جلد ۳ شائع کردہ دور حیات پبلکیشنز شمارہ ۱

سالگرہ نمبر

مہمان اڈیٹر ظ انصاری

اڈیٹر عمر مظہر حسن

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی پوائی بمبئی

۱۰ جنوری ۱۹۶۰

قیمت ۵۰ نئے پیسے

ڈاکٹر اعجاز حسین

چکبست کا جذبۂ وطن پرستی

کبھی کبھی خوبیاں بھی خرابیاں ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کی وسعت جو اسکی عظمت کا سبب ہے ایک زمانے میں تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ اول تو بدیسی حکومت کی ساحری ایسی زبردست تھی کہ سارا ملک صدیوں گہری نیند میں سوتا رہا اور پھر جب سیاسی رہنماؤں نے یہ طلسم توڑ کر بیدار کرنا چاہا تو ایک حصہ ملک کا جاگتا تھا تو دوسرا سو جاتا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیداری کی لہر اپنا کام نہ کر سکی۔ عرصے تک مختلف سیاسی تحریکات آزادی کے لئے ابھرتی رہیں۔ مختلف صوبجات سے سیاسی رہنما آوازیں بلند کرتے رہے مگر ہر حصۂ ملک سے لبیک کی صدا یکساں نہ آئی۔ ہاں اتنی مدت کی کاوش سے یہ ضرور ہوا کہ ہر جگہ متحدہ ہندوستان میں ایسے افراد کی تعداد اتنی ہو گئی کہ باوجود عام بے حسی کے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ملک و وطن کی بے حسی پر جیسے ساری آبادی کو جوش آ گیا ہو یہ بیداری سب سے زیادہ تر ان ہی افراد کی کوششوں کا نتیجہ تھی انہی کی تقریر، تحریر، پختہ خیالی اور خلوص کی بدولت آزادی کی تحریک پروان چڑھی اور دھیرے دھیرے پورے ملک میں پھیل گئی انھیں مخصوص افراد میں پنڈت برج نرائن چکبست بھی تھے۔

ان کی ولادت ۱۸۸۲ء اور وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب رفتہ رفتہ تحریک آزادی مختلف مدارج طے کرتی ہوئی ایک خاص سطح پر آ گئی تھی۔ سارا ملک ہندوستان کی آزادی میں آخری منزل تک پہنچ رہا تھا۔

چکبست کا جذبۂ وطن پرستی کسی ہیجانی کیفیت کا نتیجہ نہ تھا ان کا شعور تدریجی ترقی حاصل کرتے کرتے اب اس سطح پہ آ گیا تھا کہ وہ اس طرح باتیں کرنے لگے تھے ؎

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو !!!

لیکن اس سے بہت پہلے بھی انکے دل میں آزادی کا جذبہ کروٹیں لے رہا تھا۔ جس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم انکے کلام کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ غزل جو زیادہ تر حسن عشق کی داستان کہی جاتی ہے۔ وہ بھی چکبست کے اس ذہنی شعور کی نشان دہی کرتی ہے۔ انکی غزلوں میں کسی ایسے معشوق کا پتہ نہیں چلتا جس پر ہمارے شعراء ایک مدت سے طبع آزمائی کر رہے تھے اس کاوش میں کسی سال کی بھی قید نہ تھی چھوٹے بڑے سبھی اسکی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن چکبست کے ہاں نہ ایسی ہستی کی جستجو ہے اور نہ اس انداز میں نالہ کشی کی صدائیں جہاں سے بھی ان کا کلام پڑھئے جس غزل کو بھی دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چکبست کے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جس نے ہندوستان اور انسان کو اپنا محبوب بنا لیا ہو وہ بلا قید مذہب و ملت آدمی کو آدمی سمجھتے تھے ان کا یہ شعور احساس کی بنیاد پر تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا ہے تو سب سے پہلے آدمی کو آدمی سمجھنا پڑے گا۔ اور آدمی کی تعریف ان ہی الفاظ میں کرتے ہیں وہ شعر کا جامہ پہن کر ضرب المثل ہو گیا ہے ؎

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

اس قسم کا خیال ایک جگہ اور ملاحظہ ہو ؎

کچھ بڑی بات نہیں صاحب دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں غدر کے بعد اصلاحی تحریک مختلف فرقوں میں شروع ہو گئی اس کے ساتھ ساتھ اخلاق کی درستی اور صالح اقدار کی جستجو میں ہر رہنما منہمک رہا۔ اس کے بعد سیاسی تصور نے رنگ پکڑا کبھی یہ مانگ ہوئی کہ کچھ ملازمتیں ہندوستانیوں کو دی جائیں اور کبھی اس پہ زور رہا کہ کونسلوں میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ بغیر آزادی کے ہندوستان کو فلاح و بہبود نصیب نہ ہوگا چنانچہ آزادی کے لئے ہر کمزوری اور قوت ہندوستانیوں کو یاد دلائی جانے لگی۔ جس سے لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ اپنے وطن سے محبت اور خستہ حالی کا احساس شدید تر ہو جائے۔ چکبست نے بھی ایسے رہنماؤں کی آواز میں آواز ملانا شروع کیا۔ کبھی ہندوستان کی مفلسی و بدحالی اور کبھی یہاں کی قدیم عظمتوں کا ذکر کر کے طبیعتوں میں امنگ اور حوصلے کی لہریں دوڑانے کی فکر کی۔ مثلاً ؎

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے
طرز ہندو دیکھ کر رنگ مسلماں دیکھکر
انتشار قوم سے جاتی رہی تسکین قلب
نیند رخصت ہو گئی خواب پریشاں دیکھکر

شاد ہیں ناشاد ہیں ہم خانما برباد ہیں
ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں
ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

کبھی ہندوستان کی عظمت دیرینہ یاد دلا کر نیم بیدار قوم کو بے خبری کی دنیا سے باہر لانے کے لئے کہتے ہیں ؎

مسٹر اے بی - قیہ پرنٹر اور پبلیشر نے ادبی پرنٹنگ پریس اور اجمل پریس میں چھپوا کر
پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی - ۳ سے شائع کیا ملکیت: دور حیات پبلکیشنز

تبصرہ ضرور فرما

پہلی بات

ہر پورا ہو جائے تو تھوڑی سی مایوسی ہونے لگتی ہے
.عدت پر اس کا اطلاق درست نہیں اس لئے
وہ سوال ہی کیوں نہ معلوم کرلیں. جو ہمارے دل
امیدیں اس نمبر کے متعلق آپ کے دل میں پیدا

ندگی میں اگر ابتدا ہی سے خلوص اور نیک نیتی کا عنصر
می مرحوم نے جب اسے جاری کیا تو اپنے قائم کردہ میلان
ے بنا دیا تھا۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد
باب بھی تھے جنہوں نے اس رسالے کی پشت پر اچھے
بہد۔ ی سے نہ صرف یہ سنبھل گیا بلکہ اس میں توانائی کے
تحت "دورحیات پبلیکیشنز" نامی ایک ادارہ رجسٹر
، رسالہ نہ پہلے کسی کے ذاتی منافع کی چیز تھی نہ اب
ٹ کے تحت بھی رجسٹر کرا دیا جائے گا۔
داری جس کمیٹی پر رکھی گئی ہے اُس کے ارکان ہیں :۔
سابق وزیر حکومت بمبئی (چیرمین)
سی، مدیر اجمل، پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر
۔تی اُردو، شاعر بمبئی
ے، بیرسٹر ایٹ لا
، صابو صدیق پالی ٹکنک

ن انجمن اسلام
ہور ادیب، شاعر، ارباب نکر اور اُردو دوست ایسے ہیں

ستر (۷۰) صفحے کا یہ پرچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے
ل سے آخر تک پڑھنے کے قابل ہے اس سے آئندہ کے
دورحیات » کی ایک جھلک ضرور ملے گی۔

ظ انصاری کا مختصر مضمون « مارکسی مطالعے کا ایک
ئہ » آج کے سیاسی حالات میں خاص کر غور طلب
ے ، « عقیدے » کا لفظ اس میں شعور (Consiousness)
ے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا بلکہ Faith کے معنی
ں اسی طرح کئی اور اصطلاحیں ایسی ہیں جنہیں مصنف
ے جان بوجھ کر مذہبی ادبیات سے لیا ہے تاکہ وہی
گ ٹھیک طرح سمجھ پائیں جو اس کے مخاطب ہیں
ر مذھب و مارکسزم کی متوازی لائنیں دیکھ سکیں۔

افسانے تین ہیں۔ کرشن چندر نے اپنا افسانہ اس طرح
ام کیا کہ بے اختیار او۔ہنری یاد آگیا۔ یہ بھی ان کے
نبول افسانوں میں شمار ہوگا۔

راجندر سنگھ بیدی نے خواجہ احمد عباس پر ایک
ر، بیان کیا ہے۔ حال میں ہی یہ مضمون ہندی میں
ائع ہوچکا ہے۔

سائنس، معاشیات، ٹکنالوجی، اور علمی مسائل پر ہم مستقل
ر سے مضامین دینا چاہتے ہیں۔ سنجیدہ مضامین کے لئے،
ر سنجیدگی سے پڑھنے والوں کے لئے اس پرچے
ایک تہائی حصہ وقف ہے جس میں اختر الایمان،
ردار جعفری، باقر مہدی، وزیر آغا اور اکبر حیدرابادی
ی جدید نظمیں اور فیض احمد فیض، جمیل مظہری، آل احمد
ور اور پرویز شاہدی کی غزلیں شامل ہیں۔ فیض نے
نظم ماسکو میں تازہ تازہ کہی تھی (جولائی ۶۳ع)
سے ہم نے اپنے سالنامے کے لئے محفوظ کر رکھا تھا۔
نظم فیض کی جدید شاعری کے مزاج کی آئینہ دار ہے

سنجیدگی کا بوجھ کم کرنے کی ذمہ داری سلمی صدیقی
سف ناظم اور احمد جمال پاشا کے سر ہے۔ ان کے
وہ بھی اچھے اچھے مستند لکھنے والوں کے نام اس پرچے
ں آئیں گے۔ جیسے مہندر ناتھ اور واجدہ تبسم،
[illegible]

جنہوں نے ابتداء ہی سے "دورِ حیات" کے مقصد سے اتفاق کیا اور اس کی کوششوں کو سراہا ہے۔ ہمیں اُن کا مسلسل تعاون حاصل رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

ہم اس سالنامے کے مہمان ایڈیٹر اور دورِ جدید کے مشہور صحافی اور ادیب ظ۔ انصاری کا شکریہ ادا کرتے ہیں جس سونے کے قلم سے لکھنے والے انشاپرداز کا تعاون ہمیں آئندہ بھی حاصل رہے گا۔

انتظامی تبدیلیوں کے اعلان کے ساتھ ایک بار پھر ہم اپنے مقصد کو دہرا دینا چاہتے ہیں اور وہ ہے اُردو داں طبقہ کے ذہن کو ایسے ادبی، لسانی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل کی طرف موڑنا جن کی طرف سے یا تو وہ غافل ہیں یا پھر ان کی اہمیت کا انہیں پورا احساس نہیں ہے۔ رہی سیاست ۔ تو "دورِ حیات" یقیناً اس معنی میں سیاسی رسالہ نہیں کیونکہ یہ کسی سیاسی پارٹی یا کسی مخصوص مکتبِ خیال سے وابستہ نہیں ہے ــــــ لیکن آزادانہ طور پر، غیر جانبداری سے اس طرح رائے دینا کہ سیاسی مسائل کے سمجھنے میں مدد مل سکے اس کے دائرے سے خارج نہیں ہے۔

جہاں تک ادبی مضامین کا تعلق ہے ہم "دورِ حیات" کو ایک ایسا شریف پیام بنانا چاہتے ہیں جو اُردو داں گھروں میں بے تکلف بلا سکے اور جس کی باتیں بھائی بہن، ماں بیٹیاں، باپ بیٹے ایک ساتھ بیٹھ کر سن سکیں اور ان پر غور کر سکیں۔

اب نئے انتظام سے پیدا ہونے والی کچھ باتیں بھی سن لیجئے:

- اس اشاعت سے "دورِ حیات" مہینے میں تین بار یعنی پہلی، دسویں اور بیسویں تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔
- دورِ حیات کا مستقل سائز وہی ہوگا جو اس سالنامے کا ہے، البتہ صفحات، ٹائٹل ملا کر ۲۸ ہوں گے۔
- سالانہ قیمت ۱۲ روپے کے بجائے دس روپے ہوگی۔ ایک پرچہ تیس پیسے کا ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ یہ تبدیلیاں آپ کو بھی پسند آئیں گی۔

مارکسی مطالعے کا ایک نکتہ

ظ۔ انصاری

عقیدے اور عمل کا تعلق ایسا ہے کہ
زئی نہیں کہہ سکتا کہ دونوں میں سے کون کس کو راہ دکھاتا
ہے؛ عمل عقیدے کو یا عقیدہ عمل کو۔

عملی حالات کی روشنی میں عقیدے بنتے
بگڑتے رہیں اور عقائد کے زور سے عمل کی راہ طے کی
اتی ہے۔

جب انسان غاروں میں رہتا تھا کوئی عقیدہ
ی رکھتا ہوگا، وہ چاہے اُن دو مرد و زن کی شرکت میں
د، جو ساجھے کی زندگی گزارتے تھے یا اُن بہت سے
گوں کے درمیان جو آس پاس کے غاروں میں یا درختوں
ہ دات بسر کر لیتے تھے۔ پھر انسان کے تجربوں اور
ہوشیاری نے جب اُس کی قوتِ تسخیر بڑھائی ہوگی،
ندگی کی مشکلات پر قابو بڑھا ہوگا تو عقیدوں میں بھی
رق آیا ہوگا — یوں رفتہ رفتہ طریقِ زندگی اور اصولِ
ندگی کے دھارے متوازی بہنے لگے۔ وہ دین ہے
ور یہ شریعت۔ مذاہب کی زبان میں۔

ہر دور میں مذاہب کی کوشش یہ رہی کہ
ک شریعت کے مطابق دین اختیار کریں۔ اپنی ذاتی
ور سماجی زندگی ویسی بنائیں جیسی شریعت اُن کو بتاتی
ہے تاکہ پورے معاشرے یا سماج کی کڑیاں بھی جڑی
رہیں (Monolithic ہو) اور اس میں ہمواری
یا ایک حد تک یکسانی بھی پائی جائے (Homogenous
رہے) مادی حالات تھوڑے عرصے کے لئے اس کے
لئے زمین ہموار کر دیتے ہیں۔

لیکن چونکہ زندگی کا تانا بانا تنا اور ڈھیلا
ہوتا رہتا ہے، حالات ماضی اور مستقبل میں تبدیل ہوتے
رہتے ہیں، اس لئے عقیدوں میں بھی فرق آتا رہتا ہے۔

شریعت یا مقررہ قانونِ زندگی میں کبھی نرم
تبدیلیوں کی، کبھی گرم اور یکسر تبدیلیوں کی ضرورت پڑتی
ہے۔ جن مذاہب نے شریعت کے سانچے میں لوچ اور
لچک کی گنجائش کم رکھی (اس کے بھی بہرحال تاریخی اسباب
ہیں) اور عمل سے زیادہ عقیدے پر زور دیا۔ اُن کے
لئے عقیدے میں تبدیلی کی ہر مانگ بغاوت کا حکم
رکھتی ہے اور توڑ کا وقت آتا ہے تو کبھی سیاسی بغاوتوں
میں جلوہ گر ہوتا ہے اور کبھی معمولی خون خرابے کے بعد کوئی
نیا فرقہ اور عقیدے کی کوئی نئی شاخ اُگ آتی ہے اور پھر
یہ سلسلہ شاخ در شاخ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

سائنسی دریافتوں کی تیز رفتاری اور عالمِ
فطرت پر آدمی کی قوتِ تسخیر نے جس طرح صنعتی انقلاب
کی رہبری کی، اسی طرح مذاہب کی گروہ بندی کی جگہ سیاسی
اور علمی نظریوں کو دے دی۔ عقلِ انسانی کی ترقی، معلومات،
ان دیکھی قوتوں تک آدمی کی دسترس نے وہ فضا
تیار کر دی ہے جس میں عقیدہ مابعد الطبیعیات ——
(Metaphysics) کی چھت میں لٹکنے اور شاعرانہ
تخیل کی دیومالا سے جی بہلانے کی بجائے سائنٹفک یا
علمی چٹانوں پر قدم جمائے۔

اسلام کا اگر تہذیبِ حاضر پر یہ احسان
ہے کہ اُس نے قدیم دیومالا کا نقش دلوں سے مٹا دیا۔
(اگرچہ بعد میں مسلمانوں نے حوروں اور غلمانوں والی
غیر شاعرانہ دیومالا تراش کر رکھ بھی دی۔)، عقیدے
اور عمل میں ایک سادہ اور براہِ راست تعلق، زیادہ عملی،
بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سائنسی تعلق پیدا کر دیا تو اب سے
سو برس پہلے مارکس اور اینگلز نے خالص سائنسی اصول
کی بنیاد پر وہ محل تعمیر کیا جسے ہم مارکسزم کہتے ہیں۔ انگریز
کی سیاسی معاشیات (پولیٹکل اکانومی) جرمنوں کا فلسفہ
اور فرانس کی انقلابی مزدور تحریک، ان تین سرچشموں
سے وہ دھارا پھوٹا جس نے دنیا بھر کے عقیدے اور
عمل دونوں وادیوں کو سیراب کر دیا۔ مارکس اور اینگلز نے
اپنے زمانے کے تمام ترقی یافتہ علوم کو، نظریوں اور نتیجہ نکالنے
کے طریقوں کو نظر کے سامنے رکھا اور تب اپنی عہد آفریں تحقیقات
یہ کہہ کر پیش کیں کہ اس میں عقیدے کو نہیں عمل کو، قیاس کو نہیں
چھان بین کو، مذہب کو نہیں سائنس کو دخل ہے۔ اور اسی لئے
یہ نظریہ، جو ہم پیش کرتے ہیں جامد اور اٹل نہیں ہوگا بلکہ متحرک
اور تبدیلیاں قبول کرنے والا ہوگا۔ انہوں نے اذعانی
(Dogmatic) مذہب کا طلسم اور تسلسل توڑ کر عقیدے
اور عمل کے رہنماؤں کو ایک فکری مذہب کی جانب پکارا، جس
کے بعد ارتداد کے فتووں اور کفر کے فتووں کی گنجائش خود بخود
کم ہو جاتی ہے۔

جس طرح ایٹمی قوت کی دریافت سے سائنس
اور ٹیکنالوجی کی ہر شاخ میں زبردست تبدیلیوں کی راہ کھل گئی
ہے۔ عین اسی طرح مارکسی نظریے کے منظرِ عام پر آ جانے
کے بعد سماجی تاریخ کو دیکھنے کا انداز بدل گیا۔ سیاسی واقعات،
زرعی اور صنعتی زندگی کے اگلے پچھلے معاملات، سپہ سالاروں
کی فتوحات اور "باغیوں" کی بغاوتوں کو جانچنے کے پیمانے
تبدیل ہو گئے۔ نیوٹن، ڈارون، فرائڈ اور آئن اسٹائن نے
اپنے اپنے دائرے میں تحقیقات کر کے علمِ حاضر اور تہذیبِ
حاضر کے لئے آگے کی شاہراہیں کھول دیں، ان سے اختلاف
کیا جا سکتا ہے لیکن قطعی انکار کرنا اُس بنیاد سے انکار کرنا ہے
جس پر ہماری تہذیب آج کھڑی ہے، مارکس اور اینگلز
نے جو نظریہ دیا، وہ نہ تو کسی ایک محدود دائرے میں ابھرا

چندن ہار

کرشن چندر

یوکلپٹس کے کنج کے قریب پہنچ کر غلام سنگھ رک گیا، اور اپنے سر پر ٹرنک اور پیٹھ پر بستر پکاندھے پر رائفل اٹھائے ہوئے، اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر چاروں طرف دیکھا۔

وہ چار رفٹ کی چڑھائی چڑھ کے آیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے نیچے، پہاڑی گھاٹیاں اور ڈھلانیں گرتی جا رہی تھیں۔ اور چیڑ چیلوں سے بھرے ہوئے جنگل پھیلتے جا رہے تھے۔ اور سب سے پرے تسوں کی چمکیلی ندی کسی کی بل کھاتی ہوئی چوٹی کی طرح وادی کی کمر پر اترتی جا رہی تھی۔

غلام سنگھ نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا۔

یہ منظر اس کا برسوں کا دیکھا بھالا تھا۔ ہاتھ کی ریکھاؤں کی طرح وہ اس کے ایک ایک نقش کو جانتا تھا۔ نتھنے کھول کر اس نے اپنے وطن کی ہواؤں کو سونگھا، اور اس کے نتھنوں میں چیڑ کے جنگلوں اور یوکلپٹس کی ان کچیوں کی خوشبو بس گئی، اور اس نے خوب کھول کر تازہ اور خوشگوار ہوا سے دو تین بار اپنے پھیپھڑوں کو بھر لیا۔

پھر اس نے سر سے لوہے کا کالا ٹرنک اتارا، جس پر سفید حرفوں میں "صوبیدار غلام سنگھ" لکھا ہوا تھا۔ ٹرنک اتار کر اس نے نیچے زمین پر رکھ دیا۔ پشت کی جنبش سے بستر کو نیچے گرا دیا، پھر کاندھے سے رائفل کو احتیاط سے اتار کر ایک چٹان سے ٹکا دیا اور خود بڑے بڑے فوجی بوٹوں سے شور مچاتا ہوا یوکلپٹس کے کنج کے اندر بہنے والے چشمے کی طرف چلا گیا۔

اس کے قدموں سے کئی چھوٹے بڑے پتھر اچھل کر لڑھکے اور لڑھک کر "گڑپ" کی آواز پیدا کرتے ہوئے چشمے میں گر گئے۔ وہ چشمے کے کنارے، نرم، ہری ریشمی دوب پر لیٹ گیا۔ جس طرح وہ بچپن میں اس چشمے کے کنارے لیٹا کرتا تھا۔ پھر اس نے دھوپ کی تمازت سے جلتے ہوئے تانبے رنگ رخساروں کو چشمے کے پانی سے دھویا۔ پہلے اس نے دائیں رخسار کو پانی کی سطح پر رکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ٹھنڈی بالائی کی کئی پرتیں اس کے رخسار سے مس ہو رہی ہیں۔ پھر اس نے بائیں رخسار کو پانی سے ٹھنڈا کیا۔ پھر ایک گہرے مسرت کے احساس سے اس نے اپنا پورا چہرہ پانی میں ڈبو دیا، اور ہولے ہولے لرزنے والے فرن کے چمکیلے پتوں کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ پانی کی ٹھنڈک اس کے دل تک اتر گئی۔

پھر پانی کے دھاروں میں اپنی سانس کے شگفتہ بلبلے چھوڑتا ہوا وہ چشمے سے اپنا چہرہ نکال کر کہنیوں کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔ یوکلپٹس کی ایک ڈالی پر بیٹھے ہوئے کوے نے زور زور سے کائیں کی۔ غلام سنگھ چونک گیا۔ اس نے اپنے قریب سے ایک پتھر اٹھا کر کوے کی طرف زور سے مارا۔ کوا کائیں کائیں کرتا ہوا اڑ گیا۔ غلام سنگھ خود بخود ہنسنے لگا۔

شاید اس کے گھر کی منڈیر پر کوئی کوا اس وقت بیٹھا ہوا اسی طرح کائیں کائیں کرتا ہوا کرتارو کو آنے والے مہمان کا سندیسا دے رہا ہوگا۔ وہ تین سال کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے کرتارو کو خط تو لکھ دیا تھا اور اس وقت جس دھڑکتے دل سے کرتارو تک پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا، اسی دھڑکتے ہوئے دل سے اس کی پیاری بیوی بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔

تین سال پہلے جب وہ کرتارو سے رخصت ہو کر گیا تھا تو اسی یوکلپٹس کے کنج تک اس کی بیوی اسے چھوڑنے مسکراتے آئی تھی، اور جو وہ کپڑے اس وقت پہنے ہوئے تھی۔ انہیں کپڑوں میں غلام سنگھ اس وقت کرتارو کو اپنے ذہن میں ابھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کرتارو کا بوٹا سا قد، سڈول یوکلپٹس کی شاخوں کی طرح اور پتلے تیکھے نازک نین نقش، اور نیلی ساٹن کی لمبی پھولدار قمیص میں اس کی کمر لچکتی ہوئی اور کولہے ڈولتے ہوئے۔ ایکبارگی خون بڑے زور سے اس کی رگوں میں بجنے لگا۔ اس کی گونج اس کے کانوں میں اتنی بلند تھی گویا آس پاس کے پہاڑوں کی گھاٹیاں اور ڈھلانیں اور وادیاں اس کے لہو کی گونج سے بھر گئی تھیں۔ وہ کرتارو تک پہنچنے کا انتظار بڑی مشکل سے کر سکتا تھا، حالانکہ گھر اب بہت دور نہ تھا۔ یوکلپٹس کے کنج سے پرے، آدھے کوس کے فاصلے پر ڈھکی کی اوٹ میں تھا مگر وہاں تک پہنچنے کا انتظار کون کرے ——؟ ایسے موقعوں کے لئے چیل کا پر ہونا چاہئے۔ چیل کا پر ہوتا تو اڑتے ہوئے وہ لمحے بھر میں اپنے گھر کی چھت پر اتار سکتا تھا۔ وہ فخریہ انداز سے، دونوں بازو پھیلا کر کرتارو کو آواز دے سکتا تھا۔

"ماکھیوں میں آ گیا ہے"

وہ کرتارو کو پیار سے "ماکھیوں" کہتا تھا، جس کا مطلب پہاڑی زبان میں "شہد" ہوتا ہے۔ اس کی کرتارو واقعی شہد کی طرح میٹھی تھی اور ویسی ہی نرم اور گھلنے والی اور ویسی ہی سنہری رنگت والی اس کی آواز سن کر گھر کے آنگن میں کام کرنے والی کرتارو کیسے حیرت سے چونک جاتی اور سر اٹھا کر اپنی بڑی بڑی چشمے کی طرح چمکیلی آنکھوں سے فوراً اس کی طرف تکنے لگتی اور منہ سے کچھ بول نہ سکتی اور وہ گھر کی چھت سے چھلانگ لگا کر نیچے آنگن میں کود پڑتا، اور کرتارو کو اپنے سینے سے لگا لیتا۔

لہو اتنے زور سے گونجنے لگا تھا اور رخسار

کسی غیر مرئی قوت سے یوں تمتماتے تھے جیسے کسی نے
تانبے کو آگ پر رکھ دیا ہو۔ ظالم سنگھ نے جلدی جلدی
ٹوک میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر پھینکا۔ دو تین چار بار۔
جب چشمے کے برفیلے پانی کے لمس سے اُس کا چہرہ پھر ٹھنڈا
ہوا تو وہ ایک دم چشمے کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ پلٹ کر
اُس نے چٹان سے ٹکی ہوئی رائفل کو اپنے کندھے سے لٹکایا
بستر کو اپنی پیٹھ پر لاد لیا اور کالے ٹرنک کو اُٹھا کر جس میں
کے کپڑے اور کرتارو اور چندن کے لئے تحفے تھے [illegible]
اپنے سر پر لاد لیا اور پھر تیز تیز قدموں سے اپنے گاؤں کی
طرف چل پڑا۔

راستے بھر وہ دعا کرتا رہا کہ راستے میں اسے
کوئی نہ ملے۔ کرتارو کو ملنے سے پہلے وہ اپنے گاؤں کے
کسی آدمی سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ وہ تین سال کے بعد اپنے
گاؤں آ رہا تھا۔ اس لئے اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر راستے میں
گاؤں کا ایک آدمی بھی مل گیا تو وہ پہلے تو اُس سے پانچ منٹ
تک بغلگیر ہوتا رہے گا۔ پھر کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے
اُس کا حال چال پوچھتا رہے گا۔ پھر لپکتی ہوئی بلند آواز میں کھیتوں
میں کام کرتے ہوئے اپنے دوسرے [illegible] کو جانے پر
بلا دے گا۔

"او بسنتا سنگھا! او محمد دینا!! او قادرے!
او نے ہیرا رام! سورے پتر دیکھ کون آیا ہے...؟ اپنا
گرائیں (گاؤں والا) صوبیدار میجر ظالم سنگھ...!"

نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو کر بھی تین گھنٹے سے
پہلے اپنے گھر نہ پہنچ سکے گا..... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ
سارے گاؤں کے لوگ، اُس کی کرتارو اور اُس کے بھائی
چندن سنگھ کے سوا، مر جائیں! چند لمحوں کے لئے۔ یا سو جائیں!
یا اندھے ہو جائیں! چند لمحوں کے لئے۔ بس چند منٹوں کے
لئے..... اور جب اُس نے سوچا کہ ایسا کسی طرح نہیں
ہو سکتا، تو اُس نے چلتے چلتے اپنا راستہ بدل دیا۔

وہ تارسن نالے میں گھس گیا۔ جو گاؤں کے
پچھواڑے ڈھکی کے نیچے ایک خطرناک ڈھلان پر بہتا تھا
ڈھکی کے اوپر گاؤں تھا۔ گاؤں کے پرے دوسری طرف
کی سرسبز ڈھلانوں پر کھیت تھے۔ مگر یہاں سے وہ کسی
کو نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ کوئی اُسے دیکھ سکتا تھا کیونکہ گاؤں اوپر
ڈھکی پر واقع تھا، اور وہ تارسن نالے کے کنارے کنارے، جنگلی
اخروٹوں کے گھنیرے سایوں میں چل رہا تھا۔ بڑی احتیاط
سے قدم اُٹھا رہا تھا۔ کیونکہ ڈھلان بہت خطرناک تھی اور
یہاں سے گاؤں تک جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ مگر وہ ایک
راستہ جانتا تھا۔ بچپن کا راستہ، عمودی اور پھسلواں چٹانوں
سے گزرتا ہوا۔ ایک خطرناک راستہ جسے صرف بکریاں استعمال
کرتی تھیں یا کبھی گاؤں کے بچے سب کی نظروں سے چھپ کر
گرتے پڑتے پھسلتے ہوئے نیچے تارسن کے کنارے اخروٹوں
کے جنگل میں پہنچ جاتے تھے اور اخروٹ توڑ توڑ کھاتے تھے۔

یہ راستہ بالکل اس کے گھر کے پیچھے سے نکلتا تھا۔ اس
راستے پر چلتے ہوئے نہ وہ گاؤں کے کسی آدمی کی نگاہ میں
آسکے گا۔ بلکہ خود کرتارو کو بھی بہت پہلے اُس کے آنے کی
خبر نہ ہوگی اور وہ صرف اُس وقت دیکھ سکے گی جب وہ
گھر کے دروازے پر کھڑا ہو کر آنگن میں آواز دے گا!

"ماکھیوں؟"

چلتے چلتے وہ یکایک سہم گیا، اور سہم کر کھڑا ہو گیا۔
اُس کے راستے میں دو نیلی چٹانوں کے درمیان اُگے ہوئے
اخروٹ کے پیڑ پر دو لڑکے بیٹھے تھے اور اخروٹ توڑتے توڑتے
رُک گئے تھے اور حیرت سے اُس کی شاندار وردی اور
اُس کی چمکتی ہوئی رائفل کو دیکھ رہے تھے۔ چند منٹوں میں یہ
بچے بکریوں کی طرح اُچھلتے کودتے چٹانوں کو پھلانگتے اوپر
ڈھکی پر پہنچ جائیں گے اور چلا چلا کر اُس کی آمد کا اعلان کر دیں گے۔

اُس نے ہاتھ کے اشارے سے دونوں لڑکوں
کو نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں تک وہ لڑکے اخروٹ
کی شاخ پر جامد و ساکت بیٹھے رہے پھر اُس کے چہرے کی
خشونت دیکھ کر سہمے ہوئے نیچے آ گئے۔

ظالم سنگھ نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال
کر سیلوفون کے ایک لفافے میں بھری ہوئی ٹافیاں نکالیں۔ یہ
ٹافیاں وہ کرتارو کے لئے لایا تھا

چار ٹافیاں اُس نے ان لڑکوں کو دے کر کہا:

"لو"

لڑکے ہچکچائے

"لو!" اُس نے سختی سے کہا۔ "انگریزی مٹھائی ہے۔"
انگریزی مٹھائی کا نام سن کر اُن دونوں لڑکوں کے
ہاتھ بڑھ گئے۔

ظالم سنگھ نے ہاتھ سے رائفل کو جھلا کر کہا "اگر
تم نے کسی کو بتایا کہ ظالم سنگھ گاؤں میں آیا ہے تو گولی مار دوں
گا۔ سمجھ گئے!"

خوف اور دہشت سے لڑکوں کی آنکھوں کی سفیدی
پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ انہوں نے آہستہ سے سر ہلایا، مگر،
دہشت کے مارے اُن کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔
ظالم سنگھ آگے بڑھ گیا۔ آگے جاتے جاتے مسکرانے لگا۔
اُسے معلوم تھا کہ اب ایک گھنٹے تک تو ان لڑکوں کی ہمت
نہ ہوگی کہ اوپر ڈھکی پر جا سکیں۔ اُسے معلوم تھا کہ لڑکے اب
بھی اُس اخروٹ کے پیڑ کے نیچے کھڑے کھڑے اُسے
تک رہے ہیں، مگر اُس نے پلٹ کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا
ورنہ شاید دہشت کا تاثر ٹوٹ جاتا...... وہ مسکراتے
ہوئے آگے بڑھتا گیا اور بالکل اُس ڈھلوان پر جا پہنچا جس
کے اوپر چڑھ کر وہ سیدھا اپنے گھر کے پچھواڑے پہنچ
سکتا تھا۔

یہاں پر تقریباً کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا تھا بہت مدت سے کسی نے اس راستے کو استعمال نہیں
کیا ہے۔ یا بچوں نے تارسن نالے تک پہنچنے کا کوئی اور
راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔

یہاں پر اونچی نیچی چٹانیں تھیں اور زمین بے حد
پھسلواں تھی۔ جگہ جگہ سوئف کی جھاڑیاں تھیں اور بیروں کی
جھاڑیاں، آودی بیریاں، لال بیریاں، چٹی بیریاں اور بادام
بیریاں جن کا رنگ بادام کی طرح زردی مائل ہوتا ہے لیکن
جو مزے میں سب سے میٹھی ہوتی ہیں۔ تین سال ہوئے جب
بادام بیریاں نہ چکھی تھیں۔ تین سال سے وہ کرتارو کے
ہونٹوں کی لذت سے ناواقف تھا۔ راستے پر اوپر چڑھتے
چڑھتے بادام بیریاں چکھتے چکھتے کیوں کرتارو بار بار اُس
کے ذہن میں آ جاتی تھی؟ اور اس کی ہر سوچ میں گڈمڈ ہو جاتی تھی۔

اُس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔
چڑھائی کا آخری حصہ اُس نے بڑی مشکل سے

سکے گیا۔ جہاں فوجی مشق کرنے کے بعد آتی تھی۔ بالکل آخری چٹان تک پہنچنے کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔
جہاں پر وہ کھڑا تھا اس جگہ اور اوپر کی چٹان تک کے بیچ کے فاصلے میں صرف پونے گز کا فاصلہ
تھا لیکن وہ اوپر تک کیسے پہنچے؟ اس بوجھ کو لئے ہوئے ـــــ؟

اُس نے بڑی احتیاط سے اپنے دونوں ہاتھوں میں ٹرنک کو سر سے اٹھا کر
اوپر کیا اور دونوں بازو اٹھا کر اور ایڑیاں اٹھا کر اپنے جسم کی پوری قوت سے ٹرنک کو اوپر
کی چٹان پر ڈھکیل دیا۔ پھر ایک دم جست لگا کر جو وہ اچھلا تو اُس کے دونوں بازو اوپر کی چٹان
پر جم گئے اور باقی کا جسم نیچے خلا میں لٹکنے لگا۔ اُس نے زور لگا کر بندر کی طرح ہر اکر جو زقند لگائی
تو پاری زینگل بار کی طرح چٹان کو استعمال کرتے ہوئے چوٹی کے اوپر پہنچ گیا۔

اوپر کودتے ہوئے لمبی لمبی گھاس نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا
یہ گھاس اُس کے گھر کے پچھواڑے میں اُگی تھی۔ اس گھاس میں خود رو بھنگ کے پودے اور
پوست کے پودے، اور کہیں کہیں پر سونف کی جھاڑیاں اور لوکی کی بیلیں چھت سے زمین
تک پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کے بڑے بڑے پتوں سے ایک عجیب کڑوی سی مہک آتی تھی
جو اُسے اس وقت بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ چند لمحوں تک وہ گھاس پر خاموشی سے لیٹا رہا۔
...... خاموشی ...... گہرا سناٹا ...... جیسے ساری کائنات سو رہی ہو، اور کرتارو اُس
کے چہرے پر جھکی دھیرے دھیرے سانس لے رہی ہو۔ گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ٹرنک کو اُس
نے پھر اپنے سر پر اٹھا لیا اور دبے دبے قدموں سے چلتا، دیوار سے لگتا لگتا وہ اپنے گھر کے
دروازے تک پہنچ گیا۔

دروازہ کھلا تھا اور کھلے دروازے کے چوکھٹے میں کھڑا اندر برآمدے کے
ایک کونے میں چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی کرتارو اُسے نظر آ گئی۔ لیکن کرتارو اُسے نہ دیکھ
سکی، کیونکہ اُس کی پیٹھ ظالم سنگھ کی طرف تھی، مگر وہ کرتارو کے اُلجھے ہوئے بال دیکھ
سکتا تھا اور لہراتی ہوئی چوٹی اور آدھے رنگ پھولوں کی کاسنی شلوار اور قمیص اور اُس کے بھرے
بھرے ہاتھوں میں کہنیوں کے پاس گڑھے سے پڑتے ہوئے اور سونے میں ترشے ہوئے
گویا اُس کی آنکھوں میں چمکنے لگے اور اُس نے ہونٹ دبا کر بڑی احتیاط سے ٹرنک کو اپنے سر سے
اُتار کر کوئی آواز پیدا کئے بغیر دروازے کے اندر ایک کونے میں رکھ دیا اور پھر لستر اور پھر
انتہائی ہوشیاری سے جھک کر دبے پاؤں برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔

مگر اُس کے بوٹ فوجی تھے، اس لئے چند قدم چل کر ہی وہ آنگن کی
کی مٹی میں دبے ہوئے کسی پتھر سے لگ کر کھٹ سے اُٹھے اور کرتارو نے چونک کر اور مڑ کر ایک
لمحے کے لئے پیچھے دیکھا، اور پیچھے دیکھتے ہی اُس کا چہرہ لال لال ہو گیا جیسے اک دم شفق
کے سیج باولے نے اُس کے چہرے پر اپنی رنگین چلمن ڈال دی ہو۔ وہ بیٹھی بیٹھی اور جھک
گئی اور منہ موڑ کر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیا۔

دو تین لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ظالم سنگھ نے کرتارو کو
جا لیا اور لپک کے اپنے طاقتور بازوؤں میں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کرتارو کا دم رُکنے لگا۔
ــــ سا چلانے والی ڈولتی اُس کے گلے سے گئی اور وہ اپنے خاوند کے سینے سے لگ گئی

سسکنے لگی۔

بہت سا وقت گزر جانے کے بعد جب ظالم سنگھ کے سینے کی دھڑکن کچھ قدر
کم ہوئی تو اُس نے اُسی طرح سحر میں کھڑے کھڑے کرتارو کو اپنے سینے سے چپٹائے سوال کیا۔

"چندن کہاں ہے؟"

ظالم سنگھ کو اب اپنے بھائی کی یاد آئی تھی۔

جواب میں کرتارو کچھ نہیں بولی۔ صرف ظالم سنگھ نے اتنا محسوس کیا جیسے کرتارو
کا جسم ایک بار زور سے لرز کر کانپا۔ پھر اُس کے ہاتھوں میں برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔

"بات کیا ہے؟ بولتی کیوں نہیں ہو؟ چندن سنگھ کہاں ہے؟"
ظالم سنگھ کرتارو کو اپنے سینے سے الگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

لیکن کرتارو اُس کے سینے سے نہیں ہٹی، اور بھی زور سے چمٹ گئی اور منہ چھپا کر
بلکنے لگی۔

"بات کیا ہے کرتارو؟ بتاتی کیوں نہیں ہو؟ کیا چندن سنگھ مر گیا ہے؟"

کوئی جواب دئے بغیر کرتارو نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر کیا کسی دوسرے گاؤں گیا ہے؟"

کرتارو نے پھر انکار میں سر ہلایا۔

"پھر کہاں ہے وہ؟" ظالم سنگھ نے ذرا سختی سے پوچھا۔

"تمہارے آنے کی خبر سن کر بھاگ گیا ہے۔" کرتارو سسکیوں کے درمیان بولی۔

اب اُس کی پتلی پتلی گلابی انگلیاں ظالم سنگھ کے سینے کو ٹٹول رہی تھیں۔

"بھاگ گیا ہے؟ کیوں؟" ظالم سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چندن سنگھ اُس
کا چھوٹا بھائی تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے اس لئے ظالم سنگھ چندن سنگھ کو اپنا بھائی ہی نہیں
اپنا بیٹا بھی سمجھتا تھا۔ بڑے لاڈ اور چاؤ سے اُس نے چندن سنگھ کی پرورش کی تھی اور دونوں
بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔ اس لئے ظالم سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کرتارو کیا کہہ رہی ہے

کرتارو کا چہرہ سرک سرک کر اُوپر اٹھا اور اُس کے کان تک پہنچ گیا۔ کرتارو
کے ہونٹ اُس کے کان کی لو سے جا لگے۔ اور اُس کی گرم گرم سانس کی بھاپ ظالم سنگھ
کو بہت اچھی معلوم ہوئی۔ کرتارو دھیرے دھیرے سسکیوں کے درمیان ظالم سنگھ کے
کان میں کچھ کہنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد ظالم سنگھ نے کرتارو کو یوں اپنی گود سے گرا دیا جیسے
اب تک وہ کسی سانپ کو سینے سے لگائے تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کرتارو کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے
اُس کے نرخرے میں برف کا ڈلا رکھ دیا ہو۔

یکایک وہ چیخ کر بولا ـــــ "سچ کہتی ہو؟ کیا واقعی سچ کہتی ہو؟"

کرتارو اُس کے بازوؤں سے گر کر زمین پر لیٹی تھی، دو تین بار اُس نے
بے بسی اور مجبوری میں اپنے ہاتھوں کو جنبش دی اور اسی طرح زمین پر گری سسک سسک کر
رونے لگی مگر منہ سے کچھ نہیں بولی۔

یکایک ظالم سنگھ نے اپنی رائفل کو زور سے پکڑ لیا، پھر اُس نے ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے کرتارو کو اُٹھا کر زمین پر کھڑا کر دیا۔ اور برآمدے کی دیوار سے لگی ایک کدالی کو اُٹھا کر کرتارو کے ہاتھ میں دے کر بولا ——— "چل میرے ساتھ!"

کرتارو وحشت ناک نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"زیادہ بکواس نہ کر میرے پیچھے پیچھے چلی آ۔" ظالم سنگھ گرج کر بولا۔

اتنا کہہ کر وہ گھر کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ کانپتی ہوئی کرتارو بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

مغربی ڈھلوان پر چند بکریاں چل رہی تھیں اور ایک کتا ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ ظالم سنگھ نے پہچان لیا۔ یہ اُس کا ڈبّو کتا تھا۔

"ڈبّو" ظالم سنگھ نے زور سے اُسے پکارا۔

ڈبّو اپنے مالک کو پہچان کر تیر کی سی تیزی سے بھاگا اور بھاگتے بھاگتے آخری جست میں جو اُچھلا تو ظالم سنگھ کے کاندھوں پر۔ مگر ظالم سنگھ نے اُسے صرف ایک لمحے کے لئے اپنے کندھے پر رہنے دیا۔ پھر ڈبّو کو ہٹا کر کرتارو سے کہنے لگا۔

"چندن سنگھ کا کوئی کپڑا گھر پر ہو تو کتے کو سنگھانے کے لئے لیکر آؤ۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ وہ بھاگ کے کہاں گیا ہوگا۔ مگر اپنا کتا بھی مدد کر سکتا ہے ڈبّو بڑا ہوشیار ہے۔"

دن بھر وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چلتے رہے۔ کرتارو بار بار تھک جاتی اور بار بار اپنی کمزور آواز میں، کمزور اور مجبور سے لہجے میں کچھ اس طرح ظالم سنگھ کو واپس گھر جانے کے لئے کہتی کہ ظالم سنگھ کا غصّہ دوگنا ہو جاتا اور وہ بڑی سختی سے اُسے ڈانٹ دیتا اور آگے بڑھ جاتا۔ ڈبّو نے بھی بُو پالی تھی اور اب بڑی خوشی سے آگے آگے جھاڑیوں کے گرد گھومتا ہُوا، درختوں کے تنوں کو اور راستے میں آنے والی چٹانوں کے گرد لگی ہری گھاس کو سونگھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا اور اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک تھی، جیسے وہ اپنے پیارے چندن سے ملنے جا رہا ہو۔ ڈبّو چندن سے بڑی محبت کرتا تھا اور اُس کے پاس جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا۔

"وہیں گیا ہے۔" آگے آگے تیزی سے دوڑنے والے ڈبّو کے راستے کی سمت دیکھ کر ظالم سنگھ نے اندازہ کیا۔ ایک بار ظالم سنگھ نے چندن سنگھ کو اُس کے لڑکپن میں مارا تھا اور مار کھا کر چندن سنگھ ڈر کے مارے گاؤں سے باہر بھاگ گیا تھا۔ اور چیڑھ کے جنگلوں کے اوپر شاہ پیر کی چوٹی پر چلا گیا تھا۔ اس چوٹی پر لاکھوں برسوں کی برف نے گھُل گھُل کر کچھ چٹانوں کو ننگا کر دیا تھا۔ اور کچھ چٹانوں کے اندر دراڑیں ڈال ڈال کر ان میں عجیب و غریب محرابیں سی بنا ڈالی تھیں اور ایک بہت بڑی غار جہاں بارش اور برفباری کے طوفانوں میں گھِر جانے والے چرواہے اپنے گلّے سمیت پناہ لیتے تھے۔

دو دن تک ڈھونڈنے کے بعد ظالم سنگھ نے چندن سنگھ کو اُسی غار میں پا لیا تھا۔ وہ اور اس کے بعد جب بھی ظالم سنگھ کی کسی بات پر چندن سنگھ سے لڑائی ہوتی تھی، چندن سنگھ روٹھ کر اُسی غار میں جا کے پناہ لیتا تھا، کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا بھائی وہیں پر آ سے منا کر لے جانے کیلئے آئے گا۔

سہ پہر کے قریب وہ شاہ پیر کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ بے حد خوبصورت تھی۔ دُور دور میلوں تک کہستانی سلسلے اُٹھتے گرتے اُفقوں کو چھوتے نظر آتے تھے چٹانوں کی محرابیں ایسی خوبصورتی سے ترشی تھیں گویا برف کے ہاتھوں نے نہیں بلکہ انسانی ہاتھوں نے انہیں تعمیر کیا ہو۔ مگر ظالم سنگھ کی آنکھیں اس وقت کسی خوبصورتی کو نہ دیکھ سکتی تھیں۔

ایک محراب کے قریب پہنچ کر ڈبّو زور سے بھونکنے لگا۔

ظالم سنگھ نے اپنے کندھے سے رائفل اُتار لی۔

"کیا کرتے ہو! کیا کرتے ہو؟" کرتارو نے سسک کر کہا۔ "وہ تمہارا بھائی ہے چندن۔"

"مگر اُس نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔" اتنا کہہ کر ظالم سنگھ نے کرتارو کو دھکا دیا، اور اپنا دامن چھڑا کر کتے کے پیچھے بھاگنے لگا۔

کتے کی آواز اور قدموں کی چاپ سُن کر ایک آدمی محراب کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اُس کی نگاہوں میں سہ پہر کا سورج تھا۔ ماتھا فراخ تھا۔ آنکھیں کنول کی طرح کھلی ہوئیں۔ کوئی بیس برس کا نوجوان۔ ظالم سنگھ کی طرح اونچا پورا قد، مگر ظالم سنگھ کی طرح مضبوط نہیں بلکہ دُبلا اور کسی حد تک نازک۔ اُس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بھی ایک عجیب سا لوچ تھا۔ لوچ شاعری جیسے اُس کے انگ انگ میں گھُلی ہوئی تھی۔ وہ بیحد خوبصورت تھا۔ اور اُس کی خوبصورتی جس پر کبھی ظالم سنگھ کو ناز تھا۔ اس وقت وہ خوبصورتی ظالم سنگھ کو ایک طمانچے کی طرح محسوس ہوئی۔ اُس نے رائفل سیدھی کر لی۔

"بھیا!"۔ دونوں بازو کھول کر چندن چلایا۔

"وہیں کھڑے رہو!" ظالم سنگھ نے کڑک کر کہا اور شست باندھی۔

"بھیا میری تو سنو۔"

مگر چندن کا جملہ بکھنے کو کھلا رہ گیا، ظالم سنگھ نے اُس کے دل میں گولی داغ دی تھی، ایک لمحے کے لئے چندن پتھروں کی نیلی محراب تلے جامد، ساکت کھڑا رہا، پھر چکرا کر نیچے گر پڑا اور ایک پتھر کی سل پر ٹھنڈا ہو گیا۔

رائفل کی آواز دُور دُور تک پہاڑوں میں گونجی، جیسے چاروں طرف سمتوں سے رائفلیں چل رہی ہوں۔ دُور اوپر آسمان میں کوئی چیل چلّائی، پھر چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

ظالم سنگھ کرتارو کی طرف مُڑا۔

کرتارو اپنا فق چہرا لئے کھڑی تھی اور اُس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں وحشت جھانک

سردار جعفری

جب صبا آئے گی ہر زلف کو مہکاتی ہوئی
رنگ کے جام در و بام سے چھلکاتی ہوئی
برگِ صد لالہ و گل راہ میں بکھراتی ہوئی
شب کی مے صبح کے پیمانے میں ڈھل جائیگی
ختم ہو جائیں گے سب سردیٔ دل، تلخیٔ جاں
شمعِ افسردگیٔ روح پگھل جائے گی،

باغ خوابیدہ سہی، خنکیٔ شبنم پہ نہ جاؤ
یہ تو ہیں رات کے آنسو جو ڈھلک جائیں گے
ایک اک شاخ میں ہے دوڑی ہوئی آتشِ گل
جب صبا آئے گی شعلے بھی چمک جائیں گے
لب مہک اٹھیں گے، رخسار دہک جائیں گے

رہی تھی اور ہونٹ اُس کے ایسے بے رنگ تھے جیسے کسی نے ان ہونٹوں کا سارا لہو چوس لیا ہو
ظالم سنگھ نے اُس کے ہاتھ سے کدال چھین کر کہا۔
"میں نیچے کوئی محفوظ کھنڈ دیکھتا ہوں اسے گاڑنے کے لئے۔ جب تک تم
اس لاش کو دیکھتی رہو۔"
کرتار کچھ نہ بولی۔ اب نہ اُس کی آنکھ میں ایک آنسو تھا، نہ اُس کے
ہونٹوں پر ایک لفظ۔ وہ خاموش وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ اور جب ظالم سنگھ کدال ہاتھ
میں لئے چٹانوں پر چلتا ہوا دور کہیں چلا گیا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دھیرے دھیرے
ڈرتی ڈرتی لاش کے پاس آئی۔ دیر تک اسے گھورتی رہی۔ آہستہ آہستہ اُس کے تق چہرے
پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی اور وہ دھیرے سے طنز آمیز لہجے میں بولی۔
"مجھے ٹھکرا کر اُس موٹی سوتری کلے سے محبت کرنے چلے تھے۔؟ کیوں؟؟"
پھر وہ تھوڑا سا جھجکی، پھر بے بس ہو کر چندن کے سرہانے بیٹھ گئی، اُس
نے اُس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا، اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اُس نے بے اختیار
ہو کر چندن کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ دیوانہ وار اس کے ہونٹوں کو چومنے لگی اور کہنے لگی۔
"مگر اب تم کسی کے پاس نہیں جا سکتے۔ اب تم میرے ہو گئے ہو۔ ہمیشہ
کے لئے میرے چندن یار!"

ظفر گورکھپوری

بانسری

یاس آگیں فضا
تیر کی طرح چبھتے ہوئے
غم کے لمحات میں
اس خرابے کی پرہول ظلمات میں
درد کی بیکراں بیکراں رات میں
اک سُرن میں نے پائی تھی جو بجھ گئی
میں نے اک سُریلی آہٹ سنی تھی مگر
میرے دردوں کی وادیوں کی طرح
وہ بھی دو چار دن جاگ کر سو گئی
لہلہاتے ہوئے اک بدن کی مہک
دل کے سوتے دریچوں میں اتری مگر
دل کو چھوتی ہوئی گدگداتی ہوئی
جانے کس سمت پہنچی، کدھر کھو گئی
ایک جھنکار جلتی ہوئی روح میں
زمزمہ بن کے چھلکی تھی، بکھری تھی جو
سوچتا ہوں وہ جھنکار کیا ہو گئی

اے کہیں دور گاتی ہوئی بانسری
تو یونہی گائے جا۔ گائے جا گائے جا

بانسری اے مدھر، رس بھری بانسری
تیری آواز سے کچھ تسلی تو ہے
ان تپیدہ تپیدہ سے لمحات میں
کچھ تو تسکیں کا ساماں ہے میرے لئے
تیرے ہلکے، دلآویز نغمات میں
تیرے لب کی نوائے خوش آہنگ سے
جی کو ڈھارس تو ہے بیکراں رات میں
بانسری اے مدھر، رس بھری بانسری
چھن نہ جائے یہ ہلکی سی تسکین بھی
ٹوٹ جائیں نہ یہ آس کے سلسلے

پھوٹ جائیں نہ سیلابِ غم سے کہیں
یہ تسلی کے نازک تریں بلبلے
بانسری اے مدھر رس بھری بانسری
یہ نہ محسوس کرنے لگوں میں کہیں
اس خرابے کی پرہول ظلمات میں
میرا اپنے سوا اور کوئی نہیں
بانسری اے مدھر رس بھری بانسری
تو یونہی گائے جا، گائے جا، گائے جا
تو یونہی گائے جا گائے جا، چپ نہ ہو
چپ نہ ہو، چپ نہ ہو
چپ نہ ہو،
چپ نہ ہو،

موازنہ قیس و فرہاد

یوسف ناظم

قیس اور فرہاد کے بارے میں مؤرخین میں ہمیشہ اختلاف رائے رہا ہے اور اب تک اس بات کی صحیح طور پر تحقیق نہیں ہو سکی کہ اس زمین پر قیس عامری پہلے اُترے یا فرہاد کا نزول قیس کی ولادت سے پہلے ہوا۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ ان دونوں ابداروں کے درمیان کتنا فصل ہے۔ چونکہ ہم اس وقت تاریخ مرتب کرنے یا تحقیقی مقالہ لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتے اس لئے ان دونوں کے بارے میں یہ امور تاریخ کے ہونہار طالب علموں کے لئے چھوڑ دیتے ہیں اور آپ کو ایک خالص علمی اور فلسفیانہ مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہر لحاظ سے اہم ہے اور افسوس کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کو اب تک کسی بحث کا موضوع نہیں بنایا گیا۔ عشق کے میدان میں آنکھ بند کر کے کود پڑنے والوں سے یہ دنیا کبھی خالی نہیں رہی لیکن قیس اور فرہاد کی ٹکر کے عاشق اب تک پیدا نہیں ہو سکے۔ لیکن سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آخر قیس اور فرہاد میں کس کا پلہ بھاری ہے۔

عشق کی ہر داستان، رنج و غم کا گودام ہوتی ہے۔ قیس اور فرہاد کے عشق کی کہانیاں بھی اچھے بھلے آدمی کو بیمار ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔ پہلے زمانہ میں جب لوگوں کو فرصت کے لمحات آسانی سے مہیا تھے۔ یہ کہانیاں گھروں میں بڑے شوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں اور ان کو سُن کر بوڑھی عورتوں کی اکثر روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں کم عمر لڑکیاں غش کھا کر گر پڑتی تھیں اور ان لڑکیوں کو لخلخہ سونگھا کر ہوش میں لایا جاتا تھا۔ جب بوڑھی عورتوں کی ہچکیاں رُکتیں اور نو عمر لڑکیاں ہوش میں آتیں اُنہیں دوسری کہانی سُنائی جاتی۔ شاعروں نے اس معاملہ میں بڑی بھاری خدمت انجام دی ہے اور ان عاشقوں کے بارے میں نظمیں کہہ کر ان کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ فلم بنانے والے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں رہے اور ان لوگوں نے ان دو بہادروں کی زندگی اور عشق کے فلم بنا کر بے بہرہ عوام کے علم میں اضافہ کیا ہے۔

قیس اور فرہاد کا موازنہ کرنے کے لئے ہمیں چند تنقیحات قائم کر لینا ہے کیونکہ یہی شعار دنیا ہے۔ ہم یہ بھی تجویز پیش کرتے ہیں کہ تنقیحات قائم کرنے سے پہلے یوں نہ قیس اور فرہاد کی محبت کے چند ضروری واقعات بیان کر دئے جائیں تاکہ ہم کو اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنا پڑے۔ پہلے قیس عامری کی داستانِ عشق سنئے:

قیس عامری عام طور پر مجنوں کے نام سے مشہور رہے۔ یہ ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا اور اس کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ اسے اس کے والدین نے جس مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے بھیجا اس مدرسہ میں تذکیر و تانیث کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا اور لڑکے لڑکیوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اسی مدرسہ میں لیلیٰ نامی ایک لڑکی بھی پڑھنے آتی تھی۔ قیس کو اس لڑکی سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ اپنی تختی پر دن بھر لیلیٰ لیلیٰ لکھا کرتا تھا اور اپنے ہجے دُرست کرتا۔ بعض وقت وہ لیلیٰ کا ہوم ورک بھی کر دیتا اور خود مولوی سے پٹنے میں زندگی کا لُطف پاتا۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں، انسان کی عمر بھی بڑھتی جاتی ہے۔ لیلیٰ اور مجنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ دن گذرتے گئے اور ان کی عمریں بڑھتی گئیں۔ لیلیٰ بڑی ہو کر پردہ میں بیٹھ گئی کیونکہ اُس زمانہ میں لیلیٰ نامی ساری لڑکیاں پردہ کرتی تھیں۔ لیلیٰ کے پردہ نشین ہو جانے کے بعد بھی قیس کی دلچسپی اُس سے برقرار رہی اور عشق کے درجہ کو پہنچ گئی۔ اس درجہ پر پہنچ کر قیس نے سنگِ لیلیٰ میں بھی جلوۂ یار کی جھلک پائی۔ لیلیٰ کے والدین نے اپنی لڑکی کا عقد قیس کے ساتھ منظور نہیں کیا اور قیس دل برداشتہ ہو کر نجد کے جنگلوں میں نکل گیا۔ اور وہیں اُس نے مجنوں کے نام سے شہرت پائی۔ جنگل کی طرف جانے سے پہلے قیس نے لیلیٰ کے شہر کی ساری گلیوں میں لیلیٰ لیلیٰ پکار کر شہرت حاصل کی۔ قیس جس گلی میں بھی نکل جاتا شہر کے لڑکے اس پر پتھر پھینکتے۔ اسکول کے لڑکوں کو دوسروں کی طرف پتھر پھینکنے کا پہلا سبق قیس کے زمانے ہی میں ملا۔

لیلیٰ نے کئی لڑکوں سے التجا کی۔

کوئی پتھر سے نہ مارو مرے دیوانے کو

لیکن سوائے اسد نامی ایک لڑکے کے کسی نے لیلیٰ کی بات نہیں مانی اور اس لڑکے نے بھی یہ مہربانی مجنوں یا لیلیٰ پر نہیں اپنے آپ پر کی کیونکہ یہ لڑکا اپنے مستقبل سے بہت ڈرتا تھا اور کہتا تھا۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

انگریز بڑی شان سے ٹارزن کی فلمیں بناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ٹارزن کے سوا جنگل میں کوئی رہ ہی نہیں سکتا۔ اُنہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آج سے صدیوں پہلے قیس نامی نوجوان نے جنگل ہی میں اپنی بقیہ زندگی گزاری اور ایک مرتبہ جنگل میں نکل جانے کے بعد پھر اُس نے کبھی شہر کا رُخ نہیں کیا۔ اور پھر قیس کے پاس نہ تو ٹارزن کی طرح تیر و کمان

تھے۔ اور یہ بھی دو شاعروں کی طرح [illegible] وزن مشکل ہے۔ [illegible] کلوگرام ہوگا [illegible] کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ [illegible] قیس کی پسلیاں لیلیٰ کی انگلیوں کی طرح نرم و نازک تھیں۔ انگریزوں کو ہمارا مشورہ ہے کہ [illegible] کو مشہور کرنے میں اس قدر تعصب اور تنگ نظری سے کام نہ لیں کیونکہ [illegible] مجنوں کی شہرت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ انگریزوں کی اس تنگ نظری کے مظاہرے کی وجہ سے خواہ مخواہ ہی قومی تعلقات خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ [illegible] قیس کا مقابلہ کر سکے گا۔ قیس نہ صرف اپنے وقت کا [illegible] جنگل [illegible] تھا۔ غالب کہہ گئے ہیں

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار

صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

لیلیٰ کے والد صاحب [illegible] تھا کہ [illegible] زیادہ [illegible] لیلیٰ اور مجنوں کی شادی [illegible] دونوں کی جان لی۔ لیلیٰ ناقہ پر سوار محمل میں چھپی [illegible] مجنوں اس کے پیچھے دوڑتا لیکن آپ جانتے ہیں کہ مجنوں مجنوں تھا [illegible] نکل جاتی اور مجنوں کے حصہ میں صرف گرد راہ [illegible] آتا۔ [illegible] مجنوں کی بھاگ دوڑ بھی نہیں بھائی اور ایک [illegible] کے مطابق [illegible] لیلیٰ کے والد کے کہنے کی بنا پر جھوٹ موٹ لیلیٰ کے مرنے کی خبر سنائی گئی اور مجنوں وہیں آہ کہہ کر مر گیا اور پھر لیلیٰ نے جب مجنوں کے مرنے کی خبر سنی تو وہ [illegible] کیونکہ لیلیٰ تو بغیر مجنوں کے کبھی زندہ و سلامت نہیں رہ سکتی۔ لیلیٰ اور مجنوں کی وفات کے بعد لیلیٰ کے والد کئی دن [illegible] خوشی [illegible] زندہ رہے۔

فرہاد کی داستانِ عشق بھی اتنی ہی دردناک ہے۔ فرہاد بھی جوان [illegible] تھا لیکن اس کے معشوق [illegible] مشہور نہیں تھی۔ اگر شادی اسلامی کی پابندی کی جاتی تو شاید فرہاد ناکام عاشق کی طرح نہیں مرتا۔ فرہاد کو اپنے ہی شہر کے ایک اونچے گھرانے کی لڑکی شیریں سے عشق ہوگیا۔ اور اس عشق کے بعد فرہاد سنبھل نہیں سکا۔ فرہاد میں جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا سوائے اس کی غربت کے اور کوئی خرابی نہیں تھی۔ لیکن دولت [illegible] شرافت کا معیار تھا۔ [illegible] شیریں جیسی لڑکی سے شادی کرنے کے لئے تو خاندانی [illegible] کی ضرورت تھی لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قارون لاولد مرا تھا بلکہ اپنی دولت [illegible] زمین [illegible] قارون کے والد [illegible] شروع ہوا [illegible] فرہاد کے عشق کی تھی۔ فرہاد غریب [illegible] وہ کسی سے نہیں دبتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ شیریں کے ساتھ اس کے عقد کی جو بھی شرط مقرر کی جائے گی وہ پورا کرے گا۔ شیریں کے والد ماجد نے چیلنج قبول کر لیا [illegible] شیریں کے محل میں دودھ کی بڑی کمی تھی اور محل والوں کو [illegible] دودھ [illegible] بچوں کو بھی پوری طرح دودھ نہیں مل رہا تھا۔ جس سے [illegible] وقت محسوس ہو رہی تھی۔ محل کی اکثر دعوتیں بغیر دودھ کے منسوخ ہوا کرتی تھیں۔ اور لوگ فیرنی اور فالودہ نہ پانے کی شکایت کرتے تھے۔ شیریں کے والد نے سوچا یہ موقع اچھا ہے کیوں نہ فرہاد سے محل تک دودھ کی نہر کاٹ کر لانے کی فرمائش کی جائے۔ شیریں کے والد نے ایک خانگی صحبت میں اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو اپنی تجویز سنائی اور سب خوشی سے اچھل پڑے اور سب کو تعجب ہوا کہ اتنی ہوشیاری کی بات شیریں کے والد کے دماغ میں آئی کیسے۔ تجویز پسند کر لی گئی۔ اور فرہاد کو سنا بھی دی گئی۔ کوئی اور ہوتا تو یہ شرط سن کر ہی غش کھا کر گر پڑتا لیکن سننے والا فرہاد تھا کوئی اور نہیں۔ فرہاد نے غم و غصہ کا اظہار نہیں کیا۔ پریشانی میں مبتلا نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ آسانی سے مبتلا ہو سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس نے سٹرم دان کی تحریک چلائی حالانکہ اگر وہ چاہتا تو کئی نوجوان اس کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہو جاتے لیکن فرہاد نے کچھ بھی نہیں کیا شیریں کا نام لیا اور پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا۔ فرہاد جیسے اولوالعزم، محنتی، جفاکش اور ایماندار انجینیروں کی پیدائش کا سلسلہ اگر برقرار رہتا تو آج ہر گھر تک دودھ کی نہریں بہتیں۔ نہر تیار ہو گئی اور اس میں اب دودھ ڈالا ہی جانے والا تھا کہ شیریں کی شادی شہزادہ پرویز سے کر دی گئی۔ فرہاد تو خیر فرہاد تھا ایک معمولی آدمی بھی یہ حرکت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ فرہاد نے اپنا تیشہ اٹھایا اور سر میں اتار لیا اور کوہکن کے نام سے وفات پائی۔ ایک شاعر نے کہا ہے۔

سینۂ سنگ سے ٹپکا کرے فرہاد کا خوں

اور پرویز کے ہاتھوں میں ہو ل عشرت کے ایاغ

دونوں داستانیں آپ سن چکے۔ اب تصفیہ کیجئے کہ ان دونوں عاشقوں میں کون اونچے درجے کا ہے۔ اس بات کا تصفیہ ان تنقیحات کی روشنی میں ہونا چاہئے کہ

۱۔ خلل دماغ کے معاملے میں کس کو ترجیح حاصل ہے

۲۔ دنیا و مافیہا سے کون غافل ہو گیا یعنی عشق میں کون زیادہ ڈوبا۔

۳۔ کس نے زیادہ مدت تک عشق کیا۔

۴۔ کس کی موت زیادہ شاندار تھی۔

ہماری ان تنقیحات ہی سے غالباً آپ کو اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ہم قیس علیہ کے پرستار ہیں۔ قیس کو ہم واقعی انیس سمجھتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ انیس کے نام کے ساتھ ہی دبیر کا نام بھی لیا جاتا ہے پس قیس کے نام کے ساتھ ہی فرہاد کا نام بھی دبیر کی حیثیت میں لیا جاتا رہے گا کیونکہ فرہاد نے بھی عشق کے فن میں نئی راہیں ایجاد کیں۔ مجنوں سوائے لیلیٰ کے اور کسی بارے میں سوچ نہیں سکا۔ لیکن فرہاد نے اپنی توجہ ایک نہر کی طرف منتقل کر دی۔ یوں دیکھا جائے تو مجنوں عشق برائے عشق کا قائل تھا۔ اور فرہاد عشق برائے زندگی کا۔ فرہاد نے یقیناً نہر کاٹ کر یہ ثابت کر دیا عاشق صرف اپنے لئے مفید نہیں ہوتا بلکہ اپنے عشق سے دنیا کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہے بشرطیکہ اسے اس کے محبوب سے شادی کا یقین دلایا جائے۔ پھر بھی ہم عشق کو اپنی تمام مقصدیت بے باتوں سے اونچا سمجھتے ہیں اور مجنوں کی تو وہی 'خلوص، خشوع و خضوع اور وفا'

آپ کی شخصیت

نفسیات ،
اقبال امروہوی

ایک امیدوار کسی دفتر میں انٹرویو کے لئے جا رہا تھا۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے ایک دوسرا شخص اُس سے ٹکرا گیا۔ اس سے پہلے کہ ٹکرانے والا شخص معافی کا خواستگار ہو امیدوار نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔

"ذرا دیکھ کر چلئے جناب"

"معاف فرمائیے"

ٹکرانے والے نے نہایت انکساری سے کہا"

"کیا معاف فرمائیے" اُس نے اپنے چہرے پر غصہ کے اثرات پیدا کرتے ہوئے کہا اور پھر دوسرے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"یہ تین چار الفاظ لوگوں کو اچھے یاد ہو گئے ہیں۔ سوری، معاف کیجئے، شکریہ۔ بس جو چاہا وہ کر دیا اور ان میں سے ایک لفظ کہہ دیا"

اپنا نمبر آنے پر جب وہ امیدوار اپنے حلیہ کا اچھی طرح معائنہ کرتے ہوئے دفتر میں داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ لفٹ میں جو شخص اُس سے ٹکرایا تھا وہی اس دفتر کا افسر تھا۔ افسر نے اس کو پہچانتے ہوئے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور کہا۔

"آپ جا سکتے ہیں۔"

"لیکن ...." امیدوار نے کچھ کہنا چاہا۔

"جی ہاں آپ کو انٹرویو کے لئے بلایا گیا تھا مگر آپ کا انٹرویو تو لفٹ ہی میں ہو گیا۔

اب آپ خود خیال فرمائیے کہ اس کی بد اخلاقی اور تلخ زبانی کتنی مہنگی ثابت ہوئی۔ یہ تو سروس کا معاملہ تھا اس کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے میں آدمی کا مزاج کیسی رکاوٹ یا سہولت ثابت ہوتا ہوگا۔

جن لوگوں کے ساتھ ہم رہتے ہیں لین دین اور کام کاج کرتے ہیں اُن کے اور ہمارے احساسات اور جذبات ایک جیسے ہیں جو ہم سوچتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی وہی سوچتے ہوں۔ لہٰذا ہماری بہت سی کامیابیوں کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ دوسرے ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

کیا آپ کسی ایسے شخص کی ترقی کی امید کر سکتے ہیں جس کے بارے میں اس کے افسران اچھی رائے نہ رکھتے ہوں یا کوئی ایسا شخص اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دے سکتا ہے

کے قائل ہیں۔ عشق وہی ہے جس میں عاشق اپنا گریبان چاک کر لے۔ دُبلا ہو جائے زن گنوا لے۔ کھانے پینے سے بے پرواہ ہو جائے اور تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلے۔ عشق ڈاکٹری یا انجینئری کے فن کی ترویج کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ عشق اپنے آپ خود ایک آورش ہے اور اس آورش میں کسی اور چیز کی آمیزش، عشق کی ہتیا ہے۔ عشق اور دیوانگی نہر دو بے جوڑ چیزیں ہیں۔

اب رہا عشق کی مدت کا سوال تو یہ زیادہ اہم نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں بھی ہم مجنوں کو فرہاد سے آگے دیکھتے ہیں کیونکہ اس بات سے کسی کو انکار نہیں مجنوں نے پرائمری اسکول کے زمانے ہی سے عشق کا آغاز کیا جبکہ فرہاد کا بچپن صرف لہو و لعب میں گزرا۔ یا تو شیریں بچپن میں اُسے نظر ہی نہیں آئی یا فرہاد کو اپنے کھلنڈرے پن کی وجہ سے عشق کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ ہمارے مجنوں کی تو ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزر گئی۔

شاندار موت بھی مجنوں ہی کو نصیب ہوئی کہ اسے اپنی موت کے لئے کسی مادی شئے کا سہارا نہیں لینا پڑا۔ اُس نے ایک آہ کھینچی اور دم روک لیا۔ اس کے برعکس فرہاد کو تیشے کا سہارا لینا پڑا۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

مجنوں کی موت صدمے کے باعث ہوئی لیکن فرہاد کی موت کی وجہ خودکشی تھی۔ اور صرف اس خودکشی ہی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فرہاد پر مجنوں کو فوقیت حاصل ہے۔

★

جس کی باتوں سے اُس سے نالاں ہوں اور اُس سے کسی قسم کا تعاون نہ کرتے ہوں ؟

زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی سے گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری شخصیت دوسروں کے لئے دلکش ہو۔

مطلب یہ نہیں کہ اگر کوئی شخص خوبصورت ہے اُس کا جسم بھرا ہوا ہے یا وہ اچھے اور نفیس کپڑے پہنتا ہے تو اس کی شخصیت دلکش ہے۔ بلکہ شخصیت کا مطلب یہی ہونا چاہئے کہ آپ دوسروں کے لئے کیا ہیں آپ کے دوست احباب اور ملنے والے آپ کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔

[illegible] نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر انسان دل سے چاہتا ہے کہ لوگ اس کے بارے میں اچھے خیال رکھیں، اس کی تعریف کریں [illegible] لیکن ہر شخص کوشش نہیں کرتا کہ وہ اپنے میں وہ خوبیاں پیدا کرے جن کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کشش پیدا ہو جائے۔

آپ ایسے کسی نہ کسی آدمی سے واقف ہوں گے جو اپنے دوستوں میں بہت ممتاز ہو لوگ اس سے مل کر خوش ہوتے ہوں جس محفل میں وہ چلا جائے وہاں خوشی کی لہر دوڑ جائے، لوگ اس کی دوستی پر فخر کریں اس کا حلقۂ احباب بھی بہت وسیع ہوگا اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کے دوست ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر آپ کے کسی دوست میں ایسی خوبیاں ہیں تو آپ بھی اس کو دوست کہنے میں فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ کیا آپ نے کبھی سنجیدگی سے سوچا ہے کہ وہ اپنی کن خوبیوں کی وجہ سے ان دوستوں میں اتنا ہردلعزیز ہے۔ اس کا تجزیہ آپ آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہ خیال نہ فرمائیے کہ اس کی اس قسم کی شخصیت خدا کی دین ہے بلکہ یہ اس کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے آپ کی شخصیت کا نکھار اور حسن آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اسے آپ اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتے ہیں۔

نفسیاتی مطالعے کا ایک اہم طریقہ "مطالعۂ باطن" ہے۔ کسی بات کا ہم پر یا دوسروں پر کیا اثر ہوتا ہے۔ ہم اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ پر کوئی تہمت لگائے تو اُس وقت آپ کی جو جذباتی کیفیت ہوگی اس کو آپ اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں اور اگر آپ اس کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو آئندہ آپ ہر اُس شخص کی جذباتی کیفیت کا اندازہ لگا لیں گے جس پر تہمت لگائی جائے۔ اسی مطالعۂ باطن کے اصول کو مدِنظر رکھ کر شخصیت کی تعمیر بھی کی جا سکتی ہے۔ آپ کے بعض دوستوں کی کچھ باتیں آپ کو ناپسند ہوں گی یا ناگوار گزرتی ہوں گی۔ آپ ان باتوں سے پرہیز کر سکتے ہیں اور ایسی خوبیاں خود میں بھی پیدا کر سکتے ہیں جو آپ اپنے دوستوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

تو پھر ایک دلکش شخصیت کے لئے کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

یہاں پہلا نمبر خوش مزاجی اور خوش اخلاقی کو دینا چاہئے۔ دیکھا گیا ہے کہ ایک خوش مزاج اور با اخلاق شخص ہر جگہ اپنا مقام پیدا کر لیتا ہے۔ جو لوگ ہنس مکھ ہیں وہ نہ صرف خود مسرور رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مسرتیں بخشتے ہیں۔

جب کوئی شخص آپ سے ملنے آتا ہے اور آپ نہ صرف مسکرا کر اُس کا استقبال کرتے ہیں بلکہ جب وہ اپنا ایک ہاتھ بڑھاتا ہے تو آپ اپنے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ لے کر گرم جوشی سے دباتے ہیں تو اس سے آپ کا کچھ نقصان نہیں ہوتا لیکن آپ سے ملنے والے کے دل پر آپ کے خلوص کی ایک گہری مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ وہ آپ سے مل کر خوش ہوتا ہے آپ کے چہرے پر رقص کرتی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ جادو کا اثر رکھتی ہے۔ وہ آپ کے دوستوں کے لئے زبردست کشش کا باعث ہوتی ہے۔ لوگ آپ سے مل کر خوش ہوتے ہیں اور آپ سے اس لئے ملتے ہیں کہ ذرا دیر وہ بھی خوشیوں میں گذار دیں اور اپنے غموں کو بھول جائیں۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ آج کی دنیا میں انسانوں کو ہنسنے کا موقع کم ملتا ہے یہ صحیح نہیں ہے انسان اُس وقت بھی ہنس سکتا ہے جب وہ ہنسنا نہ چاہتا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ جب ذہنی طور پر پریشان ہوتے ہیں تو انہیں اُس وقت ہنسنا تو کیا بولنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن جب آپ مسکرانا اور ہنسنا اپنی عادت بنا لیں گے تو اُس وقت آپ ذہنی پریشانی میں بھی مسکرائیں گے اور پریشانیوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

آپ دوستوں کے لئے اپنے دل میں ہمیشہ خلوص رکھئے۔ ان سے خلوص سے ملئے۔ دوستوں سے ہی نہیں ہر شخص سے خلوص اور اخلاق سے ملنا مفید ثابت ہوتا ہے۔

ہمارے ایک دوست کیمپس کورنر پر ورلی جانے کے لئے بس کے کیو میں بہت دیر تک کھڑے رہے اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ بس کے ذریعے وقت پر نہیں پہنچ سکتے تو انہوں نے ٹیکسی کر لی۔ چونکہ وہ اکیلے تھے اس لئے انہوں نے کیو میں کھڑے ہوئے دو مسافروں کو جو ورلی جانا چاہتے تھے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ ان میں سے ایک شخص جو لائف انشورنس کارپوریشن کا ایک عہدہ دار تھا ہمارے دوست کا گہرا دوست ہو گیا۔ اُس نے انہیں امریکہ کے فورڈ کا واقعہ بھی سنایا جو ہمیشہ اپنی موٹر میں ان لوگوں کو لفٹ دیا کرتے تھے جو بس کی کیو میں کھڑے ہوتے تھے۔ فورڈ کا کہنا ہے کہ اس طرح اُسے بعض اچھی شخصیتیں مل گئیں جن کی وجہ سے اُس کی تجارت کو پہلے سے زیادہ فائدہ پہنچا لہٰذا ان دونوں کی دوستی بھی محض دوستی نہیں رہی آج ہمارے وہی دوست "لائف انشورنس کارپوریشن" میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں اور ان کی موجودہ پوزیشن محض اُن کے دوست کی مرہونِ منت ہے۔

ایک اچھی شخصیت کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ آدابِ محفل کے ان اصولوں سے بخوبی واقف ہو جن کی وجہ سے وہ دوسروں کو متاثر کر سکے۔

جب آپ دوستوں میں بیٹھے ہوں تو دوسروں کو بھی بولنے کا موقع دیجئے

بعض لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنی بات دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بالکل نظرانداز کر جاتے ہیں۔ وہ کسی کو بولنے کا موقع نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں سے اُن کے دوست بہت جلد بور ہو جاتے ہیں۔ آپ دوسروں کی باتیں غور سے سنئے

ں طرح کہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ آپ اُن کی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی ، ی رو داد غم سنا رہا ہے اور آپ خاموشی سے سن رہے ہیں تو اُس پر کوئی اثر نہیں ہوگا ، پ کے چند ہمدردی کے الفاظ اس کے بوجھ کو ہلکا کر سکتے ہیں۔ اُس سے آپ ہمدردی کیجئے ۔ سے دلاسہ دیجئے اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلائیے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ؛ کے زمانے میں سچا ہمدرد ملنا مشکل ہے ۔ ہو سکتا ہے آپ کے دوستوں میں بھی کوئی ایسا دوست ہو جو ایک حقیقی ہمدرد کی تلاش میں ہو ۔ آپ اُس کے ہمدرد بن جائیے ۔ اس طرح آپ کو بھی بہت سے ہمدرد مل جائیں گے ۔

امریکہ کی ایک فرم نے جب اپنی سالانہ فروخت کا تجزیہ کیا تو اس کے مالکان کو یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ اُس سال ایک ایسا سیلز مین سب سے زیادہ کامیاب رہا جو نہ زیادہ تعلیم یافتہ تھا اور نہ ہی تجارتی اصولوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ مالکان نے اس سیلز مین کو بلا کر پوچھا کہ اس کامیابی کی خصوصیات کیا ہیں ۔ سیلز مین نے کہا میں خود نہیں جانتا کہ مجھے آرڈر کس طرح مل جاتے ہیں ۔ یہ حقیقت ہے کہ میں بزنس کی تکنیک سے واقف نہیں اور نہ ہی مجھے دوسرے سیلز مین کی طرح باتیں بنانا آتی ہیں۔ جب ماہرین نفسیات نے اس کی کامیابی کی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اُس کا پُر خلوص ہمدردی سے بھرا ہوا دل ہے جو کامیابی کا واحد ذریعہ ہے ۔ وہ دکانداروں سے بحیثیت سیلز مین نہیں ملتا بلکہ ان سے بحیثیت ایک ہمدرد دوست ملتا ہے ۔ جب وہ کسی اسٹور پر جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ پرانی رقم کا مطالبہ کرے یا آرڈر طلب کرے سب سے پہلے وہ دکاندار کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا ہے وہ اس سے ایسی باتیں کرتا ہے جن کی اس کو ضرورت ہے ۔ مثلاً ۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے ۔ گزشتہ مرتبہ جب میں آیا تھا تو آپ کو سردی ہو گئی تھی ۔ کیا علاج اب تک جاری ہے؟ ہاں وہ آپ کا بچہ اب کیا کر رہا ہے ۔ کیا وہ واقعی امتحان میں کامیاب ہو گیا ۔ آپ کی تجارت کا کیا حال ہے؟" وغیرہ وغیرہ

لہٰذا دکاندار اُس کے خلوص اور ہمدردی کی وجہ سے اُس کے منتظر رہتے تھے ۔ وہ اس کو اپنا ایک ہمدرد دوست سمجھتے تھے ۔ اُس کی نہ صرف فروخت اچھی تھی بلکہ رقم کی وصولیابی کے سلسلے میں بھی اُس کا ریکارڈ شاندار تھا ۔"

بعض لوگوں میں دوسروں پر نکتہ چینی کی عادت ہوتی ہے ۔ وہ صرف اس کھوج میں رہتے ہیں کہ انہیں دوسروں کی خامیاں نظر آجائیں اور پھر وہ اس کو بیان کریں ۔ بظاہر نکتہ چینی کا اثر ہر شخص پر برا ہوتا ہے ۔ ہم یہ اچھا محسوس نہیں کرتے کہ لوگ ہماری خامیوں پر نظر رکھیں ۔ جب ایک بات ہمیں ناگوار گزرتی ہے تو یقیناً اس بات کا اثر دوسروں پر بھی وہی ہوتا ہوگا ۔ جب ہم کسی کی نکتہ چینی برداشت نہیں کر سکتے تو ہمیں بھی اس کا کوئی حق نہیں کہ ہم دوسروں پر نکتہ چینی کرتے پھریں ۔ اس کے برعکس اگر کوئی آپ پر تنقید کرتا ہے تو بپھر نہ جائیے بلکہ اس کو نہایت خوشی سے سنئے اور ساتھ تنقید کرنے والے کا شکریہ بھی ادا کر دیجئے کہ اس نے آپ کو اپنی اصلاح کا موقع دیا ۔ اس کا اثر بہت ہی خوشگوار ہوگا ۔

آپ اپنے دوستوں کی برائیوں کو تو ضرور نظر انداز کر جائیے لیکن ان کی اچھائیوں کو کبھی نظر انداز نہ کیجئے ۔

اگر آپ کے دوست میں کوئی خوبی ہے تو آپ اس کی دل کھول کر تعریف کیجئے ۔ اس سے نہ صرف اس کی ہمت افزائی ہوگی بلکہ وہ اپنی اس خوبی کو اس لئے اور بھی اہمیت دے گا کہ اس کی وجہ سے لوگ اس کو اچھا سمجھتے ہیں ۔ آپ اس کے سامنے ہی دوسروں سے بھی اس کی تعریف کیجئے اس طرح دوسروں کو بھی اپنی اصلاح کا موقع ملے گا اور وہ بھی اپنے اندر ایسی خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جن سے لوگ اُن کی بھی تعریف کریں ۔

یہ ریاکاری نہیں ہے

یاد رکھئے آپ دوسروں کی ہمت افزائی کرنے میں ایک خوشی محسوس کریں گے اور آپ کی یہ خوشی حقیقی ہوگی ۔ آپ اپنے ایسے دوست کی تعریف بھی کیجئے جس کو آپ اچھا نہیں سمجھتے ۔ آپ کہیں گے کہ یہ ریاکاری ہے ۔ لیکن آپ اس کی جھوٹی تعریف نہ کیجئے ہو سکتا ہے آپ اُس کو چند برائیوں کی وجہ سے اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن ان کے علاوہ اس میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی ۔ آپ ان خوبیوں ہی کی تعریف کیجئے ۔ اس طرح آپ میں فراخ دلی پیدا ہوگی ۔

آج آدمی اس لئے دکھی ہیں کہ وہ حسد اور جلن رکھتے ہیں ۔ حسد ہماری مسرتوں کا دشمن ہے ۔ حاسد خود اپنا خون جلاتا ہے ۔ وہ کبھی سکھی نہیں رہتا ۔ اُس کا ذہن اور دماغ ہر وقت مصروف رہتا ہے ۔ اس طرح کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکے یا جلن اُس کو موقع ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ سوچ سکے اور اس طرح اس کی بہت سی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں ۔

یاد رکھئے آپ کی شخصیت آپ کے لئے زبردست اہمیت رکھتی ہے

آپ اپنی شخصیت سے اپنے دوستوں میں ہی ہر دلعزیز نہیں رہیں گے بلکہ آپ جس سے بھی ملیں گے اُس کے دل پر اپنی خوبیوں کے نقوش چھوڑیں گے ۔ محض دوستوں میں ممتاز رہنے سے کام نہیں چلے گا دوستوں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کے ساتھ آپ کو واسطہ رہتا ہے ۔

ولیم جیمس کے اس مقولے کو یاد رکھئے کہ آج کے زمانے میں اگر کوئی چاہے کہ دنیا کو تیاگ کر جنگل آباد کرے ، وہ وہاں وہ اپنی اصلاح کرے تو وہ یقیناً فرشتہ بن جائیگا لیکن انسان نہیں بن سکتا ۔ اور آج ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو اس دنیا میں رہ کر نہ صرف خود کو ایک نمونے کی شخصیت بنائیں بلکہ دوسروں کو بھی اصلاح کا موقع دیں

یاد رکھئے آپ کی دلکش شخصیت آپ کی کامیابی اور کامرانی کی ضمانت ہے

آپ اس طرح ایک سکون محسوس کریں گے ۔ ایک ایسا سکون جس میں آپ بہت کچھ سوچ سکتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں ۔

لمحوں کی قیدی

باقر مہدی

ہال میں نیلی سی کم کم روشنی
چھت سے لٹکی کاغذی بیلیں
فضا میں جھومتے رنگیں غبارے
اور دیواروں سے سرگوشی کا شورِ الاماں
فرش پر قدموں کی آہٹ، دل کی دھڑکن سے سوا۔
تیز رقص، جیسے،
کتنے سایے ایک جسمِ آہنی میں قید ہوں
سوچتے کاش!۔
آج ارمانوں کے جل بُجھنے سے پہلے
اپنے ہر اک خون کے قطرے کا لے سکتے حساب!
وحشیانہ لَے سے بجتے ایک کونے میں رباب ۔۔!!
ایک خوشبو کا تعفن ہر طرف پھیلا ہوا۔

نظریں: وہ ہراتی حریصانہ اشارے
لب تبسم کی ہوس میں کچھ سکڑتے، پھیلتے
انگلیوں کے لمس سے بڑھتی حرارت جذبۂ بیتاب کی
ایسا جذبہ جس کو ٹھنڈی آگ نے روشن کیا

ایلیٹ کے "کھوکھلے انسان" رقصاں ہیں ابھی،
انقلابی، مسخرے، مشہور اور بے نام سب،
اپنی روحوں کے یہ سوداگر ا۔
ڈھونڈنے نکلے ہیں
اپنے حصے کی مسرت، جس کا ملنا ہے محال،
یہ خوشی کی جستجو ہے یا فرار ۔۔؟

سالِ نو کی منتظر
اک گھڑی، لمحوں کی قیدی،
جانے کیسے گر پڑی دیوار سے!۔
سب تماشائی ڈرے، اچھا نہیں ہے یہ شگون،
مجھ سے ہنس کر اک نجومی نے کہا،
"وقت کو گھڑیوں میں کب تک بند رکھے گا کوئی؟"

○

ابنِ بطوطہ کا سفرنامہ

جمہ ظ۔ انصاری نے
صرف ایڈٹ کیا

غرض کہ میرے بھائی، ہم گھوم پھر کے پھر آ پہنچے ہندوستان جنت نشان میں۔ چھ سو برس سے کچھ اوپر ہوتے ہیں، محمد تغلق بادشاہ نے ہمیں چین کا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ رستے میں مال و اسباب سب لٹ گیا۔ خیر جی، ہم نے کہا، الحمد جانے بلا سے۔ بس عقل اور نوٹ بک محفوظ رہنی چاہئیں تھی، سو ہے محفوظ!

چین، جاپان، اور دیکھا نام کہ، چوائی لد اُس سے آگے جہاں ہماری ورکوملیس کی ملاقات ہوئی تھی پانچ سو برس پہلے، وہ سارے ٹکڑے جوڑ جوڑ کے ایک چینی گاڑی ایجاد کرلی۔ چابی بنوالی اس کی۔ چابی بنانے والا کہتا تھا کہ لے ابن بطوطہ، چائے اور چپاتی کی طرح چابی بھی خاص ہم چینیوں کی ایجاد ہے۔ ایسی چابی بنا کے دوں گا کہ ایک لیور کم زیادہ کرکے جو مشین چاہو کھول لو۔ میں نے کہا:

"ہاں میرے لال، ایسی ہی چابی چاہئے۔ جب چالو چینی گاڑی کے انجن میں گھوڑا لگا دیا بھیجو، بچھو ۸ برس رہ کر آئے۔ جی نہیں پھرا پھر ہندوستان بتایا ہے۔ محمد تغلق بادشاہ تو اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب اُن کی گورمنٹ میں جو ایک صاحب گجرات میں تشریف لائے۔ اُنہوں نے باہر جانے پر ایک جھنجھٹ کھڑا کر دیا ہے "پی فارم" کا۔ پہلے زمانے میں پپیہا گایا کرتا تھا، اب وہاں روانگی سے پہلے ہی کسٹم والے گانے لگتے ہیں "پی کہاں، پی کہاں؟" یعنی "پی فارم" کہاں ہے تمہارے پاس؟ وہ دکھاؤ تو باہر جاؤ۔

اور اب میں تمہیں کیا بتاؤں، چابی کا بیوپار اور بیوپار بہت بڑھ گیا ہے دنیا میں۔ بعضے بعضے آدمی کے پاس سب مسئلے کھولنے کی ایک ہی چابی ہے۔ تم جانو وہ شعر ہے نا کبیر داس کا:

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھولا کوئی
ڈھائی اکھر پریم کا، جو پاسے پنڈت ہوئے

کچھ لوگ ڈھائی اکھر کی چابی سے ہی پنڈت ہو جاتے ہیں۔

تو میں نے کہا، ایسی چابی بنادے میرے بھائی کہ میں اُسے لگاتے ہی ہر مسئلہ کھولنے والے کو ذرا کھول دیا کروں۔ سو وہ بن گئی اور میں نے ازار بند کے گچھے میں لٹکالی ہے۔ تم دیکھنا کہ کیا لطف آتا ہے اس چابی کا!

چین میں جب سے انیم کی جگہ عوام چھیلے ہیں، لوگوں نے ہمارا وہاں رہنا مشکل کر دیا ہے۔ کوئی کہے اے حاجی ابن بطوطہ نیلی وردی پہن کر عوامی والنٹیر بن جاؤ۔ ہم نے کہا برخوردار کسی رنگ کی وردی کے بغیر ہی ہمارا شیوہ خدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہے۔ کسی نے کہا قاضی صاحب سب کے بخیے اُدھیڑتے ہیں اور اپنی تنقید نہیں کرتے ہیں آپ! اس بورژوا انٹلکچوئل والی بیماری کا توڑ کیا جائے گا عنقریب۔ ہم ڈرے کہ اب سر توڑا جائے گا ہمارا۔ لیکن نہیں، وہ بات پرانی ہوگئی۔ آج کل کے یہ لوگ سر پر پروپیگنڈا توڑتے ہیں بس، چنانچہ دوسرے دن سے ہمارے سکرٹری سے لے کر پنجرے کا دروازہ کھلا تو جو ہم بنگال کی ایک بندرگاہ سے سٹک لئے کر

نے گئے تھے، صبح شام بورژوا، بورژوا پکارنے لگے اور وہ حالت طاری ہوگئی کہ مُوتوا قبل اَن تموتوا (موت سے پہلے ہی مر رہو)

عوام چھیلنے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ سائنس اور ٹیکنک بڑے زوروں میں جا رہی ہے میرے بھائی۔ آگے کی طرف کونے چھجے والی ٹوپی کا ایک نوجوان میرے پاس آیا اور دست بستہ عرض کی کہ یا قاضی القضاۃ میں آپ کی ترقی سے باز آیا۔ آپ پُرانی چال کے پیر بتائے جاتے ہیں۔ جب کہ آپ کی چینی گاڑی تک انیسویں صدی کی ٹیکنک میں اٹکی ہوئی ہے۔ میں نے چمکار کر کہا۔ اے جانِ برادر دوسروں کے جھوٹے ہوئے الزام پر نہ جا۔ البتہ وہ تدبیر کر کہ ہماری چینی گاڑی اور ہمارا پچواں بھی تمہاری طرح موڈرن ہو جائے۔ اُس نے کان کے قریب مُنہ لا کر کہا۔ "کسی سے کہئے گا نہیں کہ میں سوویت روس کا پروپیگنڈا کرتا پھرتا ہوں۔ ورنہ بات اصل میں یہ ہے کہ دراصل روسیوں نے دنیا میں اونچی اڑان کا کمال کر دکھایا ہے۔ آپ اپنا سفارت خانہ مع قلمدان لپیٹ کر روس پہنچ جائیے اور یا تو قرضے کی گرانٹ میں، یا کسی رائلٹی وغیرہ میں، یا پھر کچھ خدمات دکھا کر کوشش کر کے ایک موڈرن "وَن سیٹر" مفت میں بنوا لیجئے۔ چاند تاروں میں اُڑتے پھریں گے آپ اور ایسے ایسے فوٹو چھپیں گے آپ کے کہ بوڑھے سے جوان اور جوان سے نوجوان نظر آئیں اور والے نیلے ہو جائیں۔

ہم نے سنہری ڈاڑھی کو سہلایا، موٹا چشمہ اوپر نیچے اور درمیان کیا اور پھر یوں گویا ہوئے پاک ہے ذات اُس خدا کی جس نے ہم کو ہوش اور تجھ کو جوش عطا کیا، اے سپوت، جس قوم کو قرضے کی گرانٹوں پر جینا اور ڈنر پلانا آ گیا اُس کی آنکھ کا پانی مر جاتا ہے، اُس کی کھال سخت ہو جاتی ہے اور پروردگار جب اُس کے وزیرِ خزانہ سے پوچھتا ہے

ڈارون سے ڈارون

احمد جمال پاشا

اہلِ مغرب کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ کبھی اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے مورثِ اعلیٰ بندر تھے۔ کبھی ثابت کیا جاتا ہے کہ ہمارے جدِ امجد کتے تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ ہم مچھلی کی نسل سے ہیں اور کبھی یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم چوہے کی اولاد ہیں۔

اس بدعت کا سہرا حضرت ڈارون آنجہانی کا سر ہے ان کی سائنس دانی اور علم و فضل سر آنکھوں پر مگر آپ ہی انصاف سے کہئے کہ ہم یہ کیسے باور کرلیں کہ "ہمارے مورثِ اعلیٰ بندر تھے" گویا آج اشرف المخلوقات میں شمار ہونے والے کل تک درختوں کی شاخوں پر جھولا جھولتے اور بے گھونسلا زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ اس خیالِ خام کے مان لینے کے بعد خود ہماری نظروں میں ہماری [illegible] کیا رہ جائے گی۔

نسلِ انسانی کے ارتقاء اور آغاز کے سلسلے میں یہ بہتان اگر محض یہاں تک محدود رہتا تو ہم اس پرانی بحث میں پڑنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ احتیاط یہ کرتے کہ حتی الامکان انسانیت کے دائرے میں رہیں اور ایسی کوئی حرکت نہ ہونے دیں جس سے بات کا بتنگڑ بنانے والے واقعہ کا سرا ہمارے ان نام نہاد مورثِ اعلیٰ سے ملادیں۔ یوں بھی ہم میں وہ عالی ظرفی نہیں جو ملکہ وکٹوریہ میں تھی کہ انہوں نے سر چارلس ڈارون کے اس دعوے کے بعد ("انسان بندر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے") موصوف کو جنگل میں چھڑوا دیا کہ "کہاں ناجنسوں میں پھنسے ہوئے ہو! جاؤ جا کر اپنے جدِ امجد کے ساتھ عیش کرو۔"

اس باسی کڑھی میں اس وقت ابال آیا، جب انڈونیشیا کی گشتی فوج کے ایک سپاہی نے دیکھا کہ جنگلی بندروں کے ساتھ ایک انسانی بچہ بھی چھلانگیں لگا رہا ہے۔ فوجیوں نے بدقت تمام جان ڈال کر اس بچے کو پکڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان صاحبزادے کو جب بندر اٹھا کر لے گیا تو اس وقت آپ کی عمر محض چند ہفتوں کی تھی اور اب آپ کسی طرح بھی چار سال سے کم کے نہیں ہیں۔ ان کی تمام حرکات و سکنات بندروں کے مثل ہو چکی ہیں۔ آپ کچے پھل، پتیاں اور ترکاریاں اس شوق سے کھاتے ہیں جیسے ہم اور آپ پلاؤ زردہ کھاتے ہوں۔

اندھے کو ٹھیلنے کا بہانہ۔ مغرب کا سارا پریس یک لخت حرکت میں آگیا۔ دھڑا دھڑ سائنس دانوں کے بیانات شائع ہونے لگے۔

جنوبی امریکہ کے ایک سائنس داں نے جوش میں آکر اعلان کر دیا کہ انسان بندر کی اولاد نہیں بلکہ مچھلی کی نسل سے ہے۔ اسی کے ساتھ ثبوت کے طور پر انہوں نے جل پری اور سمندری دیوی کی قلمی تصویریں اور دریائی آدمی سے ایک انٹرویو بھی اخبارات میں چھاپ دیا۔

اس پر ایک یورپی سائنس داں صاحب کو جلال آگیا اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارے آبا و اجداد مچھلی نہیں بلکہ کتے کی اولاد ہیں" اور دور کی کوڑی یہ لائے کہ "ہر چند کہ اس نسل کا ارتقاء یورپ میں ہوا مگر اس کے آخری نشانات اب بھی جزیرہ نکوبار میں پائے جاتے ہیں جہاں کے باشندے آج بھی فخریہ اپنے آپ کو کتے کی اولاد کہتے ہیں اور اس کی پرستش بھی کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ انہوں نے ستم یہ کیا کہ ڈارون صاحب کی بندر کی تھیوری کی تردید نہیں کی اور اس طرح انہوں نے بالواسطہ طور پر یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارے باپ بندر اور ماں کتیا کی اولاد ہیں۔ ان کی بات ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ باپ کے ساتھ ماں کی طرف سے بھی شرافت اور نجابت کا سلسلہ بالکل ختم ہو جائے۔

آسٹریلیا کی رگوں میں تازہ تازہ خون یورپ سے گہرا تعلق اور امریکہ سے بڑا بھائی چارہ، جھلا پس موقع پر وہ کہاں چپ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اٹھا کر ایک دلچسپ قصہ بڑی دھوم دھام سے اخباروں میں چھاپ دیا۔

ہوا یہ کہ سڈنی شہر میں ولایتی نسل کے ایک سفید چوہے صاحب جن کا نام نامی ہنری ہے۔ انہوں نے وہ کام کیا جو رستم سے نہ ہوا ہوگا۔ یہی وہ مہم تھی جسے سر کرنے میں ماہر انجینئروں کی ایک پوری ٹیم ناکام ہو چکی تھی۔ ماہرین ۸۰ فٹ کی ایک پیچ دار نلکی سے ایک تار گذارنا چاہتے تھے۔ مایوسی کی صورت میں ہنری صاحب کی، رضاکارانہ خدمات حاصل کر لی گئیں اور تار کے سرے کو تاگے سے ان کی دم سے باندھ کر نلکی کے دوسرے سرے پر ان کی چوہیا کو رکھ کر ان کا پیٹ دبایا گیا تو انہوں نے کی "چوں چوں"۔ ہنری اپنی میم صاحب کی مدد کے لئے سر پر پیر رکھ کر نلکی میں بھاگے اور موڑوں سے گزرتے ہوئے فوراً نلکی کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔

اہلِ امریکہ بھلا کب کسی کے پیچھے رہے ہیں۔ انہوں نے فوراً چوہے کی تصویریں حالاتِ زندگی، مشغولیات اور انسانی تاریخ میں چوہوں کے مقام پر مضامین کی بھرمار کر دی۔

ساتھ ہی نیویارک عجائب گھر کے نگراں اور ممتاز سائنس داں ڈاکٹر میلکم سی میک کا نے آواگون کے فلسفہ پر ایمان لاتے ہوئے یہ بصیرت افروز دعویٰ کر دیا۔

انہوں نے [illegible] کہا کہ "ہمارے مورثِ اعلیٰ چوہے تھے اور مچھلی [illegible] وا، بندر وغیرہ ارتقاءِ نسلِ انسانی کی بعد کی کڑیاں ہیں ان سب کے مقابلے میں چوہا اس ارتقاء [illegible] کی بنیادی اور اہم ترین کڑی ہے" اسی طرح انہوں نے کھلم کھلا یہ تسلیم کر لیا کہ "انسان کا جدِ امجد چوہا ہے"۔

کوئی تعجب نہیں کہ اسی کے ساتھ ساتھ

مغرب میں "چوہا کلب"، "مچھلی کلب"، "بلی کلب" اور "بندر کلب" وغیرہ بھی کھل چکے ہوں۔

اور مثال کے طور پر "چوہا کلب" کے ممبر بلوں میں رہنے کے ساتھ ساتھ چوہے دانی سے بچنے اور روٹی کپڑا کترنے کی مشق کریں اور کلب میں بنچوں کے بل داخل ہونے سے قبل ہر ممبر کو اس بات کا حلف اٹھانا پڑے گا "ہم چوہے کی اولاد ہیں"۔ "کلب میں" "بلی ہماری جانی دشمن ہے" اور "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے" قسم کے ریکارڈ بجیں اور "بھاگو چوہو بلی آئی" ڈانس ہو۔

"مچھلی کلب" کے ممبران کسی حوض یا ٹب میں مچھلیوں کے ساتھ تیرتے اور کیڑے مکوڑے نوش فرمانے کے ساتھ ساتھ کسی فرم کو آرڈر دیں کہ "ہمارے انتقال پُرملال کے بعد ہمیں انسانوں کے ساتھ نہ دفنایا جائے بلکہ یا تو بڑی مچھلیوں کے ماحضر کے لئے سمندر میں چھوڑ دیا جائے یا پھر لیبل لگا کر ہمارے قیلے ڈبوں میں بند کر کے مچھلی کے شائقین کے لئے محفوظ کر دئے جائیں۔

"کتا اسٹ کلب" کے ممبران بجائے مشاعرے اور پنچایتیں برپا کرنے کے علاوہ اہل شہر کی چوکیداری بھی کریں۔ میم صاحب اگر تازی کتیا یا پاکٹ ڈاگ کا روپ دھار کر نکلیں اور ان کے جلو میں عاشقان بازاری کا ایک جم غفیر کودتا پھاندتا ہوا ساتھ چلے۔ صاحب بہادر بلڈاگ، فاکس ٹیریر، گرے ہاؤنڈ یا السیشن بنے ہوئے گردنوں میں پٹے ڈالے ہر آنے جانے والے پر کان کھڑے کر کے بھبھوڑوں کی ورزش کریں۔ چراغ جلے ہر بھلے آدمی کو چور سمجھ کر اس پر بھونکنے کی مشق کے ساتھ ساتھ، غرانے، ممبران راہ گیروں کا تھوڑی دور تک ساتھ ہی دیدیں کہ راستہ نہ بھول جائیں یا غلطی سے دوسرے کے گھر میں نہ داخل ہو جائیں اور مجبوراً چور سمجھ کر ہمیں ان کو نشانہ پڑے ہو کر تکان کی صورت میں ممبران تریلیکس سے بے نیاز بیچ سڑک پر سونے میں مصروف ہوں یا خالی وقت گزارنے کے لئے ہر متحرک شے پر کان کھڑے

"بندر کلب" کے ممبران درختوں پر ایک دوسرے کی جوئیں نکالنے، جنگی مشقیں کرنے، کچے پکے پھل، پتیاں اور شاخیں توڑنے، جھولا جھولنے، کھیتوں اور باغوں پر دھاوے مارنے، مکانوں کی منڈیروں، دیواروں اور چھتوں پر دوڑنے، توڑ پھوڑ کرنے اور آنکھ مچولی کھیلنے کی ریہرسل میں مشغول رہیں گے۔

لیکن شاید افریقہ کی اس خبر کو مغربی اخبار نسلی امتیاز کی وجہ دبا گئے جس میں کہا گیا تھا کہ "افریقہ کے ایک پہلوان جن کا وزن بیماری کی وجہ سے گھٹ کر محض ۱۴ ہنڈرڈ ویٹ رہ گیا ہے، ڈاکٹروں کے سخت پرہیز کے باوجود، اب ان کی برائے نام غذا اسپتال میں محض ۴۰ روٹیاں اور ۳۵ گلاس دودھ رہ گئی ہے۔ دس سیر سے زیادہ گوشت اب وہ ایک وقت میں نہیں کھا سکتے۔ ان کے پیٹ کا آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹر والے نے ان کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان پہلوان صاحب کا نام نامی تغیلو اپوگو موگوٹو ہے اور وطن مبارک ٹوگولینڈ ہے۔

اور پاکستان کی اس خبر کو بھی مغربی اخبارات نے اہمیت نہیں دی کہ "کراچی کے عجائب گھر کی جانچ پڑتال کے بعد آڈیٹروں نے اس بات کا انکشاف کیا کہ عجائب گھر کے تین ہاتھیوں میں سے ایک پورا ہاتھی غائب ہے۔ عجائب گھر اور پولیس کے ذمہ دار ہاتھی کی تلاش میں مصروف ہیں۔ باخبر ذرائع کا کہنا ہے کہ ہاتھی کے عجائب گھر سے چوری ہونے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ ہاتھی کو کوئی جیب میں ڈال کر فو دو گیارہ ہو جائے۔ ورنہ دن دھاڑے (رات کو عجائب گھر بند کر کے اس پہ پہرہ بٹھا دیا جاتا ہے) اتنا مسلم ہاتھی نوکروں کے سامنے سے چوری کر لینا ممکن نہیں ہے۔

ہندوستان میں بہرائچ کی اس خبر پر بھی خاموشی رہی کہ ایک ۵۰ من وزنی جواہرات کی ہی کوئی حورے کر چلتا بنا۔ پولیس کا دعویٰ ہے کہ چونکہ جائے وقوع پر محض ایک شخص کے پیر کے نشان ملے ہیں لہٰذا یہ حرکت کسی فرد واحد کی ہے۔

جدِ امجد ہاتھی تھے

حیرت اس بات پر ہے کہ مشرق کی ان خبروں کے شائع ہونے کے بعد مغرب کے اخباروں نے اُچھالا نہیں۔ نہ افریقی پہلوان کا انٹرویو لیا اور اس کے حالات زندگی شائع کئے، نہ سائنس دانوں نے دعوٰی کیا کہ انسان ہاتھی کی نسل سے ہے۔ مچھلی، چوہے کتے اور بندر سے متاثر ہونے والے ان "ہاتھیاشکانا" سے متاثر نہ ہو سکے یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر اس بات کا دعوٰی کیا جاتا کہ ہمارے جدِ امجد ہاتھی تھے تو ہمارا بھی سینہ فخر سے پھول جاتا کیونکہ آج بھی بے شمار انسان ایسے موجود ہیں جن کی غذا کسی ہاتھی سے کم نہیں۔ اور جو مسلم ہاتھی سے لے کر ہوائی جہاز، ریل اور سڑک کوٹنے کا انجن، بجلی گھر اور پورے پورے مکان تک چوری کر چکے ہیں۔ اور یہ چوریاں مغرب میں زیادہ ہوتی ہیں۔

خیر جرائم پیشہ افراد کی سیاہ کاریوں کو جانے دیجئے اگر اشرف المخلوقات ہو کر بھی یہی حرکتیں کرنی تھیں تو انسان اور ہاتھی ہونے سے کہیں بہتر تھا کہ مچھلی، چوہے، کتے یا بندر ہو رہتے۔ مگر مذاہب کی تاریخ، دیومالا اور اساطیر کے علاوہ انسانی تاریخ بھی اس قسم کے بہادروں کے کارناموں سے عبارت ہے، جنہوں نے قلعوں کی فصیلیں، پھاٹک، پُل اور پہاڑ ڈھا دئے۔ زمین پر رہ کر خلا تک پرواز کی، ایورسٹ تک پہنچے، دریاؤں اور سمندروں کے رُخ موڑ دئے۔ طوفانوں اور انقلابوں کا سامنا کیا۔ آتش، شیر اور اژدھے پر بھاری پڑے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ کیا تو تنہا مچھلی، چوہے اور کتے، بندر کے بچے انجام دے سکتے ہیں یا ابنِ آدم؟ پھر اگر ہم اپنے اشرف المخلوقات ہونے اور اولادِ آدم کہلانے پر ناز کریں تو آخر اس میں برا کیا ہے؟ کیوں صاحب!

ایک خط
نوجوان سائنس دان کے نام

[امریکہ کے ایٹمی انرجی کمیشن کے صدر گلین سی بورگ (Glenn Seaborg) نے ایک خط لکھا تھا جس میں آج کے سائنس دان مستقبل کی نسل کو خطاب کرتا ہے۔ خط کے مصنّف کو دنیا کا سب سے قیمتی انعام یعنی نوبل پرائز مل چکا ہے ——— مترجم]

ترجمہ طلعت شاہین

> سائنس دان بننے کے لئے بیمثال ذہانت کی اتنی ضرورت نہیں ہے۔
> محنت، صبر اور استقلال نے سائنس کو آگے بڑھایا ہے۔
> سائنسی پیشہ دلچسپ بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔
>
> ——— گلین سی بورگ

عزیزمن!

میں نے سُنا ہے کہ تم سائنس کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو مجھے اجازت دو کہ اس موضوع پر تم سے دو باتیں کر لوں اور تمہارے سامنے اپنا تجربہ بھی پیش کروں۔

جب میں ہائی اسکول میں داخل ہُوا تو، نہ یہ جانتا تھا کہ سائنس کیا بلا ہوتی ہے اور نہ مجھے اس کا علم تھا کہ اس کے امکانات کا دائرہ کس حد تک وسیع ہے۔ میں نے کیمسٹری کا مضمون اس لئے اختیار کر لیا تھا کہ کالج میں داخلے کے لئے سائنس کے ساتھ ہائی اسکول پاس ہونا ضروری تھا۔ مگر کچھ ہی دنوں میں ہمارے استاد نے اس مضمون کو اتنا دلچسپ بنا دیا کہ کیمسٹری میرے ذہن پر پوری طرح چھا گئی اور میں اس کا شیدائی بن گیا۔ میں بار بار یہ سوچ کر افسوس کرتا رہا کہ کسی نے مجھے اس مضمون سے پہلے آشنا کیوں نہ کیا۔ بہرکیف میں نے تہیہ کر لیا کہ مجھے سائنس دان ہی بننا ہے اور اسی کوشش میں مجھے اپنی ساری توانائی صرف کرنی ہے۔ وہ دن اور آج کا دن، اس درمیان میں مجھے ایک لمحے کے لئے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ اپنے فیصلے میں مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو۔ ذاتی طور پر سائنس کے سلسلے سے مجھے بڑا سکون پہنچا ہے اور دل کو بڑا اطمینان میسر ہوا ہے۔

صلاحیت کا سوال

سائنس دان بننے سے پہلے تمہارے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ کیا تمہارے اندر اس کی صلاحیتیں موجود ہیں؟ شاید تمہارا دل کہے گا اور بعض لوگ اس کی تائید بھی کریں گے کہ سائنس دان بننے کے لئے انتہائی طباع اور ذہین ہونا ضروری ہے۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے سائنسی علم میں سب سے زیادہ حصّہ اُن ہی کا رہا ہے جنہیں ہم طبّاع (Genius) کہتے ہیں۔ مثلاً آئنسٹائن، راذرفورڈ، ایڈیسن وغیرہ مگر یاد رکھو کہ سائنس کے زیادہ تر انکشافات اور ایجادات، تحقیق اور تجربے اُن لوگوں کی محنت اور کاوش کے مرہونِ منّت ہیں جنہیں کسی طرح طبّاع (Genius) اور غیر معمولی ذہین محققوں کی صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ اوسط درجے کی ذہانت رکھتے تھے۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو سائنس زراعت، صنعت، صحتِ عامہ اور طب کا آپس میں اس قدر چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ان میدانوں میں کام کرنے کے لئے ایسے بے شمار لوگوں کی ضرورت پیش آئے گی جو مختلف سطحوں اور صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ بہت سی ایجادات انہی لوگوں کی بدولت ظہور میں آئیں۔ دراصل سائنس اُس طریقۂ کار کا نام ہے جس کے ذریعۂ علم کی منظم صورت کی حدود کو نظریوں اور تجربوں کی مدد سے وسیع کیا جا سکتا ہو۔ پہلے اُصولِ اساسی سیکھو، پھر سائنٹفک طریقے کی بنیادوں پر عبور حاصل کر کے آج کل سائنس دانوں کو جو سہولتیں میسّر ہیں اُن سے متعارف ہو جاؤ۔ اس کے بعد نہایت اطمینان کے ساتھ سائنٹفک ترقیوں کی اُن منزلوں کی طرف قدم اٹھانے کا حوصلہ کرو جن میں ایسے مقامات بھی آئیں گے جہاں پچھلی نسل کے بعض نہایت ذہین و طبّاع سائنس دان بھی نہیں پہنچ پائے تھے۔

میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنی ذہانت کی کمی بیشی کا مقابلہ کسی ہم عصر سے ہرگز نہ کیا کرو۔ اس کے بجائے قدرت نے جو صلاحیتیں تمہیں ودیعت کی ہیں انہی کی بنیاد پر قدم بڑھاؤ۔ پہلے اپنے لئے ایک کافی بلند مقصد متعین کر لو۔ پھر اس کے حصول کی خاطر بے دریغ محنت کئے جاؤ۔ تمہاری صلاحیتیں اسی حالت میں پوری طرح بروئے کار آئیں گی جب کہ تم ایک ایسا مقصدِ زندگی اپنے سامنے رکھو گے، جسے تم مکمل طور پر کبھی حاصل نہ کر پاؤ۔

ایک اچھے سائنس دان کے لئے صرف ایک بات ضروری ہے۔ محنت! بعض ذہین اور طبّاع

انسانوں کے مقابلے میں اوسط سے کچھ بہتر ذہن رکھنے والے بعض لوگوں نے محض اپنے کام اور استقلال کی بدولت بہتر کام کر دکھائے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بہت سی ایجادات اتفاقاً کسی پر سوچ کر ہی ظہور میں آئیں لیکن یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ بیشتر انکشافات کا دارومدار کام کرنے والوں کی انتھک محنت، صبر اور استقلال اور مناسب طریقۂ کار پر تھا۔ آج کے حالات میں میری باتیں کچھ اُلٹی سی معلوم ہوں گی، کیونکہ آج کل کی دنیا کام کم اور زیادہ فرصت کی قائل ہے۔ تفریحی مشاغل کے ذکر کے بجائے محنت اور مشقت کی باتیں کرنا زمانے کی ہوا کے خلاف ہے۔ لوگ مجھے مضحکہ خیز سمجھیں گے میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اُن کے مطالبات سے پوری ہمدردی ہے۔ میں زیادہ فرصت کا مخالف نہیں ہوں۔ تفریحی مشاغل سے مجھے دلچسپی نہیں ہے لیکن کیجیے واقعہ یہی ہے کہ ۴۰ گھنٹے فی ہفتہ کام کی شرح ایک طرف اور تخلیقی قسم کے سائنسی کام دوسری طرف ان دونوں میں تال میل قائم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک سائنس داں کو مسلسل محنت کرنے کا سب سے قیمتی انعام اس کی ذہنی تشفی، کسی ایجاد یا انکشاف کی مسرت اور اُس کام کی معنویت کی شکل میں حاصل ہوتا ہے اور یہی انعام اسے اور زیادہ محنت اور زیادہ کام پر اکساتا ہے۔ سائنس داں اور انجینئر کی نگاہیں گھڑی کی رفتار سے بے نیاز ہوتی ہیں۔

امریکہ کی قسمت بڑی حد تک مستقبل کے سائنس دانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس وقت ملک کی آبادی ۱۸ کروڑ ہے جو ۲۰۰۰ء تک دوگنی ہو جائے گی۔ تمہارے نسل کے اکثر لوگ وہ دن دیکھیں گے۔ اب غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اس مزید ۱۸ کروڑ کی آبادی کی ضرورتوں کو کیسے پورا کیا جائے اس صدی کے آخیر تک بجلی کی طاقت آج کے مقابلے میں دس گنا بڑھانا پڑے گی۔ ایٹمی توانائی کے طفلِ شیرخوار کو تنومند جوان بنانا ہوگا۔ سورج سے خارج ہونے والی توانائی پر قدرت حاصل کرنے کے مختلف امکانات پر غور کرنا ہوگا۔ طبقات الارض کے ماہرین کو معدنیات کی دریافت کے ایسے نئے ڈھنگ اختیار کرنے ہوں گے جن کی مدد سے معدنیات کی گھٹتی ہوئی مقدار اور بڑھتی ہوئی مانگ کے توازن کو قائم رکھا جا سکے۔ طبی معاملات میں بھی نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے جن کے علاج کے طریقے تلاش کرنے ہوں گے۔ صحتِ عامہ، دماغی امراض، عمر رسیدہ لوگوں کی دیکھ بھال اور ایسے ہی بیسیوں دوسرے مسائل نئے حالات کے تحت پیدا ہوں گے۔ پھر صنعتوں کو ایسی ایجادات اور ایسے سامانوں کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جن سے چند سال قبل تک لوگ واقف نہ تھے۔ سن ۲۰۰۰ء کے کارخانے ایسے سامان تیار کریں گے جو تمہاری اور تمہاری نسل کے لوگوں کی اختراع ہوں گی اور جن کا تصور بھی اب تک ہمارے ذہنوں میں نہیں آیا ہے۔

اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جدید سائنس کے سامنے بڑے بڑے تقاضے چیلنج بن کر آنے والے ہیں نئی نئی دریافتیں اور نوعِ انسانی کی بہبودی کے نئے طریقے اُفقِ آسمانی کی بہ نسبت ہم سے زیادہ قریب آ رہے ہیں۔ تمہاری محنت اور کوشش سے وہ نئی اشیاء ظہور میں آئیں گی جن کی بدولت انسان کی صحت بہتر اور پیداوار میں فراوانی ہوگی۔

ایسی صورت میں سائنس کے دلچسپ ہونے یا نہ ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یہ پیشہ تو دلچسپ ہونے سے کہیں زیادہ ولولہ انگیز بن جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا پیشہ ویسا ہی ہو گیا ہے جیسے کہ کسی نامعلوم ملک کو دریافت کرنے کی مہم یا کسی انجانے سمندر پر سے جہاز گزارنے کا تجربہ ہو۔ لیکن سائنس کی کسی نئی دریافت میں جو انبساط اور کارکردگی کا فخر محسوس ہوتا ہے اس کی مثال نہیں ملے گی۔

نئی دنیا کی دریافت اب ہوگی

بلاشبہ ہم کولمبس، بالبوا اور میگیلن کے کارنامے کی قدر کرتے ہیں مگر ذرا گہرائی میں جا کر اُن کی "دریافت" کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان بہادروں نے کچھ نئی زمینیں ضرور دریافت کیں لیکن یہ ویسی ہی تھیں جیسی دوسری زمینیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح سمندری پانی کی کچھ نئی سطحیں بھی معلوم ہوئیں لیکن یہ ویسی ہی تھیں جیسی کہ اور سطحیں ہوتی ہیں۔ دوسری بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ان کے بارے میں کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ بہادر پہلے انسان تھے جنہوں نے یہ ملک دریافت کیے کیونکہ وہاں تو پہلے سے آبادی موجود تھی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سائنس کی دریافت دوسری قسم کی ہوتی ہے۔ سائنس کی نئی دریافت واقعی نئی ہوتی ہے۔ انجینئر یا موجد پہلا انسان ہوتا ہے جو اس دریافت کو استعمال میں لاتا ہے۔ ایڈیسن نے بجلی کی دریافت کام میں لا کر روشنی کا بلب بنایا جو اب دنیا کے مختلف گوشوں کی ظلمت کو نور میں تبدیل کر رہا ہے۔ اور اب سائنس اور ٹیکنالوجی کے امتزاج سے چاند اور ستاروں کی مہم سر کی جا رہی ہے جس میں کامیاب ہو جانے کے بعد انسان واقعی "نئی زمین" دریافت کرنے کا دعویٰ کر سکے گا۔

یہ درست ہے کہ ہم لوگ ایسے سماج میں سانس لے رہے ہیں جس میں زر کی بڑی اہمیت ہے اس پر بھی میرا اعتقاد ہے کہ ہر انسان میں نفسیاتی ضرورت کا ایک ایسا پہلو (؟) یقیناً ہوتا ہے جس کے ماتحت وہ آمدنی سے قطع نظر کر کے، اپنے کام اور اس کے نتیجوں سے طمانیتِ قلب محسوس کرتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ سماج کی ترقی کا دارومدار جس حد تک سائنس دانوں کی جماعت پر ہوتا ہے کسی دوسرے گروہ پر نہیں ہوتا۔

اب جغرافیائی دریافت سے ہٹ کر زمانہ خلا کی دریافت کی طرف جا رہا ہے۔ تم اس عظیم الشان مہم میں شریک ہو سکتے ہو۔

تمہارا مخلص

گلین سی بورگ

غزل

آل احمد سرور

خرد کے قافلے خلوت گہِ دل تک نہیں آتے
بھٹکتے ہیں مسافر اپنی منزل تک نہیں آتے

لہو سے جو لکھے جاتے ہیں نوکِ خارِ صحرا پر
وہ افسانے کبھی بزمِ عنادل تک نہیں آتے

انہیں اپنی ہوس کی داستانوں سے کہاں فرصت
وفا کے تذکرے یاروں کی محفل تک نہیں آتے

خس و خاشاک کی بیداد حد سے بڑھ گئی یارب
شرارے کس لئے شعلوں کی منزل تک نہیں آتے

سرورؔ آدابِ مستی کی توقع اُن سے کیا کیجے!
کہ رندوں کو ابھی آدابِ محفل تک نہیں آتے

غزل

جمیل مظہری

کرشمے راہ میں ہیں اپنی منزل تک نہیں آتے
مری آنکھوں تک آتے ہیں مرے دل تک نہیں آتے

بیاباں میں بگولوں کے یہ پیچھے دوڑنے والے
جرس ان کو پکارے بھی تو محمل تک نہیں آتے

سوال ایسے بھی ہیں اے نازِ تمکیں ٹوٹنے والے
لبِ سائل تو کیا جو چشمِ سائل تک نہیں آتے

جمیلؔ اک عمر سے دریا کی لہریں گن رہے ہو تم
گلہ ہے اُن سفینوں کو جو ساحل تک نہیں آتے

عبدالرزاق قریشی

سیّد صاحب کی یاد میں

فروری ۱۹۳۱ء میں ایک دن یہ اعلان نظر سے گذرا کہ علامہ سید سلیمان ندوی بمبئی میں عربوں کی جہاز رانی پر چار تقریریں کریں گے۔ یہ تقریریں انجمن اسلام ہال میں مغرب کی نماز کے بعد ہوا کرتی تھیں۔ تقریباً دو ڈھائی سو آدمیوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ اور سید صاحب کی آواز بھی ذرا دھیمی تھی لیکن سکون و سکوت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص ان کی تقریر سن سکتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے علامہ سید سلیمان ندوی کو دیکھا۔ یہی وہ تقریریں ہیں جو آگے چل کر "عربوں کی جہاز رانی" کے نام سے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن (بمبئی) کی طرف سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔

سید صاحب سے ملنے کا شرف مجھے ۱۹۳۹ء میں پٹنے میں حاصل ہوا۔ اب میں کچھ لکھنے لکھانے لگا تھا۔ میرا ایک چھوٹا سا مضمون اُن کے ذہن میں رہ گیا تھا، اس کا ذکر کرکے اُنہوں نے میری ہمت افزائی کی۔ چند دنوں بعد میں پٹنے سے دیسنہ گیا۔ وہاں بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی۔ دیسنہ سید صاحب کا آبائی وطن تھا۔ اُن کی ولادت، پرورش اور ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی تھی۔

تعلیم کے ابتدائی مراحل دیسنہ اور پھلواری شریف میں طے کرنے کے بعد سید صاحب ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی نے دارالعلوم کے ناظم تعلیم کی حیثیت سے لکھنؤ میں قیام فرمایا۔ وہ اپنے وقت کا کافی حصہ مدرسہ کی نگرانی اور ہونہار طلبہ کی تربیت میں صرف کرنے لگے۔ اُنہوں نے ذہین اور باذوق طلبا کا خصوصیت سے انتخاب کیا۔ سید صاحب، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، سید ظہور الحسن شوق نیموی اور چند جوہر قابل اُن کے مخصوص شاگردوں میں تھے لیکن ان میں سرفہرست سید صاحب کا نام تھا۔

مولانا شبلی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دارالمصنّفین کے قیام کی اسکیم بنائی تھی۔ تاکہ نئے مصنفین کی تربیت کی جاسکے اور ساتھ ہی اسلامی علوم و فنون پر اُردو میں معیاری اور مستند کتابیں تصنیف ہوسکیں۔ کیونکہ ان کی اُردو میں بڑی کمی تھی لیکن ابھی یہ تجویز عمل میں نہ آسکی تھی کہ مولانا نے وفات پائی۔ سید صاحب اُس وقت دکن کالج (پونا) میں عربی و فارسی کے لکچرر تھے۔ اُنہوں نے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور استاد کی اسکیم کو عملی شکل دی یعنی ۱۹۱۵ء میں شہر اعظم گڈھ میں دارالمصنّفین کی بنیاد ڈالی اور پھر اپنی ساری زندگی اسی علمی خانقاہ میں گذار دی جب اُنہوں نے علمی دنیا میں بلند مقام حاصل کرلیا اور اُن کی شہرت کے بال و پر نکلے تو پنجاب یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ریاست حیدرآباد سے اُنہیں بلاوے آنے لگے اور بڑی بڑی تنخواہوں کی ترغیب دی گئی لیکن اُنہوں نے اس خانقاہ کو نہ چھوڑا۔ ایثار و قربانی کی ایسی مثال موجودہ عہد میں کم از کم مسلمانوں میں بہت کم ملے گی۔

دارالمصنّفین سے سید صاحب کا تعلق اتنا گہرا اور پائیدار تھا کہ وہ اور دارالمصنّفین لازم و ملزوم ہوگئے تھے سید صاحب کا نام زبان پر آتے ہی دارالمصنّفین کا تصور ذہن میں خود بخود آجاتا اور دارالمصنّفین کے ذکر کے ساتھ سید صاحب کی شخصیت سامنے آجاتی۔ آخر زندگی میں حالات نے انہیں ترکِ تعلق پر مجبور کردیا تھا لیکن یہ ...... روحانی تعلق اس وقت تک قائم رہا جب تک اُن کے دم میں دم رہا۔

سید صاحب ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جو قدیم تہذیب کا پروردہ تھا۔ ان کی تعلیم مکتب کی چٹائی پر ہوئی تھی، کالج کے شاندار ایوان میں نہیں۔ وضع قطع طور طریق ہر لحاظ سے وہ "مولوی" نظر آتے تھے لیکن کچھ تو مولانا شبلی جیسے وسیع النظر اور جدت پسند استاد کی تربیت نے اور کچھ خود اُن کی سلامتِ طبع نے اُن کی "مولویت" کو اس طرح ختم کیا کہ زہدِ خشک اور تعصب جاتا رہا مگر مذہبیت اپنی جگہ قائم رہی۔ وہ تمام عمر اسلامی تہذیب و تمدن کے پرستار رہے لیکن کبھی کسی تہذیب کا مضحکہ نہیں اُڑایا۔ اُنہوں نے ساری عمر مذہب اسلام اور اس کے متعلقہ امور پر کتابیں تصنیف کیں اور مضامین لکھے مگر کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی صرف ایک بار وہ جذبات سے مغلوب ہوگئے تھے اور ان کے قلم نے لغزش کی تھی۔ نیاز فتحپوری کا جواب دیتے ہوئے وہ ذاتیات پر اتر آئے تھے۔ اس استثنائی مثال کے علاوہ اُن کا قلم ہمیشہ نرم رو اور سبک خرام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف ہر نقطۂ خیال کے سنجیدہ طبقہ میں مقبول ہوئیں اور ان سے اختلاف رکھنے والے بھی اُن کا احترام کرنے پر مجبور ہوئے۔

سید صاحب نہایت متین و متحمل مزاج تھے باتیں کم کرتے تھے لیکن ان کی خاموشی یا کم گوئی سے نخوت و کبر کا قطعی اظہار نہیں ہوتا تھا۔ ان کے چہرہ سے متانت و تمکنت کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی شگفتگی تھی جو محبت و خلوص کا پتہ دیتی تھی۔ یہاں مولانا کی محبت و شفقت اور ہمدردی و دلسوزی کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ میرے محترم استاد و کرم فرما جناب چودھری غلام صاحب شہاب مالیر کوٹلوی کی زندگی عقیدہ کے لحاظ سے بڑی ہنگامی رہی ہے۔ موصوف نے ایک اسلامی گھرانے میں آنکھیں کھولیں لیکن طبیعت کی بے چینی نے اُنہیں قادیانیت پہنچا دیا جب سے بیزاری نے پلٹا کھایا تو بہائیت، بابیت وغیرہ کے دروازے کھٹکھٹائے مگر قلب کو سکون کہیں نہ ملا انتہائی یاس میں اُن پر دہریت کا غلبہ طاری ہوا لیکن اسلام کی آغوش

ہوسٹیمر [illegible] کی طرف سے اور پہلا [illegible] شائع ہوئے تجلی کے ساتھ۔ جو مضمون سنا رہے خاص طور پر اس کی داد دی ان میں مولانا شبلی اور سید صاحب مرحوم بھی تھے ایک بار سید صاحب کسی ضرورت سے پٹنہ گئے وہاں سے پھلواری شریف پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی سے ملنے گئے۔ نجیب صاحب نے جن خاص خاص لوگوں کو سید صاحب کے آنے کی اطلاع دی تھی ان میں مولانا شہاب بھی تھے۔ سید صاحب نے تھوڑی سے تکلف کر لوگوں سے مصافحہ کرنا شروع کیا جب شہاب صاحب کے قریب پہنچے تو ہم سب نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ شہاب صاحب نے بڑی تیزی کے ساتھ سید صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا اور انہیں سینے سے کھینچ کر ذرا سے سینے پر رکھے اور رونے لگے۔ سید صاحب نے جیب سے رومال نکالا اُن کے آنسو پونچھے اور کچھ کہا۔ جب شہاب صاحب کو ذرا سکون ہوا تو چہرے سے لگایا۔ شہاب صاحب نے مجھے بعد میں بتایا کہ میں مولانا سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کی اور آپ کے استاد کی تصنیفات نے مجھے گمراہی کے گڑھے سے نکالا، کہ مجھ پر رقت طاری ہوگئی۔ سید صاحب نے انتہائی شفقت کے ساتھ میرے آنسو پونچھے اور بڑے ہمدردانہ انداز میں مجھے سمجھایا کہ جو کچھ ہوا اس کا خیال نہ کیجئے اصل چیز تو انجام ہے۔

سید صاحب کی زندگی کتنی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے سید صاحب کو بالکل قریب سے دیکھا ہے۔ اُن کا لباس بہت سادہ مگر بے حد صاف ہوتا تھا، کھادی کا سفید کرتہ، سفید پاجامہ مشرقی رنگ کی شیروانی۔ جاڑوں میں گرم شیروانی یا بند کوٹ عموماً خاکستری رنگ کا پہنتے تھے۔ عمامہ سفید یا شربتی رنگ کا ہوتا تھا اور بہت عمدگی سے باندھتے تھے۔ گھر پر ہوتے تو سفید دوپلی ٹوپی ہوتی۔ ننگے سر کبھی نہ بیٹھتے۔ سفر پر جاتے تو بستر نہایت صاف ہوتا۔ کھانا کم بلکہ بہت کم کھاتے تھے مگر اچھا اور لذیذ کھاتے تھے۔ باتیں دھیمی آواز میں کرتے۔ یہ عادت اُن میں ابتدا ہی سے تھی۔ ماہر القادری کے ایک ہم درس مولانا عبد الباری ندوی کا بیان ہے کہ ۔۔۔
۔۔۔۔ "اگر کوئی ہم سبق کبھی سختی سے گفتگو کرتا تو اس کا جواب نرم الفاظ میں مسکرا کر یا خاموش ہو جاتے۔ لہجہ سخت نہ ہوتا"

وہ بحث سے گریز کرتے معترضین کی بات کو ضبط و تحمل سے برداشت کرتے اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیتے اور اس کے اعلان میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے بارہا معارف کے شذرات میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ ان کے اس رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ اعتراض کرنے والے خود شرمندہ ہوتے۔ دہلی کے امداد صابری صاحب نے جوشِ جوانی میں آکر ایک کتاب لکھی۔ "سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" اور اس کا نسخہ بدست خود سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ سید صاحب انسان تھے فرشتہ نہ تھے انہیں شک ہوا کہ اس مصنف کے پس پردہ مولانا اسلم جیراجپوری ہیں انہوں نے معارف کے شذرات میں لکھ دیا کہ اس کتاب کے مصنف پس پردہ کوئی اور ہے۔ امداد صابری صاحب نے سید صاحب پر ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا۔ مقدمہ کی پیشی سے دو ایک روز قبل سید صاحب دہلی پہنچے۔ جناب ملک رام کی کوشش اور نواب تاج الدین خاں سائل کے بیچ بچاؤ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد امداد صابری صاحب حج سے مشرف ہونے کے لئے مکہ جاتے ہوئے بمبئی تشریف لائے تو انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی آئے۔ اتفاق سے اس واقعہ کا ذکر آیا تو بڑی شرمندگی ظاہر کی، کہنے لگے۔ "جوانی کا جنون تھا" اور پھر سید صاحب کی ذات سے بڑی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔

سید صاحب ہر قسم کا اعتراض سن لیتے تھے، ہر قسم کی نکتہ چینی برداشت کر لیتے تھے لیکن اگر کوئی شخص رسول پاک صلعم پر اعتراض کرتا تو اُن سے ضبط نہ ہو سکتا تھا، چہرہ غصہ سے سرخ ہو جاتا مگر اس حالت میں بھی کوئی ناشائستہ کلمہ اُن کی زبان سے نہ نکلتا۔ رسول پاک صلعم سے محبت و شیفتگی، سید صاحب کی تمام تحریروں سے ظاہر ہے۔ سید صاحب کو اپنی تمام کتابوں میں خطبات مدراس سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان خطبات میں سید صاحب نے رسول پاک صلعم کے قدموں میں اپنی عقیدت ارادت کے پھول ڈالے ہیں۔ خطبات مدراس حقیقت یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کا نچوڑ اور سید صاحب کی عمر بھر کی علمی کاوشوں کا حاصل ہے۔

سید صاحب نجی محفلوں میں علمی و ادبی گفتگو کر کے معترضین کو مرعوب کرنے کی کوشش کبھی نہ کرتے۔ نوجوانوں کے سامنے خصوصاً وہ کم بولتے۔ انہیں بولنے کا موقع دیتے۔ کبھی کبھی ان سے کوئی علمی سوال کر بیٹھتے کہ وہ کچھ بولیں۔ ان کی خواہش ہوتی کہ نوجوان کسی اہم مسئلہ پر اپنی رائے ظاہر کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ نوجوان طلبہ کو علمی و ادبی طور پر ابھرتا دیکھ کر خوش ہوتے۔ میرے بعض احباب نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ سید صاحب کی زبان سے حوصلہ شکن الفاظ نہیں سنے گئے۔

سید صاحب نے تصنیف و تالیف کے علاوہ بہت سے نوجوانوں کی علمی تربیت بھی کی اور انہیں علمی دنیا سے روشناس کرایا۔ مولانا ابو الجلال ندوی، مولانا سید ابو ظفر ندوی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، پروفیسر محمد عزیز، سید صباح الدین عبد الرحمن ان کے تربیت کئے ہوئے لوگوں میں سے چند نام ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا عبد السلام ندوی بھی اُن کی مدد اور رہنمائی کے بغیر وہ نہ ہوتے جو وہ ہوئے۔ ان کی تربیت کا سب سے بڑا اور زندہ ثبوت یہ ہے کہ دار المصنفین آج بھی اسی انداز سے چل رہا ہے جس انداز سے اُن کے دور میں چلتا تھا اور اس کی تصانیف کے معیار میں کوئی پستی نہیں آئی ہے یہ محض ان کے علم و فضل کا کمال نہیں بلکہ اس میں ان کی محبت و شفقت اور ہمدردی و دلسوزی کو بھی دخل ہے۔

سید صاحب نے کسی جماعت یا شخص کا ساتھ محض جماعت یا شخص کی خاطر نہیں دیا بلکہ ہمیشہ اس کے اصولوں کو پیش نظر رکھا۔ وہ سیاسی حیثیت سے ہمیشہ کانگریس کے ہمنوا رہے لیکن زبان کے معاملہ میں کانگریس نے جس بے اصولی اور تعصب کا مظاہرہ کیا اس کی انہوں نے کھلم کھلا مخالفت و مذمت کی۔ آزادی کے بعد بعض فرقہ پرستوں نے اسلامی تہذیب پر نازیبا حملے کئے۔ سید صاحب نے معارف میں اُن کے خلاف آواز اٹھائی۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم سے اُن کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب اُن کے بڑے نیاز مند تھے۔

انہیں خطوط میں "استاذی" کے القاب سے یاد کرتے تھے لیکن جب انہی "مخلص نیازمند" ڈاکٹر اقبال نے ایک قطعہ میں مولانا حسین احمد مدنی پر حملہ کیا تو سید صاحب نے مولانا کی حمایت میں "مدینہ" بجنور میں ایک نہایت زوردار مضمون لکھا۔ مولوی عبدالحق ان کے استاد مولانا شبلی پر اکثر چوٹ کیا کرتے تھے۔ حافظ محمود خاں شیرانی سے شعرالعجم پر تنقید لکھوائی۔ تنقید بری چیز نہیں۔ یہاں بحث تنقید اور نقاد سے نہیں بلکہ تنقید نگار کے محرک کی نیت سے ہے۔ سید صاحب نے ایک سعادت مند شاگرد کی حیثیت سے مولوی صاحب کے نشتروں کی کھٹک کو ہمیشہ شدت سے محسوس کیا اور کبھی کبھی ان پر نشتر بھی چلائے لیکن ان کے فضل و کمال اور ان کی خدمات سے کبھی انکار نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ان کا اعتراف کیا۔ یہاں میں سید صاحب کے ایک خاص شذرہ کا ذکر کرتا چلوں، دسمبر ۱۹۲۲ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کا جلسہ تقسیم اسناد ہوا تھا۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی آنریری ڈگری دی گئی تھی۔ یہ آنریری ڈگری ایک ایسے بیرسٹر کو دی گئی تھی جو اتفاق سے اس وقت وزیر تعلیم تھا۔ سید صاحب نے جنوری ۱۹۲۳ء کے معارف کے شذرات میں یونیورسٹی کی اس کمزوری کی طرف اشارہ کیا اور لکھا کہ:

"علی گڑھ کے حلقۂ علم اور ادارۂ تعلیم میں اگر کوئی موزوں تر اس خطاب کے لئے ہو سکتا تھا تو وہ علمی حیثیت سے مولوی عبدالحق (ناظم انجمن ترقی اردو) تھے اور تعلیمی کوششوں کے لحاظ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔"

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ابھی مولوی عبدالحق، بابائے اردو نہیں ہوئے تھے۔ بابائے اردو تو وہ اس تحریر کے تقریباً پندرہ سال بعد ہوئے۔

سید صاحب کو دیکھ کر قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ کیسی نورانی شکل، کتنا مشفقانہ انداز گفتگو، کتنی ہمدردانہ تلقین، کیسا وقار و متانت، کیسا انکسار و فروتنی! اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے سید صاحب کو بچشم خود دیکھا ہے اور ان کی تھوڑی بہت صحبت اٹھائی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں انجمن اسلام ہال میں جمیعۃ العلمائے ہند کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اتفاق سے سید صاحب اس زمانے میں بمبئی میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دن جلسہ میں آئے۔ میں ہال کے باہر دروازے کے قریب کھڑا تھا اور بھی دو ایک دوست کھڑے تھے۔ سید صاحب ہال میں داخل ہوئے اور سب سے آخری صف میں جو دروازے کے پاس تھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ ورنہ میں نے بارہا دیکھا ہے جنہیں ذرا اعزاز حاصل ہوتا ہے وہ اگلی ہی صف میں جا کر بیٹھتے ہیں۔

سید صاحب کے مزاج میں طبعاً سنجیدگی اور متانت تھی۔ علمی افکار و مشاغل نے اس رنگ کو اور گہرا کر دیا تھا۔ جس طرح ان کی تحریروں میں وقار و تمکنت اور سنجیدگی و توازن پایا جاتا ہے اسی طرح ان کی تقریر بھی سنجیدہ ہوا کرتی تھی وہ مجلس کو شگفتہ رکھنے کے قائل نہ تھے۔ لیکن چونکہ ان کی ہر بات غور و فکر کا نتیجہ ہوتی تھی، سننے والے اس پر غور و فکر کرنے پر مجبور ہوتے تھے اور چونکہ دل سے نکلتی تھی، دل پر اثر کرتی تھی مگر نجی صحبتوں میں اور خصوصاً بے تکلف دوستوں میں وہ خوب مذاق کرتے اور جملے کستے تھے۔ مثلاً ایک بار وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جانا چاہتے تھے۔ ایک بے تکلف دوست گھوڑے کی پشت کے پاس کھڑے تھے سید صاحب نے کہا "مولانا دیکھئے گھوڑا دم نہ مار دے"۔

ڈاڑھی یا ڈاڑھی کا مقبرہ

سید صاحب کے ایک عزیز ندوہ کے ڈگری سند یافتہ سید صاحب ہی کی سفارش سے بمبئی میں لکچرر مقرر ہوئے گھر کا ماحول، ندوہ کی تعلیم و تربیت، اس لئے وضع قطع سب ایسی ہی تھی جیسی ایک فاضلِ ندوہ کی ہو سکتی ہے لیکن بمبئی اور کالج نے اثر کر کے چھوڑا۔ لباس تو عمر بھر نہیں بدلا مگر ڈاڑھی نئی اور شیروانی کی تخفیف کا احسان ہونے لگی۔ متقطع ڈاڑھی، رفتہ رفتہ فرنچ کٹ میں تبدیل ہو گئی، پھر اس کی بھی قطع و برید ختم ہو گئی۔ اور آخر ٹھوڑی پر ایک گول سا سیاہ نشان رہ گیا۔ سید صاحب نے یہ دیکھا تو کہا۔ "یہ ڈاڑھی ہے یا ڈاڑھی کا مقبرہ؟"

ایک بار مرحوم خواجہ حسن نظامی کسی جلسے کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لا رہے تھے۔ تعلقات کی بنا پر استاذی پروفیسر نجیب اشرف ندوی کو تار کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ تار میں لکھا تھا کہ فلاں دن بمبئی پہنچ رہا ہوں اور قیام فلاں صاحب کے ہاں ہوگا۔ اتفاق سے سید صاحب مرحوم ان دنوں بمبئی میں موجود تھے۔ شام کو میں خدمت میں حاضر ہوا تو وہ تار سید صاحب کے سامنے ایک تپائی پر رکھا تھا۔ سید صاحب نے اسے میری طرف بڑھایا اور کہا کہ یہ تار پڑھو اور مفہوم بتاؤ۔ میں نے تار پڑھ کر اس کا ترجمہ کیا تو فرمایا میں ترجمہ کرنے کو نہیں کہہ رہا ہوں میں تو کہتا ہوں کہ اس کا مفہوم سمجھاؤ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ سید صاحب کا مقصد کیا ہے۔ صورت سوال بن گیا۔ سید صاحب نے مسکرا کر کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں دن بمبئی پہنچ رہا ہوں۔ تم استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود رہو اور میں فلاں صاحب کے ہاں ٹھہروں گا، یعنی تمہیں مجھ سے قیام و طعام کی زحمت نہیں اٹھانا پڑے گی۔

سید صاحب نے اپنی تصنیفات میں تو نہیں لیکن معارف کے شذرات میں طنز کے نشتر چلائے ہیں۔ جہاں وہ تہذیب اسلامی سے گری ہوئی کوئی بات دیکھتے تو بڑے تیز نشتر چلاتے مگر گفتگو میں انہوں نے کبھی طنز نہیں کیا، نہ کسی جماعت پر نہ کسی فرد پر۔ ہاں تقریروں میں کبھی کبھی خوب طنز کرتے تھے۔ میرے ایک شناسا (مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم) نے بتایا کہ ایک بار مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں سید صاحب کی تقریر تھی انہوں نے جدید تعلیم یا تہذیب پر اس شدت کے ساتھ طنز کی کہ پروفیسر صاحبان جو ہال میں موجود تھے اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور ایک ایک کر کے کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل آئے۔ تقریر ختم ہوئی تو صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر عابد حسین ہال میں موجود تھے۔

○

صوفیہ — صوفیہ — صوفیہ —

سانچے میں صوفیہ ہی صوفیہ باقی تھی — وہ تھی ہی ایسی پری — تھی تو انسان مگر خدا نے اُسے ایسے بے پناہ اور انوکھے حُسن سے نوازدیا تھا کہ اس پر کسی غیر فانی مخلوق کا گمان گزرتا تھا — جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو قیامتیں ٹوٹ پڑیں — ویسے تو کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ ہر لڑکی سولہ سال کی عمر میں قیامت کو دعوت دیتی معلوم ہوتی ہے، مگر صوفیہ کی بات ہی اور تھی — اور سب سے خطرناک بات یہ کہ صوفیہ قطعاً لاعلم تھی کہ وہ آخر ہے کیا شے — اُس پر اپنی بے پناہ خوبصورتی کا راز تو اس وقت کھلا جب ایک دن وہ اپنی سہیلی کے ساتھ اسکول سے واپس آرہی تھی کہ نور سے ایک خوبصورت کار پاس سے گرد کے بادل اُڑاتی نکل گئی۔ کار میں ایک بدصورت سی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

اُس کی سہیلی زور سے ہنسی —

"صوفیہ تم نے یہ کار دیکھی؟"

"ہاں دیکھی — تب؟"

"اور اُس میں بیٹھی ہوئی جو خاتون تھیں اُنہیں دیکھا —"

"ہاں دیکھا — تب؟"

"بھلا وہ اس کار میں بیٹھنے لائق تھی — خدا کی قسم کار میں بیٹھنے لائق تو بس تم ہو — اس شاندار سواری میں بیٹھی تم کسی ملکہ سے کم کیا لگوگی — میرا بس چلے تو کاروں میں کسی بدصورت کو نہ بیٹھنے دوں۔ یہ سواری تو بڑی خوبصورت شے ہے اور اس میں بس حسینوں کو ہی بیٹھنا چاہئے۔ جیسی کہ تم ہو"۔

صوفیہ نے بڑے اچنبھے سے ساری بات سنی۔ اس کا دماغ جیسے سنّا اُٹھا —

"بھلا یہ کار ملتی کتنے کی ہوگی — ؟"

سہیلی بڑی حقارت سے ہنسی۔

"ابا ایک موٹر گیرج میں کام کرتے ہیں۔ انہیں سب بھاؤ تاؤ معلوم رہتا ہے۔ نئی گاڑی ہو تو تیس چالیس ہزار میں آتی ہے۔ ذرا پرانی ہو تو بیس پندرہ میں اور ذرا گھسی گھسائی ہو تو دس ہزار تک مل جاتی ہے" وہ ہنسی۔ "یہ گاڑیوں کا سارا معاملہ روپیہ کا سا ہے نا۔"

"باپ رے — دس ہزار!" صوفیہ آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ پھر جیسے خواب میں بڑبڑائی — "میں کیسے بیاہ کروں گی۔ پاپا جی کی تنخواہ تو کُل ڈیڑھ سو روپیہ ہے"۔

سہیلی ہنسی اور ہنس کر چپ رہ گئی۔ اور یوں یہ موضوع ختم ہوگیا۔ مگر پھر بھی جب صوفیہ نے آئینہ دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔ باپ رے — کیا سچ مچ وہ اتنی حسین تھی۔ پھر اس کی نظروں میں وہ کار گھوم گئی جو زن سے اُس کے پاس سے نکل گئی تھی — سلور گرے کلر کی وہ شاندار کار — سچ مچ صوفیہ تھی بھی اسی لائق کہ ایسی چمکیلی کار میں بیٹھ کر سیریں کیا کرتی۔

بڑا غضب تو اس وقت ہوا جب صوفیہ بیاہ کر سسرال آئی۔ شادی کی وہ پہلی رات — جب ارمان بھرے دولھا دل وجان — ایمان، تن، من دھن سب کچھ نثار کرنے — سب کچھ کر گزرنے کا وعدہ کرتے ہیں — مگر کم بخت کرتے کراتے کچھ نہیں۔ بس دل میں پھانس چھوڑ دیتے ہیں کہ — "تم — تم تو آسمان کا چاند ہو۔ میرے لائق کہاں تھیں — لیکن میرے نصیب دیکھو کہ خدا نے یہ چاند میری جھولی میں ڈال دیا۔ تم تو ایسی ہو کہ کسی کار والے سے بیاہی جاتیں — دو سو روپے پانے والے سے تم کیا خوشیاں سمیٹ سکوگی"۔

صوفیہ کا شوہر بڑی چاہت اور لگن سے کہتا گیا اور صوفیہ کان بنی سنتی رہی — پھر اُس نے بے حد محبت سے اُس کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں تھام لیا۔

"تم اس قدر خوبصورت ہو جان — کہ — کہ ....." اس کا حلق سوکھنے لگا۔ آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ صوفیہ نے اپنے مہندی بھرے پاؤں سکوڑے۔

"یہ پاؤں —" وہ گیلی گیلی آواز میں بولا۔ خدا کی قسم یہ پاؤں زمین پر دھرنے کے لئے نہیں ہیں۔ اتنے خوبصورت پاؤں والی کو تو بیٹھنے کے لئے کار ہونی چاہئے"۔

صوفیہ کا دم گھٹنے لگا — کار — کار — کار — اُس کا رُواں رُواں کار کار پکارنے لگا۔

صوفیہ کا شوہر کسی انگریز کرنل کے ہاں شوفر تھا — تنخواہ اور آنے جانے والوں کی ٹپ مل ملا کر دو سو پڑ جاتے۔ دل کا بڑا نرم تھا انگریز۔ اسی نرمی اور مروّت مروّت میں اُس کا دل اپنی ہندوستانی باورچن پر آگیا تھا جو بعد میں اُس کی میم صاحب بنی۔ صوفیہ کے شوہر نے ایک دن بڑے پیار سے کہا۔

"صوفیہ جان! اتنی لمبی خوبصورت کار میں وہ بدصورت باورچن ذرا تو نہیں سجتی — اس گاڑی میں تو بس تم ہوتیں —"

اور ایک دن خالی وقت میں وہ کار لے کر گھر پر آگیا۔ صوفیہ کو اس

مسٹر اے بی۔ تقیہ پرنٹر اور پبلشر نے ادبی پرنٹنگ پریس اور اجمل پریس میں چھپوا کر
پرنس بلڈنگ۔ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۔ ۳ سے شائع کیا ملکیہ: دور حاضر پبلیکیشنز

ہاسپٹل میں اُس کا کیورٹ ہوا۔ اتنا خون بہا کہ وہ پیلی پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اسے اینیمک قرار دیا اور کہا کہ وہ بے حساب پھل، دودھ، انڈے اور طاقتور غذائیں کھائے ورنہ صحت جواب دے جائے گی

وہ دل ہی دل میں ہنسی ـــــ ہونہہ ـــــ ایسی فضولیات پر پیسہ اُٹھائے؟ اتنے پیسے جمع ہو جائیں تو..؟!

اُس کے شوہر کو اس کے اباڈشن ہو جانے کا بے حد غم ہوا۔ وہ ایک بچے کے لئے ترس رہا تھا اور جب خدا نے یہ آرزو پوری ہونے کا دن کیا تو قسمت نے دغا دے دیا۔ وہ اس آس پر زندہ رہنے لگا کہ خدا دوسرا دے دیگا۔ مگر اس کے بعد تو اُس کی آس پوری ہوئی ہی نہیں۔ جانے اندرونی طور پر صوفیہ میں کیا کمزوری پیدا ہو گئی کہ سال پر سال گزرتے گئے مگر آنگن سونا کا سونا ہی رہا۔

صوفیہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی نہ اچھا پہنتی نہ اچھا کھاتی۔ اُس کا شوہر جو کچھ بھی کماتا تھا اتنا تو ضرور تھا کہ دو میاں بیوی مزے سے کھا پی سکیں۔ مگر گھر پر ایسی غربت اور نحوست چھائی رہتی کہ بس۔ جب بھی وہ اپنے کام سے لوٹتا دیکھتا کہ صوفیہ مشین پر جھکی ہوئی ہے۔ رات ہو جاتی تو وہ ایک مدھم چراغ جلا لیتی۔ مستقل سلائی کرنے سے اُس کی بینائی کمزور ہونے لگی۔ اور دیکھتے دیکھتے نزلے نے اپنی جڑیں گہری کر لیں۔ پہلے تو اکّے دکّے بال سفید ہونے لگے، پھر تو پورا سر چمکنے لگا۔ مگر اپنے آپ سے بے خبر صوفیہ پیسہ جمع کرنے کی دُھن میں لگی رہی۔

سولہ سال یوں ہی بیت گئے۔

ان سولہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ صوفیہ نے دن میں کئی کئی بار اپنی رقم کو نہ گِنا ہو۔ اور جب کبھی وہ رقم گنتی اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا۔ وہ سوچتی اب صرف چند دنوں کی محنت اور مصیبت باقی ہے۔ پھر تو میں کار میں بیٹھ سکوں گی۔ اُسے ہنسی آجاتی تھی۔ واقعی کرنل صاحب کی بدصورت باورچن میم صاحب اس لائق تھی کہ وہ کار میں گھومتی۔ اب لوگ دیکھیں گے کہ واقعی کار میں کیسی صورتیں سجتی ہیں۔ اُسے اپنے حسن پر کبھی ناز نہ ہوا تھا مگر اب کار کے بارے میں سوچ آتا تو اپنے حسن کا بے پناہ احساس اُسے مارے ڈالتا۔ بیٹھے بیٹھے وہ صرف یہ سوچتی رہتی کہ وہ پہلے پہل کس طرح کار میں بیٹھے گی۔ کون سی ساڑی پہنے گی۔ کیسا سنگھار کرے گی۔ اس کا دل خوشی اور فخر کے مارے اپنی جگہ چھوٹنے لگتا۔

اُس دن صوفیہ نے کمرے میں جا کر پوری رقم گنی۔ کئی نوٹ، کئی روپے، چلر، کاغذ کے نوٹ، تلنیے کے سکے۔ یہ وہ۔ ڈھیر تھا۔ اُس نے آخری نوٹ اُٹھایا۔ دس ہزار سے بھی چند روپے ادھر ہی ہو گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ کئی جگہوں سے سلائی کا بقایا آج یکمشت مل گیا تھا اور رقم پوری پوری ہو گئی تھی۔

وہ پھر گِنی کر اُس نے پھر گنے۔ پھر گنے۔ پھر اور۔ نوٹوں کو چلر کو، کاغذوں کو سکوں کو۔ کئی بار اُس نے اُٹھایا۔ چوما۔ دیکھا، رکھا۔ اُٹھایا چوما۔ وہ خوشی سے ناچتی ناچتی بالکل بچوں کے سے انداز میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ خود کو سُنا دینا چاہتی تھی کہ وہ بھی اب کار میں گھومے گی۔

آئینے سے بڑھ کر کون سچا ہوتا ہے۔ صوفیہ نے دیکھا، آئینے کے سامنے ایک بڑھیا کھڑی تھی۔ سفید کالے کھچڑی بال۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ چہرے پر جھریاں۔ دھنکا پچکا رنگ۔ سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں۔

"صوفیہ کہاں چلی گئی۔؟ صوفیہ کہاں چلی گئی!"

اُس بڑھیا کے حلق سے چیخ نکلی "صوفیہ کہاں چلی گئی!" پھر اُس نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ "کار میں بیٹھ کر سیر کو گئی ہے۔ نا؟"

قہقہے اونچے اونچے اور اونچے ہوتے گئے۔ آخر وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

اُس کا شوہر جب گھر آیا اور صوفیہ کو یوں بے ہوش پایا تو فوراً ڈاکٹر کو بلا لیا۔ کئی گھنٹے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے اُس کے شوہر کو سنایا۔

"کسی صدمے نے آپ کی مسز کو پاگل کر دیا ہے۔"

٭٭

نا محمد

نٹ گرم چھاتے

بے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اُس کے جسم پر اچھا خاصا گوشت تھا۔ وہ اُس جوان جسم کے ہر خطے سے واقف تھا۔

"ٹک مس شاہین۔ مجھے بے تحاشا نیند آرہی ہے۔"

"ڈارلنگ۔ سو جاؤ۔"

"تو میں نیند کی آغوش میں جا رہی ہوں۔"

"بصد شوق۔"

اُس نے بوٹ کے تسمے کھولے، پھر بوٹ سے پاؤں نکالے، جرابیں اُتاریں اور پلنگ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ ہاں وہ تین دن کے لئے گھوڑا گلی گیا تھا اپنی ڈارلنگ بیوی سے جھوٹ بول کر۔ ہاں وہ ایک کہانی پر بحث کرنے جا رہا تھا درآصل وہ ظلم کی کہانی نہ تھی بلکہ محبت کی کہانی کا آغاز کرنے جا رہا تھا۔ ایک افسانہ ختم ہو رہا تھا۔ دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ شبنم اُسے پسند تھی۔ نام تو لڑکی کا شبنم تھا مگر تھی وہ شعلہ۔ وہ اس شہر سے دُور بھاگنا چاہتے تھے تاکہ تین دن آرام اور سکون سے کٹ سکیں۔ تاکہ کوئی انسان اُن سے یہ نہ پوچھ سکے کہ میاں تم کیا کرتے ہو؟ کتنا کماتے ہو۔ تمہارے کتنے بچے ہیں۔ فلیٹ کا کرایہ دیا یا نہیں۔ ہاں قیامت آنے میں کتنی دیر ہے۔ ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں۔ تم کب مرو گے۔ وہ اپنی پیاری بیوی کو دُور رہ کر کتنا خوش تھا۔ تین دن تک وہ جھوٹ نہ بولے گا۔ دونوں نے گھوڑا گلی میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور ہوٹل سے کھانا، چائے، سگریٹ، شراب اور دیگر ضروریاتِ زندگی منگوا لیتے۔ یہ تین دن بڑے عجیب و غریب تھے۔ بڑے ہی نرم اور گرم، بڑے ہی دلنواز و دلکش۔ سیاسی اور اقتصادی اُلجھنوں سے دُور رہ کر، ہر لمحہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے۔ ایک دوسرے کی آغوش میں پھسلتے ہوئے۔ تین دن یوں گزر گئے جیسے ایک لمحہ گزرتا ہے۔

تین دنوں کے بعد پھر سے واپس آنا پڑا، پھر اُسی فلیٹ میں۔ اپنی پیاری بیوی کے پاس۔ وہی شور و غل۔ وہی بے ہنگم دنیا۔

"ڈارلنگ کیا ابھی تک تم سوئے نہیں۔"

"نو ڈارلنگ۔"

ہسپتال میں اُس کا کیوریٹ ہوا۔ اتنا خون بہا کہ وہ پیلی پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے اسے ایک قرار دیا اور کہا کہ وہ بے حساب پھل، دودھ، انڈے اور طاقتور غذائیں کھائے ورنہ صحت جواب دے جائے گی۔

وہ دل ہی دل میں ہنسی ـــ ہونہہ ـــ ایسی فضولیات پر پیسہ اُٹھائے؟ اتنے پیسے جمع ہو جائیں تو۔؟!

اُس کے شوہر کو اس کے اپاہج ہو جانے کا بہت غم ہوا۔ وہ ایک بچے کے لئے ترس رہا تھا۔ اور جب خدا نے یہ آرزو پوری ہونے کا دن دیا تو قسمت نے دھوکا دے دیا۔ وہ اس آس پر زندہ رہنے لگا کہ خدا دوسرا بچہ دے گا مگر اس کے بعد تو اُس کی آس پوری ہوئی ہی نہیں۔ جانے اندرونی طور پر صوفیہ میں کیا کمزوری پیدا ہو گئی کہ سال پر سال گزرتے گئے مگر آنگن سونا کا سونا ہی رہا۔

صوفیہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی نہ اچھا پہنتی نہ اچھا کھاتی۔ اُس کا شوہر جو کچھ بھی کماتا تھا اتنا تو ضرور تھا کہ دو میاں بیوی مزے سے کھا پی سکیں۔ مگر گھر پر ایسی غربت اور نحوست چھائی رہتی کہ بس۔ اور جب بھی وہ اپنے کام سے لوٹتا دیکھتا کہ صوفیہ مشین پر جھکی ہوئی ہے۔ رات ہو جاتی تو وہ ایک مدھم چراغ جلا لیتی۔ مسلسل سلائی کرنے سے اُس کی بینائی کمزور ہونے لگی۔ اور نیچے دیکھتے دیکھتے نزلے نے اپنی جڑیں گہری کر لیں۔ پہلے تو اکّے دکّے بال سفید ہونے لگے، پھر تو پورا سر چمکنے لگا۔ مگر اپنے آپ سے بے خبر صوفیہ پیسہ جمع کرنے کی دُھن میں لگی رہی۔

سولہ سال یوں ہی بیت گئے۔

ان سولہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ صوفیہ نے دن میں کئی کئی بار اپنی رقم کو نہ گنا ہو۔ اور جب کبھی وہ رقم گنتی اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھتا۔ وہ سوچتی اب صرف چند دنوں کی محنت اور مصیبت باقی ہے۔ پھر تو میں کار میں بیٹھ سکوں گی۔ اُسے ہنسی آ جاتی ــ واقعی کرنل صاحب کی بدصورت باورچی میم صاحب اس لائق تھی کہ وہ کار میں گھومتی ــ اب لوگ دیکھیں گے کہ واقعی کار میں کیسی صورتیں سجتی ہیں۔ اُسے اپنے حسن پر کبھی ناز نہ ہوا تھا مگر اب کار کے بارے میں سوچ آتا تو اپنے حُسن کا بے پناہ احساس اُسے مار ڈالتا۔ بیٹھے بیٹھے وہ صرف یہ سوچتی رہتی کہ وہ پہلے پہل کس طرح کار میں بیٹھے گی۔ کون سی ساڑی پہنے گی۔ کیسا سنگھار کرے گی۔ اس کا دل خوشی اور فخر کے مارے اپنی جگہ چھوٹنے لگتا۔

اُس دن صوفیہ نے کمرے میں جا کر پوری رقم گنی۔ کئی نوٹ، کئی روپے، چلّر، کاغذ کے نوٹ، تانبے کے سکّے۔ یہ وہ ڈھیر تھا۔ اُس نے آخری نوٹ اُٹھایا۔ دس ہزار سے بھی چند روپے ادھر ہی ہو گئے تھے۔ بات یہ تھی کہ کئی جگہوں سے سلائی کا بقایا آج یکمشت مل گیا تھا اور رقم پوری پوری ہو گئی تھی۔

وہ پھر گنی کہ اُس نے پھر گنے۔ پھر گنے۔ پھر اور۔ نوٹوں کو چلّر کو، کاغذوں کو سکّوں کو، کئی بار اُس نے اُٹھایا۔ چوما، دیکھا، رکھا۔ اُٹھایا چوما ــ وہ خوشی سے ناچتی ناچتی بالکل بچوں کے سے انداز میں آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ وہ خود کو شاباشی دینا چاہتی تھی

مہندرناتھ

ٹھنڈے ہونٹ گرم چائے

جوں ہی وہ اپنی پیاری بیوی کے پلنگ پر بیٹھا تو بیوی نے کروٹ لے کر بوسہ لیا۔

"تم آ گئے ڈارلنگ۔"

"ہاں ڈیر۔"

"کتنے بجے ہیں ڈارلنگ۔"

"صبح کے سات بجے۔"

"ابھی ہم دو گھنٹے اور سو سکتے ہیں۔"

"یس ڈارلنگ۔"

"ڈارلنگ کیا میرا بوسہ نہیں لوگے۔"

"ضرور ڈارلنگ، کھنڈالہ سے اسی کام کے لئے آیا ہوں۔"

"کیسی ہی ڈارلنگ، یو آر ونڈرفل۔ واقعی ونڈرفل ہیں۔"

اُس نے اپنی پیاری بیوی کا بوسہ لیا

"ڈارلنگ، یو ڈونٹ لَو می۔"

"کس کم بخت نے تمہیں یہ غلط اطلاع دی ہے۔"

"تمہارے ہونٹوں نے یہ پیغام دیا ہے۔"

"کیسے؟"

"تمہارے ہونٹ ٹھنڈے ہیں، برف کی طرح۔"

"ارے میں تمہیں یہ بتانا بھول ہی گیا کہ آج کتنی سردی ہے۔"

"جون کا مہینہ ہے ڈارلنگ۔ اور پنکھا فل سپیڈ پر چل رہا ہے تم تین دن کے بعد لوٹے ہو۔ کیا کہانی پر بحث ختم ہو گئی پیارے؟"

"ابھی نہیں میری جان۔"

"کتنے دن اور بحث ہوگی۔"

"بس چند ہفتے اور میری جان، فقط چند ہی روز۔"

اُس کی بیوی نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ مگر ہونٹ برابر ہل رہے تھے۔ بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ شب خوابی کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اُس کے جسم پر اچھا خاصا گوشت تھا۔ وہ اس جوان جسم کے ہر خط سے واقف تھا۔

"تھک سی گئی ہوں۔ مجھے بے تحاشا نیند آ رہی ہے۔"

"ڈارلنگ۔ سو جاؤ۔"

"تو میں نیند کی آغوش میں جا رہی ہوں۔"

"بصد شوق۔"

اُس نے بوٹ کے تسمے کھولے پھر بوٹ سے پاؤں نکالے، جرابیں اُتاریں اور پلنگ پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ ہاں وہ تین دن کے لئے کھنڈالہ گیا تھا اپنی ڈارلنگ بیوی سے جھوٹ بول کر۔ ہاں وہ ایک کہانی پر بحث کرنے جا رہا تھا دراصل وہ فلم کی کہانی نہ تھی بلکہ محبت کی کہانی کا آغاز کرنے جا رہا تھا۔ ایک افسانہ ختم ہو رہا تھا۔ دوسرا شروع ہو رہا تھا۔ شبنم اُسے پسند تھی۔ نام تو لڑکی کا شبنم تھا مگر تھی وہ شعلہ۔ وہ اس شہر سے دُور بھاگنا چاہتے تھے تاکہ تین دن آرام اور سکون سے کٹ سکیں۔ تاکہ کوئی انسان اُن سے یہ نہ پوچھ سکے کہ میاں تم کیا کرتے ہو۔ کتنا کماتے ہو۔ تمہارے کتنے بچے ہیں۔ فلیٹ کا کرایہ دیا یا نہیں۔ ہاں قیامت آنے میں کتنی دیر ہے۔ ہر روز لوگ مرتے رہتے ہیں۔ تم کب مرو گے۔ وہ اپنی پیاری بیوی کا ڈر دُور کر کے کتنا خوش تھا۔ تین دن تک وہ جھوٹ نہ بولے گا۔ دونوں نے کھنڈالہ میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ اور ہوٹل سے کھانا، چائے، سگریٹ، شراب اور دوسری ضروریاتِ زندگی منگوا لیتے۔ یہ تین دن بڑے عجیب و غریب تھے۔ بڑے ہی نرم اور گرم، بڑے ہی دلنواز و دلکش۔ سیاسی اور اقتصادی اُلجھنوں سے دُور رہ کر، ہر لمحہ ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے۔ ایک دوسرے کی آغوش میں پھسلتے ہوئے۔ تین دن یوں گزر گئے، جیسے ایک لمحہ گزرتا ہے۔

تین دنوں کے بعد پھر اُسے واپس آنا پڑا، پھر اُسی فلیٹ میں۔ اپنی پیاری بیوی کے پاس۔ وہی شور و غل۔ وہی بے ہنگم دنیا۔

"ڈارلنگ کیا ابھی تک تم سوئے نہیں۔"

"نو ڈارلنگ۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"تمہارے متعلق۔ اور تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"اصلی محبت اسی کو کہتے ہیں کہ ہم اور تم ایک دوسرے کے متعلق سوچیں اور سوچتے رہیں۔ یوں وقت تو گزر جاتا ہے نا!"

"وَنڈرفُل ڈارلنگ، ہم دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ وَنڈرفُل سی ڈارلنگ۔"

وہ اس وقت اپنی بیوی کے ہونٹ چومنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بیوی نے اُس کو خواہش سے مجبور کیا تو اسے سر جھکانا ہی پڑا۔ پچھلے تین دن تک وہ اپنی بیوی سے الگ تھلگ رہا تھا۔ اُس کی بیوی اُسے بے حد چاہتی تھی۔ اس کا پیار یقین کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ اُس کی بیوی بالکل نرم مزاج اور خوش گفتار تھی۔ جو کچھ وہ کہتا، وہ مان جاتی۔ اُس پر بھروسہ کرتی۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بند تھیں، اور سیاہ پلکیں رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ کیا وہ جاگ رہی تھی یا سو رہی تھی۔ اُسے شبنم کے متعلق کچھ علم نہ تھا جس کی نرم اور گداز بانہوں میں اس نے تین راتیں گزاری تھیں۔ وہ بھی تو اپنی ماں سے جھوٹ بول کر آئی تھی کہ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ میلا اجنتا دیکھنے جا رہی ہے۔ ماں نے بغیر کسی شک کے بیٹی کی باتیں مان لیں۔ بیچاری کیا کرتی۔ گھٹیا کی ماری ماں اپنی جوان لڑکی کی اس پھیلے ہوئے شہر میں کیسے حفاظت کر سکتی تھی۔ اور شبنم نے جانے سے پہلے تین سو روپے اُس سے اُدھار لیے تھے۔ تین راتیں اور تین سو روپے۔ رقم زیادہ نہ تھی پھر شبنم نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اگلی ملاقات میں یہ رقم واپس کر دے گی۔ اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر اس میں کیا حرج ہے۔ لیکن دینے والا کیا نہیں جانتا۔ وہ نہ جانے کتنے سیٹھوں سے کئی ہزار روپے اُدھار لیتا ہے پھر واپس کرتا ہے۔ کیا یہ لڑکی تین سو روپے واپس نہ کرے گی۔ نہ کرے کوئی بات نہیں۔ شبنم کا کندن ایسا جسم۔ ہونٹ یاقوت کی طرح۔ آنکھیں نرگسی، جوان جسم، جوان رات، دلفریب مسکراہٹ۔ بھلا ان کی قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی۔ شبنم نے یہ بھی کہا تھا کہ آج تک اُس نے کسی اور سے عشق نہیں کیا۔ پہلی بار کسی غیر مرد کے ساتھ وہ کھنڈالہ جا رہی تھی۔ کتنی عزت کی تھی شبنم نے۔ اسے خوش کرنے کے لئے اُس نے اپنے آپ کو باعصمت بتایا۔ بیچاری اور کیا کرتی۔ پہلی بار اپنی عصمت لٹا رہی تھی۔ اُسے یقین کر لینا چاہئے۔

وہ بیٹھا ہوا ان باتوں پر غور کر رہا تھا اور اُس کی بیوی سو رہی تھی۔ سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی اُسے کیا خبر۔ اگر کسی انسان کی آنکھیں بند ہوں تو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ سو رہا ہے۔ مگر اُس کی بیوی جاگ رہی تھی۔ وہ اپنے خاوند کو اچھی طرح جانتی تھی۔ پندرہ سال کی ازدواجی زندگی کے بعد وہ اپنے خاوند کو اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ جب شادی ہوئی تھی تو وہ اچھا خاصا جہیز لائی تھی۔ جہیز کے علاوہ وہ خود حسین اور خوبصورت تھی۔ اُسے اپنا خاوند بھی پسند تھا۔ ابھی خاصی مشکل تھی۔ روپے کمانے میں اسے خاص مہارت تھی۔ جوڑ توڑ میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بیسیوں آدمی جس کے ... جب کسی کی کاٹ ... تھا ... چلاتا کہ کسی کو خبر نہ ہوتی۔ لین دین کے معاملے میں بڑا کھرا اور پکا تھا۔ بس ایک ہی نقص تھا کہ حسن کا پجاری تھا۔ جہاں خوبصورت لڑکی دیکھی کہ رال ٹپکنے لگی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ اس لئے لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے ہر گُر آزماتا۔ شروع میں جب اُس کی بیوی کو خاوند کی اِس کمزوری کا علم ہوا تو وہ کافی روئی پیٹی۔ جادو منتر کروائے۔ مندروں میں جا کر جپ سادھی۔ منتیں اور دیوتاؤں کو پرساد ... مگر خاوند کا پیار اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔ ایک لڑکی کے بعد دوسری لڑکی۔ اور پھر تیسری لڑکی حسن و عشق کا چکر چلتا رہا۔

آج اپنے خاوند کے پاس لیٹی ہوئی وہ سوچ رہی تھی کہ انسان جھوٹ بول کر بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اُس کے پاس سب کچھ تھا۔ ایک فلیٹ، ایک کار، ایک خوبصورت خاوند، نوکر چاکر، عزت، وقار، سب کچھ تو ہے۔ چیخنے چلانے سے کیا فائدہ۔ اگر وہ خاوند سے لڑ جھگڑ کر الگ ہو جاتی تو اسے کیا ملتا۔ خدا کی ساری خدائی اُس سے چھن جاتی۔ اور اُسے ایک بیوہ عورت کی طرح زندگی گزارنی پڑتی۔ سچائی ایک بے کار شے ہے۔ چند ناکام اور شکست خوردہ انسانوں کا سہارا۔ ہمیشہ جھوٹ کا بول بالا ہوتا ہے۔ جو کچھ زندگی میں مل رہا ہے اُس سے سمجھوتہ کر لینا چاہئے۔ خودکشی کر لینا حماقت ہے۔ رونا بے سود ہے۔ چیخنا، چلانا، واویلا کا ذکر کرنا کمزور عورتوں کے ہتھیار ہیں۔ خاوند کو راہ راست پر لانا ایک بے کار کوشش ہے۔ انسان کو جھوٹ بول لینے کا فن آنا چاہئے۔

بیٹا سندر لپسند تھا۔ نام بھی سندر اور تھا بھی سندر۔ اُس کا قد اُس کے خاوند سے بھی لمبا تھا۔ اور عمر میں اُس کے خاوند سے چھوٹا۔ اُس کے چہرے پر نوجوانوں ایسی چمک تھی۔ رنگ گندمی۔ بال کالے چمکدار۔ چہرہ اکہرا سا۔ اگر جسم پر گوشت کی ایک تہہ چڑھ جائے تو لاکھوں میں وہی نظر آئے۔ آج کل روز ورزش کرتا ہے اور اچھی خوراک کھاتا ہے۔ وزن کیسے نہیں بڑھے گا۔ کل بتلا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ "ڈارلنگ، پانچ پونڈ وزن بڑھ گیا ہے"۔ سندر نے سوٹ کے لئے روپے مانگے تھے اور اُس نے بٹوے میں سے نکال کر دئے تھے۔ اس سال اُسے دو کمرے کا فلیٹ لے کر دوں گی۔ مزے سے فلیٹ میں رہے اور ہر ماہ مجھ سے روپیہ لیتا رہے۔ اب اُسے کس بات کی فکر ہے۔ اور اس میں کیا برائی ہے۔ کسی دن انہیں معلوم ہو گیا تو کہہ دوں گی میری بہن کا لڑکا ہے۔ میں اسے پال رہی ہوں۔ میں اس کی سرپرست ہوں۔ کسی کی دیکھ بھال کرنا بری بات نہیں۔ کسی کی مدد کرنا واقعی ثواب ہے۔ میں اس کی مدد نہ کروں تو بیچارا سڑکوں پہ مارا مارا پھرے۔ میری کتنی عزت کرتا ہے بڑے ادب سے پیش آتا ہے۔ بڑا شرمیلا ہے۔

تین دن تک وہ کھنڈالہ رہے اور سندر میرے آگے پیچھے گھومتا رہا۔

یہ سوچتے ہوئے اس کی بیوی نے آنکھیں کھولیں۔ خوابیدہ آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں پر جوان مرد کے بوسے چمک رہے تھے۔ خاوند کو علم نہ تھا اُس کے ہونٹوں پر شبنم کے شعلہ بار ہونٹوں کی گرمی تھی۔

"ڈارلنگ کتنے بجے ہیں؟"

عرب دنیا سے

قاہرہ - ۱۵ نومبر

جی ہاں، قاہرہ میں سردیاں شروع ہو گئی ہیں یہ تو جانتے ہیں، یہاں کی سردی ویسی نہیں ہوتی جیسی یورپ کو نصیب ہے۔ یورپ اور دمشق میں سردی برف لے کر آتی ہے۔ غذا ہضم ہو جاتی ہے۔ گال سرخ ہو جاتے ہیں یہاں کی سردی میں برف نہیں ہے، ٹھٹھر ہے۔ پاؤں ٹھنڈے ہو جائیں تو آدمی بیمار پڑ جائے۔ گٹھیا کا مرض یہاں سردی میں ذرا سی بد احتیاطی سے پیدا ہوتا ہے۔

ابھی وہ ہڈیوں کی جڑ تک اتر کرنے والی سردی شروع نہیں ہوئی۔ مصیف "گرمی گزارنے کے مقامات" سے لوگوں کے قافلے گاڑیاں بھر بھر کے چلے آ رہے ہیں۔ اسکندریہ اور دوسرے ساحلی مقامات سے قاہرہ کی طرف آنے والے ہوائی جہاز، ریلیں، موٹریں لدے پھندے آ رہے ہیں۔

ملک کی [illegible] آبادی [illegible] دریائے نیل کے کنارے کنارے بسی ہوئی ہے۔ گرمیوں میں لوگوں کے باہر چلے جانے سے شہر بے رونق ہو جاتے ہیں اور اب پھر سردیوں کے ساتھ ادبی اور تہذیبی، علمی اور تفریحی زندگی میں جان پڑ جائے گی۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہیں۔

بچوں کے نہرو

اب کے پھر آپ کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی سالگرہ زور و شور سے منائی گئی۔ جواہر لال نہرو کی ایسی شخصیت ہے جس سے لوگ ہندوستان کو پہچانتے ہیں۔ عام لوگ ہندوستان کو نہرو کا دیش کہتے ہیں۔ قاہرہ اور کئی بڑے شہروں میں نہرو کی سالگرہ کم و بیش اسی طرح منائی جاتی ہے جیسے آپ کے ہاں منائی جاتی ہوگی۔ بچوں کا میلہ لگتا ہے۔ اسے "یوم الاطفال" کہتے ہیں۔ اس سال پنڈت نہرو کی سالگرہ کے سلسلے میں کئی مقامات پر جلسے ہوئے۔ ایک تو جہاں خاص مرکزی انتظام تھا، تین سو سے زیادہ بچوں نے شرکت کی جن میں بہنیں جمال عبد الناصر کے بچے اور کئی وزیروں کے لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ بچوں کے لئے ہندوستانی رقص اور کئی دوسرے تفریحی پروگرام بھی ہوئے۔ دیکھنے قابل تھا یہ جلسہ۔ نہرو کی ایک بڑی سی تصویر ہال میں لگی ہوئی تھی اور ہندوستانی رواج کے مطابق اس کے گلے میں ہار پڑا تھا

یہاں عربی میں دو ایسے رسالے نکلتے ہیں جن میں ہندوستان کی ترقی، ہندوستانی ادب اور سیاست کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ ایک "صوت الشرق" (مشرق کی آواز) جسے خلیل گبریس نکالتے ہیں اور دوسرا وہ بلیٹن جو ہندوستانی سفارت خانے کی طرف سے نکلتا ہے۔ صوت الشرق کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ صبح کو اس کی کاپیاں مارکیٹ میں آتی ہیں اور شام تک ڈھونڈے سے پرچہ نہیں ملتا۔

ان دونوں پرچوں نے بھی نہرو کی سالگرہ کے تعلق سے کئی صفحے دیے ہیں۔

کتابوں کا میلہ

پچھلے ہفتے یہاں "عربی کتابوں کی نمائش" بڑے سلیقے سے لگائی گئی تھی۔ نمائش کو دیکھ کر یہ خیال گزرتا تھا کہ مصر اور لبنان یورپ کی طباعت و اشاعت کے مقابلے پر نکل آئے ہیں۔ نہایت نفیس چھپی ہوئی کتابیں، اچھے ٹائٹل، جدید طرز کی پرنٹنگ اور آرائش۔

اس نمائش کی ترتیب میں مصر کے تعلیمی اداروں، یونیورسٹیوں، سرکاری اور نیم سرکاری اشاعت گھروں نے حصہ لیا۔ قریب قریب ۲۰۰ ادارے اس میں شریک تھے۔ مصر، لبنان، عراق، یمن اور اردن سے کتابیں آئی تھیں۔ یمن کو یہاں خاص اہمیت دی گئی۔

میں جب نمائش دیکھنے گیا تو آپ کے بھی کئی ہم وطن ملے۔ ایک وہ صاحب جو افرو ایشیائی کمیٹی میں ہندوستان کی طرف سے کام کر رہے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ حیدر آباد کے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں۔

اس نمائش کا افتتاح وزیر الثقافة والارشاد القومی (Minister of Culture and National Guidance) ڈاکٹر عبد القادر حاتم نے کیا۔ یہ خود بھی مشہور مصنف ہیں۔ نمائش ہفتہ بھر چلی۔ روزانہ اس میں ۳ سے چار ہزار تک خریدار اور تماشائی آتے تھے۔ اچھی طباعت، اشاعت اور اسٹالوں کی سجاوٹ کیلئے انعام مقرر تھے۔ مصر کے دار المعارف نے جو ایک اعلیٰ درجہ کا پرانا اشاعت گھر ہے، اول انعام حاصل کیا۔ ابھی چند سال پہلے "نشر و اشاعت کا قومی اشاعت گھر" قائم ہوا تھا۔ اس نے اسٹال کی سجاوٹ میں سر فہرست جگہ پائی۔ اب اس ادارے سے ہر مہینے اچھی خاصی تعداد کتابوں کی نکلنے لگی ہے۔

کتابوں کا شوق بڑھ گیا

پڑھے لکھے اور خوش حال لوگوں میں [illegible] دیکھنے کا شوق بڑھ رہا ہے۔ طلبا اور اساتذہ [illegible] جائیے تو کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ سجا ہوا [illegible]

وگوں کے یہاں تعمیری مقاصد پر مشتمل کتابیں مگر یہ موجود ہیں، البتہ کمی ہے ان کی۔

آپ یہ نہ سمجھیں شاید کہ مصری لوگ تھوڑے ہوتے ہیں، ان کو روپیہ جوڑنے کی عادت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ صحیح ہے جن کی آمدنی اچھی اور علم کا شوق ہے، انہیں اب کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوا ہے۔ سستے داموں نکلنے والی کتابیں — (cheap editions) تو اس قدر مقبول ہیں کہ شائع ہوتے ہی دو ایک دن کے اندر ہزاروں کاپیاں بک کر ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کتابوں کے کئی سلسلے ہیں۔ مثلاً عالمی شہرت رکھنے والے ڈراموں کے سلسلے، مشہور مصنفین کی کتابوں کے خلاصے یا ترجمے، قدیم عربی ادب کی کلاسیکی کتابوں کے خلاصے اور نئے اڈیشن۔

ایک اندازے کے مطابق نمائش کے ...ں میں صرف ایک اشاعت گھر نے ایک دن کے ...ر ۵۰۰ پونڈ سے زیادہ (۱۰ ہزار روپیہ) کی کتابیں ...وخت کیں۔ قسطوں میں قیمت وصول کرنے کا سسٹم بھی اسی نمائش کے دنوں میں شروع کیا گیا۔

کتابوں کی نمائش کے سامنے دو مقصد ...اص کر تھے،

...ن عربی اشاعت گھروں کا ایک بین اقوامی ...بطہ پیدا ہو جس سے کتابوں کی نقل و حرکت اور اشاعت ...رفتار تیز ہو جائے۔

...لک جو کہ ابھی آزاد ہوئے ہیں ان میں ...رنی اور ہر موضوع کی عربی کتابیں زیادہ سے زیادہ پھیلائی ...ائیں تاکہ وہاں کے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیوں ...ں عربی زبان اپنا کھویا ہوا مقام پھر حاصل کرے۔

کتابوں کی چھوٹی چھوٹی نمائشیں بھی ...وتی رہتی ہیں۔ جہاں عرس ہوتے ہیں وہیں کتابوں کے سٹال لگائے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین، سیدہ زینب، سیدہ نفیسہ، سیدہ سکینہ اور امام شافعی کے عرس ...ڑی شان سے منائے جاتے ہیں۔ انہی موقعوں پر کتابوں کے سٹال لگتے ہیں جو زیادہ تر مذہب کی طرف سے ہوتے ہیں۔

علمی اور ادبی محفلیں

کتابوں کی نمائش کی لپیٹ میں کچھ علمی ادبی نشستیں بھی ہو گئیں جن میں صف اوّل کے اہل قلم شریک ہوئے۔ ادیب اور نقاد عباس محمود العقاد، ناول نگار یوسف السباعی (ان کے بعض ناولوں کا آپ کے ہاں ترجمہ بھی ہو چکا ہے) اور ڈاکٹر نجیب محفوظ عقاد کی شخصیت بڑی پرکشش اور موثر رہی ہے۔ یوں بھی ان کے ہاں ہر ہفتے ادبی نشست ہو جاتی ہے جس میں اوّل درجے کے لکھنے والے، نومشق اور طالب علم سب شریک ہوتے ہیں۔ ذہنی تربیت بھی ہو جاتی ہے، تبادلۂ خیال بھی اور تفریح بھی۔

کل ۱۷ نومبر سے سکندریہ میں بین اقوامی عربی مشاعرہ ہوگا جسے یہاں مہرجان الشعر کہتے ہیں۔ اگر میں جا سکا تو آئندہ خط میں اس کی تفصیل لکھوں گا تاکہ آپ اُردو کے مشاعروں سے موازنہ کر کے مجھے لکھ سکیں۔ اس سلسلے کا یہ پانچواں مشاعرہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالقادر حاتم اس کا افتتاح کریں گے۔

عربی دنیا میں پھر قدیم و جدید شاعری، عوامی اور کلاسیکی شاعری، پابند اور آزاد شاعری، حقیقت پسند اور علامتی شاعری کی بحث چل پڑی ہے۔ اس کے بعض نمونے آپ کو جمع کر کے بھجواؤں گا۔

۶ ہزار سال پہلے کی یادگار

پچھلے سال ڈیڑھ سال میں ابوسنبل کے معابد نے عالمی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ہمارے زمانے یعنی عیسوی سنہ سے کوئی چار ہزار سال پہلے جنوب کے ان پہاڑی علاقوں میں ابوسنبل کے بت اور مندر بنے تھے۔ اب اسوان جو دنیا کا سب سے اونچا ڈیم بن رہا ہے اس کی تعمیر نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ ابوسنبل کی ان تاریخی یادگاروں کو کیسے محفوظ کیا جائے کیوں کہ یہ اسوان ڈیم کے رواں ہونے پر اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتیں۔ مصر نے یہ دیکھ کر کہ معاملہ تمام تہذیبی دنیا کی ایک قدیم یادگار کا ہے۔ اس سوال کو یونیسکو کے سامنے رکھ دیا۔ یونیسکو نے ساری دنیا کو اس طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ عرب متحدہ جمہوریہ اور یونیسکو نے مل کر ایک انٹرنیشنل کانفرنس کی اس میں تقریباً ۴۷ ملک شریک تھے۔ شریک ہونے والوں میں سے امریکہ نے ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر، ہندوستان نے نقد اور جنس کی صورت میں ساڑھے پانچ لاکھ ڈالر، فرانس نے ۵ لاکھ فرانک، انگلینڈ نے دو لاکھ ڈالر، پاکستان نے ایک لاکھ تیس ہزار، انڈونیشیا نے ۴۶ ہزار، کویت نے ایک لاکھ ڈالر، الجزائر نے ایک لاکھ ڈالر، سعودی عرب نے ۴۰ ہزار اسی طرح اور ملکوں نے بھی چندہ دیا ہے۔ کویت نے بلا سودی قرضہ تیس لاکھ پونڈ بھی پیش کیا ہے۔

بعض ملکوں نے اپنے چندے کی رقم ادا بھی کر دی ہے۔ ہندوستان بھی انہی ملکوں میں سے ہے۔ ایک دستاویز پر ان سب ملکوں نے دستخط کئے ہیں یہ دستاویز عربی زبان سے، انگریزی، فرانسیسی روسی اور اسپینی زبانوں میں ترجمہ کر کے چھاپی جائے گی۔

اب تک ان سب ملکوں سے اس مد میں تقریباً تین کروڑ پندرہ لاکھ ڈالر کی رقم ملی ہے لیکن خرچ کا اندازہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر لگایا جاتا ہے۔ ابوسنبل کے معابد کو پہاڑ سے کاٹ کر اونچی جگہ نصب کرنا ہے اور اس تراشے ہوئے حصے کو ترتیب اور سلیقے سے لگانا ہے۔

اس کام کے لئے دنیا کی پانچ مشہور کمپنیوں نے ٹینڈر بھرے ہیں۔ جن میں دو امریکی، ایک اطالوی، ایک جرمن اور ایک مصری فرم ہے۔ ابھی طے نہیں ہوا کہ کس کمپنی کو یہ عظیم الشان کام سپرد کیا جائے۔

(عربی سے ترجمہ کیا گیا)

(دمشق، مکرمہ)

آکسفرڈ
یونی ورسٹی کی بستی سے

ایڈیٹر صاحب، اردو ویکلی ڈوبجات!

یہ خبرنامہ دراصل آپ کے سوالوں کے جواب میں ایک خط ہے، لیکن آئندہ میں اس کو زیادہ دلچسپ اور معلوماتی بنانے کی کوشش کروں گا، وہ پابندی بھی برتوں گا۔

اکبر حیدرآبادی

آکسفرڈ کو علمی و نیم صنعتی شہر ہونے کے باوجود، ایک رومانی شہر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس حقیقت کی گواہی ان سیاحوں کی آنکھیں دے سکتی ہیں جنہیں اس کے دیدار کا فیض حاصل ہوا ہے۔ انہی لوگوں میں خلد انصار ناہی بھی شامل ہیں جن سے میری آخری ملاقات ۱۹۵۹ء میں ہوئی تھی جب وہ میرے غریب کدے پر تشریف لائے تھے۔ میں اس رومانی شہر کو ۱۹۵۱ء سے اپنا مسکن بنائے ہوئے ہوں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ اب میرا "جسمانی گھر" بن چکا ہے اگرچہ کہ میری روح اب بھی حیدرآباد کی وادیوں میں بھٹکتی ہے۔ ع

اکبر ہے یوں تو خطۂ مغرب بھی دلنواز
پر وہ جو اک تعلقِ خاطر وطن سے ہے!

○

جولائی سے اکتوبر کے وسط تک یونیورسٹی کے تعلق سے آکسفرڈ پر ایک جمود سا طاری رہتا ہے۔ کیونکہ یہ چھٹیوں کا زمانہ ہوتا ہے مگر چہل پہل کا وہی عالم رہتا ہے کیونکہ ٹورسٹ جوق در جوق یورپ اور دور دراز ممالک سے اس جنت نگاہ قلب و نظر کی سیاحی کے شوق میں کھنچے چلے آتے ہیں۔ بارہ اکتوبر سے یونیورسٹی کا نیا تعلیمی دور شروع ہوتا ہے اور پھر نئے چہرے، نئی باتیں اور نئے چرچے، نئے دور کا چرچہ دلچسپ ہو جاتے ہیں۔ کالے گاؤن اوڑھے ہوئے طلبا اور طالبات کی آوارہ ٹکڑیاں ہر طرف اس چمنستانِ علم کے خیابانوں میں اپنے رنگ روپ کی جھلکیاں دکھاتی نظر آتی ہیں۔ ان میں سفید، کالی، پیلی، سانولی، گندمی، بھوری، صندلی، ارغوانی غرض ہر رنگ کی جلد پوست نظر آتی ہے۔ رنگوں کا یہ امتزاج لذتِ مشاہدہ کے علاوہ اور بھی کئی دلچسپ اور گہرے مشاہدوں کا حامل ہوتا ہے۔

برطانیہ کے جزیروں کی تلخ ترین خصوصیت موسم ہے۔ جلد صاف شاخ در شجر دیکھتے دیکھتے سبز سے زرد اور زرد سے زرد تر ہو چکے ہیں اور بے شمار [illegible]

کڑی سردی کا زمانہ دسمبر سے فروری تک کا زمانہ ہے۔ جو لوگ پچھلے سال کے جاڑے گزار چکے ہیں ان کے قلب و دماغ ابھی تک ٹھٹھرے ہوئے ہوں گے۔ اُس سال مسلسل کئی ہفتوں تک برف گرتی رہی اور پھر درجہ حرارت اتنا گر گیا کہ تقریباً دو ماہ تک منجمد برف کو پگھلنے کا پروانہ نہ مل سکا۔

درجہ حرارت چوبیس گھنٹوں میں ۴۴ سے گھٹ کر ۳۷ تک پہنچا ہے۔ کہئے آپ نے بھی کپکپی محسوس کی؟ گرم موٹے موٹے کوٹ وارڈروبوں سے نکل آئے ہیں۔ بوٹ ٹخنوں تک پہنچ چکے ہیں۔ دکانوں کے شو ونڈو رُواں والے کپڑوں کے نمائش کر رہے

● لیبر پارٹی کے حکومت سنبھالنے کے آثار
● اردو کے دو ہفتہ وار نکل رہے ہیں
● نئے پرچے، نئی کتابیں ● ڈاڑھی کا مقدمہ

ہوئے ہیں۔ گویا ہر طرف "حرارت" کا بیوپار ہے۔ گرم سوپ برتنوں میں کھول رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لئے شراب اور گوشت ذائقہ و مزا کے بجائے ضرورت اور وظیفہ بنتے جا رہے ہیں۔

○

موسم کا رونا تو یہاں آئے دن کا رونا ہے اور تذکرۂ موسم روزمرہ کی زبان میں داخل ہے۔ اس مستقل، قدیم اور روایتی موضوع سے ہٹ کر وقتی موضوعات حالات کے مطابق اخباری سرخیاں بنتے رہتے ہیں اور ہر طبقے کے لوگوں میں شامل بحث رہتے ہیں۔ کچھ دن پہلے تک پروفیومو، کیلر اور وارڈ کی داستان نے سنسنی پھیلا رکھی تھی [illegible]

ولسن کے شدید ترین حملوں کا ہدف بنے رہے۔ اس کے بعد رابنز رپورٹ تعلیمی مسائل پر شائع ہوئی جو کچھ دنوں تک قومی اخباروں اور آپس کی گفتگو کا اہم جزو بنی رہی۔ اس کے علاوہ میکلن کی علالت و استعفیٰ اور نئے صدر کی حیثیت سے لارڈ ہوم (موجودہ سر الیک) کا انتخاب۔

کنسرویٹیو اور لیبر پارٹیوں کی رقیبانہ نوک جھونک جاری رہی۔ ادھر سر ایلک ہوم انتخابات جیتنے کا کوئی نیا گر ڈھونڈ لاتے ہیں تو ادھر حضرت ولسن اپنی سیاسی تھیلی میں سے ایک اور چمکار نکال کر پیش کرتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھیں اور دل و دماغ اس شعبدہ بازی سے سراسیمگی کا شکار ہیں۔ رائے کا وزن کبھی ایک پلڑے میں ہوتا ہے تو کبھی دوسرے میں۔ بالآخر اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ زمین کی ہمواری " " فضا کی سازگاری " اور اسی طرح کی دوسری باتوں پر منحصر ہے۔

حکومت میں اہم تبدیلیاں ایسے وقت ہوئیں جب کہ نئے انتخابات سر پر ہیں۔ ادھر ہیرلڈ ولسن کا اصرار ہے کہ انتخابات جلد سے جلد شروع کئے جائیں۔ اور سر ایلک چاہتے ہیں کہ یہ مئی یا جون میں عمل میں آئیں۔ اکثریت کا خیال ہے کہ، کنسرویٹیو حکومت اپنی آخری عمر کو پہنچ چکی ہے اور لوگ عام طور سے ولسن کی جاندار قیادت سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ طلبا کی اکثریت بھی اس معاملے میں ہم خیال ہے۔ (کیونکہ یہ طبقہ ویسے بھی ہمیشہ جدید رجحانات کا علم بردار ہوتا ہے) لوٹن کے حلقہ میں لیبر کے نمائندے کی شاندار کامیابی اور کِن راس (شمالی برطانیہ) سے سر الک کی نامزدگی سیاسی رسہ کشی کا دلچسپ مظاہرہ پیش کرتی ہے۔ اس مقابلہ کے حیرت انگیز نتائج کے پیشِ نظر دیکھنا یہ ہے کہ ؏

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق

بھارتی اور پاکستانی اقوام کی اکثریت انگلستان کے جن صوبوں میں پائی جاتی ہے وہ برمنگھم، مینچسٹر، شیفیلڈ، ناٹنگھم وغیرہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی حصہ صنعتی ہے جہاں ملوں اور کارخانوں میں آسانی سے ملازمتیں مل جاتی ہیں اور معاوضہ بھی اچھا ملتا ہے۔ آکسفورڈ میں ان لوگوں کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار ہے۔ ان میں بھی بیشتر لوگ مزدور پیشہ ہیں۔ باقی جو کچھ پڑھے لکھے ہیں، ہسپتالوں، بسوں اور آفسوں اور دفتروں میں کام کرتے ہیں اور تیس چالیس کے درمیان یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ یہاں کے ہندوستانی اور پاکستانی عام طور سے خوش پوشیں اور فارغ البال رہتے ہیں۔ ان کی ضروریاتِ زندگی کے لئے ایک دوکان ہے اور دو ایسے سنیما گھر جہاں ہر اتوار کو ہند و پاک کی فلم دکھائی جاتی ہے جس سے ان کی تفریح کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ علمی ادارے اب تک مفقود ہیں البتہ یونیورسٹی میں ایک انجمن "مجلس" پائی جاتی ہے جو سیاسی سماجی اور تفریحی پروگرام ترتیب دیتی رہتی ہے۔

اس سال کے اوائل میں فیض اپنی تازہ فلم "جاگو ہوا سویرا" لے کر آئے جو ایک جلسہ میں دکھائی گئی اور فیض نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ یہاں سے وہ اپنی فلم نمائش کے لئے روس لے گئے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک اردو ہفتہ وار (ایشیا) برمنگھم سے نکلتا ہے اور دوسرا (مشرق) لندن سے۔ "ایشیا" اگرچہ "مشرق" کے بہت عرصہ بعد وجود میں آیا لیکن پچھلے چار پانچ مہینوں میں اس نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور نہ صرف اس کی اشاعت میں نمایاں اضافہ ہوتا جا رہا ہے بلکہ اس کا معیار مجموعی حیثیت سے بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

پچھلے مہینے انگلستان میں خوشی کا پہلا موقع سر ونسٹن چرچل کا جشن ولادت تھا جو ۳۰ نومبر کو منایا گیا۔ جب وہ ۸۹ سال کی عمر کو پہنچے۔ اس موقع پر لندن کے سیوائی ہوٹل میں عشائیہ ترتیب دیا گیا۔ چرچل کی سالگرہ کے سلسلے میں ۲۰ پاؤنڈ (تقریباً دس سیر) کا کیک بنایا گیا۔

یونیورسٹی اپنے پہلے ٹرم سے تقریباً گزر چکی ہے۔ اس کے تعلیمی سال میں ۲۴ ہفتے پڑھائی کے اور ۲۸ ہفتے چھٹیوں کے ہوتے ہیں مگر مصروفیت کا جہاں تک تعلق ہے آ ایک طالب علم کی زبانی یہ سنا گیا ہے کہ اکثریت والے یہ ۲۸ ہفتے اقلیت والے ۲۴ ہفتوں کی بازگشت ہوتے ہیں۔ سچے معنوں میں مطالعہ اور مشقت کا یہی زمانہ ہوتا ہے۔ پہلے پڑھائی کے ۲۴ ہفتوں کو آٹھ آٹھ ہفتوں کے تین ٹرم میں بانٹا جاتا ہے۔ پہلے آٹھ ہفتوں کی میعاد یونیورسٹی کی اصطلاح میں "میکل مس ٹرم" کہلاتی ہے جو تیرہ اکتوبر کو شروع ہوتی اور ۷ دسمبر کو ختم ہوتی ہے۔ پہلا ٹرم نسبتاً بہت سونا ہوتا ہے دوسرے ٹرم میں یونیورسٹی کی زندگی سرگرمیوں کے لحاظ سے اپنی معراج کو پہنچتی ہے اور آخری ٹرم امتحانات کی قربت کے پیشِ نظر بڑی مصروفیتوں کا ٹرم ہوتا ہے۔

یہ رہے "گاؤن" کے حالات۔ اب ذرا "ٹاؤن" کی بھی سن لیجئے۔ آج کل کرسمس کا نکھار روز بروز تیز ہوتا جا رہا ہے۔ دکانداروں کے لئے تو پورے ۵۲ ہفتوں کے انتظار کے بعد نشاط دیدہ و دل کی وہ گھڑی آ پہنچی جب وہ مقابلہ بازی کے ہتھکنڈوں کو پوری قوت کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ ہر دکان ابھی سے گویا ایک کرسمس کیک معلوم ہو رہی ہے۔ دکانداروں کے بھرم کے ساتھ ساتھ گاہکوں کی قوتِ خرید کا امتحان جاری ہے۔ خرید و فروخت کا بازار گرم ہے۔ کیا عجب ہے جو اس سال یہ گرم بازاری اپنا نیا ریکارڈ قائم کرے کیونکہ حکومت کے ایک اعلان نامہ کے مطابق ۱۹۵۰ء کے بعد اب پہلی مرتبہ اکتوبر اور نومبر کے درمیان ملک میں بیروزگاروں کی تعداد میں ۱/۲ فی صد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ امید و بیم کے مارے تاجروں کے لئے یہ عین خوش خبری ہے۔

فیض اکبر خاں نامی ایک پاکستانی کو جسے پہلے [illegible] کی [illegible]
اس بنا پر [illegible] کر دیا گیا تھا کہ انہوں نے اپنی ڈاڑھی [illegible] لینے سے انکار کر دیا [illegible]

سے خلاف مقدمہ جیت جانے پر ۱۲ پاؤنڈ کی رقم بطور ہرجانہ عطا کی گئی۔

فیض اکبر خاں نے بتایا کہ داڑھی کو باقی رکھنے کا سبب محض مذہبی اصول کی پابندی ہے۔ جج جیمس اسٹان فیلڈ نے اپنے فیصلے کے دوران کہا کہ فیض کی ڈاڑھی داڑھیوں کے اُن ستھرے اور مخصوص اقسام میں آتی ہے جن کا پالنا بہت سے انگریز حضرات کے لئے بھی قابلِ فخر ہوگا۔

مسز ڈارتی ہٹن نامی ایک ۱۰۶ سالہ عورت جو گھر کو آگ لگ جانے سے بری طرح جل گئی تھی Sussex کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئی۔

ایک تازہ سرکاری تحقیق کے مطابق انگلستان میں صرف ۶۰ لاکھ لوگ (یعنی آبادی کا تک بھگ ۸/۱ حصہ) ایسے ہیں جن کے گھروں میں ٹیلی ویژن سیٹ نہیں ہے۔

اس سال کے پہلے نو مہینوں میں، انگلستان آنے والے سیاحوں کی تعداد ۲،۷۷۸،۰۰۰ تک پہنچ گئی جو پچھلے سال کے اسی زمانے کی تعداد میں دس فی صد کا اضافہ ہے

کچھ نئی کتابیں بازار میں آئی ہیں اور پڑھے لکھے حلقوں میں اُن کا چرچا ہے۔

ناول (۱) 'THE GIFT' — یہ روسی مصنف VILADIMIR NABAKOV کا تازہ ترین ناول ہے جس کا ہیرو ایک ایسا نوجوان روسی شاعر ہے جو مہاجر کی حیثیت سے برلن کے ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جہاں کرب و ملال کی ملی جلی فضا پائی جاتی ہے۔ اس کی سرگزشت بڑی دلچسپیوں کا مرقع ہے۔ قیمت

(۲) MAKING OF THE ENGLISH WORKING CLASS by E.P. THOMPSON — WEIDENFIELD & NICOLSON ناشر
HUMAN SIDE OF THE INDUSTRIAL REVOLUTION', A Vast Study by Marxist Historian (Gollancz 73s 6d)

(۳) ...ICISM AND LOGIC' by BERTRAND RUSSELL (Paper Back Series — ALLEN & UNWIN 6s)

(۴) ...ATE FOR CHANGE' The White House Years 1953-1956 by DWIGHT D EISENHOWER (HEINEMANN 63s)

(۵) نظم R.S THOMAS کی تازہ نظموں کا مجموعہ "THE BREAD OF TRUTH" قیمت ساڑھے بارہ شلنگ۔

اکبر حیدرآبادی

تشنگی

میں کہ اک اجنبی ہوں ترے شہر میں
اس کی شاموں سے دل بے تکلف نہیں
میری صبحیں الگ، میری راتیں الگ
میرا نغمہ جدا، میری باتیں الگ
ہے مرا راستہ میری منزل الگ
شہر تیرا سبھی مرکزِ رنگ و بو
میری بے تابیوں کی ہے محفل الگ
میں تجھے دیکھتا ہوں، ترے شہر کی رونقیں دیکھتا ہوں
ایک طوفان اس بحر میں دیکھتا ہوں
میرے دل کو ازل کی ہے وہ تشنگی
جس کی سیری نہ کر سکیں گے نہ یہ تیرے دریا کبھی
تشنگی کو مری چاہیئے وہ کنواں
جو بہت دور نظروں سے
پیپل کے پتوں کے ٹھنڈے سے سائے میں روپوش ہے

(آکسفرڈ سے)

ہماری آیا

سلمیٰ صدیقی

خدا پناہ میں رکھے ان نوزائیدہ بچوں سے نہ جانے کس ناشکری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ صبح سے شام تک آپ اُن کی خدمت میں حاضر رہئے۔ ہر قسم کی دیکھ بھال نگرانی یا حفاظت کرتے رہئے۔ مگر کیا مجال کہ سیدھے منہ دو بات بھی کرلیں، شکریہ تو رہا در کنار۔ اور لطف یہ کہ اگر وہ کسی وقت چھت کی کڑی تکتے تکتے آپ کی صورت دیکھ کر اور آپ کی بدحواسی سے محظوظ ہو کر اپنا بغیر دانتوں والا منہ کھول دے تو آپ اُن پر سے واری ہونے لگیں۔ ہمیں بے وقوف بنانے کے گُر کوئی ان بچوں سے پوچھے۔ یوں ہی بے وقوف بنتے بنتے جب ہمیں ذرا عقل آئی تو ہم نے آیا کی مدد محسوس کی۔ اب آیا کوئی ان ان چیزوں میں تو ہے نہیں کہ ادھر آپ نے نام لیا اور وہ حاضر، اُس کے لئے تو طرح طرح کے عمل کام میں لانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں دوست احباب، مہمان اور میزبان سے لے کر اپنے گھر کی مہترانی اور دوسرے کے گھر کی نوکرانی سب سے مدد لینا پڑی اور پھر شروع ہوا انٹرویو۔

ایک دن صبح ہی صبح ناشتے کے بعد سب لوگ صحن میں بیٹھے تھے زنانے دروازے میں ایک سائیکل اور پھر اُس کی مالکن نظر آئی۔ سائیکل کو بڑے سلیقے سے دروازے سے لگا کر وہ جلدی جلدی ہماری طرف چلی آئیں

"گڈ مارننگ۔" اُنہوں نے بڑے زور سے ڈانٹا اور عذرا اور میں سہم گئے۔ مجھے آواز آئی "گڈ مارنی!"

اور اپنے ملازم سکندر کا جواب سن کر ہمارے ہوش و حواس بجا ہوئے، میں نے عذرا سے کہا۔

"پوچھو تو آپ کہاں سے آئی ہیں۔!"

"ہم بتا دیوی مشن سے آیا ہے۔ آپ کا سرونٹ ہم کو بولا تھا۔ آنے کا بات!"

اور ہم نے اُن کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے بچے کی نوکری پہلے کب کی ہے؟"

اور وہ یوں شرمائیں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے تیل آلودہ چہرے کو چھپاتے ہوئے بولیں۔

"ہم بچہ ہے بی لوگ کا مدرسہ۔"

"لیکن ہم تو نوکری پوچھنا چاہتے ہیں۔"

اور اُس نے جل کر کہا۔

"جب ہم ہاف ڈزن بچہ کو رکھتا ہے، تو ایک بابا کو ضرور رکھ لے گا۔"

جواب صحیح تھا اور ہمیں قائل ہونا پڑا۔ جب سب باتیں طے ہو گئیں تو میں نے اُن سے کہا۔

"پھر بس، کل آپ آجائیے۔"

"کل؟" اُنہوں نے حیرت سے میرا منہ دیکھا۔ "ہم دس دن سے پہلے نہیں آسکتا۔ ہمارا بڑا دن ہے۔!"

اور جب وہ جانے لگیں تو مُڑ کر بولیں۔

"ہماری سواری کا کرایہ؟"

"مگر آپ تو سائیکل پر آئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور مسٹر جون جو باہر کھڑا ہے!"

میں اس سواری کی نوعیت پر غور کرنے لگی اور وہ کہتی گئیں۔

"وہ ہم کو اپنا بائیسکل پر پہنچا دیتا ہے۔ مگر کرایہ لیتا ہے!"

وہ کرایہ لے کر چلی گئیں اور بڑا دن بھی چلا گیا۔ مگر پھر ان کی صورت نظر نہ آئی۔

آٹھ دس دن کے بعد جب ہم لوگ کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے ایک برقعہ گھر میں داخل ہوا اور پیچھے پیچھے ہماری مہترانی جھاڑو دبائے نظر آئیں۔ ہمیں دیکھ کر مہترانی نے بغیر کسی جھجک کے بولنا شروع کردیا۔

"لیجئے بی بی جی! یہ آگئیں اور ہم سب کو سخت کوفت ہوئی اور وہ بولتی گئی۔

"لو بس دل لگا کر یہاں رہو۔ ایسے اچھے دیالو ہیں ہمارے مالک کہ تمام جندگانی بیت جائے گی۔" وغیرہ وغیرہ اور میں سمجھ گئی کہ کوئی پناہ گزیں خاتون ہیں جو یقیناً خود کو ضرور ہی فسادات کا شکار بتائیں گی اور میں نے ترس کھا کر کہا۔

"بیچاری کوئی پناہ گزیں عورت ہے۔ اماں اسے کچھ دے دیجئے۔"

"اے نوج میرے دشمن ہوں پناہ گزیں۔ میں تو نیچے کی آتا ہوں۔ آپ کی مہترانی نے بہت خوشامدیں کیں۔ بتایا کہ کوئی بچے کو دیکھنے والا نہیں ہے تو میں نے اپنی لڑکی سے کہا، بیٹی یہ تو اللہ واسطے کا کام ہے مجھے جانے دے۔ میری لڑکی بہت روئی پیٹی۔ اُس نے پاؤں پکڑ لئے۔ داماد نے گلے میں ہاتھ ڈالے مگر میں نہ مانی اور

فوراً چلی آتی ۔"

ہم سب اُن کی اس محبت اور خلوص کے قائل ہو گئے مگر فوراً اُن کو ٹوک دیا۔ انہوں نے کہا۔

"پھر سے میرا لاڈلا ہے کہاں ؟"

اور میں نے صبر کرتے ہوئے اپنے بچے کو انہیں کا لاڈلا تصور کر لیا۔ میں نے کہا۔

"پہلے آپ غسل وغیرہ تو کر لیجئے۔"

"اے بی بی توبہ کرو یہ دوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے اور پھر میں پانچ وقت کی وضو کرنے والی۔ بتاؤ میں کوئی ناپاک ہوں ۔ اے میں کہتی ہوں صابرہ کی ماں تو وہ عورت ہے کہ جس پر اُس کا چھینٹا پڑ جائے وہ پاک ہو جائے ۔"

اور میں نے اُن کے پان کے چھینٹے سے بچتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ رہ جائیے ۔"

اور انہوں نے بچے کو لینے کو ہاتھ بڑھائے پھر فوراً چونک کر ہٹیں۔

"اے ہے۔ کیسی میری عقل ہے ، خالی ہاتھ بچے کو لینے لگی۔ لاؤ بی بی سوا روپیہ ہاتھ میں رکھو تو ماشاء اللہ صاحبزادے کو گود میں لوں ۔"

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ ماشاء اللہ ، انشاء اللہ اور خدانخواستہ کا وظیفہ پڑھتی ہوئی پھر سامنے آگئیں تو ہم سب کی نظریں اُن پر پڑ گئیں۔

"کیا ہے اُنا ؟"

"اے ہوتا کیا۔ موئی بد روحیں بچے کو ستاتی ہیں ۔"

ہم لوگ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے تو خود ہی بولیں۔

"بی بی لاؤ سوا روپیہ اور چھید والے تین پیسے۔ شاہ جمال کی فاتحہ دلاؤں گی بچہ سوتے میں چونک چونک پڑتا ہے ۔"

شام کو جب وہ واپس آئیں تو ہمیں بتاتے غائب ہو گئے۔

"لو اللہ کا نام لے کر لے کھا لو تبرک ہے !"

رات ہوتے ہی آئیں۔ "بیوی کیا بتاؤں کیا غضب کی سردی پڑ رہی ہے۔ کپڑے لتے سب لڑکی کے پاس رکھے ہیں۔ صبح فرصت سے جا کر لاؤں گی۔ اس وقت تو کچھ انتظام کرو ۔"

رضائی کسی کی ، دلائی کسی کی ، توشک تکیہ کسی کا۔ اس طرح اُن کا بستر بچھا گیا اور وہ اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

آج ذرا تھک گئی ہوں۔ کل انشاء اللہ سب کام سنبھال لوں گی ۔"

رات کو بری آنکھ کھلی تو میں نے چپکے سے اُٹھ کر اپنی پر اسرار اُنا کو دیکھنا چاہا۔ آہٹ پا کر فوراً لحاف میں سے بولیں۔

"کون ؟ چور ہے ؟ "

"جی میں ہوں ۔" میں نے جواب دیا۔

"خیر دلہن تو چور بہو کے گھر میں قدم رکھنے کی ہمت ... ہو جائے گا ۔"

اور میں لرز گئی اور جلدی سے روشنی جلا دی۔ منہ پر سے لحاف ہٹا کر بولیں ۔ "اچھا بی بی تم ہو ۔ سو جاؤ آرام سے۔ میں کبھی موئے چور کی فاتحہ ... چور کی تو نہیں مگر ہماری شامت آنے والی آنے لگی۔ ایک دن جب وہ اپنی لڑکی سے ملنے گئیں اور واپسی میں دیر ہوئی تو اُن کی لڑکی کے گھر آدمی بھیجا گیا۔ معلوم ہوا کہ محض آٹھ دن سے وہ اُس گھر میں ایک اچار بیچنے والی کی حیثیت سے رہ رہی تھیں اور صبح پاکستان جانے والے قافلے کے ساتھ گوشۂ عافیت میں پہنچنے کے لئے روانہ ہو گئیں۔ اُن کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ میری بہت ساری چیزیں بطور یادگار اپنے ساتھ لے گئیں۔ اُس کے بعد جو خاتون آئیں وہ ایک شاہجہانپوری آئیں۔ بہت مستعد اور حاضر جواب معلوم ہوئیں۔ آتے ہی ہماری سابق اُنا کو لوٹ کر ... سنانی شروع کیں۔

"میں کہتی ہوں بیگم صاحب بھلا ایسی عورتیں شریفوں میں رہنے کے قابل ہوتی ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ۔

مجھ پر تو اپنی اُنا کی مفارقت کا غم تازہ تھا۔ عذرا نے اُس کی شائستگی سے متاثر ہو کر اُسے رکھ لیا۔

"اچھا تو بیگم آپ پاکستان جائیں گی نا!"

"ہاں ۔" عذرا نے جواب دیا۔

"کہاں کے پاکستان ؟"

سوال ذرا ٹیڑھا تھا مگر عذرا نے حالات پر قابو پا لیا۔ بولیں

"ڈھاکہ"

"اچھا ڈھاکہ کے پاکستان جائیں گی !"

"کیوں۔ تم ساتھ چلو گی ؟" عذرا نے پوچھا۔

"اے بی بی میرے ایسے نصیب کہاں کہ اپنے اللہ رسول کے ملک کو جاؤں ویسے آپ لے چلیں گی تو چلی بھی جاؤں گی۔ مگر بی بی ڈھاکہ تو بنگالے کے پاکستان میں ہے نا؟ "

"ہاں ۔"

"اے بی بی میری توبہ بنگالے کا جادو ! اللہ بچائے۔ !!"

انہوں نے باتیں بنا کر کے دماغ چاٹ لیا۔ عذرا نے کہا

"دیکھو آیا آج میں تمہیں دودھ تیار کر کے دکھا دوں کل سے تم ہی کو بنانا پڑے گا ۔"

"اے بی بی تو اس میں کون سے پاپڑ بیلنا ہے۔ لائیے میں دو منٹ میں بنا ... بس گرم کیا اور جھٹ سے بوتل میں اُلٹ دیا ۔"

"گرم نہیں کرنا ہے آیا۔ وہ تو گرم پانی میں بنایا جائے گا !"

"[illegible]"

"ہاں نا"

"کون سا ادھر ہے یہ گیسو یا آسٹھا جل؟"

"آسٹرک" عذرا نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں، وہی آسٹھا جل۔ مگر ان ہاتھوں سے گھولا چینکا اور منگا دیا"

عذرا گھبرا گئیں۔ "دیکھو آپا۔ اب مت گھول کر پھینک دینا۔ بڑی مشکل سے

ہے"

"مشکل کیا ہے مجھے دام دیجئے، سینکڑوں شیشے منگا دوں۔ بازار میں بک رہے

ہیں"

سعدی نے آواز دی۔

"آپا، آؤ کھانا کھالو، ٹھنڈا ہو جائے گا"

"لے ہٹو بھی کھانا نہ ہوا جنت کا میوہ ہو گیا۔ جانے کتنا کھایا پیا اور اگل دیا"

اور میں سوچنے لگی زمانے کی تبدیلی دیکھو۔ خلیفہ بغداد کے دربار کی اس کنیز کی

ت کہاں آکر چھوٹی۔ آپ دیکھا اسے بھی راس نہ آئی اور دوسرے دن صبح وہ ہم پر

رحم کی نظر ڈال کر رخصت ہو گئی۔

سلسلہ کی اس کڑی میں صبح و شام کی طرح اُلٹ پھیر سے یکے بعد دیگرے

ں آتی رہیں اور جاتی رہیں۔

ایک اینگلو انڈین آپا بھی ایک بار نوکری کے لئے آئیں، جنہوں نے بچے کی

بھال سے زیادہ بچے کے والدین کے انگریزی تلفظ پر غور کیا اور اُسے سدھارنے

کا خیال دل میں اور پچیس روپے بطور ایڈوانس جیب میں لئے کھو گئیں۔

اپنے بعض دوستوں کے یہاں بھی اس مخلوق کی عجیب و غریب حرکات و کنات

نظر کیں۔ ایک دن ملاقات کو گئی تو دیکھا کہ ایک نہایت معزز خاتون ریشمی کپڑوں میں ملبوس

بانو کے پیار سے سے بچے کو ڈانٹ پھٹکار رہی ہیں۔ مجھے اُن کی یہ بد اخلاقی بہت بری

م ہوئی۔ میں اُنہیں ایک بد رنگ مہمان سمجھی اور جھک کر آداب کرنے ہی والی تھی کہ

سے آواز آئی۔

"لشکر جہاں بیگم ذرا یہاں تو آنا"

اور لشکر جہاں بیگم مع اپنے لشکر، میرا مطلب ہے تمام طمطراق کے ساتھ اٹھلاتی

ں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میزبان خاتون سامنے آئیں تو اُن کی طرف جھک کر بولیں۔

"آداب بجالاتی ہوں سرکار۔" اور غرض بندی کا چرکی یہ ہے کہ

احتراز سے کا استعمال بجد جی وغیرہ وغیرہ

معلوم ہوتا کہ کسی والی ریاست کے شاہی کی آیا ہوتے ہیں خلفا نظر آچکی ہیں

ان تمام حرکات، عادات و خصائل کی مالک ہیں جو حضور معلیٰ کی خاص بارگاہ میں پائی

تی ہیں۔ ہر بات پر "قلاقلا" کہہ کر آنچل کھینچ لینا۔ بات بات پر شعر پڑھ دینا۔ قدم قدم

پر اٹک کر چلنا۔ انہیں دوسرے ملازمین کی پست حالت سے سخت نفرت تھی۔ بیچاری کی

مجبوری تھیں۔ حضور والا کے بچے بڑے ہو چکے تھے اور خود سرکار کی خدمت میں ایک عدد میراثن

آ گئی تھی۔ بیچاری لشکر جہاں بیگم کے ساتھ انہوں نے خاص نیک سلوک کیا تھا اور اُن کی پرانی خدمات

کا صلہ یہ دیا کہ وارد فرمطبخ سے اُن کا نکاح کروا دیا، جن کی پہلی چار بیویاں سے ان کی تھوڑی سی

اور وہ سب سے کنارہ کش ہو گئیں۔ لشکر جہاں بیگم کو یوں تو کسی نوکر سے دلچسپی نہ تھی مگر ایک

خلیفہ سے چھوکرے سے تو کچھ قلبی لگاؤ تھا۔ تین چار دن بعد میں نے لشکر جہاں بیگم کی غیر

موجودگی کی وجہ پوچھی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ گذشتہ شام وہ اسی

چھوکرے سے شادی کر کے علٰیحدہ کوارٹر میں رہنے لگیں۔

میری ایک سہیلی ہیں، اُن کے شوہر تو بس ایک ہی ہیں لیکن بچے کئی ہیں۔ اس

لئے طرح طرح کی آیاؤں سے اُن کا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ آیا اُن کے لئے ایک پرابلم بن کے رہ گئی ہے

میں اپنی ان سہیلی سے ملنے سے بہت گھبراتی ہوں۔ وہ جب بھی ملتی ہیں اپنی پرانی یا نئی آیا کا ذکر

چھیڑ دیتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی میرا سامنا اُن کی کسی نہ کسی آیا سے بھی ہو جاتا ہے اور اس

کی کتھا بھی سننی پڑتی ہے۔ دونوں کی باتیں سن کر میں اس نتیجہ پر پہنچتی ہوں کہ قصور نہ تو میری سہیلی

کا ہوتا ہے اور نہ آیاؤں کا، بلکہ اصلی جھگڑے کی بنا میری سہیلی کے شوہر نامدار ہوتے ہیں جو اپنے

بچوں کی آیا اور اپنے بچوں کی والدہ کے درمیان کا ہر فاصلہ مٹا ڈالنا چاہتے ہیں۔ بچوں کی ماں

کی قدر تو وہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اُن کے لئے بچے مہیا کرتی ہے اور اپنے بچوں کی آیا کی وہ کسی

لئے بے قدری نہیں کر پاتے کہ وہ اُن کے بچوں کو نہ صرف پالتی پوستی ہے بلکہ گھر کے ماحول میں

ایک خوشگوار فضا قائم رکھتی ہے۔ عورت ہونے کے باوجود کوئی گلہ شکوہ اُن سے نہیں

کرتی۔ بیوی کی ڈانٹ پھٹکار اور طعن و تشنیع میں گھر کے مالک کا برابر کا حصہ بٹاتی ہے۔ اُن

کے سب سے چھوٹے بیٹے کو قابو میں رکھتی ہے جو نہ صرف ماں باپ بلکہ اڑوس پڑوس والوں

کے بھی قابو میں نہیں آپاتے ہیں۔ وہ پھر چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے۔ ہائے ہائے گھر کے مالک پہ

کبھی کبھار اپنی وہ تازہ شگفتہ اور کنواری مسکان بھی بکھیر دیتی ہے جو غریب شوہر کو اپنی چہیتی

بیوی کے چہرے پر صرف شادی سے پہلے دیکھنے کو ملی تھی۔

آپ ہی سوچئے اس دنیا میں بھلا ایسی کون فرشتہ صفت بیوی ہو گی جو ایسی

خوش مزاج نمک سے درست، شوہر اور بچوں کی مزاج شناس آیا کو برداشت کر سکتی

ہے۔ اس لئے ظاہر ہے میری تمام تر ہمدردی اپنی سہیلی سے ہوتی ہے اور میں اُس سے وعدہ

کرتی ہوں کہ جوں ہی میری عمر رسیدہ پڑوسن کی کالی کلوٹی اور جھگڑالو اور بوڑھی آیا نوکری چھوڑے گی

میں فوراً ہی اُسے اپنی پیاری سہیلی کے گھر کی رونق بڑھانے کے لئے لے آؤں گی۔ لیکن جب سے

میری پڑوسن کے بوڑھے دل کے مارے ہوئے شوہر پنشن اور گٹھیا لے کر گھر آ بیٹھے ہیں۔ اُس

بدصورت اور بوڑھی آیا نے بھی میری پڑوسن کی ہر زیادتی اور بد مزاجی کو خندہ پیشانی سے برداشت

کرنا سیکھ لیا ہے ۔ ۔ ۔ !

میری ایک دوسری ملنے والی ہیں انہیں اپنے شوہر سے یہ شکوہ رہتا ہے

کہ وہ ہر وقت باہر جانے کے لئے تیار رہتے تھے اور کبھی دو گھڑی بھی بیوی کا دل بہلانے اور

…سے انہیں نکلتے تھا اور انہیں گھر پہ روکنے کے لئے بیوی بچاری نے خفقے پتھے ... گھنٹے اور کبھی چونک کے سامنے ہتھیار آزمائے تھے اور یہ سب اُن پہ بیکار ثابت ... کہ جب سے اُنہوں نے اپنے بچّے کی دیکھ بھال کے لئے ایک آیا رکھی تھی اُن کے پتی دیو ... شریف، وفادار، گھریلو شوہر بن گئے تھے اُن کا وہ دفتر جو پہلے دس کے بجائے آٹھ بجے شروع ہو جاتا تھا، اب اکثر ساڑھے دس گیارہ پہ بھی مشکل سے شروع ہوتا تھا۔ بلکہ ان کے Boss کو اُن کے کام پہ اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ کسی دن دفتر سے بغیر عرضی دئے ... غیر حاضر رہتے تو وہ ان کو کچھ نہ کہتا بلکہ اب تو اکثر ساڑھے چار بجے شام ہی سے اُن سے ... رہ جانے کی فرمائش بھی کر دیتا تھا تاکہ وہ غیر ضروری اور غیر معمولی محنت کر کے اپنی صحت نہ ... کر لیں۔ اسی طرح بیوی کی صحت کے لیے بھی اُنہوں نے کچھ دنوں سے شام کی سیر و تفریح ... بڑی اہمیت دی تھی اور جب وہ شام کو گھر پر فائلیں دیکھنے میں مصروف ہوتے تھے تو اکثر ... دی سے اصرار کرتے تھے کہ وہ گھنٹہ دو گھنٹے کے لئے اپنی کسی سہیلی کے وہاں گھوم پھر ... یا کم سے کم کچھ دیر کھلی ہوا میں قریب کے پارک ہی میں چہل قدمی کر لیں۔ بیوی جو پہلے ... میں گھومنے اور سہیلیوں سے ملنے کے لئے بے قرار رہتی تھی، آج کل اور بھی زیادہ ... قرار رہنے لگی تھی۔ بچہ آیا سے بہت مانوس ہو گیا تھا اور بیوی کے لئے گھر کا ماحول غیر ... ہو جا رہا تھا اور اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ایسی مستعد اور فرض شناس ... کو گھر کی چہار دیواری سے نکال پھینکیں۔ لیکن کرنا خدا کا یوں ہوا کہ انہیں دنوں میری سہیلی ... بھائی اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کے اپنی بہن سے ملنے آیا اور اُس نے جو آیا کی خوبیاں ملاحظہ ... تو فوراً ہی اپنی بہن سے اُس آیا کو اپنے اُس ہونے والے بچے کے لئے مانگ لیا جو دو ... ہفتوں میں دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے والا تھا۔ میری سہیلی نے فوراً ہی اپنے بھائی کی ... فرمائش کو پورا کر دیا اور جب اُس کے بھائی بھاوج رخصت ہونے لگے تو پھلوں کی ... اور تھنی کپڑے کے ساتھ ہی ساتھ آیا کو بھی اُن کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ آیا نے دل ہی دل ... بھانپ لیا تھا کہ اُس کی مالکن کا بھائی اُس کی مالکن کے شوہر سے زیادہ خوش مذاق اور ... مزاج ہے اور یہ کہ بیوی بھی اُس کی مالکن کے مقابلے میں زیادہ آرام پسند اور سیدھی ... ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ بھی بڑی فرماں برداری کے ساتھ نئے جوڑے اور نئے وچار لئے ... سفر پر روانہ ہو گئی۔

آیا کے جانے کے بعد گھر کے ماحول میں تو فرق ہوا ہی۔ مشکل یہ آپڑی ... میری سہیلی کے شوہر کے Boss کی بد مزاجی پھر سے عود کر آئی اور اُس غریب کو پھر آٹھ ... صبح سے آٹھ بجے رات تک گھر سے باہر دفتر میں جھک مارنا پڑی۔۔۔۔!

حال میں ایک دلچسپ واقعہ یہ سننے میں آیا ہے کہ کسی چھوٹے سے ... نے اپنی ماں کے گلے میں اپنی ننھی ننھی باہیں ڈال کر پوچھا۔

"ممی ممی، پری کسے کہتے ہیں۔؟"

"بیٹے بہت سندری بہت خوبصورت عورت کو کہتے ہیں اُس کے پر بھی ... تے ہیں"۔ ماں نے کہا۔

بچے نے پوچھا۔

"پر بھی ہوتے ہیں؛ جب تو وہ اُڑتی بھی ہو گی؟"

"ہاں، ہاں بیٹے!" ماں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور پھر وہ اُڑ بھی جاتی ہے"۔

"پری اُڑ بھی جاتی ہے؟"

بچے نے گھبرا کر پوچھا۔ اور مچل مچل کے رونے لگا۔ ماں نے بچے کو بہلاتے ہوئے کہا

"مگر تم رو کیوں رہے ہو ننھے؟"

ننھے نے اپنی خوبصورت کم سن آیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے میری اچھی آیا اُڑ جائے گی۔ پھر میں کیا کروں گا؟"

ماں نے ہنس کر کہا۔

"ارے بھلا کیوں، تمہاری آیا کیوں اُڑ جائے گی بھئی؟"

بچے نے بسورتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا۔

"ممی کل شام جب تم شاپنگ کرنے گئی تھیں تو پاپا میری آیا سے کہہ رہے تھے کہ تم تو بالکل پری ہو!"

◆◆

چاند نے جھک کے کہا

فیض احمد فیض

رہگذر، سائے شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ،
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ،
حلقۂ بام تلے سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل،
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا حباب،
ایک پل تیرا چلا، پھوٹ گیا آہستہ،
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ،
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ،
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا، آہستہ
چاند نے جھک کے کہا
اور ذرا آہستہ،

زبان اور حکومتِ آصفیہ کی سرپرستی

نصیر الدین ہاشمی

جناب خواجہ احمد عباس نے میرے
ایک مضمون کے مراسلے کے ضمن میں جو موصوف کے
مضمون کے جواب میں اخبار بلٹز کو روانہ کیا گیا تھا،
انہوں نے حسب ذیل صراحت فرمائی تھی۔
"چونکہ نظام دکن نے تلیگو کا حق مارا
تھا اس لئے تاریخ اردو کو دبایا جانا بالکل جائز ہے"۔
خواجہ صاحب ایک افسانہ نگار اور
فلم ساز ہیں جن کا تاریخ سے سروکار نہیں ہوتا بلکہ
دروغ گوئی اور اصلیت کو مسخ کرنا، زیب داستان
کے لئے جھوٹ بولنا جائز تصور کیا جاتا ہے
واضح ہو کہ قلمرو آصفی میں صرف تلنگانہ
شامل نہیں تھا بلکہ تلنگانہ کے اضلاع کے ساتھ مرہٹواڑہ
اور کرناٹک کے اضلاع بھی شامل تھے۔ قلمرو آصفی
کی سرکاری زبان ایک عرصہ تک مغلیہ دور کے
مطابق فارسی رہی مگر زمانہ کے حالات کے لحاظ سے
اس کو تبدیل کرنا ضروری تھا۔ قلمرو آصفی میں تلنگی بولنے
والے، مرہٹی بولنے والے، کنڑی بولنے والے سب
ہی موجود تھے۔ مگر علاقہ تلنگانہ میں کنڑی یا مرہٹی
بولنے والے کم سے کم تر ہوتے تھے۔ اس طرح
مرہٹواڑہ میں تلنگی بولنے والوں کا فقدان تھا۔ علیٰ
ہٰذا کرناٹک کے علاقے میں تلنگی اور مرہٹی بولنے
والے نہیں تھے۔ لیکن اردو زبان ایک ایسی زبان تھی
جو قلمرو آصفی کے ہر حصے میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ
تک غریب سے امیر، مزدور سے سرمایہ دار سب
ہی استعمال کرتے تھے اس لئے بتدریج اردو کو
حکومت آصفیہ نے سرکاری زبان کا درجہ دیا کیونکہ
تلنگی، مرہٹی یا کنڑی کو یہ درجہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ قلمرو آصفیہ
زبانوں کی سنگم تھی۔ اردو کو سرکاری زبان بنانے کے ساتھ
حکومت نظام نے تلنگی یا مرہٹی یا کنڑی کی سرپرستی سے
کبھی انحراف نہیں کیا۔ چنانچہ جب حکومت نے ایک کالج
دارالعلوم کے نام سے سنہ ۱۲۷۲ ہجری میں قائم کیا تو یہاں
تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی تعلیم کا بھی انتظام فرمایا اور اس
زبان کا درس دینے والے پنڈتوں کو ایک ایک ہزار روپیہ
ماہوار تنخواہ مقرر فرمائی جو آج کل کے لحاظ سے پانچ ہزار
سے کم نہیں ہو سکتی۔ کیا عصر حاضر کے روشن اور تہذیب
یافتہ دور میں کسی پروفیسر کو پانچ ہزار ماہوار کوئی
حکومت دیتی ہے؟
آج سے ستر سال پہلے شمالی ہند کے ایک
سیاح اور مورخ حیدرآباد آئے تھے اور اپنی فارسی تاریخ
میں ان پنڈتوں کی ماہوار ہزار روپیہ ہونے پر حیرت اور
تعجب کا اظہار کیا ہے (دیکھو تاریخ دکن عبدالعلیم نصراللہ
خاں ص ۳۵۷)

[illegible] کے علاقوں کے [illegible]
اور تلنگانہ کے لئے یہ لازمی کر دیا گیا کہ عام زبان تلنگی،
مرہٹی یا کنڑی میں سے کسی ایک میں کام جاری کریں۔
اس کے علاوہ ان علاقوں میں ابتدائی تعلیم
تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں ہو سکتی تھی۔ ان زبانوں کے مصنفین
کو انعام دیا جاتا ہے۔ ان کی علاوہ کتاب کے نسخے خرید لئے جاتے
اور مصنفین کو صلہ دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا گیا۔
جامعہ عثمانیہ قائم کی گئی اور یہ وہ جامعہ
تھی جہاں برٹش راج اور برٹش انڈیا کے جامعات کے خلاف
ایک دیسی زبان کو جامعہ کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کا تجربہ
کیا گیا اور یہ تجربہ صد فی صد کامیاب رہا۔
جامعہ عثمانیہ میں اگرچہ اعلیٰ تعلیم اردو میں ہوتی
تھی مگر اردو کی طرح تلنگی، مرہٹی کی تعلیم کے لئے پروفیسر مقرر
کئے گئے اور ہزار ہزار روپیہ ان کو تنخواہ دی گئی ہے۔
اس کے بعد یہ کہنا کہ نظام نے تلنگی کی حق
تلفی کی تھی دروغ گوئی اور حقیقت کا بطلان نہیں تو
اور کیا ہے؟
خواجہ صاحب کو اپنے دائرے میں گھومنا
چاہئے۔ تاریخ میں قدم رکھ کر اصلیت کا بطلان اور
حقیقت کو جھٹلانا زیب نہیں دیتا۔

یہ بات نہیں ہے خواجہ صاحب!

ہفت روزہ بلٹز مورخہ ۲ نومبر ۹۳ء میں خواجہ
احمد عباس نے جن کا قلم "آزاد" ہے، اردو زبان کے مستقبل پر
بحث کرتے ہوئے نصیر الدین ہاشمی اور نجم حیدرآبادی کے بیان
کی مخالفت کی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں
اردو کا مستقبل خطرے میں ہے۔ اردو مر رہی ہے یا اسے
موت کے گھاٹ اتارا جا رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے منفق
ان کے خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
"کہا جاتا ہے کہ نظام حیدرآباد اردو کی سرپرستی
کرتے تھے۔ اب وہ اس قابل نہیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ
اتر پردیش اور پنجاب کی عدالتوں اور دفتروں
کی زبان اردو [illegible] اب نہیں ہے۔ آزادی کے بعد
ہندوستان کی راشٹر بھاشا ہندی [illegible] اس

خوبی اضافہ کے معنی میں جڑ گئے ہیں جن کا دفاتر میں
استعمال ہے۔"

یعنی جب بنگلہ زبان عدالتی و دفتری
ہی تو بنگلہ زبان ایک قدم آگے بڑھی اور اس کے الفاظ
خزانے میں کافی اضافہ ہوا۔ مطلب یہ ہوا کہ عدالتی اور
ی زبان نہ ہونے سے کسی زبان کو نقصان پہنچ سکتا
ہے۔ یہ کہنا حقیقت سے بے خبری ہے کہ بنگلہ زبان سرکار
دار کی مدد کے بغیر آگے بڑھ گئی۔ خود بنکم چندر چیٹرجی
عباس صاحب نے حوالہ دیا ہے اپنے مضمون "بنگلہ
ن" میں لکھتے ہیں۔

"جرمنی، فرانسیسی، اطالوی، اسپینی وغیرہ
م زبانوں نے اسی طرح شاہی اور مذہبی تحریکوں سے
قی کی ہے۔ بنگلہ زبان اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ خلجی،
تغلق، سید، سبھی نے زبان پر (یعنی بنگلہ زبان
) اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ لارڈ کلائیو اور اُن کے
ساتھیوں (یعنی دیگر انگریزوں) کی محنت، امداد اور
ہمت افزائی سے ہی بنگلہ زبان آج بین الاقوامی زبان
بننے چلی ہے۔ اس زبان پر اب کتنا ہی فخر کیا جائے
لیکن یہ ماننا ہی پڑے گا کہ انگریزوں کی ہمت افزائی
و نوازشات نے اس کی ترقی میں ہاتھ بٹایا ہے۔ جس
میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔"[1]

میں سمجھتا ہوں کہ بنکم چندر چیٹرجی کے ان
صاف صاف الفاظ کے بعد عباس صاحب کو دیگر حوالوں
کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اس کے بعد میں سوال نمبر ۲ کا مختصر جواب
دینا چاہتا ہوں۔

شاید عباس صاحب اس سے واقف نہیں کہ
بنگلہ زبان و ادب کی تاریخ میں پٹھانوں کے دور حکومت
کو بنگلہ زبان و ادب کے ابتدائی عہد کا سنہرا دور قرار دیا گیا ہے۔
اور بنگلہ زبان کے ہر ایک تاریخ نویس نے پٹھان بادشاہ
حسین شاہ کا نام نہایت احترام سے لیا ہے۔ حسین شاہ
نے جب دیکھا کہ مقامی زبان بنگلہ ہے تو انہوں نے اپنے
دربار کو بنگلہ زبان کے عالموں اور شاعروں سے پُر کیا۔
حسین شاہ کے دور میں مالادھار بسو نے "بھاگوت"
کا بنگلہ ترجمہ کیا اور "گن راج خان" کا خطاب پایا۔ نصرت
شاہ کے دور میں مہابھارت کا بنگلہ ترجمہ ہوا۔ اس
مہابھارت کو "پارغلی مہابھارت" کہتے ہیں کیونکہ پارغل
خاں نے اس ترجمے کی مدد کی۔ اسی دور میں "دھرم
منگل" اور "منسا منگل" لکھے گئے۔ ان عظیم ادبی کارناموں
میں حسین شاہ، نصرت شاہ وغیرہ کی ادب نوازی کا بار
بار تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ تو بنگلہ زبان کے ابتدائی دور کا ذکر ہے
اب دوسرے دور پر غور کیجئے۔ بھارت چندر رائے
گناکار کا مقابلہ ہم اُردو کے مایۂ ناز شاعر غالب سے
کر سکتے ہیں۔ بھارت کو بنگلہ شاعری میں تقریباً وہی
کلاسیکی مقام حاصل ہے جو اُردو میں غالب کو ہے۔ ان
کا کارنامہ "آنند منگل" ہے جس کا سنہ تصنیف بنکم چندر نے
۱۷۵۲ء تحریر کیا ہے۔ یہ اس صدی کی سب سے مشہور و
مقبول تصنیف رہی ہے۔ یہی وہ پہلی کتاب ہے
جس کا ایک رنگین باتصویر ایڈیشن ۱۸۱۶ء میں گنگا کشور بھٹاچاریہ
نے چھاپا جو بنگلہ زبان کی پہلی باتصویر مطبوعہ کتاب ہے اور اس
کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ کتاب کی بھی تجارت ممکن
ہے۔ اس سے قبل رئیس لوگ کتابیں چھپوا کر مفت تقسیم
کرتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ایشور چندر ودیا ساگر نے بھی "آنند
منگل" کا ایک اور ایڈیشن شائع کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے
کہ بنگلہ زبان کا یہ مشہور شاعر کون ہے۔ بھارت در در
بھٹکنے والا ایک شاعر تھا جو ملازمت کی تلاش میں بھٹکتا پھر
رہا تھا۔ راجہ کرشن کی نظرِ کرم اس پر پڑی اور انہوں نے
بھارت چندر کو اپنا درباری شاعر مقرر کیا۔ بس یہیں سے
بھارت کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ راجہ کرشن چندر نے بھارت
"گن کار" کا خطاب عطا کیا اور مولا جور کی جاگیر داری بخشی۔
بھارت کی تمام مشہور تخلیقات وہی ہیں جو انہوں نے
درباری شاعر کی حیثیت سے کی ہیں۔ راجہ کرشن کے دربار
سے بنگلہ زبان کے کئی عالم وابستہ رہے ہیں جس کی وجہ
سے راجہ کرشن کو بنگلہ ادب میں "ادب نواز" قرار دیا
گیا ہے۔ وہ راجہ جس کے دربار میں بھارت جیسا شاعر
تھا۔

طوالت کا خوف ہے اس لئے یہیں ختم کرتا ہوں
ضرورت ہونے پر طویل مضمون لکھنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

○

اُردو
آرٹس کالج، حیدرآباد

جناب ایڈیٹر صاحب۔

آپ کو شاید علم ہوگا کہ ہم نے حیدرآباد میں
سال گزشتہ سے ایک اُردو آرٹس کالج کا آغاز کیا ہے
اس کے تعلق سے اب ایک اپیل جاری کی گئی ہے جس کی
ایک کاپی ارسالِ خدمت ہے۔ ہم اس بارے میں آپ کی
نیک تمناؤں کے طالب ہیں۔ نیز چاہتے ہیں کہ اپنے قابل
قدر ہفتہ وار کے ذریعے ہماری تائید فرمائیں۔ ہمارے راستے
میں سب سے بڑی مشکل ان دوستوں کا طرزِ عمل ہے جو سمجھا
کرتے تھے کہ اگر طلبا کو اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے
سے روکتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے اس کا بھی اہتمام کیا ہے کہ جو
طلبا ہمارے کالج سے پڑھ کر نکلیں وہ کاروباری انگریزی صحیح
طور پر بولنے اور لکھنے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اسی طرح آئندہ جو
بچے اسکولوں سے تلگو بحیثیت زبانِ دوم پڑھ کر کالج میں آئیں گے تو،
ان کو کاروباری تلگو لکھنا اور بولنا سکھانے کا معقول انتظام کیا جائیگا۔ یہ
اتفاق ہی ہے کہ ہمارے کالج کے طلبا ایک قدرتی زبان میں تعلیم پانے کی وجہ
سے اپنے مضامین پر بہتر عبور حاصل کر سکیں گے اور تلگو بھی
سیکھ سکیں گے کہ آندھرا پردیش میں رہ کر دفتر اور تجارت کا [illegible]
سے [illegible] انگریزی بھی جانیں گے [illegible] کام آئے گا۔

حبیب الرحمٰن ـ معتمد اعزازی

---

[1] دیکھئے ماہنامہ "بنگ درشن" جلد
۱، بنگلہ سنہ ۱۲۷۹ ہجری یعنی ۱۸۷۲ء طور پر یہ بھی یاد
رکھئے کہ اس مشہور ماہنامہ کے ایڈیٹر خود بنگلہ زبان
کے مشہور ادیب جن کا خواجہ احمد عباس نے ذکر کیا ہے یعنی
بنکم چندر چیٹرجی تھے۔ اس ماہنامہ (جلد اوّل) کا مکمل فائل
میرے یہاں موجود ہے۔

خواجہ احمد عباس پر

راجندر سنگھ بیدی

خواجہ احمد عباس میرے دوست نہیں — ان معنوں میں جن میں کہ دوست ہوتا ہے اور میرے خیال سے کسے ہونا چاہیئے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے انہیں ہمیشہ اپنا بزرگ اور رہنما مانا اور یوں عزت کرتے ہوئے ٹال دیا۔ کچھ اسی طرح کا برتاؤ انہوں نے بھی میرے ساتھ کیا۔ میری ادبی کوششوں پر بہت بار میری پیٹھ ٹھونکی، تحریری طور پر بھی مجھے سراہا اور نوازا، اور اس کے بعد نکال باہر کر دیا! حال ہی کی بات ہے جب کہ میں نے انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تو بلاتکلف مجھ سے پوچھا۔ "تم رہتے کہاں ہو؟"

عباس صاحب کا قریبی دوست ہونے کا فخر بھی مجھے حاصل نہیں ہوا، جس میں میرا قصور ہے تو اُن کا بھی۔ میرے خیال کے مطابق انہوں نے بری طرح دوستوں کا انتخاب سمجھ بوجھ کر بھلے سے نہیں کیا۔ خاص طور سے سمجھ بوجھ کر کسی تخلیقی آدمی کو قریب لانے کی کوشش نہیں کی۔ جی ہاں! تخلیقی آدمی کے سلسلے میں اگر میرا اشارہ اپنی طرف ہے تو، چند دوسرے لوگوں کی طرف بھی جو اپنی تنقیدی نظروں سے عباس صاحب کے لئے کارآمد ہو سکتے تھے، اور خود اُن سے سیکھ سکتے تھے۔ جو بھی اُن کے پاس آیا انہوں نے کسے دیا۔ یہی نہیں، جو اُن کے پاس سے گیا اُسے جانے بھی دیا۔ پاس آنے والوں میں کچھ تو پہلے ہی گر رہے تھے اور اگر نہیں تھے تو عباس صاحب کے شائستہ برتاؤ نے ہمیشہ کے لئے انہیں بنا دیا۔ اور جانے والوں کا تو ذکر ہی کیا!

یہ جو باہمی احترام سے دوری پیدا ہوئی اس کے باوجود میں کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم مجھے اُن کے ہم خیال ہونے کا فخر حاصل ہے، جس سے قربت اور دوستی کی [illegible] ممکنات ہیں۔ پھر تھوڑا جاننے والوں میں اتنی عاجزی اور انکساری تو ہوتی ہے کہ وہ کسی کو جاننے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے ہمیشہ ساتھ رہنے والا اس سلسلے میں بڑی بونگی باتیں کرتا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ جو آدمی جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی دور رہتا ہے۔

ڈھنگ تو یہ تھا کہ [illegible] آدمی کو آپ نے ایسے دیکھے ہوں گے جن کی شکل جنم سے لے کر موت تک ایک سی رہتی ہو، جس کی وجہ سے وہ بہت سی لغزشیں نہیں کر سکتے۔ میں نے عباس صاحب کو لڑکپن میں تو نہیں دیکھا لیکن اپنے فزیالوجی کے محدود علم کے اعتبار سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی وقت بھی عباس صاحب اپنے اس انگریزی ایڈیشن کا پیپر بیک [illegible] لگے ہوں گے اور کچھ نہیں تو پچھلے پچیس برس سے تو میں اُن کا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ جہاں تک [illegible] اعتبار [illegible] جسمانی اعتبار سے آپ وہیں کے وہیں رہے ہیں۔ چہرے پر جس [illegible]

بوجھ کے نشان پہلے تھے وہی اب بھی ہیں۔ ویسے ہی نگاہ اُچٹ کر سامنے والے پر پڑتی ہے۔ وہی مونچھوں کی ہلکی سی لکیر، جس کے نیچے پتلے سے ہونٹ، جو ناراضگی یا کھسیانے وقت کچھ اس طرح ہلتے ہیں کہ نہ تو انہیں پھڑپھڑانا کہا جا سکتا ہے اور نہ بھینچنا۔ ان کی ہنسی فطری ہے [illegible] جسے استعمال کرتے ہوئے یکایک رک جاتے ہیں۔ سنجیدہ آدمی کو زیادہ ہنسنا نہیں چاہئے۔ سر کے بال پہلے ڈھائی تھے اب دو رہ گئے ہیں، اس کے باوجود سکھوں کے خلاف نہیں بلکہ انہیں کئی دفعہ میں نے کسی سکھ کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا ہے۔ پوشاک میں سادگی ہے۔ اُن کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ زندگی میں اُن کا زور [illegible] پر نہیں، کچھ اور ضروری باتوں پر ہے جن میں ادب، صحافت، فلم، سیاست اور دوسری کئی قسم کی سماجی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ دنیا کے موجودہ سیاسی نظام میں اگر انہیں اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے درمیان کسی ایک کو منتخب کرنے کا حق دیا جائے تو وہ یقیناً جمہوریہ کو منتخب کریں گے۔ صدر جمال عبدالناصر کی پیروی کریں گے۔ لیکن شکل ہمیشہ اسرائیل کے [illegible] سے ملے گی۔

(*)

میں نے عباس صاحب کو پہلی بار لاہور میں دیکھا جہاں وہ اپنے صحافی دوست ساٹھے کے ساتھ کوئی فلم بنانے کے سلسلے میں آئے تھے۔ یہ دونوں دوست انڈین پیپلز تھیٹر کی تحریک کے کرتا دھرتا تھے، اس کے ایک جلسے میں میں عباس صاحب کو دیکھنے چلا گیا۔ ان دنوں لاہور کے لارنس باغ میں ایک نیا اوپن ایئر تھیٹر قائم ہوا تھا جہاں خوب ہنگامہ تھا۔ عباس صاحب کو دیکھنے کے سلسلے میں مجھے خوب ہی دھکے کھانے پڑے۔ خیر دھکوں کی بات چھوڑیئے یہ تو زندگی کا حصہ ہے، ہم سب دھکے کھاتے ہیں، کبھی مل کر اور کبھی الگ الگ۔ ایک بار پہلے بھی جب لاہور کے بریڈلا ہال میں شاعر اعظم ٹیگور کو دیکھنے گیا تھا تو اس سے برا سلوک ہوا۔ بھگدڑ میں سینکڑوں پیروں کے نیچے کچلا گیا۔ تب بھی میں نے یہی سوچا تھا کیا کسی بڑے آدمی کو دیکھنے کے لئے خود چھوٹا ہونا ضروری ہے؟

اس جلسے میں عباس صاحب ایک خاص حیثیت رکھتے تھے، اس لئے نہیں کہ باقی سب فضول اور بیکار قسم کے مرد تھے، ان میں عورتیں بھی تھیں اور عباس صاحب سب سے باتیں کرتے پھر رہے تھے، جسے صحافت کی زبان میں کہا جاتا ہے —

[illegible] قلم بھی بنا رہے ہیں اور صحافت کو بھی سنبھال رہے ہیں۔ "بلٹز" کا آخری صفحہ تو بہرحال [illegible] کے ساتھ ساتھ خود شیخ کی سوانح حیات بھی ہو گئی۔ پنڈت نہرو سے ان [illegible] آن کے ذاتی تعلقات ہیں۔ پھر تین لوک کمیٹیوں کے ممبر ہونا، سماجی ذمہ داری کا ثبوت [illegible] اور حیات صبح تک ہی محدود نہیں۔ ہر جگہ پہنچیں گے بھی۔ تقریر بھی کریں گے۔ پورے ہندوستان میں مجھے اس قسم کے تین ہی آدمی دکھائی دئے ایک پنڈت جواہر لال نہرو، دوسرے بمبئی کے ڈاکٹر بالیگا اور تیسرے خواجہ احمد عباس جی کی یہ طاقت اور صلاحیت ایک معمولی آدمی کی نہیں۔ چنانچہ جب میں نے ایک بار عباس صاحب سے [illegible] کی تو انہوں نے ہمیشہ کی طرح زیر لب مسکرا کے ٹال دیا اور بولے۔ "بھئی تو ہر بات میں [illegible] ہے۔" اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "آج کل کیا لکھ رہے ہو؟" بیچ میں کسی نے ٹوک دیا، اس لئے عباس صاحب نے میری آنکھیں نہیں دیکھیں جو نم ہو گئی تھیں۔ ان سے میری پہلی ملاقات اور اس ملاقات میں بیس پچیس سال کا فاصلہ آ چکا تھا اور میں اپنے بلٹز میں کم بات کرنا سیکھ چکا تھا۔ ●●

غزل

ایک بھی پایا نہ بے آزار تیرے شہر میں
خود مسیحا بھی ملا بیمار تیرے شہر میں

رہگذر چپ، راہرو بے گام، بام و در خموش
ایک سناٹا ہے پُر اسرار تیرے شہر میں

کوئی گُل کھلتا نہیں، موسم بدلتا ہی نہیں
کیوں ہے محرومِ صبا گلزار تیرے شہر میں

زخم ہاتھوں میں لئے ہم آشنائے خشت و خاک
ڈھونڈتے ہیں سایۂ دیوار تیرے شہر میں

خود زلیخا کو پکار اٹھتا ہے، اب یہ حال ہے
یوسفِ کنعاں سرِ بازار تیرے شہر میں

زندگی کا نام لے کر چھیڑ ہی دیتے ہیں ہم
قصہ ہائے گیسو و رخسار تیرے شہر میں

اے تغافل کیش توان کو غنیمت جانیو!
ہم سے مل جائیں اگر دو چار تیرے شہر میں

کچھ پتہ چلتا نہیں کس شوخ کے پازیب کی
دُور سے آتی ہے اک جھنکار تیرے شہر میں

ذہن کے مخدوش بام و در کی حالت کیا کہیں
منہ چھپائے پھرتے ہیں افکار تیرے شہر میں

کیوں تجھے اندیشۂ اغیار ہے جانِ عزیز
ہم ہیں سوتے جاگتے ہشیار تیرے شہر میں

مرزا عزیز جاوید

تمام دھنس گئے دلدل میں وقت کی، جس کو
قرار ہی نہیں اک لمحہ، اُلٹتا جاتا ہے
یہ رحم کھاتا نہیں آئی سِس، نہ اِشترِ پر
جنہوں نے چاہا محبت کو لازوال کریں
میں ڈھونڈتا ہوں کہیں تھلا نہ پاٹلی پتر
موہنجو دارو، کہیں قرطبہ نہ غرناطہ
نہ نینوا ہے نہ بابل نہ آج اندر پرست
یہ سب ہیں میرے لئے گویا خواب کی باتیں
مگر یہ وقت مرے ہاتھ ہی نہیں آتا
خدا بدلتے ہیں، اصنام ٹوٹ جاتے ہیں
تمام عہد دفترِ پارینہ سال خوردہ ہوئے
اگر ہے زندہ کوئی وقت کی طرح یہ لوگ
یہ لوگ خامیاں جن کی ہیں تیرے دل کی جلن
یہ لوگ جن کو خدا بننے کی نہیں خواہش
یہ لوگ جن کی شبِ ماہ ہے، نہ صبحِ چمن
یہ لوگ جن کی کوئی شکل ہے نہ تاریخیں
ہنسی میں ڈھال کے جیتے ہیں یونہی رنج و محن
یہ لوگ کم نظر آتے ہیں جو کتابوں سے
یہ لوگ اپنی دعاؤں امیدوں کا مدفن
خدائے حاضر و غائب کی ہیں یہ وہ بھیڑیں
جنہیں چراتے ہیں صدیوں سے رہبرانِ وطن
گزر رہے ہیں سبک گام تیری دنیا سے
جہاں تلاشِ معیشت ہے کرب و دار و رسن
نماز ایک کی ہے کفر دوسرے کے لئے
کسی کی وجہِ سکوں ہے کسی کے دل کی چبھن
کسی کا رزق کسی کے لئے ہے پیالۂ زہر
جہاں زمیں نہیں اب تک کسی کا بھی مامن
یہ لوگ جو ہیں ہر اک فن کا خام سرمایہ
انہیں سے باندھا ہے میں نے حیات کا دامن
یہ میں نے مان لیا علم ہے بڑی دولت
اگر کفن نہ بنے یہ تو کیا برائی ہے؟

نیا شاعر

ظ انصاری

میز پر آنکھوں کے آگے "تیشہ"[1] رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان، شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس نے تھوڑی سی زندگی میں بڑی کوہکنی کی ہے۔ یہ کلام اور اُس کا یہ نام دونوں اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ ابھی ہمارے زمانے تک "بے ستون" پہاڑ نہیں کٹا گیا۔ ابھی حساس لوگ اپنے اپنے تیشے ہاتھوں میں لئے جُٹے ہیں۔ ریزہ ریزہ کر کے پہاڑ کٹ رہا ہے۔ فضا میں بہت سے تیشوں کی کھٹ کھٹ اور پتھروں کے تکڑے بلند ہو رہے ہیں۔

کیسے اچھے شعر سے اس شخص نے اپنے کلام کا تعارف کرایا ہے ؎

ہوئی نہ خیر کہ احساس بن گیا تیشہ
میں غم کے کوہ سے ٹکرا کے مرگیا ہوتا

احساس سے مُراد یہاں 'ادراک' یا وہ بصیرت ہے جو کوہِ غم سے ٹکرا کر مرنے نہیں دیتی بلکہ تیشے پر دھار رکھواتی ہے ــــ 'جاؤ شیریں تمہیں نہیں ملتی، نہ سہی، کوہِ بے ستون توڑ کاٹنے کو موجود ہے تمہارے آگے۔'

مگر یہ اس افتتاحی نظم کا سب سے اچھا شعر نہیں ہے۔ یوں تو ساری نظم بھرپور جذبے میں کہی گئی ہے لیکن اس کے اچھے شعر یہ ہیں ؎

میں سادہ لوح مسافر کسی کی زلف تلے
رہِ حیات میں تھک کر ٹھہر گیا ہوتا
جہاں کی نبض شناسی تو خیر دُور رہی
میں اپنے پاس سے ہو کر گزر گیا ہوتا

یہ نظم کیفیؔ اعظمی سے خطاب ہے اور اس کے بعد آگے کی نظموں اور غزلوں سے یہ پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ "تیشے" کا مصنف ظفر گورکھپوری، کیفیؔ کی آواز اور انداز سے پُوری طرح متاثر ہے۔ اُس کی خوبیوں اور خامیوں میں کیفیؔ کے بعد جن اثرات کا ذکر نہیں کیا گیا ان کا نام ہے ساحرؔ (لدھیانوی)۔ ساحرؔ کے نثری انداز کے مصرعے کافی تعداد میں ظفر گورکھپوری کے یہاں ملتے ہیں۔

کیفیؔ کی شاعری کا جوہر وہ ہے جسے مختلف اصطلاحوں کی شکل دے کر آج کل بڑی بڑی تنقیدی کتابوں کا موضوع بنایا جا رہا ہے اور جسے ہمارے پرکھوں کی زبان میں "آمد" کہتے ہیں۔ اقبالؔ نے اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" کا ٹکڑا شاعر یا فنکار سے خطاب کر کے لکھا ہوتا کہ ؎

گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا

تو ہم کہتے کہ کیفیؔ کی شاعری میں یہی حُسن ہے۔ جس کوہ و بیاباں سے آج ہمارا سابقہ ہے اُس کا سامنا کرتے وقت کبھی سیلِ تند رَو بن جاتا ہے اور جہاں گلستاں یا شبستاں میں دم لینا ہو وہاں اس کی نغمہ خوانی میدان کے نرم رو دھاروں کی چھل چھل ہو جاتی ہے۔ جن اُبھرتے ہوئے فنکاروں پر ایسا شاعر اپنا سایہ ڈال دے یا پر پھیلائے انہیں تند رَوی کی گھن گرج تو آسانی سے مل جائے گی لیکن جُوئے نغمہ خواں والا نرم لہجہ اُس کی دل سوزی اور دلبری یوں ہاتھ نہیں آتی۔ حالیؔ نے جو بات کہی ہے کہ ؎

اک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں؟

وہ بڑی پتے کی بات ہے۔ نیشِ عشق پر چیخ پڑنا اور اونگھتے ہمسایوں کو ہڑبڑا دینا اُس معاملے کی ابتدائی منزل ہے۔ "زخمِ جگر کی لذت" کو پہنچنا دشوار طلب ہے اور یہ بہت کچھ شاعر کی ذہنی اور فکری صلاحیت پر اور اُن حالات پر منحصر ہے جو اہلِ فن کی شخصیت بنانے یا بگاڑنے میں آخری فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ غیب کا حال خدا جانے لیکن ظفر گورکھپوری نے یہ جو "ہونہار برواکے چکنے چکنے پات" ہمیں دئے ہیں ان میں بڑی جان ہے بشرطیکہ تناور برگد کے سائے سے نکل کر وہ براہِ راست چمن کی فضا میں دھوپ اور ہوا حاصل کرنا سیکھ لیں اور کیوں نہیں سیکھیں گے۔ ع

جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بمبئی میں اُردو پڑھے لکھوں کی تعداد غالباً ہندوستان کے ہر شہر سے زیادہ ہے۔ اُردو والوں کے ہنگامے بھی یہاں بڑے گرم رہتے ہیں جن باتوں سے لکھنے کی تحریک ہوتی ہے ان کی بھی یہاں کمی نہیں لیکن یہ عجیب بدبختی ہے کہ یہاں سے اُردو کا جو شاعر اُٹھتا ہے وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ اُبھرتا نہیں۔ فی الحال جتنے مشاہیر اہلِ قلم یہاں ہیں۔ جن کے نام ادب کی زندہ صفوں میں شمار ہوتے ہیں، جن کا ہماری زبان کی ادبی تاریخ اندراج کرے میں نام آتا ہے، وہ سب ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ہُنر کی پہلی کرن کسی اور فضا [illegible]

---

[1] "تیشہ" مجموعۂ کلام ظفر گورکھپوری، صیقلیہ، پاٹھ روڈ، کُرلا بمبئی، ۷۰ قیمت 3/50

کہ جوار دادیاں جس اچھی فنی تعمیر ہیں۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور اور حیدر آباد جیسے مقامات پر جو اُردو کی ٹکسال سمجھے جاتے ہیں، اپنا سکّہ چلایا تھا۔ جنہوں نے اُن کے فن کو صیقل کیا ہے اور جدید تریں، چنانچہ سے شہرت کو یہ پروانۂ عطا کئے جو سکّے ٹکسال سے باہر ڈھلتے ہیں، کھرے ہونے کے باوجود بعض اوقات "سکّۂ چہوشاہی" والی خصوصیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غالب جیسے فارسی شاعر کو ایرانیوں نے اپنی تاریخِ ادب میں جگہ نہیں دی۔ حالانکہ اُن کا کیا اُن کے شاگردوں تک کا کلام ایران کے کتب خانوں اور ادبی حلقوں تک پہنچ چکا تھا۔ اور اگر آن کے ہم عصر ایرانی شاعروں کا کلام آج بھی بغور دیکھا جائے تو سوائے اس کے کہ فرانسیسی اور انگریزی شاعری کی نقالی میں کچھ نئے تجربے ہوئے اور کچھ سیاسی حالات کی کشمکش نے نئی آوازیں پیدا کیں اس کے علاوہ کم ایسے نمونے ملیں گے جو غالب کے فکر و فن کی حدوں تک پہنچتے ہوں۔

کہتے ہیں کہ غالب نے عمر کے آخری حصّے میں تقریباً اپنے ہم عصر فارسی شاعر قاآنی کا کلام منگا کر دیکھا اُس کی غنائی آوازوں سے متاثر بھی ہوئے۔ ایک آدھ چیز بھی اس نمونے کی لکھی مثلاً "تقاضا" یا "یا ہو" والی غزل، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے "قاآنی نے غالب کا کلام نہیں دیکھا تھا اور نہ وہ اس کی گہری معنویت، شوخی اور سنجیدگی کی بے مثل آمیزش و آویزش سے، جو اُس کی باریک فنکاری ہے، متاثر ہوا تھا۔ غالب کی شاعری کا کینڈا کچھ ایسا تھا کہ وہ انیسویں صدی کے فارسی ادبیات میں اپنی جگہ نہ بنا سکا اور اسی لئے کوئی اثر نہ چھوڑ سکا۔ اس کی اپیل محدود ہو کر رہ گئی۔ انجام ہمیں معلوم ہے۔

فن پارے کی اپیل کا کسی حلقے میں ایک مقررہ زمانے میں، ایک محلے یا ایک طرح کے لوگوں میں محدود ہو جانا ہر شاعر اور فنکار کے لئے فکر کی بات ہونی چاہئے یہ ایسا چور زخم ہے جس سے بے نیاز ہو جانا یا بے پروا ہو جانا خطرناک ہے۔ ظفر گورکھپوری کی ابھی ابتدا ہے اُن کا اتنا اچھا کلام اول سے آخر تک پڑھتے وقت میرا خیال بار بار اس نکتے کی طرف بھٹکا ہے اور یہ تاثر یا مضمون پڑھتے وقت بہتوں کو غلط فہمی ہوگی کہ میں اصل موضوع سے خود بھٹک گیا ہوں یا اوروں کو بھٹکا رہا ہوں۔

منشا ہرگز یہ نہیں کہ شاعر آفاقی ہو تبھی مانا جاتا ہے یا ماہ و سال کا جگر کاٹ کر جی لیتا ہے۔ ساری آفاقیت دھری رہ جائے اگر اس کے تلے کی کیل غائب ہو۔ یہ کیل یا محور ہے فنکار کا مقامی پن یا اپنے گرد و پیش سے اس کا برتاؤ۔ کوئی ایک دوسرے سے کٹتا نہیں لیکن ہر عہد میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جہاں رہے، جیسے رہے جو دیکھا جو برتا جو بھگتا۔ جو میں رہے سہے وہ مناظر اور وہ مظاہر کس حد تک کس روپ میں کس جذبے سے فنکار نے فن کے آئینے میں اُتارے ہیں۔ اسی کی ایک سادہ سی اور تازہ ترین مثال ہے جگر کی شاعری۔ جگر مراد آبادی کے موضوع بہت ہی محدود ہیں۔ اِنے گنے، اُن کا مطالعۂ کائنات اس سے بھی زیادہ محدود معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کے معاملات میں بھی کچھ بڑے نشیب و فراز یا حادثات نہیں ہیں جو شخصیت میں رنگا رنگی، وسعت اور گہرائی پیدا کرتے لیکن انہیں اپنے جیتے جی جو پیغمبرانہ مقبولیت نصیب ہوئی اور ابھی بہت جئیں گے اس راز کا سُراغ کچھ اس شعر میں ملتا ہے:

اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے (جگر)

یہ بات اوپری دل سے نہیں کہی گئی نہ غزل کے کُنبے کا جنام اُٹھائی گیرا یعنی قافیہ اس شعر کو گھسیٹ کر لایا ہے۔ یہ اُن کا زندگی بھر کا رویّہ تھا۔ یہ اُن کا نقطۂ نظر تھا۔ اور یہیں اہلِ سیاست کے فرض اور ایک محبوب فنکار کے برتاؤ میں ٹکراؤ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ٹکراؤ اُس نسبت ازلی کے ہاں بالکل ہی کھُل کر زبان پر آگیا جب ہندوستان کی تقسیم کی فضا میں اور اس کے بعد جگر کی محدود دنیا درہم و برہم ہوئی۔ "آجکل" کی ردیف میں جو غزل اُنہوں نے کہی اور اسی قسم کی دوسری غزلیں بعض بڑی بڑی نظموں پر بھاری ہیں جو اس زمانے میں اسی خلش کا برملا اظہار کرنے کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جگر کی اِن غزل نما نظموں میں شاعرانہ فنکاری کا حُسن بھی ہے، فنکارانہ صداقت بھی اور وہ مقامی رنگ بھی جس کی آب کے بغیر نہ کوئی فن غیر مقامی ہوتا ہے نہ آفاقی۔ نہ خود جیتا ہے نہ جینے والوں کو نشاط کی دو گھڑی عطا کرتا ہے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو ظفر گورکھپوری کا یہ ۱۴۰ صفحوں پر بکھرا ہوا کلام بہت کامیاب ہے۔ یہ ہمیں اُن گلی کوچوں میں لئے پھرتا ہے جہاں میونسپلٹی کے ذمّہ دار عہدہ داروں تک کا گزر نہیں ہوتا، ہمیں اُن دُکھی جیونوں سے ملاتا ہے جو دستو ئیفسکی کے ناولوں میں، گورکی اور پریم چند کی کہانیوں میں ہم سے مل چکے ہیں۔ ہمیں اس شاعر کی روح سے آشنا کرتا ہے جو اپنی مُرادوں اور تمنّاؤں کا سوگوار ہی نہیں بلکہ مزاج زندگی سے برہم بھی ہے۔ سوگواری اور برہمی میں اتنا فاصلہ تو ہے ہی جتنا عباس علمدار اور اُن کے مرثیہ خوانوں میں تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

"کچھ بے نام بگولے" اس مجموعے کی عام، مگر نمائندہ سی نظم ہے۔ مختصر ہے اس لئے پُوری نقل کرتا ہوں۔

یہ ہے مرے اجداد کا ورثہ، یہ ہے مرا ماحول، یہ گھر
پھیکی پھیکی کچھ صبحیں ہیں، کچھ راتیں کجلائی یہاں
دُور سے تک کر رہ جاتے ہیں اُڑتے بادل پیلا چاند
آگ سموتی ہے زخموں میں فطرت کی برنائی یہاں
داغوں کی لو جب اونچی ہوتی ہے تو نور برستا ہے
زخموں کی گلکاری سے ہوتی ہے محفل آرائی یہاں
آنگن ہے یا اک چوراہا، بھُولی بسری یادوں کا
دم لیتی ہے بیٹھ کے اکثر دل کی شکستہ پائی یہاں
کوئی تمنّا مرتی ہے تو عید کا عالم ہوتا ہے
کوئی جنازہ اٹھتا ہے تو بجتی ہے شہنائی یہاں
ایمانوں کی بستی اُجڑی آگ لگی پہیاد نہیں
کوئی خزانہ کب بھونکا اور کب بجلی لہرائی یہاں
راحت جیسے بہتا پانی، غم جیسے مضبوط چٹان

پل دو پل کا ملنا ہے اور برسوں کی تنہائی یہاں
آنکھیں جیسے سوکھی نہریں، سینہ جیسے کوئی کھنڈر
ایسی برسات نہ کوئی مدھ ماتی پُروائی یہاں
درد کا شعلہ پھونک چکا ہے چہرے کی شادابی کو
سوزِ جگر سے صندل جیسی پیشانی سنولائی یہاں
پھر بھی کسی کی جنّت سے یہ دوزخ بہتر ہے کہ ظفر
کچھ بے نام بگولے ہیں جو لیتے ہیں انگڑائی یہاں

اب یہ مصرعے ؎

آنگن ہے یا اک چوراہا بھولی بسری یادوں کا
راحت جیسے بہتا پانی، غم جیسے مضبوط چٹان
پل دو پل کا ملنا ہے اور برسوں کی تنہائی یہاں
سوزِ جگر سے صندل جیسی پیشانی سنولائی یہاں

وغیرہ ایسے مصرعے ہیں کہ صرف ایک موضوع کی حاشیہ گیری کے لئے نہیں لکھے جا سکتے ان میں جتنا کرب ہے اُتنا ہی ضبط بھی، شعور بھی اور صداقت بھی۔ صداقت کو ترسی ہوئی اس دنیا میں فنکار کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ہر ایک آنسو سچے موتیوں میں تُلنے کے قابل ہے۔
یہ ہمارا نوجوان شاعر جبھی کا نہیں جب اُس نے اپنی بہن نجمہ سے خطاب کر کے یہ نظم کہی ؎

یہ تو میری بھی تمنا ہے مری پیاری بہن
جگمگائیں ترے خوابوں کے حسیں تاج محل
مسکرائے تری پامال اُمیدوں کا جہاں
نکہت و رنگ لٹاتی ہوئی آئے بارات
گونج شہنائی کے نغموں سے یہ آنگن بیکل
جھوم اُٹھے تو مہکتے ہوئے پیراہن میں
ہاتھ پیلے ہوں ترے، ماتھے پہ چمکے افشاں

پر دُلھن تجھ کو بناؤں تو بناؤں کیسے؟
میرے دامن میں تو افلاس ہے بیکاری ہے
میں جہاں ہوں، وہاں جز حرص و ہوس کچھ بھی نہیں
ہر قدم لُوٹ ہے، ہر موڑ پہ عیاری ہے
اک تمنا کے سوا کچھ مرے قبضے میں نہیں،
جسم ہے جان ہے جو کچھ بھی ہے سرکاری ہے

ہائے یہ شہر، یہ زرداروں کا فردوس جہاں
[illegible]
چند کلیاں ترے گجرے کیلئے مل نہ سکیں
موسمِ گل کو تکتا ہی رہا برگِ سمن
میری نجمہ تری صورت ہیں ہزاروں بہنیں
جن کو بے مانگے بننے نہیں دیتا ہے دلھن
جن کی آنکھوں میں ہے شوخی نہ نگاہوں میں غرور
عارضوں میں کوئی غنچہ ہے نہ شعلہ نہ کرن
جن کے ماتھے پہ دمکتا نہیں جھومر کوئی
جن کے ہاتھوں میں کھنکتے نہیں پاتے کنگن
اور اسی شہر میں مجھ جیسے ہزاروں بھائی
جن کی تقدیر میں افلاس ہے یا دار و رسن

مشورہ ہے مرا، اس شہرِ زر و سیم میں اب
میرے قدموں سے قدم اپنے ملا لے تو بھی
میں نے سینے میں چھپا رکھی ہے اک برقِ تپاں
اپنے ہر زخم کو اک شعلہ بنا لے تو بھی
تیری تقدیر میں شادی کا دوپٹہ جو نہیں
باندھ لے سر سے کفن، تیغ اُٹھا لے تو بھی

یا "بیلا" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ پوری کہانی ہے جسے چند مصرعوں میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے ؎

کتنے اجسام ہیں جو روز جواں ہوتے ہیں
اور شہنائی کی آواز نہیں سن سکتے
ایک مالی کے گھرانے میں جنم پا کر بھی
اپنی مرضی سے کوئی پھول نہیں چن سکتے

جل گیا کتنے دھڑکتے ہوئے سینوں کا گداز
نو عروسی کی تمنا نہ اُبھرنے پائی
مفلسی جرم کو پروان چڑھاتی ہی رہی
بھر گئی گود مگر مانگ نہ بھرنے پائی
دل کے شعلوں کو ضرورت ہے فروزاں رکھنا
موت درمانِ شبِ غم تو نہیں بن سکتی
زندگی زخم سہی، دل کا شگفتہ ہوا زخم
موت اس زخم کا مرہم تو نہیں بن سکتی

پاؤں ... سے بھاگتے بیٹھ

اپنے اشکوں میں مری آگ ملاتے بیٹھ

ایک اور نظم ہے اسی لب و لہجہ کی، بالکل سادہ سی، بالکل ویسی جیسی
خود شاعر کو پیش آئی ہوگی اور بہت ایسے لوگوں پر بیتی ہوگی جو شعر میں اسے بیان نہیں
کرسکتے ۔ وہ نظم ہے "دشمن"۔

ظفر گورکھپوری اور ان کی شاعری، اس شاعری کے پس پردہ ذہنی
صلاحیتوں کا تعارف نا تمام رہے گا اگر میں ان کی آپ بیتی کا اہم ٹکڑا نہ سنا دوں جو
اُن کے فن کی ایک غاشدہ نظم بھی ہے اور اپنے گرد و پیش سے شاعر کے برتاؤ کی ایک تصویر بھی

"سرِ بازار"

میرا پیشہ

مرا پیشہ اندھیروں پر سدا یلغار کرنا ہے
مجھے ظلمات میں پیغمبرِ نورِ سحر کہئے
مقدس ہوں مجھے انسانیت کا راہبر کہئے
میں جن ذرّوں کو چھو دوں وہ جواہر لعل ہو جائیں
مرے گھر سے لٹیرے، ایلچی بن کے نکلے ہیں
برا مرہون مصر و روم کی دانش کا اُجیالا
وطن میں صرف دریوزہ گری جن کا مقدر تھی،
اُنہیں میں نے تلک، ٹیگور اور غالب بنا ڈالا

مرا حاصل:

مرا حاصل، مری محنت، مری خدمات کا حاصل
وہی سوکھے ہوئے ساون وہی شعلوں کی برساتیں
وہی مقروض ہستی، وہ ٹھس پرباد گراں جیسے
وہی جلتے سلگتے دن، وہی ہاری تھکی راتیں

مقدر

اک مایوس کا مقدر
ایک بوڑھی ماں
نحیف و زار بیوی
میلے کپڑوں میں کچھ بچے
جو اپنے باپ کی مجبوریوں سے پڑھ نہیں سکتے

(اختصار کے بعد)

لم کے بھرپور تاثر کو صرف شاعرانہ صلاحیت، جذبے کی صداقت اور فکر کا
ل سانچہ ہی درکار نہیں ہوتا بلکہ خود اعتمادی بھی چاہیئے ۔ یہ ایسی بے رحم صلاحیت
ہے کہ غالب نے پختگی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اپنے کلام کا جو انتخاب کیا اُس میں اپنے
جگر پاروں کا بڑا حصہ چاک کر کے پھینک دیا اور واسطے نمونے کے جن چند
اشعار اس میں سے رہنے دیئے جن کی آج بھی عجیب عجیب تشریحیں کی جاتی ہیں۔

ظفر گورکھپوری رَو میں اُڑے چلے جاتے ہیں۔ ختم کر، قلم کے
بجائے نشتر ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھتے کہ کہاں کون سا لفظ، کون سی تصویر، کون
سا استعارہ خواہ مخواہ چلا آیا ہے جسے بے دردی سے چھیل دینا چاہیئے۔ اتنا
شعور نے اور گانے والوں کے پاس چاہ اور چھلنی بھی ہوتی ہے ورنہ سارا مزہ
کرکرا ہو جائے ۔

اوپر کی نظم میں،

جہاں جبراً محافظ کہنا پڑتا ہے لٹیروں کو
جہاں تاریک گلیوں میں ستارے قتل ہوتے ہیں

قسم کے مصرعے نثر کے بے رنگ جملے ہیں ۔ بربھی میں نظم کی شعریت کا ابھی پاس نہیں
رہا یا ۔ "اُنہیں میں نے تلک ٹیگور اور غالب بنا ڈالا"
میں نہ صرف یہ کہ شخصیتوں کی آپ بیتی سے ناواقفیت کا اظہار ہے بلکہ ایک بے جوڑ
فہرست بھی ہے ۔ بڑے بڑے نام لیتے وقت اگر اُن کے باہمی ربط اور تناسب
کا لحاظ نہ رکھا جائے تو شاعر خود کوئی خاص تاثر پیدا کرنے کے دھوکے میں رہے تو
رہے پڑھنے والے دھوکے میں نہیں رہتے ۔

ایک اور جگہ ظفر نے اردو پر جو ایک جاندار نظم کہی ہے وہ شروع
یہاں سے ہوتی ہے

کرشن کی مرلی کی دھن، چکبست کے دل کا قرار
میں فراق و اختر و بیدی کے خوابوں کی دلھن
فلسفہ غالب کا ہوں، یا میر کا سوز و گداز

نہ اِن ناموں میں زمانے کی کوئی نسبت ہے نہ تاریخ ادب سے کوئی رشتہ ہے ۔
اگر کرشن سے مراد کرشن چندر ہیں جن کا شمار جوانوں میں ہوتا ہے تو وہ دوسرے یا
تیسرے مصرعے میں آتے ۔ یہاں چکبست سے بزرگ ٹھہرے بلکہ فراق سے بھی
بوڑھے قرار پائے اور سرشار و نغمہ سے بھی اوّل رہے اور اگر کرشن وہ مرلی منوہر
ہیں تو یہاں اس بات کی تُک کیا تھی ۔؟

ایسی بد پرہیزی کی بہت سی خامیاں اس مختصر مجموعے میں مل جاتی
ہیں ۔ غالباً یہ شاعر کیفی کی شاعری ہی سے نہیں اُن کے خطیبانہ انداز سے، جو شیلے طرزِ بیان
سے اور مشاعروں میں، پبلک جلسوں میں جو اُنہیں داد ملتی ہے اس سے بھی متاثر ہوئے
ہیں ۔ بُرا ماننے کی بات نہیں، سوچنے کی ہے کہ ہجوم کی نفسیات جو انقلاب برپا کرنے
کے لئے شعلہ جوالا ہے وہ کسی بھی فن کو اعلیٰ مدارج طے کرانے کے لئے کمزور سہارا ثابت ہوتی
ہے ۔ کسی خاص کیفیت یا ماحول میں، کسی خاص تحریک پر جو ہجوم ہوتا ہے وہ تھوڑی
دیر کو حمایت یا مخالفت کے شدید تناؤ میں بسر کرتا ہے ۔ یا ہر بات ہاں، یا ہر بات نا۔

[illegible] یا انداز [illegible] صول
[illegible] سا ہنر چاہئے بس ایسی ہی لوگ
[illegible] نفسیات کا شکار نہیں رہتے، مگر
[illegible] امتیاز کے مالک اور اپنے کمرے بند ہنس لینے کے
[illegible] ہو جاتے ہیں۔ (بہت سی واہ واہ وصول کر لینے کے بعد کسی مجمع کے پیچھے دبے قدموں
چلا کر دیکھئے اور سنئے کیا باتیں ہوتی ہیں۔)

ہر فنکاری جو مجمع کو تصور میں رکھ کر کی جائے اُسی مجمع کے افراد کے ذہن و شعور تک بے پروائی کا ثبوت نہیں ہو جانی چاہئے۔ ظفر گورکھپوری کی شاعری ابھی تو اس متعدی مرض کا شکار رہی آگے چل کر ممکن ہے زندگی کے تجربے، مطالعے اور مشق کی پختگی اس سے نجات دلوا دے۔

امیجری — کنایوں، استعاروں اور تشبیہوں کی بنائی ہوئی تصویر ہو یا نادر گئی ناموں کا تذکرہ اس موقع پر عرش سے فرش تک زقند نہیں بھرنی چاہئے تخلیق کے مرحلے سے گذرنے والے تمام آدم زادوں کے لئے یہاں ایک ہی قانون چلا آیا ہے احتیاط اور پرہیز۔ ہونے والی ماں کو جتنا پھرنا لازم بتاتے ہیں لیکن سخت سے زیادہ بوجھ اٹھانا اور کودنا پھاندنا منع ہے، چاہے جنین کے خلاف جنگی محاذ کے نعرے ہی کیوں نہ لگ رہے ہوں۔

الفاظ کا ایسا سیلاب بعض اوقات کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑیوں سے برسات کے ندی نالے شور مچاتے ہوئے اُترتے ہیں لیکن روز روز کا یہ سیلاب اُن لوگوں کی جان کا عذاب بن جاتا ہے جو ہموار وادیوں میں یا پہاڑ کے دامن میں بستے ہیں۔ ابو الکلام کی نثر اور جوش کی نظم، ان حضرات کی تو جوانی کا جوش نہیں بلکہ ان کے مزاج کا ایک حصّہ ہے۔ اور اسی اعتبار سے اُردو ادب کے مزاج کا بھی ایک حصّہ بن گئی۔ لفظوں کا طمطراق، ان کی کثرت اور شور و شش، تشبیہات کا ریلا یہ کوئی بہت اچھے طور طریق نہیں سمجھے جاتے مہذب قوموں کے ادب میں۔

"اک رنگ کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"

عمدہ کاریگری کا اعلان ہے اور اس کا اشارہ بھی کہ چاہے سو رنگ آپ کو نظر آئیں لیکن یہ رنگا رنگی دراصل ایک ہی رنگ کے مضمون پر چڑھی ہوئی قلعی ہو گی۔ اُردو والے اس کاریگرانہ بے مغزی کو بھگت رہے ہیں اور بھگتیں گے۔

الفاظ کا ذخیرہ ہماری زبان کے پاس بے حساب ہے۔ آج سے کم و بیش اسّی برس پہلے اُردو ہندی کے لغت ساز انگریز عالم جے، پلاٹس نے اپنے دیباچے میں، اس کے ذخیرے کو دیکھ کر حیرت اور رشک کا اظہار کیا تھا۔ تب سے اب تک یہ ذخیرہ اور بڑھ چکا ہے۔ مترادفات بہت ہیں۔ ایسے الفاظ و تراکیب بہت ہیں جن سے ہمارے شاعروں نے وہی کام لیا جو کھوٹ چُننے پچڑوں

[illegible] کے [illegible] وہ جتنے ہوا اس طرح کی ایک جرأت اور بہت [illegible]
ہے۔ "اے دوست"، "مت پوچھ"، "آہ"، "آف"، "پہیم"، "پیہم"
"کیا کہئے"، "بصد حشم" قسم کے الفاظ و تراکیب تو پہلے سے بکثرت موجود تھے۔
اب ان میں "ہی"، "بھی"، "سی"، "تو" جیسے حروفِ عطف کا بےجا استعمال
اور "اجرئیں"، "پگھلتے ہونٹ"، "دعائیں"، "کی قسم"، "بہا لے کر"، "گمنام"
"حشر خیز"، "محشر انگیز"، "کشمیر و بنگال و اجنتا"، "دار و رسن" جیسے معنی خیز
الفاظ بھی معانی سے بے نیاز ہو کر جوں توں گھس پڑے ہیں۔ ایسے چالو اصطلاحوں
کا مالِ مفت کی طرح استعمال کرنا اچھے اچھے مشاق لوگوں کے کلام کو پایۂ اعتبار سے
گرا دیتا ہے۔

الفاظ کو بھرتی کی جگہ ٹھونکنا یا پہاڑی سیلاب کے مثال اندھا دھند رولا کر دینا اُبھرتے ہوئے شاعروں اور نثر نگاروں کے لئے فال نیک نہیں ہے۔ شاعر ذاتی زندگی میں لکھ لُٹ ہو تو بہت اچھا کہ اُسے عاقبت کی فکر نہیں رہتی اور شاعرانہ جرأت (جو دراصل جرأتِ رندانہ کی دلکش صورت ہے) عمر کے ہر حصّے میں برقرار رہتی ہے۔ لیکن لفظوں کے صنّاع کو لفظوں کی فیاضی کبھی راس نہیں آتی۔ یہاں بخیلوں سے بڑھ کر بخیل اور سود خواروں سے زیادہ سود خوار ہونا چاہئے — لفظوں کے سرمائے کی فطرت یہی ہے۔ کیا کیجئے!

ہمارے ظفر گورکھپوری کے یہاں اچھے اچھے شعر اور پوری پوری خوبصورت نظمیں موجود ہیں۔ بے تکلفی کی ایک فضا ہے، بیباکی کا لہجہ ہے، نئے شعر اور نئے شاعر کی للکار ہے۔ کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کا خوشگوار اثر بھی موجود ہے جو نیچرل بات ہے۔ لیکن لفظوں کے آمد و خرچ کے بارے میں اچھا ہوتا کہ وہ ان دونوں کے ہم عصر مجروح سلطان پوری سے کچھ سیکھتے۔ معاملے کی نوعیت سے آگاہ تو یہ سب لوگ ہیں لیکن وہ جو لفظوں کی بخیلی کے کلاسیکی نکتے کو سمجھتا ہے اور برتتا ہے اچھے نوعمر نظم نگاروں کیلئے اپنے کلام سے بعض اچھی مثالیں پیش کر سکتا ہے۔

جس شاعر نے چھ سات برس کی مشقِ سخن میں ۵۴ اچھی جاندار، تر و تازہ، پابند اور آزاد نظمیں اور کوئی ۲۵، اپنے طرز کی غزلیں منتخب کر کے اس مجموعے میں رکھی ہیں اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ دیر تک کسی ایک رنگ کی تقلید میں مبتلا رہے گا۔ موضوعات میں موضوعاتی نظموں میں اور بعض غزلوں میں اُس کا اپنا بے تکلف اور بے محابا رنگ ہے جو کچھ اس نغمے کے شعروں میں صاف ملتا ہے

نازشِ شوق ہیں ہم سوختہ سامانِ بہار
پھولوں کی آنچ سے جلتا کوئی ہم سے سیکھے

شاہد کبیرپوری

غزل

اپنا ہی ... [illegible]

دنیا سے کیا آنکھ ملائیں دنیا کس کی ہوتی ہے یارو

جھوٹی ہنسی پہ ریجھ گئے سب، من کا درد نہ سمجھا کوئی

آنسو سے اُلفت ڈگرا، شبنم ہو یا شعلہ ہے یارو

عشق میں کتنے کول چہرے سانولے ہو کے رہ گئے ہیں

پونچھ کے آنسو سیکھو ہنسنا پیت میں کس کا بس ہے یارو

دیکھ لو ہم بھی جھیل رہے ہیں کچھ چپکے سانسوں کے کانٹے

مرنا تو ایک ریت تھی لیکن جینا بھی اک ریت ہے یارو

سپنے دیکھ کے رشتے والے جاگے تو ہنس ہنس کر پچھتائے

جوڑی توڑیں سانجھ کے وعدے بھولا کی بس پریت ہے یارو

جھوٹ کہو سچ، تم کچھ بھی کہو، لو آپ نے وہ بات کہی ہے

سمجھو تو کویتا کا رس ہے گا ڈالو اک گیت ہے یارو

* *

* * *

غزل

افتخار اعظمی

اِس طرف صنم تنہا، اُس طرف حرم تنہا
غم گسار رکھتے ہیں آج صرف ہم تنہا

صد ہزار آنکھوں کے شعلوں کی ضرورت ہے
رات سے نہ جیتے گی ایک چشمِ نم تنہا

چاشنی ستم کی بھی اک ذرا ملا لیتے
بدگماں بنا دے گا آپ کا کرم تنہا

یاد کر کے کڑھتے ہیں تیرے ہاتھ کی نرمی
زندگی کی راہوں میں ہم قدم قدم تنہا

زندگی کا ہر لمحہ ایک دوسرے سے ہے
کچھ نہیں ازل تنہا، کچھ نہیں عدم تنہا

ابوسلمان شاہجہانپوری

غبارِ خاطر ـــــ حصۂ دوم

ایک یاد ـــــ ایک ماتم

قارئین اس عنوان کو دیکھ کر تعجب کریں
گے اور پوچھیں گے کہ "غبارِ خاطر حصۂ دوم" مولانا ابوالکلام
آزاد کا کون سا مجموعۂ مکاتیب ہے؟ واقعہ یہی ہے کہ اس
نام کا کوئی مجموعۂ مکاتیب موجود نہیں اور نہ چھاپا جا سکا
ہے۔ یہاں ہم صرف اس کی یاد اور اپنی محرومی کے
احساس کو ایک [illegible] ترتیب دینا چاہتے ہیں۔

قلعہ احمد نگر کی اسارت کا سارا زمانہ مولانا آزاد نے
اپنے افکار کی ترتیب، تصنیف و تالیف اور بعض مصنفات کی
تکمیل میں بسر کیا۔ مولانا نے اس زمانے میں کیا کیا لکھا
اس قدر لکھا یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اس کا کچھ
اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر سید محمود صاحب
نے ایک بار پوچھا کہ مولانا آزاد قلعہ احمد نگر میں کچھ لکھتے
تھے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں۔ لکھتے تو ضرور تھے
کیا لکھتے تھے یہ معلوم نہیں۔ پرزوں کا ڈھیر ان کے
گرد لگا رہتا تھا۔ لیکن اگر ہم کسی دوسری شہادت کو
تلاش نہ کریں تو صرف غبارِ خاطر کی روشنی میں یہ
کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اس تمام مدت میں تصنیف و تالیف
اور مصنفات کی تکمیل میں مصروف رہے اور یہ
کیفیت ۹ اپریل ۱۹۴۴ء کے حادثے یعنی زلیخا
بیگم کے سانحۂ ارتحال کے بعد بھی حسبِ معمول
جاری رہی۔ اس حادثے کی وجہ سے فرق نہیں آیا۔

[illegible]

[illegible]

حال بھی رک گئی تھی اور اپنی [illegible] گتھیوں میں گم تھی۔ اگرچہ
اس کے بعد بھی بعض مصنفات کی تسوید و ترتیب کا کام
بدستور جاری رہا اور قلعہ احمد نگر کی اور تمام مصروفیات بھی بغیر
کسی تغیر کے جاری رہیں۔ تاہم یہ حقیقتِ حال چھپائی
نہیں جا سکتی کہ قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و
صورت کی تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے
ہلنے سے بچا لیا تھا۔ مگر دل کو نہیں بچا سکا تھا۔

دلِ دیوانہ دارم کہ در صحرا ست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ حالات کی تحریک کام
کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں، مگر اب سلسلۂ
کتابت کی وہ تیز رفتاری مفقود ہو چکی تھی جس نے ابتدائی حال
میں طبیعت کا ساتھ دیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر
سے بانکوڑا میں قید تبدیل کر دی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں
نے آخری جواب دے دیا۔ اب صرف مصنفات کی تکمیل
کا کام جاری رکھا جا سکا اور کسی تحریر و تسوید کے لئے طبیعت
مستعد نہ ہوئی۔

(مکتوب نسیم باغ۔ مورخہ [illegible] ستمبر ۱۹۴۶ء)

لیکن یہ "بعض مصنفات" کیا تھیں اور کن چیزوں
کی تحریر و تسوید میں مولانا مصروف رہے، کوئی قطعی بات
اس کی بابت نہیں کہی جا سکتی۔ دنیائے علم و ادب کے سامنے
تو بس "غبارِ خاطر" ہی آئی ہے۔ لیکن یہ بات یقینی
ہے کہ نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خان شروانی کے علاوہ بعض دیگر
احباب و اعزہ کے نام بھی مکاتیب تحریر کئے گئے تھے۔

اور صدیق [illegible] کے نام مکاتیب [illegible]
[illegible] تک نہ پہنچ سکے تھے۔ [illegible]
کے تھے اور ان کو دوسرے مجموعے [illegible]
گیا تھا۔ "غبارِ خاطر" میں نواب صدر یار جنگ شروانی کے
نام آخری مکتوب ۱۶ ستمبر ۱۹۴۳ء کا ہے ([illegible]
طبع ثالث) لیکن سیاسی مکاتیب کے سلسلے کا آخری
مکتوب ۳ مارچ ۱۹۴۵ء کا تھا یعنی سیاسی مکاتیب
کی تحریر کا سلسلہ غبارِ خاطر کے مکاتیب کی تحریر کے
ڈیڑھ سال بعد تک جاری رہا۔ اس سے اندازہ
لگایا جا سکتا ہے کہ سیاسی مکاتیب نہ صرف تعداد
میں زیادہ ہوں گے بلکہ اس مجموعے کی ضخامت بھی
"غبارِ خاطر" سے دو چند اور سہ چند ہوگی۔

جس زمانے میں "غبارِ خاطر" کی اشاعت کے
حقوق کے لئے ہندوستان و پاکستان کے متعدد
پبلشرز تگ و دو کر رہے تھے۔ ان میں ایک صاحب
علاء الدین خالد (سابق مالک حالی پبلشنگ ہاؤس
دہلی) بھی تھے اور غبارِ خاطر کی اشاعت کا قرعۂ فال
انہیں کے نام نکلا۔ خالد صاحب کے آصف علی مرحوم
سے بھی تعلقات تھے۔ آصف علی کا مشورہ یہ تھا کہ تم نواب
صدر یار جنگ کے مکاتیب لینے کی بجائے دوسرے
مکاتیب جو سیاسی نوعیت کے ہیں، مولانا سے حاصل کرو
ان کے نزدیک ان مکاتیب کی اشاعت کی افادیت
زیادہ تھی۔ خالد صاحب بھی اس پر آمادہ تھے۔ اور
مولانا نے ان مکاتیب کا مسودہ انہیں دکھایا بھی لیکن
پھر کہا کہ ان تحریرات کی حیثیت مکاتیب کے علاوہ بھی
کچھ ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ بعض مباحث بڑھا
دیئے جائیں۔ اس کے بغیر اس کی اشاعت مناسب نہ
ہوگی۔ اور اس وقت جبکہ ہم تاریخ ہند کے [illegible]
ایک خاص موڑ پر پہنچ گئے ہیں اور منزل ابھی صاف نظر
آ رہی ہے، اس کے لئے ابھی توقف کرنا چاہئے۔ یہ
کہہ کر مولانا نے مسودہ واپس لے لیا اور اس طرح
ایک عظیم تاریخی سرمایہ سے دنیا ہمیشہ کے لئے محروم

[illegible] ۔ مسجد کا امام و خطیب جس کا نام علی
[illegible] سے بھاگ کر نہروالہ چلا گیا۔

اُس نے وہاں جاکر راجہ کے دربار کے
امرا افسروں سے فریاد کی مگر کسی نے توجہ نہیں
کی۔ امام نے یہ حال دیکھ کر تدبیر یہ کی کہ گجراتی زبان
میں پڑا واقعہ ایک قصیدہ میں نظم کیا اور خبر رکھی
کہ راجہ کب شکار کو کب جاتا ہے۔ جب شکار کا
وقت آیا۔ امام وہ قصیدہ لے کر راستے میں ایک جھاڑی
میں چھپ گیا۔ جب راجہ اُدھر سے گذرا امام
فریادی بن کر سامنے آگیا اور عرض کیا کہ اس کا
یہ قصیدہ سُن لیا جائے۔ راجہ نے ہاتھی روک کر
اُس کی مظلوم عرضداشت سنی اور بہت متاثر ہوا
اور قصیدہ اُس کے ہاتھ سے لے کر ایک افسر کے سپرد
کیا کہ فرصت کے وقت مجھے پھر دکھایا جائے۔ راجہ
اُسی وقت شکار سے واپس آیا اور وزیر کو بُلا کر
کہا کہ میں تین دن تک محل میں رہوں گا اور آرام
کروں گا۔ ان تین دنوں کے درمیان مجھے کسی بھی
کام کے لئے مجھے تکلیف نہ دی جائے۔ بلکہ سب
کام تم [illegible]
[illegible]
تو تنہا کھمبایت کی طرف روانہ ہوا۔ نہروالہ سے
کھمبایت چالیس فرسنگ ہے مگر اس نے ایک
دن رات میں اس راستے کو طے کیا اور وہاں
بھیس بدل کر ایک سوداگر کی صورت میں اترا
گلی کوچوں، اور ہر جگہ گھوم کر واقعہ کی تحقیق کی
ہر ایک کی زبان سے یہی سنا کہ بیچارے مسلمانوں
کو بے گناہ مارا گیا۔ اور ان پر بڑا ظلم ہوا۔ راجہ
نے ہر طرح سے واقعہ کی تفتیش کی، اور ایک
لوٹے میں سمندر کا پانی بھر کر چوبیس گھنٹوں
میں راجدھانی واپس آگیا۔ صبح کو راجہ نے
دربار کیا۔ مقدمات سنے اور اُس کے بعد
مسجد کے امام کو یاد کیا۔ جب وہ دربار میں آیا
تو راجہ اُس کو حکم دیا کہ تم اپنی عرض داشت سناؤ
امام نے جب اُسے پڑھا تو ہندو درباریوں نے
کہا کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ راجہ نے آبدار کے ہاتھ سے
پانی کا وہ لوٹا منگوایا اور سب کو تھوڑا تھوڑا پانی پلایا۔
[illegible]
[illegible]
چونکہ اس معاملہ میں کسی وجہ سے [illegible]
[illegible] "اختلاف [illegible]"
کا خطرہ تھا اس لئے میں نے خود جا کر اس کی تفتیش
کی، اور مجھ پر ثابت ہو گیا کہ یہ مسلمان بے شک مظلوم
ہیں۔ میرے راج میں کسی جماعت پر جو میرے سایے
میں ہو ایسا ظلم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد اس نے
حکم دیا کہ برہمنوں اور پارسیوں میں سے جو اس جرم
کے مرتکب ہوئے ہیں ان کو سزا دی جائے۔ اور
مسلمانوں کو ایک لاکھ بالوترا (گجراتی سکہ) تاوان
دیا جائے تاکہ وہ اس سے مسجد اور منارہ بنالیں
اور امام کو خلعت اور انعام دیا۔ امام کو بخشی ہوئی
چیزیں مسجد میں بطور یادگار رکھ لی گئیں۔

محمد عوفی لکھتا ہے کہ آج تک (۶۲۵ھ)
یہ چیزیں موجود ہیں اور پرانی مسجد اور منارہ بھی۔

(ص ۲۶-۲۲۳)

ہندی کہانی

مچھلی ری تو سوکھتی کیوں نہیں ۔۔؟

جب بھی کوئی بچہ [illegible] کرتا ہے۔ تو کوئی دیدی

کی یاد آتی ہے اور اس کے ساتھ رانے بریلی والی خالہ کی وہ کہانی بھی یاد آجاتی ہے۔

ایک تھا راجہ! اُس کے سات بیٹے تھے

ایک بار وہ ساتوں راجکمار جنگل میں شکار کے لئے گئے۔ راستے میں اُنہیں ایک ندی ملی۔ خوبصورت ندی میں کافی مچھلیاں تھیں۔ راجکمار نے سات مچھلیوں کا شکار کیا اور اُنہیں گھر لا کر سکھایا۔ چھ مچھلیاں تو سوکھ گئیں۔ مگر ساتویں مچھلی سوکھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ راجکمار اُس مچھلی کے پاس گئے اور پوچھا۔

'مچھلی ری مچھلی تو سوکھتی کیوں نہیں؟

دھوپ نہیں لگتی۔

دھوپ کیوں نہیں لگتی؟

گھاس روکتی ہے۔

گھاس ری گھاس تو دھوپ کیوں روکتی ہے؟

مجھے گائے چرتی جو نہیں۔

بس اتنا سنتے ہی ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ خالہ جی بھی ہنسنے لگتیں۔ وہی اکیلی کوئی دیدی نہیں ہنستی تھیں بلکہ چپ بیٹھی رہتی تھیں۔

منّا، جگت، رمو، ہم سبھی یہی آٹھ نو سال کے تھے۔ کوئی دیدی [illegible] جو ہماری ہنسی کو [illegible]۔ مجھ پر اُن کی خاص نگاہ تھی۔ نہ جانے وہ کیوں مجھے [illegible] وہ بیٹھی رہتیں۔ شاید اسی لئے کہ خالہ جی کی کہانی [illegible] سب سے پہلے میں ہی ہنس پڑتا [illegible] نہیں ہنستا، [illegible]

پر غصہ کرتیں اور خالہ جی کو چھت کے اُس خاموش کمرے سے نیچے آنگن میں لے آتیں اور کہتیں۔

"اب انہیں کہانی مت سنائیے۔ یہ سبھی شرارتی ہیں ۔"

ہمیں اس سے دُکھ پہنچتا اور دیدی اس سے بہت خوش ہوتیں۔ خالہ جی کو آنگن میں لئے دیدی پھر سے وہ کہانی سننے لگتیں۔ اور ہم چھت کی منڈیر پر بیٹھ کر آنگن میں پیر ہلانے لگتے۔ تب دیدی دوڑتی ہوئی چھت پر واپس آتیں اور پیٹتے ہوئے کہتیں۔

"اگر چھت پر سے گر پڑے تو؟"

پھر میرا کان پکڑ کے مجھے کھینچتی ہوئی آنگن میں لے آتیں۔ میرے پیچھے میرے دوست بھی چل دیتے اور ہم کہانی سننے لگتے۔ خالہ جی کہہ اٹھتیں۔ ہاں تو سنو وہی کہانی۔

راجکمار گائے کے پاس گئے۔

گائے ری گائے تو گھاس کیوں نہیں چرتی؟

گوالا مجھے اجازت نہیں دیتا۔

او گوالے تو گائے کو گھاس چرنے کی اجازت کیوں نہیں دیتا؟

میری ماں کھانا جو نہیں بناتی؟

پھر وہی ہنسی اور کوئی دیدی کی مار۔ لڑکے ڈر کے مارے اپنے اپنے گھروں کو چل دیتے۔ میں اکیلا دیدی کے سامنے کھڑا رہتا۔ اُن کے پیٹنے کی چوٹ تو دُور کی بات رہی اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کس طرح مجھے ملتی تھیں۔

[illegible]

میں پوسٹل بابو تھے۔ اور اُن کا ذاتی مکان [illegible] میں تھا۔ سامنے گلی تھی اور گلی کے اُس پار [illegible] تھا۔ اُن کی پانچ بہنیں تھیں۔ پتا جی [illegible] دو گھونٹ بھی پی لیتے تھے۔ اُن کی ماں [illegible] رہی ہوں گی۔ اس لئے اُس حُسن کا اثر دو بڑی بہنوں میں بھی موجود تھا۔ ان ساری باتوں سے دیدی نے [illegible] واقف کرایا تھا۔ تب میں خالہ جی کے یہاں [illegible] میں پڑھا کرتا تھا۔

کوئی دیدی کا اصل نام پُشپا تھا۔ رنگ سانولا ہونے کی وجہ سے اُنہیں کوئی کہا جاتا تھا۔ اُن کی چھوٹی بہنیں اُن کی ماں کی طرح ہی خوبصورت تھیں۔

یہ اُنہیں دنوں کی بات تھی جب میں آٹھویں میں تھا۔ دیدی بھی ہائی اسکول میں پڑھا کرتی تھیں۔ ایک [illegible] نے جنم لیا۔ دیدی کو کسی نے خط لکھا تھا۔ اور وہ اُس خط کا جواب رات کی خاموشی میں لکھ رہی تھیں۔ مگر ماں کے ہاتھوں پکڑی گئیں۔ خوب مرمت ہوئی مگر دیدی نے خط لکھنے والے کا نام نہیں بتایا۔

میں چھوٹا تھا اور اس بات کو سمجھنا میرے لئے مشکل تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ کئی دنوں تک میں دیدی کو دیکھ نہ سکا۔ ایک دن چھپ کر کوئی دیدی سے ملنے گیا۔ وہ کمرے میں کھاٹ پر بیٹھی کراہ رہی تھیں۔ اندر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا اور اندر بلا لیا۔ دیکھتے ہی میں کانپ اٹھا۔ جسم پر ہلدی لگائی گئی تھی۔ جگہ جگہ پٹیاں بندھی تھیں اور [illegible] جانب منہ پر سوجن آگئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی [illegible]

"تجھے لکھنا پڑھنا نہیں ہے؟ میں ذرا بیمار [illegible] تو کیا مر گئی؟ دو چار دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ [illegible] گھر جاؤ اور سبق یاد کرو۔ شیطان کہیں کے!"

میں گھر واپس آگیا اور خوب رویا۔ دیدی کے لئے اُس روز میں پہلی بار رویا تھا۔

خالہ جی سے پتہ چلا کہ کوئی دیدی [illegible]

آہنگ

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد مرکزی تعلیم کا محکمہ کچھ بے جان سا ہو گیا تھا۔ کئی کانفرنسوں کے انعقاد اور کئی کمیٹیوں کے قیام کے بعد بھی ہم اپنے اصل مقصد سے دور رہے تھے۔ ایک عرصہ تک تعلیم کی وزارت بغیر وزیر کے ہی کام کرتی رہی اور وزیر مملکت کا [illegible] لیکن مسٹر چھاگلا نے جب سے اس وزارت کی باگ ڈور سنبھالی ہے اس میں زندگی کے کچھ آثار پیدا ہو چلے ہیں اور اس محکمے کی اصل اہمیت اب محسوس کی جا رہی ہے۔

پچھلے دنوں مسٹر چھاگلا نے اُن بیسیوں کمیٹیوں کے خاتمے کا اعلان کیا جو ایک مدت سے محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھیں۔ مسٹر چھاگلا نے ان کمیٹیوں کے کام سے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور انہیں عضوِ فضول سے تعبیر کیا۔ ان کمیٹیوں کے خاتمے سے ایک زبردست فائدہ یہ ہوا کہ تعلیم جیسا اہم موضوع اور اس سے متعلق سفارشات قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے سے بچ گئیں۔ اس سے فیصلوں میں بہت آسانی ہو گئی۔

پچھلے دنوں مدراس میں مسٹر چھاگلا نے انگریزی کو برقرار رکھنے کے تعلق سے بھی بڑی حقیقت پسندانہ بات کہی ہے۔ ہندی کی پوزیشن کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچاتے ہوئے انگریزی کی برقراری ہندوستان کی ہمہ جہتی ترقی کی ضامن ہے۔ یہ بات مسٹر چھاگلا نے بہت بلند آواز اور پُر خلوص یقین کے ساتھ کہی ہے۔ لہجے کی یہ پختگی مسٹر چھاگلا کے عزم کا پتہ دیتی ہے۔ کاش وہ انگریزی کے تعلق سے اس غیر یقینی صورتِ حال کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تاکہ قوم کو ایک الجھن سے فراغت نصیب ہو اور وہ اپنی توانائیاں ہندی اور انگریزی کے جھگڑے سے نکال کر کسی بہتر کام میں صرف کر سکے۔

مسٹر چھاگلا کو اردو کے متعلق بھی غور کرنا ہے۔ سہ لسانی فارمولا جسے تمام ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ نے منظور کیا تھا اور جسے وزیر اعظم نہرو کی تائید حاصل تھی کسی ریاست میں [illegible] رہا ہے۔ اگر مسٹر چھاگلا اس فارمولے پر سختی سے عمل کرنے کے احکام جاری کریں تو اردو والوں کی شکایات بڑی حد تک رفع ہو جائیں گی اور یہ زبان بھی اس ملک میں سر اُٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائے گی۔

اس شمارے میں

آوارہ سلطانپوری

ماں

(ماں کی موت کا ٹیلیگرام پاکر ——)

○

کتنا بے رحم ہے یہ ڈاک کا موجودہ نظام
آٹھ سو میل سے فوراً ہی خبر آ پہنچی

آٹھ سو میل کا دشوار سفر کھیل نہیں
غور تو کیجئے خطرے کے جو قاصد چلتا
یہ بھی ممکن ہے وہ خطرے کے پہنچا پنجاب
روک لیتی اُسے رستے میں کوئی مست شباب
پھانس لیتی اُسے چل دے کے کوئی بدر منیر
اور کر لیتی اُسے نفس کی لذت میں اسیر
یا کوئی ساحرہ جادو کی کرامت کے طفیل
ڈال دیتی اُسے پنجرے میں بنا کر طوطا
یہ بھی ممکن ہے اُسے راہ میں موت آ جاتی
یہ بھی ممکن ہے پہنچتا وہ مری موت کے بعد

جیتے جی میں یہ سمجھتا مری ماں زندہ ہے
میری الفت کا ستارہ ابھی تابندہ ہے

غزل

زہر کو امرت بگولے کو صبا کہنے لگے
غم سے گھبرا کر بتوں کو بھی خدا کہنے لگے

لوگ میرے حال پہ جب مرحبا کہنے لگے
کم نظر اس نعمتِ غم کو سزا کہنے لگے

کیا زباں پر اپنے دل کی بات لاتا جو ہے
اُف یہ دنیا دار اس کو بھی دعا کہنے لگے

عشق رسوا ہو کے خود پہنچا زبانِ خلق تک
حسن والے اس کو بھی اپنی ادا کہنے لگے

کیا کہوں اپنی وفا پر کتنی شرم آئی مجھے
میرے آگے لوگ انہیں جب بے وفا کہنے لگے

کیا ہوا گر ہم نے آوارہ کو آوارہ کہا
آج کل تو لوگ اچھوں کو برا کہنے لگے

خاک اور خون

خاک اور خون کی قیمت کیا ہے؟
خاک اڑ جائے ہوا میں تو پتہ بھی نہ چلے

خون بے وجہ جو بہہ جائے تو بیکار بہا
ہاں مگر جن کو ملا اپنی حقیقت کا پتا

وہ اسی خاک کو اکسیر بنا دیتے ہیں
خون کی بوند کو شمشیر بنا دیتے ہیں

سری نواس لاہوٹی

انسانی زندگی میں مطالعے کی اہمیت

ہندوستان میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے قیام کی تحریک ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہے اور بڑی سست رفتاری سے گاؤں اور شہروں میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں کا قیام عمل میں آرہا ہے مگر خوشی کی بات ہے کہ اس تعلق سے عوام کا جذبۂ خیر سگالی ابھر رہا ہے اور یہ ایسا خوش آئند جذبہ ہے جس کا ہر ذی شعور انسان کو خیر مقدم کرنا چاہئے۔

میں یہ بات بتلانے سے قاصر ہوں کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کب اور کہاں کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن نئی کھوج کے مطابق اس بات کو اب تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک میں دو ہزار سال قبل بھی کتب خانے پائے جاتے تھے ۔ مصر میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اُس کی بناء پر آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ وہاں چار ہزار سال قبل بھی کتب خانے پائے جاتے تھے ۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک کتب خانوں کے قیام کی تحریک اپنے ابتدائی دور میں ہے اس کی بڑی وجہ تعلیم کی کمی ہے اور جب تک تعلیم کی توسیع عمل میں نہ آئے ، کتب خانوں کے قیام کی تحریک کو تقویت حاصل نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی معاشی اور سیاسی جدوجہد کے ساتھ ساتھ تہذیبی زندگی کو بھی سنوارنے کی کوشش کریں اور اس جدوجہد کو کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے قیام کی تحریک کا ایک جزو بنائیں تو ان کی ترقی میں جو رکاوٹیں حائل ہیں اُنہیں بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

مدرسہ اور کتب خانہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کتب خانے انسانی زندگی کو سنوارنے کے لئے مکتب کا کام دیتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مدرسے میں استاد کو ایک ڈاکٹر کی طرح سے کڑوی، جیسی کڑوی دوا پلانے کا حق پہنچتا ہے لیکن کتب خانے میں شریک ہونے والا ہر طالب علم خود اپنے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان خود کے لئے دوا تجویز کرتا ہے تو اس اس میں شربت کی بھی آمیزش ضرور کر لیتا ہے تاکہ دوا آسانی کے ساتھ حلق سے اتر سکے ۔ مدرسہ یا مکتب ایک خاص اور معینہ مدت تک لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں لیکن دارالمطالعے اور کتب خانے ہوش سنبھالنے سے لے کر قبر میں پہنچنے تک لوگوں کے دل و دماغ کو تسکین پہنچاتے رہتے ہیں ۔ اس کے علاوہ یہ ادارے ایک انسان کا دوسرے انسان سے ربط برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں اور ان سے مستفید ہونے والا ہر شخص اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ اُس نے اپنے علم میں اضافہ کیا ہے ۔ کتب خانوں کے متعلق سے ہر شخص اگر اس بات کو اپنے ذہن میں رکھے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ مطالعے کی افادیت سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے ۔

مطالعہ اور جذبۂ آزادی

ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ایک بات ابھر کر پڑھنے والوں کے سامنے آئے گی ۔ اور وہ یہ کہ ہمیں آزادی کی جدوجہد کرنے اور اس کے لئے قربان ہو جانے کا جذبہ کہاں سے ملا تھا؟ ہم میں وہ شگفتگی اور طاقت کہاں سے آگئی تھی جس کے سہارے ہم نے ایک بہت بڑے سامراج کا مقابلہ کیا تھا ۔ میرے خیال میں ان سوالوں کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے آزادی کی جدوجہد کا جذبہ اُن لوگوں سے بھی حاصل کیا تھا جو ہم سے قبل آزاد ہو چکے تھے یا آزادی کی جدوجہد میں مصروفِ عمل تھے ۔ اور بلاشبہ اس جذبے کی بنیاد اخباروں اور کتابوں کے مطالعے کو قرار دیا جا سکتا ہے ۔ آزادی کے جذبات کو جگانے اور عوامی طاقت کو ابھارنے کے لئے ہمارے قائدین نے خطابت کو ذریعہ بنا دیا تھا ۔ مگر اس خطابت کے پس منظر پر روشنی ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ ان قومی قائدین نے اپنے جذبۂ حب وطن کو بھرپور بنانے کے لئے مارکس، لینن، ابراہم لنکن اور گیری بالڈی وغیرہ کے خیالات سے ضرور اکتساب کیا تھا اور یہ اکتساب صرف کتابوں اور اخبارات ہی کے مطالعہ کا رہینِ منت ہے ۔ اس سے آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کی زندگی میں مطالعہ کی کتنی بڑی اہمیت ہے اور اس اہمیت کا اندازہ مجھے خاص طور پر اُس وقت ہوا جبکہ قومی جدوجہد کے دوران میں مجھے بھی برسوں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور جیل کی تنہائی میں دل و دماغ کو تازہ رکھنے اور عزم کامرانی کو تقویت پہنچانے میں کتابوں اور اخبارات کے مطالعے نے بڑی مدد کی۔

تجربہ

اس موقع پر میں اپنی زندگی کا ایک واقعہ تحریر کروں گا۔ جس سے میرے بیان کی صداقت کا پڑھنے والوں کو اندازہ ہو سکے گا۔

مجھے آخری بار ۱۹۷۶ء کے اوائل میں ڈیڑھ سال کے لئے جیل جانا پڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تلنگانہ کے عوام ایک جدوجہد میں مصروف تھے اور اس جدوجہد کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی میری گرفتاری ایک کمیونسٹ کارکن کے ناتے عمل میں آئی تھی۔ اس لئے کافی ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ذہنی اذیتوں میں میرے لئے سب سے بڑی اذیت یہ تھی کہ مجھے تقریباً سات ماہ تک قید تنہائی میں رکھا گیا اور سوائے صفائی کرنے والے اور نگران کار کے علاوہ اس تنگ اور تاریک کمرے میں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ اور اس پر یہ ستم بھی ڈھایا گیا کہ پڑھنے کیلئے کوئی چیز بھی نہیں دی جانے لگی۔ حکام جیل اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ مجھے سب سے بڑی اذیت کتابیں اور اخبارات نہ دے کر پہنچائی جا سکتی ہے چنانچہ انہوں نے اس پر عمل کیا۔ ان سات ماہ میں میری حالت اس جذباتی کی سی ہو گئی تھی جسے کسی ذہنی بیماری کے بغیر پاگل خانے میں شریک کر دیا گیا ہو۔ میں سات ماہ تک مسلسل خاموش رہا اور ہر صبح شام یہ سوچتا تھا کہ شاید میں پڑھنا بھول جاؤں گا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اسی ذہنی کرب و اضطراب کے عالم میں، میں نے ایک دن تہیہ کیا کہ کتابیں اور اخبارات کے حاصل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کرنی چاہیئے۔ اپنے اس فیصلہ کی اطلاع میں نے سپاہی کے ذریعہ مہتمم جیل کے پاس بھجوا دی کہ اگر مجھے چوبیس گھنٹوں کے اندر اخبارات اور کتابیں پڑھنے کو نہیں ملیں تو میں بھوک ہڑتال کروں گا۔ اور میری یہ بھوک ہڑتال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ مجھے مطالعہ کی سہولتیں فراہم نہ کی جائیں۔ پہلے پہل تو میری یہ دھمکی کارگر ثابت نہیں ہوئی اور صبح سے شام تک کسی نے بھی آکر دریافت تک نہیں کیا کہ میں بھوک ہڑتال کیوں کر رہا ہوں۔ بات یہ تھی کہ میری اس اطلاع کے بعد جیل والوں نے اپنے جاسوسوں کے ذریعے یہ تحقیقات شروع کی کہ میں اکیلا ہی بھوک ہڑتال کر رہا ہوں یا اور بھی نظر بند اس میں شامل ہونگے انہیں جب اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ میں صرف اکیلا ہی بھوک ہڑتال کروں گا تو حکام جیل نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ میرا ارادہ اپنی جگہ مصمم تھا۔ چوبیس گھنٹے گذرنے کے بعد جب صبح کا کھانا میری "کنجی" (قید تنہائی کا کمرہ) میں لایا گیا تو میں نے کھانا لینے سے انکار کر دیا لیکن جب جوان کھانا رکھ کر جانے لگا تو میں نے کھانے کے برتن کنجی سے باہر پھینک دئے۔ جس کی وجہ سے جوان کے کپڑے خراب ہو گئے۔ اس نے جیل کے داروغہ سے اس بات کی شکایت کی اور وہ اپنی تحقیقات مکمل کرنے کے لئے کنجی میں آدھمکا۔ میں نے اس سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک مہتمم جیل نہیں آئیں گے میں کسی سے بھی بات نہیں کروں گا بات آئی گئی ہو گئی۔ شام کو پھر کھانا لایا گیا۔ اس پر میں نے کہا کہ میں بھوک ہڑتال پر ہوں اس لئے مجھے کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھانا واپس لے کر چلا گیا۔ بھوک ہڑتال کی اس پہلی رات، میں کسی طرح اپنے ساتھی وی۔ ڈی۔ دیشپانڈے (سابق اپوزیشن لیڈر حیدرآباد اسمبلی) سے ربط پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا جو میرے ہی قریب کی ایک کنجی میں رکھے گئے تھے انہوں نے بتلایا کہ اس سے قبل وہ بھی بھوک ہڑتال کی دھمکی دے چکے ہیں۔ جس کی بناء پر انہیں اخبار ملنے لگا ہے۔ کامریڈ دیشپانڈے کے اس تائید آمیز پیام سے ہمت بندھی اور میری سوچنے لگا کہ مجھے بھی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری بھوک ہڑتال کے تیسرے دن ناظم جیل معائنے کے لئے آنے والے تھے اور حکام جیل چاہتے تھے کہ انہیں میری کنجی میں نہ لایا جائے لیکن مجھے اس کی اطلاع مل گئی تھی اور میں منتظر تھا کہ اگر وہ کنجی کے سامنے سے گذریں گے تو میں نعرہ لگاؤں گا تاکہ میری پکار اُن تک پہنچ سکے۔ ہوا بھی یہی اور مجھے نعرہ لگانا پڑا جس کی بناء پر ناظم جیل نے کنجی میں قدم رنجہ فرمایا اور میں نے ساری حقیقت اُن کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ میرے اس معمولی مطالبے کو بھی پورا نہیں کیا گیا تو اس کے جو نتائج ہوں گے اُن کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ اُسی روز شام سے مجھے اخبار ملنے لگا مگر، کتابوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوا اور جب اس کے لئے اصرار کیا گیا تو پہلے مجھے جالنہ اور بعد میں بیٹر جیل میں بھجوا دیا گیا۔

زندگی کی مسرت

میرے اس نجی واقعہ کو دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ جس شام مجھے اخبار ملا، میں اتنا خوش ہوا کہ اس خوشی کو میں زندگی کی اہم مسرتوں میں سے ایک سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد دو سال کی نظر بندی جس طرح کٹی اس میں مجھے بہت کم احساس ہوا کہ میں جیل میں ہوں۔ اس کی بڑی وجہ میرے مطالعے کا شوق ہے۔ انسان کو جب مطالعے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بہت سی ذہنی اُلجھنوں میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے ــــ اس طویل اور تلخ داستان کے ذکر کا صرف یہ مقصد ہے کہ تنہائی میں بھی کتابیں ایک اچھے ساتھی اور مددگار کا کام دیتی ہیں بشرطیکہ ہم مطالعے کا شوق اور ذوق رکھتے ہوں۔

ہمارے دیش میں ابھی تک کتب خانوں کی تحریک بہت کمزور ہے۔ حالانکہ کافی عرصہ ہو چکے ہیں لیکن دوسری چیزوں کی طرح یہ تحریک

بی و فتح شاہی کا شکار بنتی جا رہی ہے۔ اس لئے
مطالعہ کا ذوق رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ اس
تحریک کو آگے بڑھائیں تاکہ انسانی شعور میں
بالیدگی پیدا ہو اور اس تحریک کو قوت نمو حاصل
ہو سکے۔ یہاں یہ سوال پوچھنا میں پڑھنے والوں کے
سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ آج کل ہمارے دیش میں
جاسوسی ادب کا بڑا چلن ہو گیا ہے جس کی وجہ سے
نئی نسل اس گھٹیا ادب کی جانب مائل نظر آتی ہے
اور سماجی زندگی پر اس کے برے اثرات مترتب
ہونے لگے ہیں۔ اس لئے مطالعے کا شوق اور ذوق
رکھنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ایسے فحش اور جاسوسی
ادب کا بھی بائیکاٹ کریں تاکہ وہ نئی نسل کی بہتر
خدمت انجام دے سکیں۔

ایک اچھی کتاب

ملک کے عوام میں تعلیم کو عام کرنے
کے لئے اب تک جن ذرائع کو استعمال کیا گیا
ہے ان میں کتب خانوں کے قیام کی تحریک کو
اولیت حاصل ہونی چاہیے کیونکہ درسی تعلیم کے
خاطر خواہ نتائج اسی وقت برآمد ہو سکیں گے جبکہ
دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی طرح سے ہمارے
ملک میں بھی کتب خانوں کو Continuation
School کا درجہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں
ایمرسن کا قول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ۔

"بسا اوقات ایک اچھی کتاب کا مطالعہ
انسان کے مستقبل کو سنوار دیتا ہے۔"

خاص طور پر ہر مذہب کی بنیادی کتابوں ہی کو لیجئے
جن کی وجہ سے انسانیت کو سنوارنے میں بڑی مدد
ملی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ہمارے ملک
میں کتب خانوں نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے۔
جس کی وجہ سے مطالعہ کا ذوق محدود ہو گیا ہے
اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب خانوں
کے قیام کی تحریک کو وسعت دی جائے جس کی کہ وہ مستحق
ہے۔ دوسرے ملکوں کے عوام زیادہ تربیت یافتہ اس لئے
ہیں کہ وہاں ہر گاؤں اور قصبوں میں کتب خانے اور
دار المطالعے ملیں گے۔ تعلیم بالغاں کے سلسلے میں تو ان
کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ وہ حضرات جنہیں
ترقی یافتہ ممالک، خاص طور پر یوروپی ممالک کے
سفر کا موقع ملا ہے وہ مرے اس بیان کی تصدیق کریں گے
کہ ان ممالک میں مطالعہ گھر تہذیب کا بہت بڑا مرکز مانے
جاتے ہیں اور وہاں پر معاشی، معاشرتی اور سیاسی
مسائل پر بڑے بڑے مباحث انہی مطالعہ گھروں
کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتے ہیں۔ میں بھی اپنے
اس مضمون کو اس امید پر ختم کرتا ہوں کہ ہمارے ملک
میں بھی قومی اور تہذیبی جلسے کتب خانوں کے زیر اہتمام
منعقد ہوا کریں گے تاکہ عوام کو نئی بیداری کا پیام مل
سکے اور وہ علم کے ان خزانوں کی صحیح قدر و قیمت کا
اندازہ لگا سکیں۔

اشتیاق بچھرائیونی

قومی یکجہتی ایک دفاعی مسئلہ
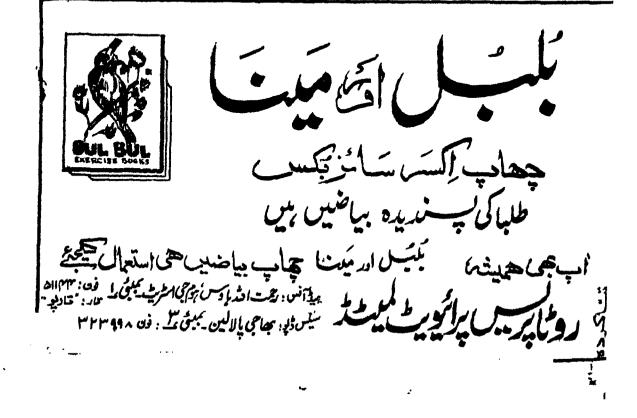
زیرِ نظر مضمون میں جناب اشتیاق بچھرائیونی نے اس وقت کے سب سے اہم مسئلے "قومی یکجہتی" پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ قومی یکجہتی کو تقویت دینے کے لئے انہوں نے جہاں ان ضرورتوں کی سفارش کی ہے، وہاں تعلیم کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کرنے پر بھی خصوصی زور دیا ہے۔ اپنی بحث میں وہ بھی اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ "قومی یکجہتی کے بغیر دفاع ممکن نہیں۔"

کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ قومی یکجہتی کے مسئلے پر بحث و مباحثہ دینیز نئے نئے طریقے سوچنے کے لئے کمیشن بیٹھا لیکن میٹنگ ختم ہونے کے بعد ممبران اپنے گھروں تک بھی نہ پہنچ پائے کہ فرقہ واریت کی آگ ملک کے کچھ حصوں میں بھڑک اٹھی — آج جسے دیکھئے قومی ایکتا اور یکجہتی کے نعرے لگا رہا ہے لیکن کیا وجوہ ہیں کہ ان کی یہ تمام صدائیں محض صدائے صحرا ثابت ہو رہی ہیں؟ حکومت اور عوام کی یہ تمام کوششیں ناکام کیوں ہو رہی ہیں سیدھی سی بات یہ ہے کہ دراصل ان کوششوں میں سچائی، خلوص، نیک نیتی اور لگن کی کمی ہے۔ ورنہ دنیا میں کوئی بھی کام ایسا نہیں جو ناممکن ہو اور جہاں تک قومی یکجہتی کا سوال ہے وہ کسی طرح ناممکنات کی حدود میں نہیں آتا۔

قوم کیا ہے؟

اس سے قبل کہ اس مسئلہ پر مزید کچھ کہا جائے بہتر یہی ہے اور موضوع کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آخر قومیت اور قومی یکجہتی کے تصور کو ہم کن معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا وہ مجموعہ جو کسی خاص مقام پر رہتا ہو، اسے ہم کسی طور پر بھی ایک قوم کا نام نہیں دے سکتے۔ قومیت کا تصور اپنے اندر بہت سے عناصر پنہاں کئے ہوئے ہے۔ اور درحقیقت انہیں تمام امور کی ست رنگی، دھنک کے مختلف رنگ قومیت کے تصور کو حقیقی رنگ بخشتے ہیں مثال کے طور پر زبان، طرزِ معاشرت، لباس، طور طریقے، پہننے اوڑھنے، طبیعت کے انداز و رجحانات، کسی ایک مخصوص قوم کی تشکیل میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ یہ تمام امور کسی ایک جگہ کے بسنے والوں میں جس قدر بھی یکساں طور پر نمایاں ہوں گے انہیں کو ہم اتنی ہی آسانی سے ایک قوم کا نام دے سکتے ہیں۔

قومیت کا فقدان

یہ ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انحراف قطعی ناممکن ہے کہ ہمارے یہاں جذبۂ قومیت کا قطعی طور پر فقدان ہے وہ اس طرح ظاہر ہے کہ آپ کسی بھی ہندوستانی سے پوچھئے وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا باشندہ نہیں بلکہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی کہنا زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں قومیت کا جذبہ یعنی Nationalism اپنی بھرپور جولانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کوئی بھی انگلستانی اپنے آپ کو یہودی، عیسائی یا پارسی کہنے میں فخر نہ محسوس کرے گا بلکہ ہمیشہ یہ کہتے ہوئے اس کا سر فخر سے بلند نظر آئے گا کہ وہ محض ایک انگلستانی ہے۔

فقدان کی وجہ

آخر یہ اختلاف کیوں ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہمارے جغرافیائی اور طبعی حالات ہیں۔ ہمارا ملک ایک وسیع ترین ملک ہے۔ اس ملک کے بعض صوبے ہی مغربی ممالک سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ ہندوستان کی اس وسعت نے اسے مختلف آب و ہوائیں بخشی ہیں۔ آب و ہوا کے اس تضاد نے لوگوں کے رہن سہن، ان کے پیشوں، ان کی غذا اور ان کی عادتوں کو بہت حد تک مختلف النوع بنا دیا ہے۔ ہندوستان کی حیات افروز اور خوشگوار ہوا نے اسے مختلف تہذیبوں، نظریوں اور مختلف زبانوں کا گہوارہ بنانے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کا کلچر اور تہذیب ہر قدم پر جدا نظر آتی ہے۔ ایک پنجابی بنگالی سے مختلف نظر آتا ہے۔ ایک بہاری اپنے انداز گفتگو اور رنگ ڈھنگ میں ایک مدراسی سے بالکل الگ دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلچر کے اس تضاد اور ماحول کے اس اختلاف نے انہیں جذباتی طور پر بھی ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ زبان، کلچر اور تہذیب [illegible] اکائی کا آدرش دئے ہیں۔

عــلاج

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے قومی یکجہتی کے لو ایک نہ سمجھنے والا مسئلہ بنا کر رکھ دیا۔ قومی یکجہتی ہے کہ آپس کے فرق اور بھید بھاؤ کو بھول کر، زبان، ذات، مذہب، عقائد اور صوبہ جاتی تنگ نظری اور دائروں سے نکل کر ایک ساتھ مل جل کر رہنا۔ قوم اور ترقی میں شانہ بشانہ کام کرنا۔ میرا خیال ہے جذباتی کی اس خلیج کو بخوبی پوری طرح پاٹ سکتی ہے۔ ہم آہنگی سے مطلب یہ ہے کہ ہم دلی اور دماغی طور مخصوص انداز میں سوچیں، اجتماعی سطح پر اپنے مسائل تلاش کریں۔ کسی بھی مسئلہ پر ہماری نظر عقل و دانش سے بے نیاز ہو کر نہ پڑے۔ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں حد تک یکسانیت آجائے۔ یہ کام دراصل ایک خاص جذبات کو قابو میں کرنے اور ان کے دھاروں کو یکساں انداز میں موڑ دئے جانے پر ہی ہو سکتا۔ انسان کو قدرت نے فطری طور پر کچھ جذبات ودیعت کئے ہیں۔ مثلاً غم و غصہ، خوشی و مسرت، نفرت و محبت وغیرہ۔ طرح ہم ان جذبات کے محرکات میں یکسانیت پیدا کر لیں۔ بہت حد تک ان جذبات کے اظہار میں ہم یکسانیت لا سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہمارے ملک پر کوئی حملہ آور ہو تو وقت ہم سب کے اندر رحم و غصہ کی ایک لہر دوڑ جائے بہادری اور دیرتا کے ساتھ ہم اس غیر ملکی دشمن کا کے ملک کی آزادی کا تحفظ کریں۔ کون نہیں جانتا جب چین نے ہمارے ملک پر حملہ کیا تھا اس ہندوستان میں نہ کوئی ہندو رہا تھا نہ مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی ہو گئے تھے۔ اور اسی ناطے انہوں نے غرض کہ ہر چیز کی قربانی دے کر ملک کی دوں میں بڑی طرح حصہ لیا تھا۔ یہ ہے ایک کہ جذبات کو ایک خاص انداز میں ابھارنے نے کا ملانے کی۔ اگر سماج کے انہیں جذبات ساری قوم کے محرکات یکساں ہو جائیں۔

جائیں تو یقیناً ملک کے اس سرے سے اُس سرے تک قومی یکجہتی کی لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔

تعلیم کا مقصد

زیر نظر موضوع کچھ اسی نوعیت کا ہے کہ اس پر جس قدر بھی قلم بند کیا جائے وہ ہمیشہ کوتاہی داماں کا گلہ کریگا لہٰذا میں یہاں تعلیمی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کی کوشش کرونگا آیا تعلیم اس میدان میں کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اس کو ہم کہاں تک ایک اہم ذریعہ بنا سکتے ہیں، کیونکہ میری نظر میں قومی یکجہتی کسی ملک کی ترقی، کامرانی اور سالمیت کی بنیاد ہوتی ہے۔ ایک قوم جس قدر ایکتا اور یکجہتی کے دھاگے میں بندھی رہے گی، اسی حد تک نہ صرف وہ اپنا دفاع کامیاب طریق پر کر سکتی ہے بلکہ ترقی و کامرانی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کر کے اپنی اصل منزل تک پہنچ سکتی ہے اور تعلیم ایک ایسا واحد ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم انسان کے اذہان، جذبات، خیالات اور افکار نہایت آسانی اور کامیابی کے ساتھ موڑ سکتے ہیں۔

کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ ناواقفیت اور جاہلیت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ حقیقتاً اگر آج ہم گھر گھر میں علم کی روشنی پہنچا دیں۔ انسان دلوں کے میل کو تعلیم کے اجالے سے منور کریں تو یقیناً ہماری بہت سی مصیبتیں خود بخود ہی ختم ہو جائیں گی۔ انسان اس روشنی میں انسان کو پہچان لے گا۔ وہ کبھی محض سُنی سُنائی باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔ پہلے کسی بھی معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ نہ کہ جذبات کے تند و تیز دھاروں پر بہنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ بھید بھاؤ کی فضا، تفریق و ظلم و تشدد کا رجحان بہت حد تک ہماری غلط تعلیم اور غلط معلومات کی بنیاد پر ہی ہیں۔

لہٰذا یہ کام ہم تعلیم کے ذریعے بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ یہاں تعلیم کا لفظ اس کے محدود ترین معنوں میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ لفظ تعلیم کو اس کے اصل اور غیر محدود معنوں میں لیا گیا ہے۔ کتابوں کے علاوہ ہم اپنی جانکاری دوسری چیزوں سے بھی بڑھا سکتے ہیں۔ مثل مشہور ہے آدمی ٹھوکر کھا کر سیکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے گوناگوں تجربات اور مشاہدات ہمیں بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ ہم اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتے ہیں چال ہے والدین کی باتیں، عادت و اطوار، رہن سہن، لباس زبان، مذہبی خیالات و عقاید ہماری زندگی اور ہمارے کردار پر بھرپور انداز میں اثر ڈالتے ہیں۔ ان تمام عناصر کو ہم بغیر جانے بوجھے اور لاشعوری طور پر اپنی زندگی اور حیات میں سموتے چلے جاتے ہیں، اور آگے چل کر یہی تمام چیزیں ہماری زندگی کا لازم و ملزوم حصہ بن جاتی ہیں۔

زہریلی درسی کتابیں

اسکول کی درسی کتابیں چونکہ ایک خاص ترتیب اور منظم طریق پر ہوتی ہیں اسی لئے اُن کا اثر ہمارے اذہان پر زیادہ پڑتا ہے۔ ہم اپنے اساتذہ سے بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ استاد ہی کیا۔ اِس زمرہ میں وہ تمام شخصیتیں بآسانی تمام آجاتی ہیں جن سے ہم کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتے ہیں مگر کس قدر افسوسناک بات ہے کہ آج کل ہماری درسی کتب میں حالات و واقعات کچھ اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کئے جا رہے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہیں۔ یہ کتابیں بجائے قومی یکجہتی کی فضا کو بڑھاوا دینے کے اس فضا کو کچھ اور ہی مسموم کر رہی ہیں۔ ان واقعات اور حادثات کو اس قدر غلط طور پر پیش کیا گیا ہے ایک فرقے کے بچے خود بخود ہی دوسرے فرقے کے بچوں سے نفرت کرنے کے لئے مجبور ہو جائیں۔ اس طرح جب شروع ہی سے اُن کا ذہن یہ بنا دیا جائے گا تو آئندہ اس کا ایک خطرناک اثر قومی یکجہتی پر پڑے گا۔ تاریخ کی کتب اس رول کو ادا کرنے میں ایک خاص حصہ لے رہی ہیں۔ آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ ان ننھے ننھے نازک سے اذہان کو شروع ہی میں زہر آلود کر دیا جائے گا تو لازمی ہے کہ یہ زہر کبھی کبھی تو باہر نکلنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

ثقافت کا روپ دھار لیتی ہے۔

یو۔پی اور مدھیہ پردیش

اس نوعیت کے مولوی کتب کے سلسلے میں یو۔پی اور مدھیہ پردیش خاص طور پر بدنام ہیں۔ ضروری ہے کہ ان تمام کتابوں کا ایک بار پھر سے گہرا جائزہ لیا جائے اور بچوں کے لئے ایسی کتابیں فراہم ہوں جو ان کے اندر، وطن سے محبت، آپسی بھائی چارہ اور تعاون کے نادر جذبات کو نہ صرف پیدا بلکہ اُبھارنے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔

مذہب کے نام پر

ہمارے یہاں اب تک مذہبی بازی گری کی دکانیں نہایت شان سے سجائے بیٹھے ہیں۔ ان کی ملمع کاری کو ابھی تک ہمارا مذہبی ذہنیت کا سماج نہیں پہچان سکا ہے۔ مذہب کے نام پر وہ آج بھی مرنے مارنے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ کاش ہم اس ملمع کاری اور دکھاوے کو نیست و نابود کر سکیں۔ میری ذاتی رائے میں مذہب کو اگر اس کے حقیقی روپ میں پڑھایا جائے تو شاید کچھ بہتری کا سامان ہو سکے۔ آج ہمارے یہاں مذہب کی ظاہری چیزوں پر زور دیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ مذہب کی اصلی روح سے انہیں روشناس کرایا جاتا ہے بلکہ انہیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ مذاہب کی عظمت کے راز کن چیزوں سے مظہر ہیں۔ ان کے اجداد اور اسلاف کے طریقوں کے کردار کی کیا خصوصیات ہیں۔ اُن کے تعلقات دوسروں کے ساتھ کیسے تھے۔ کس طرح اپنے اور پرائے کی بھلائی میں وہ ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ اور کردار کی ان عظیم قدروں کو ہم کس طرح عملی طور پر اپنا سکتے ہیں۔ مذہبی قائدوں کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی بجائے اگر ان کی تعلیمات کو بچوں کے ذہن نشین کرایا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میری ذاتی رائے میں اگر مختلف دھرموں کو

Code) یا اخلاقیات کے نام سے یاد کرتے ہیں دراصل یہی وہ باتیں ہیں جو ہماری زندگی کو اونچا اٹھاتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ باتیں تمام مذاہب میں ایک ہی جیسی ہیں۔ ہر مذہب ایمانداری، انصاف پسندی، عدم تشدد اور راست گوئی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس صفحۂ ہستی پر کوئی بھی مذہب ایسا نہیں جو دروغ گوئی، بے انصافی اور نفرت کو فروغ دینے کے درپے ہو۔ اگر دنیا کے مختلف مذاہب میں ہمیں کوئی اختلاف دکھائی دیتا ہے تو وہ محض ان کے عبادت کے طریقوں یا بعد کے لوگوں کی اختراع اور ایجاد کا نتیجہ ہے۔ بہر طور منزل سب کی ایک ہے، راستے ضرور جدا جدا ہیں۔ اگر مذہبی تعلیم کا انداز تبدیل کر دیا جائے تو یقیناً مختلف مذاہب کے درمیان بھید بھاؤ اور تفریق کی ایک خلیج نا معلوم حائل ہے وہ بآسانی پٹ سکتی ہے۔

فرقہ وارانہ کشیدگی

تعلیم کے اس پرچار سے یقیناً ہماری اقتصادی حالت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ "روٹی" کا سوال بہت حد تک ان اُلجھنوں کا سبب ہے۔ ایک فرقہ سوچتا ہے کہ اگر ہم دوسرے فرقے کو اقتصادی طور پر تباہ و برباد کر دیں گے تو ان کی تجارت اور ملازمتیں ان کے ہاتھ لگیں گی۔ نتیجے کے طور پر ان کی اپنی اقتصادی حالت اور روزگار کا مسئلہ کسی حد تک سلجھ جائے گا۔ تعلیم مختلف میدانوں میں لوگوں کی راہنمائی کرے گی۔ انہیں ملازمتوں کے علاوہ بھی اور دوسرے کام دھندوں کے لئے تیار کرے گی۔ اور پھر "روٹی" کا یہ حل شدہ مسئلہ ان کے ذہنی خلفشار کو کم کر دے گا اور یقیناً ایسی بھائی چارے کی فضا پیدا ہوگی۔ اس سلسلے میں جرائد، اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دیگر انجمنیں بھی نمایاں کام انجام دے سکتی ہیں۔

قومی جنگ کا ادبی محاذ

آج اخبارات کا رویّہ یہ ہے کہ رائی کا پہاڑ بنا کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کسی بھی اخبار کو لیجئے، کسی بھی مسئلے کے بارے میں ہندی اخبار کچھ اور اردو اخبار کچھ اور لکھتے ہیں۔ اخبارات کی زہریلی تحریروں سے ان کے ذہنوں پر یہ ردِ عمل ہوتا ہے کہ وہ انسانی قدروں سے بعید باتیں بھی کر گزرتے ہیں۔ اخبارات کو اپنا رویّہ ضرور بدلنا چاہئے۔ یہاں ہم فلموں کی افادیت اور اہمیت سے بھی کسی طرح منکر نہیں ہو سکتے۔ آج کل فلموں کا اثر عوام کے اذہان جس قدر قبول کر رہے ہیں اس سے کون ہے جو واقف نہیں۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ اور موثر قسم کی فلمیں بنائے۔ ان میں ہماری مشترکہ تہذیب کی عکاسی کی گئی ہو اور یہ فلمیں بالواسطہ طور پر عوام کو قومی یکجہتی کا درس دیں۔ اس نوعیت کی فلموں کی نمائش کے سلسلے میں جس قدر بھی ہو سکے سہولتیں مہیا کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان فلموں کو دیکھ سکیں اور اس جذباتی اور ہیجانی کشمکش کو فراموش کرنے میں کامیاب ہوں جو بدقسمتی سے مصنوعی طریقے پر پیدا کی گئی ہے۔

ہمہ رنگ تہذیب

مختلف انجمنوں اور سرکاری سطح پر مشترکہ تہذیب سے عوام کو روشناس کرانا بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر نمائشیں لگا کر اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ تہذیب، ہمارا یہ کلچر کسی ایک طبقہ کا رہینِ منت نہیں ہے بلکہ مختلف فرقوں نے اپنے خونِ جگر کی گل کاری سے اس تہذیب کو رنگ عطا کیا ہے۔ یہ تمدن مختلف لوگوں کی بے پناہ محنت اور جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ ہماری متحدہ محنت، خلوص، نیک نیتی اور یک جہتی ہمیں یقیناً اقتصادی، سماجی اور علمی طور پر

بقیہ

ناخلف اشعار

یوسف ناظم

دنیا میں جاننے پہچاننے کے ہزاروں طریقے ہیں۔ کوئی بدنصیب باپ بیٹے کی شہرت کا باعث بنتا ہے تو کوئی بیٹا، باپ دادا کا نام روشن کرتا ہے۔ باپ دادا کا نام روشن کرنے کی رسم بہت پرانی ہے اور اس رسم کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے کی سزا میں کئی نسلیں تباہ ہو چکی ہیں لیکن باپ دادا کا نام اب تک روشن نہیں ہو سکا۔ پتہ نہیں اس میں خرابی اسلاف کے نام کی ہے یا اخلاف کی بدنیتی اس کا سبب ہے۔ باپ اور بیٹوں کی اس دیرینہ کشمکش کے علاوہ شاگردوں اور استادوں کے مراسم بھی دنیا والوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں مثلاً بعض شاگرد، اپنے نام اور استادوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں تو بعض شاگرد استادوں کی بدنامی کا باعث بن جاتے ہیں۔ غالباً ناسخ کی وجہ سے اُن کے استاد کا نام بھلا دیا گیا لیکن شاگردوں اور استادوں کے یہ باہمی تعلقات عرصہ ہوا ناپید ہو گئے۔ اب شاگردوں کا کوئی استاد نہیں ہوتا۔ آج ہر طالب علم اپنا ہی نہیں استادوں کا بھی استاد ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح بعض بیویاں، اکبر الٰہ آبادی کے زمانہ میں بی بیاں کہلاتی تھیں، اپنے شوہروں کے توسط سے جانی جاتی ہیں تو چند جواں مرد بیویاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے سبب سے اُن کے شوہر جانے جاتے ہیں۔ اسی طرح اشعار کی دنیا میں بھی ہر شعر اپنے خالق کی وجہ سے جانا جاتا ہے لیکن اُردو شاعری ایسے اشعار سے بھری پڑی ہے جن کے خالق کے بارے میں ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق اپنی علیحدہ رائے رکھتا ہے۔ نقادوں نے اس قسم کے کلام اور ادب کو الحاقی ادب کا نام دے کر ریسرچ اسکالروں کی روزی کا ذریعہ پیدا کر دیا ہے۔ بعض انتہا پسند حق نویس یہ کہتے ہیں کہ اُردو ادب پر ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب کئی تذکرہ نویسوں، کتاب گھروں کے مالکوں اور ناشروں نے مل کر یہ اسکیم بنائی کہ پانچ سات سو اشعار کو خلط ملط کر کے اُنہیں مختلف شعرا کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ یہ اسکیم بہت زیادہ کامیاب ہوئی اور خوب چلی۔ آج سینکڑوں اشعار ناخلف بیٹوں کی طرح آوارہ و پریشان پھرتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ اُن کا اصل خالق کون ہے۔ اُردو شاعری کے اس الحاقی ادب کو ہم ایسا میٹرنٹی ہوم سمجھتے ہیں، جہاں نومولود بچے، نرسوں کی ہوشیاری کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ نرسوں کی ہوشیاری اور چابک دستی کا ہمیں شکوہ نہیں لیکن غضب تو یہ ہے کہ بچوں کے اس تقلب اور بیجا تصرف کے باوجود ہماری قوم اپنی صلاحیتوں کو کسی اور پیداوار کی طرف منتقل کرنے پر رضامند نظر نہیں آتی۔

الحاقی ادب کی اصل تعریف کیا ہے۔ بخدا اس سے ہم ناواقف ہیں۔ اور غالباً اپنی اسی ناواقفیت کی وجہ سے اب تک زندہ بھی ہیں کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ معلومات کی مزید تاب اب ہم میں باقی نہیں ہے۔ الحاقی ادب کو ہم اپنی آسانی کی خاطر اسمگل کیا ہوا مال سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم آپ کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے۔

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غالب کو وفات پائے جیسا کہ آپ جانتے ہیں عرصہ ہو گیا۔ غالب کا کلام چھپ کر اتنا پرانا ہو گیا کہ لوگوں کو ازبر ہو گیا لیکن اب بھی غالب کی روح کو ستانے والے یہ مشہور کرنا نہیں چھوڑتے کہ چند تصویر بتاں والا شعر غالب نے کہا ہے۔ اگر ہم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے تو اسے ہم بڑی اندوہناک خبر سمجھتے ہیں۔ اُردو [illegible] کی خُرد بُرد پر ہمیں یوں کوئی صدمہ نہیں پہنچا کیونکہ ہم اپنی روشن خیالی اور آزاد منشی کی بنا شعر کو کسی شاعر کی نہیں بلکہ اپنے ذوق کی ملکیت سمجھتے ہیں لیکن پتہ نہیں غالب سے ہمارا کیا رشتہ ہے کہ غالب سے متعلق کوئی بات بھی ہوتی ہے تو یا کہی جاتی ہے تو ہمارے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور رگ حمیت بھی پھڑک جاتی ہے ہمیں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری مسجد کے سامنے کسی نے باجا بجا دیا۔ ہم قطعی خودستائی نہیں کر رہے ہیں بلکہ دل کی بات آپ سے کہہ رہے ہیں۔ غالب سے ہماری محبت بھی کچھ علیحدہ قسم کی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کمتر اندوری یا بہادر بھوپالی کا شعر ہے تو ہمیں بالکل افسوس نہ ہوگا کیونکہ غالب کی ٹوپی ہر شخص احتراماً استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن جب کوئی یہ کہتا ہے کہ چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط، بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔ غالب کا شعر ہے تو یقین مانیے ہماری آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں۔ ہماری سمجھ کا کچھ ڈھنگ ہی ایسا ہے۔ اگر سر سید احمد، شبلی، مولوی محمد حسین آزاد یا چکبست کی تصویروں کے ساتھ کسی جگہ ہم کسی حلوائی کی تصویر لگی دیکھ لیتے ہیں تو ہم قطعی یہ نہیں چاہتے کہ اس حلوائی کی تصویر وہاں سے ہٹالی جائے۔ اس کے برعکس ہم یہ گزارش کرتے ہیں کہ

بزرگوں کی تصویریں وہاں سے اتار لی جائیں۔ کچھ یہی کیفیت ہماری اُس وقت ہوتی ہے جب کسی غیر کا شعر غالب سے منسوب کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو بھی یہ شبہ ہو کہ یہ شعر غالب کا ہے۔ ہم اس معاملے میں آپ سے تفصیلی بحث کرنے پر بھی رضامند ہیں۔ حالانکہ ہمارے جاننے پہچاننے والے جانتے ہیں کہ ہم بحث وغیرہ جیسی چیزوں سے بھی بہت گھبراتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی اپنے محبوب سے خط و کتابت تھی۔ اُن کا محبوب اُنہیں رائے اُستاد جلیل کی طرح ایک مقررہ مضمون کا خط بھیج دیا کرتا تھا اور غالب بھی قاصد کے آتے آتے ایک اور خط لکھ رکھتے تھے۔ لیکن غالب نے اپنے کلام میں کسی اور حسین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جس نے اُنہیں خط لکھے ہوں۔ شعر میں کئی حسیناؤں کی موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر غالب کا نہیں۔ ریاض خیرآبادی یا اختر شیرانی کا ہے۔ تصویر بتاں والا معاملہ البتہ ذرا ٹیڑھا ہے کیونکہ غالب مرزا خول سے ملاقات کی خاطر مصوّری سیکھ رہے تھے اور ممکن ہے تصویر کھنچوانے کے شوقین محبوب اِن کے ہاتھ لگ گئے ہوں لیکن شعر کے پہلے مصرعہ کا ڈھب کچھ ایسا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کئی محبوباؤں کا گروپ فوٹو تھا۔ اور کئی تصویریں نہ تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ غالب کے گھر سے سامان نکلنے کی بات بھی ناقابلِ یقین ہے۔ کیونکہ غالب تو عرصہ ہوا رہزن کے ہاتھوں لٹ چکے تھے اور راتوں کو مزے کی نیند سویا کرتے تھے۔ انہیں چوری کا کھٹکا ہی نہ تھا اور پھر غالب کے گھر سے کسی قسم کا سامان نہیں صرف جنازہ نکلا تھا جس کی وجہ سے وہ پشیمان بھی تھے۔ کیونکہ یہ جنازہ اور مزار اُن کی رسوائی کا باعث ہوئے اور غالب کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی کہ وہ غرقِ دریا ہوتے تو بہتر ہوتا۔ ان تمام وجوہ کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر درحقیقت ایک ناخلف شعر ہے جس کے خالق کا پتہ نہیں۔ تاہم اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے تو اُسے زیادہ نادم ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

کو فیض احمد فیض نے ذوق کا شعر کہہ دیا، اور خواجہ میر درد منہ دیکھتے رہ گئے۔ اغوا کی ایک انوکھی قسم ہے جس میں اغوا کیا ہوا مال، اغوا کرنے والا اپنے پاس نہیں رکھتا بلکہ دوسرے کے ہاں پہنچا کر خوش ہوا کرتا ہے۔ ایک اور مشہور شعر سنئے۔

بہ ترکِ کوکب یہ سلیقہ ہے ستمگاری کا
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

پتہ نہیں یہ شعر کس طرح غالب کے دیوان میں پہنچ گیا اسی طرح مضطر خیرآبادی کا یہ کلام بہادر شاہ ظفر کے دیوان میں یوں چلا گیا جیسے کوئی ملاقاتی اُن کے دیوان خانے میں جا کر بیٹھ گیا ہو۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں

اور بیچارے مضطر خیرآبادی خیر سے تکتے رہ گئے۔ غضب تو یہ ہے کہ داغ کے دیوان میں یہ شعر باضابطہ موجود ہے

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

ہم خود یہ سمجھتے تھے کہ یہ شعر یقیناً داغ کا ہوگا لیکن اسے کیا کیجئے کہ یہ شعر داغ کا بالکل نہیں ہے اور غضب تو یہ ہے کہ سوائے داغ کے کسی اور سے منسوب بھی نہیں ہے۔

بعض مشہور اشعار تو کسی نہ کسی شاعر کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں خواہ وہ صحیح ہو یا غلط لیکن انتہائی خلف اشعار صرف تنہا شعر کی حیثیت سے مشہور ہو جاتے ہیں اور ان کے خالق کا پتہ چلانا نہایت دشوار ہوتا ہے۔

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

ہم کچھ نہیں تو دن میں دو چار مرتبہ یہ شعر کسی نہ کسی کی زبانی ضرور سنتے ہوں گے لیکن ہم اس شعر کے کہنے والے سے قطعی ناواقف ہیں اور اگر آپ کو یہ بتلایا جائے کہ یہ شعر نواب علی اصغر اصغر کا ہے تو نہ تو آپ کو اس سے دلچسپی ہوگی اور نہ ہی آپ اس پر یقین کریں گے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

مکمل ناخلف شعر ہے۔ چند حضرات البتہ بہادر شاہ ظفر کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ شعر اُنہوں نے کہا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ظفر انتقال کر گئے تھے۔

اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی
آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

زیرِ قدمت ہزار دل است، والی بات ہے فرق بس اتنا ہے کہ فارسی شاعر کے محبوب کے قدموں میں صرف ایک نہیں سینکڑوں کے دل ہیں لیکن اردو شاعر کے معشوق کے پاؤں کے نیچے صرف ایک ہی دل ہے۔ ترجمہ کی غلطی معلوم ہوتی ہے، اس ترجمہ کو وزیر کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے ناخلف اشعار اُردو ادب میں بکثرت موجود ہیں۔ اور انشاءاللہ تعالیٰ ایسے اشعار کی تعداد کے بڑھتی ہی جائے گی کیونکہ تحقیق و جستجو کا جو ڈھنگ اب رائج ہوا ہے اُس میں صرف اشعار ہی کی اسمگلنگ جائز نہیں بلکہ خود شاعر کی جائے پیدائش بھی بدلی جا سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی اب بے حس ہو گیا ہے اور بے چون و چرا، نئے نئے ٹیکسوں کی طرح ہر بات قبول کر لیتا ہے۔ تحقیقی مقالے اور کتابیں لکھنے پر اعلیٰ ڈگریاں تو دی جاتی ہیں لیکن غلط تحقیق کی بنا پر کوئی شخص اپنی ڈگری واپس کرتا ہوا نہیں پایا گیا۔ اگر کوئی شخص یہ کہہ کر زندہ و سلامت رہ سکتا ہے کہ ولی، اورنگ آباد میں نہیں، گجرات میں پیدا ہوا تھا تو اس امر میں کیا قباحت ہے کہ کسی کا شعر کسی اور کے نام سے منسوب ہو جائے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ اشعار کا انشورنس ہو سکے اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ کسی شاعر کا نقصان نہیں ہونے پائے گا اور دستاویزی شہادت

انقلاب کا بچہ!

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی شباب پر تھی۔ سارا دیس "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ یہ انہی دنوں کا قصہ ہے!

میرا وطن شملہ ہے۔ بچپن وہیں گذرا۔ سردیوں میں جب برف پڑتی ہے تو بڑا لطف آتا۔ گھنٹوں لگاتار روئی روئی برف پڑتی، جیسے آکاش پر کوئی دھنیا بیٹھا روئی دھن رہا ہو۔ پہاڑوں، درختوں، مکانوں کی چھتوں غرضیکہ چپّہ چپّہ پر برف کے گالے بچھ جاتے اور پوری وادی سفید پوش ہو جاتی۔ جب برف رکتی اور اتفاق سے سورج بھی جھلک دکھا دیتا تو ساری بستی شیش محل کے مانند جھلملا اٹھتی۔ بچے ہزار روکنے کے باوجود باہر نکل پڑتے اور برف میں کھیلنا کودنا شروع کر دیتے۔ برف پر پھسلنا، اچھلنا، کودنا پھاندنا، اور نرم نرم برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے کو مارنا۔ یہی مرغوب کھیل تھے

ایک دن اسی طرح ہم کم سن لڑکوں کی دو ٹولیوں میں معرکہ گرم تھا۔ ایک دوسرے پر خوب گولہ باری ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ انقلاب زندہ باد اور گاندھی جی کی جے کے نعرے بھی لگ رہے تھے۔ عین اسی وقت ایک قدامت زدہ انگریز اُدھر آنکلا۔ بس پھر کیا تھا۔ ساری گولہ باری کا رُخ اسی کی طرف ہو گیا۔ اُس کے ہیٹ اور پُشت پر دو چار گولے دھپ دھپ پڑے انگریز جھلا گیا اور غصہ میں ہماری طرف جھپٹا۔ سب لڑکے جو مجھ سے بڑے تھے فرار ہو گئے۔ میں سب سے چھوٹا تھا۔ سہم کر وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔ انگریز گھونسہ تان کر مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ میرے اوسان تو خطا ہو گئے۔ "انقلاب کا بچہ"، یہ کہہ کر اُس نے مُکّا گھمایا میں جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ نشانہ خطا گیا اور انگریز بہادر اپنے ہی زور میں برف پر پھسل کر پاس ہی چار پانچ فٹ گہرے کھڈ میں جا پڑا۔ اتنا موقع غنیمت تھا میں فوراً بھاگ کر پہاڑی پر چڑھ گیا۔ جب اوسان ذرا ٹھکانے آئے تو نیچے نظر ڈالی۔ انگریز بہادر کھڈ میں سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ قدرت کی طرف سے اُس کی اس دُرگت پر بے ساختہ ہنسی آئی جب بھی یہ منظر یاد آتا ہے انگریز کی خفت پر ہنسی آجاتی ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ گاندھی جی نے آزادی حاصل کرنے کے لئے تشدّد کا طریقہ کیوں اختیار نہیں کیا تھا۔

وحید ——— شملہ

زندگی کا بیمہ

میں دہلی سے بمبئی آ رہا تھا۔ ریل میں میری ملاقات ایک پنڈت جی سے ہو گئی جو بیمہ کمپنی کے ایجنٹ تھے چونکہ میں بھی بیمے ہی کا کام کرتا ہوں اس لئے بہت جلد دونوں بے تکلف ہو گئے اور اس پیشے کے تجربات بیان کرنے لگے۔ پنڈت جی نے کہا کہ حال ہی میں انہوں نے ایک ایسے شخص کا بیمہ کروایا جو بستر مرگ پر تھا۔ لازم تھا کہ بیمہ سے پہلے طبی معائنے کا سوال تھا۔ پنڈت جی ڈاکٹر کے پاس گئے اور اُس سے حقیقت حال بیان کر دی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ایسے شخص کا بیمہ کسی بھی قیمت پر منظور نہیں ہو سکتا۔ پنڈت جی نے جب بہت اصرار کیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ ایک شرط پر معائنہ کر کے ساؤنڈ ہیلتھ کا سرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں کہ یہ کیس دوبارہ معائنے کے لئے کسی اور ڈاکٹر کے پاس پیش نہ ہو گا۔ پنڈت جی نے شرط منظور کر لی۔ ڈاکٹر نے سرٹیفکیٹ دے دیا۔ بیمے کی پہلی قسط بھر دی گئی اور پنڈت جی نے پالیسی لا کر مریض کے ہاتھ میں دے دی لیکن اُس کے گھر والوں کو سخت تاکید کر دی کہ اُس کے مرتے ہی وہ لوگ سب سے پہلے پنڈت جی کو اطلاع دیں ورنہ وہ بیمہ کی رقم دلوانے کی جو ۵ ہزار تھی ذمہ دار نہ ہوں گے۔ پانچویں دن اُس شخص کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے رشتہ دار بھاگتے ہوئے پنڈت جی کے پاس پہنچے۔ وہ بھاگم بھاگ ایک مداری کے پاس پہنچے جس نے دو دن پہلے ہی ایک ناگ پکڑا تھا اُسے لے کر مرنے والے کے گھر پہنچے۔ مداری نے مرنے والے کے پیر کو سانپ کٹوا دیا اور سانپ کو مار کر وہیں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر آیا اور بیمہ کمپنی کے عہدیدار بھی۔ ڈاکٹر نے سانپ کے کاٹنے سے موت واقع ہونے کی تصدیق کر دی۔ دوسرے دن مرنے والے کے ورثاء کو ۵۰ ہزار روپیہ مل گیا لیکن پنڈت جی نے نہیں بتایا کہ انہیں اس تجارت سے کتنا نفع ہوا۔

مغنی عباسی ——— بمبئی

موجود رہے گی کہ یہ شعر فلاں کا ہے۔ دوسرے اہم فائدہ یہ ہو گا کہ انشورنس کے کاروبار میں ترقی ہو گی۔ ہم تو یہاں تک کہہ دیں گے کہ ایک قانون بنا دیا جائے کہ کوئی شعر بغیر انشورنس کے مارکیٹ میں آنے ہی نہ پائے۔ بغیر انشورنس کا جو شعر بھی علم و اطلاع میں آئے ضبط کر لیا جائے اور کسی مناسب موقعہ ایسے اشعار کا نیلام کیا جائے۔ اس طریق کا تیسرا فائدہ یہ ہو گا کہ کسی حاجت مندوں کی ضرورت بلا کسی تکلیف کے پوری ہو جائے گی اور یہ لوگ، بغیر اُستاد کے شاعر بن سکیں گے۔ اس میں ہمیں کوئی قیامت نظر نہیں آتی۔ الحاقی ادب جس طرح چلا آ رہا ہے اور ادب سے خارج نہیں کیا گیا۔ اسی طرح نیلامی ادب میں جگہ پا ہی جائیگی محققین کو بھی آگے چل کر یہ ثابت کرنے کا موقعہ ملے گا کہ فلاں شعر فلاں سنہ میں، کلکتہ کے ہراج خانے میں، کے میئر کی صدارت میں ہراج ہوا تھا اور اس کی قیمت ساڑھے سات روپے اب بھی میونسپلٹی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔

فانی اور اُن کی یاسیت

ناصر صدیقی

فانی کے متعلق کسی نے کہا ہے۔

"فانی کی شاعری ایسی ہے جیسے چوٹ کھائی ہوئی بجھی ہوئی طبیعت کو کُرید کُرید کر غار کے ڈھیر سے چنگاریاں اُڑائی جا رہی ہیں۔"

یہ ایک رائے ہے اور کچھ کچھ حقیقت لئے ہوئے ہے۔ لیکن ایک دوسرے مہربان نے میر، فانی اور اُن جیسے دوسرے یاس پسندوں پر تنقید کرتے ہوئے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

"اُردو شاعری میں سب سے نکمّا شاعر میر تھا جس نے سوائے شاعری کے کچھ نہیں کیا۔ اور اگر شاعری کے علاوہ کچھ کیا بھی تو فاقہ شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری محتاج ہوتی ہے نفسیات کی۔ اور غیر نفسیات داں شاعر شاعر نہیں کہلا سکتا۔ میر کے بعد اگر کوئی نکمّا نفسیات داں شاعر پیدا ہوا تو وہ فانی ہی تھا۔ فانی کو نفسیات سے چڑ تھی۔ وہ نفسیات کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑتے تھے۔ اُنہیں دنیا اور دنیاوی مخلوق سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ قنوطی تھے اور ایسے قنوطی کہ دنیا اُن کی نظر میں تاریک تھی۔ مجسم حزن و ملال، رونا اُن کا روزمرّہ تھا۔ صورت بھی لسورتی ہوئی پائی تھی۔"

فاقہ کش شاعر

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد چند سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں کہ کہنے والا خود نفسیات داں ہے تو اس نے میر اور فانی کے کلام کو نفسیات کی کونسی کسوٹی پر پرکھا ہے؟ اگر میر و فانی نکمّے اور فاقہ کش تھے تو خود نقاد صاحب کتنے "کار آمد" اور "باکار" ہیں؟ میں ان تمام سوالات کا جواب نہیں چاہوں گا لیکن اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح میرے ذہن میں اس قسم کے سوالات اُبھرے ہیں اُسی طرح ایک عام قاری کے ذہن کو بھی یہ اقتباس متاثر کر سکتا ہے۔ فن کی باریکیوں پر تنقید اُسی وقت جامع ہو سکتی ہے جبکہ ادیب نقاد کے علاوہ باکمال اور مکمل فنکار بھی ہو — بغیر فنی بصیرت کے تخلیقی ادب پر تنقید کرنا کوئی آسان کام نہیں۔

شخصیت

فانی کے کلام سے جو شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے وہ ایک سیدھے سادے شریف اور سنجیدہ آدمی کی ہے — بہت ذہین اور دردمند دل والا — اسے نفسیات اور سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ اپنی اور اپنے دوستوں کی چھوٹی سی دنیا میں مگن رہنا چاہتا ہے۔ اپنی زندگی ہنسی خوشی گذارنا چاہتا ہے — خلوص و وفا کا متمنی۔ دوسروں کی عزّت کرنے والا اور خود اپنی عزّت کا پاس رکھنے والا — لیکن جیسے جیسے وہ زندگی کے کارواں میں آگے بڑھتا ہے تو اُس کی ملاقات رہزنوں، ریاکاروں، خود غرضوں اور ہوس پرستوں سے ہوتی جاتی ہے — راہ کٹھن ہوتی جاتی ہے اور منزل دُور — اُس کے قدم رُک جاتے ہیں۔ پیر کانٹوں سے زخمی ہو جاتے ہیں۔ وہ رُک جاتا ہے۔ ٹھہر جاتا ہے — وہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ تقدیر کیا ہے؟ یہ کیوں ہو رہا ہے — یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ کیوں ہے اور کیا ہے؟ ؏

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

اور یہاں تک کہ منزل تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے — اور اندھیرے میں مغموم صدا گونجنے لگتی ہے۔

؏ تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

وہ نہ آگے بڑھتے اور نہ پیچھے ہٹتے ہیں۔ زندگی کا کارواں رواں دواں آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ قافلے والے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے ؎

گم کردہ راہ ہوں قدم اوّلیں کے بعد
پھر راہ بر مجھے، نہ ملا راہبر کو میں
بتائے جرسِ کارواں کدھر جاؤں
نشانِ گردِ رہِ کارواں نہیں ملتا

دیوان آگ کی نذر

فانی ۱۸۷۹ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں شعر و سخن کا شوق تھا۔ اس سے اتنا ضرور ہوتا ہے کہ فانی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس میں شعر و سخن کا چرچا رہا ہوگا۔ قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے۔

"ابتدائی زندگی میں شعر و سخن کی طرف اُن کے رُجحانات کو سختی کے ساتھ روکا گیا۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ تو اُن کے ابتدائی کلام کے مجموعے کو بھی جلا ڈالا گیا۔"

قاضی صاحب کا بیان اگر صحیح ہے تو اس سے چند خاص نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ فانی کے بزرگ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا شاعری کرے۔ لہٰذا اُنہوں نے فانی کو بارہا شاعری سے باز رکھنا چاہا ہوگا۔ لیکن چونکہ بچوں کی فطرت ہوتی ہے کہ اُنہیں جس کام کے لئے منع کیا جاتا ہے وہ ضد میں آ کر اس کام کو زیادہ کرتے ہیں تاکہ وہ معلوم کر سکیں کہ آخر اُنہیں کیوں منع کیا گیا ہے۔

انچہ جب بارہ سالہ شوکت علی خاں فانی اپنا شعر پڑھ گئے
والدین نے بھی ان پر زور ڈالا تاکہ وہ اپنا شعر ختم کریں
ر شاعری ترک کر دیں۔ جب والدین کا کچھ بس نہ چلا
تنہوں نے فانی کے پہلے دیوان کو جلا ڈالا۔ اس طرح فانی
قابلیت اور استعداد کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بارہ
ال کی عمر ہی میں صاحب دیوان ہو گئے تھے۔ لیکن جب
کا دیوان منظرِ عام پر آنے سے پہلے ہی فنا ہو گیا تو پہلی
ابتدائی عمر میں فانی پر فلسفۂ غم منکشف ہوا۔ اور یہیں
فانی کی یاسیت کا دور شروع ہوتا ہے۔

"تعزیہ"

جوش ملیح آبادی فانی پر اس طرح تنقید
تے ہیں:

"دنیا ایک امام باڑہ ہے اور فانی اس
میں ایک بہت بڑا تعزیہ ہے"

لیکن اس تعزیہ کو بنانے والے کون تھے؟
کے والدین؟ نقاد یا اُن کا ماحول؟

جوش صاحب نقاد نہیں ہیں لیکن انہوں
فانی پر مزاح کی آڑ میں طنز کیا ہے۔ دراصل
کی یاسیت کے بہانے دوسرے نقادوں نے
نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ انہوں نے
کے دل میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں
اس سماج کا مطالعہ اور مشاہدہ نہیں کیا کہ وہ یاس
سند بن جائیں یا ناامیدی کو اپنی منزل بنا لیں۔ فانی
حب آگے کہتے ہیں۔

"اس کے بعد شاید اقلیم سخن کو یہ تاجدار
نصیب ہی نہ ہوتا لیکن مقدر یہ تھا کہ اُن کے دل
میں عشق کا شعلہ بھی جگہ پائے۔ وہ اپنے ساتھ
ایک افسانۂ محرومی و مہجوری لے کر آیا ہے یہ
افسانہ اتنا ہی دراز تھا جتنی کہ اُن کی عمر"

— اس کا مطلب یہ ہے کہ فانی نے عشق بھی کیا
تھا لیکن اس میں بھی انہیں ناکامی اور مایوسی ہوئی۔

اور ان کا ماحول اُن کے لئے اور زیادہ ناسازگار ہو گیا۔
یہ اُن کی دوسری ناکامی تھی۔ ظاہر ہے ایک حساس
فطرت انسان کے لئے یہ دو بڑی ناکامیاں بہت زیادہ
اہمیت رکھتی ہیں اور وہ یقیناً ان ناکامیوں اور نا امیدیوں
سے متاثر ہوئے۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ نہیں معلوم
کیونکہ تذکرہ نگاروں نے فانی کی زندگی کے بارے
میں اس سے زیادہ اور کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ پھر
بھی ہمیں اُن کی زندگی کے اُتنے ہی حالات سے کم از کم
ان کے فلسفۂ غم کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اب اگر
نقادانِ فن ان کی شخصیت اور ادب میں اُن کے مقام
سے انکار کریں اور اُن پر قنوطیت کی تہمت رکھیں تو
اُن کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ "فانی" کے "انکار"
پر قنوطیت کی تہمت رکھنے والے صرف وہی لوگ ہیں
جو اُن کے مقام کو نہیں پہچانتے — جو مقامِ انکار سے
واقف نہیں۔

فانی کا انکار

اب آئیے یہ دیکھیں کہ فانی کے یہاں "انکار"
آیا کس طرح؟ فانی جنہوں نے "احسانِ تجلی" اُٹھانے
سے بھی انکار کر دیا۔ جن کے لب پہ ایک "کلمۂ شوق"
بھی نہ آیا اور جن کے منہ سے "اَرِنی" بھی نہ نکل سکا
یہ "قوتِ انکار" اُن کے یہاں کیسے پیدا ہوئی جس
نے انہیں کہنے پر مجبور کیا ؎

دور لے جا ہٹا کے سرحدِ ناز
دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز

دراصل یہ فانی کی خودداری تھی جس اُن سے
کہلوایا ؎

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا
غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

فانی کی یہی خودداری اُن کی سب سے بڑی
خصوصیت اور انفرادیت ہے جو میر غالب اور شاد
سے بھی زیادہ اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔ فانی کی
انفرادیت اُن کے شخصی کردار کا آئینہ ہے اور اُن کے
اس شخصی کردار میں خودداری کو بہت بڑا دخل حاصل
ہے۔ دراصل فانی بڑے سیدھے سادے تھے۔
اُنہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ غدر
کے بعد پیدا ہوئے تھے جبکہ چاروں طرف انتشار
اضطراب، بے عملی اور مایوسی کی فضا تھی۔ ملک دو
گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ایک گروہ حکومت
اور حکومت کے بہی خواہوں کا تھا۔ دوسرا اُبھرتے
ہوئے متوسط طبقے کا تھا۔ فانی کی اپنی زندگی مایوس
کن تھی۔ گھر کی غیر ہمدردانہ روش، ناکام عشقیہ زندگی
کمزور اقتصادی اور مالی حالت اور ماحول کی سیمابی
کیفیت نے فانی کو غم پرستی کی اس راہ پر لگا دیا جو
بعد میں اُن کی منزل بن گئی چونکہ فانی کو سیاست سے
قطعی دلچسپی نہ تھی لہٰذا وہ ملک کے دو بڑے واضح
گروہوں میں سے کسی ایک گروہ سے بھی منسلک نہ
ہو سکے۔ وہ نہ تو حکومت کے بہی خواہ بن سکے اور
نہ ہی پریم چند یا حسرت کی طرح انقلابی۔ بات بڑی
صاف ہے کہ سیدھا سادا اور خوددار طبیعت کا
مالک کبھی سیاست میں ٹانگ نہیں اڑاتا کیونکہ
وہ نوکر شاہی کے مخصوص "گروں" اور موقع پرستی
کے "ہتھکنڈوں" سے نا واقف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ تلاشِ معاش اُنہیں سرکاروں، درباروں اور
عدالتوں میں لئے لئے پھری مگر انہیں کہیں سکون
نہ ملا۔ وہ خود اپنے خول میں سکڑ کر رہ گئے —
پے در پے ناکامیوں نے اُن کے حوصلوں کو کچل کر
رکھ دیا ؎

جگر خراش ہے حال اُن شکستہ حالوں کا
جنہیں مٹا کے رہا حوصلہ خیالوں کا

راہِ نجات

افراد اپنی نجات کے لئے یا تو روحانی
ذریعے ڈھونڈنے نکلتے ہیں، خشک اخلاقیات کا

سمجھا مالیتے ہیں یا پھر سریت اور جرائم کی طرف جھک جاتے ہیں۔ پھر بھی آرٹ کو ان رجحانات سے اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا کہ افلاطون کے اس سکونی اور مابعد الطبیعاتی فلسفہ سے جو عیسائیت کی آڑ سے کر صدیوں تک یورپ اور ایشیا کے سینے پر چھایا رہا۔ افلاطون کے فلسفہ کی بنیاد یہ تھی کہ اصل خیال محض ہے اور کائنات نقل ہے۔ حقیقت وہ نہیں ہے جس کا ادراک حواس کرتے ہیں۔ کیونکہ حواس اعتباری اور تغیر پذیر ہیں بلکہ حقیقت وہ ہے جس کا ادراک ہم حواس سے آزاد ہو کر کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسا فلسفہ انسانی جذبات اور احساسات کو کبھی معقول نہیں ٹھہرا سکتا اور نہ معقول کو محسوس بنا کر پیش کر سکتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں آرٹ کے لیے مہلک ہیں کیونکہ شاعرانہ تخیل کی بنا یہی ہے کہ وہ محسوس کو معقول اور معقول کو محسوس بنا کر پیش کرتا ہے۔

مابعد الطبیعاتی فلسفہ ایک غلط شعور کا نام ہے جو مختلف راہوں سے انسانی ذہنوں پر مسلط ہوتا ہے یا کیا جاتا ہے۔ جب بھی زندگی کے معنی کوئی سمجھ نہیں پاتا ہے تو ناامید ہوتا ہے۔ یہ ناامیدی غیر تسلی بخش ماحول میں پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ناامید انسان مذہب کی طرف جھک جاتا ہے۔ اقبال، ٹیگور، کبیر، تلسی داس، جائسی، کالی داس، غالب اور میر نے بھی مابعد الطبیعی فلسفے کے ماتحت اپنے ادب میں فن کی روشنی دی۔

پناہ گاہ

فانی بھی چونکہ مایوس اور ناامید ہو چکے تھے وہ ملک کے کسی بھی گروہ سے منسلک نہ ہو سکے تو انہوں نے مابعد الطبیعاتی فلسفہ کو اپنا لیا۔ انہیں اس سماج سے کوئی خوشی حاصل نہ ہو سکی۔ وہ اقتصادی جنسی اور تمدنی محرکات کی ایسی دنیا پیدا کرنے کے متمنی رہے جہاں خیالات کے تضاد میں توازن اور واقعات کے تنازعات میں آہنگ پیدا ہو۔ ایسی ہی دنیا کے متمنی تھے لیکن جب انہیں ایسا سماج اور ایسی دنیا نہ مل سکی تو مایوس ہو کر وہ مابعد الطبیعی فلسفہ کی طرف مائل ہو گئے کیونکہ صرف مابعد الطبیعی فلسفہ ہی انہیں پناہ دے سکتا تھا۔ اس فلسفہ نے فانی کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ وہ کہتے ہیں ؎

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات
ہاں مگر اتنا کہ زنجیر بدل جاتی ہے

ان کا یہ شعر مابعد الطبیعاتی فلسفہ کی تبلیغ کرتا ہے جب فانی اس فلسفے کے داعی بن گئے تو انہوں نے موت کی پرستش کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے موت کو زندگی کے مقابلے میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اگر اُن کی خارجی زندگی اُن کے دل و دماغ اور خلوص کو نہ ٹھکراتی۔ اگر وہ اپنے غم کو سماج کے غم سے ربط دے سکتے تو وہ کبھی موت سے والہانہ پیار نہیں کرتے۔ موت اُن کی ایسی محبوبہ بن گئی جس کو وہ بے جھجک گلے لگا لیتے تھے ؎

آج روزِ وصالِ فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز
مری قضا کو وہ لانے دلہن بنائے ہوئے

فانی مر گئے۔ انہیں سوا کرب و اذیت کے سوا کچھ نہ دیا اس اُن کی شاعری ... مجبور روح بن گئی۔

فانی کا کلام ان تمام حالات کی دکھ بھری داستان ہے۔ بقول مجتبیٰ حسین۔

"اُن کی بہترین شاعری ایک احتجاج ہے۔ ایک فرد کا احتجاج، ایک ایسی سوسائٹی کے خلاف جو انسانوں کو نہ صرف پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیتی بلکہ ان کی عظمت اور اُن کی صلاحیت کی بھی منکر ہے۔ ان کی شاعری نے مروجہ اقدار کو قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر یہ انکار ایک فرد کا ہے۔ اس لئے اس میں وہ توانائی وہ حرکت اور وہ عظمت نہیں جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اجتماعی اور مجموعی انکار میں ملتی ہے۔ یہ ایک مایوس آدمی کی آواز ہے جو جذبۂ رحم بیدار کر دیتی ہے۔ ان کی شاعری ہمارے ادب میں ایک خونچکاں کفن پہنے ہوئے کھڑی ہے جو پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ یہی کہ ہم ایک فرد کی زندگی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جو سرمایے کی ناانصافی کا شکار ہیں۔ جب تک طبقاتی اقتصادی ناہمواری باقی ہے لاکھوں فانی پیدا ہوں گے اور مر جائیں گے"

ہاں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

میں ڈالا اور اتنا گھمایا کہ صوفیہ کو پتہ آگیا — مگر اُس کا جی کچھ جاتا تھا۔ ابھی اور — ابھی اور — ابھی اور۔ . .

"یہ کار ہوگی کتنے کی؟" اس نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں یوں جیسے عمر کی آخری منزل پر کھڑی ہو — پوچھا۔

"صاحب نے تو چالیس کی لی تھی — مگر اب ۳ سال استعمال کر چکے ہیں وہ ابھی پرسوں اپنے کسی دوست سے کہہ رہے تھے کہ اگر کوئی گاہک مل جائے تو میں دس ہزار تک دے دوں گا اور مزید روپیہ ڈال کر نئی لے لوں گا۔"

دس ہزار — دس ہزار —

کار اس قدر شاندار حالت میں تھی کہ دس ہزار میں قطعاً مہنگی نہ تھی۔

صوفیہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"دس ہزار تو لیے زیادہ نہیں۔"

"تم لوگی۔" شوہر بڑے پیار سے ہنسا —

اصل میں چالیس ہزار کے مقابلے میں دس ہزار صوفیہ کو بہت کم لگے لیکن جب اُس کے شوہر نے پوچھا کہ "تم لوگی" تو اس کا دماغ ٹھکانے آگیا۔ ہوش میں آکر بولی۔

"میں —؟" بڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولی۔ "ہاں میں لو لوں گی کیوں نہیں لے سکتی؟ — انسان ہی تو کار میں بیٹھتے ہیں۔ میں بھی تو انسان ہی ہوں۔"

وہ بڑی خوش دلی سے ہنسا۔

"میری جان کے ارادے تو بہت بڑے بڑے ہیں۔" اور کار شہر کی لانبی چکنی اور چوڑی چوڑی سڑکوں کے چکر کاٹتی رہی۔

O

صوفیہ میں یکایک ایسا تغیر آگیا کہ پائی پائی کو دانتوں سے پکڑنے لگی۔ کپڑے بنانے تو اُس نے چھوڑ دئے۔ سنگھار کا سامان اُس کا شوہر لاتا تو کہتی یہ سارا فضول خرچ کس لئے — پیسے رہیں گے تو کام آئیں گے۔ کھانے کا معیار بھی گر گیا پہلے جہاں روزانہ ناشتے میں انڈے اور شام میں گوشت سبزیاں پکتی تھیں۔ دال پر آکر بات ٹھہر گئی تھی۔ آنے جانے والوں کو اُس نے چائے تک پلانی چھوڑ دی۔ شوہر باہر سے آتا تو آتے ہی اُس کی جیبیں ٹٹولنے لگتی۔

"آج تمہارے صاحب کے کسی دوست کو اُس کے گھر لے جاکر نہیں چھوڑا تم نے، پھر اُس نے ٹپ نہیں دی ہوگی۔"

وہ پریشان ہو کر رہ جاتا — پہلی تاریخ کا ایسی بے تابی سے انتظار کرتی کہ کنواریاں اپنے بالم کا بھی کیا کرتی ہوں گی اور جب پہلی تاریخ کو اُس کا شوہر جیبیں بھر آتا تو اس بھوکی طرح لپکتی اور جیبیں خالی کرتی کہ وہ حیران رہ جاتا۔ اُس کی بوڑھی ساس گاؤں میں اپنے دوسرے بیٹوں کے پاس تھی۔ کھیتی باڑی سے گزر ہوتی تھی خاصی گزر ہوتی تھی: مگر صوفیہ اور شوہر ا پانچ روپے ہر مہینے ماں کو بھیجا کرتا تھا اب صوفیہ نے بھی بند کر دئیے۔

"کیا پالنے کے لئے ہمیں رہ گئے ہیں۔ کسی کو کیا پتہ کتنی مصیبتوں سے میں گھر کا خرچ پورا کرتی ہوں۔"

اُس کا شوہر حیران رہ گیا۔ آخر یہ پیسہ وہ کیا کرتی ہے۔ مگر اُس نے پوچھا تک نہیں۔ عام شوہروں کی طرح وہ دل میں شکوک پالنے کا عادی نہ تھا بہت ہی صابر قسم کا آدمی تھا۔ گوشت ملے یا کھانے میں دال ملے۔ وہ اسی رغبت سے کھا لیتا۔ چائے ملے یا دودھ — وہ بچوں کی طرح غٹ غٹ پی جاتا۔ بس کار کوئی پرابلم ہی نہ تھا۔ جہاں تک اس کی طرف سے دردی ملی ہوئی تھی۔ وہ اکثر دیکھتا کہ جب وہ اپنی ڈیوٹی دے کر آتا ہے تو صوفیہ کمرے میں گھسی کچھ کر رہی ہے — جیسے ہی وہ آتا وہ کھٹ سے صندوق کا ڈھکنا گرا کر باہر نکل آتی — اُس دن صبر کرتے میں جو صوفیہ اور اُس میں بات چیت ہوئی تھی اُس کو اُس نے رتی برابر بھی اہمیت نہ دی تھی — اور اُس کے دماغ کے کسی گوشے میں اس بات کی یاد تک نہ تھی کہ صوفیہ نے موٹر لینے کو کہا تھا۔ وہ تو جبھی بھول گیا تھا جیسے کہ عام شوہر بیویوں کی کہی ہوئی باتیں اکثر بھول جایا کرتے ہیں۔ مگر صوفیہ نے تو جیسے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری مقصد ہی یہ بنا لیا تھا کہ کار خریدے — دن بھر میں وہ ہزار مرتبہ اپنے جوڑے ہوئے پیسوں کو گنتی اور اُس کا دل خوشی سے بھر جاتا قطرہ قطرہ کر کے ہی تو سمندر بنتا ہے۔ دس ہزار جمع ہوتے ایسے کتنے دن گزر جائیں گے — لمبی کار کی کیا ضرورت ہے۔ وہ دس ہزار میں چھوٹی سی نئی کار ہی کیوں نہ لے لیگی — مگر جانے دس ہزار میں نئی کار آتی بھی ہے یا نہیں — ابھی اتنی عام چیز تھوڑی ہوئی ہے کہ ہر کس و ناکس لے سکے۔ مانگ زیادہ ہے مال کم ہے باہر سے مال آتے ہی کھٹا کھٹ بک جاتا ہے۔ مگر اسے کیا پروا — ایسی کون اسے ہزار دو ہزار کاریں خریدنی ہیں کسے تو بس ایک کار چاہئے —

صوفیہ اسی دھن میں مری جا رہی تھی کہ کس صورت آمدنی میں اضافہ کیا جائے ایک دن بیٹھے بٹھائے اسے خیال آیا کہ کپڑے سی کر آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ مگر مشین تو تھی ہی نہیں — صوفیہ کے ماں باپ متوسط طبقے کے لوگ تھے جو بیٹیوں کو جہیز میں بس ضرورت کے لائق چند جوڑے اور چند برتن بھانڈے دے کر دولہا کر دیتے ہیں۔ ریڈیو مشین وغیرہ تو امیروں کے چونچلے ہیں۔ مگر جب اُس نے یہ سوچا کہ مشین خریدنے کیلئے بھی تو ایک معقول رقم کی ضرورت ہے تو سخت اُداس ہوئی — بڑے دنوں کے سوچ بچار کے بعد بالآخر اُس نے فیصلہ کر لیا کہ مشین خرید ہی لے۔ ویسے تو ایک ہی بار دل دکھے گا کہ اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل گئی۔ مگر روزانہ جو آمدنی آئے گی اُس سے کتنا خون نہ بڑھے گا؟

مشین آگئی اور کھٹر کھٹر رسلائی ہونے لگی۔ دن دن بھر صوفیہ مشین پر جھکی تو رہے، پاس پڑوس والیوں کے کپڑے سیتی رہتی۔ چند دن ایسے گزرے۔

ایک دن کوئی پرنسپل کے دفتر میں گھس گیا، اور طلبا کا ریکارڈ اور رپورٹ کے کارڈ چرا کر لے گیا۔ ایک عام جلسہ طلب کیا گیا۔

۲ گھنٹوں تک پرنسپل بحث کرتا رہا۔ اس نے خوشامدیں کیں، دھمکیاں دیں کہ اصل مجرم کا پتہ چل جائے لیکن کسی نے جرم کا اقبال نہیں کیا۔ آخرکار وہ غضبناک ہوگیا اور اس نے اپنی موٹی انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تم ہی ہو۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ آپ سے غلط فہمی ہوئی ہے

"وہ تم ہی ہو۔ تم ہی نے یہ سب کیا ہے۔" وہ چیخا

میں نے محسوس کیا کہ مزید بحث کرنا بیکار ہے۔ دوسرے دن مجھے اسکول سے نکال دیا گیا۔

کچھ دن تک میں نے اسکول سے اپنے اخراج کو اپنی ماں سے چھپائے رکھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہوجائے گی لیکن اُسے جلد ہی معلوم ہوگیا۔ وہ رونے لگی اور میری منت سماجت کرنے لگی کہ میں اسکول کے پرنسپل کے پاس جا کر معافی مانگ لوں۔ وہ خود بھی اس بارے میں کسی سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن میری خودداری اور میرے غرور نے مجھے پرنسپل سے معافی مانگنے سے روکے رکھا۔

میں نے اپنی ماں سے جھگڑا کرلیا اور اپنے باپ کے پاس رہنے کے لئے چلا گیا۔ میں نے قازقستان تک کا پورا سفر ریل کی چھت پر سوار ہوکر کیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۵ سال تھی۔ میں جلد بڑا ہوکر اپنے پیروں پر کھڑا رہنا چاہتا تھا۔

اُس وقت میرے والد ایک جیولاجی کی مہم کے سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے جب میں پھٹے ہوئے حالوں میں اُن کے پاس پہنچا تو، انہوں نے مجھے بڑے غور سے دیکھا اور کہا۔

"تو تم اپنے پیروں پر کھڑا رہنا چاہتے ہو۔ اگر واقعی تم اس بارے میں سنجیدہ ہو تو خیال رکھو کہ یہاں کوئی یہ بات جاننے نہ پائے کہ تم میرے لڑکے ہو۔ ورنہ یہ ہوگا کہ ہر شخص تمہارے ساتھ ہمدردی سے پیش آئے گا اور پھر تم اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہوسکو گے۔"

میں نے اپنے والد کی مہم میں ایک مزدور کی حیثیت سے ملازمت کرلی۔

میں نے کدال سے زمین توڑنا سیکھا۔ میں نے سخت چٹانوں کے ایسے ہی چپٹے ٹکڑے کر دئے جیسے میرے ہاتھ۔ میں نے ریزر بلیڈ سے ایک دیا سلائی کاٹ کر تین دیا سلائیاں بنانا سیکھیں تاکہ ہم بارش میں آگ جلا سکیں۔

کچھ دن بعد میں نے ایک دوسری مہم میں ملازمت کرلی۔ یہ مہم التائی علاقے میں کام کرتی تھی۔ میں مزدور سے بھرتی ہوا تھا لیکن جلد ہی میں مہم کی ٹیکنیکل برانچ کا ممبر ہوگیا۔ میں کلکٹر ہوگیا۔

اگرچہ میرا سابقہ کئی خراب لوگوں سے پڑا ہے لیکن میرا یہ عقیدہ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا کہ دنیا میں اچھے آدمیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہے میں آج بھی اس پر یقین رکھتا ہوں۔ بدقسمتی سے میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بدمعاش ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود آپس میں گھل مل کر رہتے ہیں۔ اور اسی میں اُن کی قوت کا راز مضمر ہے۔ اچھے لوگ منتشر ہیں اور یہی اُن کی کمزوری کا باعث ہے۔

میں نے ایک نیا اور مختلف قسم کا پیمانہ بھی بنایا ہے جس سے لوگوں کا کلچر ناپا جاسکتا ہے۔ مجھے اس کا یقین ہوگیا ہے کہ کلچر ان چیزوں کا مجموعہ نہیں ہے جسے ایک شخص جانتا ہے بلکہ وہ قابلیت ہے جس سے وہ لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ انہیں سمجھتا ہے اور اُن کی مدد کرتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ جن سے میں ملا ہوں مجھے جاہل سپاہیوں کسانوں، مزدوروں اور حتیٰ کہ مجرموں سے بھی کم کلچر رکھنے والے نظر آئے۔

میرے لئے روحانی طور پر متمول اشخاص وہ نہیں ہیں جو گھنٹوں بحث کے دوران بڑی بڑی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں اور جو اپنی بحث افلاطون کے اقوال سے شروع کرکے کافکا اور جوائس پر ختم کرتے ہیں

میرے لئے روحانی طور پر متمول اشخاص وہ ہیں جن کے دل دوسرے کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ میرے لئے انتہائی تعلیم یافتہ لوگ بھی۔ اگر اُن کی تعلیم اُنہیں بدمعاش اور لفنگا بننے سے نہیں روکتی۔ یا اُنہیں کامیاب لفنگا اور بدمعاش بننے میں مدد دیتی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کے برابر ہیں۔

○

جب میں اپنی ماں کے پاس واپس آیا تو میری رنگت دھوپ سے جل چکی تھی اور میں زیادہ پختہ شعور ہوچکا تھا۔ ماں نے اب میرے اسکول جانے پر اصرار نہیں

ایک قیمتی سوانح حیات

اس لئے میں دھواں دار طور پر نظمیں لکھنے لگا اور رسالوں پر دھاوا بول دیا لیکن میری ایک نظم بھی شائع نہ ہو سکی۔

شاعری کے علاوہ میری ایک شدید دلچسپی بھی تھی — فٹ بال — رات میں میں شاعری کرتا تھا اور دن میں فٹ بال کھیلتا تھا۔

فٹ بال نے مجھے کئی باتیں سکھائیں۔ جب میں گول کیپر تھا تو میں مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کی خفیف سی حرکت کا بھی بڑی جلدی سے سراغ لگا لیتا تھا اور اُن کی چالوں کو پہلے ہی بھانپ لیتا تھا۔ یہ چیز میری ادبی جدوجہد میں میرے لئے بڑی مددگار ثابت ہوئی۔

مجھ سے کہا گیا کہ میں فٹ بال کا ایک بہترین کھلاڑی بن سکتا ہوں۔ بہت سے لڑکے جن کے ساتھ میں اسکول میں کھیلتا تھا پیشہ ور کھلاڑی بن چکے تھے اکثر اوقات جب اُن سے میری ملاقات ہوتی ہے تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ مجھے رشک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں لیکن بعض اوقات میں بھی اُن پر رشک کرتا ہوں۔

فٹ بال کئی اعتبار سے شاعری سے آسان چیز ہے۔ اگر آپ ایک گول مارتے ہیں تو آپ کے پاس اس کا قطعی ثبوت ہوتا ہے کیونکہ بال جال میں اٹک جاتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہوتی ہے لیکن اگر آپ شاعری میں گول مارتے ہیں تو یہ گمان اغلب ہے کہ ہزاروں ریفری نہایت تیزی سے سیٹیاں بجانا شروع کر دیں گے اور چیخ کر کہیں گے کہ گول نہیں ہوا حالانکہ آپ گول مار چکے ہیں۔ لیکن آپ کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے۔ یہاں تو تماشائی جو گول کے کھمبے سے بہت ہٹ کر گزرتا ہے گول بن جاتا ہے۔

لیکن عموماً اُن چالبازیوں اور گڑبڑیوں کے باوجود کھیل کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کھیل کود ادب سے زیادہ صاف ستھری چیز ہے۔ میری زندگی میں کئی لمحات ایسے آئے جب مجھے پیشہ ور فٹ بال کا کھلاڑی نہ بننے پر افسوس ہوا۔

میں تقریباً کھلاڑی بن گیا ہوتا لیکن اُس وقت ایک ایسی بات ہو گئی جس نے میری تقدیر کا نقشہ بدل دیا۔

میں عرصے سے اپنی نظم سوویت اسپورٹس کے پاس لیجانا چاہ رہا تھا۔ صرف یہی ایک رسالہ تھا جسے میں نے اپنی نظم نہیں بھیجی تھی۔

ایک میچ کے بعد میں رسالے کے دفتر گیا۔ میں فٹ بال کا نیلے رنگ کا قمیص اور نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک ایسی نظم تھی جس میں روس اور امریکہ کے کھلاڑیوں کا مختصر موازنہ اور تجزیہ کیا گیا تھا۔

"سوویت اسپورٹس" کا ادارتی آفس ایک بہت بڑا کمرہ تھا جہاں سگریٹ کے دھوئیں کے بادلوں، ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ، قلموں کی سرسراہٹ اور کمپوزیٹروں کے کام کی گڑگڑاہٹ میں میں نے بمشکل کچھ لوگوں کی موجودگی محسوس کی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ نظموں کا شعبہ کہاں ہے۔ کمرے میں سے ایک آواز آئی کہ یہاں ایسا شعبہ نہیں ہے۔

اچانک کمرے میں سے ایک ہاتھ اٹھا اور میرے کندھے پر آ کر رک گیا۔ اور ایک آواز نے کہا۔

"نظم ذرا مجھے بتائیے"

میں نے اُس ہاتھ اور آواز پر فوراً بھروسہ کر لیا۔ میرے سامنے ایک تیس سالہ جوان بیٹھا تھا جس کے بال کالے تھے اور آنکھیں بھی کالی جو ذہانت سے چمک رہی تھیں۔ اُس کا نام نکولائی الیگزینڈرووچ تاراسوف تھا۔ وہ چار شعبوں کا نگران تھا۔ غیر ملکی خبریں، سیاست فٹ بال اور ادب۔ اُس نے مجھے اپنے برابر بٹھا لیا اور نظم پر نظریں دوڑانے لگا۔

"کیا آپ کے پاس کوئی اور نظم ہے"

میں نے اپنی جیب سے باقی نظموں کی بیاض نکالی اور ڈرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ نظمیں اسپورٹس کے متعلق نہیں ہیں۔"

"یہ اور اچھا ہے" اُس نے مسکرا کر کہا۔

اُس نے نظموں کو ٹائپ رائٹروں کے شور میں زور سے پڑھنا شروع کیا۔

آج تک مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اُس نے میرے اندر چھپے ہوئے شاعر کو کس طرح دیکھ لیا تھا۔ ایسا شخص ہو کر ادب اُس کا میدان نہیں تھا اور تعصب اور حسد سے بہت دور تھا۔

اُس نے میری نظم "اسپورٹس کی دو قسمیں" الگ نکالی اور کہا۔

"یہ نظم سب میں خراب ہے اور یہی میرے کام کی ہے۔"

اُس نے میری نظم کے پرچے پر وہ سحر انگیز الفاظ لکھے جن کا مجھے مدتوں سے انتظار تھا۔ "اسے چھپنے کے لئے تیار کیا جائے" — اور کاغذ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

"اب کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ آپ کی دوسری نظمیں بہت اچھی ہیں البتہ کہیں کہیں ایک آدھ لائن اچھی ضرور ہے۔" اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کو کہیں جانے کی جلدی ہے؟ اگر نہیں تو آپ کو اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا ہوں۔"

اُس نے کسی کو فون کیا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کمرے میں ایک آدمی جس کا رنگ گندمی تھا اور پیشانی بہت چوڑی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی بغل میں شطرنج کی بساط دبائے ہوئے تھی۔

"میرا دوست ولوڈیا ہے [illegible] — اور یہ ہیں یوجین یفتوشنکو — شاعر۔"

یہ پہلا وقت تھا کہ کسی نے مجھے شاعر کہا تھا۔

(باقی)

خواجہ حسن نظامی

محسن انجم

اُردو کے صاحب طرز ادیبوں میں خواجہ حسن نظامی کا شمار اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ اُنہوں نے روزمرہ کی عام بول چال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آسان اور فطری زبان میں مضامین لکھے۔ اُنہوں نے سادگی میں بھی پُرتکلف زبان استعمال کی ہے۔ یعنی سادگی کو پاکیزگی کے مترادف سمجھ کر شوخ اور شاعرانہ جملوں اور ترکیبوں سے بہت حد تک احتراز کیا ہے۔ اُنہوں نے اپنی تحریروں میں نہ تو پاکیزگی اور سادگی کو ہم معنی سمجھا اور نہ شاعری اور فارسی الفاظ و تراکیب کے سہارے اپنا رنگ جمانے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے تھوڑی بہت ہندی سے بھی مدد لی لیکن اس حد تک جہاں تک فطری سادگی اور پاکیزگی نے اجازت دی۔ اس طرح ان کی نثر نہایت سلیس اور دلچسپ ہو گئی ہے۔

خواجہ صاحب کی نثر کا مقابلہ غالبؔ کی نثر سے کیا جاسکتا ہے۔ غالبؔ کی تحریروں (خطوط) میں جو روزمرہ کی گفتگو، برجستگی اور بے تکلفی کی فضا پائی جاتی ہے ٹھیک وہی فضا خواجہ صاحب کے یہاں بھی ہے۔ جس طرح غالبؔ اپنے خطوط میں مکتوب الیہ سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں بالکل اسی طرح خواجہ صاحب بھی گھل مل جاتے ہیں۔ اُن کے یہاں قاری سے براہِ راست تخاطب کا انداز پایا جاتا ہے۔ وہ قاری کو کوئی علاحدہ شخصیت نہیں سمجھتے اور نہ ہی ان سے اجنبیوں جیسا سلوک کرتے ہیں بلکہ ایک طرح سے وہ قاری کو مضمون کا ایک ضروری جز خیال کرتے ہیں اور قاری سے کچھ اس طرح پوری طرح اپنائیت رکھتے ہیں۔ اُن کے حقوق کو پامال نہ کرتے ہوئے، پوری طرح اُن کا خیال رکھتے ہیں اور قاری سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ حاضر و غائب کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور یہ بات خواجہ صاحب میں براہِ راست آئی ہے۔

خواجہ صاحب نے نثر میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کا خاص کمال اُن کے ہلکے پھلکے مضامین میں ہے، جنہیں ہم انشائے لطیف کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو اُن کی تمام تحریریں اُن کے اس خاص کمال کی آئینہ دار ہیں لیکن اس قسم کے مضامین میں وہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے۔ اس قسم کے مضامین اُردو میں لکھے تو گئے ہیں مگر بہت ہی کم کے برابر۔ رشید احمد صدیقی، پطرس، مرزا فرحت اللہ بیگ اور فلک پیما وغیرہ نے بھی اس قسم کے مضامین لکھے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب ان سب سے منفرد ہیں کیونکہ ان کے یہاں موضوعات کا جیسا تنوع ہے ویسا کسی اور جگہ نہیں۔ اُنہوں نے چھوٹی سے چھوٹی، غیر معمولی باتوں سے لے کر نہایت معمولی باتوں پر بھی نہایت دلکش مضامین لکھے ہیں۔ مثلاً آتش بازی، دیا سلائی سے لے کر مچھروں کی بھن بھن تک اُن کے قلم سے بچ نہ سکے۔ یوں تو دیا سلائی، آتش بازی اور مچھروں کی بھن بھن جیسے عنوانات میں کوئی ظاہری کشش نہیں نظر آتی لیکن خواجہ صاحب نے اِن عنوانات سے جس طرح انصاف کیا ہے یہ اُن ہی کا حصہ ہے۔

خواجہ صاحب کے مضامین میں طنز سے زیادہ مزاح کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ یہ مزاح صحیح طور پر ان کی ذہانت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اُنہوں نے خاص مزاحیہ قصے اور مضامین کم لکھے ہیں۔ عام طور پر اُن کے مضامین میں کہیں کہیں کوئی مزاحیہ جملہ نظر آتا ہے اس سے ان کا مقصد مزاح نہیں بلکہ اپنے کسی نظریے یا بات کی تائید مقصود ہوتی ہے۔ مذہبی، سیاسی، ادبی اور علمی مضامین میں اُنہیں نہایت ملکہ حاصل تھا۔

خواجہ صاحب ہر بات میں جدّت پیدا کرنے کے حامی تھے۔ اور کچھ نہیں تو اپنے ملنے والوں کے قلمی چہرے لکھ ڈالے۔ قلمی چہرے یا خاکے یوں تو بہت لوگ اور رسالوں میں ملتے ہیں مگر خواجہ صاحب جیسا انداز اور اُن کی سی وسیع النظری کہاں؟

اُنہوں نے اپنا اخبار "منادی" نکالنا شروع کیا اور روزانہ اس میں اسی طرح اپنا روزنامچہ لکھتے تھے۔ دن بھر میں جو کچھ بھی ہوتا جن جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوتیں، وہ سب آپ اخبار میں شائع کر دیتے۔ یہ سلسلہ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا۔ انہوں نے مذہبی تبلیغ کے لیے اپنا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ آپ مذہبی اُمور پر دلچسپ بحث کرتے۔ آپ کی اس قسم کی بعض کتابیں بہت زیادہ مشہور ہیں۔ زکوٰۃ کے متعلق ایک کتابچہ ہے جس کا نام "خدائی انکم ٹیکس" ہے اور دوسری کتاب موت کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ جس کا نام "کم ز موت" ہے۔ یہ کتاب بھی مشہور ہے۔

خواجہ صاحب نے اوائلِ شباب ہی سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور آخری عمر تک لکھتے رہے تھے۔ اُن کی تصانیف بے شمار ہیں۔ ان کی کتابیں کئی طرح کی ہیں۔

ایک تو وہ جو خواجہ صاحب نے خود ہی لکھی ہیں۔ دوسری وہ جو خواجہ صاحب نے دوسروں سے لکھوائیں یا ترجمہ کروائی ہیں۔ جن کتابوں کا آپ نے ترجمہ کیا ہے اُن میں آپ کا نام مترجم ہی کی حیثیت سے شائع ہوا ہے۔ تیسری قسم وہ جو خواجہ صاحب نے اپنی زیرِ نگرانی اور طرزِ تحریر میں لکھوائی ہیں۔ موخر الذکر یعنی تیسری قسم کی کتابوں میں اصل مصنف کا نام نہیں لکھا گیا ہے اور یہ کتابیں خواجہ صاحب ہی کے نام سے منسوب ہیں۔

بعض لوگ اس بات کو خواجہ صاحب کی بددیانتی پر محمول کرتے ہیں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے ان کتابوں میں اتنی زیادہ اصلاح و ترمیم کی ہے کہ وہ کُتب انہیں کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یوں تو انہوں نے بیشمار کتابیں لکھیں مگر ان میں سے "انتخاب توحید" "سی پارۂ دل" "جگ بیتی" "غدر دہلی کے افسانے" "سفرنامۂ مصر و حجاز و شام" "کرشن بیتی" "چٹکیاں اور گدگدیاں" "آپ بیتی" "مجموعۂ خطوط" اور "قبروں کے غیبی لوشتے" بہت مشہور ہیں۔

"سفرنامۂ مصر و حجاز و شام" ان کی پہلی کامیاب کتاب ہے۔ اس میں اُنھوں نے اپنے خاص طرزِ نگارش میں سفر کے حالات اور واقعات بیان کئے ہیں۔ اکثر جگہوں پر بے خود ہو کر شاعری بھی کی ہے۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کی مزار پر پہنچ کر انہوں نے کہا۔

"یوسف ایُّہا الصدّیق! دروازہ کیوں بند ہے؟ صورت دیکھنے دیجئے۔ مصری عورتوں کی طرح چھُری سے ہاتھ نہیں کاٹوں گا۔ جلوۂ محمدیؐ نے جمال بینی کا عادی کر دیا ہے!—

میرے اچھے یوسف! تم سے کس طرح ہم کلام ہوؤں۔ جی چاہتا ہے بے باک ہو کر، گستاخ ہو کر، از خود رفتہ کیف میں مجنونانہ جوش میں خطاب کروں مگر پیغمبری آداب مانع ہے۔ ادب روکتا ہے۔ معاف کیجئے میں نے بادشاہِ مصر اور مقبولِ پروردگار کو تم کہہ کر مخاطب کیا۔ خواب کی تعبیر بتانے میں حضور کو ملکہ تھا۔ فرمائیے تو اس دُنیا کے خواب کی تعبیر کیا ہے۔ یہاں کے محرک نظاروں نے میری نیند برباد کر دی ہے۔"

"انتخاب توحید" دراصل اخبار "توحید" سے منتخب شدہ مضامین کا مجموعہ ہے اور اس میں تمام تر خواجہ صاحب ہی کے مضامین ہیں۔

"سی پارۂ دل" بھی خواجہ صاحب ہی کے مضامین کا مجموعہ ہے جسے احسان الحق صاحب نے مرتب کیا ہے۔

"کرشن بیتی" بھی آپ کی ایک تصنیف ہے۔ جس کے بارے میں آپ نے کہا ہے کہ۔

"میں نے اتنی محنت کسی کتاب میں نہیں کی جتنی تلاش اور عرق ریزی کرشن بیتی" لکھنے میں کی ہے۔"

خواجہ صاحب کی تحریروں کا تاثر عموماً بہت گہرا ہوتا ہے۔ جب وہ مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں تو پڑھنے والا بے تحاشہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس اگر غمگین اور المیہ افسانے لکھتے ہیں تو قاری کرداروں کے غموں کو اپنا غم سمجھنے لگتے ہیں۔ "غدر دہلی کے افسانے" اور "جگ بیتی" کے اکثر افسانوں میں سوز و گداز کی فراوانی ہے۔

"جگ بیتی" کے ایک افسانے کا ایک حصّہ ملاحظہ ہو:—

"دولت والو ٹکڑا دو! عزّت والو ٹکڑا دو! اپنے بچوں کا صدقہ ٹکڑا دو! اپنے لالوں کا صدقہ ٹکڑا دو! تمہاری جوڑی کی خیر۔ تمہاری ڈیوڑھی کی خیر۔ ایک نوالہ! لو میرا خالی پیالہ۔ لوگو! تمہارے محلے میں ٹھوکریں کھانے والی بھکارن آئی ہے۔ ساتھ میں اس کی جائی ہے۔ ہم دونوں پر بھوک کی مار آئی ہے۔ دہائی ہے۔ دہائی ہے ایک نوالہ مجھ کو دو! سونے والو جاگو! ایک دن میں بھی سوتی تھی۔ پیا کا پیرا سوتی تھی۔ دنیا نے تاراج کیا۔ اس کو جس نے راج کیا۔ اب گدڑی میرا جوڑا ہے اور پاؤں کا چھالا گھوڑا ہے عیش کی راتیں فانی ہیں۔ موت کے دن سب جانی ہیں۔ کنڈی کھولو ٹکڑا دے دو، روکھا ہو یا بھی ہو۔ سب ہے نعمت، بھوک سے میری بُری ہے نوبت۔ یہ ننھی بچی روتی ہے۔ یہ محل کی ملکہ گود میں تھی۔ اب گدا کی دختر پیدا ہے۔ یہ باپ کی پیاری [illegible] کی ماری [illegible] آئی بھکارن ٹکڑا [illegible] یہ دنیا آنی جانی ہے۔ [illegible] فانی ہے۔ [illegible] مدہوش نہ ہو۔ عبرت سے با ہوش بنو صدقہ کا ایک ٹکڑا دو۔"

یہ منثور شاعری ہی نہیں ہے کیونکہ اس میں اکثر جملے موزوں ہیں۔ ظاہر ہے کہ بغیر کسی کوشش کے یہ سب ہونا محال ہے اور بہت بڑی بات ہے۔

خواجہ صاحب کے متعلق مُلّا واحدی نے ایک واقعہ لکھا ہے ایک دفعہ خواجہ صاحب خواجہ نوشاد علی خاں کو درگاہ حضرت سلطان جیؒ میں لے گئے۔ درگاہوں کے دروازوں پر جوتیوں کے رکھوالے بیٹھا کرتے ہیں۔ ہم سب نے جُوتیاں اُن کے سپرد کیں۔ واپس آتے وقت خواجہ صاحب نے رکھوالوں کو انعام دینے کی غرض سے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اتفاق سے ریزگاری کے بجائے روپیہ ہاتھ آگیا۔ خواجہ صاحب نے وہی روپیہ رکھوالوں کو دے دیا اور ہمیں یہ قصہ بتایا کہ بچپن میں میں خود یہاں بیٹھا کرتا تھا اور انعام کا پیسہ پیسہ جمع کرتا تھا۔

اب چلتے چلتے خواجہ صاحب کی نثر نگاری پر مشہور صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے بھی سنتے چلئے۔

"اگر کوئی میٹھی، سریلی، سجیلی، البیلی اُردو کی بہار دیکھنا چاہے تو اسی دہلوی خواجہ حسن نظامی کے قلم کے ترشے ہوئے گل بوٹے، نقش و نگار دیکھ کر اُن پر اپنا سر دُھنے۔ بانکپن، شگفتگی اور ندرتِ ادا اُن کا خاص ہُنر اور اثر، سوز و گداز اُن کے قلم کا امتیازی جوہر۔ چاہے روتے ہوؤں کو ہنسا دیں اور جب چاہے ہنستوں کو رُلا دیں۔ بچوں کو طرح طرح کے کھلونے دے کر بہلاتے ہیں۔ جوانوں کا خون گرماتے ہیں اور بڑھوں کو تھپکیاں دے کر سلاتے ہیں۔ کمال یہ ہے جس موضوع پر بھی قلم اُٹھائیں اس کو جان بنا دیں۔ حروف کے پیکر بے جان کو جاندار بنا کر چمکا دیں۔ شنید کو دید کا پیرہن پہنا دیں۔"

محمد خواجہ معین الدین

راڈر کی نئی ایجاد
اندھے دیکھ سکیں گے

یہ تو کم و بیش سب ہی جانتے ہیں کہ ریڈیو اسٹیشن
ٹرانسمیٹر میں آواز برقی لہر پر (جو بہت High
Frequency ہوتی ہے) بٹھا کر Modulation
یں ایریل کے ذریعے چھوڑ دی جاتی ہے۔ ریڈیو
اس کو حاصل کرتا ہے تو وہ برقی لہر اور آواز کو الگ
کرتا ہے اور ہم آواز سن پاتے ہیں۔

ان ہی دو اصولوں کو پیش نظر رکھ کر سائنس
ں نے آواز کو برقی لہر کے ذریعہ فضا میں چھوڑا اور
کی واپسی کے بعد انہوں نے حسابات کے ذریعہ یہ
م کیا کہ یہ آواز کتنی دور سے کتنی دیر میں اور کس قسم
شے سے ٹکرا کر واپس لوٹی ہے، اور پھر اس آلہ پر
کے ذریعہ فضا میں لہروں کو منتشر کیا گیا تھا، ایک
ہ (Screen) فٹ کر دیا گیا۔ جس پر میل
(Miles) وغیرہ کے حلقے (Range) بنائے
۔ اس پر ایک سوئی لگائی گئی، جو متحرک رہتی ہے
میں اس آلہ کے اثرات کی ایک حد متعین کی گئی،
حد کے اندر جو شے بھی آجاتی ہے پردہ پر فوراً معلوم
جاتا ہے۔ پردے پر لکھے گئے حسابات اور سوئی کی حرکت
سے اس شے کا مقام، وجود، فاصلہ اور نوعیت معلوم
ہو جاتی ہے۔ سائنس دانوں نے اس آلہ کا نام راڈر
"RADAR" رکھا۔

یہاں قدرت نے انسان کو ہمیشہ کی طرح
رہبری کیا۔ وہ یوں کہ Radar کی ایجاد کا خیال سائنس
دانوں کو چمگادڑ کی ساخت دیکھ کر ہوا۔ چمگادڑ کی آنکھیں
نہیں ہوتیں اور وہ اپنی راہ کا تعین اور خطرے کا بچاؤ اپنی
آواز ہی کے ذریعے کرتا ہے۔ گویا وہ قدرتی Radar
ہے۔

راڈر حال اور مستقبل کی ایک اہم ترین ضرورت
ہے جو کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد وجود میں آئی۔ اس
کا سہرا اسویڈن اور برطانیہ دونوں کے سر ہے۔ آج فضا میں
آواز کی رفتار کو بھی پس پشت ڈال کر اڑنے والے ہوائی
جہاز، سمندر کے وسیع ترین آغوش میں ہر خطرہ سے
بے نیاز ڈولنے والے آبی جہاز، ہوائی جہازوں کو امن و
عافیت سے فضا کے دوش سے زمین کی آغوش میں
لینے والے ہوائی اسٹیشن، سب کے سب راڈر
کے بے حد مرہون منت ہیں۔ جنگ کے زمانے میں اس
کی افادیت اور بڑھ جاتی ہے۔ زمانے نے وہ لمحات
شاید اب تک نہیں بھولے جب جرمنی کی خطرناک
"U. Boats" حملوں کا قلع قمع برطانیہ نے اسی
Radar کے سہارے کیا تھا۔ یوں بہ زمانۂ امن بھی
اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یورپی ممالک
میں جہاں کی فضا اکثر کہر کی بانہوں میں لپٹی پڑی رہتی ہے
ہوائی اڈوں پر اترنے چڑھنے اور اپنی آمد و رفت
کو برقرار رکھنے کے لئے اسی راڈر کی ضرورت پڑتی
ہے۔

خیر Radar کی اہمیت، اصولوں وغیرہ
کی نسبت اب تک کافی لکھا جا چکا ہے۔ ہم آج جو
خاص بات یہاں عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ
ان ہی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے سائنس دانوں نے
ترقی کی جانب ایک اور قدم بڑھایا ہے۔ چنانچہ سائنس
دان Mr. Alvin E. Brown ــــــــ
نے جو مشہور انگریزی ہوائی جہاز کمپنی Lockheed
کے Missiles & Space Co تحقیقی سائنس دان
ہیں، ایک نئے قسم کا راڈر بنایا ہے۔ جس کا نام
(BAT RADAR) ہے۔ اس کی مدد سے
اندھے بآسانی اپنی راہ چل سکیں گے۔ یہ راڈر ابھی
تیاری اور تحقیق کی ابتدائی منزل میں ہے۔ مگر اس
کمپنی کا یہ دعویٰ ہے کہ جب یہ مکمل تیار ہو جائے گا تب ہم
یہ یقین سے کہیں گے کہ کسی بھی نابینا کو لاٹھی کے قدیم
سہارے کی ضرورت نہ رہے گی۔

اس سائنس دان کا کہنا ہے کہ جس طریقے
سے چمگادڑ اپنی راہ معلوم کرتا ہے ویسی مکمل کامیابی تو انہیں
حاصل نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے شمالی امریکہ کے
(Nyctus Lucifugus) نامی چمگادڑ پر تجربہ
کیا اور وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک بند کمرے میں،
انسانی بالوں کے برابر تار چمگادڑ کی راہ میں حائل کئے گئے
مگر یہ دیکھا گیا کہ وہ ان کو بھی محسوس کر کے بچ نکلا۔

مذکورہ راڈر جو فی الحال تجربتاً بنایا جا رہا ہے
اس قسم کا ہے کہ دونوں کانوں پر دو ریسیور چڑھے ہیں اور
ہاتھ میں ٹرانسمیٹر۔ آواز بھیجتے وقت اس میں ہلکی ٹِک
ٹِک کی آواز آتی ہے اور جب آواز لوٹتی ہے تو مسلسل ٹِک ٹِک
کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ واپس شدہ آواز کی بلندی و پستی
حائل شدہ اشیاء کے دور و نزدیک ہونے کا پتہ
دیتی ہے۔ اگر ریسیور میں کوئی آواز نہ آئے تو یہ پتہ
چلتا ہے کہ راستہ صاف ہے۔ اسی طرح دروازے
بند ہیں یا کھلے، اس کا بآسانی پتہ چل جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ یہ ابھی ابتدائی
منزلوں میں ہے، اس لئے فی الحال ٹرانسمیٹر وغیرہ
کافی وزنی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب اس کی ہلکی پھلکی
شکل اندھوں کے لئے ایک انمول تحفہ ثابت ہو۔

حرمت الاکرام

غزل

آئی ہے سحر کے نئے خواب کی دھڑکن
لو جاگ اٹھی مہر جہاں تاب کی دھڑکن

ہر جام کے پیکر میں ہوتی ہے نئی روح
میخواروں کے دل میں نئے آداب کی دھڑکن

اس نغمۂ خاموش پہ سر دھنتا ہوں پہروں
سنتا ہوں خود اپنے دلِ بیتاب کی دھڑکن

"افلاک نشینانِ زمیں" کو ہے یہ شکوہ
ذروں میں ہے کیوں انجم و مہتاب کی دھڑکن

اے ابرِ بہاراں یہ تمنا تھی ہمیں بھی
دل سنتا کسی لمحۂ شاداب کی دھڑکن

آہنگ زمانہ کا بدل دیتی ہے اکثر
تاریخ کے صفحوں میں نئے باب کی دھڑکن

اس دورِ تن آساں میں ہو غرقابِ بلا کون
محسوس کرے کون تہِ آب کی دھڑکن

کچھ بھی نہ سہی ایک تڑپ رہتی ہے زندہ
ہوتی ہے بڑی چیز کسی خواب کی دھڑکن

کہتی ہے کہ بیداریٔ جاں مانگ لو ہم سے
یہ سینۂ امواج میں گرداب کی دھڑکن

ضد ہے مجھے جینے کی کہ ممکن نہیں جینا
حرمت مری نبضوں میں ہے زہراب کی دھڑکن

○

اختر حمیدی

غزل

عجب موجِ خزاں مہنگی پڑی ہے
بہارِ گلستاں مہنگی پڑی ہے

چمن میں پھول یوں بھی رو رہے ہیں
نگاہِ باغباں مہنگی پڑی ہے

حدیثِ گردشِ غم کے علاوہ
ادائے دلبراں مہنگی پڑی ہے

ترے کوچے میں کھائے زخم کتنے
یہ راہِ کہکشاں مہنگی پڑی ہے

وفا تو ہر زمانے میں گراں تھی
جفا بھی اب یہاں مہنگی پڑی ہے

بدن میں ہو گئے پیوست کانٹے
شگوفوں کی دکاں مہنگی پڑی ہے

صلیبیں ہر جگہ آراستہ ہیں
ہمیں اپنی زباں مہنگی پڑی ہے

زمانے کو ملا موقع ہنسی کا
مجھے آہ و فغاں مہنگی پڑی ہے

کسی کی جستجو میں ہم کو اختر
یہ گردِ کارواں مہنگی پڑی ہے

○

امیر عارفی

غزل

ہمیں نے توڑ دئے آرزو کے جام و سبو
پلا رہا ہے زمانہ خود آج دل کا لہو

جہاں جہاں بھی ترا بانکپن نظر آیا
بسایا دل نے وہاں اک جہانِ رنگ و بو

جھلس گئی ہیں زمانے کی دھوپ میں یادیں
جو دن ڈھلا نہ رہا کوئی سامنے مہ رو

تلاش کر نہ ہمیں دل وفا شعاروں میں
کہ ہم نے چاک گریباں کا کر لیا ہے رفو

دیارِ دل ہوا روشن، مہک اٹھیں راہیں
گزر گئی جو خیالوں سے اک تری خوشبو

دیارِ غیر بھی اب ہو چلا وطن اپنا
چلا ہے اک نگہِ ناز کا عجب جادو

قیصر مظہر حسین

یہ داغ داغ اجالا...

اسٹیشن پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ملٹری کے سپاہی سنگینیں تانے ہوئے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ ایک سپاہی لوہے کی بنچ پر نیم غنودگی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ بنچ کے نیچے لٹکا ہوا تھا اور اوپری حصہ بنچ پر۔ ایک مریل سا کتا بجلی کے کھمبے کے پاس سو رہا تھا۔ بلب کے گرد طواف کرنے والے پتنگوں میں سے اگر کوئی اس کے وغر جسم پر گرتا تو وہ چونک کر اپنی گردن اٹھاتا اور چاروں طرف نظر دوڑا کر پھر گردن زمین پر ڈال دیتا۔

اسٹیشن ماسٹر کے آفس پر ایک بڑا سا تالا لگا ہوا تھا مگر دیوار پر لگی ہوئی تختی پر بلب کی مدھم روشنی میں "محمد علی" صاف نظر آرہا تھا۔ تختی پر جمی ہوئی دھول اس بات کی صاف غمازی کر رہی تھی کہ تختی کو کئی دن سے صاف نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دھول اب کبھی صاف نہ ہوگی۔ اس پر دھول جمتی ہی رہے گی۔ جمتی ہی رہے گی یہاں تک کہ محمد علی دھول میں بالکل غائب ہو جائے گا۔

اسٹیشن کی ہوٹل کا مالک رام کرشن کاؤنٹر پر سویا ہوا تھا۔

"گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے"

"تھوک بند چائے پیجئے" کے بورڈ دھوئیں کی وجہ سے سیاہ ہو چکے تھے اور ان پر مکڑیوں نے جا بجا جال بن دئے تھے۔

ملٹری کا سپاہی ٹہلتا ہوا کتے کے پاس پہنچا۔ کتے کم ہو چکے تھے۔ شاید کتا ابھی ابھی سویا تھا۔ سپاہی کچھ دیر کے بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے اپنے کاندھے سے بندوق اتاری اور سنگین سے کتے کو ایک ٹھوکا دیا۔ کتا بلبلاتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ بہت دیر تک اس کی آواز فضا میں گونجتی رہی۔

دور کسی گھنٹے نے ۳ بجائے۔ لوہے کے بنچ پر لیٹا ہوا سپاہی اٹھ بیٹھا اور فوجی ٹوپی کو جو اس نے تکیے کے طور پر استعمال کی تھی صاف کرنے لگا۔ ایک طویل انگڑائی لے کر وہ ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے سوجے ہوئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نیند نہیں ہوئی۔ اس نے رک کر ایک اور انگڑائی لی اور بڑی بھیانک آواز میں نیند کو ایک گندی سی گالی دی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ ایک طویل سی جماہی لیتے ہوئے اس نے دوسرے سپاہی سے پوچھا۔

"کیا ٹائم ہے؟"

"تین"۔

"تین" اور وہ ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ رام کشن کو سوتا دیکھ کر اسے پھر نیند آنے لگی۔ اس نے کھڑے کھڑے تیسری انگڑائی لی اور اسے یوں محسوس ہوا گویا نیند انگڑائی کے ساتھ نکل بھاگی۔

"سالا ابھی تک سو رہا ہے"

وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس نے رام کشن کو ٹھوکا دیا۔ رام کشن نے کروٹ بدلی۔

"مار سالے کو — سالا کہتا ہے ہندو ہے۔ اب ہندو تو اب بنے گا تو۔ ارے پکڑ۔ پکڑ سالی کو۔ تیرا باپ ہے تو کیا ہے۔ مسلمان تو ہے۔ اور تو۔ سالی ریشمی بلاؤز پہنتی ہے"

اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس انداز سے فضا میں لہرائے گویا وہ سچ مچ ریشمی بلاؤز پھاڑ رہا ہے — اور پھر اس کے دونوں ہاتھ کسی بے جان شے کی مانند کاؤنٹر پر گر پڑے۔

"سالا خواب میں بھی ریشمی بلاؤز دیکھتا ہے" سپاہی نے مسکرا کر زیر لب کہا اور رام کشن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ "کیوں بے حرامزادے ریشمی بلاؤز ہی پھاڑتا رہے گا یا چائے بھی بنائے گا۔ چائے بنا۔ اٹھ"

رام کشن آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹرین کا ابھی تک کوئی پتہ نہ تھا۔ تین بج چکے تھے۔ یوں تو ٹرین کو ۱۱ بجے پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر کئی دنوں سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔ سگنل مین گوکل سنگھ سگنل دے کر ایک بنچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی سرخ لال ٹین کا تیل ختم ہو چکا تھا۔ اس کی بتی میں سے چھوٹی چھوٹی چنگاریاں نکل رہی تھیں جو اس بات کا پتہ دیتی تھیں کہ لالٹین اب کچھ دیر اور جلے گی اور پھر بجھ جائے گی —

یکایک قندیل کی روشنی غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی اور وہ بھڑک کر خاموش ہو گئی۔ بتی میں سے کچھ دیر کے لئے دھواں اٹھا اور پھر وہ بھی ختم ہو گیا۔ گوکل سنگھ نے سوچا زندگی کی شمع بھی کچھ اسی طرح جلتی ہے اور پھر ایک آخری سنبھالا لے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ قندیل کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا یہ قندیل نہیں بلکہ ایک ایسی لاش ہے جس کی زندگی کی روشنی ابھی ابھی خاموش ہوئی ہو اور اس نے دیکھا کہ قندیل کی بجائے واقعی وہاں ایک لاش پڑی ہوئی ہے کنچی کی لاش — اس کی بیٹی کی لاش — ننھی منی کی لاش — اور ننھی منی ننگی تھی۔ مادرزاد ننگی۔ اور اسے یوں محسوس ہوا گویا اس دن کی طرح اس وقت بھی وہ رسیوں سے جکڑا کھڑا ہے اور سامنے اس کی بیٹی لیٹی ہوئی ہے۔ اس نے دیکھا کہ حسین خاں کٹا ہوا پڑا ہے اس کا سر کھاٹ کے نیچے اور دھڑ کھاٹ کے اوپر۔ پھر کنہیا نے کنچی کے کپڑے اتارے۔ اور وہ سب کچھ

دیکھتا رہا پھٹی پھٹی آنکھوں سے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا گویا اُس کی کوٹھڑی میں ایک بھیانک زلزلہ آگیا۔ اُس کا سر چکرا گیا ہو اور پھر — پھر اُسے کچھ نہیں معلوم۔ اور جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے کنہیا کو کہتے سُنا۔

"سالے نے نہ معلوم اور کتنے مسلمانوں کو چھپایا ہوگا۔"

اور پھر وہ سب چلے گئے۔ بارہ — پورے بارہ — اور کنمی دو دن تک بے ہوش رہنے کے بعد مر گئی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اُسے سیپٹک ہو گیا۔ اُس کی نظر کے سامنے بارہ شیطانی مسکراتے ہوئے چہرے گھوم گئے وہ تمام چہرے فضا میں ایک دائرے کی شکل میں گھوم رہے تھے۔ بڑی تیزی سے وہ گھوم رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ گویا کہہ رہے ہوں۔

"اور چھپا حسین خاں کو۔ اور چھپا حسین خاں کو۔ ہم کسی بھی حسین خاں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اور تیری بیٹی — ہاہا — ہاہا"

اور پھر اُس کی نظروں میں حسین خاں کا کٹا ہوا سر گھوم گیا۔ جس سے تازہ خون بہہ رہا تھا۔ حسین خاں اُس کا دوست تھا۔ اُس نے سوچا حسین خاں کتنا اچھا آدمی تھا۔ کتنی ہی بار حسین خاں سے اُس نے روپے قرض لئے تھے مگر اُس نے کبھی اس کا ذکر نہ کیا۔ اور جب وہ انہیں واپس کرنے لگا تو حسین خاں نے کہا تھا کہ رہنے بھی دے تھا کر کنمی کا بیاہ قریب ہی ہے۔ آخر وہ میری بھی تو بیٹی ہے نا۔ کیا میرے پر اُس کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اور وہ کنمی سے کتنا پیار کرتا تھا۔ کتنی بار اُس نے کنمی کے لئے کپڑے لئے۔ اور جب پارسال کنمی اُس سے پوچھے بغیر میلے چلی گئی تھی تو وہ سخت غصہ میں بھرا بیٹھا تھا اور اگر حسین خاں وقت پر نہ آتا تو وہ کنمی کو مار ہی بیٹھتا مگر حسین خاں نے آگے بڑھ کر کہا تھا کہ ٹھاکر اگر تو نے کنمی کو کہا تو میں بھی لڑ بیٹھوں گا تم سے بار بیٹھوں گا اور اُس نے کہا تھا کہ حسین خاں تو لاڈ پیار میں چھوکری کو خراب کر رہا ہے...."

یکا یک اُس کے پیروں میں گدگدی سی محسوس ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ ایک کتا اُس کے پیروں کو چاٹ رہا ہے۔ وہ ویسے ہی بیٹھا رہا اور کتا اُس کے پیروں کو چاٹتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد کتا دُم دبا کر ایک طرف چل دیا۔ اُس نے نظریں اُٹھائیں اور اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ چاند مغربی اُفق پر ڈوب رہا تھا اور ستارے دم توڑ رہے تھے۔ اسٹیشن پر ایک بھیانک خاموشی مسلط تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کئی جنازے ابھی ابھی یہاں سے گذرے ہیں۔ فوج کے سپاہی تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور رام کشن شاید کہیں چلا گیا تھا اور وہ سپاہی چائے کا انتظار کرتے کرتے بنچ پر گردن لٹکائے سو چکا تھا۔

گوکل سنگھ کی آنکھوں میں بھی کئی راتوں کی نیند تیر رہی تھی مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اُسے نیند نہ آتی تھی۔ شاید کنمی کے ساتھ اُس کی نیند بھی رخصت ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک جماہی لی اور بجھی ہوئی قندیل اُٹھا کر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دیوار پر لگی ہوئی تختی کے سامنے آکر وہ رُک گیا اور اُسے بغور دیکھنے لگا۔ وہ متواتر ۳ سال یہ تختی اُسی جگہ لگی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ گو وہ پڑھنا نہ جانتا تھا مگر "محمد علی" اُس کے شعور پر کچھ اِس طرح مرتسم ہو گیا تھا کہ وہ بہ آسانی یہ نام لکھ اور پڑھ سکتا تھا۔ اور پھر اُسے پانچ دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا جب فساد کی شدت حد سے زیادہ تجاوز کر چکی تھی اور فساد کے جراثیم اسٹیشن کی حدود میں بھی داخل ہو گئے تھے اور پھر اُسی رات محمد علی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ جاتے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور کنمی تو اُس کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مگر — محمد علی بھی تو حسین خاں تھا وہ بھی کسی کنہیا کا شکار بن گیا ہوگا۔ اُس نے سوچا۔

اُس نے اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ کھولا۔ لیمپ کی مدھم روشنی میں کمرہ عجیب بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ کمرے کی ہر چیز پر دھول کی تہ جم چکی تھی اور نیا اسٹیشن ماسٹر ابھی تک نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اسی ٹرین سے آئے اُس نے سوچا۔ دیوار پر لگا ہوا کلاک نہ معلوم کب سے اُلٹا لٹک رہا تھا۔ وہ فرش پر لیٹ گیا۔ یکا یک گھنٹی بجی۔

ٹرین اگلے اسٹیشن سے روانہ ہو چکی تھی۔ گوکل سنگھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ صبح کسی سہاگن بیوہ کی طرح سفید چادر سے جھانک رہی تھی۔ سپاہی جن کی آنکھیں نیند کی وجہ سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں اپنی وردی جھٹک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ رام کشن کی ہوٹل سے دُھواں نکل رہا تھا۔ غالباً وہ سپاہیوں کے لئے چائے تیار کر رہا تھا۔ "کنمی بھی روزانہ اتنی ہی صبح چائے بناتی" اس نے سوچا اور پھر اُس کی نظروں کے سامنے وہی بارہ شیطانی چہرے گھوم گئے جنہوں نے اُس کی کنمی کے جسم میں بارہ قسم کا زہر بھر دیا تھا۔ اور اُسے پولیس اسٹیشن کا وہ منظر یاد آگیا جب وہ سب انسپکٹر کے پاس فریاد لیکر گیا تھا۔ کنہیا بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس انسپکٹر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں دوست تھے۔ وہ کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ پولیس انسپکٹر نے اس کے گال پر دو تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

"سالے مسلمانوں کو چھپا کر رکھتا ہے۔" اور کنہیا کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "کیوں بے کنہیا اس کی کوئی اور بیٹی ہے کیا؟"

اُس کے خیالات کا سلسلہ ریل کی سیٹی نے توڑ دیا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آچکی تھی۔ گوکل سنگھ نے دیکھا کہ ٹرین بالکل خالی ہے۔ وہ گارڈ کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ گارڈ نے اُسے بتایا کہ گاڑی پوری بھری ہوئی تھی مگر عالم پور سے دو چار اسٹیشن آگے غنڈوں کی ایک ٹولی نے گاڑی پر حملہ کر دیا اور گاڑی خالی ہو گئی

اُس نے ایک ڈبے میں جھانک کر دیکھا سُرخ سُرخ خون کی ایک دھار اُس کی طرف آرہی تھی اُس نے اندر قدم رکھا۔ ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے لپٹا ہوا تھا اور ماں سو رہی تھی۔ اُس کی ننھی ننھی مٹھیاں ماں کے سر کے بال پکڑے ہوئے تھیں۔ وہ آگے بڑھا اُس کے پیر کسی ملائم سی چیز سے ٹکرائے اُس نے جھک کر اُسے اُٹھایا۔ وہ ایک بچے کا ننھا سا ہاتھ تھا۔ گوکل سنگھ پر ایک بھیانک لرزہ طاری ہو گیا

اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ جب اُس کی چکچاہٹ ذرا کم ہوئی تو اس کی نظر ماں پر پڑی اور اُسے کچھ یاد آ گیا۔ اُس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس نے اپنا رومال ماں کے ننگے جسم پر ڈال دیا۔ جب وہ ڈبے سے باہر نکلا تو اُسے سارا اسٹیشن گھومتا ہوا نظر آیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے دماغ میں لاوا اُبل رہا ہے۔ وہ جھکا کر ایک بنچ کے سہارے نیچے گر پڑا اور جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اُس نے دیکھا کہ ایک کنہیا خون میں بھری ہوئی تلوار پانی سے دھو رہا ہے۔

ملٹری کے سپاہیوں نے پلیٹ فارم پر لاشوں کو اکٹھا کر دیا۔

کسی کا سر کٹا ہوا تھا۔ کسی کا ہاتھ۔ کسی کا پیر اور کئی جسم دو ٹکڑوں میں بٹ چکے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے۔ بوڑھے بھی تھے۔ اور جوان بھی تھے۔ عورتیں بھی تھیں اور ایسی عظمت دوشیزائیں بھی تھیں جن کی نظریں پتھر کو موم بنا سکتی تھیں۔ گوکل سنگھ اُن سپاہیوں کو دیکھ رہا تھا جو لاشوں کو ڈبوں سے نکال رہے تھے۔ اُن کے چہرے کسی عجیب قسم کے جذبے سے عاری تھے۔ اُن کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کیونکہ اسی کام کے لئے مامور کئے گئے تھے۔

دفعتاً ایک ہلکی سی کراہ نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ ڈبے کی طرف بڑھا۔ ڈبہ خالی تھا۔ خون میں لتھڑے ہوئے چند انسانی اعضاء اُسے نظر آئے اُسے کچھ تسلی سی ہوئی۔ ڈبے میں ایک عجیب قسم کا تعفن تھا مگر وہ آگے بڑھا۔ انسانوں کے لتھڑے ہوئے خون سے اپنے پیروں کو بچاتا ہوا اُس نے تاریکی کو چیرتے ہوئے اپنی نظریں ڈبے کے چاروں طرف دوڑائیں۔ کوئی شے نشست کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے جھک کر غور سے دیکھا۔ وہ ایک لڑکی تھی گوکل سنگھ کو صرف اُس کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اُس بے جان لاش کو اٹھا کر نشست پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش تھی اور اُس کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ اُس نے ڈبے سے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ ملٹری کے سپاہی اپنے فرائض تندہی سے انجام دے رہے تھے۔ اور گارڈ مالم کشن کی ہوٹل میں چائے کا کپ مُنہ سے لگائے کھڑا تھا۔ گوکل سنگھ نے لاش اپنے کاندھے پر ڈالی اور اپنے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔ دروازہ کھول کر اُس نے لاش کو چارپائی پر ڈال دیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں غیر ارادی طور پر فرش پر سوکھے ہوئے خون پر جم گئیں۔ یہ حسین خاں کا خون تھا جو سوکھ کر کالا ہو گیا تھا اُس نے دیکھا کہ وہ خون کا دھبہ پھیل رہا ہے۔ پھیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ پورا کمرہ اُسے خون کا ایک بہت بڑا دھبہ معلوم ہونے لگا۔ اُس نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور اُسی وقت کسی کنہیا نے اُس کے دل میں چپکے سے کہا۔

"تو ایک مسلمان لڑکی کو پناہ دے رہا ہے۔"

"میں ایک انسان کو پناہ دے رہا ہوں۔" کسی اندرونی طاقت نے جواب دیا۔

اُس نے آنکھوں پر سے اپنے ہاتھ ہٹا لئے اور گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

لڑکی کے سر کا زخم گہرا تھا اور پیشانی کے داہنی حصے کو چیرتا ہوا سر تک چلا گیا تھا۔ لڑکی کی کلائیوں پر جا بجا زخم تھے اور اُس کی مخروطی نازک نازک انگلیاں اب بھی ساڑی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھیں۔ گوکل سنگھ نے زخم کو ٹھنڈے پانی سے دھویا اور اُس پر پٹی باندھ دی۔ لڑکی زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہی تھی مگر گوکل سنگھ لڑکی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے سوچا یہ کنچی میں کس قدر ملتی ہے۔ کنچی کا رنگ بھی گورا تھا اور آنکھیں بڑی بڑی کنچی بھی نیند میں بالکل اسی طرح معلوم ہوتی ہے۔ کنچی بھی نیند میں کبھی کبھی اسی طرح بڑبڑاتی تھی مگر کنچی۔ کنچی تو اب ہمیشہ کی نیند سو گئی ہے۔ میری کنچی۔ اُس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو لڑھک کے رخسار پر گر پڑے مگر یہ کنچی نہیں ہو سکتی اُس نے سوچا اور پھر جیسے کسی نے اُس کے کان میں چپکے سے کہا۔

"یہ کنچی نہیں ہو سکتی۔ یہ کنچی نہیں ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ یہ تیری دشمن ہے۔ اُسے مار ڈال۔ اُسے جلا دے۔"

"نہیں۔ نہیں۔"

گوکل سنگھ نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس دیں اور اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر لڑکی کا ماتھا سہلانے لگا۔ لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت نحیف آواز میں کچھ کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ گوکل سنگھ کے چہرے پر کئی دن کے بعد آج مسکراہٹ ناچ اٹھی۔ اُس نے دودھ کا گلاس پھر لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دیا مگر لڑکی نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم..... تم مجھے مار دو گے..... مار ڈالو مار ڈالو۔" لڑکی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں اب بھی اپنی ساڑی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ لڑکی کی نظریں گوکل سنگھ کے چہرے پر آ کر جم گئیں۔ اُس نے ایک چیخ ماری اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گوکل سنگھ کو یوں معلوم ہوا جیسے کسی اندھیرے غار میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو جس کی گہرائی کی کوئی انتہا ہی نہیں اور وہاں بھی کسی کنہیا نے اُس کے کان میں کہا۔

"یہ مسلمان ہے۔" گوکل سنگھ کا چہرہ حد درجہ خوفناک ہو گیا اور اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کا ہاتھ لڑکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔

"ہاں۔ ہاں یہ تیری دشمن ہے۔ حسین خاں کی بیٹی ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ یہ تیری کنچی کے قتل کا سبب ہے۔ اس سے کنچی کے قتل کا بدلہ لے۔ اسے مار ڈال جلا دے۔"

اُس نے دیکھا کہ حسین خاں کا کٹا ہوا سر پھر اپنے جسم سے مل گیا ہے اور کنچی سامنے برہنہ پڑی ہوئی ہے اور اُس کا سر دوسری طرف ڈھلکا ہوا ہے۔ اور پھر اُس کی آنکھوں میں شعلے لپک گئے اور اُسے ایسا لگا گویا اُس نے لڑکی کے تمام کپڑے نوچ پھینکے اور

وہ ایک شیطانی جذبے کے تحت اُسکی طرف بڑھ رہا ہے
"یہ میری بچی کی قاتل ہے۔ یہ مسلمان ہے۔ میں اسے مار ڈالوں گا۔" اُس کے اندر کسی نے چیخا اور وہ اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے لڑکی کی طرف جھپٹا۔ مگر جھکا کر پیچھے گر پڑا۔ وہاں اُس کی کنپٹی لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اُس کی مخروطی نازک نازک انگلیاں اپنی ساڑی کو مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھیں وہ کہہ رہی تھی ـــ " بابو ـ میں ماں ہوں بابو ـ میں انسان کی ماں ہوں ـ میں ہندوستان کی ماں ہوں ـ میں کنپٹی ہوں "

لڑکی نے ایک کراہ کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔
اُس نے اب کی بار چیخا نہیں صرف انتہائی نحیف آواز میں پوچھا ـ" میں کہاں ہوں "

"تم محفوظ ہو ـ بالکل محفوظ "

"مگر تم سکھ ہو "

"میں انسان ہوں "

"مگر تم .... "

"میں ایک باپ بھی ہوں "

گوکل سنگھ کی آواز بھرا گئی لیکن اُس کے جسم میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی اور اُسے ایسا لگا گویا اُس نے کوئی زبردست مہم فتح کر لی ہو اُس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھ تیزی سے لڑکی کی پیشانی پر دوڑ رہے تھے۔ دو آنسو کے قطرے ڈھلک کر اُس کی لمبی داڑھی میں جذب ہو گئے۔

لڑکی نے کروٹ بدلنا چاہا مگر وہ ایک دردناک کراہ کے ساتھ ویسے ہی دبکی پڑی رہی۔ اُس کے چہرہ پر برسوں کی تھکن چھائی ہوئی تھی۔ زخم کی تکلیف سے اُس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں ـ اُس کا ماتھا بھٹی کی طرح تپ رہا تھا۔ اُن کے ہونٹ جن پر کسی وقت رنگینیاں کھیلتی تھیں۔ وہ کچھ کہنے کے لئے پھڑک رہے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کی تمام قوت سلب ہو چکی ہے

○

گوکل سنگھ ہسپتال کی سیڑھیوں پر آ کر رک گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایمبولینس میں سے سپاہی مُردہ کو نکال رہے ہیں ـ یہ وہی لاشیں تھیں اور وہی سپاہی تھے جنہیں وہ اسٹیشن پر دیکھ چکا تھا۔ کچھ سپاہی ایمبولینس کے گرد کھڑے مُردہ جسموں کی حفاظت کر رہے تھے لاشوں پر بھی حملہ ہو سکتا تھا ـ سپاہیوں نے لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا اور اُن پر چادریں ڈھانپ دیں۔

کچھ دیر بعد اسپتال کے پیچھے ایک لڑکی ایک بڑے سے اسپیشن کتے کو لئے ہوئے نکلی۔ لاشوں کے قریب گزرنے پر اُسے بدبو کا احساس ہوا۔ اُس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور لاشوں کو چادر سے ڈھکا دیکھ کر اپنی سفید سی دستی ناک پر رکھ لی اور جلد گزرنے لگی۔ اسپیشن لاشوں کے قریب گیا اور اُنہیں سونگھنے لگا۔ لڑکی نے دُور ہی سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"نو، نو جنکس ,گندہ چیز ہے ـ کم ہیر"

مگر جنکس گندہ چیز کو چاروں طرف گھوم کر سونگھنے لگا۔ اُس کا تجسس بیدار ہو چکا تھا۔ وہ "گندہ" چیز کو دیکھنے پر تلا ہوا تھا۔ لڑکی نے امداد طلب نظروں سے سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ ایک سپاہی اسپیشن کی طرف بڑھا اور دُور ہی سے کہا۔

میم صاحب بُلاتا ہے۔ گندہ چیج۔ بھاگ جاؤ"

اسپیشن دُم ہلاتا ہوا لڑکی کی طرف چل دیا۔

لڑکی نے ہنستے ہوئے سپاہی کی طرف دیکھا اور چل دی

گوکل سنگھ اس لڑکی کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی تھی ـ شام میں سیر کے لئے وہ روانہ ریلوے لائنز سے گزرتے تھے اور بڑے بڑے بالوں والا کتا بھی ہمیشہ اُن کے ساتھ ہوتا ایک مرتبہ اُس نے جھپٹ کر رامو کی پنڈلی پکڑ لی تھی اور جب حسین خاں اُسے بچانے کے لئے بھاگا تھا تو اُس کی پیٹھ پر اُچھل کے اپنے زبردست پنجے گاڑ دئے تھے۔ اُس وقت ڈاکٹر صاحب کو سخت غصہ آیا تھا اور وہ لال پیلے ہو گئے۔ اُنہوں نے حسین خاں کی طرف بڑھتے ہوئے کہا تھا۔

"یو ڈیم سوائن ـ تم کیوں بھاگا اُس کے پیچھے اگر کوئی جرم ہو جاتا تو ـ اور تم " ڈاکٹر صاحب نے رامو سے کہا " تم تگڑا بدمعاش ہے۔ ہندوستانی لوگ بہت تگڑا لنگ ہوتا ہے "۔ اور جب وہ دونوں دوا کے لئے ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تھے تو اُنہوں نے سب انسپکٹر سے جو اُن کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا کہا۔

" انسپکٹر یہ دونوں بھوت بدمعاش ہے جب ڈالی ہوا کھانے جاتا ہے تو یہ پیچھے سے سیٹی مارتا ہے ـ ڈالی نے کئی بار ہم سے کئی بار complaint کیا اور دیکھو انسپکٹر یہ پلیس ہم سر پر تم ہی کو دیتا ہے یہ آج کل Available نہیں ہے۔ بڑا کاسٹلی ہے یہ پلیز ہم نے اپنے یوز کے لئے رکھا تھا۔ آٹھ روپے کا باٹل آتا ہے اس کا۔"

دوسرے دن انسپکٹر صاحب نے حسین خاں اور رامو کو تھانہ بُلا کر خوب ڈانٹا تھا اور جب اُنہوں نے عُذر پیش کرنے کی کوشش کی تو اُنہیں حوالات میں بند کر دیا تھا۔

اُس کے خیالات کا تسلسل بوٹوں کی چاپ نے توڑ دیا۔ اُنہیں نے دیکھا انسپکٹر لاشوں کے پاس کھڑا سپاہیوں سے کچھ بات کر رہا ہے اور نہایت لاپروائی سے سگریٹ کا دُھواں فضا میں اُڑا رہا ہے انسپکٹر کو آتا دیکھ کر گوکل سنگھ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

" ہلو ڈاکٹر ہم تمہارے لئے کچھ لاشیں present لایا ہے" اُس نے خاص اینگلو انڈین انداز میں کہا۔

"او انسپکٹر presents لایا ہے تم ہم سمجھا ـ کتنا ہو گا "

"یہی کوئی چالیس پچاس "

"صرف چالیس پچاس ـ بہت کم ـ

گھر کو جا رہا ہے۔ کیا سب مرا ہُوا ہے؟"

"ہاں۔ سب مرا ہُوا ہے۔"

"مگر انسپکٹر پاکستانی لوگ تو اُدھر بھوت مارتا ہے۔ ہندوستانی لوگ پکا روگ......

I mean to say پاکستانی لوگ بھوت بدماس ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کی زبان پر ہندوستان بہت چڑھا ہُوا تھا۔

"ہندوستان کا لوگ بھی بھوت بدماس ہوتا ہے۔ بھوت مارتا ہے۔ مگر اب ذرا تھک گیا ہے۔"

انسپکٹر کی نظر ڈاکٹر کی لڑکی پر پڑی جو سیشن کو لئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ انسپکٹر کرسی پر نیم ایستادہ ہو گیا۔ "ہلو!"

"ہلو۔"

"کیوں ڈالی تم شام میں ہوا کھانے جاتا ہے؟"

"جاتا ہے۔"

"کوئی پیچھے سے سیٹی تو نہیں مارتا۔"

"نو۔ نو۔ تھینک یُو انسپکٹر۔ تمہارا ہم پر بہت مہربانی ہے۔ اور جب گوکل سنگھ نے شیشے کی کھڑکی میں انہیں اُٹھتے دیکھا تو واپس ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کی لڑکی کے بغیر واپس جا رہا تھا۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر بھی تو کنہیا ہے۔ وہ کنہیا ہندوستانی تھا اور یہ انگریز۔ انگریزی کنہیا۔

اُس نے نظر اُٹھا کر دیکھا سپاہی اپنے کام سے فراغت پا کر پاس ہی کے نل پر ہاتھ دھو رہے تھے۔ ایک خارش زدہ کتا لاشوں کے پاس ہی ٹانگ اُٹھا کر پیشاب کر رہا تھا اور اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ ایک سپاہی ایک درخت سے ٹیک لگائے بیڑی سلگا رہا تھا۔ ایک ناقابلِ برداشت بُو پھیل رہی تھی اور گوکل سنگھ چلا جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا وہ لڑکی کو نہ بچا سکے گا اور وہ لڑکی اُس کے گھر میں دم توڑ دے گی۔ ایک کنچی اور جائے گی۔ ایک ماں اور مر جائے گی۔ ایک ہندوستان اور مر جائے گا۔ وہ چلا جا رہا تھا۔ گھر کی طرف نہیں کہیں اور۔ یکایک وہ رُک گیا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ سامنے مولوی صاحب آ رہے تھے۔

اُسے یاد آیا ایک وقت مولوی صاحب کو بلا ٹکٹ سفر کرتے ہوئے اُس نے بچایا تھا۔ وہ ٹکٹ چیکر کے سامنے خدا اور رسول کی قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رہے تھے۔ اُن کا ٹکٹ کہیں کھو گیا تھا گوکل سنگھ جانتا تھا کہ ہر وقت کہیں نہ کہیں کھو جاتا تھا مگر نئے ٹکٹ چیکر نے اُن کی مخضب ڈاڑھی اور جبّہ و دستار کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُن کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو گوکل سنگھ نے بابو سے کہہ سُن کر انہیں بچایا تھا اور اپنے گھر لا کر ٹھنڈا پانی بھی پلایا تھا۔

گوکل سنگھ دونوں ہاتھ جوڑ کر اُن کی طرف بڑھے جیسے وہ کرپان لے کر اُن پر ٹوٹ پڑا ہو۔ اُنہوں نے رُکتے رُکتے کہا۔

"کیوں جی کیا چاہتے ہو؟"

گوکل سنگھ رُک گیا۔ مولوی صاحب کے لہجے نے اُس کی ساری خوشی کافور کر دی۔ وہ وہیں ٹھٹک گیا اور کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔ گھر چلئے۔"

"ایں گھر چلوں۔ کیوں چلوں؟ بیچ سڑک میں ایک شریف آدمی کو روکنا کہاں کی شرافت ہے۔"

مولوی صاحب کی آواز ڈر کے مارے عجیب سی ہو گئی تھی۔ اُن کا سانس پھول رہا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے گویا گوکل سنگھ گھر لے جا کر انہیں ذبح کر ڈالے گا۔

"شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں میں اسٹیشن پر۔"

مگر مولوی صاحب تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ وہ ہر قدم پر پیچھے مُڑ کر دیکھتے جا رہے تھے کہ شاید گوکل سنگھ پیچھے سے آ کر اُن پر حملہ نہ کر دے۔ آخر وہ سکھ ہی تو ہے۔ سکھوں کا کیا بھروسہ۔ الکفار لا اعتبار۔

اور اُمید کی آخری کرن بھی ڈوب گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہُوا کہ اُس کی زندگی کا سارا رس کسی نے چوس لیا ہے۔ وہ ڈھیلے ڈھیلے قدم اُٹھاتا ہُوا اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا۔ اُسے حسین خاں یاد آ رہا تھا جو ہر مصیبت میں اُس کی مدد کرتا رہا تھا۔ اگر آج حسین خاں زندہ ہوتا تو وہ لڑکی کو ضرور بچا لیتا۔ حسین خاں کتنا اچھا آدمی تھا۔ وہ کبھی نماز نہیں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی تو شراب بھی پی لیتا۔ مگر پھر بھی وہ بہت اچھا تھا۔ وہ مصیبت میں لوگوں کا ساتھ تو دیتا تھا۔

وہ اپنے کوارٹر کے پاس آ کر رُک گیا۔ اندر جاتے ہوئے اُسے کچھ خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ لڑکی مر جائے گی یا ممکن ہے ابھی تک مر چکی ہو اور اگر بچ گئی تو۔ اس خیال سے ہی اُس کے مُردہ چہرے پر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے سوچا اگر وہ بچ گئی تو وہ اُسے کنچی کے سارے کپڑے دے دیگا۔ اور سیٹھ کی دکان سے چاندی کی نئی چوڑیاں بھی خرید دے گا۔ وہ اُس کا کنچی سے بھی زیادہ خیال رکھے گا اور بلا ضرورت کبھی اسٹیشن نہ جائے گا بلکہ کوارٹر پر ہی رہے گا۔ جب کنچی زندہ تھی تو وہ اکثر صبح سے شام تک اسٹیشن پر ہی رہتا تھا خواہ کچھ کام ہو یا نہ ہو۔ مگر کنچی کی موت نے اُسے کنچی سے بہت قریب رکھ دیا تھا۔ کنچی کے لئے جو روپے حسین خاں نے جمع کیا تھا وہ اُسے بھی اس لڑکی کی شادی پر خرچ کر دے گا اور جب وہ اُس سے بغیر پوچھے ہی چلی جائے گی تو وہ مصنوعی غصّے سے اُسے مار بھی دیگا مگر پھر اُسے بچائے گا کون؟ حسین خاں تو مر چکا ہے حسین خاں۔ مگر نہیں وہ اُس پر مصنوعی غصہ بھی نہیں نہیں کرے گا خواہ وہ کتنی بھی بڑی غلطی کرے وہ اُس سے کچھ نہ کہے گا۔ اور اُسے اس بات سے بڑی تسکین ہوئی کہ وہ اُسے کنچی ہی کے نام سے پکارے گا۔

وہ بہت آہستہ سے گھر میں داخل ہُوا۔ اُجالے سے اک دم اندھیرے میں داخل ہونے کی وجہ سے پہلے پہل اُسے کچھ نہ دکھائی دیا۔ وہ تھوڑی دیر وہیں دم سادھ کر کھڑا رہا۔ پھر اُس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہونے لگیں تو اُس نے چارپائی کی طرف دیکھا اور اُس کے مُنہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ لڑکی چارپائی پر نہیں تھی۔ اُس نے دائیں طرف مُڑ کر دیکھا۔ لڑکی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے سیدھے ہاتھ میں گلاس تھا جو صراحی کی طرف بڑھا ہُوا تھا اور اُس کے مُنہ سے

جاگ رہا تھا۔ گوکل سنگھ لڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور اُس کا سر اُٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ بہتے ہوئے آنسو اُس نے اپنے رُومال سے پونچھے۔ مگر لڑکی کا سر دوسری طرف ڈھلک گیا۔ اُس نے لڑکی کا سر نہایت آہستہ سے زمین پر رکھ دیا اور چارپائی پر سے ایک چادر کھینچ کر لڑکی کے جسم پر ڈال دی۔ وہ مر چکی تھی۔

جب شام ذرا گہری ہو گئی تو گوکل سنگھ لاش کے پاس سے اُٹھا۔ وہ دن بھر مری ہوئی لڑکی کے پاس ہی بیٹھا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ آنسوؤں کی وجہ سے دُھندلا گیا تھا۔ اُس نے موم بتی جلا کر لکڑی کے صندوق پر رکھ دی اور پھر آ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس نے چادر کا کونہ اُٹھا کر لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لڑکی کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور آنکھیں کھُلی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ مسلسل تکلیف اور کرب کی وجہ سے بالکل پژمُردہ ہو چکا تھا۔ گوکل سنگھ نے ایک گیلے کپڑے سے اُس کے چہرے کو صاف کیا۔ اُس کی آنکھوں میں سرمہ لگایا اور اُس کے بالوں کو کنگھے سے سنوارا۔ پھر وہ اُٹھا اور کونے کے صندوق سے ایک نئی ریشمی ساڑی نکالی جسے اُس نے کبھی کی شادی کے لئے خریدا تھا۔ لاش کو اچھی طرح نئی ریشمی ساڑی میں لپیٹ کر وہ ذرا دُور جا بیٹھا اور ریشمی ساڑی میں لپٹی ہوئی لاش کو بغور دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور لاش کو اپنے بازوؤں میں اُٹھانے کے لئے جُھکا۔ آنسوؤں کے دو گرم گرم قطرے ریشمی ساڑی پر گرے اور جذب ہو گئے۔ اُس نے لاش کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا اور گھر سے باہر نکل گیا۔

اسٹیشن سے قبرستان کافی دُور تھا۔ وہ تھک گیا تھا مگر پھر بھی چلتا ہی رہا۔ قبرستان کے قریب پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اُسے قبرستان میں گیس کی روشنی دکھائی دی۔ وہ آج تک مسلمانوں کے قبرستان نہیں گیا تھا۔ اُس کے دل میں ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ گیس کی مدھم روشنی میں اُس نے دیکھا کہ کچھ لوگ کسی میت کو دفن کر رہے ہیں۔ وہ فوراً بازو ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور اُن لوگوں کے چلے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ بہت دیر ہو گئی مگر وہ لوگ سب تو وہیں کھڑے تھے۔ اُس نے دُور کھڑے ہوئے مولوی صاحب کو دیکھا جو ہاتھ کے اشاروں سے لوگوں کو کچھ بتا رہے تھے۔ وہ ذرا نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ لوگ فوج کے سپاہی تھے جو کسی کی لاشوں کو دفن کر رہے تھے اور مولوی صاحب ہدایات دے رہے تھے۔

اُس نے سوچا اس طرح کافی دیر ہو جائے گی۔

وہ دوسرے راستے سے قبرستان کی باڑھ میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا۔ لاش کو ایک اونچے ٹیلے پر لٹا کر وہ ساتھ لائی ہوئی کدال سے قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ اُس نے آج تک قبر نہ دیکھی تھی اور نہ ہی اُسے قبر سے متعلق کوئی معلومات تھیں۔ اُس نے ایک اچھا خاصا گڑھا تیار کر لیا جس کی گہرائی کوئی چھ فٹ ہو گی۔ اُس نے کدال رکھ دی اور لاش کے پاس بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے لاش کو قبر میں اُتار دیا۔ مٹی سے قبر بند کرنے سے پہلے وہ بہت دیر تک لڑکی کی صورت دیکھتا رہا۔ ریشمی ساڑی میں وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی اور آنکھوں میں سرمہ لگانے سے لڑکی کے چہرے پر ایک نور آ گیا تھا جسے قبرستان کی اندھیری رات میں بھی وہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ بہت دیر تک لڑکی کی صورت دیکھتا رہا اور جب اُس کی آنکھوں میں جلن محسوس ہونے لگی تو وہ اُٹھا اور لڑکی کو مٹی سے ڈھک دیا مگر اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے ایک زندہ لاش کو دفن کر دیا ہو۔ اُس کا دل بھر آیا اور اُس کی سانس میں تیزی آ گئی۔ سر چکرا گیا اور وہ بمشکل زمین پر بیٹھ سکا۔ کافی دیر بیٹھے رہنے کے بعد جب اُس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ جانے کیلئے اُٹھا۔ وہ بمشکل دو چار قدم ہی گیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک سپاہی نے آ کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

○

دوسرے دن مولوی صاحب چلا چلا کر مسجد میں کہہ رہے تھے۔

"میں اس ملعون کو جانتا ہوں۔ وہ مسلمانوں کا کٹر دشمن ہے۔ وہ اکثر مسلمانوں کو اسٹیشن پر پریشان کیا کرتا ہے اور اُس لڑکی کو بھی اسی نے قتل کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ حسین خاں کو قتل کر چکا ہے۔ اُسے سخت سزا دلوانی چاہئے۔ سب مسلمانوں کو مل کر اُس کے خلاف کارروائی کرنی چاہئے۔"

"مگر آپ کے پاس ثبوت کیا ہے کہ اُس نے اس لڑکی کو قتل کیا ہے۔" کسی نے مجمع میں سے...

"میں نے خود لاش دیکھی ہے۔ اُس ملعون نے اس معصوم لڑکی کو گڑھے میں دفن کر دیا تھا۔" پیشانی کا اوپری حصہ پھٹا ہوا تھا۔

"اگر وہ سکھ لڑکی کو قتل کرتا تو اُسے دفن کیلئے قبرستان کیوں لاتا۔ وہ لاش کو کہیں لے جا سکتا تھا۔ اُسے جلا سکتا تھا یا کسی اور طرح ٹھکانے لگا سکتا تھا۔"

"تم گدھے ہو چپ رہو۔"

گدھا چپ ہو کر بیٹھ گیا اور مولوی صاحب دیر تک تقریر فرماتے رہے۔

دوسرے دن گوکل سنگھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اُس پر ایک لڑکی کے قتل کا الزام تھا۔

"شاید آپ جان گئے ہوں گے کہ میں آپ کے پاس کیوں آیا ہوں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ تم پچھلے دنوں میری لڑکی سے کافی ملتے رہے ہو۔ شاید رشتے کی بات کرنے آئے ہو۔"

"ابھی تو میں رشتے کی بات کرنے نہیں بلکہ اس سے بھی اہم کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ دراصل ہماری کمپنی نے بیمے کی ایک نئی اسکیم شروع کی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ یہ نئی اسکیم آپ ہی سے شروع ہو۔"

○

کسی کمیٹی کے وجود کے لیے تین ممبروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اگر کمیٹی واقعی کچھ کام کرنا چاہتی ہے تو ان تین ممبروں میں سے ایک کا بیمار اور دوسرے کا غیر حاضر ہونا ضروری ہے۔

"کیف و کم"

اُردو ادب میں طنز و مزاح کی تاریخ مختصر ہے۔ اُردو زبان کی ابتدا سے لے کر اس میدان میں جتنے بھی کامیاب شہسوار ہے ہیں انہیں اُنگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ والوں کا حال ہے اور نظم والے تو پوروں پر جا سکتے ہیں۔ دراصل طنز و مزاح کی زمین اس سنگلاخ ہے کہ اس میں دیدہ ور کا پیدا ہونا بڑا کل ہے۔ شاعری اور کسی حد تک افسانہ نگاری ح یہ فن آسان نہیں ہے اور یہی وجہ اس میں والوں کے فقدان کا باعث ہے۔

طنز و مزاح کی زمین جس قدر سنگلاخ ئی ہی اس میں پھسلن بھی ہے۔ قدم ذرا اِدھر را اور اک دم کھائی میں۔ یہاں بچنے کا سوال انہیں ہوتا۔ میری رائے میں اسے پُل صراط دہ مناسب ہوگا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز کی قدریں ہتی ہیں اس میں ادب بھی شامل ہے لیکن اچھا راہ وہ کسی بھی زمانے کی پیداوار ہو ہمیشہ اچھا ے اور اس کی افادیت اور عظمت میں کوئی فرق یا۔ طنز و مزاح بھی ادب ہی کا ایک حصہ ہے ۔ کے طنز و مزاح میں وہ کاٹ نہیں جتنی ک طنز و مزاح کا تقاضا ہے۔ میں یہاں صرف زاد کے ایک کردار فوجی کی مثال پیش کروں گا فوجی کیریکٹر فسانہ آزاد کی تصنیف کے زمانے میں بہت دلچسپ اور ہنسی کا گول گپا رہا ہے۔ عوام حتٰی کہ خواص بھی اس کی باتوں پر کھلکھلا کر ہنس پڑتے تھے لیکن زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں نے آج اس کیریکٹر کو اتنا ہی بھونڈا بنا دیا ہے جتنا پہلے وہ دلچسپ تھا۔ آج اگر ہم فسانۂ آزاد پڑھتے ہیں تو ہمیں فوجی کی باتوں پر ہنسی نہیں آتی۔ غصہ آتا ہے اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے کیونکہ اس کے کالموں میں سطحی اور سستا پن جھلکتا ہے۔ بات بات پر قرولی نکالنا عجیب مسخرا پن معلوم ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب رؤسا اور امرا کے دل بہلاوے کے لئے لکھی گئی ہے اور ایسے رؤسا و امرا طنز و مزاح کے شعور سے بیگانہ ہوتے تھے اور ہر احمقانہ بات پر ہنس دیتے تھے۔

وہ خوشحالی کا دور تھا۔ بات خواہ ہنسی کی ہو یا نہ ہو، ہونٹوں پر ہنسی آ ہی جاتی تھی لیکن آج کا دور بڑا صبر آزما ہے۔ آج ہونٹوں پر ہنسی لانے کے لئے انسان کو بڑے کرب سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ مزاح جو آج لوگوں کو ہنسائے بڑا بھرپور اور نفیس ہے کا مزاح ہوتا ہے اور اس کا پیدا کرنے والا پختہ کار اس عہد میں ایسے بہت کم طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں جن کا طوطی اس نقار خانے میں بڑی اونچی آواز میں بولتا رہا ہے۔ رشید احمد صدیقی ؔ پطرس شوکت تھانوی (ملا رموزی اور فرحت اللہ بیگ کو بھی شامل کر لیجئے۔) سے یہ فہرست شروع ہو کر کنہیا لال کپور اور یوسف ناظم پر آکر ختم ہوتی ہے۔

فرقت کاکوروی کی تحریروں میں بھی طنز و مزاح کے جراثیم موجود ہیں لیکن ان کی تحریروں میں تخلیقی آنچ بہت کم ہوتی ہے۔

اس محفل کی دو بہت ہی روشن شمعیں پطرس اور شوکت تھانوی یکے بعد دیگرے گل ہو چکی ہیں۔ رشید صاحب نے لکھنا تقریباً ختم کر دیا ہے۔ کنہیا لال کپور اور یوسف ناظم کا قلم آج بھی چل رہا ہے۔ مؤخر الذکر کا بہت تیزی سے۔ یوں تو آج اس صنف میں کئی ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو طنز و مزاح کی تعریف پر یہ دو نام جس قدر پورے اترتے ہیں اتنا کوئی اور نہیں۔

یوسف ناظم کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ حال ہی میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے "کیف و کم" کے نام سے ذرا بے دلی ہی سے چھاپا ہے۔ یہ مجموعہ طنز و مزاح کے ادب میں ایک بڑا خوشگوار اضافہ ہے اور اسے بہتر طریقے پر چھپنا چاہئے تھا لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ چھپ گیا ورنہ پتہ نہیں یہ موتی اور کب تک سیپ میں قید رہتا۔

"کیف و کم" کی تقریباً تمام تحریریں بہت شگفتہ اور ترو تازہ ہیں اور نفاست مزاج رکھنے والے کے لئے بڑا خوبصورت سامانِ ظرافت ہے۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں شروع سے آخر تک ایک سنجیدہ وقار قائم ہے اور کہیں بھی پھکڑ پن یا چھچھور پن کا احساس نہیں ہوتا۔ طنزیہ اور مزاحیہ چیزوں میں عموماً یہ نقص نامعلوم طریقے پر گھس آتا

ہے اور شوکت تھانوی جیسا فنکار بھی اس کی زد سے نہیں بچ سکا لیکن یوسف ناظم نے اپنی کتاب میں ایک جملہ بھی ایسا نہیں لکھا جو ذوقِ سلیم پر بار ہو یا جسے پڑھ کر سستے پن کا احساس ہوتا ہو۔

طنز و مزاح انشائیے ہی کی ایک قسم ہے جس میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ پلاٹ ہو سکتا ہے نہ کلائمکس اور نہ ہی کردار نگاری جب کسی تحریر میں یہ چیزیں نہ ہوں تو ظاہر ہے وہ سپاٹ اور بے جان ہوں گی۔ ایسی تحریروں کو پڑھنے کے قابل بنانا بڑا محنت طلب ہے اور پھر ان میں طنز و مزاح پیدا کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ کیف و کم کے تقریباً تمام مضامین بہ جز دو ایک کے نہ صرف طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں بلکہ وہ قاری کو اکثر مقامات پر بے ساختہ قہقہہ مارنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ زیر لب مسکراہٹ تو یہیں قدم قدم پر ملتی ہے۔

یوسف ناظم طنز سے زیادہ مزاح پر قادر معلوم ہوتے ہیں یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کا رجحان مزاح کی طرف زیادہ ہے۔ یوں اُن کے طنزیہ مضامین میں بھی گہری کاٹ موجود ہے اور اس کا ثبوت "بارات" "قواعد اُردو" "صحت اور زندگی" اور بیشتر مضامین کے وہ حصّے ہیں جہاں اُنہوں نے اپنے اس ہتھیار کا استعمال کیا ہے۔ "بارات" میں ہمارے چند بیہودہ رسوم و رواج پر بڑا کاری طنز ملتا ہے۔

یوسف ناظم کا مزاح اور طنز خالص ہندستانی مزاج کا ہے۔ اُنہوں نے مغربی ادیبوں کا بھی مطالعہ کیا ہوگا لیکن مغرب کا خفیف سا اثر بھی اُن کے کسی مضمون پر نہیں ہے۔ اس معاملے میں وہ کنہیا لال کپور سے زیادہ ہندوستانی ہیں۔ کپور صاحب کا فن مغربی ادب سے کافی متاثر نظر آتا ہے۔ اس لئے اُن کے ہاں خالص ہندوستانی مذاق کی چاشنی کم ملتی ہے۔

یوسف ناظم زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے واقعے میں مزاح کا پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ اُنہیں کسی بڑے موضوع کی ضرورت نہیں پڑتی اور یہ چیز اُن کے پختہ فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ "چوتھی کانفرنس" "نثر میں نوحہ" "صحت اور زندگی" "مجرب نسخے" اور "سالانہ رپورٹ" اُن کی اسی خوبی کی طرف بڑے نمایاں اشارے کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کی روانی اور شگفتگی اس بات کی بھی غمازی کرتی ہے کہ اُنہیں اس بارے میں خاص تگ و دو اور جد و جہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کے مضامین میں نہ فلسفے کی گتھیاں ہیں اور نہ غور و فکر کی باریک گرہیں۔ وہ جب لکھنے پر آتے ہیں تو بے تکان لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کے لکھنے والوں میں اکثر ایک قسم کا سطحی پن آ جاتا ہے لیکن یوسف ناظم اس نقص سے بہت دور ہیں لیکن کہیں کہیں لفظی تکرار سے مزاح کی حس دب کر رہ جاتی ہے۔ "موت" میں شاید لفظوں کی تکرار کی وجہ سے ہی مزاح کا عنصر دب کر رہ گیا ہے۔ کرشن چندر نے بجا طور پر "کیف و کم" کو ادب میں ایک جوہر کا اضافے سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن افسوس اس کا ہے کہ یوسف ناظم اب بہت کم لکھتے ہیں۔

(ق۔م۔ح)

حکیم ضیا احسن ...

منتخب اشعار

دل کو ویراں کر کے پائیں لو...
پاؤں پھیلانے لگی وحشت بیا...

ہر چمن پرور ہے اب تن پروری...
آتشِ گل سرد ہے رنگِ گلستا...

ان سفینوں پہ بھروسہ کر لیا تھا...
جا چھپے جو دامنِ ساحل میں طوفا...

○

وہ جادو تھا بتانِ مغربی کی چشم...
کہ آخر کھینچ لے ہی گئی شیخ و برہ...

جنوں کے فیض سے کیسے بھی گھر اُ...
کوئی ہے مجھ پا بھی کوئی اپنا ہے...

وذیرؔ ان کو خود اپنی ہی نگہ جل جیر...
جنہیں ڈھونڈھا کئے دیر و حرم میں

○

خطوط

حافظ ابراہیم صدیقی ——— لندن

..... پرچے کی سائز میں جو تبدیلی تم نے کی ہے وہ بہت اچھی ہے
اس سے پرچہ کافی خوبصورت ہو گیا ہے۔ کیا ہمیشہ اتنا ہی ضخیم پرچہ نکالنے
کا خیال ہے۔ مجھے مضامین میں "مارکسی مطالعہ کا تحفہ" اچھا لگا گو یہ ذرا گنجلک
لکھا گیا ہے اور اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ذرا تشنہ بھی ہے
۔۔ افسانے اچھے چھاپو جیسے اس پرچے میں ہیں ورنہ بیکار قسم کی چیزیں
چھاپنے سے کیا فائدہ۔ نظمیں، غزلیں اور افسانے چھاپنے والے تو اور پرچے
بھی ہیں۔ تم اصلاح معاشرہ کے متعلق مضامین کیوں نہیں چھاپتے۔ یہ اور ایسی کئی
چیزیں ہیں جن کی قوم کو ضرورت ہے۔ یہاں آکر پتہ چلتا ہے کہ آزادی ملنے کے
باوجود ہم کس قدر پسماندہ ہیں۔ زندگی کے ہر کاروبار میں ہمیں اچھا بننے کی ضرورت
ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں یہاں کی طرزِ معاشرت کے بارے میں تمہیں کچھ مضامین
لکھ کر بھجواؤں۔ یہاں کے لوگوں کو جب دیکھتا ہوں تو اپنے والوں پر رونا آتا
ہے۔ یہ لوگ کہاں ہیں اور ہم کہاں۔ ..... تم اپنے قارئین کو سب سے پہلے
اچھا شہری بننے کی تعلیم دو۔ رائے میں توازن پیدا کرنا سکھاؤ۔ برداشت کا
سبق ازبر کرواؤ۔ کم از کم ایک پرچہ تو ایسا ہو جو یہ کام کرے۔ میں تمہیں اس
لئے لکھ رہا ہوں کہ دوِ حیات کا رجحان اسی طرف ہے اور یہ پرچہ جلبِ
منفعت کے لئے نہیں ہے بلکہ واقعی کام کرنے کے لئے ہے اور اگر سستی قسم کی
غزلیں اور کہانیاں ہی چھاپنا اور پڑھنا ہمارا مقصد رہا تو پھر ——— اور ——— کیوں
پڑھیں ———

ناہید افروز ——— شکاگو

..... میں صدر کینیڈی کے قتل کی روئداد ایک خط کی صورت میں
آپ کو بھیجی تھی لیکن اب تک وہ دوِ حیات میں نظر نہیں آئی۔ روداد کیا تھی
آنکھوں دیکھا حال تھا۔ اور ہم نے ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا۔ سالنامہ کا جب پیکٹ
آیا تو ہم نے سمجھا کوئی ادبی پرچہ ہے لیکن کھولا تو کافی حیرت ہوئی۔ دوِ حیات
کو نئے لباس میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ہر اعتبار سے پہلے سے زیادہ
خوبصورت ہو گیا ہے۔ ...... پرچے کو کہیں دبا کر رکھ دو پڑھنے کو
ملتا ہے ورنہ کوئی ملنے والا آتا ہے تو اٹھا کر لے جاتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا۔ امریکہ
کے اُردو سیکھنے والے طلبا ہر اُردو کے پرچے پر بُری طرح جھپٹتے ہیں۔ یہ تھوڑا ہاتھ
ہوتا ہوا پرچہ یا تو کالج کی لائبریری میں پہنچ جاتا ہے یا پھر انتہائی شکستہ حالت
میں واپس ملتا ہے۔ اس لئے اگر آپ دو پرچے ایک یونیورسٹی لائبریری کے لئے
اور ایک ہمارے لئے بھجوائیں تو بہتر ہوگا۔ ہم دونوں پرچوں کی قیمت ادا
کر دیں گے۔ یونیورسٹی نے جو پرچے خریدے تھے اس کی قیمت تو آپ کو
مل چکی ہوگی۔

اقبال افسر ——— حیدرآباد

...... دوِ حیات کی طباعت اب کافی بہتر ہو گئی ہے۔
لیکن اس کے دس روزہ کر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی یا تو پندرہ روزہ ہونا چاہئے
تھا یا پھر وہی ہفتہ وار۔ بہرحال پرچہ اب پہلے سے بہتر ہو گیا ہے اور ہر لحاظ سے
خوبصورت۔ ...... اس پرچے کے پیچھے بڑی نامور شخصیتیں ہیں۔ چند ایک
سے میں بھی واقف ہوں۔ ان لوگوں کی وابستگی پرچے کی زندگی کی ضامن ہے
اسپورٹس پیج کے بارے میں میری تجویز کا آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ
کا جواب آنے پر تصویریں بھجوا دوں گا۔ اور وہ سلسلہ بھی شروع کر دوں گا۔

خلیل الرحمٰن ——— جہلم

...... ۲۰ فروری کا شمارہ سامنے ہے۔ نہال احمد صاحب کا
مضمون دیکھا۔ دو شادیوں کا مسئلہ واقعی قابلِ غور ہے اور میں [illegible] کے حق میں
ہوں۔ لیکن نہال صاحب اس کا کوئی صحیح نظریہ پیش نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے اس
کے تدارک کی کوئی قابلِ عمل تجویزوں کا احاطہ نہیں کیا۔ ہمیم حسین صاحب کے افسانے
کا پلاٹ اچھا ہے لیکن کئی جگہ انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

پرانی خبریں!

"مخبر" بمبئی۔ ۷ اگست ۱۸۹۱ء

ہندوستانی اخباروں کی تعداد ۵۵۰ ہے جو ۱۶ مختلف زبانوں میں چھپتے ہیں۔

○

"مخبر" بمبئی۔ ۱۶ اکتوبر ۱۸۹۱ء

آج ۴ بجے رانی باغ کے قریب ایک عیسائی عورت غبارے باز جو یوروپ و امریکہ میں قریب تین سو بار اُوڑ چکی ہے اوڑے گی۔

○

"مخبر" بمبئی۔ ۲۰ نومبر ۱۸۹۱ء

غبارے میں پرواز

جمعہ کے دن ساڑھے چار بجے لیفٹنٹ میسفیلڈ مری آفیسر وکٹوریا گارڈن میں بلّون میں بیٹھ کر ہوا میں اُوڑے۔ دو میل سے زیادہ اوپر گئے اور وہاں سے بلّون چھوڑ دیا اور چھتری کے سہارے سے زمین پر آنا شروع کیا۔ آتے وقت وقفہ کرتے ہوئے آتے تھے واقعی بڑا کار نمایاں کیا اور یہ پہلا ہی عمل ہے جو ہندوستان میں اس صورت میں کیا گیا۔ اگرچہ بلّون میں بہت سے اُڑے مگر یہ کچھ اور تھا۔ جنگ کے وقت ایسے بلّون دشمن کے حال دریافت کرنے کے لئے بہت فائدہ دیتے ہیں۔

○

"مسلم ہیرلڈ" بمبئی ۵ جنوری ۱۸۹۷ء

اسٹیشن وزیرآباد پر چند لوگوں نے قلی سے اپنا اسباب ریل پر رکھوایا اور اجرت مانگنے پر قلی کو ایسا گھونسا لگایا کہ اوس کی ایک آنکھ نکل پڑی اور نصف چہرہ متورم ہو گیا اوس کی چیخوں نے یورپین اسٹیشن ماسٹر کو کمرے سے باہر نکالا۔ گورے بے پروائی سے جواب دے کر چلتے ہوئے۔

★

زعفران زار

ایک عورت اپنے بال بنوا کر سیلون میں سے نکلی ہی تھی کہ اُس کی سہیلی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

"ارے میری خانم۔ تم نے اپنے بالوں کا کیا کیا۔ کہیں بالوں کی ٹوپی تو نہیں پہن لی۔"

"یہ بالوں کی ٹوپی ہی ہے۔"

"واقعی ۔۔۔ میں تو پہچان بھی نہیں سکی تھی۔"

ایک مریض علاج کے لئے اسپتال میں داخل ہوا۔ اُسے اپنے کمرے میں آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"آجائیے۔"

ڈاکٹر اندر آ گیا۔

"میں آپ کا ڈاکٹر ہوں۔ آپ کپڑے اُتار دیجئے"

مریض نے سب کپڑے اُتار دئے اور ڈاکٹر نے اُس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جب معائنہ ختم ہو گیا تو مریض نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کہئے وہ کیا بات ہے۔"

"آپ نے دروازے پر دستک کیوں دی تھی"

ایک عورت انتہائی بھیڑ کے وقت سڑک پار کرنے میں اپنی چھوٹی بچّی کی مدد کر رہی تھی۔ جب وہ عین بیچ میں پہنچے تو ایک کار میں بیٹھے ہوئے کانسٹبل نے لاؤڈ اسپیکر سے کہا۔

"ننھی بچّی مہربانی کر کے اپنی امّی کو بتاؤ کہ سڑک کس طرح پار کرتے ہیں۔"

اب کی بار

اس پرچے سے دووحیات وقت کا بالکل پابند ہوگیا ہے۔ اب انشاءاللہ اشاعت میں تاخیر نہیں ہوگی۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے کرم فرما ہماری پچھلی فروگزاشتوں کو درگزر کر دیں گے۔

اس شمارے میں سری تراس لاہوتی اور اشتیاق بھیرا ئیونی کے مضامین مفید ہونے کے ساتھ ساتھ فکر انگیز بھی ہیں۔ ہمارے عہد میں مطالعے کا شوق بڑی تیزی سے کم ہوتا جا رہا ہے مطالعے سے میری مراد سنجیدہ علم و ادب سے ہے ورنہ یوں تو جاسوسی، سستا اور سوقیانہ ادب جس قدر پیدا ہو رہا ہے اور جس قدر شدت سے پڑھا جا رہا ہے کبھی ماضی میں شاید ہی پیدا یا پڑھا گیا ہوگا۔ لاہوتی صاحب کا مضمون اس تعلق سے بہت اہم ہے کہ یہ مطالعے کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اشتیاق صاحب نے اپنے مضمون میں قومی یکجہتی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ کئی باتیں تشنہ رہ گئی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون کم سے کم وقت میں لکھا گیا ہے۔

دو مضامین شخصیتوں کے متعلق بھی اس شمارے میں آپ پڑھیں گے۔ فانی اور خواجہ حسن نظامی اُردو ادب کی بڑی چٹانیں ہیں۔ یہ دونوں مضامین لکھنے والے کم عمر ہیں طبعی اور ادبی دونوں اعتبار سے لہٰذا انہیں اسی معیار سے جانچنا چاہئے۔

تاخون انصار لمرآنوگراف والوں کے علم بہت جاننا ہی اور یہ ہماری نئی نسل کے نمائندے ہیں آوارہ سلطانپوری کی تینوں چیزیں اچھی شاعری کی تعریف میں آتی ہیں۔ وہ دووحیات کی دریافت نہیں ہیں لیکن بازیافت ضرور ہیں۔

ہفت روزہ
دورِ حیات
پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی

جلد ۳ — یکم اپریل ۱۹۶۴ء — شمارہ ۹

اس شمارے میں

★

سالانہ: دس روپے
فی پرچہ: تیس نئے پیسے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر پر بحث ۵ مئی ۶۴ء تک ملتوی کردی ہے۔
- بہار، اڑیسہ، مدھیہ پردیش اور مغربی بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے
- یو۔پی اسمبلی نے یو۔پی ہائی کورٹ کے دو ججوں کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کردئے۔
- بہار میں فرقہ وارانہ فسادات کی شدت کے پیش نظر فوج طلب کرلی گئی۔
- فیلڈ مارشل عارف صدر عراق، پاکستان کا سرکاری دورہ ختم کرنے کے بعد نئی دہلی پہنچ گئے۔
- مسٹر پی سی سین وزیر اعلیٰ مغربی بنگال نے اسمبلی میں بیان دیا کہ مغربی بنگال میں جنوری کے فسادات میں ۲۴۷ آدمی ہلاک ہوئے۔
- کشمیر میں جنگ بندی لائن کے قریب ۲۴ پاکستانی حملہ آور ایک جھڑپ میں ہلاک ہوئے
- ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی میں ایک نیا بحران پیدا ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسٹر ڈانگے نے ۴۰ سال قبل برطانوی حکومت کو اپنی خدمات پیش کی تھیں اور اس کے عوض قید سے رہائی چاہی تھی۔
- ٹوکیو میں امریکی سفیر پر ایک جاپانی نے قاتلانہ حملہ کیا۔ انکی حالت تشویشناک ہے۔
- جاپان کے وزیر داخلہ نے امریکی سفیر پر قاتلانہ حملے کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا انہوں نے بتایا کہ ملک میں امن وامان کی برقراری بالکلیہ وزیر داخلہ کی ذمہ داری ہے۔
- ہندوستان اور پاکستان کے وزیر داخلہ بہت جلد دہلی میں ملیں گے اس کانفرنس میں فرقہ وارانہ فسادات اور اقلیتی امور کے بارے میں غور کیا جائے گا۔
- الاسکا میں زبردست زلزلہ آیا جس کی وجہ سے ۸۲ آدمی ہلاک ہوگئے۔

منوّر لکھنوی

فغانِ منوّر

گزرتے ہوئے حالات
کے تحت

نہیں نہیں ہوش اب ٹھکانے ہے تاب رخصت مقابلے کی
کراں کہاں جا کے ختم ہوگی مرے مصائب کے سلسلے کی

میں آدمی ہوں نہیں فرشتہ نہ اجر خواہِ عمل ہوں کیسے
ضرور انعام کی طلب ہے ضرور ہے آرزو صلے کی

روا ہو یا ناروا ہو شکوہ صدا بہ صحرا بنا ہوا ہے
یہ گوشِ رحمت کو ہوگیا کیا، نہیں سماعت کسی گلے کی

نہ دست و پا ساتھ دے رہے ہیں نہ ہے بھروسہ دماغ و دل پر
جواب ہمت نے دے دیا ہے، نہیں کمر چست حوصلے کی

کبھی تھا عقدہ کشا جو ناخن ہے اب مری سمت سے کشیدہ
سلجھ سکے گی نہ کوئی گتھی مرے کسی بھی معاملے کی

پھری ہوئی ہے نگاہِ داور جبیں کا ہر نقش مٹ رہا ہے
یہی ہے تمہید کیا منوّر مرے مقدر کے فیصلے کی

اختر راہی

نقشِ پا

آگ، پانی اور ہوا
چاند، سورج، آسماں
گردشِ ایام، فصلِ گل، خزاں
زلزلے، طوفانِ باراں اور برقِ بے اماں
کل تلک تھے مظہرِ جاہ و جلالِ کبریا
آج ہیں سب کاروانِ شوق کے یہ نقشِ پا

●

مسجدوں کے بام و در، مینار و گنبد
بت کدوں کے بت، کلیسا کی صلیبیں
مندروں کے خوشنما زریں کلس
کل تلک تھے عظمتِ رب کے نقوشِ جاوداں
آج ہیں سب ارتقائے ذہنِ انساں کے نشاں

کس سے پوچھوں کون ہوں میں کون ہے میرا خدا
ہیں سبھی اپنے ہی دردِ زندگی میں مبتلا

ادیبؔ اور فسادات

پاکستان کے ماہ نامہ "افکار" کراچی کی فروری ۶۴ء کی اشاعت میں "جہانِ تازہ" کے تحت پروفیسر حنیف فوق کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جو دراصل ایک دردمندانہ اپیل ہے اُن ادیبوں کے نام جو انسانیت کی بقا اور امن کے لئے اپنے ذہن و قلم وقف کر چکے ہیں۔

فوق صاحب نے کلکتہ اور کھلنا کے فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہو کر یہ مضمون لکھا ہے اور گذشتہ فسادات بھوپال، جبلپور، جے پور، ڈھاکہ وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے سیاست، مذہب اور فساد کی اس تثلیث کو انسانیت کے لئے دائمی عذاب کہا ہے۔ ۴۷ء سے برصغیر ہند و پاک میں انسانی خون سے کھیلی جانے والی اس ہولی اور اس کے عواقب کا ذکر کرتے ہوئے صاحب موصوف نے ایک ادیب کے ناطے جو دردمندانہ اپیل کی ہے اُسے پڑھ کر مجھے کرشن چندر کا وہ خط یاد آگیا جو کہ انہوں نے جبلپور اور بھوپال کے فسادات سے متاثر ہو کر پاکستانی ادیب ابن انشاء کے نام لکھا تھا اور جو پاکستان رائٹرس گلڈ کے آرگن "ہم قلم" میں گلڈ کے سکریٹری جمیل الدین عالی کے جواب کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

کرشن چندر نے اپنے خط میں ابن انشاء کے توسط سے پاکستانی ادیبوں سے وہی اپیل کی تھی جو تازہ ترین فسادات سے متاثر ہو کر پروفیسر حنیف فوق نے کی ہے۔ ہند و پاک کا وہ کونسا ادیب ہے جو برطانوی سامراج کی بنیادی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو سے ناواقف رہا ہوگا۔ لیکن آج جب ہم آزاد ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے جھوکے ننگے عوام صدیوں کی نکبت سے نکل کر ایک بہتر اور خوش حال زندگی گزاریں، تو برطانوی استعماریت کا بھوت کیوں بار بار سر اُٹھا رہا ہے اور ہمیں آزاد قوموں کی حیثیت سے امن پسند دنیا میں ذلیل و خوار کر رہا ہے۔

اِس کیوں کا جواب جتنا ہند و پاک کے سیاستدان جانتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ دونوں ملکوں کے ادیب جانتے ہیں۔ لیکن بقول پروفیسر حنیف فوق اس کے اظہار کی ہم میں جرأت نہیں ہے۔ "چند ادیبوں نے کشت و خون کی مساوات قائم کر کے یہ سمجھ لیا ہے کہ فسادات کا صحیح تجزیہ ہو گیا لیکن انسانیت کے نام پر محض جذباتی اپیلیں اس مسئلے کا صحیح حل نہیں ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ظالم کو ظالم ہی کہنا پڑے گا اور ان تمام حالات و کوائف کی نشان دہی کرنا پڑے گی جو اس افسوسناک صورتِ حال کی ذمہ دار ہیں اُردو کے ادیبوں نے ابھی تک اس جرأت اور بصیرت کا ثبوت نہیں دیا ہے۔"

کرشن چندر نے اپنے خط میں یہی تجویز پیش کیا تھا اور لکھا تھا کہ ہند و پاک کے اُردو ادیبوں کو "جرأت اور بصیرت" کا ثبوت دینے کے لئے باری باری مل بیٹھنا چاہئے۔ اس اپیل کے جواب میں جمیل الدین عالی نے گلڈ کی جانب سے لکھا تھا کہ پاکستانی ادیب اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اس قسم کی پہلی کانفرنس پاکستان میں بلانے کیلئے تیار ہیں بشرطیکہ ہندوستانی ادیبوں کی کوئی نمائندہ جماعت اس کانفرنس میں اپنے نمائندے بھیجنے کے لئے تیار ہو۔ جمیل الدین عالی کے جواب کی روشنی میں "خیال" کاٹھی نے جو نوٹ لکھا تھا اُس میں انجمن ترقی اُردو ہند کو متوجہ کیا گیا تھا لیکن انجمن ترقی اُردو ہند نے اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید اس لئے کہ اُنہیں دنوں دونوں حکومتیں سرکاری طور پر ادیبوں کے خیر سگالی وفود بھیجنے پر غور کر رہی تھیں۔ یہ گفتگو کامیاب رہی اور دونوں ملکوں کے کچھ ادیب سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے اِدھر اُدھر گئے لیکن اِن ادیبوں نے نہ اُن حالات پر بحث کی جو دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات کے محرک ہیں نہ اُن ظالموں کو ظالم کہا گیا جو سیاسی اغراض کے لئے بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہتے ہیں۔ اور نہ ہی کوئی ایسی راہ عمل تجویز کی جو انسانیت کے اس دائمی عذاب کے خاتمے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتی۔

کرشن چندر۔ جمیل الدین عالی اور حنیف فوق نے اپنے اپنے طور پر جو تجاویز پیش کی ہیں اُن کا مقصد یہی ہے کہ دونوں ملکوں میں آئے دن ہونے والی بہیمیت اور درندگی کی روک تھام کی جائے اور بلند آواز میں ان کی مذمت کی جائے۔ یہ صدائے حق صرف وہی ادیب اُٹھا سکتے ہیں جو آزاد ضمیر لے کر دونوں ملکوں کے ادیبوں کی کانفرنسوں میں شریک ہوں اور برٹرینڈ رسل کی طرح بے باک اور صداقت پسند ہو سکیں۔

آخر میں ہند و پاک کے ادیبوں سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ ہماری آزادی، انسانیت دوستی اور حق پسندی اسی وقت تاریخ کا سنہرا باب بن سکے گی جب برصغیر ہند و پاک سے آپس کی خونریزی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا اور اس کام کی انجام دہی میں دونوں ملکوں کے شاعر و ادیب بڑا موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔

فیض انصاری

وہ بات

بات سے بات .....

گاؤں کے سب سے معزز بزرگ بدھ سنگھ سے گاؤں والوں نے اصرار کیا کہ وہ اس سال انتخاب میں ضرور حصہ لیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"بھئی میں ٹھہرا جاہل گنوار۔ اس عمر میں یہ چناؤ وناؤ مجھے زیب نہیں دیتا۔ کسی پڑھے لکھے نوجوان کو کھڑا کرو ....."

لیکن گاؤں والوں نے اُن کی ایک نہ سُنی اسے مجبور ہو کر چناؤ میں کھڑے ہو گئے زور شور سے پرچار شروع ہُوا۔ جب چناؤ میں دو چار دن رہ گئے تو لوگوں نے بدھ سنگھ سے اصرار کیا کہ آپ بھی کچھ بولیں۔ لوگ آپ کے مُنہ سے کچھ سننے کے لئے بیچین ہیں۔

بدھ سنگھ نے بہت ٹال مٹول کی لیکن بے سود۔ ہار کر انہوں نے اپنے ساتھی سے پوچھا میں کیا بولوں۔ ساتھی نے بتایا یہ کون مشکل بات ہے تقریر کرنے والے تو بات میں سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں آپ بھی ایسا ہی کیجئے۔ بدھ سنگھ جھجکتے ہوئے کھڑے ہوئے اور بولنا شروع کیا۔

"بھائیو اور بہنو! میں نہ تو اسپیکر ہوں اور نہ لاؤڈ اسپیکر۔ سپیکر تو اپنے گاؤں کے پٹیل صاحب تھے۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب اُن کا انتقال ہوا تو اُن کے جنازے پر دو طرح کے گل ہار چڑھائے گئے تھے۔ ایک تو وہ جو زبردستی اپنی شیروانی میں لگاتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا گلقند بنتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گلقند قبض کو دُور کرتا ہے اور قبض سب روگوں کی جڑ ہے اور جڑ خربوزے کی لمبی ہوتی ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے اور رنگ جرمنی کے پکے ہوتے ہیں۔ جرمنی میں ایک ہٹلر ہُوا تھا اُس نے بہت سی واریں لڑی تھیں۔ جیسے سوموار منگل وار، بدھ وار۔ بس جی بدھ سنگھ میرا نام ہے۔ جب آپ پرچی ڈالنے آویں تو مہربانی کر کے اسے ضرور یاد رکھیں۔ جے ہند"

کسم لتا ——— بمبئی

پہلی غلطی

میرے ایک دوست ایک بڑی کمپنی میں ملازم ہیں۔ بڑے زندہ دل اور ہنس مکھ۔ حالانکہ وہ ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں انہوں نے اپنے ماتحتوں کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ہر ایک کے ساتھ پیار و محبت اور اخلاق سے پیش آنا اُن کی سرشت میں داخل ہے۔

ایک دن تنخواہ کا لفافہ جب اُن کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے دیکھا کہ لفافے میں دس روپے کا نوٹ زیادہ رکھا ہے۔ اُن کی تنخواہ ۷۰۰ تھی مگر روپے تھے ۷۱۰۔ اُنہوں نے بغیر کچھ کہے سُنے چپکے سے وہ نوٹ بھی رکھ لیا۔

دوسرے دن دفتر میں انہوں نے گرینڈ پارٹی دی جس میں دس کی بجائے اُن کے ۲۵ روپے خرچ ہو گئے۔ پارٹی میں وہ اکاؤنٹنٹ بھی شریک تھا جس نے غلطی سے ۱۰ روپے اُن کے لفافے میں زیادہ رکھ دیئے تھے لیکن کسی کو پتہ نہ چلا کہ پارٹی کس سلسلے میں ہوئی اور انہوں نے اس کی غرض و غایت بتائی۔

دوسرے ماہ جب تنخواہ کا لفافہ آیا پر پہنچا تو اُس میں دس روپے کم تھے۔ آپ نے فوراً اکاؤنٹنٹ کو بُلوایا۔

"اجی قبلہ میری تنخواہ میں ۱۰ روپے کم"

"جی ہاں پچھلے ماہ غلطی سے آپ کو زیادہ دے دئے گئے تھے۔ اس لئے اب کاٹ لئے ہیں"

"واہ قبلہ غلطی آپ کریں اور بھگتوں دس روپے"

"لیکن جناب وہ دس روپے جو میں پچھلے ماہ آپ کو زیادہ دے دئے تھے۔ ہوگا۔؟"

"دیکھئے قبلہ میری پہلی غلطی معاف دوسری نہیں لگتیہ روپے"

مغنی عباسی ———

ایک قیمتی سوانح حیات

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری ملاقات ان دو آدمیوں سے ہوئی۔ کئی اعتبار سے یہ ملاقات میری شاعری کے لئے بہت سود مند ثابت ہوئی۔ یہ دونوں ادیب بننا چاہتے تھے لیکن اب تک انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اب انہوں نے مجھ میں خود کی نوجوانی چھپی ہوئی دیکھی اور میرے ذریعے وہ اپنی شکستہ خواہشات کی تکمیل چاہتے تھے۔ ہم تینوں ساری رات ماسکو کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور جب ہم پوپھٹنے سے قبل ایک دوسرے کو الوداع کہنے لگے تو تاراسوف نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"اب سے ایک گھنٹے کے اندر اخبار چھپ جائیگا اور اُس میں تمہاری نظم ہوگی۔"

"یہ یاد رکھو کہ تمہارا تعلق اب صرف تمہاری ذات ہی سے نہیں رہا۔" برلاس نے کہا لیکن میں نے ان چونکا دینے والے الفاظ کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

۷ بجے صبح میں نے اخبار بیچنے والے ایک لڑکے کے ہاتھ سے سوویت اسپورٹس کی کاپی جھپٹ کرلی۔ اخبار سے ابھی ابھی تازہ تازہ چھپائی کی سیاہی کی بو آرہی تھی۔ میں نے اخبار کھولا اور میری نظم دیکھی نظم کے نیچے میرا نام تھا۔

میں نے ۵۰ کاپیاں خریدلیں ــــ اخبار بیچنے والے لڑکے کے پاس اتنی ہی کاپیاں تھیں۔ اور لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر چلنے لگا۔ اخبار میرے ہاتھ میں تھا اور میں ہاتھ اونچا کرکے ہوا میں لہرا رہا تھا۔ زمین میرے قدموں تلے گھومتی ہوئی معلوم ہورہی تھی میں جینئس بن چکا تھا۔

میں گھر پہنچا اور بڑی ظفرمندی کے احساس کے ساتھ وہ سارے اخبار اپنی ماں کے سامنے بکھیر دیئے میری ماں کے ردِّعمل کو مسرت آمیز نہیں کہا جاسکتا تھا "اب میں تمہاری طرف سے قطعی مایوس ہوچکی ہوں۔" اُس نے ایک آہ بھر کر کہا۔ شاید وہ ایسا خیال کرنے میں صحیح بھی تھی۔

اُسی دن تاراسوف نے مجھے نظم کا معاوضہ دلوادیا۔ مجھے ۳۵۰ روبل ملے۔

مجھے ماں نے کہا تھا اور میں کتابوں میں بھی پڑھ چکا تھا کہ تمام شاعر شراب پیتے ہیں اور چونکہ اب میں شاعر بن چکا تھا اس لئے میں نے معاوضے کی رقم شراب پینے میں خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے ایک دوست سے مشورہ کیا جس کی عمر ۱۴ سال تھی اور جو ایک تاتارقلی کا لڑکا تھا، کہ شراب کس طرح پی جائے۔ اُس نے بڑے تجربہ کارانہ انداز میں کہا ہمیں ایک عمدہ ہوٹل میں چلنا چاہیئے لیکن ساتھ ہی عورتیں ہونا ضروری ہے۔

ہم نے ۱۷، ۱۷ سال کی دو لڑکیوں کو دعوت دی کہ وہ ہمارے ساتھ ہوٹل چلیں۔ ایک بال بنانے کی دُکان میں کام کرتی تھی اور دوسری ایک فیکٹری میں آپریٹر تھی۔ ان لڑکیوں کے کہنے پر ہم چاروں ایک عمدہ ہوٹل اور ریسٹورنٹ کی جانب چل پڑے ہوٹل میں پہنچ کر میں نے کھانے کی فہرست دیکھی۔ ایک شراب کے آگے Yerla لکھا ہوا تھا میں نے فوراً اُس کا آرڈر دے دیا۔ جب بوتل سامنے آئی تو مجھے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شراب گولیوں کی شکل میں ہوگی

رات کے پچھلے پہر اُن لڑکیوں نے مجھے گھر پہنچا کر میری ماں کے حوالے کردیا۔ اس جادو کی دنیا میں سفر کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری صلاحیتیں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھارہی ہیں۔

میری ماں رونے لگی۔ میں بالکل بھول چکا تھا کہ صبح ۱۰ بجے مجھے فٹ بال کی تعلیم دینے والے اُستاد سے اسٹیڈیم میں ملنا تھا تاکہ مجھے ٹیم میں شریک کرنے کے بارے میں جانچا جائے۔

میں سخت قسم کے دردِ سر میں مبتلا تھا لیکن میں نے خود کو کسی نہ کسی طرح اسٹیڈیم پہنچا دیا۔ کھیل شروع ہوا اور میں گول کے کھمبوں کے درمیان کھڑا تھا لیکن مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ میدان میں کیا ہورہا ہے مجھے کبھی دو اور کبھی تین تین بال نظر آنے لگے اور ان میں سے میں ایک کو بھی نہیں روک سکا۔

فٹ بال کوچ میرے قریب آیا اور انتہائی ہمدردی سے پوچھنے لگا۔

"کیا تمہاری طبیعت کچھ خراب ہے؟"

لیکن جب اُس نے مجھے دیکھا تو لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے اپنے ہاتھ فضا میں لہرائے کھلاڑیوں کی طرف متوجہ ہوا جو بالکل ساکت و صامت کھڑے تھے اور شیکسپیر کے کسی کردار کی طرح کہنے لگا۔

"صبح کے دس بجے کا وقت ہے اور ایک پندرہ سال کا لڑکا نشے میں دُھت۔ مجھے سخت افسوس اور شرمندگی ہے کہ میں اس اخلاقی گراوٹ کے دَور میں رہ رہا ہوں۔"

میرے فٹ بال کے شوق کا اس افسوسناک طریقے پر خاتمہ ہوگیا۔

○

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تاراسوف اور برلاسس نے جن سے میں ۱۹۴۹ء میں ملا تھا۔ مجھے ایک شاعر اور ایک انسان بنانے میں بڑا اہم اور تعمیری حصّہ ادا کیا۔

میرے غیر یقینی کردار کے باوجود میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان دونوں نے میرے لئے کیوں اتنی تکلیفیں کیوں اُٹھائیں اور ان میں اتنا برداشت کا مادّہ کہاں سے آگیا تھا۔

برلاسس میرے لئے ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا تھا اُس نے جدید فلسفے کے بنیادی اصولوں سے مجھے واقف کروایا۔ اُس نے مجھے ہیمنگ وے کے بارے میں بتایا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ ہیمنگ وے روس میں چھپنا شروع ہوا اور اُس کی کتابوں کی لاکھوں کاپیاں بکنے لگیں۔ اُس وقت اُس کی کتابیں کتابوں کے شوقین لوگوں کے لئے ایک نادر چیز تھی۔

A farewell to arms

The Sun Also Raises

To have and have not

اور کلی من جارو کی The Snow نے مجھے اپنی ہمہ گیری اور جوانمردی سے بہت متاثر کیا۔

کچھ دن بعد ہیمنگ وے کی ناول For whom the bell talls میرا محبوب ناول بن گیا۔ مغرب کے کچھ لوگوں کے لئے یہ درجہ دوم کا ناول ہے۔ ممکن ہے میں جانبداری برت رہا ہوں لیکن [illegible] کے کردار آج [illegible] میں بہت [illegible]

ہوں۔ اس کردار کے آئینے میں آنے والے سالوں کے تاریخی واقعات کی بڑی خوبصورتی سے پیش تیاسی کی گئی ہے۔

برلاسس نے مجھے ان کتابوں کی تلاش میں بہت مدد دی جو اُس وقت نایاب تھیں۔ اُن کتابوں کے مصنفوں میں ہیمنگ، جوائس۔ فرائیڈ۔ پراؤسٹ۔ اسٹین بک فاکنر۔ ریمارک اور سینٹ اکسوپری قابلِ ذکر ہیں۔

میں تھامس مان کے ناول Magic Mountain کی رُوحانی بلندی سے بے انتہا متاثر ہوا۔ یہ ناول انسان کی تکالیف میں ایک چٹان کی طرح کام دیتا ہے۔ میں والٹ وِہٹ مین کی فنی دسترس۔ رمباد کے جوش و خروش و رعنائی کے شکوہ۔ باؤدلیر کی الیہ حس۔ دِھرکین کے بھوت پریت۔ رِلکے کی نزاکت۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خوفناک مناظر اور رابرٹ فراسٹ کی صحت مند دیہاتی بصیرت سے میں حد درجہ متاثر ہوا ہوں۔

روس کا ادب عالیہ جو اسکول میں مجھے بے انتہا بور معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اسے غلط طریقے سے پڑھایا جاتا تھا۔ اب میرے لئے نہایت دلچسپ اور زندگی سے بھرپور ہو گیا۔ نثر میں۔ ٹالسٹائی کے جملے جو ابرق کی چٹان کی طرح سخت تھے۔ چیخوف کا زیروبم جو خزاں کے پتّوں کی طرح نرم اور ہلکا تھا۔ دوستووسکی کی گرہ بندی جورات میں ٹیلیگراف کے تاروں کی طرح کانپتی ہوئی تھی۔ ان تمام چیزوں نے مجھے زندگی میں پہلی بار زبان کے حسن، معنوں کی دولت اور گہرائی کی طرف متوجہ کیا۔

پُشکن نے جو اسکول کے باسی ناشتے کی طرح [illegible] انتہائی مسرّت سے میرے لئے اپنے جوان اور مضبوط بازو کھول دئے اور شیشے کے سرکاری خول سے نکل کر باہر آگیا۔ ذہین بہادر۔ بے جھجک اور برف اور شراب کی خوشبو لئے ہوئے پشکن میرے سامنے کھڑا تھا۔ لرمنتوف کا المناک ظاہر کردار اور تعاون کے ادبی [illegible]

اُس کا لبادہ میرے لئے ناقوس [illegible] ہو گئیں۔ شاعروں کی نگاہیں ۔۔۔ بلوک کی پیغمبرانہ گہری آنکھیں۔ یسینین کی بچّوں جیسی نیلی اور پریشان آنکھیں۔ میکووسکی کی باغیانہ مضحکہ اُڑاتی ہوئی، لیکن سراب کی سی کیفیت رکھنے والی آنکھیں۔ میری نگاہوں سے چار ہوتی رہیں۔

پاسترناک میرے لئے اب تک ناقابلِ فہم تھا۔ وہ مجھے بہت پیچیدہ نظر آتا تھا اور اُس کی امیجری کی بھول بھلیّاں میں اُس کے خیالات کا سلسلہ میرے ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ برلاسس نے اُس کی نظمیں مجھے بار بار سُنائیں اور انتہائی صبر و سکون کے ساتھ مجھے اُن کے معنی سمجھائے۔ لیکن مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو، جب کوئی چیز نہیں سمجھ سکتے ہیں تو خود کی بجائے آرٹسٹ کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں وہ بڑے فخریہ انداز میں کہتے ہیں۔

"بھئی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی"۔

اُنہیں یہ کبھی خیال نہیں آتا کہ یہ اُن کی محدود سمجھ کا نتیجہ ہے ۔۔۔ پہلے پڑھنے والے کو چاہئے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کے بعد اسے یہ حق پیدا ہوتا ہے کہ وہ تعریف کرے یا برائی کرے ۔۔۔ اور مجھے اپنی محنت کا انعام مل گیا۔ ایک دن اچانک مجھے معلوم ہوا کہ پاسترناک میری سمجھ میں آنے لگا ہے۔ وہ میرے لئے ایک صاف و شفاف شیشے کی طرح ہو گیا اور اس دن سے وہ میرے لئے ایک انتہائی سادہ شاعر بن گیا اتنا سادہ، جیسے آسمان اور زمین۔

(ٹی۔م۔ح)

جواب طلب اُمور کیلئے ڈاک خرچ

بھیجنا نہ بھولئے

سید محمود الحسینی

جمہوریت تجربات کی کسوٹی پر

زیرِ نظر مقالہ میں حکومت کی معاشی، زرعی اور صنعتی پالیسیوں کے حُسن و قبح کا جائزہ لینے کے بجائے جمہوریت کا حسی تجزیہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ برسرِ اقتدار جماعت نے پارلیمانی جمہوریت کو مشعلِ راہ بنا کر سوشلسٹ طرز کے سماج کی تشکیل کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ جمہوریت کو تجربات کی کسوٹی پر کسنے سے یہ ظاہر ہو سکے گا کہ اس نے کتنے میٹھے پھل دئے اور کتنے کڑوے (سید محمود الحسینی)

اخبارات و رسائل کے جمہوریت نمبر میں بالعموم دستور سازی کی تاریخ، اس کے حسن و قبح اور دستوروں سے مقابلہ کے ساتھ ساتھ پیچھے مڑ کر گذرنے والے سالوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ دستور نے قوم کو کیا دیا؟ یہ ایک مسلمہ سچائی ہے کہ ہر دستور خواہ وہ وحدانی ہو یا وفاقی کاغذ پر کافی دیدہ زیب معلوم ہوتا ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اہلیانِ ملک کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں ان حقوق اور تحفظات کی جھلک ملتی ہے یا نہیں جن کی گارنٹی دستور میں دی گئی ہے اس نقطۂ نظر سے جب ہم آزادی کے بعد کے سولہ سالوں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کافی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ منصوبہ بند اقتصادی پالیسی کے باوجود ملک سے بے روزگاری کم روزگاری جہالت غربت، افلاس، لسانی منافرت، چھوت چھات، غذائی بحران، زمین کی صحت مند اصولوں پر از سرِ نو تقسیم، لگان کی شرح میں انقلابی تبدیلی جیسے کلیدی مسائل کو ابھی تک حل نہیں کیا جا سکا۔ اقلیتیں مضطرب اور بے چین ہیں زبان کے سامراج کی وجہ سے لسانی اقلیتوں میں شدید قسم کی برہمی اور بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔ ایسی شکل میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دستور نے چاہے پوری فیاضی دکھائی ہو لیکن اُس کے چلانے والوں نے حقیقی معنی میں اہلِ ملک کو کچھ نہیں دیا۔

کثرتِ تعبیر

ہر زمانہ میں بعض چیزیں دلوں اور دماغوں پر حکمراں ہوتی ہیں اور عرصہ تک دل و دماغ اُن کی گرفت سے آزاد نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں بعض دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ جمہوریت کو بھی یہی مقام حاصل ہے۔ یہ لفظ اس قدر مقبول اور زبان زدِ خاص و عام ہے کہ آج کل جو کام بھی شروع کیا جاتا ہے اُسے جمہوریت کا تقاضا بتایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام بھی جمہوریت کا مدعی ہے اور اشتراکی بھی۔ جہاں کروڑوں انسانوں پر ایک ہی شخص چھایا ہوا ہے وہاں بھی جمہوریت کا پرچم لہرا رہا ہے اور کشتی کا ہر مسافر ملاح بنا ہوا ہے وہ بھی جمہوریت ہی ہے۔ غرضکہ اس جمہوری دور میں خود جمہوریت کے بارے میں جتنے منہ ہیں اُتنی ہی باتیں ہیں۔ اگرچہ اس کو آدرش تسلیم کر لیا گیا ہے پھر بھی ہجومِ خسرواں نے اس کو چوں چوں کا مربہ بنا دیا ہے، اور بیچاری جمہوریت کا خواب ہی کثرتِ تعبیر میں پریشاں ہوا جا رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس معشوقِ ہرجائی کو کسی رنگ کا لباس پہنا کر پیش کرنے کے بجائے جیسے اس کے عاشقوں کے سامنے برہنہ لے آیا جائے۔ اس طرح کے تعارف کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کا سلسلۂ نسب کیا ہے کہاں پیدا ہوئی۔ نامِ خدا جوانی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اُسے کن مراحل سے گذرنا پڑا۔ اور مرشد نے اس پر کیا اثر ڈالا پھر یہ کہ اس نے اپنے عاشقوں کو وصل سے ہمکنار کیا یا ہجر سے۔

مارٹن لوتھر سے پہلے

یوں علمی انداز میں تو اس کا تذکرہ ارسطو اور افلاطون تک کے یہاں ملتا ہے لیکن اس کا عملی ظہور کوئی پرانی بات نہیں ہے۔ اس کے جاننے کے لئے کسی علمی و سیاسی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ پچھلی قومی تاریخ پر ایک اُچٹتی ہوئی سی نظر ڈال لینا کافی ہوگا۔ سولہویں صدی عیسوی تک پورا یورپ شہنشاہیت کی سیاسی گرفت اور پاپائیت کے مذہبی شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا۔ جگہ جگہ وہ ایجنسیاں قائم تھیں جہاں سے پوپ کی جاری کی ہوئی دستاویزاتِ مغفرت فروخت ہوتی تھیں۔ عام عقیدہ یہ تھا

کر دیا گیا تھا کہ پوپ کے ہر فیصلے میں خدا بولتا ہے۔ پوپ کے ذریعہ
دنیا کے کسی بھی بدترین بادشاہ کے دربار سے کم نہیں تھی
ایک پادری کا یہ قول مشہور ہے کہ
"عیسیٰ کا مذہب ہمارے لیے عیش و عشرت
کا بہترین سرچشمہ ثابت ہو رہا ہے۔"
دوسری طرف مطلق العنان شہنشاہیت
اپنے پورے جلال و جبروت کے ساتھ بندگانِ خدا
پر مسلط تھی۔ بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ
قانون تھا اور چونکہ اُسے پوپ کا آشیرواد حاصل
تھا اس لئے وہ حق بھی تھا۔ اس کے آگے سرِ تسلیم
خم کرنے سے انحراف سیاسی بغاوت ہی نہیں بلکہ
مذہبی کفر بھی تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصر یہ
کہ کلیسا اور شہنشاہیت ایک دوسرے کے
پشت پناہ بنے ہوئے ... مقولہ بن گیا ہے
[illegible]
جا ... ۔ بے بس رعایا کی جان و مال، عزت،
آبرو حتیٰ کہ ایمان و نجات بھی انہیں کے قبضے میں تھا
اس "ملی بھگت" نے خدا کی مخلوق پر کیسے ہولناک اور
لرزہ خیز مظالم کئے ہیں اور اپنی رائے سے ہر اختلاف
کو حتیٰ کہ علمی و سائنسی تحقیقات تک کو کس بیدردی
کے ساتھ کچلا ہے۔ یہ ایسی خونچکاں، المناک اور
دردانگیز داستان ہے جس سے ہر پڑھا لکھا
آدمی باخبر ہے۔

یہ ایک مسلّمہ سچائی ہے کہ ظلم و جبر جتنا
شدید ہوگا اتنا ہی شدید اس کا ردِعمل۔ یہی حال
یہاں بھی ہوا۔ ایک طرف مارٹن لوتھر کی مذہبی اصلاح
نے دوسری طرف علمی بیداری نے اس "متحدہ محاذ"
کے خلاف نفرت پیدا کرنا شروع کی [illegible]
[illegible]

چونکہ غالب حصّہ کلیسا کا تھا۔ رعایا کے مقابلے میں تو کلیسا
بادشاہ کا حامی تھا۔ لیکن بادشاہ کی مجال نہیں تھی کہ
پوپ کی رائے سے اختلاف کر سکے۔ چنانچہ فرانس کے
فلپ آگسٹس نے صلیبی جنگ میں سلطان صلاح الدین
ایوبی کی خودمختاری دیکھ کر کہا تھا کہ
"مبارک ہے صلاح الدین جس کی گردن پر
کسی پوپ کا جوا نہیں ہے"
عوام کے ذہن و فکر بھی بادشاہ کی طرف سے
نہیں بلکہ پوپ کی طرف سے پہرے بٹھائے ہوئے
تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر تحریکِ آزادی میں پاپائیت
کے خلاف جذبات کی شدت زیادہ تھی۔

انقلاب کے بانی

ان ہی جذبات نے سولھویں صدی عیسوی میں
مارٹن لوتھر کو اور سترھویں صدی عیسوی میں روسو
اور والٹیر وغیرہ کو جنم دیا۔ اور بجا طور پر یہ خیال عام
ہو گیا کہ یہ مذہبی و سیاسی اقتدار ایک ظلم ہے جس سے
انسان کو آزاد ہونا چاہئے۔ انسان پیدائشی طور پر
آزاد ہے۔ اُس کے فکر و ضمیر کو اور اس کی مرضی و رائے
کو بالکل آزاد ہونا چاہئے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے
کہ وہ افراد کی رائے اور مرضی پر اپنی رائے اور مرضی مسلط
کرے۔ بات بالکل معقول تھی لیکن جب بھی انسان کی
خودی نے کروٹ لے کر "یوں نہیں یوں" کہا ہے
جس کا نام انقلاب ہے۔ ہمیشہ ایک انتہا سے دوسری
انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ یہی ٹھوکر اس نے یہاں بھی
کھائی۔ چونکہ وہ کلیسائی نظام کے ہاتھوں بہت ستایا
ہوا تھا۔ اس لئے کلیسا سے اس کی نفرت مذہب
اور خدا تک پہنچ گئی۔ اتفاق سے اسی دور میں علمی
ترقی ہوئی اور سائنس نے بہت سی پرانی چیزوں کو
[illegible] انکشافات و ایجادات کے ساتھ نئے
[illegible]
[illegible]

بحث کرنا شروع کر دیا۔

انحراف

ان تمام اسباب نے مل کر انسان کے ایک
طرف بہہ جانے والے ذہن کو اس طرف موڑ دیا کہ
ہر پرانی چیز دقیانوسی اور قابلِ ترک ہے۔ پرانا
مذہب، پرانا اخلاق، حتیٰ کہ پرانا خدا بھی ہماری
جدید ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ خدا کا
اوّل تو کوئی بدیہی ثبوت موجود نہیں اور اگر ہو بھی
تو بس اتنا کافی ہے کہ اس کی پوجا کر لی جائے۔ انسان
کو اپنی مرضی پوری کرنے میں خودمختار رہنا چاہئے
اختیاری اخلاقی حدود، سماجی بندھن یا خدائی ہدایت
ان میں سے کوئی بھی فرد کے حقِ خوداختیاری سے
زیادہ محترم نہیں ہے۔
فرد کی آزادی کا یہ تصور جب فلسفہ اور
نظریہ کی بلندی سے اُتر کر اجتماعیات کی عملی آئین پر
آیا تو کچھ عملی دشواریاں پیش آئیں۔ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ انسان تنہا ہو تو ٹھیک ہے لیکن انہی آزاد
انسانوں کا جب سماج بنے تو کیا ہوگا؟

اکثریت

اس کا حل تجویز کیا گیا کہ اکثریت کی جو مرضی
ہوگی وہی چلے گی۔ اور ان کے منتخب کئے ہوئے
نمائندے چلائیں گے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اکثریت
کی رائے کے حق ہونے کی کیا ضمانت ہے۔ جواب
دیا گیا کہ اکثریت یعنی خواہشِ عام کبھی غلط چیز پر
جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اکثریت کی رائے ہونا
ہی اس کے صحیح ہونے کی کافی دلیل ہے۔ یہ نظریات
جب کامیاب ہوئے اور انہی بنیادوں پر جب
سیاسی نظام بن گیا تو پہلا نتیجہ تو یہ برآمد ہوا کہ پورا
یورپ جو مذہب کے واسطے سے ایک مرکز سے وابستہ
تھا وہ لامرکزیت کا شکار ہو کر منتشر ہو گیا۔ جب وہ

مرکز ہی نہ رہا تو اس سے وابستگی کیسی۔ جب ایک فرد دوسرے فرد کا تابع نہیں ہے تو ایک قوم دوسری قوم کی تابع اور ماتحت کیوں ہو؟

قوم اور جمہوریت

پھر منتشر افراد کو مجتمع رکھنے کے لئے ایک مرکز کی بہر حال ضرورت ہے اس لئے قومیت کا تصور پیدا ہو یعنی وہ تمام لوگ جو ملک میں رہتے ہوں یا ایک زبان بولتے ہوں یا ایک نسل سے تعلق رکھتے ہوں وہ ایک قوم ہیں اس طرح سے بنی ہوئی قوم کو سربلند ہونا چاہئے۔ اس قوم کا مفاد سب کا مطلوب مقصود ہونا چاہئے۔

دوسری قوموں سے مسابقت کرنا چاہئے جو چیز قوم کے لئے مفید ہے، وہی حق ہے۔ قوم کے مفاد پر فرد کے مفاد کو قربان کر دینا چاہئے یہاں پہنچ کر قومیت، نیشنلزم یا قوم پرستی بن گئی۔

یہ ہے جمہوری ریاستوں کا بنیادی تخیل اور اس کی مختصر سی تاریخ جس کو اس زمانہ کا انتہائی ترقی یافتہ آدرش کہا جاتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس کا کیا مقام ہے۔ اپنے اصل مقصد، فرد کی مکمل آزادی کے مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا اور نتائج کے اعتبار سے اس نے انسانیت کو کیا دیا۔ ہمارے خیال سے اس کی بنیاد میں حقیقت اور صداقت سے زیادہ فکر کی بلند پروازی کو دخل ہے۔ انسان کے فکر و عمل پر پابندیاں بدستور ہیں۔ صرف ان کی نوعیت بدل گئی۔ اس کا فکر و ضمیر کچھ آزاد تو ہوا لیکن آزادی سے زیادہ آوارہ ہو گیا اور نتائج یہ برآمد ہوئے کہ آج کسی ایک لیڈر کی بے احتیاطی اس معمورۂ ہستی کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔

ایسا نہیں کہ انسان مکمل آزاد رہنے سے کوئی خطرہ ہے لیکن تمام پابندیوں ہی سے آزاد ہو جانا انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح ہر پابندی سے آزاد ہو کر انسان ترقی تو کیا کرے گا، زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ محض مبالغہ آرائی نہیں بلکہ تجربہ سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اگر وہ خدا کی عائد کی ہوئی پابندیوں سے آزاد ہو گا تو اسے قومی مفاد کے نام سے عائد شدہ قیود و پابندیوں کو قبول کرنا ہو گا

طوقِ غلامی

کروڑوں انسانوں کا خدا کے نام پر چند انسانوں کے اغراض کے تابع ہو جانا یقیناً ظلم ہے لیکن کروڑوں آدمیوں کا قومی مفاد کے نام پر چند آدمیوں کی اغراض کے تابع ہو جانا کہاں کا انصاف ہے؟ آخر دونوں میں جوہری اعتبار سے فرق کیا ہے؟ ایک انسان اگر خدا کا نام لے کر ظلم کر سکتا ہے تو قومی مفاد کا نام لے کر کیوں نہیں کر سکتا؟ مختصر یہ کہ بیچارا انسان اس قدر تڑپنے اور پھڑکنے کے بعد بھی غلام کا غلام رہا۔ فرق یہ رہا کہ خدا کے خود ساختہ نمائندوں کی غلامی نہ کی۔ عوام کے خود ساختہ نمائندوں کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا۔ لطف یہ ہے کہ پہلے تو وہ سمجھتا بھی تھا کہ میں غلامی کر رہا ہوں لیکن اب غلام ہونے تک کا احساس نہیں رہا۔ وہی استبداد کا دیو جمہوریت کی قبا پہن کر ناچ رہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آزادی کی نیلم پری ہے۔ استبداد سے کم سے کم انسان کا درونِ خانہ تو محفوظ رہتا تھا جہاں اس کے سوا کسی کی مرضی نہیں چلتی تھی۔ راعی اور رعایا کے درمیان حقوق و اختیارات کی حد متعین تھی لیکن اب چونکہ راعی رعایا سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں ہے اس لئے حکومت کے اختیارات کی کوئی حد نہیں رہی۔ آدمی کا چولھا اور چکی تک حکومت کے اختیارات سے آزاد نہیں ہیں۔ کیونکہ حکومتیں ہر قدم قوم اور عوام کے فائدے کے لئے ہی اٹھاتی ہیں کہا گیا تھا کہ ہر فرد کو آزاد رہنا چاہئے لیکن عمل کی دنیا میں آ کر تسلیم کرنا پڑا کہ جبر کے بغیر کوئی نظام نہیں چل سکتا۔ فی الاصل جبر ہی کا دوسرا نام حکومت ہے ایسی صورت میں وہ فرد کی آزادی کیا ہوئی؟

موم کی ناک

یقیناً اتنا فرق ضرور ہو گیا ہے کہ پہلے جبر بے ڈھنگے پن کے ساتھ ہوتا تھا اس کا کوئی ضابطہ اور قانون نہیں تھا۔ زیادہ واضح الفاظ میں جبر کا فن نہیں تھا اور اب وہی جبر آئین و قانون کا جامہ پہن کر فن ہو گیا ہے۔ مگر جبر کے فن بن جانے سے اس کی حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اور کون نہیں جانتا کہ قانون ایک موم کی ناک ہے۔ جس کو قانون بنانے کا اختیار رکھنے والے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ فرد کی آزادی کے علمبردار کیا فرد کا یہ حق تسلیم بھی کرتے ہیں کہ وہ خودکشی کرے اگر نہیں تو کیوں؟ غرض یہ کہ جبر تو بہر حال ناگزیر ہے اس کے بغیر ان کو چارہ نہیں۔ بس یہی سوال رہ جاتا ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس چیز کا حق کس کو ہے عوام یا ان کے نمائندوں کو؟ یا کسی اور کو؟

فرد کی آزادی کا یہ تخیل بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا کہ افراد اخلاق کی حدود سے بھی آزاد ہو گئے۔ عورت عصمت و عفت کی حدود سے آزاد ہو گئی۔ عوام بادشاہ اور پوپ کے چکر سے چھوٹ گئے۔ مالدار لوگوں کو چھوٹ مل گئی کہ وہ عامۃ الناس کی نفسیاتی رگوں کو چھیڑ کر اور کمزوریوں کو ابھار کر کے خون چوستے رہیں۔ یہاں تک کہ ان گنت بندگانِ خدا کلیسا اور شہنشاہیت کی گرفت سے نکل کر بھی پھر خود غرض اور چالاک سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنس گئے جو اپنی ذہانت چالاکی اور دولت کی طاقت سے انہیں عوام کے نمائندے بھی بن گئے اور انہیں اپنے ہر ظلم کو قانون کی شکل دینے کا اختیار بھی ہے اور یہ اختیار

بھی ہے کہ اپنی دولت اور مفاد کی حفاظت کے لئے جب چاہیں کروڑوں عوام کو جنگ کا ایندھن بنا دیں۔

مقدس ڈکٹیٹرشپ

فرد کی اس بے لگام آزادی کا یہ ردِ عمل ہوا کہ کلیت پسندانہ رجحانات پیدا ہوئے محسوس کیا جانے لگا کہ انسان کی یہ مطلق العنانی آزادیٔ انسان کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے۔ فرد کی آزادی کو اجتماعی مفاد کا پابند ہونا چاہیئے کیونکہ دولت یعنی ذرائع پیداوار ہی فساد کی جڑ ہے۔ اس کی وجہ ایک فرد ذرائع پیداوار کی طاقت پا کر بیشمار انسانوں کو اپنی طاقت کا غلام بنا سکتا ہے۔ اس لئے اس دولت پر اجتماعی کنٹرول ہونا چاہیئے۔ افراد اپنے حقیقی مفاد کو نہ خود سمجھ پاتے اور نہ اس کی حفاظت کر سکتے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ عوام یعنی مزدوروں کی ایک مقدس ڈکٹیٹرشپ ہو جس کے اختیار میں افراد بھی ہوں اور ان کے ذرائع پیداوار بھی۔ جس طرح پہلے فرد کی بےلگام آزادی کے لئے کیلئے کچھ فلسفے گھڑ لئے گئے تھے۔ اسی طرح افراد کی اس جدید غلامی کے لئے بھی کچھ فلسفے گھڑ لئے گئے تاریخ کا ایک نیا فلسفہ بنا کر پیش کیا گیا کہ ہمیشہ سے افراد پیٹ اور روٹی ہی کے لئے لڑتے رہے ہیں اور یہی ایک چیز اس قابل ہے کہ اب بھی اس کیلئے آدمی کو لڑنا اور مرنا چاہیئے۔

انسان تاریخ کے اس جدلی عمل کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہے اور جدلی عمل کے درمیان سے اس کے ارتقاد کا راستہ نکلتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نظریے کے علمبردار طاقت اور ذرائع پیداوار پر قابو پا کر وہی سب کچھ کیوں نہیں کریں گے جو سرمایہ دار کرتا ہے کیونکہ اس فلسفہ کی رُو سے انسان فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے تو اس کے جواب میں ایک صوفیانہ طرز کی خیالی چیز پیش کی جاتی ہے کہ جب لوگوں کا مزاج اس نظام کے مطابق [illegible] اور دنیا بھر میں اشتراکی طرز کی حکومتیں قائم ہو جائیں گی تو پھر سرے سے حکومت ہی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور یہ ڈکٹیٹرشپ درخت کے سوکھے پتوں کی طرح خود بخود جھڑ جائے گی۔

ہلاہل اور قند

لیکن تجربہ بتا رہا ہے کہ یہ ڈکٹیٹرشپ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ جو لوگ اس قدر بے تحاشا طاقت پانے کے بعد بھی اتنے نیک بن جائیں گے کہ خود بخود اپنی حاصل شدہ خدائی سے دستبردار ہو جائیں خصوصاً جبکہ انہیں کسی بالاتر طاقت پر یقین بھی نہیں ہے۔ یہ بات تو ابھی سمجھ میں نہیں آتی بہت ممکن ہے کہ کبھی اس "مادی تصوف" کی یہ منزل بھی آ جائے واقعات کی دنیا میں جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنا مکمل بندہ بنا لینے کی اس سے بہتر شکل ابھی تک ایجاد نہیں ہوئی۔ انسان دوسرے بے شمار انسانوں کو بند کر کے رکھنے کے لئے اس سے بہتر قید خانہ اب تک نہیں بنا سکا تھا۔ جہاں انسان ظلم کے خلاف چیخ بھی نہ سکے۔ اس کے باوجود جس طرح پہلے بارہا انسان اپنے لئے بیڑیاں بنانے میں سرگرمی دکھا چکا ہے اسی طرح آج بھی اس ماڈرن جیل کی تعمیر میں سرگرمی دکھا رہا ہے اور اس کا نام اشتراکیت رکھا ہے۔ لیکن زہر کی بوتل پر محض شہد کا لیبل لگا دینے سے زہر شہد تو نہیں بن جایا کرتا۔ یہ اشتراکیت تو اس بے قید جمہوریت کا ایک ردِ عمل ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسی بے شمار چیزیں اس کے اندر ملیں گی جو اندر ہی اندر انسانیت کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔

اکثریت کی حقیقت

اگر آزادی و جمہوریت کی عملی شکلوں کو غائر نظر سے دیکھا جائے تو اس میں بہت سے جھول ملیں گے جو انسانیت کے جانے پہچانے اور مسلمہ اصولوں کے خلاف تو ہیں خود ان کے اصولوں کے خلاف بھی ہیں، مثلاً یہ کہ جمہوری اصول کی رُو سے حکومت کو اکثریت کا نمائندہ ہونا چاہیئے لیکن طریقِ انتخاب کا طریقہ ایسا ہے کہ جو ایک اقلیت اور نہایت قلیل اقلیت کو بھی چند افراد کے مسعود کر دیتا ہے ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ ایک حلقہ میں اگر سو رائے دہندگان ہیں اور دس امیدوار کھڑے ہیں تو جس کو گیارہ ووٹ مل جائیں گے وہی کامیاب ہو جائے گا۔ کیا سو میں سے گیارہ رائیں اقلیت نہیں ہیں؟ یا اس نظام میں سکریٹری اور ڈائرکٹر کے لئے انجینئر اور ڈاکٹر کے لئے کمشنر اور کلکٹر کے لئے منشی کے لئے اور اہلکار کے لئے بھی کسی کوالیفیکیشن کی ضرورت اور شرط ہے لیکن وزیر اور وزیر اعظم کے لئے جو پورے کسی صوبے یا ملک کو چلانے کی ذمہ داری ہے کسی کوالیفیکیشن کی ضرورت نہیں۔ ایک شخص آج دکان پر بیٹھا ہوا پان لگا کر بیچ رہا ہے اگر وہ چیخنے کے فن سے بھی واقف ہے تو کل جا کر کسی جماعت کا ممبر بنے گا اور پرسوں وزیر کی حیثیت سے کسی کارخانے یا ہسپتال کا افتتاح کر رہا ہوگا۔ پھر چونکہ یہاں تمام تر بنیاد عوام کے ووٹوں پر ہے اس لئے ان کے چھپے ہوئے اور دبے ہوئے تعصب کو برابر ہوا دی جاتی رہتی ہے۔ عوام کے جس حصے کے بھڑک اٹھنے کی امید ہو اسے چھیڑ کر ووٹ حاصل کی جائیں تاکہ ان کی مدد سے اسمبلی اور وزارت تک رسائی میں کامیابی ہو۔

اس طرح آزادیٔ جمہور کی یہ خیالی جنت ہر وقت اغراض و خواہشات کے جہنم میں جلتی رہتی ہے

الحاد کا اندھیرا

اب اگر ایک شخص سمجھنا چاہے تو پچھلے تجربات اور روزمرہ کے واقعات اس کو یہ حقیقت سمجھانے کے لئے کافی ہیں کہ انسان نے آزاد ہونے کے لئے جتنے بھی ہاتھ پیر مارے اتنے ہی غلامی کے پھندے کستے چلے گئے عقل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ انسان بالکل آزاد اور شتر بے مہار ہو کر نہیں رہ سکتا اسے کسی نہ کسی کی بندگی کرنا ہی پڑے گی۔ یہاں سوال آزادی اور غلامی میں سے

ڈاکٹر اعجاز حسین

چکبست کا جذبۂ وطن پرستی

کبھی کبھی خوبیاں بھی خرابیاں ہو جاتی ہیں ۔
چنانچہ ہندوستان کی وسعت جو اسکی عظمت کا سبب ہے ایک زمانے میں تکلیف دہ ہو گئی تھی ۔ اول تو بدیسی حکومت کی ساحری ایسی زبردست تھی کہ سارا ملک صدیوں گہری نیند میں سوتا رہا اور پھر جب سیاسی رہنماؤں نے یہ طلسم توڑ کر بیدار کرنا چاہا تو ایک حصہ ملک کا جاگتا تھا تو دوسرا سو جاتا تھا ۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیداری کی لہر اپنا کام نہ کر سکی ۔ عرصے تک مختلف سیاسی تحریکات آزادی کے لئے ابھرتی رہیں ۔ مختلف صوبوں سے سیاسی رہنما آوازیں بلند کرتے رہے مگر ہر حصۂ ملک سے لبیک کی صدا یکساں نہ آئی ۔ ہاں اتنی مدت کی کاوش سے یہ ضرور ہوا کہ ہر جگہ متحدہ ہندوستان میں ایسے افراد کی تعداد اتنی ہو گئی کہ باوجود عام بے حسی کے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ملک و وطن کی بے حسی پہ جیسے ساری آبادی کو جوش آ گیا ہو بیداری سے زیادہ تر ان ہی افراد کی کوششوں کا نتیجہ تھا ، انہی کی تحریر و تقریر پختہ خیالی اور خلوص کا [illegible] آزادی کی تحریک پروان چڑھی اور دھیرے دھیرے پورے ملک میں پھیل گئی انہیں مخصوص افراد میں پنڈت برج نرائن چکبست بھی تھے ۔

ان کی ولادت ۱۸۸۲ء اور وفات ۱۹۲۶ء میں ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب رفتہ رفتہ تحریک آزادی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی ایک خاص سطح پر آ گئی تھی ۔ سارا ملک مہاتما گاندھی کی قیادت میں آخری منزل کے قریب پہنچ رہا تھا ۔

چکبست کا جذبۂ وطن پرستی کسی ہیجانی کیفیت کا نتیجہ نہ تھا ان کا شعور تدریجی ترقی حاصل کرتے کرتے اب اس سطح پہ آ گیا تھا کہ وہ اس طرح باتیں کرنے لگے تھے ~

ہیں باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمن روزگار کو !!!

لیکن اس سے بہت پہلے بھی انکے دل میں آزادی کا جذبہ کروٹیں لے رہا تھا ۔ جس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم انکے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہیں ۔ غزل جو زیادہ تر حسن عشق کی داستان سمجھی جاتی ہے ۔ وہ بھی چکبست کے اس ذہنی شعور کی نشان دہی کرتی ہے ۔ انکی غزلوں میں کسی ایسے معشوق کا پتہ نہیں چلتا جس پر ہمارے شعراء ایک مدت سے طبع آزمائی کر رہے تھے اس کاوش میں کسی سال کی بھی قید نہ تھی چھوٹے بڑے سبھی اسکی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن چکبست کے ہاں [illegible] کی جستجو ہے ورنہ اس انداز میں ناحق کی صدائیں جہاں سے بھی ان کا کلام پڑھئے جس غزل کو بھی دیکھئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چکبست کے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جس نے ہندوستان اور انسان کو اپنا محبوب بنا لیا ہو وہ بلا قید مذہب و ملت آدمی کو آدمی سمجھتے تھے ان کا یہ شعور احساس کی بنیاد پر تھا کہ ہندوستان کو آزاد ہونا ہے تو سب سے پہلے آدمی کو آدمی سمجھنا پڑے گا ۔ اور آدمی کی تعریف وہ جن الفاظ میں کرتے ہیں وہ شعر کا جامہ پہن کر ضرب المثل ہو گیا ہے ~

درد دل پاس وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

اسی قسم کا خیال ایک جگہ اور ملاحظہ ہو ~

کچھ بڑی بات نہیں صاحب دوراں ہونا
آدمی کے لئے معراج ہے انساں ہونا

ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان میں غدر کے بعد اصلاحی تحریک مختلف فرقوں میں شروع ہو گئی اس کے ساتھ ساتھ اخلاق کی درستی اور صالح اقدار کی جستجو میں ہر رہنما منہمک رہا ۔ اس کے بعد سیاسی تصور نے رنگ پکڑا کبھی یہ مانگ ہوئی کہ کچھ ملازمتیں ہندوستانیوں کو دی جائیں اور کبھی اس پہ زور رہا کہ کونسلوں میں ہندوستانی ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آئی کہ بغیر آزادی کے ہندوستان کو فلاح و بہبود نصیب نہ ہوگا چنانچہ آزادی کے لئے ہر کمزوری اور قوت ہندوستانیوں کو یاد دلائی جانے لگی ۔ جس سے لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ اپنے وطن سے محبت اور خستہ حالی کا احساس شدید تر ہو جائے ۔
چکبست نے بھی ایسے رہنماؤں کی آواز میں آواز ملانا شروع کیا ۔ کبھی ہندوستانیوں کی غفلت [illegible] اور کبھی یہاں کی قدیم عظمتوں کا ذکر کر کے طبیعتوں میں امنگ اور حوصلے کی لہریں دوڑانے کی فکر کی ۔ مثلاً ~

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بے کار ہے
طرز ہندو دیکھ کر رنگ مسلماں دیکھ کر
انتشار قوم سے جاتی رہی تسکین قلب
نیند رخصت ہو گئی خواب پریشاں دیکھ کر
شاد ہیں ناشاد ہیں ہم خانماں برباد ہیں
ہم سے اچھے ہیں کہ یہ وحش و طیور آزاد ہیں
ملک میں دولت نہیں باقی دوا کے واسطے
ہاتھ خالی رہ گئے ہیں اب دعا کے واسطے

کبھی ہندوستان کی عظمت دیرینہ یاد دلا کر نیم بیدار قوم کو بے خبری کی دنیا سے باہر لانے کے لئے کہتے ہیں ~

کرتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی تاراجی کے بغیر نیوکلر جنگ نہیں لڑی جا سکتی۔ لیکن ان کا استدلال یہ ہے کہ نیوکلر اسلحہ کی دہشت سے جو توازن پیدا ہوا ہے وہی امن کی برقراری کا ضامن ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ ایسا غیر یقینی توازن کب تک برقرار رہ سکتا ہے اور تباہی کب تک ٹل سکتی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کوریا اور انڈوچائنا کی لڑائی میں امریکہ کے فوجی جنرلوں اور دیگر سیاسی قائدین نے ایٹم بم استعمال کرنے کی اجازت طلب کی تھی اور گذشتہ سال مغربی برلن کے مسئلہ پر جو بحران پیدا ہو گیا تھا اس وقت واشنگٹن سے یہ پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ صدر کینیڈی نیوکلر جنگ سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

نیوکلر اسلحہ کی دہشت سے توازن پیدا کرنے کی پالیسی زیادہ خطرناک امکانات پیدا کر سکتی ہے۔ اس میں اتفاقیہ طور پر جنگ کے شروع ہونے کے امکانات شامل ہیں۔ بعض ماہرین ان امکانات کو زیادہ قوی تصور کرتے ہیں۔ وہ مسٹر سی، پی، اسنو، کے اس خیال سے متفق ہیں کہ اگر نیوکلر اسلحہ بندی کی دوڑ کو نہیں روکا گیا تو اس سے کسی بھی منزل پر نیوکلر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔ اس کے علاوہ معمولی سا تصادم بھی نیوکلر جنگ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

نیوکلر جنگ کے امکانات اور اس کے ہولناک نتائج کے احساس نے ساری دنیا میں اسلحہ بندی کی مہم کو مضبوط بنا دیا ہے۔ خونریز طاقتیں بھی ترکِ اسلحہ کی راہیں تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ مغرب اور مشرق کے درمیان ترکِ اسلحہ کی بات چیت ۱۹۵۱ء سے اب تک مختلف مراحل سے گذر چکی ہے۔ اس راہ میں کئی بار تعطل پیدا ہوئے اور ٹوٹ گئے۔ بالآخر گذشتہ سال امریکہ اور روس نے مکمل اور عام ترکِ اسلحہ کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔

عالمی امن کونسل

عالمی امن کونسل ابتدا ہی سے نیوکلر ترکِ اسلحہ کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنے اور اس غرض سے رائے عامہ کو مستحکم بنانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں عالمی امن کونسل نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ تمام بڑی طاقتیں نیوکلر ہتھیاروں کو ممنوع قرار دینے سے اتفاق کر لیں اور متفقہ بنیاد پر اسلحہ میں تیزی سے کمی کی جائے معائنہ اور کنٹرول کے انتظام کے ذریعہ اس کی نگرانی کی جائے تمام اسلحہ اور ایٹم بموں کی گنتی کی جائے۔ ان تجاویز کو اگر قبول کر لیا جاتا تو آج دنیا زیادہ محفوظ اور زیادہ مسرور رہتی لیکن ان تجاویز کو قبول نہیں کیا گیا۔

نیوکلر اور عام ترکِ اسلحہ کے بارے میں امن کونسل کی تجاویز کے قبول نہ کئے جانے کا سبب مسٹر فلپ نوئل بیکر کے الفاظ میں یہ ہے کہ مغربی ممالک خود کو اسلحہ میں کمی کرنے کے اصول اور بالخصوص نیوکلر بم کو ختم کرنے کا پابند بنانے کے لئے کبھی بھی آمادہ نہیں ہوئے۔ جہاں تک روس اور اس کے حلیف ممالک کا تعلق ہے وہ معائنہ اور کنٹرول کے طریقے کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار ہیں۔ بشرطیکہ اس کا مقصد، ترکِ اسلحہ ہو۔ البتہ ترکِ اسلحہ کے عمل کے آغاز سے قبل انہوں نے معائنہ اور کنٹرول کے انتظام کو قبول کرنے سے اتفاق نہیں کیا کیونکہ انہیں سُراغ رسانی اور جاسوسی کا اندیشہ تھا۔

روشن امکانات

دنیا میں چونکہ فوجی صورتِ حال میں تبدیلی ہو چکی ہے۔ اس لئے وقت کا تقاضہ صرف یہی نہیں ہے کہ نیوکلر بم پر امتناع عائد کیا جائے بلکہ ان بموں کو منتقل کرنے والے وسائل پر کنٹرول قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ جنیوا میں ترکِ اسلحہ اور امتناعِ نیوکلر اسلحہ کے مسئلہ پر جو بات چیت ہوتی رہی ہے اس میں بھی یہ سوال زیرِ بحث رہا۔ اس بات چیت میں روس اور امریکہ نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان میں اختلاف اور تضاد ہے۔ امریکہ چاہتا ہے کہ ان مسائل پر سست روی کی پالیسی اختیار کی جائے اس کے برخلاف روس عام اور مکمل ترکِ اسلحہ کے مقصد کو جلد حاصل کرنے کے لئے چند مرحلوں کے اندر ہی اس کام کو مکمل کرنے پر زور دے رہا ہے۔ اس اختلاف کے باوجود بھی ترکِ اسلحہ کی بات چیت کی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ دونوں بلاکوں نے ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے رعایت برتنے کی پالیسی پر بھی عمل کیا ہے۔ اس میں مزید مفاہمت اور رعایت کے روشن امکانات نظر آتے ہیں۔

بعض حکومتیں جلد از جلد ترکِ اسلحہ کا مقصد کسی بھی شرط پر حاصل کرنے سے اتفاق نہیں رکھتیں۔ لیکن ہر ملک کے عوام ایسا چاہتے ہیں۔ البتہ انہیں ایسا طریقہ معلوم نہیں ہو سکا جس کے ذریعے وہ اپنی خواہشات اور رائے کو اس کے حصول میں موثر بنا سکیں۔ اس کے لئے انہیں عالمی امن کونسل کا پلیٹ فارم استعمال کرنا چاہئے تاکہ ترکِ اسلحہ کی گفتگو میں جو سستی پیدا ہو گئی ہے اس میں سرعت اور تیزی پیدا ہو اور معائنہ کا کام سہل ہو سکے۔

دنیا نیوکلر طاقتوں کے مسلح کیمپوں سے بڑی ہے عالمی امن تحریک نے دنیا کے بڑے حصے میں ترکِ اسلحہ کے حصول کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مدد دی ہے حقیقی معنوں میں پُر امن بقائے باہم کی راہ میں اسلحہ بندی ہی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ پُر امن بقائے باہم سے ان قوتوں کو جو مفلس ممالک کا استحصال کرتے ہیں فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس سے ساری دنیا کے عوام کو فائدہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے معاشی فلاح و بہبود کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے نیوکلر ترکِ اسلحہ ایسی ضرورت بن گئی ہے جس کی تکمیل سے ساری دنیا اور بالخصوص ترقی پذیر اور کم ترقی یافتہ ملکوں کی ترقی اور خوشحالی وابستہ ہے۔

(ترجمہ: سری نواس لاہوٹی)

ایک اسٹیشن ماسٹر نے ٹرین میں ایک قتل کی واردات بیان کرتے ہوئے لکھا۔

"قاتل پلیٹ فارم سے داخل ہوا۔ مسافر کے پیٹ میں چاقو گھونپا اور دوسرے دروازے سے ریل کی پٹری پر کود پڑا۔ اس طرح اس نے ریلوے قانون کی خلاف ورزی کی۔"

اچھی کہانی برا انجام

اسمٰعیل لطیف

لہروں کے نشانات ساحل پر روزانہ بنتے رہتے ہیں۔ ایک لہر آکر کوئی نشان بناتی ہے تو دوسری کچھ دیر بعد اُس کو مٹا کر اپنا نشان بنا دیتی ہے۔ انسان کے سکون کا بھی یہی حال ہے۔ صدیوں سے انسان سکون کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ سیکڑوں اصول سکون حاصل کرنے کے لئے بنائے گئے۔ دھرتی پر مہان پُرش موسموں کی طرح آتے رہے اور سکون حاصل کرنے کی راہوں کی نشان دہی ہوتی رہی۔ لیکن یہ سب لہروں کے نشانات کی طرح ہوتا رہا۔ ہر نئی لہر آتی گئی اور پرانے نشانات مٹتے گئے۔

اسی لئے میں سکون کا متلاشی کبھی نہیں رہا۔ سکون کو میں خود لذتی کا دوسرا دلفریب نام سمجھتا ہوں۔ سکون تو محض ایک اضافی جنس ہے۔ اضافی جنس کا لین دین یا نفع نقصان ایک خام خیالی کے سوا کچھ نہیں

میں کہانیاں لکھتا ہوں اور لوگ میری کہانیوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مجھے ایک عظیم افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔ جو کہانیاں میں نے لکھی ہیں وہ میری بےچینی کی دین ہیں۔ اگر میں سکون کا متلاشی ہوتا تو ایک بھی کہانی نہ لکھ پاتا۔ دنیا کے اس وسیع ساحل پر بےشمار انسانی لہروں سے کئی نشانات اُبھرتے ہیں۔ میں اُنہیں دیکھتا ہوں۔ جس سے میری بےچینی بڑھ جاتی ہے۔ اور میں کسی ایک نشان کو منتخب کرتا ہوں۔ کچھ تراش خراش اور سنوارنے کے بعد لوگوں کے سامنے اس کے نقوش پیش کر دیتا ہوں اور یہ میری تخلیق کہلاتی ہے۔

اسی طرح میں نے کئی کہانیاں لکھیں اور میں یہ سمجھتا رہا کہ یہ ساری کہانیاں دوسروں کی ہیں۔ میری اپنی کوئی کہانی نہیں۔ کچھ دنوں پہلے میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ وہ کہانی نہ جانے کس طرح میری اپنی کہانی بن گئی۔!؟ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے میں نے ہر کہانی اپنے شعور کے اُجالے کو ختم کرنے کے بعد لکھی تھی۔ تاریک پردوں کے پیچھے کوئی بیٹھا مجھ سے کہانیاں لکھواتا رہتا تھا۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری ہر تخلیق میری اپنی کہانی تھی۔ میں نے دوسری لہروں کے نشانات کو اپنی لہروں سے مٹا دیا تھا۔

جب میری کہانی شائع ہوئی تو بےحد پسند کی گئی۔ میرے پاس سیکڑوں تعریفی خطوط آئے میں اپنی تخلیق پر بہت خوش ہوا لیکن مجھے ایک خط ایسا موصول ہوا جس نے میرے سرور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اب اپنی تخلیقات پر کبھی مسرت کا اظہار نہ کر سکوں گا۔ خط کے متعلق مزید کچھ بتلانے سے پہلے وہ کہانی لکھتا ہوں جسے میری بہترین کہانی قرار دیا گیا۔ وہ کہانی یوں تھی۔

ایک راجا تھا۔ اس کی ایک رانی تھی رانی بےحد حسین اور دنیاوی خوبیوں سے مالا مال تھی راجا کے پاس دنیا کی ہر راحت اور عیش کے سامان موجود تھے۔ اگر نہ تھا تو بس اُس کی زندگی میں سکون نہ تھا۔ راجا خود بھی نہیں جانتا تھا کہ آخر اس کی زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ بےچین رہا کرتا تھا لیکن رانی اس بات سے بےخبر تھی۔ وہ تو راجا کو اپنے دل و جان سے چاہتی تھی۔ چاہت میں تو سکون کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لئے رانی ہر چیز سے انجان ہو کر محبت کئے جا رہی تھی۔ رانی کی محبت اتنی شدید تھی کہ وہ اپنے سے بھی بےخبر تھی۔

ایک دفعہ راجا شکار کے لئے گیا۔ وہ شکار کو کیا گیا کہ وہاں سے لوٹ کر ہی نہ آیا۔ جانے کیا ہوا؟ وہ شاید خود شکار ہو گیا۔ شاید موت کا شکار ہو گیا ہو۔ دنیا میں انسان کا کسی بھی وقت کسی کے شکار ہو جانے کا امکان رہتا ہے۔ راجا کو بہت تلاش کیا گیا۔ جب ہر تلاش بےسود ثابت ہوئی اور راجا کا کوئی پتہ نہ چلا تو یہی سمجھ لیا گیا کہ راجا موت کا شکار ہو گیا اور اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

رانی کی دُنیا اُجڑ گئی اُس کی محبت کا چراغ بُجھ گیا اور ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ اب یہ عیش و مسرت کے سامان تاریکی میں کس کام کے؟ اُجالے کے سامان اندھیرے میں تاریک سائے بن جاتے ہیں۔ جب ساتھی ہی بچھڑ گیا تو خوشیوں سے کیا واسطہ خوشیوں کا وجود تو کسی کے دم سے ہی محسوس ہوتا ہے۔ تنہا خوشیاں منانے والے ہی پاگل کہلاتے ہیں۔ رانی نے زندگی کی آسائشوں سے منہ پھیر لیا۔ وہ تمام راحتوں کو چھوڑ کر جنگل جنگل ہرنی کی طرح بھٹکتی رہی۔ ایک دن وہ جنگل کے ایسے مقام پر پہنچی جس کی صنّاعی میں قدرت نے خاص اہتمام سے کام لیا تھا۔ یہ مقام بےحد دلکش تھا۔ رانی کے بےچین دل کو اُس مقام کی دل کشی نے موہ لیا۔ اور وہ اسی مقام پر رہنے لگی۔ انسان کے دکھ فطرت کے حسین نظاروں میں گم ہو جاتے ہیں یہ بلند اور خاموش پہاڑ، یہ گنگناتے ہوئے رواں دواں چشمے، یہ مہکتے ہوئے پھول انسان کے دکھوں

کو پھیلا دیتے ہیں۔ جب تک پھیل جاتے ہیں تو قوس قزح بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں۔

اُسی جگہ رانی نے ایک خوبصورت پتھر دیکھا۔ رانی نے اُس پتھر کو تراشا اور راجا کا مجسمہ بنایا اب رانی دن رات راجا کے مجسمے کے پاس بیٹھی اپنے جذبات کی دھاروں سے راجا کے تصورات ڈھالتی رہتی۔ اُس کے جذبات اسی طرح اُمڈتے اور بہتے رہتے۔

پھر ایک دن وہ راجا نہ جانے کہاں سے نکل آیا۔ راجا نے اپنے مجسمے کے سامنے اپنی رانی کو تڑپتے ہوئے پایا۔ وہ یہ منظر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا اور اپنے دل میں یہ کہتے ہوئے واپس لوٹ گیا کہ پتھر سکھ پجاریوں کو پتھر کے صنم ہی کافی ہیں

یہ تھی وہ کہانی اور اُس کا انجام۔ لیکن اس کا انجام کسی اور طرح ہوا۔ جو خط مجھے سب سے آخر میں مجھے موصول ہوا وہی اس کہانی کا انجام بنا۔ یہ خط میری منگیتر نے لکھا تھا۔ وہ کشمیر کی حسین وادیوں میں اپنی زندگی کے کچھ دن گزارنے گئی تھی۔ اُس نے مجھے لکھا تھا۔

آپ کی بہترین کہانی پڑھی۔ کہانی کیا ہے آپ کے جذبات کی صحیح عکاسی ہے۔ لیکن میں اس کہانی کے لئے آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتی کیونکہ ... کہانی نے میرے رُومان انگیز خیالات کو سرد کر دیا میرے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی ہے۔ مجھے اس بات کا احساس پہلے کبھی نہ تھا کہ دنیا میں محبت کا اس طرح مذاق بھی اُڑایا جا سکتا ہے۔ کہانی لکھنے والے پیار اور محبت کو افسانے کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔

میں آپ سے اُسی رانی کی طرح محبت کرتی تھی۔ میرے دل کی دُنیا کے آپ راجا تھے۔ میرے من مندر کے دیوتا تھے۔ محبت ہی پتھر کو بھگوان بنا دیتی ہے۔ لیکن آج مجھ پر اس خیال کی حقیقت ظاہر ہوئی کہ جس نے پہلی بار مورت بنائی تھی اس کا مقصد بھگوان کو بنانا نہ تھا بلکہ وہ تو بھگوان کی سنگدلی کو ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن لوگوں نے بُت کو خدا سمجھ لیا تو اس میں سنگ تراش کا کیا قصور؟

یہاں کشمیر کی وادیوں میں ہر جگہ فطرت کی حُسن کاری میں میں نے محبت کی روانی دیکھی۔ میرے دل نے جو محبت کی دُنیا بسائی تھی اُسے میں افسانہ بنتے نہیں دیکھ سکتی۔ جب مرد یہ نہیں چاہتا کہ اس کی مورت کو کوئی عورت پوجے تو عورت بھی اپنے لئے تاج محل کی خواہش کیوں کرے!

میری دعا ہے کہ آپ اپنی کہانیوں کی دُنیا میں مسرور رہیں۔ میرا کیا میری بنائی ہوئی مورت اگر آج کسی نے توڑ دی تو کل دوسری مورت بنا لونگی۔

یہ ہے خط کا خاتمہ اور میری کہانی کا انجام۔

ایک حسین لڑکی ماہر نفسیات کے پاس گئی اور کہا۔

"آپ خیال کریں گے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں لیکن میں ہمیشہ اپنی چھتری کھو دیتی ہوں۔ دیکھئے نا ایک سال میں میری بارہ چھتریاں کھو گئیں۔"

○

جج نے سختی سے کہا۔

"تم راہ گیروں کے لئے ایک مستقل خطرہ ہو۔ تمہارا لائسنس دو سال کے لئے ضبط۔"

"مگر حضور میری زندگی کا دارومدار اسی پر ہے۔"

"اور راہگیروں کی زندگی کا بھی۔"

○

ایک انگریز اور ایک امریکن میں بحث ہو رہی تھی۔ انگریز نے جوش میں آ کر کہا۔ "آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ انگریزوں کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا۔"

امریکن نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ بھی خدا کی مصلحت ہے۔ ورنہ وہ اندھیرے میں ساری دنیا کو لوٹ لیتے۔"

عبدالمجید آزاد

غزل

ہر ایک سینے کو سوزِ درد سے معمور ہونے دو
یونہی ظلمت گہہ ہستی کو کچھ پُر نور ہونے دو

سر دار و رسن اب زندگی کے گیت گانا ہے
مزہ جب ہے کہ ہر دل کو دلِ منصور ہونے دو

صلہ اے میکشو! پا کر ہو گے تشنہ کامی کا
طبیعت کو مئے غم سے ابھی مخمور رہنے دو

یہ کچھ دن اور ہے دورِ امارت اے وطن والو
نظامِ بزمِ عالم کو ذرا جمہور رہنے دو

دلِ آزاد اک دن بندشِ غم توڑ ہی دے گا
یہ شاہیں ہے اسے پرواز پر مجبور ہونے دو

مکتوباتِ سلیمانی

کے حواشی کی چند مزید گلکاریاں

مکتوباتِ سلیمانی (مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی، مدیر صدقِ جدید) میں تقریباً ایک ہزار حواشی ہیں۔ ان میں ایک چوتھائی کے قریب غیر ضروری ہیں۔ یہ ایک چوتھائی حواشی یا "ثنائے خود" کے لئے وقف ہیں، یا قارئین کتاب کو مرعوب کرنے کے لئے یا کتاب کا حجم بڑھانے کے لئے۔ فاضل مرتب نے بعض ضروری حواشی چھوڑ دئے ہیں۔ اگر وہ غیر ضروری حواشی کے بدلے ان ضروری حواشی کو لکھتے تو کتاب کا حجم بھی ان کی خواہش کے مطابق ہوتا، ان پر غیر ضروری حواشی لکھنے کا الزام بھی نہ لگتا اور قارئینِ کتاب کو بعض اہم معلومات بھی حاصل ہو جاتیں۔ ذیل میں مثالاً چند حواشی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن کا لکھنا ضروری تھا:

ص۱۵! بی جی ہارنیمن کی اعلیٰ صحافت نگاری بیباکی وجرأت اور ہندوستان دوستی کا ذکر ضروری تھا۔ موجودہ نسل ان کے نام سے بھی ناآشنا ہے۔

ص۲۹ سید صاحب اپنے مخلص دوست سے پوچھتے ہیں:

"عمر خیام کا جواب آپ نے پسند فرمایا!"

یہ جملہ سید صاحب نے ایک نوآموز مضمون نگار کی طرح اپنے دوست سے داد لینے کیلئے نہیں لکھا تھا بلکہ یہ جواب یا مضمون ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق مولانا کو حاشیہ ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو و فارسی کے مشہور محقق مرحوم حافظ محمود خاں شیرانی، مولوی عبدالحق (مرحوم) کے ایما سے مولانا شبلی کی شعرالعجم پر مفصل و مسلسل تنقید رسالہ اردو میں لکھ رہے تھے خیام سے متعلق کسی وجہ سے انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر محمد اقبال (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) سے تنقید لکھوائی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا نہایت مبسوط و مدلل جواب لکھا جو معارف میں شائع ہوا اور جس کی داد خود تنقید نگار نے دی۔ جو غیر معمولی اسباب کی بنا پر یہ جواب لکھا گیا ان کے علاوہ اس کی ایک علمی ادبی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہیں سے سید صاحب کو خیام سے خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور برسوں کی تحقیق کے بعد انہوں نے اپنی وہ معرکہ آرا تصنیف اہلِ علم وادب کے سامنے پیش کی جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے انہیں لکھا تھا کہ خیام پر اس پایہ کی کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں۔

ص۲۴۳ سید صاحب نے لکھا تھا کہ

"مولانا حمید الدین صاحب فراہی کی تفسیر کا اردو ترجمہ تو مولانا کی زندگی میں ہو نہیں سکتا کیونکہ ان کو اکثروں کا ترجمہ پسند نہیں۔"

مولانا حمید الدین فراہی (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے زہد واتقا تبحرِ علمی، فضل وکمال، نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کے باوجود نہ اپنی زندگی میں مشہور و معروف ہو سکے نہ اب ہیں یہاں تک کہ متوسط طبقہ کا علمی حلقہ شاید ان کے نام سے بھی واقف نہ ہو۔ مولانا دریابادی کو مولانا سے مرحوم سے کوئی کدبھی نہیں ہے (جیسے بعض فضلاء سے رہا ہے یا ہے) بلکہ وہ ان کے عقیدت مند ہیں اس لئے ان کو مولانا کی علمی عظمت اور شخصی برگزیدگی اور خصوصاً ان کی قرآن فہمی اور تفسیرِ نظام القرآن سے متعلق چند جملے نہیں بلکہ کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہئے تھا۔ پھر انہیں یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ مولانا کی وفات کے بعد کئی سورتوں کا ترجمہ اردو میں انہی کے ایک شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا اور وہ شائع بھی ہو چکا ہے، بلکہ بعض سورتوں کے ترجمے کے دو دو، تین تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تفسیرِ ماجدی کی تکمیل کے بعد تفسیرِ نظام القرآن ان کی نظر سے گر گئی اور مولانا کی جو عزت ان کے دل میں تھی وہ کم ہو گئی۔

ص۲۸۴ مولانا عبدالماجد حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"بمبئی میں لیکچر پچھلے سال سید صاحب دے آئے تھے"

یہ لیکچر کوئی رسمی قسم کا وعظ تو نہ تھا جو مولانا نے اس کا ذکر اس سرسری انداز سے کر دیا۔ بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر سید صاحب نے عربوں کی جہاز رانی جیسے اہم موضوع پر مسلسل چار خطبے دئے تھے۔ ان خطبات کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہیں بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے اسی زمانے میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی نکل چکا ہے۔

ص۲۹۶ سید صاحب نے ارقام فرمایا تھا کہ۔

"پیغامِ صلح کا تراشہ دیکھا۔ تعجب ہے کہ اہلِ لاہور و قادیان نے اس کی اشاعت میں دیر کی۔"

یہ کوئی اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے متعلق مولانا کو حاشیہ لکھنا چاہئے تھا۔ شاید اس کی مصلحت کوشی نے انہیں اس سے باز رکھا ہو۔ اور اگر مولانا یہ کہیں کہ یہ تلمیح اب ذہن میں نہیں رہی تو انہیں یہ بتلا دینا چاہئے تھا۔ اس قسم کی متعدد مثالیں کتاب میں موجود ہیں۔

بعض حواشی میں فاضل مرتب نے ضرورت سے زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ اس اختصار کے

باعث بیان میں غلطی بھی ہو گئی ہے مثلاً۔

ص۲۷۳ پر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا ایک خط میں ذکر آگیا ہے۔ مولانا نے حاشیہ میں صرف اتنا لکھا ہے
"پرنسپل جامعۂ ملیہ"۔
گویا ڈاکٹر صاحب اس وقت بھی جامعہ ملیہ کے پرنسپل ہیں۔ پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ ذاکر صاحب پرنسپل کبھی نہیں کہلائے۔ وہ شیخ الجامعہ تھے۔ جس کے خلوص و اخلاق نے انہیں پٹنہ اور دہلی کی سیر کروائی اس کے سابق عہدہ سے ناواقفیت اور اس کے متعلق اس قدر اختصار باعث حیرت ہے۔

ص۲۹۱ پر مولانا دریابادی نے مندرجۂ ذیل حاشیہ لکھا ہے۔
"شاہ معین الدین اس وقت رفیق دارالمصنفین تھے۔ موجودہ مدیر معارف، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی"۔
گویا اب شاہ صاحب رفیق دارالمصنفین نہیں رہے بلکہ دارالمصنفین کی رفاقت کو ترک کر کے مدیر معارف ہو گئے یہ جھول مولانا کی اختصار پسندی کی وجہ سے پیدا ہوا۔ شاہ صاحب اب دارالمصنفین کے رفیق ہی نہیں بلکہ ناظم بھی ہیں علاوہ اس اہم علمی ادارہ کو حسن و خوبی سے چلا رہے ہیں یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ جب شاہ صاحب رفیق دارالمصنفین تھے تو صرف "شاہ معین الدین" تھے اور مدیر معارف ہوئے تو "مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی" ہو گئے۔

"غلطی ہائے مضامیں" کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلئے۔ ص۱۹۰ پر مولانا نے ایک حاشیہ لکھا ہے۔
"ریاست آصفیہ حیدرآباد ۱۹۴۸ء تک پوری طرح زندہ و سلامت تھی اور دارالمصنفین ہر طرح اس کا دست نگر تھا"۔
یہ صحیح ہے کہ ریاست آصفیہ حیدرآباد سے دارالمصنفین کو مالی امداد ملتی تھی لیکن یہ کہنا کہ "وہ ہر طرح اس کا دست نگر تھا"۔ اس عظیم و وقیع علمی ادارہ کی توہین ہے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سید والا کی روح پر اس ریمارک سے کیا گزری ہو گی۔ عماد الملک کے جس خط کی طرف سید صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ فروری ۱۹۶۴ کے معارف میں شائع ہو گیا ہے۔ عماد الملک لکھتے ہیں کہ
"معارف کی مداخلت سیاسی امور میں خصوصاً مخالفانہ خیالات ہماری سرکار کو ناپسند ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے دارالمصنفین کو ضرر پہنچے"۔
جہاں تک ہمارا علم ہے دارالمصنفین کو ضرر نہیں پہنچا لیکن معارف نواز ریاست کی سرکار کے خیالات کا اندازہ ضرور ان جملوں سے ہو جاتا ہے اور پھر ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا مولانا عبدالماجد کو والیۂ بھوپال کی شاہانہ فیاضیاں یاد نہیں رہیں؟

○

مولانا عبدالماجد ایک کہنہ مشق صحافی، بلند پایہ مصنف اور صاحب طرز انشاپرداز ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی کہ مکتوبات سلیمانی کے حواشی میں زبان و بیان کی بیسیوں خامیاں اور غلطیاں پائی جاتی ہیں مثلاً
"شیخ فضل الرحمٰن قدوائی جو بعد کو خان بہادر ہوئے اور بعد کو بارہ بنکی میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے"۔
"بعد کو" کی تکرار، تکرار قبیح ہے۔ دوسری بار "بعد کو" کے بدلے "پھر" لکھا جا سکتا تھا یا اس جملے کو یوں لکھا جا سکتا تھا۔
"جو آگے چل کر خان بہادر ہوئے اور پھر بارہ بنکی میونسپل بورڈ کے چیرمین بھی منتخب ہوئے"۔
"یہی غیر شبلی مسلک انہوں نے اپنی کتابوں اسپرٹ آف اسلام وغیرہ میں لکھا ہے"۔
لفظ "کتابوں" کا تقاضا ہے کہ کم از کم دو نام ہوں پھر "وغیرہ" لکھنے سے پہلے کم سے کم دو ناموں کا ہونا ضروری ہے۔

"اب دل کو دھن اس کی سوار تھی ہے"
"سوار" غیر ضروری ہے اور اگر سوار لکھنا ہی ہے تو پھر "کو" کے بدلے "پر" ہونا چاہئے۔ یعنی جملے کی یہ شکل ہو گی۔
"اب دل پر دھن اس کی سوار تھی"۔
لیکن بہتر صورت یہ ہوتی؛
"اب دل کو دھن اس بات کی تھی"۔
"یہ مولوی عبدالرزاق خاں ملیح آبادی ہیں جنہوں نے آگے چل کر میری اور سید صاحب کی مخالفت میں کمال حاصل کیا"۔
گویا مخالفت بھی کوئی ہنر ہے جس میں کمال حاصل کیا جا سکتا ہے۔
"سید صاحب فتویٰ بہت کم لکھتے تھے لیکن آخر کبھی تو لکھتے اور تائیدی دستخط مولوی عبدالسلام سے کرا لیا کرتے تھے"۔
یہ جملہ فاضل مدیر صدق کی جلد بازی کی صریح غمازی کرتا ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ "سید صاحب فتویٰ بہت کم لکھتے تھے لیکن اگر کبھی لکھتے تو تائیدی دستخط مولوی عبدالسلام سے کرا لیا کرتے تھے"۔
"میں مجلس استقبالی کا صدر تھا"۔
"استقبالیہ" کے بجائے "استقبالی"۔ معلوم نہیں سہو کتابت ہے یا مولانائے محترم کی جلد بازی؟
"فیہ ما فیہ ... جو میری تہذیب کے بعد ..."
"ایڈیٹنگ کے لئے "ترتیب" کا لفظ استعمال ہوتا ہے نہ کہ "تہذیب"۔
"میں نے اسی بچی کو گودوں میں کھلایا ہے"۔
"گود میں کھلایا ہے" یا "گودوں کھلایا ہے" ہونا چاہئے۔
"منشی امیر علی ... سچ کے کاتب تھے۔ سچ کی بندش سے (یہ) بچارے بھی بے روزگار

"بچے کی بندش سے" کے بجائے "بچے کے بند ہو جانے کی وجہ سے" لکھنا چاہئے تھا۔ "بندش" بند ہو جانے کے معنی میں کبھی استعمال نہیں ہوتا۔

"یہ مضمون غالباً پرویز صاحب کا تھا جو اب منکر حدیث ہونے کی وجہ سے اتنا چکے ہیں۔"

"اتنا چکے ہیں" کچھ مبہم سا معلوم ہوتا ہے "شہرت حاصل کر چکے ہیں" لکھا جا سکتا تھا۔

"یہ وہی مولوی رئیس احمد جعفری ندوی ہیں.... جنہیں آگے چل کر ایک مشہور صحافی اور اہلِ قلم بننا تھا۔"

"بننا تھا" کیا معنی؟ اس جملے کو یوں لکھا جا سکتا تھا: "جو آگے چل کر ایک مشہور صحافی اور اہلِ قلم ہوئے" یہاں ایک بات اور۔ رئیس احمد جعفری چونکہ مولانا دریابادی کے ثنا خوانوں میں ہیں اس لئے مولانا بھی ان کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ رئیس جعفری ایک اچھے صحافی اور انشا پرداز ہیں اور کتابوں کا ڈھیر لگاتے جا رہے ہیں لیکن کیا مولانا نے ان کے ناول پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ ذرا وہ تھوڑا سا وقت نکال کر جاسوسی، بانی اور دل وغیرہ پڑھ ڈالیں تو انہیں معلوم ہو کہ یہ ندوی صاحب، جو ایک مشہور صحافی اور اہلِ قلم ہیں کیا کیا گل کھلاتے رہتے ہیں۔ مولانا دریابادی۔ شرافتِ قلم کے قائل ہیں۔ وہ ان ناولوں کو پڑھیں اور دیکھیں کہ ان میں کہاں تک شرافتِ قلم پائی جاتی ہے۔

بعض جملوں میں حشو و زوائد کا عیب پایا جاتا ہے۔ جیسے۔

"صاحب الناظر کو مولانا شبلی سے بڑی دیرینہ اور شدید کد چلی آتی تھی۔"

"دیرینہ" کے بعد "چلی آتی" کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

"سید صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی۔ انہیں کا صاحبِ نظر مصنف ہی کہہ سکتا تھا۔

"انہیں" کے بعد "ہی" غیر ضروری ہے۔

"معارف میں صرف منتخب ہی کلام چھپتا تھا۔"

"صرف" کے بعد "ہی" غیر ضروری ہے۔ ایک بات اور "چھپتا تھا" کیا معنی؟ کیا معارف اب نہیں نکلتا یا مولانا کا یہ مقصد ہے کہ پہلے منتخب کلام چھپتا تھا اور اب رطب یابس سبھی کچھ چھپتا ہے۔ اگر یہ مقصد ہے تو جملے کے شروع میں "اس وقت" لکھنا چاہئے تھا۔

"مولوی عبدالباری کے کسی مضمون کو دیکھ انہوں نے (سید صاحب نے) داد دی ہوگی۔ ان کی داد اس وقت بجائے خود ایک سند تھی۔"

"اس وقت" حشو ہے۔

"سید صاحب.... میرا قیام دارالمصنفین میں رکھنا چاہتے تھے۔"

"رکھنا" نے جملے کو چیستان بنا دیا ہے۔

"احاطۂ دارالمصنفین کے پڑوس میں ایک مستقل چھوٹا سا بنگلہ میرے سید صاحب نے مخصوص کر لیا تھا۔"

"احاطہ" اور "مستقل" کی قطعی ضرورت نہ تھی۔

سب سے بڑا جھوٹ

جھوٹوں کے ایک کلب میں جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ اور سب سے بڑا جھوٹ بولنے والے کو "عظیم جھوٹے" کا خطاب ملنے والا تھا۔

مقابلے میں شریک ہونے والے بیس ممبران میں سے انیس ممبران جب اپنی دانست میں بڑے بڑے جھوٹ بول چکے تو بیسواں ممبر آیا اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔

"حضرات مجھے جھوٹ بولنے سے سخت نفرت ہے۔ میں نے آج تک کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

اور ججوں کی کمیٹی نے متفقہ طور سے بیسویں ممبر کو "عظیم جھوٹے" کے خطاب کا اہل قرار دیا۔

ڈوبتے ہوئے پروفیسر کو لوگ سمندر سے نکال لائے تو پروفیسر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ مجھے تیرنا بھی آتا ہے۔"

مرزا محمد معین الدین

سوپر سونک Super-Sonic

یہ تو تقریباً سبھی جانتے ہیں کہ کوئی بھی شے جب متحرک ہوتی ہے تو ہوا بازو ہٹ کر اُس کو آگے بڑھنے کا راستہ دیتی ہے اور جیسے جیسے اُس کی رفتار میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ ہوا ہٹتے ہوئے اُس کو راستہ دیتی ہے بالکل اُسی طرح جس طرح پانی میں جہاز، پانی کو کاٹتے ہوئے اپنی راہ بناتا ہے۔

رفتار کی اضافت کے ساتھ ساتھ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ رفتار کی تیزی انتہائی عروج پر ہوتی ہے اور وہ ہوا پر بھی سبقت لیجاتی ہے یعنی ہوا کو کٹنے یا بازو ہٹنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ رفتار کی یہ تیزی آواز کی رفتار کہلاتی ہے۔ اس موقع پر متحرک شئے ہوا کو دباتی ہوئی کمپرس (compress) جاتی ہے جسکو Sound Barrier کہتے ہیں۔ اس دباؤ کی انتہا پر ہوا میں دھماکا Explosion ہوتا ہے جس کے بعد آگے کی ہوا اپنا دباؤ بالکل کھو دیتی ہے اور متحرک شئے کی رفتار پہلے سے بھی یعنی آواز کی رفتار سے بھی کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس عمل کو ساؤنڈ بیریر (Sound Barrier) توڑنا کہتے ہیں۔

جنہیں اسی بنیاد پر سائنس والوں نے اُن ہوائی جہاز کو ایجاد کیا جنہیں دیکھ کر ہماری عقل دنگ ہے۔ جو پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ان جہازوں کا نام "سوپر سانک" ہے۔ جو جہاز آواز کی رفتار سے کم تیز جاتے ہیں وہ "سب سانک" اور جو آواز کی رفتار سے زیادہ تیز نکل جاتے ہیں وہ "سوپر سانک" کہلاتے ہیں۔

آواز کی رفتار اوسطاً ۷۶۵ میل سے ۷۰۰ میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سوپر سانک فی گھنٹہ ۷۰۰ میل سے زائد کی رفتار سے پرواز کرتے ہیں۔

اب تک صرف ایر فورس کے طیاروں ہی کو جن میں بمبار وغیرہ شامل ہیں، سوپر سانک بنایا گیا ہے تاکہ دفاعی لحاظ سے برتری قائم رہے۔

مگر سائنس دانوں کو چین کہاں وہ قدرت کی عطا کردہ صلاحیتوں کے ذریعہ برابر جدوجہد میں منہمک ہیں۔ چنانچہ اس میدان میں برطانیہ اور فرانس نے اپنے جھنڈے گاڑنے کے لئے قدم بڑھایا ہے اور ہر دو ملک کی جہاز ساز کمپنیاں برٹش ایرویز کارپوریشن اور سُڈ ایوی ایشن نے باہمی اشتراک سے کنکارڈ (concorde) نامی سوپر سانک سفری جہاز تیار کر رہی ہیں۔ یہ جہاز پیرس سے نیویارک کا طویل سفر صرف تین گھنٹے میں طے کرے گا اور تقریباً ۱۰۰ مسافر اس میں سفر کر سکیں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری ایر انڈیا انٹرنیشنل نے بھی اس جہاز کا آرڈر دیا ہے۔ گویا آپ اور ہم بھی بہت جلد آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز فضا میں تیرتے رہیں گے۔

سوپر سانک جہازوں کی تیاری میں امریکن فیڈرل ایوی ایشن اتھارٹی American Federal Aviation Authority نے ایک اہم قدم اُٹھایا ہے وہ یہ کہ مذکورہ کمپنی نے تمام جہاز ساز اداروں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے اپنے نئے نمونے (Design) پیش کریں۔ ان اداروں میں قابلِ ذکر بوئنگ Boeing، لاک ہیڈ Lockheed، نارتھ امریکن North American، پراٹ اینڈ وہٹنی Pratt and Whitney، جنرل الیکٹرک General Electric اور کرٹس رائٹ Curtis Wright ہیں۔ اس پروگرام کا نام S.S.T ایس۔ ایس۔ ٹی یعنی سوپر سانک ٹرانسپورٹ رکھا گیا ہے۔ یہ بات سوپر سانک جہازوں کی ضرورت اور اہمیت کو بڑھانے کے لئے کافی ہے کہ ڈیزائن کی منظوری اور جہاز کی تیاری سے قبل ہی اب تک تقریباً ۱۰۰ جہازوں کا آرڈر مختلف کمپنیوں نے دیا ہے جن میں بالخصوص T.W.A - K.L.M-P.A.A اور ایر انڈیا ہیں۔

سائنس کی یہ ترقیاں اس بات کی غماز ہیں کہ انسان کا چاند تاروں کو چھونے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔

پھر بھی قدرت قادرِ مطلق ہے، دیکھیں، انسان کو کہاں تک کامیابی بخشتی ہے۔

پرانی خبریں

مسلم ہیرالڈ مورخہ یکم فروری ۱۸۸۸ء

کلکتہ میں ایک یوروپین لڑکی کو چیچک نکلی ڈاکٹر نے ہسپتال میں منتقل کرنا چاہا۔ انسپکٹر پولیس تعمیل کے لئے گیا۔ اوس کی ماں نے لڑکی کو نہ جانے دیا مرض متعدی کو پھیلانے کا جرم قائم ہوا۔ ملزمہ نے وجہ بیان کی کہ ڈاکٹر مجھے ہسپتال میں اپنی لڑکی کے پاس رہنے سے روکتا تھا۔ اوس کے گواہوں نے کہا کہ گھر میں کافی انتظام رہتا ہے کہ مرض باہر نہ پھیلے۔ عدالت نے بُوڑھی میم کو ۴ روز کی قید محض کا حکم دیا۔ جس کو سشن کورٹ نے رد دی۔ اپیل کا قصد ہے۔

○

۲۴ جنوری ۱۸۹۷ء

سیلون میں اس قدر لڑکیوں کی کثرت ہے کہ اب تجویز ہے کہ امریکا بھیجی جائیں جہاں لڑکیاں کمیاب ہیں۔ عنقریب ایک جہاز لڑکیوں کا امریکا روانہ کیا جائے گا۔

●

سعادت نظیر ـــــــــ حیدرآباد

ایک زمانے سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو مخاطب کروں مگر میرا ہو عدیم الفرصتی اتنا بھی تو نہیں کر سکا۔ حال ہی میں ایک مراسلہ جس میں اس ناچیز کا بھی تذکرہ ہے آپ کے رسالے میں شائع ہوا تو سمجھا کہ ؎

لو، خط و کتابت کی تقریب نکل آئی۔

امیر عارفی صاحب ایک نوجوان اور ہونہار طالب علم ہیں۔ میں جانتا ہوں اور وہ بھی مجھ سے متعارف ہیں۔ تعجب ہے کہ موصوف کو بغیر کسی تقریب میں کیسے یاد آ گیا اور اس طرح کہ میرے متعلق ایک قطعی رائے بھی بزعم خود قائم کر لی۔ خیر، موصوف کو میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ کسی سے بھی متعلق اظہار رائے میں احتیاط اور دُور اندیشی سے کام لیں اور طنز و تعریض ادیبانہ وقار و شرافت کو پامال نہ ہونے دیں تو انسب و احسن ہوگا۔

احسن علی عباسی ـــــــــ دہلی

...... یہاں کے ایک پرچے نے غالباً طنزاً دو رجحانات کو انسائیکلو پیڈیا لکھا ہے۔ لیکن درحقیقت اُنھوں نے بہت ہی صحیح لکھا ہے۔ میری نظر میں آج کل ہندوستان بجو پاکستان میں بھی کوئی ایسا پرچہ نہیں ہے جو مضامین کے لحاظ سے اس قدر متنوع مفید اور دلچسپ ہو جتنا دو رجحانات۔ آپ کے پرچے کی تقریباً ہر چیز پڑھنے کے قابل ہوتی ہے اور اگر کوئی پڑھنے کے قابل نہیں ہوتی تو آپ کے پرچے کا سلیقہ اور ترتیب اُس میں ایسی کشش پیدا کر دیتی ہے کہ مجبوراً پڑھنے کو طبیعت چاہتی ہے لیکن پھر یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے کے بعد کوفت ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ دو تین بلا وجہ ضائع ہو گئے۔ اس قسم کی چیزوں میں میں ....

.... کو شامل کرتا ہوں۔ چونکہ اسی پرچے میں دو شادی (حالانکہ دو شادیاں ہونی چاہئے تھا) جیسا اہم، مفید اور خیال انگیز مضمون بھی شامل ہے۔

اکرم علی خاں ـــــــــ بمبئی

..... مکتوبات سلیمانی پر دو رجحانات میں جو مضامین نکل رہے ہیں وہ بڑے مفید اور سچائی پر مبنی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ کا پرچہ ایک اہل علم کو غلط راستہ چلنے پر ٹوکنے کی ہمت رکھتا ہے۔ مکتوب نگاری کی خواہش کے باوجود مکتوب الیہ کا خط کو نہ پھاڑنا اور پھر اُس کا شائع کرنا ایسی حرکت ہے جو نہ صرف اخلاقاً بلکہ شرعاً بھی انتہائی مکروہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ افتخار احمد صاحب نے ان خطوط کی اشاعت کے پیچھے جو مقصد بتایا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

اشتیاق حسین ـــــــــ لکھنؤ (یو پی)

...... مکتوبات سلیمانی پر مضامین پڑھ کر کتاب پڑھنے کی ضرورت اور خواہش ہو رہی ہے۔ کئی جگہ دریافت کیا لیکن یہ کہیں دستیاب نہیں ہو رہی ہے۔ کیا آپ اس سلسلہ میں کچھ مدد کر سکیں گے۔ یا کم از کم اتنا ہی لکھئے کہ یہ کہاں مل سکتی ہے۔

* مکتبہ جامعہ دہلی سے رجوع کر کے دیکھئے۔ بمبئی میں تو یہ نایاب ہے ـــ (ادارہ)

مختار احمد ـــــــــ پونا

...... آج کل دو رجحانات ملتے ہی جو چیز مجھے متوجہ کرتی ہے وہ ہے "ایک قیمتی سوانح حیات"۔ عدیم الفرصتی کے باوجود سب سے پہلے اس کو پڑھ لیتا ہوں پھر فرصت کے وقت دوسری چیزیں۔ میرا مشورہ ہے کہ یہ سوانح حیات دو رجحانات میں مکمل ہونے کے بعد اسے کتابی صورت میں چھاپئے تاکہ یادگار رہے اور مجھ جیسے وہ لوگ جنہیں کبھی کبھی پرچہ نہیں ملتا یا کوئی لیجاتا ہے تو واپس نہیں لوٹاتا، مستفید ہوں اور اس گھاٹے سے بچ سکیں۔

بھول بھلیّاں

ابّاجان اور جمی میاں

جمی میاں نے اسکول سے واپسی پر اپنے ابّاجان سے ایک سوال پوچھا جو اس طرح تھا۔

"تین دوست سیر کرتے ہوئے ایک شہر پہنچے۔ وہاں اُنھوں نے ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لینا چاہا مگر منیجر اُس وقت وہاں موجود نہ تھا۔ کلرک نے بتایا کہ ایک کمرہ خالی ہے جس کا کرایہ تیس روپے ہے۔ تینوں دوستوں نے مل کر فی کس دس روپے کے حساب سے کُل تیس روپے ادا کر دئے۔ مگر دراصل کرایہ پچیس روپے تھا۔ چنانچہ جب منیجر واپس آیا اور اسے یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے کلرک سے کہا کہ تم نے کمرے کا کرایہ زیادہ لے لیا ہے۔ دراصل اس کا کرایہ ۲۵ روپیہ ہے۔ اُس نے ہوٹل کے ملازم کو بلوا کر ۵ روپے دئے اور کہا کہ یہ ان مسافروں کو واپس کر دئے جائیں۔

روپے لیکر ملازم سوچنے لگا کہ آخر یہ ۵ روپے تین آدمیوں میں کیسے تقسیم ہوں گے؟ پھر اللہ نے آدمیوں کو کیا پتہ کہ اصلی کرایہ کیا ہے لہٰذا اُس نے صرف تین روپے لوٹائے اور باقی ۲ روپے خود رکھ لئے ــــ جمی کا سوال یہ تھا کہ ایک ایک روپیہ واپس لینے کے بعد ہر مسافر نے فی کس ۹ روپے کرایہ ادا کیا یعنی تین مسافروں کے ۲۷ روپے ہوئے ۲ روپے ملازم کی جیب میں گئے اس طرح ۲۹ روپے ہوئے مگر مسافروں نے شروع میں مجموعی طور پر تیس روپے ادا کئے تھے تو باقی ایک روپیہ کہاں گیا؟

ابّاجان سے تو اس سوال کا جواب بن نہ پڑا۔ آپ آپ بتا سکیں تو ایڈیٹر دورِ حیات کے پتے پر لکھ بھیجئے تاکہ بے چارے جمی کی اُلجھن دُور ہو سکے

طلعت شاہین

زعفران زار

بمبئی کے ایک کلب میں عورتوں کے پتلون پہن کر آنے پر سخت بحث چل رہی تھی انجام کار مندرجۂ ذیل تجویز منظور ہوئی۔

" عورتیں کلب کے احاطے میں پتلون پہن کر داخل ہو سکتی ہیں لیکن کلب کی خاص عمارت میں داخل ہونے سے پہلے اُنھیں پتلون اُتار دینے چاہئیں "

○

ایک سڑک پر ایک گدھا مرا ہوا پڑا تھا کسی راہ گیر نے اُسے وہاں سے اٹھوانے کیلئے میونسپل کارپوریشن کو فون کیا۔

فون ریسیو کرنے والے کلرک نے کہا۔

" مگر آپ ہمیں کیوں اطلاع دے رہے ہیں۔ اس کا کفن دفن کرنا تو آپ ہی کے ذمے ہے۔

راہ گیر نے برجستہ جواب دیا۔

"لیکن اس کے رشتہ داروں کو مطلع کرنا بھی تو میرا ہی فرض ہے "

○

کپڑے کی دوکان میں ایک صاحب داخل ہوئے اور فرمایا۔ " میری لڑکی کا انتقال ہو گیا ہے کفن چاہئے "

دوکاندار نے پوچھا۔

" مرحومہ کی عمر کیا تھی؟ "

" جی ۱۶ برس "

" پھر بیس گز کا کفن تو لے لیجئے جتنا عام طور سے لگتا ہے "

" جی نہیں بلکہ صرف دو گز دیجئے "

" وہ کیوں "

" بات دراصل یہ ہے کہ وہ ٹیڈی گرل تھی "

اب کی بار

اس شمارے سے دورِ حیات کی ترتیب میں ایک اہم تبدیلی کی جا رہی ہے اداریہ کا صفحہ ختم اور اس کی بجائے "اِن دس دنوں میں" کے نام سے ایک نیا عنوان قائم کیا جا رہا ہے۔ اس نئے عنوان کے تحت پچھلے دس دنوں میں دنیا میں جو اہم واقعات رُونما ہوئے ان کا خلاصہ دیا جائے گا۔ اس طرح دورِ حیات کا اداریہ اب بالکل ہی غیر جانبدارانہ ہو گیا ہے۔

○

اس شمارے میں ایک اہم مسئلے "جمہوریت" پر محمود الحسینی کا مضمون شریک ہے۔ اس سے اختلافات کے کئی پہلو نکل سکتے ہیں۔ یہ جماعتِ اسلامی کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں اور جمہوریت کے خاص اسلامی تصور میں بھی بہت فرق ہے۔ اس موضوع پر مختلف مضامین بڑی خوشی سے قبول کئے جائیں گے خواہ وہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہوں ــــ ترکِ اسلحہ پر ایک اہم اور مفید مضمون بھی اسی شمارے میں پڑھئے۔

حضرت محمود لکھنوی کی غزل ایک قدیم تغزل کا مزہ ہے جو اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اسمٰعیل لطیف کے افسانے کا موضوع گو نیا نہیں لیکن بات کہنے کا انداز ضرور نیا ہے اور دلکش بھی۔

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳

جلد ۳ | ۱۰ اپریل ۱۹۶۴ء | شمارہ ۱۰

اس شمارے میں

قیمت

فی پرچہ ———— ۲۰ نئے پیسے

سالانہ ———— دس روپے

ایڈیٹر

قیصر مظہر حسین

اِن دس دنوں میں

○ فیلڈ مارشل عارف صدرِ عراق نے بمبئی میں اپنے وداعی بیان میں کہا کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات بہتر اور خوشگوار بنانے میں اپنی پوری کوشش کریں گے۔

○ مسٹر شیخ عبداللہ سابق وزیرِ اعظم کشمیر کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اُن پر اور ۱۳ دوسرے افراد پر حکومت کے خلاف سازش کرنے کا جو مقدمہ چل رہا تھا اُسے واپس لے لیا گیا۔ شیخ عبداللہ کو پہلی مرتبہ اگست ۵۳ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں اُنہیں رہا کیا گیا لیکن ۴ ماہ بعد ہی حکومت کے خلاف سازش کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔

○ برازیل میں صدر گولار کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ حکومت اب دائیں بازو کے لوگوں کے ہاتھ آئی ہے۔

○ ارجنٹائن کا باکسنگ چیمپین الجاندرو لیبرنٹی جو ایک مقابلے میں ۲۱ ستمبر ۶۲ کو بیہوش ہو گیا تھا، انتقال کر گیا۔ وہ ۱۸ ماہ سے مسلسل بے ہوش تھا۔

○ مسٹر دیو گی بمبئی میونسپل کارپوریشن کے صدر چُن لئے گئے۔

○ مدرائی میں ایک اسکول کی عمارت گر جانے کی وجہ سے ۲۵ لڑکیاں ہلاک ہو گئیں۔

○ بھوٹان کے وزیر اعظم مسٹر جگمی ڈورجی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

○ جنرل میک آرتھر کا انتقال ہو گیا۔

○ لندن میں بغیر ڈرائیور کے چلنے والی ٹرین کا آغاز ہو گیا۔

○ دہلی میں ہندوستان اور پاکستان کے وزرائے داخلہ میں اقلیتوں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی۔

○ پنڈت نہرو نے شیخ عبداللہ کو دہلی آنے کی دعوت دی۔

○ مسٹر بھٹو وزیر خارجہ پاکستان نے بھی شیخ عبداللہ کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔

○ صدر نے مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کے سکریٹری محمد اجمل خاں کو راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا ہے۔

مظفر حنفی

غزلیں

وہ دشمن سے کچھ کم نہیں ہے، مگر پھر بھی اپنا ہے اپنا سمجھ کر نہ کہہ دیں
وہی بات اغیار جو کل کہیں گے، اُسے آج ہی کیوں مظفر نہ کہہ دیں!

ابھی وقت ہے، سوچ لیجے کہ ہم پر عنایات میں "کچھ کمی تو نہیں ہے"
ابھی بولنے کی اجازت نہ دیجے کہیں آپ کو ہم "ستم گر" نہ کہہ دیں

دکھانے لئے جا رہے ہیں بڑے فخر سے "تاج بی بی کے روضے کی جالی"
مگر ساتھ میں "ایک گائیڈ" لگا ہے کہ مہمان دیوار کو در نہ کہہ دیں

"بڑی شخصیت" ہم انہیں مانتے ہیں، مگر قدر اپنی بھی پہچانتے ہیں
"مساوات" کے زعم میں "ایک دن وہ کہیں ہم کو اپنے برابر نہ کہہ دیں

بھلا اس سے بہتر "حماقت کی پردہ دری" کے لئے اور چارہ بھی کیا ہے
پشیمان ہو کر اگر لوگ "خود ساختہ الجھنوں کو" مقدر نہ کہہ دیں

کئی بار سوچا کہ دو چار پیغام بھیجیں ترے نام، اپنی طرف سے
مگر قاصدوں کا بھروسہ نہیں ہے کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر نہ کہہ دیں

بڑے تلخ گو ہیں، بڑے صاف گو ہیں" مگر اب جہاں میں ہیں ٹھیر جائیں
جناب مظفر بہت بڑھ چلے ہیں کہیں آپ کو لوگ خود سر نہ کہہ دیں

تم بھی کرتے ہو انتظار کہاں
اس کے وعدوں کا اعتبار کہاں

لوگ تو حاشیے لگاتے ہیں"
ہم کہاں آپ کا دیار کہاں

انجمن ہے یہ خود پسندوں کی
آپھنسے تم بھی میرے یار کہاں

میں جو سچ بات منہ پہ کہتا ہوں
دوستوں میں مرا شمار کہاں

ان شرافت کے دعویداروں کو
اپنی فطرت پہ اختیار کہاں

"بلبل و گل" معانقہ کرتے
بیچ میں آ گئے یہ خار کہاں

شیخ جی سے حساب کرنا ہے
ورنہ مسجد میں میکسار کہاں

یوں ہی سن کر، یقین مت کیجے
"تذکرے میں" ابھی بہار کہاں

سر کچھ ایسا بلند رکھتا ہوں
اتنی اونچائیوں پہ دار کہاں

واقعی خوشگوار گذری ہے
اب منکرات کا خمار کہاں

دور ہی ظلم و جور کا ہے یہ
آپ ہوتے ہیں سوگوار کہاں

تم مظفر کے پاس ہو کہ نہ ہو
اس کے اشعار سے فرار کہاں

ایک قیمتی سوانح حیات

یہی وقت تھا جب میری ادبی تربیت شروع ہوئی اور قسمت نے میرے لئے ایک بہترین اُستاد بھیج دیا۔ لیکن اب تک میری شاعری میں میری تربیت کا عکس نہیں اُبھرا تھا۔ ایک شاگرد اور ایک شاعر کی حیثیت سے میری ترقی کی رفتار کی لکیریں بالکل متوازی دوڑ رہی تھیں۔ سوویت اسپورٹس میں اب میری نظمیں تقریباً روزانہ چھپ رہی تھیں۔ میں نے فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال، باکسنگ، اسکیٹنگ، کشتی رانی اور خاص تقاریب کے بارے میں نظمیں کہیں ان تقاریب میں۔ سال نو، یوم مئی، ریلوے مزدوروں کا دن۔ وغیرہ شامل ہیں۔ خاص تقریبوں کے لئے اس قسم کی شاعرانہ صنافت ہمارے ملک میں بہت مقبول تھی اور بدقسمتی سے آج بھی ہے لیکن اُس وقت میں یہ نظمیں لکھ کر بیگار نہیں ٹال رہا تھا بلکہ تفریح کی خاطر لکھ رہا تھا لیکن جوش وخروش کے ساتھ۔

اُس وقت میرے خیالات بالکل نابالغانہ تھے۔ میں صرف اپنے شاعری کے جسم کو کسرتی بنا رہا تھا یعنی استعاروں تشبیہوں اور اوزان کو ہندوستانی مگدر کی طرح گھما رہا تھا۔ تاراسوف بڑا بہترین معلم تھا۔ نظمیں کس بارے میں ہیں یہ اس وقت بالکل غیراہم چیز تھی لیکن بچپن کے یہ معصومانہ کھیل اپنے اندر اخلاقی ابتری اور گراوٹ کے بیج رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن تاراسوف نے ٹیلیفون کر کے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ اُس دن سوویت اسپورٹس میں میری نظم "یوم مئی" چھپی تھی۔

" زینیا " ایڈیٹر۔ ان چیف بڑی پریشانی اور اُلجھن میں ہے "۔ تاراسوف نے پریشان مسکراہٹ کے ساتھ کہا ۔" تمہاری نظم میں اسٹالن کا ذکر تو کُجا اُس کا نام تک نہیں ہے اور اب اتنی دیر ہو چکی ہے کہ نظم روکی ہی نہیں جا سکتی "

" تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے "

" دیکھو زینیا میں نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی پریشانی میں اُلجھ جاؤ۔ اس لئے میں نے تمہاری نظم میں چار سطریں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں "

" تم نے اچھا کیا " میں نے جواب دیا۔ میرے لئے اسٹالن کا ذکر ہونا یا نہ ہونا ایک ہی جیسا تھا۔

یادگاروں کی تقریب کے مواقع پر ماسکو کے تقریباً تمام اخبارات میری نظمیں چھاپنے لگے۔

" زینیا اب تم سیکھ گئے ہو کہ کس طرح لکھنا چاہئے " تاراسوف نے مجھ سے کہا " اب تم اس بارے میں غور کرو کہ تمہیں کس بارے میں لکھنا چاہیئے "۔

پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اختلاف کے طور پر سر ہلایا اور کہا۔

" اب تم لوگوں کو بے وقوف بنانا چھوڑ دو میں۔ اب سوچنے لگا ہوں کہ جو کتابیں میں نے تمہیں پڑھنے کے لئے دی تھیں کیا وہ تضیعِ اوقات تو نہیں تھیں "

جب میں نے یہ سنا تو فیصلہ کیا کہ میں کرسانوف سے جا کر ملوں جو ایک بوڑھا۔ بالغ النظر اور میرا محبوب شاعر تھا۔ تاکہ اُس کی اخلاقی مدد اور ہمدردی حاصل کرسکوں۔

کرسانوف نے میری طرف غمگین نظروں سے دیکھا اور کہا

" کیا تم سمجھتے ہو کہ میں ہماری نظمیں اس لئے پسند کرتا ہوں کہ وہ میری نظمیں جیسی ہیں۔ مگر میں اسی لئے اُنہیں پسند نہیں کرتا۔ ایک بوڑھے ہیئت پرست شاعر کی حیثیت سے میں تمہیں رائے دوں گا کہ ہیئت اور روایت پرستی کے بارے میں بالکل بھول جاؤ شاعر میں صرف ایک ہی ناگزیر صفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ انتہائی سادہ ہو یا انتہائی پیچیدہ عوام کو اس کی ضرورت بہرحال ہوتی ہے۔ شاعری اگر واقعی حقیقی ہے تو وہ

روس کے ایک نوجوان باغی شاعر

یوجینی یوفتےشنکو

کی خودنوشت سوانح حیات

مجھے بہت جلد قوانین کا علم ہو گیا۔ نظم شائع ہونے کے لئے یہ ضروری تھا کہ اُس میں چند سطریں اسٹالن کے لئے لکھی ہی جانی چاہئیں۔

یہ چیز مجھے قدرتی بھی معلوم ہوئی اور پھر سے میں نے کبھی کسی کو نظموں میں کمی بیشی کرنے کا موقع نہیں دیا اور خود ہی نظمیں لکھتا رہا۔

میں اخباروں کا مستقل شاعر ہو گیا

ایک دلیں میں حصہ لینے والی کار نہیں ہوتی جو تیزی سے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک مقررہ ڈگر پر بھاگتی پھرے وہ ایک ایمبولینس کار ہوتی ہے جس کا کام تیزی سے دوڑ کر لوگوں کی جانیں بچانا ہے۔

کرسانوف نے میری شخصیت کو ہلا کر رکھ دیا لیکن مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی۔

۱۹۵۲ء میں میں نے اپنی شاعری کا پہلا مجموعہ چھپوایا۔ The Prospectors of Future "مستقبل کے متلاشی" اس کے سرورق کا آسمانی رنگ اندر کے مواد سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اگرچہ کہ اخبارات میں اس پر بہت اچھے تبصرے ہوئے لیکن جب میں نے کتابوں کی دوکانوں میں جھانک کر دیکھا تو پوری کتابیں جیسی کی ویسی رکھی ہوئی تھیں۔

ایک دکان پر میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان شاعری کے شعبے میں شاعری کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ جب اس نے میری کتاب ہاتھ میں لی تو میرے دل کی حرکت جیسے بند سی ہوگئی۔ اس نے کچھ ورق الٹے ایک گہرا سانس لیا اور پھر کتاب واپس رکھ دی

"یہ وہ کتابیں نہیں جن کی مجھے تلاش ہے"۔

اس نے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی سے کہا "میری ایک محبوبہ ہے وہ بہت اچھی لڑکی ہے لیکن کچھ دنوں سے زندگی کے بارے میں اس کا نظریہ کچھ عجیب سا ہوگیا ہے — فریب خوردہ قسم کا — میرا خیال تھا کہ شاعری کی کسی کتاب سے اس کی اصلاح ہوجائے گی لیکن ان کتابوں میں جو شاعری ہے میں تو اسے شاعری ہی نہیں سمجھتا۔ یہ صرف ڈھول کی آواز ہے اور اس سے زندگی پر پھر سے ایقان بحال ہونا ناممکن ہے"۔

وہ نوجوان باہر نکل گیا اور آسمان سے گرتی ہوئی برف میں غائب ہوگیا۔

میں گھر آیا۔ پھر سے اپنا مجموعہ پڑھا اور پوری صداقت کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی شخص کے لئے بھی کسی کام کا نہیں ہے۔

کچھ دنوں تک میں ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا میں نے ادبی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیا اور وظیفہ پر زندگی گزارنے لگا۔ مجھے اس ادارے میں اس حقیقت کے باوجود داخلہ مل گیا کہ میرے پاس ہائی اسکول کا ڈپلوما نہیں تھا۔ میں ادیبوں کی یونین کا بھی ممبر بن گیا اور یہ سب کچھ میرے مجموعے کی وجہ سے ہوا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ میرے مجموعے کی کیا حیثیت ہے۔ میں مختلف انداز سے اور مختلف موضوعات پر لکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے تشکک کے بارے میں خود کے بارے میں، عظیم محبت کے لئے میری توقعات کے بارے میں، جھوٹ اور سچ کے درمیان فرق کے بارے میں اور انسان کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ جب میں اپنی نئی نظمیں لے کر ایڈیٹروں کے پاس گیا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے" ایک نوجوان شاعر نے مجھ سے پوچھا جو ایک اخبار میں شاعری کے شعبے کا نگران تھا اور جس نے ہمیشہ میری نظموں کی تعریف کی تھی خواہ وہ بین الاقوامی حالات پر ہوتیں یا خاص موقعوں پر — "یہ اداس لہجہ مجھے بڑا پریشان کر رہا ہے تم ایک بوڑھے شخص کی طرح شاعری کر رہے ہو۔ ہمیں زندگی سے بھرپور نظموں کی ضرورت ہے جو لوگوں کے جوش کو ابھارے"۔

میں بوڑھا نہیں ہوا تھا لیکن عمر میں پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ حصۂ نظم کے ایڈیٹر کو پختہ عمر ہونے کا ذاتی تجربہ نہیں تھا۔ اس لئے جب وہ کسی میں یہ چیز دیکھتا تو اسے یہ قبل از وقت بوڑھاپن نظر آتا۔ میری نظموں میں جو اداس لہجہ تھا وہ اس میں خطرناک قسم کی قنوطیت پسندی دیکھ رہا تھا گویا کہ بغیر محسوس کئے ہوئے اداس نظمیں لکھنا ممکن ہے۔ وہ لوگ جو اداسی اور غم میں خطرہ محسوس کرتے ہیں خود انسانیت کے لئے بے انتہا خطرناک ہوتے ہیں۔ مصنوعی رجائیت لوگوں کو خوش اور ترقی پسند نہیں بنا سکتی وہ صرف انہیں معطل کرتی ہے۔ صاف و شفاف۔ ایماندارانہ اور غیر جذباتی قسم کی اداسی اپنی بے چارگی اور لاچاری کے باوجود لوگوں کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور اپنے کرب و اضطراب سے انسانیت کے لئے عظیم روحانی دولت پیدا کرتی ہے

میں پہلے ہی کی طرح رجائیت پسند رہا۔ لیکن میری رجائیت جو پہلے گلابی تھی اب تمام رنگ لئے ہوئے تھی جس میں سیاہ رنگ بھی شامل تھا۔ اور اسی لئے وہ حقیقی اور پختہ معلوم ہوتی تھی۔

لیکن مجھے رجائیت کے اس مفہوم کے لئے جنگ کرنی پڑی۔ مخالفت اتنی سخت تھی کہ میری تقریباً تمام نظموں کی اشاعت رک گئی۔

اس وقت کی روسی ادبی تنقید پر "جدوجہد نہیں" "No Conflict" کا نظریہ حاوی تھا۔ اس کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ ہمارے سماج میں اچھے اور خراب کی جنگ نہیں ہے بلکہ اچھے اور اس سے اچھے کی جنگ ہے۔ بعد میں جب ہم کچھ لوگ اس نظریے کی تردید پر اتر آئے تو ہم نے یہ ثابت کرنے میں کامیابی حاصل کی کہ آج بھی سوویت سماج میں اچھے اور برے میں جنگ جاری ہے۔ لیکن ہمیں اس میں کافی وقت لگا دنیا کو ہلا دینے والے چند بین الاقوامی واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ہی ہم یہ بتا سکے کہ یہ رجائیت پسندی کس قدر خطرناک اور غیر اشتراکی ہے۔

اس زمانے کی کتابوں میں مسکراتے ہوئے کسان اور مزدور نظر آتے تھے۔ تقریباً ہر ناول اور کہانی کا اختتام خوشگوار ہوتا تھا۔ پینٹر اپنی تصویروں میں سرکاری تقریبات۔ شادیوں۔ عوامی جلسوں اور فوجی پریڈ کے مناظر بناتے تھے۔

ترجمہ: ق۔م۔ح

○

ہندوستان اور پاکستان کی اقلیتیں

مشرقی پاکستان۔ کلکتہ اور پھر مشرقی پاکستان اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اس بدنصیب برصغیر کی دو مملکتوں کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں ہم سے ضرور کوئی بنیادی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

تقسیم کے وقت یہ حقیقت صاف ظاہر تھی کہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں اقلیتوں کی بڑی تعداد رہے گی۔ اُس وقت کے لیڈروں نے اقلیتوں کے تحفظ کے لئے کئی تجاویز پر غور کیا تھا۔ آج اُن اوّلین اقدامات پر غور کرنا سود مند ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح ہم مستقبل کے بارے میں بہت کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستان کے بانی سے جب اقلیتوں کے مسئلے کے بارے میں جب بھی پوچھا گیا تو انہوں نے لاہور کے ریزولوشن کی طرف توجہ دلائی۔ وہ ریزولوشن یہ ہے:

"پاکستان کے علاقوں میں اقلیتوں کو قابلِ لحاظ، مؤثر اور قانونی تحفظات فراہم کئے جائیں گے۔ اُن کے مذہب، کلچر اور اُن کے سیاسی، اقتصادی اور انتظامی اور دوسرے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا اور اس بارے میں اُن کے مشوروں پر عمل کیا جائے گا۔ ہندوستان کے علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اُن کے لئے اور دوسری اقلیتوں کے لئے بھی قابلِ لحاظ، مؤثر اور قانونی تحفظات فراہم کئے جائیں گے اور اُن کے مذہبی، تہذیبی سیاسی، اقتصادی انتظامی اور دوسرے حقوق کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی اور اس بارے میں اُن کے مشوروں پر عمل کیا جائے گا۔"

اس طرح اس ریزولوشن کی نوعیت دستوری تحفظات کی سی ہو گئی جسے بہت مکمل طریقے پر ترتیب دیا گیا اور غیر جانبدارانہ طریقہ پر نافذ کیا گیا۔ بدقسمتی سے اس قسم کے تحفظات کی کارکردگی کی تاریخ پہلے ہی سے موجود تھی۔ خواہ وہ دستور بندی کی صورت میں ہو، یا فیصلوں کی ـــ مثال کے طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد کے فیصلے ـــ تاریخ بتاتی ہے کہ اگرچہ یہ تحفظات بہت کارآمد ہیں لیکن ان کی افادیت میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک نفسیاتی اور سیاسی مسئلے کو قانون کے فارمولے کے ذریعے حل نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں جس چیز کی ضرورت ہے وہ راہوں کا ہموار کرنا اور اکثریتی اور اقلیتی فرقوں کے درمیان جذباتی مساوات کی فضا قائم کرنا ہے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جس میں ماؤنٹ بیٹن پلان منظور کیا گیا تھا، افتتاحیہ تقریر کرتے ہوئے اچاریہ کرپلانی نے دونوں ملکوں پر زور دیا تھا کہ دونوں ملکوں کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کی جائے جو اقلیتوں کے بارے میں چھان بین کرے ـــ یہ اقلیتوں کے مسائل حل کرنے کے بارے میں بڑی ٹھوس تجویز تھی۔

لیکن لیڈر لوگ بہت جلد قانونی نقطۂ نظر کا شکار ہو گئے اور اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اسے ایک ادارے کی صورت دینے کے بجائے جیسا کہ اچاریہ کرپلانی کا مقصد تھا، ہمارے لیڈروں نے اقلیتوں کی حفاظت کو ایک مشترکہ مسئلہ بنا لیا۔ اسی لئے ملک کو تقسیم کرنے والی کونسل نے ۲۲ جولائی ۱۹۴۷ء کو جو بیان دیا اس میں یہ کہا کہ

"کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ وہ اختیارات حاصل ہونے کے بعد اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ اور مساویانہ سلوک کریں گی۔ مستقبل کی دونوں حکومتیں ان یقینات پر قائم رہنے کا پھر عزم کرتی ہیں۔"

"دونوں حکومتیں اس بات کا اعلان کرتی ہیں کہ اقلیتوں کے حقوق کی پوری شدت سے حفاظت کی جائے گی۔ ہندوستان کے وزیرِ اعظم نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہندوستانی دستور میں اقلیتوں کے حقوق کی پوری پوری ضمانت دی گئی ہے۔ وزیرِ اعظم پاکستان نے بیان کیا کہ اسی طرح کی دفعات قراردادِ مقاصد میں بھی موجود ہیں جسے پاکستان کی مجلسِ دستور ساز نے منظور کیا ہے۔ دونوں حکومتوں کی یہ پالیسی ہے کہ بلا امتیازِ مذہب و ملت دونوں ملک کے شہری اپنے ملک کے جمہوری حقوق استعمال کر سکیں گے۔"

"دونوں حکومتیں اس بات پر زور دیتی ہیں کہ اقلیتوں کی وفاداری اُسی ملک سے ہونی چاہیے جس کے وہ شہری ہیں اور انہیں اپنی شکایات اور تکالیف دور کرنے کے لئے اپنی ہی حکومت سے رجوع کرنا چاہیے۔"

اس کے ساتھ یہ بھی طے ہوا تھا کہ آسام اور دونوں بنگال کی حکومت میں اقلیتوں کا ایک ایک نمائندہ لیا جائے۔ اس کے بعد اقلیتی کمیشن کا

قیام بھی عمل میں آیا۔

۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء کا کلکتہ کا معاہدہ بھی اس مقصد کے حصول کے لئے ایک اہم قدم تھا۔ اس میں باہمی تیقن دیا گیا تھا کہ

"اقلیتوں سے کسی بھی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا اور اُن کے تہذیبی اور مذہبی حقوق کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی۔"

۸ اپریل ۱۹۵۰ء کو جو نہرو لیاقت معاہدہ تکمیل پایا اس نے اقلیتوں کے مسئلے کو بین الاقوامی شکل دے دی:

"ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں اقرار صالح کرتی ہیں کہ ہر حکومت اپنے ملک میں اقلیتوں کے ساتھ بلا امتیاز مذہب مطلق مکمل مساویانہ سلوک کرے گی۔ اُن کی جان، مال تہذیب و تمدن۔ ذاتی وقار۔ آزادی تحریر و تقریر، آزادی مذہب، آزادی حرکات و سکنات اور آزادی پیشہ و معاش کی بشرطیکہ قانون اور اخلاق کے حدود میں ہوں، پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کے افراد، اکثریتی طبقے کے افراد کی طرح مساویانہ حقوق کے حق دار ہوں گے نہیں اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اکثریتی فرقے کے افراد کے دوش بدوش اپنے ملک کی عوامی اور سیاسی زندگی میں حصہ لیں۔ سیاسی اور دوسرے عہدے قبول کریں اور اپنے ملک کی پولیس اور فوج کی خدمتوں پر مامور ہوں۔"

انہی معاہدات کی بنیاد پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان احتجاجات ہوتے رہتے ہیں اور دونوں ملکوں کے ہائی کمشنر فساد زدہ علاقوں کا دورہ کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاہدے بڑے مفید ثابت ہوئے تھے لیکن آج ان کی افادیت محدود ہو گئی ہے۔ آج ان کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اقلیتوں کے مسئلے کو بین الملکی جھگڑا بنا کر دونوں ملک ایک دوسرے کے انتظام مملکت میں دخل دیں۔ اقلیتوں کی مدد کرنے کی بجائے یہ معاہدے اور زیادہ اُن کے آڑے آ رہے ہیں۔ تقسیم کو پندرہ سال ہو چکے ہیں لیکن اقلیتوں کے سوال کی وجہ سے دونوں ملک ایک دوسرے کے انتظام مملکت میں دخل انداز ہو رہے ہیں۔

پاکستان برسوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے پروپیگنڈے کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ اسے اس کی مطلق پرواہ نہیں کہ خود ہندوستانی مسلمانوں پر اس کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ تازہ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ اس کی مثال ہے۔

حضرت بال کی درگاہ سے موئے مبارک کی چوری کو پاکستان نے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ مشرقی پاکستان کے فسادات کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کا اثر کلکتہ پر پڑا اور پھر اس کا بدلہ پوری شدت سے مشرقی پاکستان میں لیا گیا۔

کیا ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں اور خود ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کے لئے یہ بات سود مند نہیں ہوگی کہ اگر ہندوستان پاکستان سے صاف صاف کہہ دے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ بالکلیہ ہندوستانی حکومت سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں پاکستان کی مداخلت برداشت نہیں کی جا سکتی۔

"پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشیدگی نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ہزارہا مشکلات پیدا کر دی ہیں۔" ڈاکٹر ڈونالڈ ایوگن اسمتھ نے "ہندوستان بہ حیثیت ایک غیر مذہبی حکومت" پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہندوستان اور پاکستان میں کشیدگی خواہ وہ سرحدی جھگڑوں کی وجہ سے ہو، کشمیر کے سبب ہو یا کسی اور نزاع کے باعث، فوراً ہی ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نئی مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔"

یہ سلسلہ جلد از جلد ختم ہونا چاہئے۔ یہ سب کچھ لئے پریشان کن ہے۔

ان چیزوں کا خاتمہ ہندوستان کی قومی یکجہتی کے لئے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس سے خود ہندوستانی مسلمانوں کو بھی بہت بڑا فائدہ پہنچے گا۔ وہ اپنے حق کے لئے پوری شدت سے لڑ سکے گا۔ آج وہ اس موقف میں نہیں ہے۔ اس وقت یہ ہرگز نہیں کہا جا سکے گا کہ اپنے حقوق کے لئے جنگ کر کے وہ پاکستان کی مدد کر رہا ہے۔ اس وقت اس کی نوعیت ایک ہندوستانی شہری کی ہوگی جو اپنے حقوق منوانے کے لئے وہ تمام احتجاجی ذرائع استعمال کر رہا ہوگا جو ہندوستانی دستور کے تحت اُسے حاصل ہیں۔ اب تک ہم یہ افسوس ناک حقیقت دیکھتے آئے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر اپنی قوم پرستی ظاہر کرنے کے لئے حکومت کی ہر پالیسی پر خواہ وہ داخلی ہو یا خارجی اپنے طبقے کی وفاداری پیش کرنے کا چیخ چیخ کر اعلان کرتے ہیں۔ وہ لیڈر تو نظر نہیں آتا جو جرأت سے کام لے کر حکومت سے مسلمانوں کے مصائب کے بارے میں نمائندگی کرے اور ملازمت اور تعلیم کے میدان میں اُن کی مشکلات پیش کرے۔ (یہ کام جنوبی ہند کے مسلم لیگیوں پر چھوڑ دیا گیا ہے) مسٹر ایم۔ سی چھاگلا کی قسم کے سیاستدان بہت عام ہیں اور بہت آسانی سے مل جاتے ہیں جو بڑی زندہ دلی سے یہ کہتے ہیں کہ:

"اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی مسئلہ ہے تو وہ زیادہ تر صرف اس وجہ سے ہے کہ ہندوستانی مسلمان خود کو ہندوستان میں ضم کر دینے کیلئے راضی نہیں ہیں۔"

پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات سے مسلم اقلیتوں کے مسئلے کو ہٹا کر اُس جگہ رکھنا چاہئے جو واقعی اس کی جگہ ہے۔ یہ بالکلیہ جمہوریہ ہندوستان کا مسئلہ ہے اور اسے قومی یکجہتی کے دائرے میں رکھ کر حل کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اکثریتی طبقہ وسیع النظر اور سوچنے سمجھنے پر مائل ہو۔ اقلیتی طبقے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ مواقع کو زیادہ بہتر طریقے پر پرکھیں اور ہندوستانی

غلطیوں کی تعریف میں

بامیٹ لینڈ
ترجمہ: رشید الدین

آئے دن اخبارات اور رسائل کے ایڈیٹر قارئین کے ان گنت خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں جن میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے کی گئی غلطیوں کی جانب اُن کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے۔ لکھنے والے عموماً اس قسم کی باتیں لکھتے ہیں کہ فلاں ناول نگار نے اپنے ایک ناول میں پھاوڑے کی مدد سے زمین کھود کر کامیاب طریقے پر تیل نکالتے بتایا ہے! بھلا صرف پھاوڑے کی مدد سے کیونکر تیل نکالا جاسکتا ہے؟ یا فلاں افسانہ نگار نے اپنے ایک جاسوسی افسانے میں ایک انسپکٹر اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کے فرق کو اچھی طرح ملحوظ خاطر نہیں رکھا۔ بھلا پولیس کے محکمے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل کیونکر ایک انسپکٹر کے ساتھ زبان درازی کرسکتا ہے؟ یا فلاں افسانہ نویس نے اپنی ایک کہانی میں ایک مزدور سے فلسفیانہ مکالمے کہلوائے ہیں بھلا ایک مزدور کو فلسفہ سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

لکھنے والے گویہ خطوط بڑی ہی مستعدی سے لکھتے ہیں لیکن ایک پڑھنے والا اس بات پر تعجب کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُن کا کیس بہرحال بکمزور ہی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک مشہور ترین وکیل اور ہوشیار ترین بیرسٹر بھی اس قسم کے کیس میں اپنے موکل کو یہی پرخلوص مشورہ دے گا کہ وہ اسے عدالت میں نہ لیجائے کا۔ آخر کار ایک فن کار بھی ان غلطیوں کے بارے میں وہی بات کہے گا جو کلائیو نے برطانوی پارلیمنٹ میں اُس وقت کہی تھی جبکہ اس سلسلے میں اس پر مقدمہ چلایا جارہا تھا کہ اُس نے ہندوستان میں زیادتی کی، یعنی:

"خدا کی قسم جناب! مجھے خود اپنے اس اعتدال پر اچنبھا ہے۔"

آخر ایک ناول یا افسانے میں جس میں ساری دنیا سموئی ہوئی ہوتی ہے۔ ایک ادیب اگر چند غلطیاں کرجائے تو یہ ایسی کونسی تعجب کی بات ہے کہ۔ یہ چیز بہرحال ان مورخوں اور سوانح [illegible] تو بہتر ہی ہے جو اپنی تحریر [illegible] دیتے ہیں۔

میں نکتہ چیں غلطیاں ڈھونڈنے والوں اور اعتراض کرنے والوں سے بہت ڈرتا ہوں اور جب بھی کوئی چیز لکھتا ہوں تو اگر اس میں کوئی شبہ ہو تو فوراً انسائیکلو پیڈیا دیکھ لیتا ہوں اور یہ اطمینان کرلیتا ہوں کہ میں نے کوئی ایسی چیز تو نہیں لکھی جو اس کے مترادف ہو کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکلتا ہے یا قطب شمالی ایک ستارہ ہے وغیرہ۔ اکثر میں نصف شب کو نیند سے جاگ پڑتا ہوں اور اپنے پریس کو بھیجے ہوئے مضمون کے متعلق سوچتا ہوں کہ اس میں کوئی غلطی تو نہیں رہ گئی یا کوئی جملہ ایسا مبہم تو نہیں جس کا، پڑھنے والا کچھ اور مفہوم نکال لے۔

ایسے بہت سارے الفاظ ہیں جن کے معنی عام طور پر سمجھ میں نہیں آتے لیکن ایک قاری پھر بھی ان کو مزے لے کر پڑھتا ہے۔ ایسے جملے یا الفاظ اس لئے پسند نہیں کئے جاتے کہ پڑھنے والا اُن سے مرعوب ہوجاتا ہے بلکہ اُن میں ایک قسم کی اپیل اور اُن کی کیفیت ہوتی ہے۔ کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اپنی ایک نظم میں شاعر نے جن قیمتی پتھروں کا ذکر کیا ہے ان کے نام صحیح ہیں یا نہیں بلکہ وہ نظم کے مزاج اور الفاظ کی نشست و پیوست وغیرہ میں کھو کر رہ جاتا ہے جبکہ ایک پیشہ ور جوہری اس قسم کی نظم پڑھتے ہوئے اس میں کئی غلطیاں نکالتا ہے۔ اسی طرح جس طرح کہ کوئی درزی کسی بڑے مصور کی بنائی ہوئی تصویروں میں اور کچھ نہیں تو لباس کی تراش خراش کی غلطیاں ہی نکالنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک شاعر اپنی نظم میں وہ بات کہہ جاتا ہے جو ایک جوہری ہزار کوشش کے باوجود بھی ہم سے نہیں کہہ سکتا۔ ایک عام قاری کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ شاعر نے جن قیمتی پتھروں کا ذکر اپنی نظم میں کیا ہے وہ اُن سے کما حقہٗ واقف بھی ہے یا نہیں۔

قدیم تاریخ کی کتابوں میں جو غلطیاں کی جاتی ہیں ہم اُن پر ہنستے ضرور ہیں، مگر جب بھی کوئی تاریخی ثبوت دینے کا وقت آتا ہے تو ہم جدید اور ترمیم شدہ تاریخی کتابوں کی بجائے پھر ان ہی قدیم کتابوں کے حوالے دیتے

شہری ہونے کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ اب تک ہندوستانی مسلمان ان دونوں چیزوں سے لاپرواہی برتتے رہے ہیں۔

یہ بڑی افسوسناک چیز ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اب تک ایسا کوئی لیڈر نصیب نہیں ہوا جو انہیں ان باتوں سے روشناس کرائے۔ ایسا لیڈر جو ان کے جائز مطالبات کے حصول کے لئے بے جھجک لڑنے تیار ہو جائے جسے پاکستانی ایجنٹ کہلائے جانے کا ڈر نہ ہو اور جسے وزارت یا کسی اور عہدے کا لالچ نہ ہو۔

آخر میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقلیتوں کا مسئلہ بالکلیہ داخلی مسئلہ ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ یہ داخلی مسئلہ ہی نہیں رہتا دونوں ملکوں کی ڈپلومیسی سے اس مسئلے کی، علیحدگی دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے لئے بڑی، مددگار ثابت ہوگی۔

٭٭

جولیس سپے چک
سید رضا کاظمی

آزادی کی خاطر

اڑتے ہوئے بمبار کے لئے تو وہ بالکل آسان سا نشانہ تھا!

ایک مختصر سا گڑھا تھا جس کے اردگرد البوئے کے نصف درجن بچے بیٹھے رنگین گولیاں کھیل رہے تھے۔ جنگ چنگھاڑتی ہوئی مشینوں کو بند کر سکتی ہے۔ فن کے فنکاروں کو مٹا سکتی ہے اور شاید دیوتاؤں کو بھی منہ بند رکھنے پر مجبور کر سکتی ہے لیکن بچوں کے کھیل کو بند نہیں کرا سکتی۔

پائلٹ نے نشانہ باندھا اور بم بچوں کی ٹولی کے درمیان گرا۔

لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور گڑھے کی سمت دوڑے۔ لوگوں نے اپنی لال لال آنکھوں سے آنسوؤں کے پھول گراتے ہوئے، بچوں کے مردہ جسموں کو اپنی آغوش میں اٹھا لیا اور لاشوں کو اسکول کے برآمدے میں فرش پر رکھ دیا جہاں سے کچھ دیر پہلے بچے کھیلنے کے لئے باہر نکلے تھے۔

کچھ دیر بعد سرکاری فوٹوگرافر آ گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں کیمرہ سنبھال کر لاشوں کی تصویر اپنے سیاہ کیمرے کی اندرونی تاریکیوں میں محفوظ کر لی۔

تین روز بعد ناگہانی موت کی یہ تصویری دستاویزیں والیویانے سے لندن، لندن سے پیرس اور پراگ تک پہنچ چکی تھیں اور مشینوں کے کالک بھرے جسم سے ٹکرا ٹکرا کر اخباروں کے صفحۂ اول پر موٹی سیاہ حاشیہ والی سرخیوں کے تحت شائع ہو چکی تھیں۔ لوگوں نے ان خبروں کو ویسی ہی مضطرب نگاہوں سے گھور کر دیکھا جیسی نگاہیں حادثہ کے وقت البوئے کے رہنے والوں کی تھیں۔

موسم بہار اپنے شباب پر تھا۔

کوئلہ گودام کی پشت پر ایک تنہا درخت پھولوں سے لدا ہوا یوں نظر آ رہا تھا جیسے رم جھاگ، گاؤں کے مٹیالے دھوئیں بھرے ہوئے سمندر میں آسمان کے کسی اکیلے روشن ستارے کا عکس پڑ رہا ہو۔ اس درخت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا کہ وہ وہاں ایک پہرہ پر کھڑا ہو کر گاؤں کے بچوں کی رہنمائی کر رہا ہو تاکہ وہ کھیل کے مقام پر پہنچ جائیں۔

یہ چھوٹا سا گڑھا ایک ایسا مقام تھا جہاں وہ ننھے بچے کھیلنے کے لئے جاتے تھے اور گرد و غبار سے دور بیٹھ کر اپنے کھیل کی ادائیں سوچتے۔ یوں جیسے تنہائی میں بیٹھ کر کوئی شاعر اپنی نئی نظم کے لئے نئے نئے دلچسپ موضوع تلاش کرے۔ یہی تو ایک ایسا پرسکون گوشہ تھا جس کی سمت اسکول کے ماسٹروں کے قدم کبھی نہ اٹھتے تھے۔ جہاں کا کیچڑ بھرا راستہ لاریوں کی دوڑ دھوپ سے پٹ کر پختہ بن گیا تھا اور گولیاں اس راہ پر یوں لڑھکتیں جس طرح چکنے تختے پر پانی کی بوند پھسلے۔ یہی تو ایک ایسی جگہ تھی جہاں تھوڑی سی ہریالی نظر آتی۔ جہاں کوئلے کے ڈھیروں کا سخت سینہ چیر کر سبزہ پھوٹ نکلا تھا۔ جہاں کوئی اپنے ہمجولیوں سے لڑ سکتا تھا۔ سہانے سپنے دیکھ سکتا تھا، اور دو ایک کانچ کی رنگین گولیاں ہار جیت سکتا تھا۔

لیکن جس دن کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اس دن وہ چھ لڑکے کوئلے کے اس ڈھیر کے قریب کھیلنے، آپس میں لڑنے جھگڑنے، سہانے سپنے کے جھولے میں جھولنے یا رنگ برنگی گولیاں کھیلنے نہیں گئے تھے۔ انہوں نے تو اس صاف ستھرے گڑھے کی جانب جو حسب معمول ان کا منتظر تھا، دیکھا بھی نہیں۔ وہ سب تو راستے کے کنارے بیٹھ گئے۔ ہری ہری دوب کی جانب اپنی پشت کر لئے اور سر جوڑ لئے۔

فرنٹا نے اپنے اسکول کی کاپی کھول کر اندر سے اخبار کا تہہ کیا ہوا ٹکڑا نکالا۔ اور بڑی احتیاط سے اسے زانو پر رکھ کر سیدھا کیا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس نے باپ کو اخبار سیدھا کرتے دیکھا تھا۔ اخبار کے صفحے پر ایک کم سن لڑکے کا چہرہ ان کی طرف گھورتا ہوا نظر آیا۔ اس لڑکے کا بھیجا اڑا ہوا تھا۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ "البوئے کا ایک معصوم لڑکا"

فرنٹا نے آہستہ آہستہ بوڑھوں کی طرح اخبار پڑھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھی غور سے سننے لگے۔

اس نے پڑھا۔ البوئے پر بمباری کی رپورٹ۔ فاشزم کی بربریت کی خونی تفصیلات۔ اور اخبار کے ایڈیٹر کی طرف سے شائع ہونے والی، ظلم کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی اپیل۔

بچے ان تمام الفاظ کے مفہوم سے تو واقف نہ فرنٹا نے اٹک اٹک کر ہجے کر کے پڑھے تھے لیکن انہوں نے اپنی عقل و سمجھ کے مطابق ان کا مفہوم نکال لیا — البوئے کے لڑکے؟ ہاں وہ تو — ہم جیسے بچے۔ انہیں کے مانند وہ بھی تو کوئلے کے ڈھیر کے قریب گڑھے میں گولیاں کھیلنے گئے تھے۔ دفعتاً آسمان سے ان پر موت ٹوٹ پڑی تھی۔ معاً بچوں کی اداس نظریں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اکا دکا بادل آسمان پر تیر رہے تھے۔ لیکن وہاں کوئی دشمن نہ تھا۔ اپنی ننھی ننھی آنکھوں کو موند کر انہوں نے دشمن کی خیالی تصویر بنانے کی کوشش کی۔ مختلف ڈیل ڈول اور بھیانک چہرے نظروں کے سامنے

اُبھرے۔ پھر جلد ہی آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ گو اُن کے ذہنوں میں دشمن کی شکل متعین نہ ہو سکی لیکن لفظ دشمن ذہن پر مرتسم ہو گیا۔ وہ دشمن جس نے ایلوئے کے بچوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا اور ایلوئے کے دوسرے بچے اسی دشمن کے خلاف اُن کی امداد کے طالب تھے۔

"میرا بڑا بھائی اسپین چلا گیا ہے۔" روندا نے کہا۔ "والنٹیئر بن کر۔"

اور وہ نیچے اس قسم کی عملی امداد کے بارے میں سوچنے لگے۔

"لیکن تم بندوق نہیں چلا سکتے۔" فرزنا کا اعتراض معقول تھا۔ وہاں وہ لوگ بندوق چلانا سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں وقت لگے گا اور امداد کی آج ضرورت تھی۔ اس میں دیر کی گنجائش نہ تھی۔ آج اور ابھی امداد کی جانی چاہئے۔ اخبار میں چھپی ہوئی اپیل کا مضمون بالکل صاف تھا۔ فوری امداد کی ضرورت ہے!

تو پھر کیا کیا جائے؟

انہوں نے دوبارہ اخبار پر نظریں دوڑائیں یقیناً اخبار میں امداد دینے کا پورا طریقہ لکھا ہوگا۔

دفعتاً فرزنا نے اخبار کے ایک صفحہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ دیکھو۔"

اخبار میں امدادی رقم بھیجنے والوں کی طویل فہرست شائع کی گئی تھی۔ ..... پانچ، دس، پچاس سو کراؤن!

پگڈنڈی کے کنارے چھ جیبوں کی ریزگاری نکال کر ڈال دی گئی۔ لیکن مجموعی رقم نصف کراؤن سے زیادہ نہ ہوئی۔

یہ تو بہت کم ہے؟

انہوں نے پھر اخبار پر نظریں دوڑائیں۔ اس طویل فہرست میں کسی ایک نے بھی اتنی حقیر رقم نہیں دی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی امداد ہوئی۔ ؟ صرف نصف کراؤن ——؟

"کل میں اور رقم لے آؤں گا۔"

"نہیں کل تو بہت دیر ہو جائے گی۔"

کون جانے کل تک کیا ہو جائے۔ ان کی تساہلی کے باعث نہ جانے اسپین کے کتنے لڑکوں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔ کل؟ نہیں نہیں جو کچھ کرنا ہے، آج کرنا ہوگا۔

مایوس نظریں زمین پر گڑ گئیں۔ شاید کہیں کوئی ایک نوٹ یا سکہ گرا پڑا مل جائے! ہاں اکثر انہیں راستہ میں سکہ پڑا ہوا ملا ہے جسے کوئی راہ گیر بے خیالی سے گرا گیا تھا۔ کئی بار ایسا ہو چکا ہے —— اور وہ سب اس قسم کے پرانے واقعات کو اپنے ذہن میں کریدنے لگے۔

لیکن سڑک پر نہ کوئی نوٹ پڑا تھا اور نہ کوئی سکہ۔

چھ بچوں کے ننھے ننھے ذہن انتہائی سنجیدگی سے سوچنے لگے۔

دفعتاً اینٹونین نے کہا —— "میں —— میرے پاس —— میرے پاس ایک قلم تراش ہے" اُس نے ہچکچاتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔

خیالات کے دھارے کو ایک موڑ ملا۔

"بھلا ایک چاقو سے کیا ہوگا؟"

"کیا کچھ نہیں! اگر میں اسے بیچ دوں تو؟"

پانچ نمناک آنکھیں اینٹونین کے چہرے پر جم گئیں۔ اپنا چاقو بیچ دے! —— چاقو تو اینٹونین کا ایسا خزانہ تھا جس کی وجہ سے سب اسے رشک و حسد کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے لئے چاقو تو ایک مقدس تلوار کی مانند تھا جس پر ہاتھ رکھ کر وہ سب قسمیں کھایا کرتے تھے۔

کیا وہ واقعی اپنا چاقو فروخت کر دے گا! اپنی تمام پونجی؟

لیکن پونجی! جب انسانوں کی جانیں جا رہی ہوں تو پونجی کی کیا وقعت؟

دفعتاً فرزنا حالت اضطراب میں اٹھ کھڑا ہوا باقی سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرزنا نے اپنے ہاتھ کچھ ایسے انداز میں ہلایا جیسا کہ صرف بچے ہی کرتے ہیں یا پھر خطرہ کے عالم میں عمر رسیدہ افراد۔

فرزنا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی ڈبیا نکال کر زمین پر اینٹونین کے چاقو کے پہلو میں رکھ دی۔ یہ پالش کی ڈبیا تھی جو کبھی کیڑے مکوڑوں کو بند رکھنے کے کام آتی تھی تو کبھی کھڑکھڑاتی ہوئی گاڑی بن جاتی اور کبھی خلا وا ندی کے کنارے پر چلنے والا اسٹیمر۔ یہ ڈبیا اینٹونین کے قلمتراش کے برابر قیمتی تو نہ تھی لیکن اس کے ساتھ فرزنا کی مختصر زندگی کی تاریخ ضرور لپٹی ہوئی تھی۔

روندا نے اپنی تیرہ رنگ برنگی کانچ کی گولیاں کو ایک بار مٹھی میں بھینچ کر انہیں الوداع کہا اور چپکے سے گولیوں کو قلمتراش اور ڈبیا کے قریب رکھ دیا لیکن جب جوزف نے اپنی پیٹی اُتار کر زمین پر رکھ دی تو روندا کو شرم آگئی اور اُس نے اپنی چودھویں گولی بھی زمین پر رکھ دی۔ یہ اُس کی سب سے پیاری گولی تھی جو خالص جست کی بنی ہوئی تھی اور جس کی مدد سے وہ ہمیشہ جیتا تھا!

چھ جوڑی جیبیں اُلٹ دی گئی تھیں اور سڑک کے کنارے چھ بچوں کا سب کچھ اُن کی اپنی اور سب سے پیاری پونجی قرینے سے پہلو بہ پہلو رکھی ہوئی تھی...... ایک قلمتراش۔ ایک ڈبیا۔ ایک سیٹی۔ چودہ گولیاں رسّی کا ایک چھوٹا ٹکڑا۔ ایک پیٹی۔ کاغذ کا بنا ہوا ایک بٹوہ جو دیکھنے میں چمڑے کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چمکیلے پتھر کا چکنا ٹکڑا۔ ایک اسکرو ڈرائیور جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی اور دیگر بہت سی چیزیں جن کا مصرف ہم آپ نہیں جانتے۔ جن کا نام بھی ہم آپ بھول جاتے ہیں، جونہی ہم آپ بچپن کی سرحد پار کر لیتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں [illegible] ایک جھیل کی شکل میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔ بچے بچوں نے ایک بار پھر اپنی اپنی جیبوں کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اب یہ مجموعی امداد حقیر نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس کے بعد انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے فرنشا اور انٹونین سے کہا کہ وہ دونوں ان چیزوں کو فروخت کر دیں تاکہ جو رقم ملے وہ فوراً گھائل اور سسکتی ہوئی انسانیت کی مدد کے لئے بھیج دی جائے۔!

فلتا وانڈی کے دائیں ساحل پر پرانا شہر آباد ہے۔ جس کی تنگ اور پیچدار گلیوں میں آج بھی آپ کو کباڑیوں اور زیورات رہن رکھ کر سود پر رقم دینے والوں کی دوکانیں نظر آئیں گی۔ کتنے ہی مصیبت زدہ غربت کے مارے ہوئے اپنی مفلسی وہاں کے ساہوکاروں کے پاس رہن رکھنے کے لئے لے جاتے ہیں اور خود کو یہ تسلی دیتے ہوئے لوٹ آتے ہیں کہ اسے کچھ رقم میں تبدیل کر لینے سے وہ کسی حد تک کم ہو جائے گی!

اپنے غربت زدہ مفلس والدین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چھ لڑکے اُس گلی کی جانب چل پڑے۔ لوگ اپنی اپنی فکروں میں ڈوبے ہوئے ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو یہ بھی احساس نہ ہوا کہ اُن کے قریب سے ایک فاتح لشکر گذر رہا ہے جس میں صرف چھ ننھے ننھے سپاہی ہیں۔ اگر ان لوگوں میں سے کسی کو حقیقت کا احساس ہو جاتا تو یقیناً وہ اپنی ٹوپیاں اتار کر انہیں احتراماً سلام کرتے۔

آگے آگے فرنشا اور انٹونین تھے جنہوں نے اپنی اپنی جیبوں کو مضبوطی سے اپنی مُٹھیوں میں دبا رکھا تھا۔ ان سے دس قدم کے فاصلے پر بقیہ چار بچے مارچ کر رہے تھے۔ اور ان کی نظریں اپنے قافلہ سالاروں پر گڑی ہوئی تھیں۔

دونوں قافلہ سالار بوڑھے ایزک یہودی کی دکان پر پہنچ کر رک گئے۔ چاروں لڑکے قریب آ کر اٹینشن کھڑے ہو گئے۔ ان کے دل دھڑک رہے تھے لیکن وہ اپنی گھبراہٹ چھپانا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ اُن میں سے ہر ایک کو یہ احساس تھا کہ اُن کے ساتھیوں کی نظریں اُن پر جمی ہوئی ہیں۔

بوڑھا ایزک کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اُنہوں نے خاموشی سے تمام مال اُس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ڈبیا۔ سیٹی۔ رسّی کا ٹکڑا۔ گولیاں اور آخر میں انٹونین کا قلمتراش! اور انہوں نے اپنی نظریں بوڑھے ایزک کے جھرّیوں بھرے چہرے پر گاڑ دیں۔

لیکن اُن کی نظروں میں اُس خوف کی جھلک نہ تھی جو اُن کی ماؤں کی آنکھوں میں اس لمحہ نظر آتی۔ جب وہ اپنی زندگی کی کوئی یادگار کوڑیوں کے مول فروخت کرنے آتے اُن کی آنکھوں میں تو فتح کی چمک تھی۔

بوڑھے ایزک نے ایک نگاہِ غلط انداز اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں پر ڈالی اور تیوریاں سکیڑ کر بولا۔

"اس کوڑا کرکٹ کا میں کیا کروں گا۔؟"

لڑکے خاموش کھڑے رہے

"میں اُن کا کیا کروں گا۔" وہ چلّایا "اٹھاؤ اسے یہاں سے بدمعاشو اور فوراً بھاگ جاؤ۔"

"ہم یہ سب فروخت کرنے کے لئے لائے ہیں!" فرنشا نے تیزی سے کہا۔

بوڑھا ایزک بڑا قیافہ شناس تھا۔ وہ آواز سن کر بتلا سکتا تھا کہ کون خوشامد کر رہا ہے۔ کون عاجزی کر رہا ہے۔ کون پہلی بار آیا ہے، کون دوسری بار۔ کون ایک دفعہ ٹھگ کئے جانے پر دوسری دفعہ نہ آئے گا کون اپنے بلیزر کے کوٹ کو دوبارہ بیچنے آنے کے بجائے مٹی چاٹنا گوارا کرے گا۔ فرنشا کی آواز اور اس کا لہجہ کچھ دوسرے ہی قسم کا تھا۔ ایسی آواز اُس نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ سوچنے لگا۔ یہ شریر لڑکے کیا کچھ اور نہیں کر سکتے۔ سوائے سگریٹ کے لئے کچھ رقم۔" جملے کا آخری حصہ اُس نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ لڑکوں نے سُن لیا۔

"نہیں سگریٹ کے لئے رقم نہیں چاہئے۔" فرنشا نے سخت لہجے میں کہا۔

"او۔ تو شاید سینما کے لئے!"

"نہیں سینما کے لئے بھی نہیں" فرنشا نے غصّہ بھری آواز میں کہا۔ "یہ رقم اسپین کے لئے ہے!"

چند لمحہ دکان میں مکمل سکوت رہا۔

آئزک کے ذہن میں اُس کی گذشتہ زندگی کی تمام تلخ و شیریں داستانیں گھوم گئیں اور فرنشا خود اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ کیوں اس نے یہ بات اس بوڑھے یہودی کو کیوں بتا دی۔ اب یہ پولیس کو اطلاع دے دیگا۔ [illegible] تمام پونجی ضبط کر لی جائیگی اور ایلوے کے بچوں کو امداد نہ پہنچ سکے گی۔

اُس نے آہستہ سے کاؤنٹر کی جانب ہاتھ بڑھایا تاکہ جو کچھ مٹھی میں آ سکتا اُٹھا لے۔۔۔ "رہنے دو" ایزک چیخا

ایزک نے فرنشا کی ڈبیا اٹھائی اور اُسے اُلٹ پلٹ کر غور سے دیکھنے لگا۔ "ہوں۔ ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "ڈبیا کچھ ایسی خراب نہیں لیکن میں اس کے لئے دو کراؤن سے زیادہ نہیں دوں گا اور یہ" اُس نے انٹونین کا قلمتراش اپنے ہاتھ میں لیا اور لڑکوں کی جانب دیکھا۔ "اچھی چیز ہے۔ اس کے ۔۔۔ تم کہتے ہو کہ یہ رقم اسپین کے لئے چاہئے۔ نیک خیال ہے ۔۔۔ اس کے لئے پانچ کراؤن مناسب ہے۔"

اور بچے اپنی سانسیں روکے سوچ رہے تھے۔ کتنی بڑی فتح ہوگی ایلوے کے ساتھیوں کی ۔۔۔ اتنی رقم ۔۔۔ اتنی بڑی امداد۔

بوڑھے ایزک نے ایک ایک چیز کا مناسب دام لگایا ۔۔۔ رسّی کے ٹکڑے کا ۔ چپکیلے پتھر کا ۔ اور معطّر کی جستے کی گولی کا ۔!

اور پھر اس نے اس خیال سے کہ ریزگاری کی شکل میں رقم زیادہ معلوم ہوگی، بیس کراؤن گن کر کاؤنٹر پر پھیلا دئے ۔۔۔ !!

(ایک ہسپانوی کہانی) ++

مُدیرِ صدق" کا ایک نوٹ

مولانا عبد[illegible]

رسالہ "صدق" میں "سچی باتیں" کے عنوان کے تحت مذہبی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پر جس مخصوص انداز میں تبصرہ فرمایا کرتے ہیں، اس سے لوگ واقف ہیں۔ مولانا کے قلم سے نکلے ہوئے نوٹ میں بلا کا طنز ہوتا ہے اور کبھی بڑی تلخی۔ جس زور و شور کے ساتھ وہ مسلمانانِ ہند کے "حقوق کی پامالی" کا نوحہ کرتے ہیں اس سے ان کے قومی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا موصوف کو اس بات میں بڑا کمال ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے کوئی بات یا واقعہ اس طرح اٹھا لیتے ہیں کہ جیسے کوئی آدمی اپنی دو انگلیوں میں، پلیٹ سے رس گلا اٹھا لے۔ پھر اُسے مولانا موئے قلم کی مدد سے کچھ ایسے رنگ دے کر پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر بڑا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی غیر مسلم پیغمبرِ اسلام یا مذہبِ اسلام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کبھی اُن کی عظمت یا فضیلت کا کوئی پہلو اُجاگر کرتا ہے تو ہمارے ہندوستانی مسلمان بھائی خوشی سے پھول جاتے ہیں خوش ہو لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں لیکن افسوس اس وقت ہوتا ہے جبکہ لوگ اس غیر مسلم کے خیال اور اُس کی رائے کو سند کے طور پر استعمال کرتے ہیں کیونکہ اس طرح تو ایسا لگتا ہے جیسے خود انہیں (مسلمانوں کو) اپنے عقیدہ پر کچھ شک سا ہو تا رہا ہو۔ جسے دُور کرنے کی خاطر اُنہیں کسی خارجی شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر تماشہ یہ کہ ایسے موقعوں پر کوئی یہ بھی نہیں سوچتا کہ کہنے یا لکھنے والا کون ہے؟ اُس کا مایۂ علم کتنا اور کیسا ہے؟

"صدق" کی ایک حالیہ اشاعت میں مولانا عبدالماجد [illegible] ایک نوٹ تحریر فرمایا ہے۔ عنوان دیکھ کر پہلے تو گمان ہوا کہ یہ بیان کرنا مقصود ہوگا کہ بعض لوگوں کے لئے قرآنِ مجید کی اشاعت، طباعت یا قرآنی علوم سے متعلق تصنیفات کس طرح جلبِ منفعت بن کر باعثِ برکت ثابت ہوتی ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ مولانا نے اس نوٹ میں بی۔ بی۔ سی (لندن) کے رسالے لسنر (LISTNER) کے ایک مضمون پر تبصرہ فرمایا ہے۔ جس کا عنوان ہے "قرآن کا زندہ اثر" مولانا کو اعتراف ہے کہ وہ اس رسالہ کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اتفاقیہ طور پر ان کی نظر اس مضمون پر پڑ گئی تھی۔ چونکہ بعض اسلامی امور اور معاملات پر مضمون نگار نے کچھ توصیفی پہلو اختیار کیا ہے اس لئے مُدیرِ صدق نے نہایت خوشی خوشی اسے، بہ طور سند "دنیائے اسلام کے سامنے پیش کر دیا۔ فرماتے ہیں

"قرآن مجید کی جو روحانی و دینی برکتیں ہیں انہیں چھوڑئیے، خالص، دُنیوی، مادّی، سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے بھی کتنی بڑی دولتِ بے بہا اُمت کو مل گئی تھی۔ کیسی حرص و رشک کی نظروں سے بیگانے اسے دیکھ رہے ہیں اور اس وجہ کی بیدردی سے ہم اس نعمت کی کیسی ناقدری بھی کر رہے ہیں۔"

لسنر کے مضمون کا لب لباب یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے خاصے بڑے حصے میں عربی، ایک مشترکہ زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ وہ زبان ہے جو قرآن نے عطا کی ہے ..... یہ قرآنی مکتبوں ہی کا کرشمہ ہے کہ عربی زبان اب تک خالص صورت (؟) میں قائم ہے اور عربی میں اپنے عقیدے کے ساتھ ساتھ قرآنی الفاظ کا احترام بھی قائم ہے" — ترجمہ کی پیچیدگی کو نظر انداز کیجئے پھر بھی یہ کونسی انوکھی بات ہوئی۔ کون سا انکشاف ہوا؟ اس اقتباس سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تو پھر اس کی اشاعت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدیرِ صدق جو مغرب سے علمبردار اور مشرقی قدروں کی فضیلت کے قائل ہیں لسنر کے مضمون سے صرف اس لئے متاثر ہو گئے کہ یہ ایک انگریز کے قلم سے نکلا تھا اور لندن کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے بطور سند پیش کر دیا۔

اگر لسنر کا رسالہ اور انگریز مضمون نگار کی رائے اتنی ہی واجبِ احترام ہے تو کیا فرماتے ہیں مدیرِ صدق اسی رسالہ لسنر کی اشاعت مورخہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کے بارے میں جس کے صفحہ ۹۷۵ پر رسول اللہؐ کو گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے۔ پیچھے آپ کے رفقاء دکھائے گئے ہیں جن میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ ایک فرشتے کو خوشبو چھڑکتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سامنے ایک قلعہ ہے جس کی فصیل پر کچھ لوگ کھڑے ہوئے خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

کیا مولانا اس تصویر کو بھی بطور سند پیش کرنا پسند فرمائیں گے؟

مولانا موصوف جیسے عالمِ دین اور فاضلِ وقت اور بلند پایہ مصنف کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مذہبی معاملات میں رائے اور تبصروں سے پہلے چھان بین کر لینا فرضِ اولین ہے ورنہ اکثر شدید غلط فہمیوں کا احتمال ہوتا ہے۔

"کیا ڈاکٹر نے اُسے پیٹ کا درد دُور کرنے کی دوا دی ہے؟"

"پیٹ کا درد۔ ارے بھائی وہ اس قدر لمبیر ہے کہ اُسے تو سرطان کی دوا دی جانی چاہیئے۔"

مکتوبِ نیویارک

اے۔آر۔قریشی

ایک عجیب وغریب ٹریڈ یونین ......
جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ ......
...... مجرم جو قانون کی زد سے ہمیشہ باہر رہتا ہے
...... ملک کے سب سے بڑے افسر سے ٹکر

امریکہ میں حکومت اور ٹریڈ یونینوں
درمیان ایک ایسا عجیب وغریب تعلق ہے کہ شاید
کے کسی ملک میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ وہ
۔ دوسرے کے ساتھ ایک امن پسند اور باشعور شہریان
فراد کی طرح سلوک روا رکھتے ہیں۔ کیونکہ دونوں
نزم کے خلاف نظریاتی طور پر متفق ہیں کبھی کبھی
لی بنیادوں پر ٹریڈ یونینوں اور حکومت کے
یان سنگین تنازعات بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن
لو اصولی و بنیادی طور پر ہی فوراً حل کر دیا جاتا ہے
۔ اس طرح بجائے کسی سنگین تصادم کے ہمیشہ خوشگوار
ں پر تنازعات کا منصفانہ تصفیہ کر دیا جاتا ہے۔
تمام ٹریڈ یونینوں میں صرف ایک یونین ایسی ہے
ہمیشہ حکومت سے نبرد آزما رہتی ہے۔ اور اس
تعلقات کبھی حکومت سے خوشگوار نہیں رہے۔ اس
نین کا نام "انٹرنیشنل برادرہڈ آف ٹیمسٹرز" ہے
ومت اور ٹیمسٹرز کے درمیان کشیدگی کی وجہ اس
ظیم کی وہ خطرناک طاقت ہے جس سے خود حکومت
ف کھاتی ہے کیونکہ یہ یونین دوسری یونینوں سے
را مختلف ہے۔

یونین کیا ہے جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ ہے
غیر قانونی اور تشدد پسندانہ سرگرمیوں سے ہمیشہ خوف
اس کی ایک فضا قائم رکھتا ہے۔ حکومت اور یونین
کے درمیان کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ اس تنظیم
سرغنہ جیمز ہوفا نامی ایک شخص ہے جس نے امریکہ
ناکوں چنے چبوا دئے ہیں۔ وہ اس تنظیم پر پوری
طرح حکمران ہے اور اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ جب
چاہے اپنی مرضی مطابق فنڈ میں سے ہزار ہا ڈالر جہاں
چاہے خرچ کر دے۔ وہ اپنے اس اثر او طاقت
کی بناء پر جب چاہے ملک کے ایک سرے سے
دوسرے سرے تک مکمل ہڑتال کرا کر تمام کاروبار
اور مواصلاتی نظام کو درہم برہم کر سکتا ہے۔ یوں سمجھئے
کہ "ٹیمسٹرز" ایک الگ حکومت ہے اور ہوفا امریکہ
کی معاشیات پر قابض ہے۔ اس مستقل دردِ سری
سے نجات حاصل کرنے کے لئے امریکی حکومت ہوفا کو
اس اقتدار سے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کر چکی ہے
حکومت چاہتی ہے کہ کسی طرح ہوفا کی بدعنوانیوں اور
ٹیمسٹرز اور ملک کے جرائم پیشہ طبقے کے درمیان تعلق
ثابت کر کے اس کو قانون کی زد میں لائے لیکن ابھی حکومت
اس سلسلے میں قطعی ناکام ہے۔ بلاشبہ ہوفا ٹریڈ یونینسٹ
کم اور بدمعاش زیادہ ہے لیکن اس کو ثابت کرنا ایک
الگ مسئلہ ہے۔

ہوفا کے .... ایک مثال یہ بھی
ہے کہ وہ اکثر یونین کا فنڈ بے دریغ اپنی ذاتی ضروریات
پر خرچ کرتا ہے اور ایسی بے ہنگم سرگرمیوں پر جن کا یونین
کے مفاد سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ لیکن ہوفا
ایک ایسا ذہین شخص ہے کہ وہ اپنی انتظامی قابلیت اور
منفرد صلاحیتوں کی بناء پر اب تک اس قسم کی کسی
گرفت میں نہیں آیا۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اسے
یونین کے فنڈ کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے
کا پورا اختیار ہے وہ جب چاہے اس بل بوتے پر
شہادتیں خرید سکتا ہے۔ بڑی سے بڑی مدد حاصل
کر سکتا ہے اور بڑے بڑے وکیل حاصل کر کے
قانونی حملے کو پسپا کر سکتا ہے۔

اسی طرح گذشتہ دس سال سے اس پر مقدمے
پر مقدمے چلتے چلے آ رہے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے
کہ ملک کی پوری انتظامیہ اپنے تمام تر قانونی اور مادی وسائل
کے باوجود ایک مجرم کو مجرم ثابت کرنے میں اب تک ناکام
ہے۔ ہر طرف سے اس پر قانون کے جال پھینکے جاتے
ہیں لیکن وہ ہر مرتبہ ان جالوں کو مکڑی کے جالوں کی
طرح توڑ کر بہ آسانی نہ صرف نکل جاتا ہے بلکہ اکثر اپنے
مخالفین کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ اور اب یہ کشمکش
روز بروز سنگین صورتِ حال اختیار کرتی جا رہی ہے
حتیٰ کہ حال ہی میں ہوفا اور امریکہ کے اٹارنی جنرل اور
سابق صدر کینیڈی کے چھوٹے بھائی رابرٹ کینیڈی کے
درمیان دو بدو جنگ کا سلسلہ چل نکلا ہے کیونکہ رابرٹ
کینیڈی امریکہ سے بدمعاشی اور لاقانونیت کی بیخ کنی کے
کے لئے ایک منظم مہم کا آغاز کر چکے ہیں لیکن خیال ہے وہ
بھی جلد یا بدیر اس چالاک ٹریڈ یونینسٹ سے مات
کھا جائیں گے کیونکہ اس کی خطرناک شاطرانہ چالوں
کے سامنے نوجوان اٹارنی جنرل کی سادگی اور خلوص
کے مہرے نہیں ٹھہر سکتے۔

بہرحال دو بدو جنگ کا یہ سلسلہ جاری ہے

اور اس سلسلے کی کڑی ایک حالیہ مقدمہ ہے جو ہوفا پر قائم کیا گیا ہے جو، چاٹا نوگا کے ایک چھوٹے سے قصبے کی وفاقی جرگہ میں چل رہا ہے لیکن حکومت کی طرف سے عائد کردہ بہت سے الزامات ثبوت نہ ہونے کے سبب اب تک مسترد کئے جا چکے ہیں کیونکہ اُن کا ثبوت فراہم کرنا بہت مشکل ہے۔

البتہ توہین عدالت کے سلسلے میں اس پر ایک مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور الزام یہ ہے کہ اس پر جب ۱۹۶۲ء میں ناشوائل کے مقام پر جرگہ میں مقدمہ چل رہا تھا تو اس نے جرگہ کے ممبروں کی توہین کی تھی مقدمہ کے دوران ہوفا کے خلاف ایک گواہ ایڈورڈ گریڈی پارٹین نے جو کئی سال ہوفا کا نائب رہا اور اس دوران انتظامیہ کی طرف سے اس کی جاسوسی بھی کرتا رہا، شہادت کے دوران بتایا کہ ہوفا نے اپنے قریبی دوستوں کے سامنے کہا تھا کہ جرگہ کو خریدنے کے لئے اگر اسے ۳۰ ہزار ڈالر بھی خرچ کرنے پڑے تو وہ کرے گا اور ناشوائل کے مقدمے کے دوران ہوفا نے بڑے تحکمانہ انداز میں جرگہ کے ممبروں سے تلخ کلامی بھی کی تھی اور اس مقدمہ کے ختم ہونے کی وجہ یہی تھی کہ جرگہ ممبر اس خطرناک شخص کی سرگرمیوں سے خائف ہو گئے تھے۔ ہوفا اس موقعہ پر اپنے سابق ساتھی کی شہادت کو خاموشی سے سنتا رہا۔

اُسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ حکومت بھی اس اُس کے خلاف وہی حربہ استعمال کرے گی جو وہ خود حکومت کے خلاف استعمال کرتا رہا تھا۔ یہ ہوفا پر پہلی چوٹ تھی۔ اس کے وکیلوں نے اس شہادت کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے گواہ پر نشہ کا الزام لگایا اور کہا کہ پارٹین عصمت فروشی کے کاروبار میں ملوث ہے، یا پیشہ ور جھوٹا گواہ ہے وغیرہ وغیرہ

لیکن ہوفا نے جو اس وقت تک بالکل کون کے ساتھ کھڑا تھا، گواہ پر الزامات لگاتے ہوئے کہا کہ پارٹین جو میری گواہی کے لئے معاوضے پر لایا گیا ہے اُس کے کردار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی دغا شعاریوں پر زندگی بھر نظام قائم رہا اور جوان سال لڑکیوں سے معاشقے لڑاتا رہا جس نے نہ صرف اپنی بیوی کی زندگی تباہ کی بلکہ اولاد کا مستقبل بھی تاریک کر دیا۔ اس کی ضمیر فروشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کے عظیم ترین دشمن کاسترو کو خفیہ طور پر ہتھیار سپلائی کرتا رہا اور اس نے ان حقائق کو اس اعتماد اور خوبصورت انداز میں پیش کیا کہ اس وقت وہ ملک کا سب سے زیادہ محب وطن شہری معلوم ہوا۔ اور اُس پر الزامات لگانے والا گواہ مجرم کی حیثیت سے کھڑا اُس کا منہ تک رہا تھا۔ بلاشبہ اس نے جس انداز میں یہ جوابی الزامات گواہ پر لگائے ہیں وہ اُس کے وکیلوں سے کئی گنا زیادہ موثر اور کامیاب تھے کیونکہ جنسی بے راہ روی اور (تعدادِ ازدواج) اور کاسترو کا مدد دینا امریکہ میں سب سے بڑے جرائم شمار ہوتے ہیں۔ حالانکہ آگے چل کر ملزم نے ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کر دیا لیکن ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے کہ جیسے ہوفا ایک مرتبہ پھر اس جال سے نکل جائے گا۔

اب معلوم ہوا ہے کہ رابرٹ کینیڈی اور امریکہ کے وفاقی محکمہ کے سربراہ ایڈگر ہوور بھی اس کے خلاف بطور گواہ پیش ہوں گے اور اس طرح ہوفا کے وکلا کے خیال کے مطابق آنے والے معزز گواہوں کا بھی وہی حشر ہو گا جو پارٹین کا ہو گا۔

ہو سکتا ہے کہ امریکہ کے یہ دو اہم اعلیٰ افسر، ان حالات میں ہوفا کے خلاف چاٹا نوگا کی عدالت میں جا کر گواہی نہ دیں۔ ان حالات کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ہوفا ابھی تک مضبوط ہے اور اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی پوری پوری قوت بھی موجود ہے اور عین ممکن ہے کہ قانون کے نئے جال بھی ایک بار پھر مکڑی کے جالوں کی طرح ٹوٹ جائیں اور ہوفا کپڑے جھاڑ کر ان سے باہر نکل آئے۔

☆☆

واحد پریمی

غزل

خوشا یہ جرأتِ تعمیرِ نو دیوانے کی
قفس میں رکھی ہے بنیاد آشیانے کی

خوشی کی خوشی ہے نہ غم کا غم کوئی
یہ انتہا ہے مرے درد کے فسانے کی

یہاں جو آیا وہ اپنا ہی خون پیتا رہا
بہت پرانی ہے یہ رسم بادہ خانے کی

میں ایک تنکا سہی راہِ زیست کا لیکن
مجھے اڑا نہ سکے گی ہوا زمانے کی

وہ لوگ ہی تو ہیں دراصل کامیابِ حیات
جو سعی کرتے ہیں غم میں بھی مسکرانے کی

جنونِ ذوق پرستی نہیں ہے اب شاید
بجھی بجھی سی ہیں کیوں شمعیں آستانے کی

جو اٹھ سکو تو اٹھو آندھیوں کی صورت تم
بدل سکو تو بدل دو فضا زمانے کی

ہمیں وہ اہلِ جنوں ہیں کہ ایک دن واحد
رکھیں گے برق پہ بنیاد آشیانے کی

سگریٹ نوشی
ایک مہلک خطرہ!

پچھلے دنوں امریکہ میں واشنگٹن کے ایک بہت بڑے ہال میں حکومت نے ۱۰۰ نامہ نگاروں اور امریکہ کے دس چوٹی کے ڈاکٹروں کو ۳ گھنٹے کیلئے بند کر دیا۔

اس قید کا تعلق جرم و سزا سے نہیں تھا بلکہ اس اجلاس میں امریکہ کے بہترین طبی دماغ دنیا کے نامہ نگاروں کے سامنے سگریٹ نوشی اور صحت پر اُس کے اثرات کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کر رہے تھے

یہ رپورٹ ایک لاکھ پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل تھی اور نتائج تک پہنچنے کے لئے ان ڈاکٹروں کو ۱۴ مہینے لگے تھے۔ اس طویل رپورٹ کا لب لباب پہلے صفحے پر موٹے موٹے حرفوں میں چھپا ہوا تھا۔

"سگریٹ نوشی صحت کے لئے بہت خطرناک چیز ہے اور اس کے روکنے کیلئے مناسب اقدامات کئے جانے چاہئیں۔"

چونکہ مسلسل سگریٹ نوشی ہمیشہ دل بیماریوں اور پھیپھڑے کے سرطان کی وجہ بتائی گئی ہے اس لئے ڈاکٹروں کی یہ رپورٹ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے لیکن جو چیز توجہ طلب ہے وہ ہے ڈاکٹروں سگریٹ نوشی کی روک تھام اور اس سے پیدا شدہ بیماریوں کے علاج کے بارے میں حکومت کو آگاہ کرنا۔ اس رپورٹ میں علاج کے طریقوں پر بحث نہیں کی گئی اور ڈاکٹروں نے اس بارے میں جوابات دینے سے پہلو تہی کی ہے کیونکہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے امریکہ کی ایک بہت بڑی صنعت زندہ ہے جس سے سالانہ ۸ ارب ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔

جب نامہ نگاروں نے سگریٹ نوشی کے انسداد کے بارے میں مزید معلومات کے ڈاکٹروں کو مجبور کیا تو انہوں نے چار طریقے بتائے۔ جن کے ذریعے حکومت اس خطرے کی روک تھام کر سکتی ہے۔

★ سگریٹ نوشی کے خلاف تعلیمی مہم چلائی جائے

★ سگریٹ کے پیکٹوں پر تمباکو کی قسم اور دوسرے اجزا کا اعلان۔

★ پیکٹوں پر سگریٹ نوشی سے صحت کو خطرہ لاحق ہونے کی وارننگ ہو۔ اور سگریٹ کے اشتہارات پر پابندی ہو۔

سگریٹ پینے والوں کے لئے اس رپورٹ میں ذرا سا بھی تسکین کا پہلو نہیں ہے۔ ایک ڈاکٹر نے اقبال کیا کہ وہ "بلا نوش" ہے اور وہ ہمیشہ فلٹر لگے ہوئے سگریٹ پیتے ہے۔ لیکن رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فلٹر لگے ہوئے سگریٹ بھی صحت کے لئے اتنے ہی مضر ہیں جتنے سادہ سگریٹ۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے ایسا سگریٹ ایجاد ہونے کی بھی کوئی امید نہیں جس سے سرطان سے بچاؤ ہو سکے۔

ایک ڈاکٹر نے جو دو مہینوں سے سگریٹ کی بجائے پائپ پینے لگے تھے پوری رپورٹ کو انسانی نقطۂ نظر سے جانچتے ہوئے کہا۔

"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں ایک نوجوان کو رائے دوں گا کہ وہ سگریٹ پینا شروع نہ کرے اور ایک سگریٹ پینے والے کو کہوں گا کہ وہ سگریٹ پینا بند کر دے اور اگر وہ اس کے بعد بھی سگریٹ پیتا رہے تو میں کہوں گا کہ وہ ایسا کرکے ایک بڑا خطرہ مول لے رہا ہے۔"

رپورٹ میں سگریٹ نوشی۔ سگار اور پائپ میں امتیاز برتا گیا ہے۔ سگار اور پائپ گو بہر حال صحت کے لئے خطرناک ہیں لیکن سگریٹ سے ذرا کم۔ سگریٹ کے بارے میں رپورٹ میں کہا گیا ہے۔

★ مردوں میں سرطان کی بیماری سگریٹ نوشی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دوسری سب وجوہات ضمنی ہیں حتّٰی کہ خرابیٔ ہوا بھی۔ ۱۹۶۲ء میں امریکہ میں اس کی وجہ سے ۴۱ ہزار آدمی مرے۔ عورتوں کو سگریٹ

- پچھلے سال امریکیوں نے ۵۲۳ ارب سگریٹ اور ۷ ارب سگار پھونکے اور تقریباً ۶۵ لاکھ پونڈ تمباکو کھایا۔
- تقریباً ۷ لاکھ ۵۰ ہزار امریکی تمباکو کی کاشت کرتے ہیں۔
- تقریباً ۹۶ ہزار امریکی سگریٹ اور سگار کی کمپنیاں چلاتے ہیں۔
- ۶۳ء میں سگریٹ اور سگار کی برآمد سے ۱۵ کروڑ ڈالر حاصل ہوئے۔

نوشی کی وجہ سے پھیپھڑوں کا سرطان مردوں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔ زیادہ سگریٹ پینے کی وجہ سے پھیپھڑوں کے سرطان کا خطرہ ہر آن بڑھتا جاتا ہے اور سگریٹ نوشی ترک کر دینے سے خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

★ سگریٹ نوشی سوکھی اور پرانی کھانسی کی سب سے اہم وجہ ہے۔ اس بیماری سے موت کا خطرہ بہت قریب آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ سگریٹ نوشی سے پھیپھڑوں میں ہوا کا پوری طرح گزر نہیں ہوتا اور یہ چیز انسان کے لیے بڑی ہلاک ہے۔

★ سگریٹ نوشی کے سرطان کا بڑا نمایاں سبب ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس سے ۲۱۰۰ آدمی مرے۔

★ دل کی بیماریوں کی سب میں بڑی وجہ سگریٹ نوشی ہے۔ دل کی حرکت بند ہو کر مرنے والوں میں ۷۰ فیصد سگریٹ نوش ہوتے ہیں۔ امریکہ میں اس مرض سے مرنے والوں کی تعداد ۵ لاکھ ۷۷ ہزار ہے۔

★ جو عورتیں دورانِ حمل میں سگریٹ پیتی ہیں اُن کے بچے عام بچوں سے کم وزن کے پیدا ہوتے ہیں اور اُن کی زچگی اکثر قبل از وقت ہو جاتی ہے لیکن یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ آیا ایسے بچے سگریٹ پینے والی ماؤں کے بچوں کی بہ نسبت کم صحت مند ہوتے ہیں۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سگریٹ نوشی کی وجہ سے اکثر آگ لگنے کے حادثات ہوتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق آگ لگنے کی وجہ سے جو اموات واقع ہوتی ہیں، اُن میں ۱۸ فیصد موتیں لاپروائی سے سگریٹ پی کر پھینکنے اور اُس کے نتیجے کے طور پر آگ لگنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

ڈاکٹروں کی کمیٹی نے جس میں پانچ سگریٹ نوش ڈاکٹر شامل ہیں اپنی رپورٹ میں کہا کہ انہوں نے سگریٹ نوشی کی موافقت میں دلیلیں ڈھونڈھنے کی بے حد کوشش کی لیکن یہ دلائل کہ اس سے پیٹ کا نظام ٹھیک رہتا ہے اور وزن کو بڑھانے سے روکا جاسکتا ہے، طبی نقطۂ نگاہ سے بالکل غیر اہم ہیں۔ البتہ یہ بات کہ سگریٹ نوشی سے سکون ملتا ہے جو ذہنی تندرستی کے لیے مفید ہے ایک حد تک ٹھیک ہے لیکن، کمیٹی نے سکون کی مقدار متعین نہیں کی۔

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا ہے کہ سگریٹ پینے والے لوگ بیماریوں کا آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ تمباکو نوشی میں ۷ مادّے ایسے ہوتے ہیں جن سے سرطان پیدا ہو سکتا ہے۔ انہیں پالی سائیکلک ہائیڈروکاربن کہا جاتا ہے۔ تمباکو نوشی میں تار Tar کا جو مجموعہ ہوتا ہے وہ بھی سرطان کا بڑا طاقتور سبب ہے۔

یہ سب باتیں ایک محفوظ سگریٹ ایجاد کرنے کی اہمیت پر زور دیتی ہیں۔ اُن میں ۵۵ فی صد فلٹر ٹپڈ Filter Tipped ہوتے ہیں لیکن کمیٹی نے کہا ہے کہ فلٹر ٹپ سگریٹوں سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن کمیٹی نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ چونکہ فلٹر ٹپ سگریٹ ابھی تک وسیع پیمانے پر استعمال ہونا شروع نہیں ہوئے اس لیے اُن کے بارے میں یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ ان کے پینے سے بیمار پڑنے کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

اس متفقہ فیصلے کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ سرطان سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سگریٹ پینا چھوڑ دیا جائے۔ کمیٹی نے سگریٹ نوشی کو ایک عادت بتایا ہے، لت نہیں۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ اگرچہ سگریٹ پینے والے نفسیاتی طور پر تمباکو نوشی کے غلام ہو جاتے ہیں لیکن وہ طبعی طور پر تمباکو کے اس طرح غلام نہیں ہو جاتے جس طرح مارفیا استعمال کرنے والے، مارفیا کے ہو جاتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ سگریٹ نوشی گو ایک عادت ہے لیکن اس عادت کو آسانی سے نہیں ختم کیا جاسکتا۔ سگریٹ نوشی ختم کرنے کے لیے جو اقدامات اٹھائے گئے ہیں اُن میں سگریٹ نوشی کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم، جس میں سگریٹ نوشی کی وجہ سے بیمار پڑنے کا خوف بتایا گیا ہے بہت کامیاب اور موثر رہی ہے۔

رپورٹ کے شائع ہوتے ہی تمباکو کی صنعت میں کھلبلی مچ گئی۔ تمباکو کی صنعت کے ڈائرکٹرز نے فوراً ہی بیان دیا کہ یہ رپورٹ حرفِ آخر نہیں ہے۔ ٹوباکو مرچنٹس ایسوسی ایشن نے کہا کہ ہم اس خیال سے کبھی اتفاق نہیں کریں گے کہ سگریٹ نوشی میں اتنے خطرات پوشیدہ ہیں۔

اس رپورٹ کے خلاف ایک بہت بڑا جلسہ ہونے والا ہے، جس میں اس رپورٹ پر سخت نکتہ چینی کی جائے گی۔

ادھر امریکن کینسر سوسائٹی۔ امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن اور امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن نے اس رپورٹ پر مکمل اطمینان ظاہر کیا ہے۔

امریکی سینیٹ کے ایک ممبر نے کہا ہے کہ وہ جلد ہی کانگریس میں وہ مسودہ قانون پیش کریں گے جس میں حکومت کو اختیارات دئے جائیں گے کہ وہ سگریٹ نوشی ختم کرنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرے۔ ★★

(ترجمہ ق۔م۔ح)

حال ہی میں چار آدمیوں کا بہت کم وقفہ سے انتقال ہوا۔ ان چار میں۔ ایک شاعر۔ ایک پبلشر ایک بک سیلر اور ایک لڑکی والا تھا۔ ان لوگوں کی جائیداد کا جب حساب لگایا گیا تو، شاعر نے پچاس روپے چھوڑے۔ پبلشر نے پانچ سو۔ بک سیلر نے پانچ ہزار اور لڑکی والے نے پچاس ہزار۔

۲۔ش۔ مکرمہ

عجائبات کا شہر

اسوان

جو مصر کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی

"...کاش میں یہاں پورا ایک سال گزار سکتی ...ت اور تاریخ کی خوشبو میں بسے ہوئے ان لمحات ...دیکھتی، پرانے زمانوں کی داستانیں سنتی اور وہ ...نیات محسوس کرتی جو لفظوں میں بیان کی جا سکتی۔"

شہر اسوان کے بارے میں الفاظ دنیا کے ...پہلی بار نہیں کہے گئے۔ چند سال پہلے جب ...ز یہاں آئی تھی۔ اس نے بھی اس شہر کی خوبصورتی ...اثر ہو کر کہا تھا:

"میرا جی چاہتا ہے کہ کروندوں کے پتوں کا لباس ...یل کی موجوں میں بچوں کی طرح چھینٹے اڑاؤں اور ...اس طلسمی حرارت کے سپرد کر دوں۔"

اس شہر کے متعلق جو الفاظ سمرسٹ مام، میرلین ...، جین رسل اور رابرٹ ٹیلر نے کہے تھے انہیں ...نہیں ملا لیکن وہ ہوا میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ ...کی ہوائیں یہاں آنے والوں کو وہ الفاظ سرگوشیوں ...یں۔

...ان کے بازاروں میں ایسے نوادرات ...جو کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ ...اس قدر ...جاتے ہیں۔ ...اور وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جو اس عظیم الشان شہر میں اپنے قدم جمانے کے لئے محنت کر رہے ہیں۔ ان محنت کرنے والوں میں وہ بوڑھے بھی شامل ہیں جو پتھر کے ننھے ننھے چمکدار ٹکڑوں کو وہ حسن بخشتے ہیں جو سیاح عورتوں کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ یہ ساری گہما گہمی جو پچھلے تین سال کے عرصے میں پیدا ہوئی ہے مصر کے اس عظیم ترین بند کی وجہ سے ہے جو اس شہر میں زیر تعمیر ہے۔

اس دیو ہیکل بند کے علاوہ یہ شہر ماضی کے ان عجائبات سے معمور ہے جو مصر کی قدیم اور سربستہ تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔ ان عجائبات میں، فرعونوں کی پانچ ہزار سال پرانی حکایات بھی ہیں اور یونانی دیومالا جیسے وہ لوک گیت بھی ہیں جو دریائے نیل اور اس کے دیوتاؤں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اور جو مصر کے اس دور افتادہ علاقے کے باشندوں میں سینہ بسینہ چلے آتے ہیں۔ یہاں ہزاروں سال پرانا وہ معبد بھی ہے جو ہر سال کچھ عرصہ کیلئے پانی میں روپوش ہو جاتا ہے اور نقاشی کے وہ شاہکار بھی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے سالہا سال پہلے کے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں اس شہر کی آبادی ...۲۴ تھی جو اب ...۵۸,۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ تین سال میں یہ تعداد ۲,۵۰,۰۰۰ تک جا پہنچے گی کیونکہ تین سال بعد یہ شہر نہ صرف مصر بلکہ افریقہ کا سب سے بڑا صنعتی مرکز بن جائے گا۔

اسوان کے آبی ذخیرے کی عمارت اس شہر کی شاندار ترین جگہ ہے۔ اس کے جنوبی چبوترے پر بیٹھ کر دیکھا جائے تو دور جزیرہ فیلائی اور وہ پرانا معبد نظر آتا ہے جو فراعنہ کے عہد کی یادگار ہے۔ یہاں کے باشندے اس معبد کے بارے میں جو قصہ سناتے ہیں وہ کچھ اس طرح ہے کہ پرانے زمانے میں یہاں کے ایک بادشاہ کو اپنے گھر میں بیٹی کی پیدائش اتنی بری لگی کہ وہ اس کو ہلاک کرنے پر تل گیا۔ مگر دیوتاؤں نے اس کو اجازت نہ دی۔ بادشاہ کسی نہ کسی طرح اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اس نے کاہنوں سے مشورہ کرنے کے بعد شہزادی کو ایک محل نما معبد میں قید کر دیا۔ شہزادی کو دیکھ کر یہاں بہت سے اژدھے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ دریائے نیل نے اس کی جان بچانے کے لئے انہیں حکم دیا کہ وہ شہزادی سے دور رہا کریں۔ لیکن اژدھے شہزادی کے دشمن نہیں تھے بلکہ اس سے محبت کرتے تھے۔ چنانچہ دریائے نیل کی اس غلط فہمی پر انہیں بہت دکھ ہوا اور وہ اتنا روئے کہ دریائے نیل میں سیلاب آ گیا۔ اس سیلاب سے یہ معبد بھی ڈوب گیا۔ اور لہریں شہزادی کو بہا کر پاتال میں لے گئیں۔ کہتے ہیں وہ شہزادی اب بھی تک زندہ ہے اور جب بھی سیلاب آتا ہے تو وہ سطح آب پر نمودار ہوتی ہے اور اس معبد کے چبوترے پر

کھڑی ہو جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ شمال کی طرف بہتی ہوئی اپنے محبوب "گیبی" کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا کرتی ہے۔

اسوان ماضی کی اُن یادگاروں کا شہر ہے جو دریائے نیل سے متعلق ہیں۔ فراعنۂ مصر کی کے زمانے کی ان یادگاروں کو محفوظ رکھنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس سلسلے میں پوری تندہی سے کام کیا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر ابو سمبل کی عبادت گاہوں کو تباہی سے بچانے کے لئے تقریباً ۱۲۰۰۰ مزدور اور معمار کام کر رہے ہیں۔ کالا بادشاہ کی عبادت گاہوں کو تین سال کی محنت کے بعد تباہ ہونے سے بچا لیا گیا ہے۔ اس تعمیری کام کے ساتھ ساتھ کئی غیر ملکی وفود بھی عبادت گاہوں کیلئے رضاکارانہ کام بھی کر رہے ہیں جس میں ییل یونیورسٹی اور فورنتھا انسٹیٹیوٹ کے وفود خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

یادگاروں کی تعمیر کے علاوہ اسوان شہر کی توسیع کے کئی منصوبے بھی زیرِ تکمیل ہیں۔ دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر سیاحوں کا ایک شہر تعمیر کیا جارہا ہے۔ کئی عالی شان ہوٹل، تھیٹر اور سینما تعمیر ہو رہے ہیں اور "ناصر لیک" جو دنیا بھر میں انسان کی بنائی ہوئی سب سے بڑی جھیل ہوگی زیرِ تعمیر ہے۔

فلپائی جزیرے میں ایک "نیوبین سٹی" بھی بسایا جارہا ہے اس میں نیوبیا کے علاقے کی یادگاریں رکھی جائیں گی۔ نیوبیا کے دیہات کے لوگوں کی بولی بھی مصر کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ یہ مصر کی عام زبان سے بہت مختلف ہے۔ مصریوں کو بھی اس کے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ اس میں فراعنہ کے زمانے کے بہت سے الفاظ شامل ہیں اس زبان کی ابھی تک کوئی گرامر وضع نہیں کی گئی۔

امید کی جاتی ہے کہ بند مکمل ہو جانے پر یہ شہر اتنی ترقی کر جائیگا کہ اس کی صورت پہچاننا مشکل ہو جائے گی کہ یہ

یہ شہر جو بہت دُور جنوب میں واقع ہے بیک وقت مصر کا ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی۔

خطوط

منظور الامین ــــــــ لکھنو

"دودِ حیات" اب باقاعدگی سے مِل رہا ہے۔ اس کی شکل وصورت میں آپ نے بڑی خوشگوار تبدیلی کی ہے۔ سالنامہ بہت اچھا رہا۔ آپ صرف سالنامے پر اکتفا نہ کریں۔ کچھ خاص نمبر بھی نکالنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کے حالیہ اداریہ ـــ "ایٹمی نیوکلیائی گولیاں" سے میں بالکلیہ متفق ہوں۔ کاش ہمارے ادیب ان پہلوؤں پر غور کرسکیں۔

حرمت الاکرام ــــــــ مظفرپور (یوپی)

..... غالب کے مجسمے کا عکس دیکھ کر مسرت ہوئی۔ اکبر علی خاں کا مضمون اور سردار جعفری کی نظم، دونوں اچھی چیزیں ہیں۔ "دودِ حیات" کی نئی تبدیلیاں قابلِ مبارکباد ہیں۔ کاش! اس کی اشاعت بھی وقت کی پابند ہو سکے۔ ....

ثریا محمود ندرت ــــــــ کلکتہ

یہ آپ نے بہت ہی اچھا کیا کہ سائز تبدیل کر دیا۔ دودِ حیات کو نئے روپ میں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس تبدیلی کی وجہ سے پرچہ کا صوری حسن بہت زیادہ نکھر گیا ہے۔ کتابت بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔

اداریے میں آپ نے بڑی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ کاش اردو کو اس کا صحیح مقام مِل جائے۔ آمین۔

حصۂ نظم و غزل خوب ہے۔ مضمون "فانی اور ان کی یاسیت" بڑا معلوماتی مضمون ہے۔ فانی کی زندگی اور ان کی شخصیت پر اس سے روشنی پڑتی ہے علاوہ ازیں تازہ شمارہ سے جو آپ نے نیا سلسلہ علامہ اقبال کے فارسی کلام کو اردو اور انگریزی کا جامہ پہنا کر شروع کیا ہے یہ بہت اچھی کوشش ہے۔

گلفروش خاں ــــــــ بمبئی

دودِ حیات کی نئی تبدیلیاں واقعی بڑی خوبصورت اور عمدہ ہیں یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ دودِ حیات کو خوب سے خوب تر بنانے میں آپ لوگ بڑی لگن کے ساتھ انتھک کوشش کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو کامیابی عطا فرمائے۔

یہ بات باعثِ طمانیت نہیں کہ دودِ حیات آئندہ وقت کا بالکل پابند رہے گا۔ زندہ جرائد وہی ہیں جو گوناگوں دشواریوں کے باوجود عوام تک پہنچتے ہیں۔ آپ کے ساتھ عوام کی قوت ہے آپ انہیں مایوس نہ فرمائیں

تازہ شمارہ ملا۔ نوعیتِ مضامین کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔
یوسف ناظم، رشیدہ مُلّا حرمت الاکرام، بہت پسند آئے۔
سائنسی مضامین کا سلسلہ برابر جاری رکھئے اس شمارہ میں خواجہ معین الدین کا مضمون راڈر کی ایجاد بہت مفید ہے۔

فرقان احمد ــــــــ بمبئی

..... آپ نے سائنسی مضامین کا سلسلہ پھر سے شروع کر کے دودِ حیات کو اور مفید بنا دیا ہے اب اسے بند نہ کیجئے۔ سائنس کی دنیا میں تازہ اور نئی ایجادات کا حال اس سے معلوم ہوتا ہے۔

خواجہ معین الدین

گائیڈڈ مزائیلز اور ہاٹ لائن

GUIDED MISSILES AND HOT LINE

آج کے ترقی یافتہ دور میں جب کہ سائنس کی نت نئی ترقیاں انسان پر قدرت کے راز ہائے درون منکشف کر رہی ہیں، وہیں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم اور دوسرے مہلک اسلحہ کی تیاری سے دنیا ایک سراسیمگی کی کیفیت میں گرفتار ہے۔ ان اسلحہ جات کی تیاری کی دوڑ میں امریکہ اور روس برابر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ دنیا روس کے اس کارنامے سے واقف ہی ہے کہ اس نے ۱۰۰ میگاٹن کا بم بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس بم کا بنا لینا ہی اسلحہ کی دوڑ میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بم وقت پر صحیح طور سے کام کرے اور غنیم پر حاوی ہے لیکن دنیا اس خطرناک تجربے سے اب تک دوچار نہیں ہوئی ہے اور خدا نہ کرے کہ ہو۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران بم ڈیڑھ سو سے دو سو میل کی رفتار سے اڑنے والے جہازوں کے ذریعے گرائے جاتے تھے۔ اب یہ کام جٹ اور سوپر سانک طیاروں سے لیا جاتا ہے۔ یہ طیارے تقریباً ۷۰ ہزار فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں اور انتہائی سرعت کے ساتھ نیچے آکر دشمن کے علاقوں کو آگ اور خون میں نہلا دیتے ہیں۔ مگر آج یہ بات عملاً شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے اس لئے کہ ہر بڑی طاقت اپنے دفاع کے لئے جٹ اور سوپر سانک فائٹر ہمیشہ تیار رکھتی ہے۔ جونہی راڈر کے پردے پر غیر ملکی طیارے نظر آتے ہیں چاروں طرف سے انہیں نرغے میں لے لیا جاتا ہے۔ گویا راڈر کی ایجاد نے طیاروں کے ذریعے بمباری کو بے حد مشکل کام بنا دیا ہے۔ لیکن انسان کے اندر کھوج اور ترقی کا جو جذبہ موجود ہے وہ بھلا کب اس کو نچلا بیٹھنے دیتا ہے۔ چنانچہ اس مشکل کو آسان بنانے کے لئے سائنس دانوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور گائیڈڈ مزائلز کی ایجاد کی۔ جن کے ذریعے ہائیڈروجن بم اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر دنیا کے کسی بھی حصے میں داغا جا سکتا ہے۔ گائیڈڈ مزائلز ایک ایسا آلہ ہے جس میں انجن لگا ہوتا ہے، جس کو چلانے کیلئے کسی آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ ریڈیو الیکٹرانک Radio Electronic کے ذریعہ قابو میں رکھا جاتا ہے۔ جس طرح ہم ریڈیو میں بٹن گھما کر Condenser کے پتوں میں کم زیادہ عمل اور رد عمل پیدا کر کے حسب دلخواہ اسٹیشن حاصل کر لیتے ہیں اسی طرح اپنے ملک میں بیٹھ کر گائیڈڈ مزائلز کو ایک بٹن کے ذریعے اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں اور جہاں چاہیں نشانہ لگا سکتے ہیں۔ آجکل بڑی طاقتوں کے پاس حسب ذیل گائیڈڈ مزائلز موجود ہیں۔

1, Short Range Guided Missiles
2. Medium Range Guided Missiles
3. International Balastic Missiles

ان میں اول الذکر دشمن کے آنے والے طیاروں کو فضا ہی میں تباہ کرنے کیلئے تیار ہیں۔ ثانی الذکر دو ہزار سے تین ہزار میل کے فاصلے تک بمباری کر سکتے ہیں اور ان ہی پر ایٹم بم، ہائیڈروجن بم NUCLEAR WAR HEAD دشمن کے ملک پر پھینکے جا سکتے ہیں۔ موخر الذکر بہت دور دور تک حملہ کر سکتے ہیں جیسے امریکہ سے روس تک، انگلینڈ سے آسٹریلیا تک۔ اس قسم کی خطرناک اسلحہ کی موجودگی اور اس میدان میں بڑی طاقتوں کا ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کا جذبہ کسی کی بھی ذرا سی غلطی کے باعث ساری دنیا کو تباہی کی آغوش میں پہنچا سکتا ہے۔ اس خطرہ اور تباہی سے بچنے کیلئے مرحوم صدر کینیڈی اور مسٹر خروشچیف نے امریکی وہائٹ ہاؤس اور روس کی وزارت خارجہ تک ٹیلیفون کی لائن ڈالی ہے جس کے ذریعے ایسے خطرناک موقعوں پر دونوں ممالک کے سربراہ فوراً ایک لمحہ میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں یا دنیا جنگ کی لعنت سے بچ سکتی ہے۔ اسی کا نام ہاٹ لائن ہے۔ اس پر دونوں حکومتوں کا سخت ترین پہرہ ہے۔

اب کی بار

اس شمارے میں اقلیتوں کے سوال پر ایک نہایت ہی اہم مضمون شامل ہے۔ یہ مضمون نہ صرف اس مسئلہ کو صحیح روشنی میں پیش کرتا ہے بلکہ ایک حد تک اس پریشان کن مسئلے کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ ضرورت اس چیز کی ہے کہ ہم غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے اس اہم اور نازک مسئلے پر غور کریں یہ چیز دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے حق میں مفید ہوگی۔

سائنس کے مضامین کے سلسلے میں ادارے میں کافی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان مضامین کو جس طرح پسند کیا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اردو داں عوام اب فنون لطیفہ سے ہٹ کر اور چیزوں کو بھی پسند کرنے لگے ہیں۔ اسے اردو زبان کے مستقبل کی ضمانت کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

اس اشاعت میں مکتوب نیویارک شامل ہے جس کے لئے ہم قریشی صاحب کے ممنون ہیں۔ اسوان ڈیم پر جو مضمون ہے وہ بھی کافی معلوماتی اور دلچسپ ہے۔

سائنس کا مضمون ہمیں سائنس کی جدید ترین ایجادات سے بہرہ ور کرتا ہے یہ سلسلہ پابندی سے جاری رہے گا۔

مظفر حنفی ہسوی کی دونوں غزلیں اچھی ہیں پہلی غزل پر مرحوم شاد عارفی کا رنگ غالب ہے اور دوسری غزل کی دلکشی اور سلاست بیان دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

ہفت روزہ

دورِیت

پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

جلد ۳	۲۰ اپریل ۱۹۶۴ء	شمارہ ۲

اس شمارے میں

فی پرچہ — تیس ۳۰ نئے پیسے
سالانہ — دس روپے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- شیخ عبداللہ نے کہا ہے کہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیر کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔
- جنرل میک آرتھر نے جن کا پچھلے دنوں انتقال ہوا ہے، دس سال پہلے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا (جو اب شائع ہوا ہے) کہ وہ کوریا کی جنگ جیت سکتے تھے لیکن برطانیہ کی غداری اور امریکہ کی مداخلت سے جنگ جیتی نہ جا سکی۔
- مسٹر لال بہادر شاستری نے شیخ عبداللہ سے کہا ہے کہ وہ اپنی تقریروں میں ضبط و تحمل سے کام لیں۔ شیخ عبداللہ نے رہائی کے بعد اپنے بیانات اور تقریروں میں حکومت ہند کو کشمیر کی غیر یقینی صورت حال کا ذمہ دار گردانا ہے۔
- دہلی یونٹ کی پرجا سوشلسٹ، سوشلسٹ اور فارورڈ بلاک پارٹیوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر پنڈت نہرو ۱۵ اگست تک وزارتِ عظمیٰ سے دستبردار نہیں ہوئے تو وہ اُن کو ہٹانے کے لئے جدوجہد شروع کر دیں گی۔
- امریکہ کا ساتواں جہازی بیڑا بحرِ ہند میں داخل ہو گیا۔ امریکہ نے کہا ہے کہ یہ بیڑا خیرسگالی دورے پر ہندوستانی سمندر میں آیا ہے۔
- مسٹر فرینک انتھونی نامزد ممبر پارلیمنٹ نے کہا ہے کہ آج ہندوستان کا ہر مسلمان موت کے سائے میں چل رہا ہے۔
- مسٹر مہاویر تیاگی کو حکومتِ ہند کا وزیرِ بحالیات مقرر کیا گیا ہے۔
- کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے ۳۲ چوٹی کے لیڈروں کو پارٹی سے معطل کر دیا ہے یہ لیڈر بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے۔

افتخار اعظمی

تصویریں

دھندلی دھندلی سی چند تصویریں
پردۂ ذہن پر ابھرتی ہیں
اپنے ہاتھوں میں لے کے ہاتھ مرا
مسکراتی ہیں رقص کرتی ہیں

یہ ہے ماں جس کی گود میں میں نے
زندہ رہنے کا عزم پایا ہے
دودھ کی شکل میں مجھے جس نے
اپنے دل کا لہو پلایا ہے

اور یہ باپ کا حسیں پرتو،
ذہن پر جس کے غم کا سایہ ہے
جیسے میرے لئے بہت دن تک
بوجھ آلام کا اٹھایا ہے

یہ ہے بھائی کی یاد کا موتی
یہ ہے بہنوں کی جاوداں تصویر
سب محبت کے دلربا پیکر
سب رفاقت کی اک حسیں تفسیر

چاند ہے یہ مری محبت کا
آج گہنا گیا ہے جس کا پیار
میرے کانوں میں گھولتی تھی رس
جس کے پازیب کی ہر اک جھنکار

جس کی زلفوں کی چھاؤں میں میں نے
دوپہر درد کی بتائی ہے
کاکل زندگی میں ڈال کے خم
زلف جس شوخ کی سجائی ہے

یہ فرشتے ہیں مہر و الفت کے
جو مرے ساتھ صورت احباب
ہر کڑے وقت میں نظر آئے
لے کے اپنی مروتوں کی کتاب

ذہن میں میرے رقص کرتا ہے
میرا گاؤں، مری گلی، مرا گھر
بوڑھے دادا کی شفقتوں کا خیال
بھائی صاحب کی جھڑکیوں کا ڈر

یاد کی شمع لے کے جاتا ہے
آج مانوس سی فضاؤں میں
آم چننے کو دوڑ جاتا ہوں۔
گنگناتی ہوئی گھٹاؤں میں

ہر طرف رنگ، نور، نکہت ہے
ہر طرف پیار ہے محبت ہے
ہر طرف مسکراہٹیں رقصاں
ہر طرف پیار ہے، محبت ہے

مٹ گیا خود مگر انہیں میں نے
گردِ ایام سے بچایا ہے
ہر نفس یاد کے گھروندے کو
ان سے سو سو طرح سجایا ہے
بخشتی ہے مرے شعور کو یہ
تازگی، حسن، رنگ، تنویریں
کرتی رہتی ہیں لطف کی بارش
مجھ پہ یہ دل نواز تصویریں

آٹھویں قسط

ایک قیمتی سوانح حیات

اس خطرناک رجحان کا نقطۂ عروج ایک فلم تھی۔ جس میں ہزاروں امداد باہمی کے اصول پر کاشت کرنے والے انسانوں کو بتایا گیا تھا۔ یہ کسان ایک عظیم الشان دعوت کھا رہے تھے جو، ایک نئے پاور اسٹیشن کے افتتاح کے وقت ترتیب دی گئی تھی۔ حال ہی میں اس فلم کے پروڈیوسر سے جو کافی ذہین آدمی ہے میری گفتگو ہوئی۔

"تم اس طرح کی فلمیں کس طرح بنالیتے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "یہ صحیح ہے کہ میں نے بھی ایک زمانے میں، میں نے بھی اسی جذبے کے تحت نظمیں لکھی تھیں لیکن میں اس وقت بالغ النظر نہیں تھا جبکہ تم کافی باشعور ہو۔"

پروڈیوسر نے اداس مسکراہٹ سے کہا "تمہیں شاید پتہ نہ ہو کہ میں اس بارے میں بہت کہ میں اس بارے میں بہت پُرخلوص تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ تمام چیزیں کمیونزم کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہیں اور پھر میں اسٹالن پر پورا بھروسہ اور یقین رکھتا تھا۔"

اس لئے جب ہم شخصیت پرستی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اس ضمن میں ہم ہر اُس شخص کو ملزم نہ گردانیں جو اس سے وابستہ رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ ضرور ایسے رہے ہیں جنہوں نے اپنی مطلب براری کے لئے اس صورت حال سے فائدہ اُٹھایا ہے لیکن یہ بات کہ کئی لوگوں نے اسٹالن کا قصیدہ گایا ہے، بُرائی نہیں ہے بلکہ ایک المیہ ہے۔

ذہین اور طباع لوگوں کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسٹالن کے فریب میں آجاتے؟ — اسٹالن ایک مضبوط اور معرکۃ الآرا شخصیت تھی جب وہ جانتا تھا کہ عوام کو کس طرح مجبور کیا جا سکتا ہے

روسی عوام کے ذہنوں میں اسٹالن کا نام لینن کے نام کے ساتھ رچا بسا تھا۔ اسٹالن جانتا تھا کہ لینن روسی عوام میں کس قدر ہر دلعزیز ہے اور یہی دیکھتے ہوئے اُس نے تاریخ کچھ اس طرح مرتب کروائی کہ لینن کے ساتھ اُس کے تعلقات بہت گہرے اور قریبی معلوم ہونے لگے حالانکہ ایسا نہیں تھا اور تعلقات اتنے گہرے نہیں تھے۔ جتنا کہ تاریخوں میں بتایا گیا ہے۔ یہ تاریخیں کچھ اس طرح لکھی گئیں کہ آخر میں خود اسٹالن بھی یہی سمجھنے لگا۔

لیکن حقیقت میں اسٹالن نے لینن کے خیالات توڑ مروڑ کر پیش کئے۔ لینن کے لئے کمیونزم انسان کی خدمت کرنے کا ذریعہ تھا اور اُس کا زندگی بھر یہی مقصد رہا لیکن اسٹالن کے نزدیک انسان کمیونزم کی خدمت کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

اسٹالن کا یہ نظریہ کہ عوام کمیونزم کو چلانے والے پہیے ہیں جب عمل میں لایا گیا تو اس سے بہت خطرناک نتائج برآمد ہوئے۔

روسی شاعر جنہوں نے دورانِ جنگ میں بہترین شاعری کی تھی خاموش ہو گئے۔ اگر کبھی کبھار کوئی اچھی نظم نظر آجاتی تو یہ بھی جنگ پر ہی ہوتی۔ جنگ پر نظمیں لکھنا زیادہ آسان تھا۔

شاعر کارخانوں۔ بڑی بڑی عمارتوں اور دوسری ترقیاتی اسکیموں کا معائنہ کرتے اور زیادہ تر مشینوں کے بارے میں لکھتے۔ اُن آدمیوں کے بارے میں کچھ نہیں لکھتے جنہوں مشینیں بنائی تھیں اب اگر مشینیں پڑھ سکتیں تو اُن کے لئے یہ نظمیں کام کی ہوتیں لیکن انسان کو اس سے کیا دلچسپی۔

اُس وقت شاعر کی مقبولیت زیادہ کتابوں کے چھپنے سے نہیں معلوم ہوتی تھی بلکہ اس سے معلوم ہوتی تھی کہ اس کی سرکاری حیثیت کیا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر کتابوں کی دکانوں میں شاعری کی کتابوں کا انبار لگ گیا۔ انہیں پوچھتا تھا۔

شاعری ہر دلعزیز نہیں تھی۔ بڑے اور پُرانے شاعر خاموش تھے اور جب بھی انہوں نے سکوت توڑا تو اور زیادہ خراب ہو گئے۔ شاعروں کی وہ نسل جسے جنگ نے پیدا کیا تھا اور جس سے کئی اُمیدیں وابستہ تھیں خود ہی تحلیل ہو گئی۔ پُرامن زمانے کی زندگی جنگ کے زمانے کی زندگی سے

روس کے ایک نوجوان باغی شاعر
یوجنی یوفتے شنکو
کی خود نوشت سوانح حیات

زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہو گئی

مشاعرے کبھی کبھار ہی ہوتے تھے اور عوام اُن سے دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ کئی شاعروں نے ایسی نظمیں لکھیں جو پڑھنے والوں کے لئے نہیں تھیں بلکہ اسٹالن پرائز حاصل کرنے کیلئے لکھی گئی تھیں۔

اسٹالن پرائز بہت بڑی بات تھی فوری طور پر لاکھوں جلدوں کی فروخت تمام اخباروں میں تصویریں اور اچھے تبصرے۔ کسی بڑے سرکاری عہدے پر تقرر، کار، بنگلہ (بغیر اُمیدواروں کی فہرست پر رہتے ہوئے) اور ساتھ ہی موسم گرما کا ایک گھر بھی۔ کئی ادیب اور شاعر اس کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں کرتے تھے کہ جن کتابوں پر اُنہیں پرائز ملا ہے اُسے پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ اُنہیں بس پرائز سے سروکار تھا۔

یہ انتہائی غیر منصفانہ بات ہو گی اگر میں اس زمرے میں ہر ادیب اور شاعر کو شریک کر لوں۔ کئی ادیبوں اور شاعروں نے نہایت ایمانداری اور خلوص سے اپنا کام جاری رکھا۔ انہوں نے انعام کے لئے کبھی نہیں لکھا لیکن اُنہیں انعام ملا، لیکن انعام کی خواہش کرنے والے بہت سے ادیب تھے

میں نے لکھنا جاری رکھا اور اُس دن کے بارے میں سوچتا رہا جو ایک نہ ایک دن آنے والا تھا۔ میں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی کہ میری چیزیں چھپتی ہیں یا نہیں۔

میں نے صرف شعر کہنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میں مختلف ادبی بحثوں میں بھی حصّہ لیتا رہا۔ جن کا کام جھوٹے اور غلط نظریوں کی نفی کرنا تھا۔

مَیں جانتا تھا کہ ادیبوں کی یونین میں اکثریت اچھے اور ایماندار ادیبوں کی ہے لیکن میں یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ کچھ عہدوں پر ایسے لوگ فائز تھے جو اس کے اہل نہیں تھے۔

بدقسمتی سے یہ وہی لوگ تھے جو "ادبی پالیسی" بناتے تھے اور اُس میں ناخوشگوار چیزوں کو داخل کرتے تھے مثلاً یہودیوں کی مخالفت۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ یہودیوں کی مخالفت کا جذبہ روسی عوام کی طبیعت سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا۔ یہ ہمیشہ اُن پر لادا گیا ہے۔ روس میں زار کے زمانے میں مخالف یہودی تحریک چلائی گئی تھی اور یہ پھر مصنوعی طور پر اسٹالن کے زمانے میں بھی چلائی گئی۔ لینن میرے لئے جو ایک سچّا روسی ہے اور جسے لینن کے نظریات دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ مخالف یہودی جذبہ ہمیشہ قابلِ نفرت رہا ہے۔

اور اب جبکہ اسٹالن کی موت کو دس سال گزر چکے ہیں میرا خیال ہے کہ اُس کا عظیم ترین جرم یہ نہیں تھا کہ اُس نے یہودیوں کی گرفتاری اور اُنہیں جان سے مار ڈالنے کے احکام دئے تھے۔ اُس کا عظیم ترین گناہ انسانی جذبے اور اقدار کو تباہ کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اسٹالن نے خود کبھی مخالف یہودی جذبے کو ایک نظریے کی طرح فروغ نہیں دیا لیکن اس کے عمل میں اس نظریے کی جھلک موجود تھی۔ اسٹالن نے کبھی سختی۔ ظلم۔ مخبری۔ مکاری اور کسی سیاسی یا مذہبی جنون کا بھی پرچار نہیں کیا لیکن یہ تمام چیزیں اُس کے عمل میں جھلکتی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ کئی لوگ کمیونزم کے خلاف سوچنے اور عمل کرنے لگے اگرچہ کہ وہ پکے کمیونسٹ سمجھے جاتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ جو کمیونزم کے نام پر جیتے ہیں لیکن اصل میں اُسے بدنام کرتے ہیں اس کے خطرناک دشمنوں میں سے ہیں۔ اُن دشمنوں سے بھی زیادہ خطرناک جو مغرب میں بستے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ مستقبل میں بڑی سخت جدوجہد ہونے والی ہے۔ ایسی جدوجہد جو موت تک لے جائے گی اور یہ ایسے لوگوں کے خلاف ہو گی جو کمیونزم کا پرچار کرتے ہیں اور اپنے عمل سے اُسے بدنام کرتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ جدوجہد طویل اور صبر آزما ہو گی۔ جب ایسے لوگوں پر جو کمیونزم کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھتے ہیں، یہ الزام لگایا گیا کہ وہ لوگ لینن کے خیالات اور نظریوں کو بدنام اور تباہ کر رہے ہیں اُنہوں نے پلٹ کر الزام لگانے والوں پر بھی یہی الزام لگایا۔

ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ شاعر اس ماحول کو پاک کرنے کی جدوجہد میں کیا رول ادا کر سکتی ہے۔ میں نے بنی جنگ۔ ادبی بحثوں تک میں حصہ لیا جہاں میں غصّے میں بھری اور چبھتی ہوئی تقریریں کرتا جبکہ میری شاعری، بہت نرم۔ خاموش اور اپنائیت لئے ہوئے تھی۔ بے شک ایسی شاعری کرنے کا مطلب اُسی جدوجہد میں حصہ لینا تھا لیکن دوسرے طریقے سے لیکن یہ طریقہ مختلف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بحیثیت شہری سماجی جدوجہد میں حصہ لینا میرا فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میری شاعری کو اس سے بلند و بالا رہنا چاہئے اس طرح سماجی جدوجہد کے بارے میں میرے خیالات اور میری شاعری دو مختلف چیزیں تھیں۔

اب قارئین میری نظموں کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔

"یہ بہت اچھی نظمیں ہیں" شاعر سلسکی نے ایک دن محبت کے عنوان پر میری کئی نظمیں سننے کے بعد کہا "لیکن آج کے زمانے میں شاعر ہونے کیلئے صرف شاعر ہونا ہی ضروری نہیں ہے۔"

اُس وقت میں اُس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا۔

○

۵ مارچ ۱۹۵۳ء کو ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس نے روس کو ہلا کر رکھ دیا۔ اسٹالن کا انتقال ہو گیا۔ میرے لئے قطعاً ناممکن تھا کہ میں کبھی خوشی یا یقین کر لوں۔ وہ ہماری زندگی کا ایک حصہ ہو چکا تھا۔ پورے ملک پر ایک قسم کا خوف طاری ہو گیا۔ عوام کو شروع ہی سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ وہ سب اسٹالن کی سرپرستی میں ہیں اور اب اس کے انتقال پر لوگ جیسے یتیم ہو گئے۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ ہم خوش حال مستقبل کی روشنی کے ساتھ ہی اس کے غم میں ہماری آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور ساتھ ہی مستقبل کا خوف بھی۔ ادیبوں کی یونین کے جلسے میں شاعروں نے نظمیں پڑھیں۔ وہ ہچکیوں کی وجہ سے مشکل سے اپنی نظمیں پڑھ سکے۔ (قائم ہے)

حسن عباس فطرت

چھتری

ابنِ بطوطہ نے آم کو ہندوستان کا تحفہ کہا ہے۔ ٹھیک ہی کہا ہوگا۔ اور اب یہ حقیر سراپا تقصیر بلکہ پرانی لکیر کا فقیر کہتا ہے کہ
"چھتری ہندوستان کی برسات کا تحفہ ہے"۔
آپ اس پر سند چاہیں گے۔ ذہن حاضر نہیں ورنہ ایک کیا سینکڑوں اساتذہ کے ہزاروں دواوین کا انبار لگا دیتا۔ فی الحال ایک نام نہاد آدم زاد اور اصلاً نامراد استاد کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں، جس میں صنعتِ بے قافیہ و بے ردیف کا خاص التزام رکھا گیا ہے۔ سنئے۔

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے
لپٹ جاتے ہیں وہ چھتری کی چھڑ سے

اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ بیچارہ گریباں دریدہ عاشق (یا یوں کہئے مردم گزیدہ شاعر) برسات کے بلبلوں سے کھیلتا ہوا۔ اپنے پیرہنِ تارتار اور جسمِ سوگوار کی طرح نحیف و نزار اور از سرتا پا داغدار، چھتری کی لاش کاندھے پر لادے چلا جا رہا ہے۔ چھوٹے نصیب اس کی محبوبہ کے اسی وقت وہ بھی مرچ مسالے اور آٹے دال کی گٹھریاں لئے ہوئے چپ چپ کرتی نظر آتی ہے۔ یہ عاشق نامراد (یعنی شاعر) میاں اپنی بدبختی اور خوش وقتی پر دل و دماغ کے نشے بجھے تاثرات سے کہ اس کے ادھر چھینٹا ہے اور معشوقہ بھیگی بلی ہو کر "مرتی کیا نہ کرتی" کہہ کر طوعاً کرہاً اس کا ساتھ گوارہ کر لیتی ہے۔ دونوں چلتے ہیں راستے میں محبوبہ کے قدم ڈگمگاتے ہیں مگر پھر بھی وہ سہارے کے لئے چھتری کی چھڑ کو عاشق کی کمر پر ترجیح دیتی ہے مگر طرزِ تغافل کو ادا سمجھنے والے اسی پر مر مٹتے ہیں لہٰذا ایک شعر بھی موزوں کر دیتے ہیں جسے میں پہلے ہی سنا چکا ہوں۔

نیم کے درخت کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا کوئی عضو بیکار نہیں لہٰذا میں کہتا ہوں کہ آج کی اس صنعتی زمین پر چھتری ہی ایسا خودرو لودا مریلی کی طرح بغیر جڑ کا درخت ہے جس کا کوئی حصہ کسی عہد میں بیکار نہیں جاتا اور میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ یہ مصرعہ موزوں دراصل چھتری ہی کی شان میں صادر ہوا تھا جب وقت بے وقت اپنے پرائے سبھی گلے لگائے ہوئے ملتے ہیں کہ

یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں اُلٹا سیدھا

آئیے میں آپ کو پہلے پہل بنا چھتری کی افادیت سے متعارف کراؤں۔ بنا چھتری عہدِ قدیم کی ایک مرحوم صفت "وضع داری" اور "شرافتِ خاندانی" کی واضح ترین علامت ہے اور اگر آپ کے علم میں نہ ہو تو میں بتاؤں کہ چھتری کی اصل چھڑی تھی۔ کثرتِ استعمال سے گھستے گھستے چھتری میں بدل گئی۔ کیونکہ اردو کا مزاج بڑا بے ادب و اوچھا رہا ہے نا؟ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہ مثل مشہور ہے شے اپنی اصل کی طرف پلٹتی ہے اگر آپ باسلیقہ اور خوش ذوق ہنرمند ہیں تو اپنی چابک دستی سے ہر آن و ہر لحظہ چھتری کو چھڑی بنا سکتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ اس سے دو قدم آگے کہنے والے نے کہا اور نقل کرنے والے نے نقل کیا ہے کہ یہ مصرعہ مشہور ہے

عصائے پیر ہے تیغِ جواں ہے حرزِ طفلاں ہے

بھی اول اول صاحبہ موصوفہ کی شان میں اترا تھا جسے یاروں نے تاویل اور سرقہ کر کے اغیار کے پلّے باندھ دیا۔ اک ذرا بھی غور فرمائیے تو میرے قول کی صداقت آپ پر عیاں ہو جائے گی۔ بوڑھے کھوسٹ اس کے سہارے دروازے دروازے حتیٰ کہ موت کے دروازے تک بغیر جھٹکے اور بے کھٹکے پہنچ سکتے ہیں۔ نہ موسم، راستے کا پتھر بن سکتا ہے نہ حالات کی دیوار ہی حائل ہو سکتی ہے۔ رہے جواں، ان کی تو بات ہی نہ کیجئے۔ جہاں موم، لوہا اور لکڑی تلوار بن جاتی ہو تو پھر ہماری چھتری تو تلوار بھی ہے اور آہن زاد بھی اسی لئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی نے ذرا تیکھے پن سے اپنی چھتری کو جنبش دی ہے اور دیکھتے دیکھتے حریف کا پتہ پانی ہو کر رہ گیا ہے۔ ہزار افسوس و صد ہزار حیف کہ میں بذاتِ خود یہ تجربہ ابھی تک کسی آدم زاد پر نہ کر سکا خدا وہ موقع بھی جلد لائے گا مگر بچ جانے کہ جب بھی ہمارے محترم اعلیٰ بلکہ ابوالآبا نے گروہ بندی کر کے ہماری شکست منڈیر پر اپنی عقل سہانی میں نے انگنائی میں اپنے گھٹنے ٹیک، ایک آنکھ دبا کر چھتری کا دستہ ہاتھ میں لے کر نوک ان کی طرف کی ہے تو بخدا کبھی زرگر کی تلاش یا ایجاد کی نوبت ہی نہ آئی اور وہ قلندرانِ بالائی اور رہنوردانِ پربت و رانۂ کتب خانگی نیست، پائے گدا لنگ نیست، گنگناتے یا غوغاتے ہوئے حدِ نظر کے پار اتر گئے ہیں۔

رہا طفلاں کا مسئلہ وہ تو جس طرح ہم سب کے سب کثیر العیال + نا فارغ البال لوگ ہیں اسی طرح یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ جب ہم انہیں پیسہ نہ ہونے پر ٹھیکروں سے بہلا لیتے ہیں اور پھل یا مٹھائی نہ ہونے پر کاغذ، گھاس اور پتوں سے ان کی بھوک مٹا لیتے ہیں تو اس کو ہماری یعنی پیاری چھتری سے

تو نہ جانے کتنی بلائیں ٹالی جا سکتی ہیں۔ کیسے کرتب دکھائے جا سکتے ہیں اور بڑے بڑوں کو مات دی جا سکتی ہے البتہ مجھے ان صحیفہ نگاروں سے سخت شکایت ہے جو شب و روز طرح طرح کی سنسنی خیز سرخیاں لگاتے بجھاتے ہیں۔ سفیدی کو سیاہی میں بدلتے رہتے ہیں۔ بجو بہ نگار اور نا ممکن باتوں کو اپنے اخبار میں بڑی معقول و مناسب جگہ دیتے ہیں۔ ان میں سلت آٹھ جگہ چاقو چلواتے ہیں اور نو دس بار ہاتھا پائی اور جوتم پیزار کروانے کے باوجود سسپنس اور ایڈونچر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ اپنی برادری اور کنبے میں ہماری مفید عام چھتری کو کیوں نہیں داخل کر سکتے؟ آزمائش بہترین کسوٹی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک بار اور صرف ایک بار وہ ایک تجربہ کر کے دیکھیں پھر ہمیشہ کے لئے ہمارے ہم نوا نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ۔ جہاں ان کو چاقو چلوانا درکار و منظور ہو وہاں چاقو کو قلم زد یا قلم زن کر کے چھتری لکھ دیں پھر دیکھئے بھولے عوام اور بے بس قارئین کی سراسیمگی اور حیرت و تجسس میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ کیونکہ چھتری تو بلاشبہ چاقو کے مقابلے میں تلوار کی حیثیت رکھتی ہے کچھ نہیں تو کم از کم جسامت و طوالت کے اعتبار سے ہی۔ دوسرے یہ کہ اُن کو کوئی نادان دوست ہو کہ دانا دشمن، جھوٹا ثابت نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اعتراض ہونے پر بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ابی ہم نے لکھا ہی کیا؟ یہی نا کہ چھتریاں چل گئیں۔ اس جملے سے مار پیٹ، دھینگا مشتی کا مفہوم کہاں سے پیدا ہو گیا

اب تو رہا میرا ایک مخلصانہ مشورہ جسے

ع مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے۔ کہہ کر ختم کرتا ہوں اور اپنا ماجرا سناتا ہوں کہ کوئی چھتری سے کچھ اگر فائدہ اٹھائے یا نہ اٹھائے میں تو خوب جی بھر کر اپنی چھتری سے کام لیتا رہتا ہوں۔ شاید اسی لئے کوئی چھتری میرے پاس چھ دن سے زیادہ ٹکتی بھی نہیں۔

الغرض قصہ کوتاہ اب طوالت کے خوف سے بند چھتری کا ذکر بند کر کے کھلی چھتری کا دروازہ کھولتا ہوں۔ اسے سنئے۔ اگر آپ کے سر پر کھلی چھتری سایہ فگن ہے اور بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ قدرتی بات یہ ہے کہ آپ سر سے پیر تک بارش کے پانی اور ندامت کے پسینے میں شرابور ہیں۔ مگر یہ آپ کی انکساری ہے ورنہ تو آپ کو اکڑ اکڑ کر چلنا چاہیے کیونکہ بھلی بری کیسی ہے چھتری اگر سر پر سایہ کے لئے ہے تو آپ کی حیثیت عرفی محفوظ ہے اور آپ کا شمار مکان والوں میں ہو گا۔ خانماں بربادوں اور خانہ بدوشوں میں نہیں۔ بلا سے آپ میر تقی میر کے مذکورہ گھر کے آخری متوفی ہی کیوں نہ سمجھے جائیں۔ اک ذرا صبر کیجئے تو بتاؤں کہ ہر چند تسلیم ہے کہ اس حالت میں آپ کی چھتری آپ کے لئے واٹر پروف ذرا سی بھی نہ ہو مگر اس سے بڑھ کر مردم پروف تو ہے ہی۔ ظاہر ہے کہ بارش میں آپ کا کاروبار مندا ہو گا اور اسی حساب سے کم بخت قرض خواہوں کا دل گندہ ہو گا۔ اور وہ گلی گلی اور ناکے ناکے

راہ میں وہ ملے کہاں گھر پہ نہیں بلائے کیوں کی رٹ لگاتے ہوئے آپ کی ٹوہ میں ہوں گے، اور کسی لاکھ درندہ کی طرح گھات لگائے پھرتے ہوں گے مگر اُن روسیاہوں کا خیال آتے ہی آپ کی یہ انیس خاطر غمگین بہ زبانِ بے زبانی دلاسہ دے گی۔

" میں تیری سر تا پا، مگر تو گھبرا مت۔ میں ہر کوچہ و بازار میں ان نابکاروں سے اسی طرح محفوظ رکھوں گی جس طرح تیرے گھر پر تیری مدقوق و چڑچڑی بیوی آڑے آتی رہتی ہے۔ بس اک ذرا تصور کر لے کہ تیرے سر پر بوسیدہ چھتری نہیں بلکہ کلاہ نوبہ کلاہ کو کوئی کج کئے بغیر بانکپن آتا نہیں اور حریف منہ کی کھاتا نہیں۔ تو بس پھر کیا ہے اک ذرا سا مجھے بھی کج کر لو اور اکڑتے اینڈتے ہوئے شی شی یہ جا وہ جا ڈور نکل بھاگو "

اور صاحب ان چھٹ بھیوں کو تو گولی مارئیے۔ ارے یہ ادا تو آپ کو بڑے سے بڑے ملک الموت سے بھی بال بال بچائے گی۔ میری مراد آپ کے چند مخصوص و بے تکلف احباب اور بے فکرے دوستوں سے ہے۔ چھتری کی یہ مستقل کجی آپ کو بار بار ہاتھ اٹھانے، سلام کا جواب دینے، خیریت پوچھنے اور گلا شہر سنے کی تمام تکلیف و کوفت سے یکلخت بچائے گی اور ان سب امور کی انجام دہی بھی ذرا سی حرکت و جھکاؤ سے ہوتی رہے گی۔ آپئے کچھ اور رنگین فائدے بتاؤں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہر سواری میں Over take ایک اخلاقی جرم اور مزاحمت بیجا کا ہم پلہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر کیا کہنا اس نرم و سبک اور آزاد رو سواری کا کہ اس میں Over take کا کہیں سوال ہی نہیں اٹھتا۔ جس حسینہ کے تعاقب کا تصور ہی آپ کو اپنی جندیا کے لئے خطرہ مول لینا معلوم ہوتا ہو آپ بلا تکلف اس کی چھتری سے اپنی چھتری ٹکرا کر وصل کی حسرت جی بھر کر نکال سکتے ہیں۔ صرف زیر لب Sorry کہہ لینا کافی ہو گا۔ اور سر جھکائے، نظر نیچی کئے اپنی اور اپنی چھتری کی جان سلامت لئے چاہے جہاں پھر سکتے ہیں۔ کرٹے کی کان میں کون کس کو ڈھونڈ پاتا ہے۔ یہی چھتری غریب آدمی کے لئے وہ کام کرتی ہے جو امیروں کے لئے موٹر کار بھی انجام نہیں دے پاتی۔ دراصل بارش ہی میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی مغرور سے مغرور لڑکی جس کی آپ سے علیک سلیک یا معمولی جان پہچان یا صورت آشنائی ہو ناممکن آپ دیکھیں کہ بھری برسات میں کسی دکان کی اوٹ لئے پائنچے اٹھائے دوپٹہ کمر میں لپیٹے ہوئے ادھر اُدھر وحشی ہرنیوں کی طرح جھجکی جھجکی نظریں اور شکوی ہوئی پیشانی لئے کھڑی ہے۔ آپ فوراً ہی بلا جھجک

اپنی چھتری سمیت اس کے بالکل قریب پہنچ جائیے اور اپنے کو سراپا پیش کر دیجئے۔

"ارے آپ یہاں کھڑی ہیں! کب سے پھنسی کیسے پھنس گئیں آپ؟ آج میں تو بڑی سخت ضرورت سے باہر نکلا ہوں۔ (اگر ضرورت نہ تا ہی منتظر ہو تو کم از کم جان بلب ماں کی دوا لینے کے لئے نکلئے۔) مگر آپ کو یہاں اس طرح اور اس حال میں دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ دیکھئے آپ تو کانپ رہی ہیں۔ ہوا بھی تو بہت تیز ہے اور پھر سارے کپڑے شرابور۔ چلئے، جلدی کیجئے۔ میں پہلے جلد از جلد آپ کو گھر تک چھوڑ دوں تب آگے بڑھوں ورنہ یہ پانی تو کہتا ہے کہ آج نہ برسا تو کبھی نہ برسا۔" یقیناً ایسے وقت میں ایسے ہمدرد کے ساتھ بعد شکریہ ہر آدمی چل کھڑا ہوگا۔ اب آگے آپ کی ذہانت، دوم قسمت۔

اب معاشیات اور اقتصادیات کے دائرے میں آ گئیے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اولاً تو آپ کو ضرورت رہتی ہے مگر بازار جانے کا موقع نہیں ملتا اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ بازار پہنچ گئے ہیں اور یہ سوچ کر بڑی کوفت میں مبتلا ہیں کہ آپ نے گھر سے کوئی تھیلا یا ٹوکری تو لائے نہیں۔ پھر اگر خریدیں تو اسے گھر تک لے جائیں کیسے؟ لیکن آپ کی یہ گھبراہٹ اور پریشانی سراسر ناتجربہ کاری اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔ آپ ذرا اپنی انگلیوں کو جنبش میں لائیے اور اندازہ کر لیجئے کہ آپ کی چھتری آپ کی گرفت میں ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو اب آپ اسی طرح مطمئن اور بے فکر ہو جائیے جس طرح جیب کترے کا سابقہ پڑ جانے پر شریف آدمی اپنی خالی جیب ٹٹول کر اطمینان کا سانس لیتا ہے اور اب آپ اپنے اس اسپرنگ دار یا لچکدار تھیلے میں کیلا، چاول اور شراب سے لے کر جوتے، برتن، سوئی اور جھاڑو تک رکھ سکتے ہیں۔ البتہ یہ خیال رہے کہ

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہئے۔

یا

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

اتنا ہی نہیں بلکہ اس معاملے میں تو ہم کو چھتری کی مساوات پسندی اور انصاف دوستی سے سبق لینا چاہئے۔ جس طرح ایک خریدار کے لئے چھتری ہر تعاون و امداد دینے پر تیار رہتی ہے اسی طرح ہر دوکاندار کے لئے بھی یہ خود نفع بخش ہے اور کم خرچ و کوتاہ نشیں بھی ہے۔ چنانچہ ایک چھتری کی موجودگی دوکاندار کو دوکان، جگہ، عمارت سب سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ ایک چھتری کو الٹ کر دنیا بھر کی چیزیں اور ہزاروں سامانِ تجارت سجا کے بیچے جا سکتے ہیں اور پھر یہ کہ جب چاہے یہاں سے وہاں، وہاں سے اور کہیں بلا زحمت و تضیعِ اوقات جا سکتے ہیں۔ اسی چھتری کو پھر سیدھا کر لو تو چھت کا کام دے گی اور تمام سامان کی حفاظت کی ذمہ دار۔

کہا جاتا ہے کہ دھان، پان اور حضرتِ انسان کی قسموں کا ٹھکانا نہیں لیکن آج میں اس مثلث میں چھتری کا اضافہ کر کے کہتا ہوں کہ آپ اس کی چاہے جتنی قسمیں اصلی و جعلی گنا ڈالیں مگر بات پھر بھی ادھوری ہی رہے گی۔ اگرچہ بلحاظ جنس (Gender) تو اردو کے قاعدے کے مطابق مذکر و مونث یا مردانی زنانی چپلوں کی طرح محض دو قسمیں ہیں مگر مزے کی بات یہ ہے کہ جس طرح دیہاتی مرد شہر جا کر مرد ہوا ہو جاتا ہے اسی طرح اسے شہر میں تو چھتری کے نام سے پکارتے ہیں مگر دیہات میں چھاتا کے بلند آہنگ لقب سے نوازتے ہیں۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ "نجیب الطرفین" چھاتا اس نازک و ضعیف صنف میں آتا ہی نہیں۔ کیونکہ اس کا خام مواد و مسالہ ہی اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ چھاتا بانس کی تیلی پتلی مگر فولاد کی کھپچیوں سے بنتا ہے اور اس میں متوسط طبقہ کا بانس بطور ڈنڈے کے لگا دیا جاتا ہے جس کی برکت سے چھاتا بردار کے کندھے کی رنگت اس کے آبنوسی چہرے سے لگا کھانے لگتی ہے۔ اس کا والی و وارث بالکل آہنی پوشش جیسا ہوتا ہے یہ چھاتا بارش اور دھوپ ہی سے نہیں بلکہ اولے

اور پتھر سے بھی بچاتا ہے۔ لڑائی کے موقع پر، پیراشوٹ کی چھتری سے زیادہ سود مند ہوتا ہے اور چھت سے زیادہ قابلِ اعتماد۔ اس کے موجد ہنومان جی بتائے جاتے ہیں۔ آج کل نقل اور نام کا زمانہ ہے۔ لہٰذا اس چھاتے کی صلابت تو خواب و خیال ہو گئی۔ البتہ کبھی کبھی نام لے لیا جاتا ہے۔ جس سے محض اس کے اٹھانے والے کی ضخامت و شخصیت سے فی الجملہ تطابق مطلوب ہوتا ہے۔ مثلاً نازک انداموں کی چھتری تو پہلوانوں کا چھاتا۔ انگریزوں کی چھتری، ہندوستانیوں کا چھاتا۔ لڑکیوں کی چھتری، لڑکوں کا چھاتا۔ امیروں کی چھتری، غریبوں کا چھاتا۔ مولویوں کی چھتری، پنڈتوں کا چھاتا۔ لیڈروں کی چھتری، مزدوروں کا چھاتا وغیرہ۔ اس طرح کی تقسیم نہ جانے کتنی ہو سکتی ہے اور ہر ایک پر الگ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ مگر جتنی قسمیں سامنے آئی ہیں یا باقی رہ گئی ہیں انہیں تو چھوڑئیے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ایک کمال ہر ایک میں قدرِ مشترک کے طور پر ہے وہ یہ کہ ہر ایک قسم اپنے اٹھانے والے کی شخصیت، سیرت، صورت و تعلیم، مزاج کا آئینہ ہوتی ہے اور اگر آپ میں بصیرت واقعی موجود ہے تو آپ کسی شخص کی چھتری سے اس کے مالک کے عادات و خصائل معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی شخصیت و کردار پر چھوٹا یا بڑا سا مضمون بھی لکھ سکتے ہیں مگر ایسا کیجئے گا نہیں۔

آخر میں مجھے چھتری کے عیوب بھی گنانے ہیں کیونکہ آپ کہیں گے۔ ہنرش گفتی عیبش بگو۔ پہلی خرابی تو یہی ہے کہ وہ کم بخت بڑی بے وفا اور بڑی دغا ہے۔ ذرا سا چوک ہوئی کہ اس کے پر لگے اور پھر ملتی کبھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ بعض وقت یہ خود ایک بوجھ ہو جاتی ہے اور اسے نوچ کر پھینکنے کو جی چاہتا ہے مگر بار بار ضبط سے کام لینا پڑتا ہے۔ بعض وقت اس کا سایۂ رحمت مہمل یہ زحمت ہو جاتا ہے۔ بجری برسات

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

ہندو مسلم فسادات

اس مضمون سے اختلاف کے کئی پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اس میں کچھ کام کی باتیں بھی ہیں اس لئے یہ مضمون "دیہات" میں شائع کیا جا رہا ہے ـــ (ادارہ)

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ ہند و پاک میں فسادات کی آگ بری طرح پھیل رہی ہے۔ ہمارے باشعور ادیبوں اور شاعروں کی اکثریت اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور تعمیری مضامین لکھنے کے بجائے خاموش ہے۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار کا کام افسانے لکھنا ہے، ناول نگار پلاٹ کی تلاش میں گم ہے۔ شاعر شعر موزوں کرنے کی فکر میں ہے اور محقق و تنقید نگار حضرات موٹی موٹی کتابوں میں کھوئے ہوئے ہیں۔ لیکن وقت کی ضرورت ہے۔ جو فنکار نظر نہیں نہیں رکھتے، جن کا قلم وقت کے اہم تقاضوں کو پورا نہیں کرتا وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سماج کے معمار نہیں بن سکتے۔ اس لئے ہمارے فن کاروں کا اس وقت فرض ہے کہ وہ عوام کی رہنمائی کریں۔ عوام سے الگ رہکر فن کی خدمت ممکن نہیں ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد چھوٹے موٹے فرقہ وارانہ فسادات بار بار ہوئے ہیں لیکن ان دنوں ہند و پاک میں جس طرح فسادات کی آگ پھیلی ہے، اس قدر بھیانک صورت آزادی کے بعد سے فسادات نے کبھی اختیار نہیں کی۔

ناکام حکومتیں

بار بار ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات نے یہ صاف طور پر ثابت کر دیا ہے کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں فسادات کی جڑ کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہیں خاص کر مشرقی اور مغربی بنگال میں حالیہ فساد، تمام باشعور ترقی پسند اور امن پسند عوام کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے۔ جتنی بار فسادات ہوئے دونوں ملکوں کی حکومتوں نے یا تو اپنے اپنے طور پر امن کی اپیل کی ہے یا مشترکہ بیانات دئے ہیں۔ حتیٰ کہ "نہرو لیاقت" معاہدہ بھی ہوا لیکن ان بیانات اور معاہدوں میں فسادات کا دائمی حل نہیں مل سکا موقع ملتے ہی حالات بگڑے اور فرقہ پرستی نے سر اُٹھایا ہے۔ فسادات کا الزام ہمیشہ ایک حکومت دوسرے کے سر تھوپتی آئی ہے اور درحقیقت اس طرح دونوں حکومتیں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی ہیں۔ اب بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ دونوں حکومتیں ناکام ہیں۔ ورنہ حکومت نہ چاہے، امن پسند عوام نہ چاہیں۔ تعمیر و ترقی کے متوالے نہ چاہیں ـــ اور صرف چند غنڈوں کے چاہنے پر۔ صرف چند مفاد پرستوں کی مرضی پر کیا فسادات ہو سکتے ہیں۔ کیا حکومتیں امن پسند عوام کو ساتھ لے کر یعنی عوام کی اکثریت کو ساتھ لے کر چند مفاد پرستوں کا گلا گھونٹ نہیں سکتی؟

فرقہ پرستی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کیلئے

۔۔۔ آپ چھتری کی اوٹ میں راستہ طے کرتے ہیں اور آپ ۔۔۔سوائے اپنی چھتری کے سب آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ دکھائی ۔۔۔یتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی حقیقتاً ہم پہاڑ تلے پہنچ جاتے ہیں اور ۔۔۔لوں کے قہقہے ہمیں ہشیار و متنبہ کرتے ہیں۔ کھلی چھتری ۔۔۔ستم توڑتی ہے تو بند چھتری اپنی نوک اور دستہ سے بار ۔۔۔ر آپ کے صبر و ضبط کا امتحان لیتی رہتی ہے اور اس معاملے ۔۔۔ں وہ اپنے پرائے کا امتیاز بالکل نہیں کرتی جس میں نوبت ۔۔۔فساد بھی پہنچ سکتی ہے۔ سب سے دلچسپ کھیل تو اُس ۔۔۔قت دکھاتی ہے جب رحمت کے تمام فرشتوں نے مل جل کر آب و باد کی بخشش بے اندازہ و بے حساب کرنا شروع کر دی ہو اور آپ اپنی چھتری کی تنگ دامانی کا خیال کئے بغیر باہر نکل پڑیں تو یہ طائر ملکوتی دائیں، بائیں جھکنے کے بعد پر پرواز تولتا رہتا ہے اور پھر دم کے دم میں اپنے مرکز کی طرف پہنچنے کے لئے ہمہ تن سمٹ کر آسمان سے لو لگا دیتا ہے اور آپ براہ راست فیضانِ رحمت کا اکتساب کرنے لگتے ہیں۔ اس وقت حال و قال لازمی ہے اور زبان پہ یہ شعر بھی ؂

اے نامراد چھتری تجھ پہ غضب خدا کا
تُو نے مرا سفینہ خشکی ہی میں ڈبویا

مگر ڈر یہ ہے کہ کہیں چھتری بھی پلٹ کر جواب نہ دے بیٹھے کہ او نادان آج سے سو برس پہلے تجھے تنبیہ کر دی گئی تھی۔ تُو اسے بھول بیٹھا ہو تو، سُن ؂

چھتری کے تم فریب میں مت آئیو اسد
چھتری تمام حلقۂ دام خیال ہے

☆☆

یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ جڑ کہاں ہے۔ کتنی گہری ہے اور کہاں تک پھیل چکی ہے۔

مذہب اور تقسیم

فرقہ پرستی کی جڑ تلاش کرنے کیلئے ہمیں تاریخ ہند کے چند پرانے اوراق کی ورق گردانی کرنی پڑیگی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ جڑ نہایت قدیم و گہری ہے اور اس کا زہر سماج کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہ مرض ایسا نہیں جس کا علاج ناممکن ہو کیونکہ عالمی تاریخ گواہ ہے کہ فرقہ پرستی دنیا کے کونے کونے میں مختلف صورتوں میں رہی ہے۔ مختلف مذاہب کے نام پر، ایک ہی مذہب کے مختلف گروہوں کے نام پر، مختلف زبان، رنگ و نسل کے نام پہ فرقہ پرستی کو ہوا دی گئی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ دنیا بھر میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس نے فرقہ پرستی کو حل کرنے کے لئے اپنے ملک کو تقسیم کر دیا ہو ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم اس سلسلے میں تاریخ عالم کا واحد واقعہ ہے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ دنیا بھر میں فرقہ پرستی ہوتے ہوئے بھی آج تک اس سرزمین کا کوئی ملک محض فرقہ پرستی کی وجہ سے تقسیم نہیں ہوا جیسا کہ عظیم ہندوستان ہوا ہے اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ عالمی تاریخ میں ایک انوکھا قدم اٹھانے کے باوجود، ہندوپاک سے فرقہ پرستی کی جڑ کٹ نہ سکی۔ اس سے ثابت ہوا کہ تقسیم ملک فرقہ پرستی کا کوئی حل نہیں تھا۔ اگر یہ حل ہوتا تو تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں ہمیشہ کے لئے امن قائم ہو جاتا اور دونوں اپنے اپنے ملک کی تعمیر میں سرگرم رہتے لیکن ایسا نہیں ہوا ہے۔

مسلمان اور مسلم لیگ

کہا جاتا ہے کہ تقسیم ملک کے واحد ذمہ دار مسلمان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی رگ رگ میں فرقہ پرستی بسی ہوئی ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ لیکن کیوں؟ کیا مسلمان واقعی فرقہ پرست ہیں۔ کیا ان کے کردار میں فرقہ پرستی رچی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا اس کے باوجود یہ غلط ہے کہ ان کے کردار میں فرقہ پرستی رچی ہوئی ہے انہوں نے مسلم لیگ کا ساتھ کیوں دیا؟ اس لئے کہ ہم انہیں اپنے ساتھ لا نہ سکے۔ ہم میں کوئی ایسی کمزوری ضرور تھی جس کی بناء پر مسلمانوں کی اکثریت ہم سے پرے ہٹ گئی۔ انگریز سامراجیوں کی چال میں آ گئے۔ مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے۔ اکثریت کا نعرہ بلند کیا۔ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے دوسروں پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہئے۔

ہندوستان کے مسلمان کون ہیں۔ ظاہر ہے یہ کروڑوں مسلمان باہر سے یعنی عرب ممالک سے ہندوستان نہیں آئے۔ وہ ہندوستانی ہیں۔ ہندی ہیں ہمارے اور ان کے خون میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ پھر ان پر فرقہ پرست ہونے کا الزام کیوں ہے۔ کیا یہ الزام ہم پر نہیں لگ سکتا۔ مسلمانوں کے کردار ہی میں اگر فرقہ پرستی شامل ہوتی تو مسلمان کیوں کر سامراجیوں کے خلاف لڑتے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ بن بیلا کی قیادت میں الجیریا کے عوام جدوجہد کر رہے ہیں۔ ناصر نے مصر کو نئی زندگی دی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تادم آخر کانگریس میں مولانا آزاد رہے ہیں اور خان عبدالغفار خاں کو ہم آج بھی فخر سے سرحدی گاندھی کہتے ہیں۔ بنگال کا باغی شاعر قاضی نذرالاسلام بھی ایک مسلمان ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوامی رہنما مولانا بھاشانی بھی ایک مسلمان ہی ہیں۔ کیا یہ سب فرقہ پرست ہیں؟ نہیں۔ ان کو فرقہ پرست کوئی نہیں کہہ سکتا انہیں کوئی عوام دشمن قرار نہیں دیتا۔ پھر یہ کیسے مان لیا جائے کہ، مسلمان فرقہ پرست ہوتے ہیں۔ کیا آج کوئی ڈاکٹر ذاکر حسین پر فرقہ پرستی کا الزام لگا سکتا ہے؟

کانگریس کی غلطی

مسلمانوں کی اکثریت کو آزادی کی جدوجہد میں ہم ہمارے ساتھ نہیں لا سکے۔ اس کی ذمہ داری ہم پر ہی عائد ہوتی ہے۔ وجہ ہماری آزادی کی تحریک کی اندرونی کمزوریاں رہی ہیں۔ کانگریس کی تاریخ شاہد ہے کہ کانگریس رئیس زادوں کی ایک انجمن رہی ہے۔ اس کے کرتا دھرتا اونچے مالدار طبقے سے آئے ہوئے ہندو تھے اور ان ہندوؤں میں بھی اکثریت اونچی ذات والوں کی تھی۔ جس کی وجہ سے ہندوؤں کی چھوٹی ذات والے مثلاً اچھوت کانگریس سے دور رہے اور ان میں اونچی ذات کے خلاف نفرت کا جذبہ بھی رہا۔ کانگریس کی تحریک بڑے لوگوں کی تحریک تھی چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان جو بھی کانگریس کے کرتا دھرتا تھے وہ رئیس زادے تھے۔ گاندھی جی، پٹیل، راج گوپال اچاریہ، موتی لال نہرو، خان عبدالغفار خاں، جواہر لال نہرو، نیتا جی اور مولانا آزاد وغیرہ وغیرہ میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو نچلے طبقے یا غریب گھرانے کا فرد ہو۔ ان کے نام گواہ ہیں کہ کانگریس دولت مندوں کی انجمن تھی اور نہ ہی مسلم لیگ کوئی عوامی جماعت تھی۔ اس کے کرتا دھرتا بھی رئیس زادے تھے۔ لہٰذا یہ دونوں جماعتیں عوام کی نمائندہ جماعتیں نہیں تھیں۔ ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ انگریز کے بجائے حکومت ان کی ہو۔ اور ہوا بھی یہی۔

انگریز سے پہلے

انگریز سے پہلے دہلی پر مسلمانوں کی حکومت تھی اور شاہ دہلی کے تحت ہندوستان میں کئی ہندو راجے اور مسلمان نواب تھے۔ ان لوگوں نے رہ رہ کر اپنی آزادی کے لئے ہنگامے برپا کئے۔ مسلمانوں کے آخری دور میں تاجر سماج نے سر بلند کیا۔ اور کئی نواب تاجروں کے قرضدار تھے۔ مثلاً مرشد آباد کا نواب گھرانہ۔ تجارت کے اس دور میں ہندوستانی تاجروں سے انگریز تاجروں کا ملاپ ہوا اور انگریز تاجروں نے یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی نے نوابوں سے حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ اس طرح انگریز یہاں کا حاکم بنا۔ یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے

کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی، جس کی وجہ سے مسلمانوں پر پیٹے ہوئے مہروں کی سی حالت طاری ہو گئی۔ مسلمان ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن ہندوؤں کی حالت ایسی نہیں تھی اُن لوگوں نے مسلمانوں سے قبل انگریزی تعلیم و تربیت حاصل کی اور انگریز سماج میں اپنا مقام بنالیا۔ مسلمان انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے ہے اور فرنگی زبان سے اس نفرت نے انہیں ایک حد تک گوشہ نشین بنا دیا۔

کانگریس کا فرقہ وارانہ کردار

چونکہ ہندوؤں نے پہلے انگریزی تعلیم و تربیت پائی اس لئے اُن میں نیشنلسٹ خیالات نے زیادہ زور پکڑا۔ کانگریس کی تحریک میں وہ آگے آگے رہے۔ لیکن کانگریس کا کردار ہندوانہ رہا ہے جس کا ثبوت ہے بھگوت گیتا کا پاٹھ کرنا اور بھجن گانا۔ رام راج قائم کرنے کا ارادہ اس تحریک کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہا ہے یعنی کانگریس تحریک ہندو مذہب کو اپنے دامن لئے ہوئے تھی اور اس طرح اس نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ پلاٹ فارم کا راستہ ہموار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ خیالات کو تازگی ملی۔ انگریزوں نے موقع کا خوب استعمال کیا اور آزادی کی تحریک کو کمزور کرنے کے لئے مسلمان رہنماؤں کو یہ سمجھایا کہ دیکھو کانگریس ہندوؤں کی تحریک ہے۔ اس کا مقصد ہندوؤں کی بہبودی ہے۔ رام راج قائم کرنا ہے۔ ہندو راج قائم کرنا ہے اور اس طرح مسلمانوں کے لئے جداگانہ ریاست کے نظریئے نے زور پکڑا۔ اور جب مسلمانوں کی ایک الگ جماعت نے سر اُٹھایا تو کانگریس کے رہنماؤں میں سے چند نے اس غلطی کو محسوس کیا۔ چت رنجن داس، گاندھی جی اور نیتا جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشش کی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی

جنگِ آزادی کا مقصد چونکہ محض انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کرنا تھا۔ (یہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جنگ نہیں تھی۔) اس لئے اُن کے پاس کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا جس کی بنا پر وہ سرمایہ دارانہ نظام کی دھجیاں بکھیر سکے۔ یہ سیاسی جدوجہد بڑی حد تک ملکی سرمایہ داروں کی آزادی کے لئے تھی تاکہ وہ انگریز سرمایہ داری کا آزادانہ طور پر مقابلہ کر سکیں یعنی دونوں طاقت میں اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے لڑ رہے تھیں۔ آزادی کی تحریک سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف نہیں تھی۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ کمال اتاترک جو اسلامی ممالک کو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تحریک لینے کے لئے تیار کر رہے تھے، کے خلاف ہندوستان میں جب خلافت کی تحریک نے جنم لیا تو کانگریس نے خلافت کی تحریک کو تسلیم کیا۔ اور اسی طرح کمال اتاترک کے خلاف آواز بلند کی گئی۔

صرف کانگریس ہی نہیں

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ جنگ آزادی کے زمانے میں کوئی ایسی ہر دلعزیز سیاسی جماعت نہیں تھی جو کسانوں اور مزدوروں کی جماعت کہی جاسکے۔ کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں پیدا ہو چکی تھیں لیکن اُن کے کرتا دھرتا بھی اونچے یا درمیانی طبقہ کے افراد ہی تھے۔ جن میں عوامی مفاد کے لئے لڑنے کی اتنی قوت نہ تھی۔ کمیونسٹ پارٹی بھی فرقہ پرستی سے دُور نہیں تھی۔ اُس نے بھی پاکستان قائم کرنے کی بھرپور تائید کی یعنی اس نے بھی یہ تسلیم کر لیا تھا کہ قومیت کی بنیاد محض مذہب ہے اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ ملک کی تجویز کو قبول کرنے کی ذمہ داری کانگریس کے سر ہے کیونکہ وہی ملک کی سب سے بڑی جماعت تھی لیکن کمیونسٹ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انہوں نے ایک تاریخی غلطی کی ہے اور براہِ راست کسی بھی تقسیم ہندوستان کے ذمہ دار وہ بھی ہیں۔

فساد کی ضرورت

تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے حکمران طبقوں نے اپنے طبقے کی سہولت کی خاطر عوامی تحریکوں کو کچلنے عوامی مطالبات سے نجات پانے اور اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے ضرورت کے تحت بار بار فرقہ پرستی کو ہوا دی ہے۔ ہندوستان میں ہم نے دیکھا ہے کہ، الکشن میں ہر جماعت نے کچھ نہ کچھ فرقہ پرستی سے کام لیا ہے۔ الکشن میں مندر اور مسجد کا استعمال کیا گیا ہے۔ پاکستان میں بھی یہی ہوا ہے۔ حال ہی میں مشرقی پاکستان کے کھلنا اور جیسور میں جو فسادات ہوئے ہیں اس کی ضرورت پاکستانی حکومت کو رہی ہے۔ پاکستانی حکومت نے پاکستان کی تمام عوامی تحریکوں کو کچل دیا ہے۔ ہزاروں سیاسی قیدی آج بھی پاکستان کی جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مشرقی پاکستان نے عرصہ کے بعد پھر سے اپنے مطالبات کے لئے لڑنا شروع کیا تھا۔ دو تین ماہ سے مثلاً بنگال میڈیکل کالج کے ڈاکٹر اور طالب علم عرصہ سے جدوجہد کرتے آرہے ہیں۔ مولانا بھاشانی نے پورے ملک میں سیاسی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام جمہوریت کے خواہاں ہیں۔ وہ ووٹ دینے کی آزادی چاہتے ہیں۔ اپنا حق چاہتے ہیں اور حکومت نہیں چاہتی کہ پاکستانی عوام کو ووٹ دینے کا حق ملے لہٰذا عوام کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے کا واحد طریقہ فرقہ وارانہ فساد ہے۔

مغربی بنگال کے رہنما یہ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں جو فسادات ہوئے انہیں کی وجہ سے کلکتہ میں فساد ہوا۔ مان لیا کہ مشرقی بنگال کے فسادات کے اثر ہی نے مغربی بنگال کی فضا کو بگاڑا اور یہاں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری پاکستان پر ہے لیکن یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے فرار ممکن نہیں اور نہ ان وجوہات پر پردہ ڈا[illegible] کی وجہ سے فساد ہوا ہے۔ مغربی بنگال مشرقی بنگال کا کچھ نہ کچھ اثر ہونا غیر فطری نہیں [illegible] دونوں حصوں کے تعلقات نہایت [illegible] حد تک ہوتے ہوئے بھی (؟)

گہرے رشتے میں مربوط ہیں جس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن فساد کا جواب فساد سے دینا کوئی تعمیری جواب یا تعمیری ردِ عمل نہیں ہے۔

چند تجویزیں

فسادات کے حل کے لئے مختلف سیاسی پارٹیوں نے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ کچھ اس قسم کی ہیں۔

- پاکستان سے تمام ہندوؤں کو ہندوستان لے آنا۔ یہاں کے مسلمانوں کو پاکستان بھیج دینا۔
- پاکستان سے لائے ہوئے ہندوؤں کو بسانے کے لئے پاکستان سے زمین طلب کرنا۔
- پاکستان کا تجارتی طور پر بائیکاٹ کرنا۔

پہلی تجویز صاف طور پر فرقہ پرستی کی انتہا ہے۔ ہندوستان کے لئے جو ایک غیر مذہبی جمہوری ملک ہے یہ ناممکن ہے۔ یہ ہمارے ملک کی جمہوریت کا خون ہے۔ ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کو رہنے کا پورا پورا حق ہے کیونکہ یہ اُن کا وطن ہے اور اُن کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

پاکستان سے تمام ہندوؤں کو یہاں لے آنے اور اُن کو بسانے کے لئے پاکستان سے زمین طلب کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم پاکستانی عوام کو فرقہ پرست قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہاں کے عوام فرقہ پرست نہیں ہیں۔ اگر پاکستان کے عوام فرقہ پرست ہوتے تو آج ایک بھی ہندو پاکستان میں زندہ نہ رہتا۔

دوزخ کے کیڑے

کیا ہم مولانا بھاشانی کے اس بیان کو بھول جائیں جو انہوں نے ہسپتال پر پڑے پڑے پاکستانی عوام کے نام دیا ہے۔ مولانا نے ۲۱ فروری کو ڈھاکہ میں "یوم شہدا" کے موقع پر کہا۔

"آج جو لوگ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے ہاتھوں کو اپنے بھائیوں کے خون سے رنگ رہے ہیں وہ اپنے ہاتھوں کو ناپاک کر رہے ہیں۔ آج جو مذہب کے نام پر بے گناہ عورت، مرد اور بچوں کے سینے پر چھری چلا رہے ہیں اُن کا نہ تو کوئی ملک ہے اور نہ کوئی مذہب۔ وہ ہندوستانی ہوں یا پاکستانی، وہ سب کے سب انسانیت کے دشمن ہیں۔ کسی مذہب سے اُن کا کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ دوزخ کے کیڑے ہیں۔ وہ تہذیب کے نام پر بدنما داغ ہیں۔"

(بنگلہ سے ترجمہ)

ہم کیونکر اُن پاکستانی بھائیوں کو فرقہ پرست کہہ سکتے ہیں۔ جنہوں نے مشرقی بنگال میں فسادات کے دنوں اپنی جان پر کھیل کر فسادات کے خلاف اپنی آواز بلند کی ہے۔ امن کمیٹی قائم کی۔ امن کا جلوس نکالا۔ فساد کرنے والوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور صرف یہی نہیں بلکہ ہندوؤں کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہوئے تیس ۳۰ پاکستانی مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ہم ان کے اس عظیم اور مقدس مقصد کی بے حرمتی نہیں کر سکتے۔ ہمیں پاکستان کے بہادر عوام پر کامل یقین ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے خلاف لڑتے رہیں گے اور آج نہیں تو کل فرقہ پرستی کو موت کے گھاٹ اُتار کر ہی دم لیں گے۔

احمقانہ تجویز

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ پاکستان سے تجارتی تعلقات ختم کر لئے جائیں۔

آج کی دنیا میں کسی ملک کا بائیکاٹ کرنے کی تجویز نہ صرف احمقانہ ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ آج کوئی بھی ملک کسی ملک کا بائیکاٹ کر کے اُسے مجبور نہیں کر سکتا اور پھر ہندوستان کے پاس ایسی کونسی تجارتی چیزیں ہیں جسے پاکستان کسی اور ملک سے حاصل نہیں کر سکتا۔

قابلِ عمل تجویزیں

اس قسم کی فرقہ وارانہ تجاویز سے فسادات ختم نہیں ہوں گے بلکہ انہیں اور تقویت ملے گی۔ آج فسادات کا خاتمہ کر کے بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مندرجۂ ذیل تجویزوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) دونوں ملکوں کے اخبارات ایک دوسرے ملک کی عوامی جد و جہد کی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کریں تاکہ دونوں ملک کے مزدوروں اور کسانوں میں اُن کی جد و جہد کا زیادہ سے زیادہ پرچار ہو اور ان میں اتحاد پیدا ہو۔

(۲) دونوں ملک کے عوام اپنی اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہند پاک ادبی کانفرنسیں، مشاعرے، سنگیت پروگرام، صحافیوں کی بیٹھک اور فلمی میلے وغیرہ ہوں۔

(۳) فلموں اور اخبارات پر سے ہر قسم کی پابندی اُٹھالی جائے۔ اخبارات اور رسالوں کو بذریعہ منی آرڈر یا وی۔ پی رقم خریداری وصول کرنے کی سہولت دی جائے تاکہ ایک ملک کے رہنے والے دوسرے ملک کے اخبارات اور رسالوں کے خریدار بن سکیں اور ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جان سکیں۔

(۴) عید میں زیادہ سے زیادہ ہندو اپنے پاکستانی دوستوں سے ملنے جائیں اور دیوالی یا دُرگا پوجا کے موقع پر زیادہ سے زیادہ مسلمان اپنے دوستوں سے ملنے ہندوستان آئیں۔ دونوں حکومتوں سے مطالبہ کیا جائے کہ ان موقعوں پر جانے آنے کے لئے سہولتیں فراہم کی جائیں اور سفر کرایے میں کمی کی جائے۔

(۵) اگر خدا نہ کرے پاکستان کے کسی حصہ میں طوفان یا قحط وغیرہ ہو تو ہندوستانی بھائی پاکستان کی امداد کے لئے فنڈ قائم کریں اور بالکل اسی طرح اگر ہندوستان میں ہو تو پاکستانی بھائی امدادی فنڈ قائم کریں۔

(۶) ہندوستان اور پاکستان کے ادیب ہندو مسلم اتحاد کو پروان چڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ مضامین لکھیں تاکہ فرقہ وارانہ پالیسیوں کے تحت لوگوں کے دل و دماغ پر جو میل چڑھ چکا ہے وہ اُتر جائے اور عوام کا شعور صاف ہو جائے اور اُن میں مشترکہ تہذیب، دوستی، انسانیت اور بھائی چارگی کا جذبہ نئے سرے سے جنم

نازش پرتاپگڑھی

اشکوں میں رنگِ خونِ تمنا اُبھار کے
ہم نے بھی دن گزار لئے ہیں بہار کے

کٹنے کو دن کٹیں گے غمِ روزگار کے
قصّے رہیں گے رحمتِ پروردگار کے

ہم کو یہ دن بھی یاد رہیں گے بہار کے
ہر بابِ گُل سے نکلے ہیں افسانے خار کے

توہینِ غم نہ ہو تو میں پوچھوں پکار کے
کیسے مزاج ہیں مرے پروردگار کے

یاں تک تو آ گئے ہیں ترے انتظار میں
ہم خود جواب دیتے ہیں تجھ کو پکار کے

یوں مسکرا اُٹھا کوئی مجبورِ زندگی
معنی بدل گئے ستمِ روزگار کے

یہ احترامِ غم ہے کہ زنداں سے تھوڑی دور
جھونکے رُکے ہوئے ہیں نسیمِ بہار کے

تنہائی سفر نے بنائے ہیں بے حساب
ورنہ بہت نہیں ہیں ستم روزگار کے

شرما گئی ہے خود ہی مری غیرتِ خلوص
دھوکے کھلے ہیں جب نگہِ اعتبار کے

کس رُخ سے زندگی نے دکھایا ہے آئینہ
آنسو نکل پڑے غمِ لیل و نہار کے

راہِ طلب میں آئے ہیں ایسے مقام بھی
جب رو دیے ہم اپنی شبِ غم گزار کے

دل میں جراحتوں کا چمن زار کھل گیا
آنکھوں نے خواب دیکھ لئے تھے بہار کے

اے جراتِ حیات ذرا کھل کے مسکرا
دیکھیں گے حوصلے غمِ ہمت شکار کے

اپنی زمیں کی مانگ میں افشاں نہ بھر سکے
لاتے رہے ہیں لوگ ستارے اُتار کے

کچھ جاتے جاتے رہ سی گئی تیرگیٔ شب
کچھ ہم بھی رُک گئے ہیں سحر کو پکار کے

نازش نہ ہوتی کاش کوئی شاخِ آشیاں
احسان کیوں اُٹھائے نسیمِ بہار کے

ثریا محمود زیدی

وادیٔ جنت نشان

ہر گام پر یہ لالہ و گُل کی حسیں قطار
حدِ نگاہ تک یہ دل افروزیٔ بہار
یہ کھیت زعفران کے زرّین و زرنگار
جیسے بسا چا ارض پہ کندن کے مرغزار
"ڈل" کا یہ حُسنِ شوخ، یہ جھرنوں کا سلسلہ
اٹھکیلیاں سی کرتی ہوئی ہر طرف صبا
پانی پہ کشتیوں کی، شکاروں کی دوڑ بھی
سطحِ زمیں پہ یاسمن و گُل کا رنگ روپ
یہ برف پوش سر بہ فلک سی پہاڑیاں
تا حدِّ در بکھری بکھری یہ شاداب جھاڑیاں
کرتا ہے خوبیوں میں اضافہ نشاط باغ
چھلکاتی ہیں چناروں کی رعنائیاں ایاغ
یہ "شالامار" باغ کی افسوں طرازیاں
خاموش سبزہ زاروں کی افسانہ سازیاں
کشمیر! تیرا جلوۂ رنگیں ہے لازوال
دنیائے آب و گِل میں کہاں ہے تری مثال
کشمیر! تیری اور ہی کچھ آن بان ہے
بے شبہ تو زمین پہ جنت نشان ہے

فساد کی دستک

[illegible] سیمیں

اُسی روز صبح کے اخباروں میں ہندو
مہاسبھا کا یہ اعلان شائع ہوا کہ وہ ہندوستان گیر پیمانے پر ہتیم
ستی منائے گی۔ اور اس اعلان نے جیسے دلّی کے
رسا[illegible] کو نگل لیا تھا۔ ہمارے دفتر میں لوگ اخبارات
[illegible]ی خبروں پر اظہارِ رائے کی غیر معمولی صلاحیت
[illegible]رکھتی ہے اگر کہیں سے ایک طوطے کی چوری کی
خبر آجائے تو وہ اپنے سیموزیم میں یہ ثابت کر سکتے
[illegible]ل یہ کسی مینا کی چوری کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے کام
[illegible] قبیلی تدابیر کو ابھی سے درست کر لینا چاہئے مگر
[illegible]سبھا کے اس اعلان سے جیسے سب کے احساس کو
[illegible]لے پہنچ گئی تھی۔ کسی کی ایک دوسرے سے ہم کلام
[illegible]کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔

شام کے وقت جب ہم لوگ دفتر سے باہر نکلے
[illegible]نے نندلال بابو سے کہا۔

"نندلال بابو! یہ ہندو مہاسبھا کو کتنی ٹھوکی
[illegible]ہے! ہندوؤں کو ہندوستان میں کاہے کا خوف
[illegible]ہے۔ جو اُن کی حفاظت کے لئے کمر کسی جا رہی ہے"
[illegible]ت سُن کر نندلال بابو کے چہرے پر ایک ہلکا سا طنز
[illegible]ر رہ گیا۔ وہ میری بات سُنی ان سُنی کر کے چُپ
[illegible] ہمارے ساتھ چلتے رہے۔

میں نے کچھ دیر کے بعد پھر کہا۔
"نہیں نندلال بابو! جنگل میں اگر کوئی ناتواں ہرن
[illegible]ی حفاظت کی بات کرے تو سمجھ میں آتی ہے لیکن اگر
[illegible]یہ اپنی بقا کا رونا روئے تو اس کا کیا کہیں۔
ایسے کہیں گے کہ دو چار ہرنوں کو اور کھا لو"

حمید نے جو اب تک ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا،
درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اور کیا کہیں
گے؟"

ہندو مہاسبھا کا یہ اعلان کھلنا اور کلکتہ کے
فسادات کے فوراً بعد ہی شائع ہوا تھا۔ اور جب سے
کھلنا اور کلکتہ میں تیتر کو بچانے کے لئے بٹیر کو شہید
کیا گیا تھا حمید کی آنکھوں سے زندگی سے محبت کا اُجالا
جاتا رہا تھا۔ وہ فطرتاً بڑا شوخ نوجوان تھا اور اس کی شوخی
اور حاضر جوابی کی وجہ سے ہمیشہ ہمارے دفتر میں ہما ہمی
رہتی تھی مگر ان فسادات کے بعد سے وہ بالکل خاموش
ہو کر رہ گیا تھا جیسے قدرت نے اُس کی زبان کو
جتنی بھی شوخی عطا کی تھی وہ ساری کی ساری اب
صرف ہو چکی۔ لوگوں میں ابھی تک تحفظ اور اعتماد کا
احساس بحال نہیں ہوا تھا۔ اور ہر شخص کو یوں محسوس
ہوتا تھا جیسے کلکتہ اور کھلنا ہمارے پڑوس میں ہمارے
مکان سے بالکل لگ کر واقع ہوں اور وہاں کے شعلے
ہمارے مکان کی شہتیر تک بھی پہنچ چکے ہوں یا پہنچ
رہے ہوں اور حمید کے جذبات ان دنوں بالکل اُس
بکری کے بچے کی مانند تھے جو ندی کے کنارے پانی پیتے
ہوئے شیر کی نگاہوں میں آ گیا ہو۔ آج وہ بہت دنوں
کے بعد اس موضوع پر کچھ بولا تھا اور جب بولا تو مجھے فوراً
اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ میں نے اُس کے درد کو اس
کے سامنے ہی چھیڑ دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس جیسے اس
کے اس مختصر سے جواب نے ندٔ پ کچھ آنسو تھے جو
میری ہمدردی کے اظہار سے اُس کے گالوں پر ڈھلک آئے

نندلال بابو نے تنبیہہً میری طرف دیکھا اُن
کی اس خاموش تنبیہہ میں ہزار جواب چھپے ہوئے تھے
میں نے بات کو آئی گئی کرنے کے لئے جیب سے
سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور باری باری سے سب کو
پیش کرنے لگا۔ میری اس مصروفیت سے حمید کے
چہرے پر بھی ایک ہلکی سی اعتماد بخش مسکراہٹ کی
سُرخی پھیل گئی۔ اور پھر ہم سب چُپ چاپ دھوئیں کے
مرغولے بناتے ہوئے لوری بندر اسٹیشن کی طرف بڑھتے
رہے۔ مگر یوں جیسے اب بھی ایک دوسرے کے
وجود سے خائف ہوں۔ یوں جیسے اب بھی اپنے اپنے
وجود کی گہرائیوں میں ڈوب کر سسکنا چاہتے ہوں
مگر جب اُسی شام کو ہماری کالونی میں
ہندو بچاؤ ستی بنائی گئی تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔
اس لئے کہ ہماری ساری کالونی میں کوئی مسلمان ہے ہی نہیں
بس ناکے پر ایک ایرانی ہوٹل والا ہے تو اُسے لوگ
ہندو مسلم فرقہ واریت کے اس موجودہ تصور سے مستثنیٰ
قرار دیتے ہیں۔ اور رہ گئے گنپت راؤ دادا کی داڑھی کی
کی بھتی چڑھانے والے دو چار چھو کرے تو دادا اُن سے
تو چاہے جس مسلمان کا خون کرا لے۔ پھر کالونی میں اس
ہندو بچاؤ ستی کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں
نہ آیا۔ میں نے سمجھا کسی نے گپ اڑا دی ہے اور میری
بیوی کسی کے بہکاوے میں آ گئی ہے۔
مگر میری بیوی نے کہا۔
"نہیں جی۔ ستی تو بن بھی گئی اور گنپت راؤ دادا
اُس کے پردھان ہیں"
"اچھا" میں نے پھر بھی بے یقینی کے عالم میں
کہا۔
"ہاں ہاں" میری بیوی نے مجھے یقین دلانے
کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اور آج رات کو گنپت
راؤ دادا کے گھر پر میٹنگ ہے۔ آپ کو بھی بلایا ہے"
اور جیسے کوئی بات بجلی کے کوندے کی
طرح مجھ پر عیاں ہو گئی۔ ستی ضرور بن گئی ہے۔ میں نے

سو چا اگر گنپت راؤ دادا اس کا پروردہ ہے تو پھر اس میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔

گنپت راؤ دادا ہماری کالونی کا جیسے کوئی غیر سرکاری حاکم تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر کالونی میں ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ کاروبار تو دارو کا تھا۔ مگر لوٹ رعب اور دبدبہ اتنا کہ کسی تھانے دار کو بھی حسد محسوس ہونے لگے اور اپنی اسی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے دادا وقتاً فوقتاً ایسے تماشے کرتا ہی رہتا تھا۔ اس کے پاس اس کالونی میں ناجائز دارو کشید کرنے کا اجارہ تھا۔ مگر "دارو بندی سپتاہ" منانے میں بھی وہ پیش پیش رہتا تھا۔ کسی کے گھر کوئی شادی بیاہ ہو تو دولہا کھانا پروسنے والوں میں سب سے آگے اپنی دھوتی کھونس کر موجود رہتا تھا۔ کہیں ستیہ نارائن کی پوجا ہوتی تو دولہا سب سے لمبا تلک لگا کر ہاتھ میں لاٹھی لئے

امن عامہ کا محافظ بن کر کھڑا رہتا۔ اور پولس والے کہیں نہ کہیں پڑے اونگھتے رہتے۔ یہ سب اس کا آئے دن کا معمول تھا۔ ابھی پچھلے دنوں جب ہماری کالونی میں قومی یکجہتی کے پروگرام ہوئے تھے تو دادا نے اپنی سرگرمیوں سے سب کو قائل کر دیا تھا۔ اب اگر اس نے ہندو بہار بستی پر سب سے پہلے لیک کہہ کر اس ترغیب کو کسی دوسرے کے پاس جانے سے بچا لیا ہو تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

کھانا کھا کر میں بستر پر چپ چاپ لیٹ گیا تو میری بیوی نے پھر پوچھا۔

"کیوں جی آپ میٹنگ میں نہیں جائیں گے؟"

"نہیں" میں نے کروٹ بدلتے ہوئے، لاپرواہی سے کہا اور پھر سگریٹ سلگانے لگا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ اس کام کے لئے دادا ہی موزوں ہے لوگ کافی بھی" میں نے مسکراتے ہوئے بات کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"اور نہیں تو کسی کسی مسلمان پر ٹوٹ پڑتا شہر"

میری بیوی بولی۔ "لیکن آپ چلے جاتے تو ذرا دادا کی بات رہ جاتی۔"

مگر میں اسی کروٹ لیٹا رہا اور اپنی بیوی کی بات سنی ان سنی کر کے سگریٹ کے دھوئیں سے مرغولے بنانے میں مصروف رہا اور پھر سو گیا۔

صبح جب میں دفتر جانے کے لئے بس اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا تو گنپت راؤ دادا سے ملاقات ہو گئی اس نے احتجاج سے لبریز لہجے میں کہا۔

"کیوں بابو جی آپ رات کی میٹنگ میں نہیں آئے"

"میں دادا ذرا تھک گیا تھا۔ اس لئے سو گیا تھا"

میں نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"تو بابو جی ہم نے کونسی لاٹھی چلا دی تھی آپ سے" دادا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس ذرا آپ کے جیسے پڑھے لکھے آدمی سے صدارت کرا لیتے۔ ہماری بھی عزت رہ جاتی"

میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے دادا مگر آپ کو بیٹھے بٹھائے یہ سوجھی کیا۔؟"

"آپ کا مطلب؟" دادا نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کیا اپنے دھرم کی رکھشا کرنا بری بات ہے؟"

"نہیں۔ نہیں" میں نے کہا "مگر آپ رکھشا کریں گے کس سے۔ اس کالونی میں لے دے کے یہ جو دو چار مسلمان چھوکرے ہیں وہ تو آپ کی روٹیاں چباتے والے ہیں یہ اور کون ہے یہاں؟"

"ارے صاحب" دادا نے جیسے اس کے کردار کی تصدیق کرتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ سب تو اپنی کے غلام ہیں ان سے کیا لینا دینا۔"

"یا پھر وہ ناکے پر ہوٹل والا ایرانی ہے" میں نے ذرا اور کریدنے کی غرض سے کہا۔

"نہیں۔ نہیں بابو جی" دادا نے جیسے مجھے یقین دلانے کی غرض سے کہا۔ "اگر کچھ لفڑا ہو گیا تو میں خود اس کی دکان پر پہرہ دوں گا۔ وہ بیچارہ تو خالی نام کا مسلمان ہے۔ ورنہ وہ تو ایرانی ہے اور دیا دھرم میں بھی کسی سے پیچھے نہیں"

مجھے ہنسی آ گئی۔ دادا نے یہ سمیتی صرف اس لئے بنائی تھی کہ کہیں اس کی تحریک کسی اور کے ذہن میں نہ پیدا ہو جائے اور دادا کی لیڈری میں کوئی حصہ دار پیدا ہو جائے۔

میں نے کہا۔

"تو پھر آپ نے یہ سمیتی اس لئے بنائی ہے کہ کالونی میں کوئی نیا مسلمان آ کر نہ بس جائے۔"

"آپ بھی بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں بابو جی" دادا نے اپنی مسکراہٹ کو اور بھی عجیب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تو یہ سمیتی یوں ہی بنالی ہے۔ آخر جگ کی دنیا ہے مگر چوکنا رہنے میں کیا ہرج ہے۔"

دادا کے اس آخری جملے نے مجھے بھی چونکا دیا۔ تو آخر دادا کی اس ساری اچھی گری کا نشانہ کوئی نہ کوئی تو ہے ضرور۔ جو شاید ابھی وہ مصلحتاً چھپائے ہوئے ہے اور جس کا پتہ شاید تبھی چلے گا جب کسی نہ کسی پر واردات بیت چکی ہو گی۔ میں نے دادا کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس گفتگو سے نجات حاصل کرنے کے لئے جان بوجھ کر سر کھانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ میں بھی چپ چاپ کے عالم میں بس اسٹینڈ کی طرف چلا آیا۔

مگر یہ بات میرے ذہن سے گئی نہیں —

گنپت راؤ دادا اس سے پیشتر بھی کئی مرتبہ کالونی میں ایسی پہیلیاں بجھا چکا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ دادا نے لوگوں کو بڑی شد و مد کے ساتھ اتر کی طرف متوجہ کیا اور اس کے بعد دکھن میں کسی نہ کسی کے خون کی لکیر بہتی دکھائی دی۔ ایک مرتبہ دادا کا ایک ایسے پولیس افسر سے پالا پڑ گیا جس نے دادا کا دارو کا ہفتہ لوٹا دیا اور پورے استقلال کے ساتھ دادا کی جیلبید

مشہور کر دیا تھا۔ کالونی میں کسی دوسرے شخص کو اس افسر سے کوئی شکایت نہ تھی۔ مگر پھر جب دادا نے پہلی گولی تو سب دیکھتے ہی رہ گئے۔ دادا کی ایک داشتہ تھی ان دنوں جس کا نام تھا گنگو بائی۔ ایک روز جب وہ پولیس افسر دادا کی جھگیوں پر چھاپہ مارنے کی غرض سے اُدھر گیا تو گنگو بائی نے اچانک چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ ساری کالونی اکٹھی ہو گئی۔ رات کا تیسرا پہر تھا اور گنگو بائی کے بلاؤز کے دو تین بٹن یوں ٹوٹے ہوئے تھے جیسے کسی کشمکش کا شکار ہو گئے ہوں۔ لہٰذا کسی کے ذہن میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی اور دادا پاگلوں کی مانند ساری کالونی میں بہو بیٹیوں کی لاج اور شرم کی دُہائی دیتا ہوا گھوم رہا تھا اور ساری کالونی کی آنکھیں پھر گئیں۔ اور لوگ کالی جھنڈیاں لئے ہوئے وزراء کی کوٹھیوں کی طرف یلغار کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ اس افسر کو اس دلدل سے نکلنے کے لئے مجبوراً اپنا تبادلہ کرالینا پڑا۔ اور دادا کی جھگیوں میں سے ہمیشہ کی مانند ہی دارو بہتی رہی۔

اور جب اس حادثے کے کچھ ہی دنوں بعد دادا کی گنگو بائی سے ان بن ہو گئی۔ کیونکہ اب وہ بھی اس کے ساتھ رہتے رہتے اس کے گُر سیکھنے لگی تھی تھوڑی بہت ہوشیاری کے پر پرانے لگی تھی اور دادا کی جھگیوں میں بھاگی داری حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو دادا نے اسے بھی کوشش کی ایسی گولی کھلائی کہ وہ دنگ رہ گئی۔ دادا کے چھوکروں نے ساری کالونی میں مشہور کر دیا کہ گنگو بائی کو اب شرم و حیا سے کوئی واسطہ نہیں رہا اور یہ کہ وہ لوگ تو دادا کے نمک کا پاس رکھتے ہیں ورنہ گنگو بائی تو سب کے ساتھ تیار ہے۔ اس بات پر کالونی میں کوئی جلسہ جلوس تو نہیں ہوا مگر جب کچھ دنوں کے بعد دادا ایک شام گنگو بائی کو چٹیا پکڑ کر گھر سے باہر نکالا تو کالونی کے پرچار تو ضرور ہو چکا تھا کہ حیرت یا ہمدردی کے مارے انگلی دانتوں کے نیچے بھی نہیں گئی۔

دادا اپنے اس فن میں ماہر تھا۔ کم از کم ہماری کالونی میں تو کوئی دوسرا شخص اس کی اس مہارت کو للکارنے کا اہل نہیں تھا۔ ہر واقعہ یا حادثہ کے بعد لوگ آہستہ آہستہ اصلیت کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ مگر تب تک واقعات کی شدت اتنی سرد پڑ چکی ہوتی کہ لوگ صرف اس کی مکاری پر مسکرا کر رہ جاتے۔ اور زیادہ سے زیادہ آئندہ اس کے جھانسے میں نہ آنے کی قسمیں کھانے لگتے۔ مگر پھر کبھی نہ کبھی دادا یوں اچانک دام دام کرتے ہوئے اُن کے سامنے آجاتا کہ لوگ اُس کی بغل میں چھپی ہوئی چھُری کو قطعاً نہ دیکھ پاتے اور اُس کے ساتھ ساتھ بہنے لگتے۔

میرے سامنے ایسا کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور میں ہزار کوشش کے باوجود یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر دادا کا رُخ اب کے کس طرف ہے؟

مگر اپنی تمام تر اُلجھن کے باوجود دفتر پہنچ جانے پر کینت راؤ دادا کچھ دیر کے لئے میرے ذہن سے جاتا رہا۔ کیونکہ وہاں سبھی کی رپورٹ تقریباً یکساں تھی۔ شہر میں تقریباً سبھی محلوں میں رات بھر میں ہندو بچاؤ سمتیاں تشکیل پا گئی تھیں یا تشکیل پا رہی تھیں۔

اور میں حیرت کے مارے دم بخود سا ہو رہا تھا کہ آخر سارے شہر کے ہندوؤں کا دل کس بلائے ناگہانی کے خوف سے دہل گیا ہے یا یہ کہ شہر کے ہر محلے اور ہر بستی میں کوئی نہ کوئی کینت راؤ دادا آباد ہے۔

ہمارے دفتر میں دو چار ہستیاں ایسی بھی ہیں جو واقعی ہندوؤں کی رکھشا کی مسرت میں ہی زندہ ہیں۔ کچھ دیر تک ہماری اُن سے چھیڑ چھاڑ ہوتی رہی۔ یوں ہی چھیڑ چھاڑ اور کیا۔ مگر اُن کی آوازیں یوں تھرّا رہی تھیں جیسے اگر کبھی واقعی ہندوؤں کو بچانے کا کوئی نادر موقعہ ان کے ہاتھ آگیا تو شاید وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی بچا کر ہی دم لیں گے۔

معاً مجھے خیال آیا کہ آج حمید دفتر نہیں آیا شہر کی فضا تو ابھی تک بالکل ٹھیک تھی۔ اور سوائے سمتی گری کے اور کوئی اُبال نہیں آیا تھا۔ پھر حمید کو کیا ہو گیا۔ اس احساس نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ میں اپنی کرسی سے اُٹھ کر نند لال بابو کے قریب گیا اور آہستہ سے بولا۔

"نند لال بابو آج حمید دفتر نہیں آیا!"

"ارے ہاں!"

نند لال بابو نے بھی چاروں طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے استعجاب کے عالم میں کہا۔ "ہم لوگ واقعی اس ساری ہماہمی میں اسے بھول ہی گئے تھے۔ اسے کیا ہوگا ممکن ہے اس کی طبیعت ہی خراب ہو گئی ہو!" مگر صبح سے یہ بچاؤ بچاؤ کی باتیں سُنتے سُنتے ہماری سمجھ بوجھ کے حاشیے کچھ ایسے بن گئے تھے کہ ان کی حدود میں صرف خطرے کی قیاس آرائیاں ہی ممکن تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات سارے دفتر میں پھیل گئی۔ اور ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ فوراً کسی کو حمید کے گھر بھیج کر اُس کی خیر و عافیت دریافت کی جائے۔ اور اگر صورتِ حال واقعی توجہ طلب ہو تو اُس کے خاندان کو کسی اور کے ہاں منتقل کر دیا جائے۔

مگر اسی اثنا میں حمید نظر آگیا۔ وہ بڑے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے دفتر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر قطعی کوئی پریشانی نہ تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ گنگنا رہا تھا۔ اور ہماری تمام تر توجہ سے بے پرواہ اپنی میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آخر ہم سب اُس کے قریب گئے اور اُس کے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ شاید ہماری پریشانی کی وجہ سمجھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگوں کی فکرمندی کا شکریہ مگر میں آپ لوگوں کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ ہماری کالونی نے آج صبح ایک قومی یکجہتی سمتی کی بنیاد ڈالی ہے!"

حمید ہماری کالونی کے پاس والی ہاؤسنگ بورڈ کالونی میں رہتا تھا۔ اس لئے میرا اشتیاق بڑھا اور میں نے کہا۔

"قومی یکجہتی سمتی! مبارک ہو بھئی۔ مگر کل

کی سنگین رات میں وہ کونسا نیک شخص تھا جس کے دماغ میں یہ دردِ انسانی کی اُپج پیدا ہوئی ؟

"ارے یار تم تو جانتے ہی ہو گے" حمید نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "وہ تمہاری کالونی میں گنپت راؤ دادا کی آشنا نہیں تھی۔ گنگو بائی ؟"

"ہاں، ہاں"

میں نے جیسے ہکلائی ہوئی زبان میں کہا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ایک آدھ لمحہ میں گنپت راؤ دادا کی تازہ ترین پہلی مجھ پر عیاں ہونے والی ہے اور اس کے عیاں ہوتے ہی حیرت کے مارے میرے خون کی گردش رُک جائے گی۔

حمید نے کھنکار کر گلا صاف کیا یا شاید بہت بڑا انکشاف کرنے سے پیشتر اپنے اوسان دُرست کئے اور پھر بولا۔

"تو وہ گنگو بائی آج کل ہماری کالونی میں دھندا کر رہی ہے۔"

"کا ہے کا دھندا ؟"

میں نے جیسے ڈوبتی ہوئی سی نحیف آواز میں پوچھا۔

"دارُو کا۔ اور کا ہے کا" حمید نے جواب دیا۔ "مگر بیچاری ہے بڑی دردمند عورت۔ صبح جب اُس نے تمہارے دادا کی کارستانی کی خبر سنی تو فوراً کالونی کو اکٹھا کر کے قومی یکجہتی کمیٹی بنا دی۔ اور سب لوگوں سے اپیل کی کہ کم از کم وہ اپنی کالونی میں مکمل امن و امان قائم رکھیں۔"

اور میرے پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ گنپت راؤ دادا کی دارُو آس پاس کی تمام کالونیوں میں سپلائی ہوتی تھی ــــ اور مجھے یوں لگا جیسے فساد ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

٭٭

زمانہ جو بیت گیا!

انور احمد سوپاروی

پُرانے زمانے کی باتیں اگر باطل نہیں تو افسانہ ضرور لگتی ہیں۔ تاہم نہ تو انہیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ قابلِ فراموش ہیں۔ ماضی ایک ساگر ہے جس میں بھُولی بسری باتیں لہروں کے رُوپ میں مچلتی نظر آتی ہیں۔ اس کی ہر موج اپنے اندر ایک کہانی چھپائے ہوئے ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ آپ کی جیب میں پڑا ہوا ایک نیا پیسہ آج سے چند صدیوں قبل بڑی قدر و قیمت کا حامل تھا۔ اُس کی قوتِ خرید سے آپ کم از کم آٹھ سیر چاول یا پانچ سیر گیہوں، دو سیر گھی یا چار سیر شکر خرید سکتے تھے۔ تو آپ دنگ رہ جائیں گے۔ بات بھی بڑے اچنبھے کی ہے۔ آج کی گرانی میں تو ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ یقین نہ آئے تو ایک نئے پیسے کو لے کر بازار میں جائیے اور اطمینان کر لیجیے۔

آج ہم اسی نوعیت سے اپنے آباو اجداد کے زمانے کی جھلکیوں پر ایک اجمالی نظر دوڑائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ بعض باتیں جن کا تذکرہ آگے آیا ہے آپ کو محض خیالی معلوم ہوں گی اور آپ انہیں مشکل ہی سے باور کریں گے۔ تاہم اس سے ایک اندازہ ضرور ہو گا کہ ہم میں اور پچھلی نسلوں میں کتنی وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے جس کا پاٹنا اب ہمارے بس کی بات نہیں رہی۔

ہماری بات کوتلیہ (۳۰۰ قبل مسیح) سے شروع ہوتی ہے۔ ارتھ شاستر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں تمام ضروری اشیاء کے نرخوں پر حکومت کی نظر رہا کرتی تھی۔ کوئی چیز سرکار کی مقررہ قیمت یا نرخ سے زیادہ فروخت کرنا جرم کے برابر تھا۔ بعض اوقات تو مجرم سوداگروں کو فوراً سزا دی جاتی تھی اور انہیں اسی جگہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ کوتلیہ نے اپنے زمانے کی چند چیزوں کے نرخ لکھے ہیں وہ ذیل میں درج ہے۔

چاول، گھی اور گیہوں	فی من	۲۵ نئے پیسے
شکر	فی من	۳۷ نئے پیسے
نمک	فی من	۲ نئے پیسے

خیال رہے اُس زمانے کا من جدید من سے کئی گنا بڑا تھا اور مزیدار بات تو یہ تھی کہ دُودھ کا بیچنا قانوناً جرم سمجھا جاتا تھا۔ وہ مفت دیا جاتا تھا۔

چندر گپت دوم کے زمانے میں فاہیان نے چین سے چل کر ہندوستان کی سیاحت کی اور یہاں کے متفرق حالات قلمبند کئے۔ اُس کی ان تصریحات سے اَن گنت امور پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے

"یہاں سکّوں کا رواج عام نہیں ہے، لین دین میں کوڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔"

ہمارا محاورہ "کوڑیوں کے دام بکنا" غالباً اسی زمانے کی طرف نشان دہی کرتا ہے۔ ایک آدمی کو اس زمانے میں نہایت آرام و چین سے شاندار زندگی بسر کرنے کے لئے سالانہ تین روپے درکار تھے یعنی یومیہ ۷ نئے پیسے۔ جبکہ آج تیس روپے دو چار دن کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ دوسرے مشہور سیاح ہیونن سانگ اور البیرونی کے بیانات بھی ایسی ہی ارزانی کی کہانی سُناتے ہیں۔ جن کو پڑھنے کے بعد خواہ مخواہ ایک خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم اس زمانے میں پیدا ہوتے تو آج کی یہ تنگ حالی اور پریشانی سے دوچار نہ ہوتے۔

بہرکیف ان گنت تاریخی حوالات و تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں ہمیشہ سرکار کی نگرانی میں رہا کرتی تھیں۔ بادشاہوں کو اپنی رعایا کی خوش حالی اور سکھ چین کا خیال رہا کرتا تھا۔ اس کے بعد (۱۷۰۰) سترہ سو سالوں تک یعنی بارہویں صدی عیسوی تک نرخوں میں کوئی اضافہ نہیں ہُوا۔ البتہ علاؤالدین خلجی کے زمانے میں قیمتوں میں خفیف سا اضافہ ہُوا تھا۔ تاہم فوراً ان پر قابو پا لیا گیا۔ خلجی (۱۲۹۰ء تا ۱۳۲۰ء) اور تغلق خاندان (۱۳۲۰ء تا ۱۴۱۳ء) کے دَورِ حکمرانی میں چند اشیاء کے نرخوں کا حال حسبِ ذیل تھا۔

اشیاء	مقدار	خلجی	تغلق
جَو	فی من	۴ جاتل	۸ جاتل
گیہوں	فی من	۷½ جاتل	۱۲ جاتل
چاول	فی من	۵ جاتل	۱۵ جاتل
گھی	فی من	۲۰ جاتل	ایک روپیہ
شکر	فی من	۷ جاتل	ایک روپیہ
چنے	فی من	۵ جاتل	۴ جاتل

واضح رہے اُس زمانے کا ایک من ۱۲½ سیر پر مشتمل تھا اور ایک جاتل ایک پیسے کے برابر تھا۔ علاؤالدین خلجی کھانے پینے کی چیزوں کی قیمتوں کی بابت بہت سخت گیری سے کام لیا کرتا تھا اُس نے اپنے تمام سرکاری افسروں کو اس ضمن میں خصوصی ہدایتیں دے رکھی تھیں کہ کوئی سوداگر عوام سے مقررہ نرخوں سے زائد نہ لینے پائے۔ حتّٰی کہ معمولی چیزوں کے نرخ بھی مقرر تھے۔ ابن بطوطہ اور شہاب الدین نے اپنے سفری تاثرات و تصریحات

ی وساطت سے ہم تک اہم معلومات پہنچائی ہیں۔ محمد شاہ تغلق نے اس میدان میں کچھ غفلت برتی تھی۔ پھر بھی اس کے زمانے میں ایک عدد بیل کی قیمت صرف دو روپے تھی اور پندرہ گز سوتی کپڑا ایک روپے میں ملتا تھا۔

مغل دَور بھی ارزانی مشہور تھا۔ ہمایوں نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایک روپے میں چار بکریاں بکتی تھیں۔ صوبہ بنگال، ارزانی کے اعتبار سے پورے ملک میں مشہور تھا۔ یہ دَور تاریخ ہند میں کئی اعتبار سے ہندوستان کا سنہری دَور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ایک من ۴۰ سیر پر مشتمل تھا۔ اس دَور کی ارزانی کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

گیہوں	فی من	۱۲ دام	مساوی ۳۰ نئے پیسے
جَو	فی من	۸ دام	مساوی ۲۰ نئے پیسے
چاول (عمدہ قسم)	فی من	۱۱۰ دام	مساوی ۵۰۔۲ روپیہ
چنا	فی من	۸ دام	مساوی ۲۰ نئے پیسے
شکر	فی من	۵۶ دام	مساوی ۴۶۔۱ روپیہ
نمک	فی من	۱۶ دام	مساوی ۳۸ نئے پیسے

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک کم و بیش یہی نرخ تھے۔

خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ (تاریخ ہند حصہ دوم ص۔ ۳۹۳-۹۴) میں مغلوں کی آمد سے قبل کے دَور (خصوصاً ابراہیم خاں لودھی) کی ارزانی اور پیداوار کی افراط کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"سلطان ابراہیم کے عہدِ سلطنت کے واقعات عجیبہ میں سے ایک یہ ہے کہ اناج، کپڑا اور ہر قسم کی تجارت کی اشیاء ارزاں تھیں کہ پہلے کسی بادشاہ کے زمانے میں نہیں ہوئی۔ شاید سلطان علاؤالدین خلجی کے عہد میں یہ ارزانی ہوئی ہو مگر اس ارزانی میں سلطنت کی سلامت مظالم اور صد طرح کے دباؤ اور سختیاں تھیں مگر اس سلطنت میں ارزانی پیداوار کی افراط کے سبب سے تھی۔ سلطان سکندر کے عہد میں بھی ارزانی تھی۔ مگر وہ سلطان ابراہیم کے زمانے کی ارزانی کے برابر نہ تھی۔ ایک بہلول کا دس من اناج آتا تھا۔ پانچ سیر گھی کی اور دس گز کپڑے کی بھی یہی قیمت تھی۔ ہر چیز کی ارزانی کا یہی حال تھا۔ ایک معزز آدمی جس کے اہل و عیال بھی ساتھ ہوں، پانچ تنکہ ماہوار کی آمدنی میں اپنی اوقات اچھی طرح بسر کر سکتا تھا۔ ایک سوار کی تنخواہ بیس[2] سے تیس[3] تنکہ تک تھی۔ اگر کوئی مسافر دلی سے آگرہ تک جانا چاہتا تو ایک بہلول اس کو اور اس کے گھوڑے اور سائیس کو کافی تھا۔"

اورنگ زیب کے بعد ۱۷۲۱ء میں چند ضروری اشیاء کے دام مندرجۂ ذیل تھے۔

سوا من چاول	ایک روپیہ میں
کھانے کا تیل ۲۰ سیر	ایک روپیہ میں
گھی ۱۰½ سیر	ایک روپیہ میں

اٹھارویں صدی میں غیر ملکی عناصر ہندوستان سے چمٹ رہے تھے، ہندوستان نئی تہذیب و تمدن سے ہمکنار ہو رہا تھا۔ جس میں تصنع، خود نمائی اور اخلاقی اقدار کی فراموشی۔ تجارت، لوٹ، کھسوٹ، ذخیرہ اندوزی بے ایمانی اور مطلب پرستی کے قالب میں منتقل ہو رہی تھی کھانے پینے کی چیزیں کمیاب ہونے لگیں، بھاؤ بڑھنے لگے ساتھ ہی ساتھ عوام کی پریشانیوں میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ نئے نظام کے خدوخال ابھی ابھرنے ہی لگے تھے کہ ملک قحط کے پنجے میں جکڑنے لگا۔ بنگال ایک صدی اندر ہی دو مرتبہ قحط سے دوچار ہوا۔ پہلا قحط ۱۷۷۰ء میں اور دوسرا ۱۸۶۴ء میں پڑا۔ دکن اور راجپوتانہ ۱۸۰۲ء قحط سے دوچار ہوئے اور یوپی، ۱۸۶۸ء۔ ۱۸۶۴ء کے قحط بنگال کے لئے گجرات سے غلہ بھیجا گیا۔ اس وقت گجرات میں باجری ایک روپیے میں ۲۷ سیر بکتی تھی۔ جبکہ اس کی فوراً ہی بعد ایک روپیہ میں صرف نو سیر بکنے لگی۔ اسی طرح یوپی کے لئے خاندیس سے باجری روانہ کی گئی۔ چنانچہ قحط زدہ علاقہ میں غلہ بھیجنے کے قبل اور بعد کے نرخ ملاحظہ ہوں۔

قبل قحط	یوپی	۶۱ سیر فی روپیہ
بعد قحط	یوپی	۱۲½ سیر فی روپیہ

سلطنت اودھ اور لکھنؤ کے شاہ غازی الدین حیدر (متوفی ۱۸۳۷ء) کے زمانے کے نرخ حسب ذیل تھے۔

گیہوں کا آٹا	ایک روپیہ کا	۲۲ سیر
چاول	ایک روپیہ کا	۲۰ سیر
چنا	ایک روپیہ کا	۲۰ سیر
گھی	ایک روپیہ کا	۲ سیر
گھی معمولی	ایک روپیہ کا	۲¾ سیر

انگریز جب ہندوستان پر پوری طرح مسلط ہو گئے تو انہوں غالباً اقتصادیات کے اس ضروری اور نہایت اہم پہلو کی طرف بہت ہی کم توجہ دی۔ اُن کے زمانے سے ہی چیزوں کے بھاؤ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آزادی کے بعد بھی یہی رفتار رہی مندرجۂ ذیل تختہ سے اس کی تصدیق ہوگی۔

سنہ	فی من	دودھ	گھی
۱۸۹۱	"	۳-۸-۰۰	—
۱۹۰۱	"	۴-۴-۰۰	—
۱۹۱۱	"	۵-۴-۰۰	۱۷٪
۱۹۳۹	"	۵-۸-۰۰	۵٪
۱۹۵۳	"	۲۲-۰۰-۰۰	۲۰٪
۱۹۵۸	"	۳۰-۰۰-۰۰	۲۱٪
۶۰-۶۲	"	۳۵٪ تا ۴۰٪	۲۶٪

منیجر: تو تم سمجھتے ہو کہ تم سخت محنت اور مشقت کر سکتے ہو۔

اُمیدوار: جی میں کیا سمجھوں گا۔ ہندوستان کے بہترین ججوں کا بھی یہی خیال ہے۔

خطوط

فضل اللہ فاروقی ——— کراچی

کھلونا حیات کے دو نمبر موصول ہوئے۔ پہلا پرچہ ملا اور پڑھا لیکن حیرت و تعجب ضرور رہا کہ اس گمنام و گوشہ نشین کو کس نے یاد کیا۔ پھر بمبئی کی ۱۲ سالہ زندگی یاد آئی اور نام تلاش کئے.....

...... دسنوی صاحب جب تشریف لائے تھے تو اُنہوں نے اس پرچہ کی زیارت کرائی تھی۔ چھوٹا سا پرچہ لیکن مضامین کے لحاظ سے جب بھی قابلِ توجہ تھا اور اب بھی قابلِ کشش ہے۔ پہلے پرچہ میں مکتوب سلیمانی پر ایک مضمون دیکھ کر اور صاحبِ کتاب کی شخصیت اور تقدس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وعدہ شکنی پر افسوس ہوا۔ یہ حرمت الاکرام کی غزل بہت دنوں بعد دیکھنے میں آئی۔ یہاں تو ایسی غزلیں کمیاب ہی ہیں۔ اُف کتنا جمود ہے ہمارے موجودہ ادب میں۔

زبیدہ خاتون انصاری ——— بمبئی

۱۰ اور ۲۰ مارچ کا ملا جلا شمارہ واقعی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس شمارے میں دو ایک مضامین کے سوا سبھی "کھلونا حیات" کے وزن و وقار سے تطبیق رکھتے ہیں۔ خاص طور پر "مطالعہ کی اہمیت"، "قومی یکجہتی"، "ناظرِ اشعار"، "ایک قیمتی سوانح حیات" مد" خواجہ حسن نظامی" لیکن یہ "فانی اور اُن کی یاسیت" والا مضمون کس آقریب میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ اقربا پروری تو نہیں؟ پتہ نہیں صاحبِ مضمون نے بیچارے فانی کی یاسیت کو کس نکتہ سے سمجھانا چاہا ہے۔ اکثر پیراگراف تو کہیں پڑھے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو کہتے ہیں پیراگراف کی ترتیب بھی ایک فن ہے۔ معلوم ہوتا ہے صدیقی صاحب اس معمولی فن سے بھی نابلد ہیں۔ بھئی ایسی چیزوں سے کھلونا حیات کی نیک نامی کو بٹہ نہ لگائیے۔

عبد الوحید خاں ——— حیدرآباد

"بھول بھلیاں" کے عنوان کے تحت جمی کی پریشانیوں سے مجھے ہمدردی ہے دراصل میں بھی ہائی اسکول سے ریاضی سے جی چراتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے ہوٹل کے مسافروں کو تفکر سے کام لینا چاہیئے تھا کُل ادا شدہ رقم تیس روپیوں میں سے انہیں تین روپے واپس ملے ہیں گویا اُنہوں نے علٰحدہ علٰحدہ ۹ روپے ادا کئے گویا باقی تیس روپیوں کی تقسیم تین نفوس میں برابر ہونی چاہئے تھی مگر ایک تو بیچارے مسافر میری طرح ریاضی سے جی چراتے ہوں گے اُنہوں نے تکلیف گوارا نہ کی اور ملازم ہوٹل نے وضاحت بھی نہ کی۔ ممکن ہے جمی مجھ سے متفق ہوں گے۔ اگر جمی کی پریشانیاں ابھی بدستور ہوں تو امید کہ ایڈیٹر صاحب ان اُلجھنوں کو سلجھا دیں گے۔

★ آپ نے "بھول بھلیاں" کو اور پُر پیچ بنا دیا ہے۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔

قیصر

پرانی خبریں

کشف الاخبار. بمبئی
۲۵ اپریل ۱۸۷۸ء

چمنی کی حفاظت

اکثر لیمپ کی چمنی روشنی کی گرمی سے پھوٹ جاتی ہے اُس کے حفاظت کی عمدہ ترکیب یہ ہے کہ کسی برتن میں سرد پانی بھر کر اس میں چمنی کو ڈال دے پھر اُسے آگ پر رکھ دے جب پانی خوب کھولنے لگے تو آگ پر سے اوتار کر خوب سرد ہونے دے جب پانی مثل سابق سرد ہو جاوے اوس وقت کام میں لاوے

○

کشف الاخبار. بمبئی
۲۸۔ نومبر ۱۸۷۸ء

تاریخ آغاز مدرسہ اسلامی اردو، فارسی، عربی در شہر سورت

من متائج طبع وقاد و ذہن نقاد جناب فضیلت مآب کمالات انتساب مستجمع اوصاف لاتعداد جناب مولوی ممتاز احمد صاحب تہانوی مقیم سورت رفیق جناب نواب میر ذوالفقار علیخاں صاحب بہادر رئیس اعظم سورت۔ ادام اللہ برکاتہم۔

چونکہ قائم نمود در سورت
فضل حق مدرسہ پئے تادیب
از سر انبساط تاریخش
گفت ممتاز بقعۂ تہذیب
۱۲۹۵

○

زعفران زار

"میری لڑکی صرف پیانو بجاتا ہی نہیں بلکہ ہر کام بہترین طریقہ سے کر سکتی ہے"۔

"تو اُس سے کہئے کہ پیانو کو بند کر دے اور اُس کی چابی دریا میں پھینک دے"۔

○

دو آئرش باشندے تیسرے کی بیماری کے گفتگو کرنے لگے۔

"بیچارہ پیٹر مجھے ڈر ہے کہ وہ مر نہ جائے"

"کیوں بھئی ایسی کیا بات ہے"

"وہ بے انتہا لاغر اور دُبلا ہو گیا ہے تم بھی بہت دُبلے ہو اور میں بھی دُبلا ہوں۔ لیکن ہم دونوں دُبلوں کو اگر ایک کر دیا جائے تو پیٹر ہم سے بھی دُبلا ہے"

○

"بیٹے تمہارا چہرہ تو بہت صاف ستھرا ہے لیکن تمہارے ہاتھ اس قدر گندے کیوں ہیں؟"

"چہرہ دھونے کی وجہ سے"

○

"ہیرا اب تک کی دریافت شدہ چیزوں میں سب سے زیادہ سخت چیز ہے۔ اتنا سخت کہ یہ شیشے کو بھی کاٹ دیتا ہے"

"آپ شیشے کی بات کر رہے ہیں۔ ہیرا تو عورت کے دل پر بھی نقش بٹھا دیتا ہے"

○

اب کی بار!

پاکستان میں آج کل جس قسم کی شاعری کی وبا چل نکلی ہے۔ وہ صرف پاکستانی کے رسائل ہی کے لئے شرمناک نہیں ہے بلکہ اُردو زبان و ادب کے لئے بھی ایک عظیم خطرہ اور اُس کے دامن پر بیٹا داغ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان "ٹیڈی شاعروں" کو برہنہ جنسی موضوعات کے سوا اور کوئی موضوع ہی نہیں سوجھتا۔ اپنی تو یہ حالت ہے کہ ان شاعروں کی چیزیں پڑھ کر گردن شرم کے مارے جُھک جاتی ہے۔ کیسے جگر دار اور ہمت والے ہیں پاکستانی رسائل کے وہ ایڈیٹر جو اس قسم کی چیزیں صرف چھاپتے ہی نہیں بلکہ انہیں نئی شاعری بتاتے ہیں۔ آفریں ہے حکومت پاکستان پر جو اس قسم کی چیزوں کی اشاعت پر خاموش ہے۔ کہیں ڈسے ہی یہاں تو حکومت نے رسائل کو چھوٹ دے رکھی ہے۔

یہ وبا پاکستان سے چل کر ہندستان بھی پہنچ گئی ہے اور یہاں بھی "ٹیڈی شاعروں" کی ایک ٹولی پیدا ہو رہی ہے جو اسفل ترین جنسی موضوعات کو اپنی شہرت اور ذہنی رزق کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں لیکن شکر ہے کہ ہندوستانی رسالوں کے ایڈیٹروں کی آنکھ کا پانی ابھی نہیں مرا اور ہندوستانی ٹیڈی شاعر اپنی جنسی پیاس پاکستانی رسائل میں چھپ کر بجھا رہے ہیں۔

ہر سنجیدہ اخبار کا آج فرض ہے کہ وہ اس قسم کے شاعروں اور رسالوں کی سخت مذمت کرے اور زبان و ادب کے ناموس کی حفاظت کرے۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے !

انسان کی زندگی میں کتنے ہی زخم لگتے ہیں لیکن وقت کا مرہم انہیں مندمل کرتا چلا جاتا ہے لیکن کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جو مندمل ہونے کے باوجود داغ کی صورت میں نمایاں رہتے ہیں۔ پنڈت نہرو کا زخم بھی وقت کے مسیحا کے ہاتھوں مندمل تو ہو ہی جائے گا لیکن یہ زخم داغ بن کر سدا لَو دیتا رہے گا۔

دنیا میں بہت کم انسان ایسے گزرے ہیں جن کی موت کا اجتماعی غم انفرادی غم بھی بن گیا ہے۔ پنڈت نہرو کی موت نے ہندوستان کے ہر گھر کو غم کدہ بنا دیا۔ ہندوستان پر ہی کیا منحصر ہے دنیا کا وہ کونسا ملک ہے جہاں اس عظیم شخصیت کی موت پر آنسو نہ ٹپکے ہوں۔ جہاں دل خون ہو کر نہ بہ نکلا ہو۔

اگر صرف وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہی کا انتقال ہوتا تو یہ اس قدر اندوہناک سانحہ نہ ہوتا لیکن ان کے ساتھ تو ایک عہد ایک تاریخ، ایک کلچر۔ ایک مورخ، ایک ادیب۔ ایک سیاست دان۔ ایک امن کا پیامی۔ ایک بیدار ذہن۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کرنے والا ایک مجاہد اور ایک عظیم ترین انسان مر گیا۔ شمع کی طرح پگھل جانے والا دل گداختہ اور وقت آنے پر اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا ایک پہاڑ مر گیا۔

پنڈت نہرو ہر زمانے کے ہندوستان کے ایک سربرآوردہ اور عظیم لیڈر تھے۔ اُن کا سیاسی قد تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے تمام ہندوستانی لیڈروں سے بڑا تھا۔ ان کا مقابلہ اگر کسی سے کیا جا سکتا ہے تو صرف گاندھی جی سے۔ ہندوستان میں صدیاں گذر جائیں گی لیکن ایسی پہلو دار عظیم شخصیت اب شاید ہی پیدا ہو۔

پنڈت نہرو کی موت کے غم کی بھرپور ترجمانی دنیا کی کوئی بھی زبان نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ہمارے جسموں پر نہیں دلوں پر حکومت کی ہے۔ ان کی حیثیت ایک مشفق باپ کی سی تھی جو اپنی اولاد کو ڈانٹتا بھی ہے۔ مارتا بھی ہے اور پچکارتا بھی ہے اور ان کی تکلیف پر آنسو بھی بہاتا ہے۔ اب ہندوستان کو ایسا شفیق باپ کا ہے کو نصیب ہو گا۔ کون ہے جو اُن کی سی لاڈ لائے گا۔

پنڈت نہرو ہندوستان کے ایک سنہرے دَور کی بڑی ہی جامع تاریخ تھے اس تاریخ میں درد و کرب۔ مصیبتیں، جدوجہد، آزمائشیں، قربانیاں، غم و اندوہ، خوشی و سرشاری سبھی کچھ تھا۔ وہ اس تاریخ کے خود ہی مورخ بھی تھے۔ اُنہوں نے اسے اپنے خون سے رقم کیا تھا۔

پنڈت نہرو ہندوستان کے وزیر اعظم ہی نہیں تھے۔ وہ اس کی زندگی تھے۔ رُوح رواں تھے۔ وہ ہنستے تھے تو پورا ہندوستان ہنستا تھا وہ روتے تھے تو پورا ہندوستان روتا تھا۔ اُنہوں نے ہندوستان کے ذرّے ذرّے پر اپنی شخصیت کا ایسا گہرا نقش چھوڑا ہے کہ اُن کے بغیر ہندوستان کا تصوّر بھی ایک طلسم معلوم ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت کے اطراف ایک ایسا گلیمر ایک ایسی چمک تھی جو اُن ہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ وزارتِ عظمیٰ میں اب وہ خوبصورتی اور وہ کشش نہیں رہی۔ چاند کے گرد جو ہالہ رہتا ہے وہ ختم ہو چکا ہے۔

اس جامع صفات شخصیت کی کس کس ادا کو یاد کر کے رو یا جائے ۔ وہ کمزوروں اور مظلوموں کا زبردست حامی اور بڑا پکّا دوست تھا اُس نے کامن ویلتھ کا ممبر ہونے کے باوجود سویز کے معاملے میں برطانیہ کے مصر پر حملے کی شدید مذمت کی ۔ یہ جرأت لوہے پاک کس میں ملے گی؟ یہی نہیں اُس نے اس موقع پر برطانیہ ، فرانس اور فلسطین کے خلاف مصر کی ہتھیاروں سے مدد بھی کی ۔ جنوبی کوریا کی جنگ میں امریکہ کو جنگی سرگرمیاں بند کرنے پر مجبور کیا ۔ انڈو چائنا میں قیامِ امن کے لئے اپنی پوری توانائیاں صرف کیں ۔ کمیونسٹ ممالک کو Non-Aggressive پالیسی قائم کرنے پر مجبور کیا ۔ افریقہ اور ایشیا کے ملکوں کو ایک مرکز پر لاکر کھڑا کیا ۔ لاؤس میں اپنی نگرانی میں امن کمیشن قائم کیا ۔ دنیا کو "پنچ شیل" کے اصول دئے جنہیں چین ہندوستان پر حملے کے باوجود اب تک Denounce نہیں کرسکا ۔ کیوبا میں امریکی مداخلت کی مذمت کی ۔ روس اور امریکہ کو ایک میز پر لاکر بٹھادیا اور انسانیت کے سر سے جنگ کا خطرہ ہٹادیا ۔ چین کے حملے کے باوجود اقوام متحدہ میں اُس کی شمولیت کی کوشش کرتا رہا ۔ اتنا بڑا دل رکھنے والا ہندوستان میں اب کب پیدا ہوگا ۔ صرف ہم ہندوستانی ہی نہیں پوری دنیا اُس کے احسانات کے بوجھ تلے جھکی ہوئی ہے ۔

ہندوستان میں اُس نے ہر مذہب اور ہر فرقے کے لوگوں سے ٹوٹ کر محبت کی ۔ ۱۹۴۷ء کے خوفناک فسادات کے دوران اُس نے اپنی سلامتی کی پروا نہ کرتے ہوئے فسادیوں کے مشتعل ہجوم میں گھس کر غریب مسلمانوں کی جانیں بچائیں ۔ انہیں اپنے گھر میں پناہ دی ۔ مسلمان پناہ گزینوں کی خبرگیری کے لئے رات میں کئی کئی بار ہمایوں کے مقبرے کے چکّر لگائے ۔ فرقہ پرستوں نے اس پر ہنگامہ بھی کیا اور اُس پر مسلم نوازی کا بہتان بھی لگایا لیکن اُس نے ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کی ۔ وہ قومی یکجہتی کا بڑا پرستار اور ہندو مسلم اتحاد کا زبردست علمبردار تھا ۔ لاکھوں اعتراضات کے باوجود اُس نے قومی ہم آہنگی کے جذبات کو فروغ دینے کے لئے ایک معمولی مسلم عہدیدار کی ایک غیر مسلم لڑکی سے شادی کی تقریب میں شرکت کی ۔ اُس کے گھر صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ وہ سب کے دُکھ درد سنتا انہیں دلاسہ دیتا ۔ اُن کی ضرورتیں پوری کرتا ۔ بیمار شاعروں اور ادیبوں کو علاج کے لئے اپنی جیب سے پیسے دیتا ۔ اپنی روزمرہ کی مصروف ترین زندگی سے جس میں خود کے آرام کے لئے بھی بمشکل ایک آدھ گھنٹہ نکل سکتا تھا اردو شاعروں کا کلام سننے کے لئے ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے نکالنا ۔ اچھے اشعار پر سر دھننا اور اُنہیں دیر تک گنگنانا ۔ ادیبوں اور شاعروں کو چائے اور کھانے پر بلانا اور پھر وقت کی پروا کئے بغیر اُن کے ساتھ کھو جانا ۔ اپنے اصولوں اور قانونی موشگافیوں سے آنکھ چُرا کر اپنے دیرینہ رفیقوں ۔ شاعروں اور ادیبوں کو نوازنا ۔ اُن کی پُشت پناہی کرنا ۔ آڑے وقت اُن کے کام آنا ۔ اور ہندوستان میں اُنہیں پناہ دینا ۔ معمولی معمولی اور بڑے وفود کا استقبال کرنا ۔ اُن کے مطالبات سُننا ۔ بات چیت کرنا ۔ خفا ہونا ۔ جھلّانا ۔ چیخنا ۔ چلّانا ۔ سمجھانا ۔ منانا ۔ پیار و محبت کی باتیں کرنا اور پھر سر پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں رخصت کرنا ۔ اُردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لئے کوشش کرنا اور حق غصب کرنے والوں کی شیطنت پر جھلّانا ـــ ہم اِن باتوں کو کونسا چراغ لے کر ڈھونڈیں ۔

وہ غیر مذہبی حکومت کا کٹّر پرستار اور جمہوری اصولوں کی بقا کے لئے اپنی جان تک کی بازی لگا دینے والا سپاہی تھا ۔ وہ سوشلزم پر بڑا غیر متزلزل یقین رکھتا تھا ۔ اور یہی تین چیزیں اس کی زندگی کا نصب العین تھیں ۔ اُنہیں استحکام بخشنے کے لئے وہ متواتر ۱۷ سال تک رات دن اُٹھتے بیٹھتے ۔ سوتے جاگتے ۔ چلتے پھرتے اور اپنی صحت کی پروا کئے بغیر کام کرتا رہا ۔ اُنہیں کی خاطر وہ اپنا مریض جسم لے کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آخری بار کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے بمبئی آیا ۔ انہیں کی خاطر اُس نے بھوبنیشور کے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی جہاں اُس پر پہلی بار اِس جان لیوا بیماری کا حملہ ہوا ۔

وہ اپنے وطن کو جنّت اور اپنے ہم وطنوں کو خوشحال بنانے کے لئے آخری دم تک کام کرتا رہا ۔ اُس نے نئے ہندوستان کا جو خاکہ

بنایا تھا اُس میں رنگ نہیں بھر سکا۔ اُس نے ہر کام کی ابتدا کی اور بڑی لگن، خوبصورتی اور جانفشانی سے کی لیکن وہ اُن کی تکمیل دیکھے بغیر ہی رخصت ہو گیا۔ وہ نئے ہندوستان کے کاروان کو منزل تک نہیں لے جا سکا لیکن اسے ایسی راہ پر ڈال گیا جو سیدھی منزل تک جاتی ہے ۔ یہ راہ سوشلزم کی راہ ہے اور اُس کی منزل ہے ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت ۔ ملک کو اس راہ پر ڈالنے کے لئے مرنے والے کو ۱۷ سال لگے ہیں۔ اس راہ میں قدم قدم پر اُس کے پسینے کی بوندیں۔ اُس کے خون کے قطرے اور اُس کے نقشِ قدم ملتے ہیں۔ یہ راہ اُسے کتنی عزیز تھی اور یہ منزل کتنی خوابناک ۔

پنڈت نہرو اپنی شہرت کی انتہائی بلندی اور اپنی عظمت کی انتہائی معراج پر پہنچ کر مرے ہیں ۔ اُن کی زندگی جس قدر خوبصورت اور عظیم تھی اُسی قدر اُن کی موت بھی عظیم الشان اور حسین تھی۔ عوام نے اپنی محبت کے خزانے اُن پر بے دریغ نچھاور کئے ہیں۔ اُن کی زندگی میں بھی اور اُن کے مرنے کے بعد بھی اور جب تک ہندوستان زندہ ہے اُن کی محبت میں کمی نہیں آئے گی۔

پنڈت نہرو بڑی صاف ستھری شخصیت تھے ۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ وہ ایک عظیم سیاست داں ہوتے ہوئے بھی بڑی پاکیزہ سیرت کے مالک تھے ۔ دوستوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انہوں نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بھی کبھی بُرے خیالات کو اپنے دل میں نہیں پالا۔ اُن کے دل میں جو بھی ہوتا تو صاف اور دو ٹوک طور پر کہہ دیتے ۔ پچھلے چند سالوں سے تو وہ سخت قسم کی تنقیدوں اور گالیوں کو بھی پی جانے کے عادی ہو گئے تھے ۔ اُن کا سیاسی دماغ سستی سیاست کی تمام گندگیوں کو برداشت کرنے کا خوگر ہو گیا تھا۔ یہ کتنے بڑے ظرف کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو ایک زمانے میں کسی کی ایک ہلکی سی شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا، اب دشنام طرازیوں پر بھی چیں بہ جبیں نہیں ہوتا تھا۔ پچھلے دنوں انہیں وزارتِ عظمیٰ سے ہٹانے کی مذموم کوشش بھی چند سیاسی پارٹیوں نے شروع کی تھی۔ اُن پر بہتان تراشے تھے ۔ من مانے الزامات لگائے تھے لیکن وہ عظیم شخصیت ان باتوں کو بھی پی گئی۔ یہ کتنی شرمناک کوشش تھی اور وہ کتنا بڑا ظرف تھا!

اُن کے ظرف کی عظمت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کی لاٹھیاں کھانے اور ۹ سال تک اُن کے قید خانوں کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد بھی اس عظیم انسان کا دل انگریزوں سے بدظن نہیں ہوا۔ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اُس نے کامن ویلتھ میں رہنا منظور کیا اور اُن سے اس طرح کے تعلقات رکھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ایسا فراخ دل اور وسیع النظر اب کہاں سے آئے گا۔

ہندوستان کو آج جو عظمت اور سرافرازی حاصل ہے وہ صرف جواہر لال نہرو کی تنہا ذات ہی کی وجہ سے ہے ۔ بیرونی ملکوں کے اکثر سربراہوں سے اُن کے ذاتی اور دوستانہ تعلقات تھے ۔ یہ تعلقات ہندوستان کی آزادی سے پہلے کے تھے اور بعد میں اور زیادہ مستحکم ہو گئے تھے۔ پنڈت نہرو کی موت سے ہندوستان کو دوسرے ملکوں سے ہم آہنگ کرنے والی ایک زبردست کڑی ٹوٹ گئی۔ ایک ایسا مضبوط رشتہ ختم ہو گیا جسے اب بڑی سے بڑی شخصیت بھی نہیں جوڑ سکتی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پنڈت نہرو کی موت سے صرف ہندوستان ہی یتیم نہیں ہوا بلکہ امن و انصاف کی عبادت گاہیں تہذیب و تمدن کے گلشن ، اخلاقیات اور روایات ، کی قدریں ، محبت اور اخوت کے رشتے ۔ مذہب اور انسانیت کے سرچشمے ، فن اور آرٹ کے نگارخانے اور ہندوستانی سیاست کا پورا ایوان یتیم ہو گیا ہے ۔ ہم اب اُس کا بدل کہاں سے لائیں ــ؟

پھول اور ویرانہ

جب سے انسان نے اس خلق میں آنکھیں کھولیں
لوگ کہتے ہیں کسی روز بھی ایسا نہ ہوا
ڈوبا سورج تو زمانے میں اندھیرا ہی رہا
پھر اُجالا نہ ہوا
رات روز آتی ہے لیکن کبھی ایسا نہ ہوا
لوگ جا کر در و دیوار سے ٹکرائے ہوں
کبھی طوفانوں کی ہیبت سے کسی نے نہ سُنا
آدمی بیٹھ گئے موت کے تہہ خانوں میں
یا کسی باغ کے مالی کو اگر موت آئی
باغ والے ہوئے آباد بیابانوں میں

میرے دل میں یہی رہ رہ کے خیال آتا ہے
اتنی کلیاں ہیں کوئی پھول بھی بن جائے گی
پھول کے نام پہ جاگ اُٹھتا ہے پھر میرا شعور
ایک آواز مری رُوح سے ٹکراتی ہے
مجھ کو یہ کہنے پہ اُکساتی ہے
گلستاں کا ہے یہ مطلب کہ مہک جائے دماغ
پھول کیا پھول تو کھِل جاتے ہیں ویرانے میں

اوآسکا سلطان پوری

پنڈت نہرو اب ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن اُن کے جیسی بھر پُور مکمل اور مصروف زندگی اب شاید ہی کوئی گذار سکے۔ وہ ابھی یہاں ہیں ابھی وہاں۔ ابھی پنجاب میں ابھی بنگال میں۔ کوئی جگہ بھی جہاں وہ موجود نہ رہتے ہوں۔ ہمیشہ توانا چست اور ان تھک۔ پچھلے سترہ سالوں میں جبکہ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم رہے شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جب اُن کا نام اخباروں کی زینت نہ بنا ہو۔ وہ وزیر اعظم تھے۔ وزیر خارجہ تھے۔ اٹومک انرجی کے وزیر تھے۔ لوک سبھا کے لیڈر تھے پلاننگ کمیشن کے چیرمن تھے۔ سائنٹفک اور انڈسٹریل ریسرچ کے چیرمین تھے۔ یہ عہدے صرف زیب داستان کے لئے ہی نہیں تھے بلکہ پنڈت نہرو نے ان میں اپنے خون کی حرارت شامل کر کے انہیں چمک بخشی تھی۔ یہ عہدے اُن کے امن۔ پارلیمانی جمہوریت۔ پلاننگ۔ سائنس اور ٹیکنولوجی سے گہرے تعلق اور دلچسپی کے مظہر تھے۔

نئی عبادت گاہیں

ہندوستان کی آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کی تعمیر کے سلسلے میں جن عظیم کاموں کی بنیاد پڑی وہ ان سب سے مسرور رہتے۔ انھوں نے لاتعداد بند۔ فیکٹریاں، عمارتوں، پاور اسٹیشنوں اور تحقیقی اداروں کی بنیاد رکھی اور ان کا افتتاح کیا۔ انہوں نے ان اداروں کو نئے ہندوستان کی نئی عبادت گاہیں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ یادگاریں بڑے فخر کے ساتھ ہمیں اُس ہندوستان کی یاد دلاتی رہیں گی جس کی تعمیر میں پنڈت نہرو نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا جس وسعت سے سفر کیا ہے شاید ہی کسی ہندوستانی لیڈر نے کیا ہو اور ہندوستانی عوام سے ان کا جس قدر گہرا تعلق رہا ہے وہ کا ندھی جی [illegible]

ہزاروں پہلو

پنڈت نہرو کی شخصیت کے ہزاروں پہلو تھے۔ انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں کیمبرج میں قدرتی سائنس پڑھی تھی۔ بیرسٹر بن کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ فرنچ زبان میں مہارت حاصل کی۔ الہ آباد میونسپلٹی کے ممبر رہے (الہ آباد جو کئی اعتبار سے اور دوسرے شہروں سے ان سے قریب تر ہے) صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ انہوں نے اور اُن کے والد موتی لال نہرو نے ۱۹۱۹ء میں الہ آباد میں ایک اخبار Independent کی بنیاد ڈالی تھی لیکن جو دو سال بعد ہی بند ہو گیا۔ اور ایک کامیاب مصنف کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے سات کتابیں لکھیں جن میں Glimpses of World History- Autobiography اور Discovery of India سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ انہوں نے لکھنے پڑھنے کا کام زیادہ تر اپنی قید کے زمانے میں کیا۔ "کچھ پُرانے خطوط" A Bunch of Old Letters بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اُنہوں نے آزادی کے بعد ترتیب دی۔ اُن کی Autobiography اور Discovery of India ایسی کتابیں ہیں جن میں ہندوستان کی اصل روح جھلکتی ہے۔ ان کتابوں کا دنیا کی ۲۰ مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ تنخواہ کے علاوہ ان کتابوں کا معاوضہ اُن کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا۔ اور اسی سے اُن کے حد سے بڑھے ہوئے اخراجات پورے ہوتے تھے ورنہ وزیر اعظم کی حیثیت سے اُنہیں جو تنخواہ ملتی تھی وہ اُن کے لئے بالکل ناکافی تھی۔

سُرخ گلاب

پنڈت نہرو ہندوستان کی آزادی کے لئے ہمیشہ بے چین اور فکرمند رہتے تھے۔ وہ مکمل ۱۶ گھنٹے روزانہ حکومت اور ملک کے کاموں میں مصروف رہتے۔ اس تھکا دینے والی مصروفیت کے بعد بھی وہ تعمیری نقشوں کی منظوری۔ بیرونی ممالک کے لیڈروں اور حکمرانوں سے ملاقات۔ عوام کی شکایات کی شنوائی لاتعداد درخواستوں پر غور و فکر، حکومت کی پالیسی سے متعلق اہم بیانات کی تیاری اور اخباری نمائندوں کی انٹرویو کی خواہش کے لئے وقت نکال لیتے۔ اس روزمرّہ کے معمول سے ہٹ کر وہ ایک دن میں کبھی دس اور کبھی بارہ بارہ تقریریں کرتے۔ اور پھر رات گئے دیر تک وہ ضروری خطوں کے جوابات اپنے سکریٹری کو نقل کرواتے اور جب یہ سب کام ختم ہو جاتا تو وہ کھانا کھا کر بستر پر لیٹتے اور تھوڑی دیر تک اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھنے کے بعد چند گھنٹوں کے لئے سو جاتے۔ شاید صبح کا ناشتہ ہی ایک ایسا موقع ہوتا جب وہ تھوڑی دیر سکون کے ساتھ اپنے خاندان والوں اور عزیز دوستوں سے ملتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔

پنڈت نہرو کی یادیں ہندوستان کے ذرّے ذرّے میں کروٹیں لے رہی ہیں — کتنی باتیں ہیں جو ہمیں اُن کی یاد دلاتی رہیں گی۔ اُن کی اچکن میں گلاب کا سُرخ پھول جو اُن کی اچکن میں لگے لگے ان کی ہمہ رنگ شخصیت کا ایک حصّہ بن گیا تھا — ۱۴ نومبر جو بچوں کے لئے چچا نہرو کی پیدائش کا دن ہے اور جو اب سرکاری طور پر بچوں کا دن بن گیا ہے — چانکیہ پوری اور شالستانی مارگ — دلی کے علاقوں کے نام جو پنڈت نہرو کے رکھے ہوئے ہیں — پنڈت نہرو کی سر کے بل کھڑے ہونے کی محبوب اکسرسائز جس سے اُن کے ڈاکٹروں نے اُنہیں چند سال پہلے روک دیا تھا — ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اُن کی بے خوف ہمّت و جرأت کی یاد — ۱۹۳۲ء میں مسولینی سے ملنے سے انکار — ۱۹۶۰ء میں کئی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس سے وقت نکال کر نیویارک میں میوزیم کی سیر — اُن کی نازک مزاجی جو اب ختم ہو چکی ہے اور اُن کی پیاری اور دلفریب مسکراہٹ جو صرف ان کی مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ جس میں پورا ہندوستان انگڑائیاں لیتا ہوا نظر آتا تھا — آنند بھون کی ۸۶ سالہ مہترانی کو ۴۲ سال بعد بھی پہچان کر اُسے گلے لگا لینا اور اُس کی خیریت دریافت کرنا۔ اپنے پُرانے رفیقوں کو باوجود سیاسی اختلافات کے پابندی سے خطوط لکھنا اور اُن کی صحت کے بارے میں فکرمند رہنا۔ اُن کی گالیاں کھا کر بھی اُن کے استقبال کے لئے ہوائی اڈے پر جانا۔ اُنہیں اپنے پاس ٹھہرانا۔ ہر طرح خاطر مدارات کرنا — ہم اُن کی کن کن باتوں کو یاد کر کے روئیں گے۔

مسلمانوں کا نہرو

پنڈت نہرو کو اقلیتوں اور خصوصاً مسلم اقلیت کا جتنا خیال اور پاس تھا اُس کی گہرائی کا اندازہ اُن کے جذبات سے ہوتا ہے جو اُنہوں نے اس مسئلے پر اپنی تقریروں میں ظاہر کئے ہیں۔ وہ بار بار اقلیتی فرقے کو وزارتوں اور حکومت کے دوسرے شعبوں میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینے پر اصرار کرتے رہے لیکن تنگ نظر اور فرقہ پرست کانگریسی اُن کی ہدایات پر کسی نہ کسی بہانے عمل نہ کرنے کا جواز پیدا کر لیتے تھے اور اُن کی خواہش کو نظرانداز کر دیتے تھے۔ وہ مسلم کلچر کے بڑے مدّاح تھے۔ لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تقسیم اُنہیں کی ایما پر عمل میں آئی لیکن حیدرآباد کے تقسیم ہو جانے کا اُنہیں شدید غم تھا کیونکہ اس سے مسلم کلچر پر بڑی کاری ضرب پڑی تھی اور وہ اس کا اظہار کئی بار کر چکے تھے۔

پنڈت نہرو کی موت سے ہندوستان کے ہر طبقے کو تو نقصان پہنچا ہی ہے لیکن مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اُس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ایک زندگی ہزار یادیں

برسوں پہلے ہم نے اپنی تقدیر کے ساتھ عہد کیا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس عہد کو پورا کریں خواہ پوری طرح سے نہ سہی لیکن قابلِ لحاظ حد تک

یہ پنڈت نہرو کی آواز تھی۔

اس شخص کی آواز جس کے ہاتھوں میں نصف صدی تک ہندوستان کا دل دھڑکتا رہا۔ یہ آواز پارلیمنٹ ہاؤس میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کی رات گونجی تھی۔

یہ نہرو کی آواز تھی جس میں آزاد ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی جھلک پوشیدہ تھی۔

اس منزل تک پہنچنے کے لئے بہت ہی دشوار اور کٹھن راہ سے گذرنا پڑا کیونکہ جب آزادی کا سورج چمکا اس وقت پنڈت نہرو کی عمر ۵۸ سے تجاوز کر رہی تھی۔ ان ۵۸ سالوں میں سے کم و بیش ۲۷ سال سیاسی جدوجہد کی نذر ہوئے تھے اور ۱۰ سال سے زیادہ جیل کی سختیوں اور تنہائیوں میں بسر ہوئے تھے۔

اکیلا بچپن

پنڈت نہرو پہلی مرتبہ دسمبر ۱۹۲۱ء میں جیل گئے اور آخری بار ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے آخری بار انہوں نے ۱۰۴۱ دن کی جیل کاٹی۔ یہ ان کی قید کی سب سے زیادہ طویل مدت تھی۔ اس رہائی کے دو سال بعد وہ آزاد ہندوستان کے وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوئے۔

پنڈت نہرو ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والدین موتی لال نہرو اور سروپ رانی کے اکلوتے لڑکے تھے۔

اُن کا بچپن ہر اعتبار سے یکہ و تنہا تھا۔ ۱۶ سال کی عمر تک جب وہ تعلیم حاصل کرنے ہیرو (انگلینڈ) گئے، نہرو نے کسی بھی اسکول میں تعلیم نہیں پائی تھی۔ اُن کی تعلیم گھر ہی پر ہوئی تھی اور یہ تعلیم انگریز آیاؤں اور خانگی استادوں نے دی تھی لیکن اِن استادوں میں صرف ایک شخص جو آئرلینڈ کا باشندہ تھا اور جس کا نام فرڈی نینڈ۔ ٹی۔ بروکس تھا ان پر اپنا کچھ اثر چھوڑ سکا۔

اس زمانے میں انہیں اپنے والد سے قریب ہونے کا موقع نہیں ملا۔ وہ دُور دُور ہی رہے کبھی کبھار موتی لال اپنے کاموں سے وقت نکال کر اپنے بچوں کے ساتھ کچھ دیر کھیلتے۔ یہ کھیل کرکٹ اور ٹینس ہوتے تھے۔

"میں ایک ملے جلے ماحول میں پروان چڑھا" سالوں بعد نہرو نے اپنے بچپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ان ابتدائی سالوں میں نہرو اپنی ماں سے بہت مانوس رہے۔ ماں نے اپنا سارا پیار اپنے بچے پر نچھاور کیا اور بچے نے ماں کی بے انتہا محبت دیکھ کر اُسے تھوڑا بہت اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کی۔

نہرو کے مذہب کے بارے میں خیالات مبہم اور دُھندلے دُھندلے سے تھے۔ ان کے استاد فرڈی نینڈ بروکس کو، ان کے خیالات کو اپنے انداز پر موڑنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

نہرو جب ۱۱ سال کے تھے تو اُنہیں ایک بہن پیدا ہوئی اُس کا نام سروپ رکھا گیا جو آگے چل کر مسز وجے لکشمی پنڈت کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اٹلی اور ہندوستان

نہرو نے ۱۹۰۵ء کے کرسمس میں ہیرو میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۷ء کے گرما میں اپنی تعلیم ختم کی اُس وقت اُن کی عمر ۱۶ سال تھی یعنی انگریزی اسکول میں داخل ہونے والے طلباء سے ۲ سال زیادہ۔

ہوائی جہاز اور ہوائی سفر اُس زمانے میں عام نہیں ہوئے تھے لیکن ان کی ترقی سے وہ بہت خوش تھے اُس ابتدائی زمانے میں بھی گیری بالڈی کی قیادت میں اٹلی کی آزادی کی جدوجہد نے اُنہیں شدید طور پر متاثر کیا۔ اٹلی اور ہندوستان کی ایک سی بدقسمتی سے اُن کا دماغ جلتا رہا اور یہ تلخ یادیں اُن کے ذہن میں بس گئیں۔ اُن کا ایشیائی شعور، روس اور جاپان کی جنگ بیدار ہوا اور وہ اپنے ملک کے سیاسی حالات اور اُس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان کے باہر کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے لگے۔

اُس وقت ہندوستان کا دل دھڑک رہا تھا۔ ۱۹۰۴ء سے جب سے کہ تقسیم بنگال کا فتنہ کھڑا ہوا تھا، قوم پرستی کے جذبات نے بہت واضح طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ آل انڈیا کانگریس کی میانہ رو جماعت نے بال گنگا دھر تلک میں ایک خطرناک دشمن چھپا ہوا پایا۔

۱۹۰۸ء میں مانک تل بم سازش کیس شروع ہوا اور بہار، شر اور پنجاب میں ہلچل اور بے چینی شروع ہو گئی۔

کم آمیز

ان واقعات سے جذباتی دلچسپی اور جوش و خروش پیدا ہونے کے بعد نہرو کے نئے ہیرو کی دنیا

بہت چھوٹی ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۰۷ میں وہ کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں شریک ہو گئے۔ نہرو نفیس مغربی لباس پہنتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنے شناساؤں سے گھل کر نہیں ملتے تھے۔ وہ کم آمیز تھے اور کبھی کبھی اس معاملے میں بداخلاقی کی حدود میں بھی داخل ہو گئے لیکن اپنے قریبی دوستوں کے درمیان وہ ہمیشہ بشاش بشاش رہتے تھے۔

کیمبرج کی سیر کے لئے کئی ہندوستانی لیڈر آتے تھے۔ ان میں بنگال کے لیڈر بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور گوپال کرشن گوکھلے قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۰۷ میں ہندوستان میں قوم پرستی کا بے حد عروج ہوا۔ نہرو کے والد موتی لال نہرو سورت میں تھے۔ چونکہ کانگریس کا اجلاس بدنظمی اور ہڑبونگ کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۱۰ میں جب نہرو ۲۰ سال کے تھے تو وہ کیمبرج کی تعلیم ختم کر کے نکلے۔ انہوں نے نیچرل سائنس میں سیکنڈ کلاس آنرز حاصل کیا تھا۔

کالج اور اسکول میں نہرو کا تعلیمی ریکارڈ معمولی اور اوسط درجے کا تھا۔ ابھی ان کے سیاسی عقائد کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں۔ کیمبرج سے وہ لندن گئے جہاں ان کا قیام دو سال تک رہا۔

۱۹۱۲ کے موسم گرما میں انہوں نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔

جب وہ کیمبرج میں تھے تو انہیں نومبر ۱۹۰۷ میں ایک اور بہن کرشنا پیدا ہوئی۔

تلاش

نہرو تلاش اور تجربہ اور ہنگامہ خیز زندگی کے لئے انگلینڈ گئے تھے لیکن جب وہ اپنے گھر واپس ہوئے تو ہندوستان کو تلاش کرنے کے لئے واپس ہوئے۔

۱۹۱۲ کا سال سیاسی ہنگاموں کا سال تھا۔ تلک جیل میں تھے اور اعتدال پسند جو حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کرنے تیار تھے اور مورلے منٹو اصلاحات پر غور کر رہے تھے اور پر اٹھ رہے تھے حکومت برطانیہ "نا اتفاقی پیدا کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر کاربند تھی۔ مسلم لیگ بڑی قوت کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔

دسمبر ۱۹۱۲ میں انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد نہرو نے پہلی بار بہار میں بانکی پور کے کانگریس کے جلسے میں شرکت کی۔ اس وقت سے وہ سیاست میں پوری طرح کود پڑے۔ اپنے طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ ان اقوام کی جدوجہد میں دلچسپی لے رہے تھے جو بیرونی تسلط کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ انہوں نے آئرلینڈ کی سن فین تحریک میں گہری دلچسپی لی تھی۔

بانکی پور کے اجلاس میں شرکت کے بعد وہ پہلے اعتدال پسندوں کی طرف جھکے۔ یہ پارٹی Servant of India Society کے نام سے مشہور تھی اور سن ۱۹۰۵ میں گوکھلے نے پونا میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔

پہلی جنگ عظیم

یہی وقت تھا جب پہلی بار نہرو نے گاندھی کا نام سنا۔ نومبر ۱۹۱۳ میں گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف کہ وہ مزدوروں پر عائد کیا ہوا سالانہ ٹیکس معاف نہیں کرے گی، نٹال سے ٹرانسوال تک پیدل سفر کیا تھا۔

اسی زمانے میں جنگ بلقان ہوئی اور اس کے اثرات ہندوستان پر پڑے۔ جب ۱۹۱۴ میں پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ہندوستان کی ہمدردیاں بٹی ہوئی تھیں اور قوم پرستی کے جذبات پھر سے زندہ ہو رہے تھے۔

گاندھی جی انگلینڈ میں ۳ ماہ ٹھہرنے کے بعد ۹ جنوری ۱۹۱۵ کو جنوبی افریقہ سے بمبئی پہنچے۔ اس وقت تک نہرو بہت کم آمیز، بہت شرمیلے، بہت حساس اور کچھ مغرور قسم کے تھے۔

لکھنؤ پیکٹ

۱۹۱۶ کا سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۹۱۶ میں لکھنؤ کے اجلاس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو لکھنؤ پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا اور جداگانہ انتخاب کا نظریہ منظور ہوا۔ اسی اجلاس میں نہرو پہلی بار گاندھی جی سے ملے۔

تلک نے ۱۹۱۶ میں ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی اور اسی سال مسز اینی بسنت نے بھی اپنی آل انڈیا ہوم رول لیگ قائم کی۔ نہرو نے دونوں لیگوں میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۱۹ میں ہوم رول لیگ کے سکریٹری بنائے گئے۔

۱۹۱۷ کی ابتدا میں گاندھی جی نے اپنی ستیہ گرہ کا پہلا تجربہ چمپارن میں شروع کیا۔ نہرو کے خاندان میں اس کا کافی چرچا ہوا اور جذبات اور قوت سے بھرپور بیٹا اپنے باپ کے خلاف صف آرا ہو گیا۔

جون ۱۹۱۷ میں مسز بسنت کی گرفتاری سے حالات نے تیزی سے پلٹا کھایا۔ جولائی ۱۹۱۸ میں مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ کانگریس کی توقعات سے بہت کم تھیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے ناکافی کہتے ہوئے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

جلیانوالہ باغ

اسی دوران میں ترکی کے خلاف جنگ کی وجہ سے مسلمان بددل ہو گئے۔ ۱۹۱۷ء میں حکومت نے بغاوت اور مجرمانہ سازش کی چھان بین کرنے کے لئے رولٹ کمیشن قائم کیا۔

رولٹ بل کی ہر طرف مذمت کی گئی۔

اس پل نے گاندھی جی کو سیاسی اسٹیج پر پوری طرح اُبھار دیا۔

گاندھی جی نے پورے ملک کو ہڑتال کرنے کے لئے للکارا۔ نہرو نے اپنے ضلع میں ہڑتال کو کامیاب بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

۶ر اپریل کو ہڑتال کے دن فوج اور پولیس نے کئی شہروں میں نہتے لوگوں پر گولیاں چلائیں ۸ر اپریل کو گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۵ اپریل کو پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا اور اس کے فوری بعد جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام شروع ہوا۔

کسان مارچ

اس کے ساتھ باپ اور بیٹے ایک ساتھ کام کرنے لگے۔ دسمبر ۱۹۱۹ میں امرتسر کانگریس ہوئی جس کی صدارت موتی لال نہرو نے کی، گاندھی جی سب کی نگاہوں کا مرکز تھے۔

۱۹۲۰ میں یوپی کے پرتاپ گڑھ ضلع میں نہرو نے پہلی "کسان مارچ" ترتیب دی۔

۲۸ر مئی ۱۹۲۰ء کو خلافت کمیٹی نے اپنے بمبئی کے اجلاس میں گاندھی جی کی عدم تعاون کی تحریک سے مکمل اتفاق کیا۔ ۳۰ر مئی کو تلک کا انتقال ہوا اور گاندھی جی اور نہرو نے جنازے کے زبردست جلوس میں شرکت کی جو چوپاٹی کی ریت پر جلایا گیا تھا۔

شادی

مارچ ۱۹۱۶ء میں بسنت پنچمی کے دن دہلی میں نہرو کی کملا کول سے شادی ہوئی۔ کملا ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ نہرو جی کی طرح دبلی پتلی اور حساس تھیں۔

نہرو کی شادی اور اس کے بعد کے پانچ سال بہت اہم ہیں۔ کملا کے لئے یہ سال تنہائی لئے ہوئے تھے۔ شادی کے ۲۱ ماہ بعد نومبر ۱۹۱۷ میں انہیں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام پریادرشنی اندرا۔ وہ اُن کی تنہا اولاد تھی۔

کملا اپنی ناگہانی موت تک جو ۱۹۳۶ء میں واقع ہوئی۔ ہندوستان کے سیاسی گرم و سرد میں برابر نہرو کے شانہ بہ شانہ چلتی رہی۔

یکم اگست ۱۹۲۰ کو تلک کی موت عدم تعاون کی تحریک کے آغاز کے دن ہی ہوئی۔ دسمبر ۱۹۲۰ میں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں وجے راگھوچاری کی صدارت میں ہوا۔ ۱۹۲۱ کا زیادہ حصہ نہرو نے دیہاتوں میں کام کر کے گزارا اور وہ کسانوں سے قریب ہوتے گئے۔

گرفتاری

۱۹۲۱ء کا پورا سال ہندوستان سیاسی سرگرمیوں میں ڈوبا رہا۔ گاندھی جی پورے ملک میں گھوم کر عدم تشدد کا پرچار کر رہے تھے اور نہرو زیادہ سے زیادہ گاندھی جی کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ یہ تحریک جوں جوں عام ہوتی گئی حکومت نے اسے سختی سے دبانا شروع کیا۔

نہرو نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ہندوستان کی نمائندگی گاندھی جی ہی کر سکتے ہیں اور یہ کہ ان کی جگہ گاندھی جی کے بازو رہے۔

جولائی ۱۹۲۱ء میں کانگریس نے غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

پورے سال انفرادی گرفتاریاں ہوتی رہیں باپ بیٹے دونوں گرفتار ہوئے اور انہیں لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا۔ باہر کی طرح قید خانے میں بھی نہرو نظم و ضبط اور صفائی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دن آہستہ آہستہ گزرتے گئے اور اچانک فروری ۱۹۲۲ میں گاندھی جی نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک اُٹھالی۔

۳۱ر جنوری ۱۹۲۳ کو نہرو قید سے رہا ہوئے ان کے دل میں مبہم خیالات جنم پانے لگے۔ کانگریس میں انتشار جنم پا رہا تھا اور گاندھی جی جیل میں تھے۔

نہرو نے اپنے جذبات کے بہاؤ کے لئے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈھا۔ اُنھوں نے اپنی توانیاں اپنے شہر کے میونسپل کاموں پر مرکوز کر دیں۔

ہندو مسلم فساد

ملک کے حالات دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۲۳ میں ہندو مسلم اتحاد میں تیزی سے کمی

۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء

آج اک بات ذہن نے پوچھی

"موت سے کس کو رستگاری ہے"

سچ ہے!

لیکن یہ بات سچ کیوں ہے؟

میرزا عزیز جاوید

گئی۔ ستمبر میں کوہاٹ اور سرحدی صوبے میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑے۔ دسمبر میں گاندھی جی کی صدارت میں کانگریس کا سالانہ اجلاس بلگام میں ہوا۔ نہرو نے امید کی تھی کہ گاندھی جی اس اجلاس میں کوئی واضح پالیسی سامنے رکھیں گے لیکن نہرو کو سخت مایوسی ہوئی

ستمبر ۱۹۲۳ میں نہرو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری چنے گئے۔

۱۹۲۴ میں ملک کے سیاسی حالات کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور کوئی عوامی تحریک نہیں ابھری۔

۱۹۲۵ کے موسم خزاں میں کملا نہرو شدید بیمار ہو گئیں۔ ۱۹۲۶ کے اوائل میں نہرو اپنی بیوی اور بچی کو لے کر وینس چلے گئے۔ نہرو یورپ میں ایک سال ۹ ماہ ٹھہرے اور اس عرصے میں ان کے خیالات اور نظریوں میں ایک فیصلہ کن نیا موڑ پیدا ہوا۔

اس ۲۱ ماہ کے عرصے میں ان کا بیشتر وقت جنیوا اور مونٹینا کے ایک سینی ٹوریم میں گزرا۔ یورپ نے حالات بدل سے تھے۔ جرمنی لیگ آف نیشنز میں شامل ہو چکا تھا۔ روس کے پنج سالہ منصوبوں نے جو ۱۹۲۹ سے شروع ہوئے تھے۔ نہرو کے خیالات کو بعد میں منصوبہ بندی کی طرف موڑ دیا تھا۔ اس دوران میں نہرو نے لندن اور ماسکو کا بھی سفر کیا۔

انہوں نے اٹلی۔ سوئیزر لینڈ۔ بلجیم اور جرمنی کا بھی دورہ کیا۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے انہوں نے بروسلز میں مظلوم قوموں کی کانگریس میں شرکت کی۔ انہوں نے اکتوبر ۱۹۲۷ میں روس کے انقلاب کی دسویں سالگرہ میں بھی شرکت کی۔

ہندوستان کو واپسی

۱۹۲۷ کے دسمبر میں کانگریس کا اجلاس مدراس میں ہونے والا تھا اور نہرو نے اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے ہندوستان واپس آنے کا قصد کیا۔

شروع دسمبر ۱۹۲۷ء میں نہرو اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان واپس ہوئے۔ انہوں نے خود کو کانگریس کے سیاسی دھاروں کے بیچ پایا۔ مدراس کے اجلاس میں انہوں نے کئی تجاویز پیش کیں جن میں ان کے نئے خیالوں اور نظریوں کا عکس تھا۔

ایک تجویز کے ذریعے ہندوستان کی مکمل آزادی مانگی گئی تھی۔ ۱۹۲۸ کے اواخر میں نہرو نے پہلی بار آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس میں شرکت کی۔

کسانوں میں ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کے سیاسی میدان میں ایک اور شخصیت نمودار ہوئی اور وہ ولبھ بھائی پٹیل کی تھی اس وقت پٹیل کی عمر ۵۴ سال تھی۔

۳ فروری ۱۹۲۸ کو سائمن کمیشن کی آمد ہندوستان میں سخت ہنگاموں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ہر جگہ دہشت پسندانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں حکومت نے مزدوروں پر وار کیا۔ نہرو ٹریڈ یونین کانگریس کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کا ان واقعات سے راست تعلق ہو گیا۔

باپ بیٹے میں اختلافات

کلکتہ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں پنڈت موتی لال نہرو صدر اجلاس اور جواہر لال نہرو میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ نہرو مکمل آزادی کے مسئلے پر کسی بھی قسم کا سمجھوتہ کرنے تیار نہیں تھے۔

سائمن کمیشن کے خلاف ایک جلوس کی رہنمائی کرتے ہوئے ۱۹۲۸ میں لکھنؤ میں انہوں نے پولیس کی لاٹھیاں کھائیں۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ کو لارڈ ارون نے ہندوستان کی دستوری ترقی کے بارے میں ایک اعلان کیا۔ نہرو نے اس اعلان پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

کانگریس کے لاہور کے اجلاس میں نہرو کانگریس کے صدر کی حیثیت سے جلوس نکلا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے سرمایہ۔ مزدور اور سوشلسٹ سماج کے تعلق سے خیالات پیش کئے۔

۲ جنوری ۱۹۳۰ کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ایک تجویز پیش کی جس کے ذریعہ ۲۶ جنوری آزادی کا دن مقرر کیا گیا۔ اس دن نہرو نے ایک تقریر کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی چاہی۔

گاندھی جی کے جانشین

لاہور کے کانگریس کے اجلاس میں گاندھی جی نے نہرو کو صدر بنا کر انہیں اپنا سیاسی جانشین مقرر کر دیا تھا ۲۶ جنوری کو جو عوامی مظاہرے ہوئے ان سے عوام کا آزادی کے لئے جوش و خروش اور بڑھ گیا۔

۱۲ مارچ کی صبح ساڑھے چھ بجے گاندھی جی نے سابرمتی سے ساحل سمندر کے ایک دیہات ڈانڈی تک اپنا تاریخی سفر شروع کیا یہ سفر کسانوں پر ٹیکس کے خلاف تھا۔

نمک کے بارے میں ستیہ گرہ اپنی مثال آپ تھی۔ اس ستیہ گرہ نے نہرو کو بے انتہا متاثر کیا اور ایک بار پھر ان کا جوش و خروش اور توانائی و بے صبری عود کر آئی۔

۶ اپریل کو گاندھی جی نے ڈانڈی میں نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی۔

۱۴ اپریل کو نہرو الہ آباد میں گرفتار کیا۔ گاندھی جی ۵ مئی کو گرفتار ہوئے۔ پورے ملک میں بے چینی پھیل گئی۔

۹ جولائی ۱۹۳۰ء کو لارڈ ارون نے پھر نوآبادیاتی دستور کی تجویز پیش کی۔ اس کے فوراً بعد چند قوم پرستوں نے حکومت اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کروانے کی کوشش کی۔ گاندھی جی اس بات چیت میں بہت محتاط تھے نہرو کا فیصلہ

آخری ہوگا۔" انہوں نے کہا۔ موتی لال اور نہرو کو پونا لایا گیا۔ تین دن تک بات چیت ہوتی رہی۔ کانگریسی لیڈروں نے جو شرطیں رکھی تھیں وہ حکومت کو منظور نہیں تھیں۔ قائدین پھر قید خانوں کو واپس ہو گئے۔

پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ نومبر کو لندن میں منعقد ہوئی جس میں کانگریس نے حصہ نہیں لیا جن پارٹیوں نے کانفرنس میں حصہ لیا وہ اپنے مقاصد میں متحد ہو گئے اور انہوں نے مرکزی حکومت کی تشکیل کے فیصلے کو منظور کر لیا۔

موتی لال نہرو کا انتقال

۲۵ جنوری کو گاندھی جی، نہرو اور دوسرے لوگ رہا کر دئے گئے۔ ۵ فروری کو موتی لال نہرو کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نہرو، گاندھی جی سے اور قریب ہو گئے اور ان کے لئے آزمائش، ایثار اور تکالیف کا دور شروع ہوا ۱۹۳۱ء کے کراچی کے کانگریس کے اجلاس میں نہرو نے بنیادی حقوق پر اپنی تجویز پیش کی ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء سے ۴ ستمبر ۱۹۳۵ تک جب وہ ساتویں بار قید سے چھوٹے نہرو صرف ۹ مہینے ہی آزاد رہے۔ ورنہ ان چار سالوں میں وہ جیل ہی میں رہے الموڑہ کی جیل ہی میں ۱۴ فروری ۱۹۳۵ کو نہرو نے اپنی "سوانح عمری" ختم کی۔

نہرو جیل ہی سے بمبئی میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس کی کارروائی کا جو راجندر پرشاد کی صدارت میں ہوا مطالعہ کرتے رہے۔

نہرو کو خوشی تھی کہ کانگریس نے دستور ساز اسمبلی کے خیال کو اپنایا۔ ۲۸ اکتوبر کو گاندھی جی نے سرکاری طور پر کانگریس سے اپنی علٰحدگی کا اعلان کیا۔

نومبر میں مرکزی اسمبلی کے لئے انتخابات ہوئے جس میں کانگریس بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔

کملا کا انتقال

۴ ستمبر ۱۹۳۵ کو نہرو اچانک قید سے رہا کر دے گئے۔ اُن کی سزا میں ابھی ساڑھے پانچ مہینوں کی مدت باقی تھی۔ اُن کی بیوی کملا کی حالت نازک تھی جو جرمنی میں بیدن ولر میں علاج کے لئے ٹھہری ہوئی تھیں۔ نہرو فوراً ہی الہ آباد سے یورپ روانہ ہو گئے۔

۲۸ فروری ۱۹۳۶ کی صبح کملا نہرو کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت نہرو اور اندرا اُن کے پاس تھے مارچ ۱۹۳۶ میں نہرو کملا کی راکھ لے کر ہندوستان واپس ہوئے۔ تنہائی تھکاوٹ کا احساس اُن پر بے انتہا غالب تھا۔

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کانگریس کو ۵ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل ہوئی۔ فوراً ہی چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔

۱۹۳۸ء میں نہرو کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔

آٹھویں بار قید

دوسری جنگِ عظیم کے دوران نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈر بڑے بحران میں رہے۔ ۱۹۳۹ میں کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا اور ۸ صوبوں میں گورنر کی حکومت قائم ہو گئی۔ نہرو اور گاندھی قوم کو ایک تحریک سے دوسری تحریک کو لیجاتے رہے نہرو آٹھویں بار جیل گئے اور اس بار وہ ایک سال سے کم قید رہے۔ پرل ہاربر پر حملے کے بعد حکومت نے سارے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

کچھ دنوں بعد کرپس مشن ہندوستان آیا لیکن اس کی ناکامی کے آثار ابتدا ہی میں نظر آ رہے تھے

ہندوستان چھوڑ دو

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد نہرو نے عوام سے کہا کہ جاپانی حملے کی صورت میں وہ ملک کو بچانے کے لئے گوریلا جنگ لڑیں۔

۷ اگست ۴۲ کو کانگریس کا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں "ہندوستان چھوڑ دو" تجویز پر غور کرنے کے لئے ہوا۔ یہ تجویز نہرو نے پیش کی۔

۹ اگست کو گاندھی جی، نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور احمد نگر لیجائے گئے۔ پورے ملک میں احتجاجات اور ہڑتال کا طوفان کھڑا ہو گیا۔ آتش زدگی، قتل اور لوٹ مار کے واقعات ہونے لگے۔ جنوری ۴۳ تک بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا گیا۔

شملہ میں لارڈ ویول کے ساتھ نہرو نے مولانا آزاد کی قیادت میں بات چیت شروع کی تاکہ کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو سکے۔

ستمبر ۴۳ میں لن لتھ گو چلے گئے اور اُن کی جگہ ویول وائسرائے ہو کر آئے۔

۲۲ فروری ۴۴ء کو کستوربا کا انتقال جیل ہی میں ہوا۔

اس اثنا میں دستور ساز اسمبلی کا الیکشن۔ ماؤنٹ بیٹن کی آمد۔ ملک کی تقسیم سے اتفاق اور کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔

۴۱ء میں ماؤنٹ بیٹن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر عارضی حکومت قائم کی۔

آزادی کا اعلان

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ کو نئی دہلی پہنچے اور فرقہ وارانہ فسادات اور انتشار کے باوجود انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے ۱۴ اگست

کا اعلان کر دیا۔

۱۵ اگست کو آزاد ہندوستان وجود میں آیا اور نہرو اُس کے پہلے وزیر اعظم بنے اور اس عہدے پر وہ اپنی موت تک فائز رہے۔

۱۵ اگست سے نہرو لاکھوں کروڑوں عوام کے محبوب رہنما بن گئے۔ انہوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اقتصادی ترقی اور ہندوستان کے اتحاد کو اپنا نصب العین بنایا۔

نہرو کی سرکردگی میں ہندوستان نے معاشی اور اقتصادی ترقی کے لئے ہمہ جہتی کوششیں شروع کیں۔ پنج سالہ منصوبوں کے پیچھے نہرو ہی کی رہنمائی کام کر رہی تھی۔

خارجی امور میں نہرو نے ہندوستان کو ایک آزادانہ پالیسی عطا کی۔ انہوں نے ملک کو غیر جانبدار رکھا اور ہزاروں دباؤ اور تنقید کے باوجود جو ملک کے اندر اور باہر ان کے اس فیصلے کے خلاف ہوتی رہی وہ اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہے۔

پنچ شیل

نہرو پنچ شیل کے خالق تھے پنچ شیل کا تصور سب سے پہلے انہوں نے ہی پیش کیا تھا جسے بعد میں افرو ایشیائی ممالک نے ۱۹۵۵ء میں بندونگ میں اپنا لیا۔

یوں تو وہ ہر پسماندہ ملک کے ساتھی تھے لیکن افریقہ اور ایشیا کے ممالک سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔

اپنے بیرونی ملکوں کے دوروں میں انہوں نے ان ملکوں کے عوام پر گہرے نقوش چھوڑے امن اور آزادی کے بارے میں اُن کے بے باکانہ خیالات نے انہیں بیرونی ملکوں کے عوام کا محبوب لیڈر بنا دیا۔ ۳ فروری ۱۹۴۸ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے اُن کا خطاب تاریخ عالم میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ اسی طرح ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۱ء کے خطبات بھی امن کے قیام اور سامراج کے خاتمے کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۰ء میں نہرو نے ہندوستانی وفد کے لیڈر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کی اور کرشچیف اور آئزن ہاور پر زور دیا کہ وہ آپس میں امن کے لئے بات چیت کریں۔

اقوام متحدہ میں اُن کی سرگرمیاں اور پھر اگست اور ستمبر ۱۹۶۱ء میں بلگریڈ میں غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں اُن کی سرگرم شرکت نے اُنہیں پوری دُنیا کے ایک اہم لیڈر کی حیثیت دیدی۔ اب اُن کے وقت کا اکثر حصہ عالمی مسائل میں صرف ہونے لگا۔

اقوام متحدہ پر اُن کا ایقان ہمیشہ قائم رہا باوجودیکہ اکثر اوقات اس عالمی ادارے کو سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پاکستان اور ہندوستان کے کشیدہ تعلقات پنڈت نہرو کے لئے بڑی بےچینی اور ناخوشی کا باعث رہے۔ وہ آخر تک دونوں ملکوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔

چین کی امداد

پنڈت نہرو نے جان لیا تھا کہ چین کی نئی حکومت مستقل طور پر عالم وجود میں آچکی ہے اور ہندوستان نے اُن کی رہنمائی میں اس نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

پنڈت نہرو ہی کی کوششوں سے چین کو بندونگ میں افرو ایشیائی ممالک کی کانفرنس میں شرکت نصیب ہوئی۔

انہوں نے زندگی بھر چین کی اقوام متحدہ میں شمولیت کی کوشش کی۔ یہ کوشش چین کے ہندوستان پر حملے کے بعد بھی جاری رہی۔

۱۹۵۴ء میں اُنہوں نے چینی وزیر اعظم چو۔ این۔ لائی کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدے پر دستخط کئے جس کی بنیاد پنچ شیل پر رکھی گئی تھی۔ لیکن جب چین نے اکتوبر ۱۹۶۲ میں ہندوستان پر حملہ کیا تو پنڈت نہرو کو اپنی زندگی کا سب سے زیادہ شدید صدمہ پہنچا۔

سویز کا واقعہ

پنڈت نہرو کی جرأت مندانہ پالیسی کی ایک مثال سویز کا واقعہ ہے۔ انہوں نے برطانیہ کی مذمت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس حقیقت کے باوجود کہ ہندوستان کامن ویلتھ کا ممبر ہے انہوں نے صرف مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ۳۱ اکتوبر ۵۶ء کو اقوام متحدہ کو ایک پیغام کے ذریعہ مجبور کیا کہ وہ جلد مصر کے خلاف جارحانہ کارروائی ختم کرنے کے لئے قدم اُٹھائے۔

بیرونی ممالک کا سفر

پنڈت نہرو نے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا اور ۱۳ اکتوبر کو امریکی پارلیمنٹ اور ۲۴ اکتوبر کو کینیڈا کی پارلیمنٹ سے خطاب کیا۔ انہوں نے پھر ۵۶ء اور ۶۱ء میں امریکہ کا دورہ کیا۔

۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۱ء میں وہ روس کے دورے پر گئے۔

۱۹۵۶ء میں وہ چین ائرلینڈ۔ مغربی جرمنی فرانس، شام اور لبنان گئے۔

جون ۱۹۵۱ اور ۱۹۵۹ میں وہ نیپال گئے

مئی ۱۹۵۳ میں اُنہوں نے ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کے جشن میں شرکت کی۔

۱۹۵۴ء میں اُنہوں نے برما۔ تھائی لینڈ انڈونیشیا اور ملایا کا سفر کیا۔

جون جولائی ۱۹۵۵ء میں روس کے علاوہ انہوں نے یوگوسلیویہ۔ پولینڈ، چیکوسلواکیہ آسٹریا۔ اٹلی اور مصر کا دورہ کیا۔

۸۔ جولائی ۱۹۵۵ء کو انہوں نے پوپ سے ملاقات کی۔

جون ۱۹۵۷ء میں وہ خیرسگالی کے دورے پر شام۔ ڈنمارک۔ فن لینڈ۔ ناروے۔ سویڈن۔ مصر۔ ہالینڈ اور سوڈان گئے۔

اکتوبر ۱۹۵۷ء میں انہوں نے جاپان کا بھی دورہ کیا۔

۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء کو انہیں ملک نے سب سے بڑا اعزاز "بھارت رتن" کا خطاب دیا۔

کارنامے

۱۹۶۱ء میں پنڈت نہرو نے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لئے قومی یکجہتی کانفرنس بلوائی۔ اس کانفرنس نے بڑے اہم فیصلے کئے اور یہ بڑے دُور رس نتائج کی حامل رہی۔ یہ پنڈت نہرو کا بڑا کارنامہ ہے

★ ملک کے ہر ترقیاتی کام کے پیچھے پنڈت نہرو کا دل و دماغ کام کرتا رہا ہے۔ وہ پلاننگ کمیشن کے صدر تھے اور پنج سالہ منصوبے انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

★ آزاد ہندوستان کی تعمیر سب میں زیادہ خون پسینہ نہرو نے بہایا ہے۔

★ اُنہوں نے ہندوستان میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔

★ اس جمہوریت کو سوشلسٹ طرز فکر عطا کیا۔

★ عوام کو ایک غیر مذہبی نظریہ فکر سے ہمکنار کیا

★ ملک کو زراعتی، صنعتی۔ اقتصادی تہذیبی اور ہر قسم کی اقدار کی ترقی پر لگایا۔

★ پوری دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لئے شدید جدوجہد کی۔

★ بین الاقوامی تنازعات کا پُرامن حل ڈھونڈنے کی بنا ڈالی۔

★ مختلف نظریۂ حیات رکھنے والوں میں خوشگوار تعلقات قائم کئے

کسی ایک واحد شخص کے اتنے سارے کارنامے دنیا کی تاریخ میں شاید ہی مل سکیں۔

شمع گُل ہوگئی

کمیونسٹ چین کے حملے کے بعد بھی اُنہوں نے کمیونسٹوں سے کسی بھی برہمی کا اظہار نہیں کیا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ چین کے حملے کے صدمے کی وجہ سے ہی اُن کی زندگی اس قدر مختصر ہوگئی

اُنہوں نے ملک کے طول و عرض کا بارہا دورہ کیا۔ اُن کا سا عوام کا مزاج شناس اب ملک میں شاید ہی کوئی ہو۔

اُنہیں ہندوستان کے ہر مذہب اور ہر فرقے کا اعتماد حاصل تھا۔ عوام اُن پر اپنی جانیں نچھاور کرنے تیار رہتے تھے۔ ان کی زندگی میں تھوڑی دیر کے لئے بھی ایسا وقت نہیں آیا جب عوام نے اُن سے ذرا سی بھی بدظنی کا اظہار کیا ہو۔

☆

وہ ۲۹ جنوری ۱۹۴۸ کی ایک اُداس رات تھی جب گاندھی جی ایک قاتل کی گولی کا نشانہ بن کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے تھے۔ درد و غم سے ڈوبے ہوئے نہرو نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہماری زندگیوں کا نور ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔"

لیکن ان ۱۵ برسوں تک نہرو نے اپنی محبت اور ایثار کی ایک ایسی شمع جلائے رکھی جس سے ملک کا کونہ کونہ منور ہوگیا۔ جس کے نور سے سیاہ راستے اور تاریک خرابے بھی جگمگا اُٹھے۔

اور آخر یہ شمع بھی ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کی ایک ظالم دوپہر کی نذر ہوگئی۔

جواہر ریزے

ایک مرتبہ پنڈت نہرو ایک جلسے میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ دیر ہوگئی تھی اور فاصلہ کافی طے کرنا تھا۔ اس لئے ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کا حکم دیا۔ پچھلی سیٹ پر اُن کے ساتھ لال بہادر شاستری بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ موٹر اپنی پوری رفتار کے ساتھ جا رہی تھی کہ سامنے ایک بیل آگیا۔ ڈرائیور نے بیل کو بچانے کی کوشش کی۔ بیل تو بچ گیا لیکن گاڑی ایک درخت سے ٹکرا کر اُلٹ گئی۔ موٹر میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ دُور جا کر گر پڑے۔ ڈرائیور زخموں سے چُور ہوگیا۔ نوکر کو بھی کافی چوٹیں آئیں اور وہ درد کے مارے کراہنے لگا۔ پنڈت نہرو کو بھی دو چار جگہ زخم لگے۔ لیکن اُنہوں نے اپنے حواس نہیں کھوئے۔ اُٹھنے لگے تو انہیں اپنے جسم پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ انہوں نے پڑے پڑے ہی لال بہادر شاستری کو پکارا۔ "شاستری جی آپ کہاں ہیں؟"

"میں آپ کے اوپر ہی تو پڑا ہوں" شاستری جی نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

پنڈت نہرو نے ایک قہقہہ لگا کر کہا "مجھے اُٹھنے بھی دو گے یا یونہی مجھ پر پڑے رہو گے۔"

اتنے میں حفاظتی دستے کی موٹریں بھی آگئیں۔ انہوں نے نہرو کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو جان میں جان آئی

نہرو

وہ نہرو جس نے سارے دیش کی جلتی اُمنگوں کو
حسیں خوابوں کی صورت اپنی پلکوں پہ سجایا تھا

وفا کے پیار کے ترشے ہوئے انمول ہیروں سے
نئی تاریخ کے ماتھے کو اتنا جگمگایا تھا

لہو سے شوخ کرنوں کی نئی فصلیں اُگائی تھیں
سحر کی آرزو بن کر سحر کے ساتھ آیا تھا

اُبھرتے حوصلوں کو اعتبارِ زندگی دے کر
زمیں پر آسمانوں کی بلندی کو جھکایا تھا

گذرتے قافلے کو وقت کی شاداب راہوں میں
فروغِ حُسنِ مستقبل کا آئینہ دکھایا تھا

وہ نہرو مر گیا لیکن وہ نہرو مر نہیں سکتا
جو دِل کے ساتھ دھڑکے آنسوؤں کے ساتھ تھرائے

خیال و فکر کے کھلتے ہوئے لاکھوں دریچوں سے
امیدوں کا سویرا بن کے اپنا نور پھیلائے

نظر آئے وہی مانوس سا چہرہ فضاؤں میں
وہی آواز جادو بن کے سینوں میں اُتر جائے

نہ ٹوٹے اعتبارِ روز و شب کا سلسلہ ہرگز
نہ کوئی باغ ویراں ہو نہ کوئی پھول مرجھائے

وہ عظمت، وہ اُجالا، وہ صدا، وہ یاد زندہ ہے
تو پھر اے موت! ایسے میں ترا کیوں کر یقیں آئے

خورشید احمد جامی

گاندھی اور نہرو

ہندوستانی قوم کا محبوب لیڈر جس نے ملک کی آزادی کے لئے بے غرضانہ اور ایک مصمم ارادے کے ساتھ جنگ کی اور جسے گاندھی جی نے "ہندوستان کا ہیرا" کا خطاب دیا تھا۔ ہماری تاریخ میں ایک لافانی اور کبھی نہ ماند پڑنے والی چمک کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ پنڈت نہرو میں دو صفات بڑی لاثانی تھیں۔ اُن کا خدمت اور ایثار کا جذبہ ـــ اُن کی یہ دو صفات بحیثیت ایک انسان اور ایک سیاستدان آزادی سے پہلے اور بعد پوری طرح نمایاں ہوئیں۔ ہندوستان کی خوش قسمتی کا یہ بڑا راز ہے کہ پنڈت نہرو کی شخصیت متنازعہ فیہ نہیں تھی۔ بلکہ ملک کے مختلف عناصر کو قریب لانے میں وہ بڑی معاون ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کی سیاسی کامیابی بڑی حد تک پنڈت نہرو کی مرہونِ منت ہے ان دونوں شخصیتوں میں ہندوستان جھلکتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان دونوں کا مجموعہ ہی ہندوستان تھا۔

مختلف اور یکساں

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی دو آدمی اپنی طبیعتوں کے اعتبار سے اتنے مختلف اور اس کے باوجود اس قدر ایک جیسے نہیں ہوں گے جتنے گاندھی جی اور پنڈت نہرو تھے۔ اپنی خود نوشت سوانح حیات میں پنڈت نہرو نے گاندھی جی سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہم سب جنوبی افریقہ میں اُن کی بہادرانہ جدوجہد کی تعریف کرتے تھے لیکن وہ ہم نوجوانوں کو بہت مختلف، بہت دُور اور ایک دم غیر سیاسی شخصیت معلوم ہوتے تھے۔"

دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی پہلی ملاقات لکھنؤ کانگریس کے اجلاس میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ اُس وقت گاندھی جی ایک موٹی سوتی دھوتی اور لانبا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ اُن کے سر پر کاٹھیاواڑی پگڑی تھی۔ اُس وقت اُنہوں نے کاندھے پر کپڑا ڈالنا شروع نہیں کیا تھا۔ یہ ۱۹۲۱ء میں شروع ہوا۔ جواہرلال نہرو، ہیرو اور کیمبرج سے نئے نئے آئے تھے اور انگریزی لباس پہنے ہوئے تھے۔ پنڈت نہرو نے بعد میں بڑی بے تکلفی سے جو اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا اقبال کیا کہ اُس زمانے میں لٹے ونے رہتے تھے۔

باغی انسان

وہ کونسی چیز تھی جس نے پنڈت نہرو کو گاندھی جی کے قریب کھینچا؟ گاندھی جی کے اندر جو باغی انسان چھپ بیٹھا تھا۔ جو ناانصافی اور ظلم سے نفرت کرتا تھا۔ جو اونچے اصولوں کے صرف اظہار سے مطمئن نہیں ہوتا تھا بلکہ ان پر عمل پیرا ہونے پر اصرار کرتا تھا۔ اسی باغی شخص نے جواہرلال کو اپنی طرف کھینچا۔

پنڈت نہرو نے گاندھی جی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اُن کی شفقت آمیز دلچسپی کے باوجود مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک بند دروازے سے خطاب کر رہا ہوں۔"

یہ بات ان دونوں شخصیتوں کے بارے میں کتنی صحیح ہے اور اس کا سبب صاف ہے ان دونوں شخصیتوں نے اپنے عمل کی بنیاد اپنے پہلے اصولوں پر رکھی تھی

گاندھی جی کی ایک اور صفت نے پنڈت نہرو کو اپنی طرف کھینچا۔ گاندھی جی کو بنیادی طور پر داخلیت پسند تھے لیکن وہ دوسروں سے مختلف تھے۔ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کا اسی طرح خیال رکھتے تھے جس طرح خود کی فلاح و بہبود کا۔ اس بارے میں یہ دونوں ایک دوسرے کے مماثل تھے اور موتی لال نہرو سے قطعی مختلف تھے

لیکن باپ بیٹے دونوں گاندھی جی کی طرف کھنچتے گئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی عمل پر اصرار کرتے تھے۔ موتی لال نہرو نے حقیقی معنوں میں گاندھی جی کی پیروی نہیں کی۔ وہ اپنے بیٹے کی راہ پر چلے۔ جواہرلال نہرو نے بھی گاندھی جی کے اکثر معاشی اور اقتصادی نظریوں سے جنہیں وہ دقیانوسی خیال کرتے تھے انحراف کیا لیکن وہ اس خلیج کے باوجود جو معاشی اقتصادی، سیاسی اور سماجی اختلافات کی بناء پر گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے درمیان پیدا ہو گئی تھی، گاندھی جی کے ساتھ رہے۔ اس طرح وہ حقیقی معنوں میں گاندھی جی کی پیروی کر رہے تھے۔

اختلافات

آزادی کے بعد گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے درمیان اختلافات نمایاں ہو کر سامنے آگئے جب پنڈت نہرو نے آزاد ہندوستان کو اپنی پالیسی اور نظریات کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ کئی لوگوں نے اس دور کو گاندھی جی کی روایات اور نظریات کے ٹوٹنے کا دور کہا ہے۔ جو ایک حد تک صحیح ہے

پنڈت نہرو کی زندگی کے کئی اہم پہلو ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ منطقی طور ان ہی چیزوں کی پیروی کر رہے تھے جن پر وہ یقین رکھتے تھے اور جن کے بارے میں وہ کئی سال سے لکھتے اور کہتے آ رہے تھے۔

راز

پنڈت نہرو کی ہمہ گیر ہردلعزیزی اور اور قوم پر ان کی مضبوط گرفت کا کیا راز تھا۔ طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی میں پنڈت نہرو کی بے پناہ محبت اور مقبولیت آزادی سے پہلے کے واقعات و حادثات تھے جن پنڈت نہرو گزرے تھے۔ انہوں نے ملک کی ی کے لئے جو تکلیفیں جھیلیں اور جو قربانیاں دیں ام کے دل میں جڑ پکڑ چکی تھیں لیکن اگر منطقی پر ہم اس کا تجزیہ کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کی زیزی کا راز ان اصولوں پر سختی سے چلنا تھا جو گاندھی جی سے ورثے میں ملے تھے۔

طبیعت اور فطرت

پنڈت نہرو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب مزاج کا ایک بڑا ہی خوبصورت نمونہ تھے۔ وہ ذہنی اور جذباتی طور پر جمہوریت پسند تھے لیکن موقعوں پر ان کی طبیعت میں مطلق العنان شخصیت بھی جھلکتی ہے۔ وہ ایسے شخص تھے جو اپنے اصولوں مفادات کو بڑی سختی سے عملی جامہ پہنانے کی ادا رکھتے تھے۔ وہ جلد بازی تھے یہ جلد بازی کو جلد سے جلد ترقی کی راہ نے کے لئے تھی۔ اکثر اوقات ان کی اس زی کو غلط نظر سے بھی دیکھا گیا لیکن تجزیہ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدمت وطن ہی کی لگن کا پہلو تھا۔

زندگی کا سرمایہ

آزادی کے فوری بعد وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کی خدمات کا جائزہ لینا اس وقت مشکل ہے۔ یہ کام پنڈت نہرو کی سوانح حیات اور ہندوستان کی آزادی کی تاریخ لکھنے والے مورخ کا ہے لیکن آزادی کے فوری بعد جو دس سال گزرے ہیں، جب گاندھی جی کا قتل ہوا اور جب ہر دن ہندوستان کے لئے آزمائش کا ایک عظیم مرحلہ تھا، پنڈت نہرو ایک آہنی عزم رکھنے والا رہنما ثابت ہوئے۔ ان کا غیر مذہبی نقطۂ نظر، جمہوری اصولوں کے لئے جدوجہد، عالمی امن اور اس کے بقا کے لئے ان تھک کوششیں اور ہمارے قومی زندگی کے معیار کو اونچا کرنے کی دوڑ دھوپ، ایسی چیزیں ہیں جو پنڈت نہرو کو دنیا اور ہندوستان کے عوام کے ذہن سے کبھی محو نہ ہونے دیں گی۔ یہی چیزیں ان کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔

اَن مٹ نقش

ہندوستانی عوام کے دل و دماغ پر پنڈت نہرو کا ایک کبھی نہ مٹنے والا عکس قائم ہو چکا ہے۔ گاندھی جی کے انتقال کے وقت پنڈت نہرو نے جو کچھ کہا تھا وہ آج ان کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

"گاندھی جی نے ہندوستانی دماغوں پر اور اس عہد کے دماغ پر جس میں ہم رہ رہے ہیں اپنا دائمی نقش چھوڑا ہے، جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ گاندھی جی ہمارے رگ و ریشے میں سرایت کر چکے ہیں۔ انہوں نے ہماری زندگیاں بدل کر رکھ دی ہیں۔"

اور آج یہی بات بڑے وثوق سے پنڈت نہرو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

جواہر ریزے

پنڈت نہرو ملک و قوم کی خدمت میں کچھ ایسے کھو گئے تھے کہ انہیں اپنے سراپا کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ ایک بہت بڑے جلسے میں تقریر کرنے کے لئے پہنچے تو فوٹوگرافروں نے اپنے کیمرے اُن کے چہرے کی بجائے اُن کے پیروں پر مرکوز کر دئے۔ پنڈت نہرو پہلے تو کچھ پریشان سے ہوئے اور کچھ سمجھ نہ سکے کہ کیا معاملہ ہے لیکن جب ہر کیمرہ اُن کے پیروں ہی کو گھورنے لگا تو انہوں نے بھی اپنے پیروں کی طرف نظر کی تو معلوم ہوا کہ اُن کے سیدھے پیر کا جوتا بری طرح منہ پھاڑے ہوئے ہے۔ اُنہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ڈائس کی طرف بڑھ گئے۔

◉

پنڈت نہرو کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی تنخواہ کیا ہے، کتنا روپیہ ٹیکسوں میں کٹتا ہے اور کتنا بینک میں جاتا ہے۔ مہینے کی آخری تاریخیں تھیں، نہرو نے گھر کے اخراجات کے لئے ایک معمولی رقم کا چیک کاٹ کر اپنے نوکر ہری کے حوالے کر دیا۔ رات میں بارہ بجے جب وہ سب کام ختم کر کے کھانے کے لئے میز پر بیٹھے تو کھانے میں صرف ایک سبزی اور دال تھی۔ پنڈت نہرو نے سوالیہ نظروں سے ہری کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔

"بینک میں روپیہ نہیں ہے۔"

دوسرے دن کے اخراجات کیلئے ہندوستان کے وزیر اعظم کو اپنی بیٹی اندرا گاندھی سے روپیہ قرض لینا پڑا۔

ایک عظیم وصیّت

ھندوستانی عوام نے اپنے کئی لیڈروں کی عزت کی ہے اور کچھ شخصیتوں کی پرستش بھی کی ہے لیکن میرے ملک کے عوام کے ہر طبقے نے مجھ پر اپنی بے دریغ محبت کی ایسی بارش کی ہے جس سے میرا دل بھر بھر آیا ہے۔

میں اپنے عوام کی کتنی ہی خدمت کیوں نہ کروں، اس محبت جیسی بیش بہا چیز کا لوٹانا کسی صورت بھی ممکن نہیں لیکن میری اب جو کچھ بھی زندگی باقی رہ گئی ہے اُس میں میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ میں اپنے عوام کی اس محبت کا اہل بن سکوں۔

میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو جلایا جائے۔ میری راکھ کا کچھ حصہ الہ آباد میں گنگا میں بہایا جائے اور باقی راکھ کو ہوائی جہازوں کے ذریعہ ہوا میں لیجا کر اُن کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں ہندوستان کے کسان پسینہ بہاتے ہیں تاکہ میری راکھ اُن کھیتوں کی مٹی میں مل جائے اور اُس کا ایک ناقابلِ امتیاز حصہ بن جائے۔

میں اپنے بے شمار دوستوں اور ساتھیوں کا بھی بے انتہا ممنون ہوں۔ ہم نے بڑے بڑے معرکے مشترکہ طور پر سر کئے ہیں اور اُن کامیابیوں اور غموں کو بھی آپس میں بانٹا ہے جو ان معرکوں کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

میں انتہائی سنجیدگی سے اس چیز کا اعلان کرتا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد میرے لئے کسی بھی قسم کی مذہبی رسومات ادا کی جائیں۔ میں ان رسومات پر قطعاً اعتقاد نہیں رکھتا اور ان رسومات کا قبول کرنا خواہ وہ رواجاً ہی کیوں نہ ہو ریاکاری اور خود کو اور دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہوگی۔

میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کو جلا دیا جائے۔ اگر میرا انتقال کسی بیرونی ملک میں ہو تو میری لاش کو وہیں جلا کر میری راکھ الہ آباد بھیج دی جائے۔ اس راکھ کا کچھ حصہ گنگا میں بہا دیا جائے اور بڑا حصہ مندرجہ ذیل طریقے پر ڈسپوز کیا جائے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میری یہ خواہش کہ میری راکھ کے کچھ حصے کو الہ آباد میں گنگا میں بہا دیا جائے کسی مذہبی جذبے کی پیداوار نہیں ہے۔ اس معاملے میں میرا کوئی مذہبی جذبہ نہیں ہے۔ الہ آباد میں رہنے کی وجہ سے میں اپنے بچپن سے گنگا اور جمنا سے محبت کرتا آیا ہوں اور جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا یہ محبت بھی بڑھتی گئی۔ میں نے موسم کے ساتھ ساتھ اُن کی بدلتی ہوئی طبیعتوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں اکثر اُن روایتوں، خیالی قصوں، نغموں، کہانیوں اور تاریخی واقعات کے بارے میں سوچتا رہا ہوں جو ہر زمانے میں ان سے وابستہ رہے ہیں۔

خاص طور پر گنگا ہندوستان کی ندی ہے۔ اپنے عوام کی محبوبہ جس کے اطراف نسل ہا نسل کی یادیں، اس کی امیدیں اس کی مایوسیاں، اس کی کامیابی کے نغمے، اس کی کامرانیاں اور اس کی شکستیں گوندھی ہوئی ہیں۔ وہ ہندوستان کے قدیم کلچر اور تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، ہمیشہ بہتی رہتی ہے لیکن وہ ہمیشہ وہی گنگا رہتی ہے۔ وہ مجھے برف میں لپٹی ہوئی پہاڑیوں اور ہمالیہ کی گہرائی تک پھیلی ہوئی وادیوں کی یاد دلاتی ہے جنہیں میں نے شدت سے چاہا ہے۔ وہ مجھے ڈھلوان میں لہلہاتے اور زرخیز میدانوں کی یاد دلاتی ہے جہاں مجھے زندگی گزارنی اور کام کرنے ہیں۔ صبح کے سورج کی کرنوں میں مسکراتی اور ناچتی ہوئی اور شام کے سایوں میں اداس طول اور پُراسرار رازوں سے پُر۔ سردیوں میں سکڑی ہوئی سست رفتار اور پتلی اور برسات میں گرجتی اور چنگھاڑتی ہوئی جس کا سینہ سمندر کی طرح کشادہ ہے جس میں سمندر ہی کی طرح برباد کرنے کی قوت ہے۔ گنگا میرے لئے ہندوستان کے ماضی کا ایک نشان اور ایک یادگار ہے جو حال میں بہہ رہی ہے اور مستقبل کے عظیم سمندر میں جا کر مل رہی ہے۔

اگرچہ کہ میں ماضی کی بہت ساری روایات کو اپنے دامن سے جھٹک چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہندوستان بھی ان بیڑیوں سے نجات حاصل کرے جو اُسے پابند کئے ہوئے اور باندھ کر رکھے ہوئے ہے جو اس کے عوام کو منتشر کئے ہوئے اور اُن کے جسم اور روح کی آزادانہ ترقی کو روکے ہوئے ہے گو میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں نہیں چاہتا کہ پوری طرح ماضی سے قطع تعلق کر لوں۔ میں اس ورثہ پر فخر کرتا ہوں جو ہمارا رہ چکا ہے اور ہمارا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں بھی سب کی طرح ماضی کی اسی اٹوٹ زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا سلسلہ ہندوستان کے ماضی بعید کی تاریخ سے ملتا ہے۔

میں وہ زنجیر نہیں توڑوں گا کیونکہ میں اسے عزیز رکھتا ہوں اور اُس سے قوت اور وجدان حاصل کرتا ہوں۔ میری اس خواہش کی شہادت میں اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو میرے آخری خراجِ عقیدت کے طور پر میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ میری راکھ کا کچھ حصہ الہ آباد میں گنگا میں بہا دیا جائے تاکہ میری راکھ اُس عظیم سمندر میں جا کر ملے جو ہندوستان کے ساحل سے ہم آغوش رہتا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

۲۱ جون ۱۹۵۴ء

ایک دور کی موت

آنکھوں میں اشک ہونٹوں پہ نالے ٹھہر گئے
نغمے گلے میں، سینے میں دم جیسے رُک گیا
یکلخت چلتے چلتے ہوائیں سہم گئیں
ہر شاخِ تر پہ گلاب کا سر آج جھک گیا
اب کس ہوا سے غنچۂ خاطر بھلا کھِلے
بہلالیں دل کو ہم بھی مگر تو کہاں ملے

اب کس سے کیجئے ذکر، یہ کیا حادثہ ہُوا
کس غم سے آج دامنِ دل تار تار ہے
کس دکھ نے تابِ نوحہ گری ہم سے چھین لی
ہر آنکھ آج کس کے لئے اشکبار ہے
ہندوستاں سہاگ ترا کیا ہُوا بتا
سنگم ترا سپوت کہاں کھو گیا بتا

کن کن قیامتوں سے نگاہیں ملائیے
کس کس سوالِ زیست کا اب دیجئے جواب
کس در پہ جائیے کہ ملے روشنی کی بھیک
اب زخمہائے دل کا کسے دیجئے حساب
دُنیا کا درد بانٹنے والا نہیں رہا
اُمڈی وہ تیرگی کہ اُجالا نہیں رہا

اک شمع تھی کہ جل بجھی اپنی ہی آگ میں
اک داستانِ مہر و وفا ختم ہوگئی
اک رُوحِ بے قرار کو آرام آگیا
اک پیار کی دُکھی ہوئی آواز سو گئی
موتی کی آب لُٹ گئی اپنے ہی دیس میں
آج ایک دور مر گیا نہرو کے بھیس میں

سلیمان اریب

میرخواہ

بمبئی کے شب و روز

مندرجۂ ذیل روداد ۲۰ مئی کے شمارے میں آنی چاہیئے تھی لیکن کچھ دیر سے نکلنے کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ اس دوران پنڈت نہرو کے انتقال کی وجہ سے ہندوستان کے سیاسی حالات میں کافی تبدیلی آگئی لیکن اس کے باوجود ان بدلے ہوئے حالات میں بھی یہ روداد اسی دلچسپی اور اہمیت کی حامل ہے۔ (ادارہ)

اکبر الہ آبادی نے دلّی کا دربار دیکھا تو ایک لاجواب نظم رقم کر دی۔ امسال ۱۵ سے ۱۷ مئی تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسے بمبئی میں ہو رہے تھے تو میرخوار نے سوچا کیوں نہیں اپنی سرکار کا دربار بھی دیکھ لیں۔

تین سو ٹن برف

شہر کے جنوبی حصے میں بیس لاکھ کے خرچ سے بنے ہوئے شانمکھنند ہال میں جلسے ہو رہے تھے۔ لیکن وقت یہ تھی کہ مئی کی گرمی۔ تقریباً تین ہزار کا مجمع اور ہال "ائرکنڈیشنی" کی نعمت سے محروم، پنکھوں کی تعداد دوچند کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہونے والا تھا۔ لہٰذا مجلس استقبالیہ نے تین سو ٹن برف کی سلیں لا کر فضا میں خنکی پیدا کرنے کی کوشش کی پھر پنکھوں کو سوجھی کہ وقفے وقفے سے گلاب کے عرق کی خوشبو پھیلا کر ہال کو معطر کیا جائے تاکہ خنکی کے ساتھ لطافت بھی پیدا ہو سکے۔ ہال اور اسٹیج کی سجاوٹ بڑی سادگی تھی۔ بیدلرزاں کے تیج وخم اور رنگین کپڑوں سے جمنی والے نے اپنے مخصوص اسٹائل و رشد کے خاصے پیارے نمونے پیش کئے تھے لیکن اتنی ہی بدمذاقی مہاتما گاندھی کی اس کٹی ہوئی تصویر سے ٹپک رہی تھی جو کبڑی سی عقب میں کھڑی تھی

ٹھیک ۹½ بجے دن کو وزیر اعظم، صدر کانگریس ارکان ورکنگ کمیٹی، گورنر مہاراشٹر، وزرائے حکومت وغیرہ کہکشاں کی طرح اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ ہال کے باہر دو تین برآمدوں میں ایک نئی دنیا ظہور میں آگئی تھی۔ ریسٹوران کے علاوہ پریس اور اخبار نویسوں کے لئے تار بھیجنے کی سہولت، ٹیلیفون، ٹرنک کال بلکہ خبر رساں ایجنسیوں کے ٹکر، ٹائپ رائٹر، صوفے، کرسیاں، میز، ڈاک خانہ غرض سب کچھ موجود تھا۔ سڑک پر دور دور تک تماش بینوں کا ہجوم تھا۔ تحفظی کارروائی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ انسپکٹر پولیس، خفیہ پولیس، وائرلیس اور رضاکاروں کی بھرمار تھی۔

گاندھی کی کانگریس

جلسہ میں آنے والوں کے لئے موٹر پارک کرنے کا انتظام بڑا معقول تھا۔ ایک فرلانگ تک موٹروں کا اژدھام تھا۔ اور وہ بھی کیسی کیسی شاندار موٹریں! میرخوار دل میں سوچنے لگا — کیا یہ اسی گاندھی کی کانگریس ہے جس نے کرتا پہننا اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ اس دیس کے کروڑوں باشندے اس کے بغیر زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے؟ یا یہ اس باپو کی جماعت ہے جو سیوگرام میں جھونپڑی میں رہا کرتا تھا کیونکہ اس کے ہم وطنوں کو اس سے بہتر جگہ میسر نہ تھی؟ کیا اس کانگریس کی شان و شوکت، تزک و احتشام امریکن کنونشن سے کچھ کم تھی۔ اس فضا اور اس ماحول میں بیٹھ کر غربت، مفلسی اور سوشلزم وغیرہ کی باتیں کچھ بے جوڑ سی لگتی تھیں۔ غربت اور غریبی پر کرشنامنن نے ایک بلیغ جملے میں اظہار خیال کیا:

"ہندوستان غریب نہیں ہے۔ ہندوستانی غریب ہیں!"

کم سخنی

وسیع اسٹیج پر بے شمار تکئے پڑے ہوئے تھے۔ آسمان سیاست کے بے شمار درخشندہ ستارے آتے گئے اور بیٹھتے گئے۔ ان میں جواہر لال نہرو اور صدر کامراج کے علاوہ۔ وجے لکشمی پنڈت، مرارجی ڈیسائی، جگجیون رام، لال بہادر شاستری، سردار سورن سنگھ، غلام محمد صادق، لیفٹیننٹ راؤ چوہان، وسنت راؤ نائک، اندرا گاندھی، ایس کے پاٹل، گلزاری لعل نندہ، سچیتا کرپلانی، کرشنامنن وغیرہ وغیرہ۔ غرض ڈراما یا سینما کی اصطلاح میں "آل اسٹار کاسٹ" تھا۔ جلسے کی کارروائی صدر کامراج کے جنبش سر سے شروع ہوئی۔ تین دن کے سیشن کا یہ ایک ریکارڈ ہے کہ صدر جلسہ "کم گو بلکہ چُپ گو" پر عمل کرتے ہوئے صرف ایک بار مائک کے سامنے کھڑے ہوئے۔ اپنے ترجمان سے دو چار الفاظ دھیرے دھیرے کہا اور بیٹھ گئے باقی وقت "خموشی گفتگو ہے" پر عمل پیرا رہے

سلسلہ جاری

کچھ منتظمین سے

میر خوار نشست و برخاست کے معاملے میں ہندوستانی طور طریقوں کا بڑا قائل ہے چنانچہ اس کا خیال ہے کہ مشاعروں اور جلسوں میں نہ صرف مہمانانِ خصوصی بلکہ سامعین کی نشست بھی فرشی ہونی چاہئے تھی مگر ہوا یہ کہ ہم سب نے سمجھوتا سا کر لیا ہے یعنی ڈیس (جس کا غلط العوام ڈائس ہے) یا اسٹیج پر تو نشست فرشی رکھی جاتی ہے اور باقی حصوں میں صوفے اور کرسیاں ہوتی ہیں۔

اس سمجھوتے نے انتہائی غلط قسم کی روایات کو جنم دیا ہے۔ جن سے سامعین کو روحانی اذیت ہوتی ہے اور جن کا اندازہ اسٹیج پر بیٹھے ہوئے زعما اور اکابر کو (اول تو) ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اگر مجلس مشاعرہ ہے یا کوئی ادبی تقریب ہے تو عین اس وقت جبکہ کوئی شاعر کلام سنانے یا مقرر تقریر کرنے مائک پر کھڑا ہوتا ہے تو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعرا، ادبا یا زعما ٹولیوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ قصہ شروع ہو جائے گی سلام، کلام، خیریت، خیر صلا، شکوے شکایت، ہنسی تفریح اس طرح شروع ہو جائے گی کہ سامعین ان ٹولیوں کی طرف متوجہ ہو جانے پر مجبور ہو جائیں گے اور بیچارہ شاعر یا مقرر گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے خونِ جگر کا رنگ دکھانے کی سعیِ جمیل کرتا رہے گا۔ ہمارے شعرائے کرام اور ادیبوں نے یہ تہذیب کہاں سے سیکھی اور یہ کیوں پیدا کی، یہ نفسیاتی مطالعے کا موضوع بن سکتا ہے۔

میر خوار کو یقین تھا کہ کانگریس جیسی وسیع جماعت کے اجلاس میں اسٹیج پر وقار اور سنجیدگی ہوگی۔ ایسے اجلاس جن میں ہمارے چوٹی کے سیاسی رہنما ڈسپلن، تہذیب اور اخلاق کے معلمین، حکومت کے وزرا اور دوسرے عمائدین جمع ہوں، ایسے اجلاس جن کی کارروائی "دیکھنے اور سننے" کے لئے نہ جانے کتنے غیر ملکی صحافی اور نمائندے اور مدبرین جمع ہوں۔ کم از کم یہاں تو ایسی باتیں نہ ہوں گی، جن سے ہماری تہذیب پر حرف آسکتا ہو۔ مگر افسوس کہ یہاں بھی مایوسی ہوئی یہاں بھی لوگ چار چار پانچ پانچ کی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر حلقے بنا بنا کر اس طرح بیٹھ گئے جیسے اسکول کے میدان میں ڈرل ماسٹر بچوں کو کھیل کھلانے کے لئے بٹھا دے کسی کا منہ دکھائی دے رہا ہے تو کسی کی پیٹھ۔ مندوبین تجویز پر تقریر کر رہے ہیں اور ٹولیاں اپنی اپنی گفتگو میں مصروف و مشغول!

کافی غور و فکر کے بعد میر خوار اس نتیجے پر پہنچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ جلسوں اور مشاعروں کے لئے کچھ اصول بنا لئے جائیں جن کو تسلیم کئے بغیر منتظمین کو جلسے کرنے کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔ اصول یہ ہوں:

(الف) اسٹیج پر صدر، سکریٹری وغیرہ بیٹھنے والوں کی تعداد دو سے تین تک محدود کر دی جائے

(ب) اگر محترم شرکائے جلسہ اور مہمانانِ خصوصی کا روشن ضروری سمجھا جاتا ہو تو اسٹیج پر فرشی نشست پر صوفے یا کرسیاں لگائی جائیں تاکہ "مشورے اور ضروری باتیں" صرف دائیں اور بائیں پڑوسی تک محدود رہ سکیں۔ اس طرح اس انداز نشست کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا جس کا منظر سامنے بیٹھے ہوئے ناظرین کے لئے سخت مکروہ اور قابلِ اعتراض ہوتا ہے۔

(ج) اسٹیج پر فرشی نشست کی مجبوری ہو تو پھر اسٹیج کے عقب یا بازو میں ایسی نشستوں کا انتظام کیا جائے جہاں ممتاز مہمان، شعرائے کرام وغیرہ جا کر بیٹھ سکیں اور دل کھول کر "مشورے اور ضروری باتیں" کر سکیں۔ یہاں منتظمین، چائے پان اور سگریٹ کا بھی خوب وافر انتظام کر دیا کریں۔

تکئے سے یا تکئے پر!

فرشی نشست کی ایک اور خرابی ہے جس کا مشاہدہ کانگریس کے اجلاس میں میر خوار نے بھی کیا اسٹیج پر بے شمار تکئے رکھے تھے۔ پہلے تو یہ سب قرینے سے لگے تھے لیکن جیسے جیسے لوگ آتے گئے ان کی ترتیب میں فرق آتا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں ان کے طریقۂ استعمال میں بھی خاصا اختلاف دکھائی دینے لگا۔ کوئی تکئے سے لگا ہوا تھا۔ کوئی تکیہ لگائے تھا اور کوئی تکئے پر بیٹھا تھا۔ یورپ میں لوگ بستر میں سوتے ہیں اور ہندوستان میں بستر "پر"۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ کرشنا مینن اپنی "جادو کی چھڑی" سے لمبے تکیوں کو گھسیٹتے دکھائی دئے اور کبھی بازو میں رکھے ہوئے جوتوں اور چپلوں کو گویا ایک مداری کی طرح انہوں نے اپنی چھڑی سے پرے تک پھرا دی۔

افسوسناک منظر

جشن کا ایک اہم پہلو بیمار نہرو کی شرکت تھی۔ میر خوار کے خیال میں اہمیت اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے ہر علاقے اور ریاست سے آئے مندوبین نے اپنی آنکھوں سے وزیر اعظم کا آنا جانا اور انہیں بیٹھنے کا تکلیف دہ منظر دیکھا انہوں نے دیکھا کہ بھوبنیشور کی علالت کے بعد سے اب تک ان کے محبوب جواہر لال کی صحت کس منزل پر ہے۔ ان کے منہ سے دبے دبے فقرے یا الفاظ ان کے جذبات کی غمازی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے دل میں نہ جانے کیا کیا باتیں آ رہی ہوں گی!

اور میر خوار نے اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ منظر دیکھا کئی ایسے موقعے آئے جبکہ کافی دیر تک وزیر اعظم تکیہ کا سہارا لگائے یکہ و تنہا خاموش بیٹھے رہے اور دس دس فٹ کے فاصلے تک ان کے پاس فرد واحد بھی دکھائی نہ دیا۔ اور جو اس فاصلے پر بیٹھے بھی تھے ان میں سے بہتوں کی پیٹھ جواہر لال کی طرف تھی وہ آپس کی گفتگو میں اس طرح مصروف تھے جیسے وہاں پر جواہر لال کا وجود نہیں کے برابر ہو۔ آخر اس بے رخی اور سرد مہری کے کیا معنی؟

ایک قیمتی سوانح حیات

ایسے لوگوں نے ماسٹالن کے زمانے کے سماج کو اپنی چالوں سے متوازن کرنے کی پوری کوشش کی۔ درحقیقت انہوں نے اقتصادی تنظیم جدید کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اعلیٰ عہدیداروں کی مراعات ختم کرنے کی مخالفت کی۔ وہ شکوے شکایت پر اُتر آئے انہوں نے خاص طور پر نئی نسل پر الزام لگایا کہ وہ منکر مذہب و اخلاق ہو گئی ہے اور اس کے دل میں انقلاب کی روایتوں کا احترام نہیں رہا ہے۔ چونکہ نوجوان نسل تنگ موری کی پتلون پہن رہی ہے اور جاز موسیقی کو پسند کرتی ہے۔ وہ ہیمنگ وے اور پکاسو کو تعریف بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے اس لئے ان لوگوں کے نزدیک وہ منکر اخلاق ہو گئی ہے اور اُن کے خیال میں وہ بورژوائی جراثیم سے متاثر ہو چکی ہے۔

لیکن درحقیقت نوجوان نسل کیسی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ Cynic (دنیا اور آسائش کے نفرت کرنے والے) ہو گئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ لوگ ایک اخلاقی خلا کے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے چاکلیٹ کھانا۔ تنگ موری کی پتلون پہننا۔ چست سوئٹر پہننا۔ موسیقی کے ریکارڈ جمع کرنا۔ اُس پر راک این رول رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہی چیزیں مغربی کلچر سے قریب لے جاتی ہیں۔ یہ طبقہ ہیمنگ وے اور پکاسو کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اس طبقے نے مغربی اخباروں کی توجہ کو بہت زیادہ اپنی طرف مبذول کیا لیکن یہ طبقہ درحقیقت بہت ہی مختصر سا تھا۔

نوجوان روسی نسل کا بہترین طبقہ شک و شبہات کے سخت لمحات سے برآمد ہوا۔ یہ طبقہ دنیا بیزار نہیں تھا۔ ان کے تجربوں نے اُن کی ہمتوں کو آزمایا اور اُنہیں قوت بخشی۔ اُنہوں نے نہ صرف اپنے والدین کی غلطیوں کے اعادے کی مخالفت کرنے کی ہمت پیدا کی بلکہ اُنہوں نے اپنے باپ داداؤں کے کارناموں کو آگے بڑھانے کا بھی عزم کیا۔ سوویت یونین میں قدیم اور جدید نسلوں کے ان اختلافات کو مغربی اخباروں نے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ میں نے اکثر ایسے کمیونسٹوں کو جو میرے والد کی عمر کے تھے اپنا ہم عصر محسوس کیا ہے جبکہ میرے اکثر ہم عصر مجھے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں معلوم ہوئے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوان رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے روحانی طور پر جوان رہنا۔ یہ نوجوان پن ہی ہے جو میری نسل کے بہترین طبقے اور پُرانی نسل کو اپنی جدوجہد اور کارکردگی میں متحد کئے ہوئے ہے۔ ممکن ہے نئی نسل کا بہترین طبقہ تنگ موری کی پتلونیں پہنتا ہو جاز پر راک این رول رقص کرتا ہو لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُنہیں انقلاب پر یقین رکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ ہیمنگ وے، سیلنگر اور گنگسلے ایمس کو پڑھتے ہیں۔ غیر ملکی تصویریں دیکھتے ہیں ٹینسی سی ولیمس اور آرتھر ملر کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ اور پکاسو کی تصویروں کی نمائش دیکھنے کے لئے طویل قطاروں میں کھڑے رہتے ہیں لیکن یہ تمام چیزیں بورژوا سماج اور کلچر کی غلطیوں پر تنقید کرنے اور خود کے سماج اور کلچر کی بقا کے لئے جنگ کرنے سے نہیں روک سکتیں۔ یہ باتیں صرف یہ اشارہ کرتی ہیں کہ اُن کا ذوق متنوع اور اُن کا ذہنی اُفق وسیع ہو گیا اور یہ ہی بات سے جسے کٹر قسم کے عقیدہ پرست لوگ ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اُنہوں نے بے انتہا کوشش کی ہے حتیٰ کہ بین الاقوامی کشیدگی کو بھی کام میں لایا ہے تاکہ وہ اس عمل کو اُلٹا کر دیں۔

مثال کے طور پر لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ میں بڑی بے عزتی میں زندگی بسر کر رہا ہوں فرانس کے ایک اخبار نے اس بارے میں خوب لکھا لیکن درحقیقت حکومت اور پارٹی نے مجھے کبھی بھی بُرا بھلا نہیں کہا۔ میں صرف کٹر عقیدہ پرست لوگوں کا نشانہ بنا رہا ہوں وہ لوگ میری نظموں کی اشاعت کو روک نہیں سکے۔ میں جو چاہتا لکھتا رہا، اور جہاں چاہتا چھپواتا رہا۔

۱۹۵۶ء میں میری نظم "زیما جنکشن" شائع ہوئی اور اس کے ساتھ "نوئے میرا" میں ایک پُرانے کمیونسٹ کی انتہائی سخت تنقید اُس نظم پر شائع ہوئی۔ لیکن اُسی پرودا نے میری نظمیں چھاپنے کی پیشکش کی۔ نقاد نے مجھ پر شکی اور منکر ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن وہ ہزاروں خطوط جو مجھے ملک کے کونے کونے سے ملے اُن سے صاف ظاہر تھا کہ لوگوں نے میری نظم کو اُسی طرح سمجھا جس مفہوم کو لئے ہوئے میں نے لکھا تھا اور اسی بات کی مجھے سخت فکر تھی۔

میرے دوسرے مجموعے The Highway of Enthusiast پر بہت کم تبصرے ہوئے لیکن وہ فوراً ہی بک گیا اور کتابوں کی دکانوں سے اس کا غائب ہو جانا بہتر

تبصرہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۷ء میں میری نظموں کا ایک سلسلہ جس میں شخصیت پرستی پر حملے کئے گئے تھے۔ Young Guard نامی اخبار کی چھپی ہوئی کاپیاں میں سے چھٹتے رہ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ایڈیٹروں نے میری نظموں پر پھر سے غور کیا تھا۔ ان نظموں کو ایک تنقید نگار نے غیر اخلاقی بتایا تھا۔ لیکن جس دن اخباروں میں تبصرہ چھپا اُسی دن مجھے ایک تار ملا۔ یہ سمندری سفر پر نکلے ہوئے ایک روسی جہاز سے آیا تھا۔

"ہم نے آپ کی نظمیں پڑھیں۔ انہیں جاری رکھئے"

نیچے دستخط کی جگہ لکھا ہوا تھا۔

"جہاز کے ملازمین"

روس کے ایک نوجوان باغی شاعر

یوجنی یوفتے شنکو

کی خود نوشت سوانح حیات

اور میں نے ہمت نہیں ہاری۔

۱۹۵۷ء میں ڈوڈنسوف کی کتاب Not by Bread Alone پر ادیبوں کی یونین میں بحث شروع ہوئی۔ پہلی میٹنگ میں ایک جوشیلے مقرر نے کتاب کے مصنف کو ایک نے "ٹالسٹائی" کا خطاب دیا۔ میں نے اس بے جا تعریف کو پسند نہیں کیا کیونکہ ناول میں کئی فنی غلطیاں تھیں اگرچہ ساتھ ہی اس میں کئی خوبصورتیاں بھی تھیں۔ کچھ دنوں بعد دوسری میٹنگ ہوئی اور اس مرتبہ ڈوڈنسوف "ٹالسٹائی" نہیں رہا تھا بلکہ اُسے سامراج کا ایجنٹ کہا جانے لگا۔ میں ایک ہم عصر ادیب ہونے کی حیثیت سے اُس کی عزت کرتا تھا۔ وہ ایک اچھا شہری تھا۔ اس لئے میں نے اس حملے کی بھرپور مدافعت کی۔

کچھ دنوں بعد مجھے Literary Institute (ادبی ادارے) سے خارج کر دیا گیا کیونکہ میں وہاں کے لیکچروں میں باقاعدہ اور پابندی سے شریک نہیں ہوتا تھا۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ پچھلے چار سالوں سے میں بہت کم لیکچروں میں شریک ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے نوجوان کمیونسٹ لیگ سے بھی نکال دیا گیا۔ مجھے اپنی مدافعت میں کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ مجھ پر بیگانہ اور اُن میں سے ایک نہ ہونے کا الزام تھا۔

اُس وقت زندگی مجھے بہت تاریک نظر آ رہی تھی لیکن میں لکھتا رہا۔ میرے دوست اور میرے پڑھنے والے میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ یہ لوگ مجھے پیار بھرے خطوط اور تحائف بھیجتے رہے۔

مجھے نوجوان کمیونسٹ لیگ میں پھر سے لے لیا گیا اور کچھ دنوں بعد میں Literary Institute میں اس کی شاخ کا سکریٹری بن گیا۔ اس عہدے پر میں چار سال تک فائز رہا۔

لیکن نقاد میری دھجیاں بکھیرتے رہے۔ مجھے "خواب گاہ کا شاعر"، "کم عمر مجرمین کا نظریاتی لیڈر"، "سڑا گلا بورژوائی"، "گندگی کا مطرب"، "گندے نالے کا شاعر" اور "جھوٹا انقلابی" کے خطاب دیے جانے لگے۔

لیکن میں سائبیریا کی مضبوط پیٹھ رکھتا تھا اور پھر اس کے علاوہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں سخت سے سخت الفاظ بھی اب وہ معنی نہیں رکھتے تھے جو پہلے رکھتے تھے۔ میری نظمیں چھپتی ہی رہیں۔ اور میں عوام کو اپنی شاعری سناتا ہی رہا۔

اسی سال میں پہلی بار پاسترناک سے ملا۔

اکثر نوجوان شعرا جو پاسترناک سے ملنے پیریڈل کینو میں اُس کے گھر جاتے تھے کئی دنوں سے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاسترناک مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔ بہترین ملاقاتیں وہ ہوتی ہیں جو اتفاقیہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک دن مجھے رائٹرز یونین کی ہدایات پر اٹلی کے ایک پروفیسر راشپ لینو کو ساتھ لے کر پاسترناک کے گھر جانا پڑا۔

ہم ملاقات کے وقت کا تعین کئے بغیر پہنچ گئے تھے۔

اچانک باغ میں ایک درخت کے پیچھے سے سفید جیکٹ میں ملبوس ایک بھورے بالوں والا شخص جس کی رنگت دھوپ سے کملا گئی تھی نمودار ہوا اور تقریباً مجھ سے ٹکرا گیا۔

"کہو کیسے ہو؟" اُس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ اُس کی بھوری آنکھوں میں حیرت تھی۔ میرا ہاتھ چھوڑے بغیر اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، تم یوفتے شنکو ہو۔ ہاں میں نے تمہیں ٹھیک پہچانا۔ دبلے پتلے، لمبی لمبی ٹانگوں والے۔ ایسا ظاہر کرتے ہو جیسے تم شرمیلے نہیں ہو لیکن میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں کہ ادبی ادارے میں پابندی سے لیکچر سننے نہیں جاتے۔ کیا تمہارے ساتھ جارجیا کا شاعر بیلہ ہے؟ میں جارجیا کے لوگوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔"

(باقی ہے)

راکٹ

شیخ عبدالقادر

کیا آپ نے ربر کے غبارے کو غور سے دیکھا ہے؟ جب ہم غبارے میں ہوا بھرتے ہیں تب وہ ہر طرف سے پھولنا شروع ہو جاتا ہے سائنس دانوں نے اس سے پتہ چلایا کہ اگر ہوا اونچے دباؤ سے کسی برتن میں بھری جائے تو وہ ہر طرف ایک ہی دباؤ سے کام کرتی ہے۔

اوپر کی شکل ایک ایسا برتن ہے جس میں اونچے دباؤ کی ہوا بھر دی گئی ہے۔ یہ ہوا اب۔ ب د۔ د ج۔ اور ج ا بازوؤں پر ایک ہی دباؤ سے کام کرتی ہے۔ اس میں یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ یہ دباؤ ایک دوسرے کو کس طرح متوازن کرتا ہے۔ چونکہ اب پر ہوا کا دباؤ ج د کے برابر ہوتا ہے اس لئے شکل ا ب ج د اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے مطلب یہ کہ یہ حرکت نہیں کر سکتی۔ اگر یہ دباؤ کم زیادہ ہو تو یہ شکل زیادہ دباؤ کی سمت میں حرکت کرتی ہے شاید آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر غبارے میں ہوا بھر کر اُسے ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے تو غبارہ اُس کے منہ کے اُلٹ سمت زور سے پھینکا جاتا ہے۔

غبارے

ا ب ج د ایک غبارہ ہے جس میں ہوا اونچے دباؤ سے بھری ہوئی ہے۔ اگر غبارے کا منہ د بند ہو تب اندر کا دباؤ ہر رُخ میں یکساں رہے گا۔ مثلاً ا اور ج کا دباؤ ایک دوسرے کو متوازن کرے گا۔ اسی طرح ب د کا دباؤ بھی برابر ہوگا اور یہ غبارہ اندر کے ہوا کے یکساں دباؤ کی وجہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ (باہر کی ہوا کی وجہ شاید اس میں حرکت ہو لیکن اندر کے دباؤ کا اثر نہیں ہوگا) اگر منہ د کھول لیا جائے تو ا اور ج کا دباؤ ایک دوسرے کے متوازن ہوگا۔ لیکن ب کا دباؤ د کے دباؤ سے زیادہ ہو جائے گا اور یہ غبارہ ب کی سمت میں زور سے اُڑے گا۔

دیوالی کا راکٹ

سائنس دانوں نے اس اصول کو خیال میں رکھتے ہوئے راکٹ کی ایجاد کی۔ دیوالی کے تہوار پر بارود سے بھرے ہوئے راکٹ شاید آپ نے اُڑائے ہوں گے۔ یہ راکٹ ایک چھوٹی سی ڈبیا ہوتی ہے۔ جس کی ایک طرف ایک چھوٹا سا منہ ہوتا ہے جب اُسے سلگایا جاتا ہے تو اندر کی بارود جلنا شروع ہوتی ہے۔ ڈبیا میں اونچا دباؤ High pressure

بارود جلنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس ڈبیا کا منہ کھلنے کی وجہ سے یہ ڈبیا منہ کے مخالف سمت میں اُڑنا شروع ہوتی ہے۔ یہ اُس وقت تک اُڑتی ہے جب تک بارود جلتی رہتی ہے۔ پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ زیادہ دباؤ کی وجہ سے اندر کی ہوا منہ سے باہر نکلتی ہے اور باہر کی ہوا سے ٹکرا کر اس ڈبیا کو اوپر لیجاتی ہے۔ جیسے ہم تیرتے وقت پانی کو پیچھے ہٹاتے ہیں اور ہم آگے بڑھتے ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا ہے کہ راکٹ کے اُڑنے کی قوت اُس کے اندرونی دباؤ کی کمی اور زیادتی کی وجہ سے ہے نہ کہ باہر کے دباؤ کی وجہ سے۔ اس لئے سائنسدانوں نے پتہ چلایا کہ راکٹ جیسی مشین ہم ایسی جگہ بھی لے جا سکتے ہیں جہاں ہوا نہ ہو۔

چینیوں کی ایجاد

راکٹ کی ایجاد بہت پُرانے زمانے سے ہوئی ہے۔ تقریباً ۷۰۰، ۸۰۰ قبل مسیح میں چینیوں نے بارود سے بھرے ہوئے چھوٹے سے راکٹ اُڑائے تھے جو آج کل ہم دیوالی کے تہوار میں اُڑاتے ہیں لیکن ان اُصولوں کو اچھی طرح کام میں لانے کے لئے ۵۰، ۶۰ سال پہلے ڈاکٹر رابرٹ گوڈارڈ نے جو امریکہ کے طبعیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں، اس پر کام کرنا شروع کیا اور ۱۹۲۶ میں Maskachusettes کے آبرن مقام پر اپنا پہلا کامیاب راکٹ اُڑایا۔

اُس کے بعد راکٹ میں کافی ترقی ہوئی اور دوسری جنگِ عظیم میں جرمنی نے V2 راکٹ اڑا کر کچھ عرصے کے لئے جنگ کا پلڑا اپنی طرف کر لیا تھا۔

۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ

راکٹ دوسری اور مشینوں سے بہت ہی الگ مشین ہے کیونکہ غیر متوازن دباؤ کی وجہ سے وہ اک دم چھلانگ لگا کر اُڑنا شروع کرتا ہے اور دوسری مشینوں سے کئی گنا زیادہ رفتاری سے۔ V2 راکٹ جو آج کل کے راکٹ کے مقابلہ میں بہت چھوٹا راکٹ تھا۔ ۵ ہزار میل کی رفتار سے ایک چھلانگ لگاتا تھا۔ اس میں ۸½ ٹن تیل رکھا جا سکتا تھا اور یہ صرف ۷۰ سکنڈ میں ختم ہو جاتا تھا۔ آج کے راکٹ V2 راکٹ سے ۱۰ یا ۲۰ گنا زیادہ تیل رکھتے ہیں اور اُن کی رفتار تقریباً ۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد راکٹ کے استعمال کا مقصد بہت بدل چکا ہے۔ امریکہ اور روس ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے لئے دفاعی راکٹ بنا رہے ہیں۔ ان دونوں نے چاند پر جانے کی بھی کافی تیاریاں کر لی ہیں اور راکٹ میں جانے کے لئے نئے تیل ایجاد کئے ہیں۔ موٹر کار چلانے کے لئے ہم پٹرول اور ہوا لیتے ہیں۔ چونکہ ہوا کا آکسیجن پٹرول کے جلنے کے لئے مفید ہوتا ہے لیکن راکٹ کے لئے جو فضا سے بھی باہر جاتا ہے آکسیجن ملنا ناممکن ہے۔ اس لئے راکٹ کے اندر گیسولین (لوئی بھی تیل) اور آکسیجن کا پانی پہلے ہی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے۔ آکسیجن گیس چونکہ کافی جگہ لیتی ہے اس لئے −272°F Degrees پر اس کا پانی بنایا جاتا ہے اور یہ راکٹ میں اسٹور کر لیا جاتا ہے۔

تین منزلہ راکٹ

دور اُڑنے والے راکٹ میں گیسولین اور آکسیجن جمع کرنے کے لئے بھی کافی جگہ لگتی ہے اس لئے آجکل راکٹ میں مائع ہائیڈروجن اور Flourine oxidiser کا استعمال ہونا شروع ہوا ہے جو راکٹ کو کافی دور تک لیجا سکتا ہے۔ امریکہ کا سیٹرن راکٹ جو کیپ کنیڈی کے فلوریڈا راکٹ بیس سے اُڑایا گیا ہے جس میں ہائیڈروجن کا پانی تیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

آجکل ایک ہی راکٹ کے ذریعے دور خلا میں جانا مشکل ہونے کی وجہ سے ۲ یا ۳ راکٹ ایک دوسرے کو جوڑ کر اُڑائے جاتے ہیں۔ پہلا راکٹ پہلا اُڑ کر کچھ دور تک جاتا ہے اور الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خود دوسرا راکٹ اُڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تیسرا۔ تیسرا راکٹ یا دو مصنوعی چاند کو دنیا کے اطراف گھمانے کے لئے اُڑایا جاتا ہے۔

عمل ردِّ عمل

اسمٰعیل لطیف

ہر وقت ایک نئی لہر میرے ذہن
ابھرتی اور میں اُس میں بہنے لگتا۔ کچھ عرصے تک
بہاؤ ایک معین رُخ پر ہوتا، پھر ایک اور لہر اُٹھتی اور
ت بدل دیتی، ہر بار دھارا مجھے نئی سمت پر بہانے
ا۔ میری ہستی ان لہروں کے ہاتھوں بے بس ہو کر
ئی تھی۔ میں اپنی ایک راہ پیدا کرنا چاہتا مگر ہر
ے کئی راہیں پیدا ہو جاتیں اور میں بھٹک کر
جاتا۔ اُنہیں اُلجھنوں کی وجہ سے میں ہمیشہ
چین رہا کرتا۔ یہ بے چینی اُس تعلیم کی دین تھی
میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ دے کر حاصل
تھی۔ جو کچھ میں نے کتابوں سے سیکھا، میرے
س کا روگ نہیں تھا۔

زندگی کا روگ دن بدن بڑھتا ہی
چلا جا رہا تھا۔ میں اس بوجھ کو ڈھوتے ڈھوتے
تھک گیا تھا۔ زندگی کا کوئی ساتھی نہ تھا جو سہارا
دیتا۔ کاش مقررہ وقت پر میں اپنی زندگی کے ساتھی
انتخاب کر پاتا۔ مگر اُس وقت یہ میرے اختیار کی
بات نہ تھی کیونکہ میری ذہنی ساخت کچھ اس طرح
تھی کہ میں نے ذمہ داریوں کو سمجھنے کی بھی کوشش
نہ کی۔ ازدواجی بندھنوں کو میں زنجیر سمجھا اور
شادی کی فطری خواہش کو بڑی بے دردی سے کچل
۔ تعلیم نے میرے ذہن میں آزادی کا ایسا تصوّر
کر دیا کہ زندگی کے بعض مسلّم حقائق سے بھی میں
منہ موڑ لیا۔ حقیقتوں سے انحراف کے بعد

زندگی بڑی تیزی ماضی کی اتھاؤں میں گم ہونے لگتی ہے
آج میرے پاس ماضی کے سوا کچھ نہیں، ماضی جو راکھ
کا ایک ڈھیر ہے، جس میں دبی ہوئی چنگاریوں سے
ابھی زندگی میں آگ لگ جاتی ہے۔

جب میری بے چینی بہت بڑھ جاتی تو میں
ساحلِ سمندر پر پناہ لیتا تھا کیونکہ سمندر بھی میری طرح
ہمیشہ بے قرار رہتا ہے اور یوں بھی زندگی کا کوئی کنارہ
نہ تھا۔ سمندر کے کنارے مچلتی ہوئی موجوں کی جھاگ
اور ساحل کی ریت ہوتی ہے۔ ریت اور جھاگ کی مدد
سے بچے گھروندے بناتے اور توڑنے کا کھیل کھیلتے
رہتے۔ میں بھی وہاں بیٹھے بیٹھے اپنے ذہن میں کئی
گھروندے بناتا اور آخر کار اُکتا کر اُنہیں مسمار کر کے
گھر لوٹ آتا۔ ایسے گھروندے بنانے سے کبھی وقتی طور
پر لطف حاصل ہوتا ہے۔

سمندر کے کنارے مجھے ایک روز اپنے
کالج کا ایک پرانا دوست مل گیا۔ یہ وہی دُبلا پتلا
پستہ قد عباس تھا جس میں ایک نمایاں تبدیلی یہ
ہوئی تھی کہ اُس کے چہرے پر گھنی ڈاڑھی اُگی ہوئی
تھی۔

"تم نے یہ ڈاڑھی کیوں رکھ لی؟" میں نے
عباس سے رسمی خیریت پوچھے بغیر ہی یہ سوال کر دیا۔

"میں نے ڈاڑھی کیا رکھ لی گویا اپنے وجود
کو ہی ختم کر دیا۔ جو ملتا ہے پہلے ڈاڑھی کے متعلق
ہی دریافت کرتا ہے۔ چلو تمہیں بھی بتا دوں کہ
میں نے کسی مذہبی جذبے کے تحت ڈاڑھی نہیں رکھی
دراصل اس ڈاڑھی کی وجہ سے میرا احساسِ کمتری
کا جذبہ ختم ہو گیا۔"

عباس نے ڈاڑھی کی غیر مذہبی تشریح خوب
کی۔ میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ عباس نے پھر کہنا
شروع کیا۔

"تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں جسمانی لحاظ
سے کس قدر کمزور اور نحیف تھا۔ مگر مجھ پر جنسی جذبات
کی کیسی شدّت تھی۔ عورت تو میرے اعصاب پر
ہمیشہ طاری رہتی تھی۔ اگر ٹھیک وقت پر عورت
حاصل نہ ہوتی تو میں اعصابی مریض ہوتا اور اب تک
کسی پاگل خانے میں مر کھپ گیا ہوتا لیکن آج اس
ڈاڑھی کے طفیل سے میں چار بچوں کا باپ ہوں۔"

عباس نے اپنی بات ختم کی تو میں سوچنے
لگا کہ انسان کا رویّہ مسرت کے معاملے میں کتنا
عجیب ہوتا ہے۔ وہ اپنی خوشیوں کی خاطر کبھی خدا
کے وجود کو مانتا ہے اور کبھی اپنی مسرتوں کو برقرار
رکھنے کے لئے منکر بھی بن جاتا ہے۔

"کیا سوچنے لگے؟" عباس کے سوال پر
میں چونک پڑا۔

"یہی سوچ رہا تھا کہ اگر ٹھیک وقت پر تمہیں
ڈاڑھی بڑھانے کی ترکیب نہ سوجھتی تو آج تم بھی
میری طرح کنوارے ہوتے۔"

میرے مذاق کے ساتھ ہی میرا لاشعور باہر
آ گیا۔

"تم ابھی تک کنوارے ہو؟" عباس
کے تعجب نے مجھے سنجیدہ بنا دیا۔

"ہاں"۔ جواب میں میرے پاس صرف ایک
ہی لفظ تھا جس میں میری حسرتیں اور نامرادیاں سمائی
ہوئی تھیں۔

"چھوڑو ان فضول باتوں کو، ہم ایک زمانے
کے بعد ملے ہیں۔ آؤ اس اچانک ملاقات کو رنگین بنائیں۔"

عباس کا مطلب بار میں چلنے کا تھا وہ مجھے پکڑ کر قریب کے ایک بار میں گھس پڑا۔

"تم بھی شراب پیتے ہو؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

عباس نے غیر ضروری قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"میرے یار کچھ لوگ حقیقتوں کو فراموش کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں اور میں حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے پیتا ہوں۔"

نشے کے عالم میں تم پر کون سے حقائق واضح ہوتے ہیں۔؟"

میں نے عباس کی منطق سمجھنا چاہی۔

"تم ابھی تک طالبعلموں کی طرح سوالات کرتے رہتے ہو۔ میرے بھائی نے نوشی سے انسان میں صرف نشہ ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان میں جرأت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حقیقتوں کو سمجھنے کیلئے جرأت چاہئے ورنہ تمہاری طرح فرار کی عادت اختیار کرنی پڑتی ہے۔"

عباس کا طنز میرے ذہن کی گہرائیوں میں چبھتا چلا گیا اور میں مزید کچھ کہے بغیر اُس کے گلاس میں شراب اُنڈیلنے لگا۔

"تم کس حد تک پیتے ہو؟" گلاس بھرتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا۔

"اس حد تک کہ شراب مجھے پینا نہ شروع کر دے۔" عباس نے میرے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا "انسان اپنے آپ کو پیتا رہے، اس سے بہتر تو یہ ہے کہ شراب ہی اُسے پی لے۔" میں عباس کی کمزور رگ ٹٹولنے لگا۔

"اپنے آپ کو پینا ہی تو زندگی کا اصلی سرور ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کر سکتے اُنہیں مایوسیاں نگلتی رہتی ہیں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مایوسیاں اپنی ہوتی ہیں اور خوشیاں دوسروں کی حق تلفی سے حاصل ہوتی ہیں۔" میں نے اپنے وار کو تیز کرنے کے لئے کہا۔

"ہر حصول کے لئے حق تلفی لازمی ہے۔ دنیا کے دینے کے جذبے میں پانے کا مفاد ہی چھپا ہوتا ہے یہاں تک کہ مجھے تو قدرت کی بخششوں میں بھی انتقام کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔"

عباس کے فلسفے سے اُکتا کر میں نے اس سلسلے سے رہائی حاصل کرنے کے لئے کہا۔

"تم تو اچھے خاصے فلسفی بن گئے ہو۔"

"تمہارا خیال غلط ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں فلسفہ، ریاضی، منطق وغیرہ جیسے درسی مضامین کچھ کام نہیں آتے۔ انسان اگر اتنا جان لے کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں تو سمجھو کہ زندگی گزارنے کے بہترین گُر سے اُس نے واقفیت حاصل کر لی۔ میں نے اُن تمام باتوں کو بھلا دیا جو میں نے کتابوں سے سیکھی تھیں۔"

عباس نے زندگی کے معیار کو کتنا گھٹا لیا تھا۔ دو اور دو چار ۔۔ کیوں کہ وہ چار بچوں کا باپ بن چکا تھا، وہ ہر بات باپ کے روپ میں سوچ اور سمجھ رہا تھا۔

مجھے اس روپ سے سخت نفرت تھی اس لئے میں نے بیزار ہو کر یہ ملاقات جلد ختم کر دی اور گھر لوٹ آیا۔

میں نے عباس کی تمام باتوں کو بھلا دیا لیکن اُس کی داڑھی میرے ذہن پر بُری طرح چھا گئی، اور آہستہ آہستہ میرے چہرے پر بھی چھانے لگی۔ میں عباس کے عمل کا ردِ عمل اپنی ذات پر دیکھنا چاہتا تھا اسی لئے میں نے بھی داڑھی رکھ لی۔

آفس میں میری داڑھی سے کچھ عرصہ تک کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد ہماری نئی ٹائپسٹ نجمہ مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جن میں محبت جھلک رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب عمل کا ردِ عمل ہو رہا ہے۔ میں نجمہ کے بارے میں زیادہ سوچنے لگا۔ پہلے مجھے تجربوں پر یقین نہ تھا۔ اب میں تجربوں کا قائل ہو گیا۔

ایک دن نجمہ نے مجھے آفس کا وقت ختم ہونے کے بعد ٹھہرنے کے لئے کہا تو میرے لئے گزرتا ہوا وقت تھم گیا۔ اُس دن میں ہمیشہ کی طرح تیز رفتار ماضی کی راہوں میں گم نہیں ہونے لگا۔ کسی نہ کسی طرح آفس کا وقت ختم ہوا اور سب لوگ چلے گئے تو نجمہ میری میز کے قریب آئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرا وجود سراپا انتظار بن گیا۔ میرے کان اُس کی آواز کے منتظر تھے۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"آج میں نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میں نوکری چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ جب میں یہاں نئی نئی آئی تو اُس وقت میرے لئے ہر چیز نئی نئی تھی لیکن آپ سے مجھے اجنبیت محسوس نہ ہوئی کیونکہ آپ کے چہرے کی سنجیدگی نے مجھے آپ سے متعارف کرا دیا۔ مجھے تو ایسا لگا، جیسے میں آپ کو جنم جنم سے جانتی ہوں۔ پھر ادھر کچھ دنوں سے آپ کے چہرے پر داڑھی بڑھنے لگی اور وہ دلکش سنجیدگی گھٹنے لگی مجھے لگا جیسے آپ نے ایک نقاب اُتار دیا اور دوسرا چڑھا لیا۔ آپ تو بہروپئے نکلے۔ مجھے دکھ ہے کہ میں نے دھوکا کھایا۔ مجھے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ مرد اپنے چہرے پر داڑھی کی طرح سنجیدگی اور معصومیت بڑی آسانی سے رکھ لیتے ہیں۔ اور اپنی اصلیت کو چھپا دیتے ہیں۔ میں نے آج آپ سے اسی لئے ملاقات کی تاکہ آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کر دوں اور آپ زندگی میں مزید روپ بدلنے کی کوشش نہ کریں۔"

وہ یہ کہہ کر چلی گئی اور میں پتھر کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آج میں اُبھرتی ہوئی لہروں میں بہنے کی بجائے غرق ہونے لگا ہوں۔"

خطوط

جیلانی بانو ـــــــــــ حیدرآباد

...... دورِ حیات کی زندگی کا تو مجھے ایک عرصہ سے علم نہیں
بہرحال یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کوئی فرمائش کریں اور میں پوری نہ
دوں ۔ جلد ہی کچھ بھجواؤں گی ۔

انور معظم ـــــــــــ حیدرآباد

...... دورِ حیات بے شک کبھی کبھی نظر آتا ہے لیکن اُس کا حلیہ دیکھ کر
اس کی صحت کے بارے میں تشویش لاحق ہو رہی ہے ۔ تعجب اس پر ہے کہ بمبئی
سا ایک ہفتہ ایسے حالوں میں کیونکر رہ سکتا ہے اور پھر دورِ حیات پر کئی برس
گزرنے کے بعد بھی ۔

.... دوسرا نکتہ یہ کہ شاعری تین سال سے بند ہے ۔ اب تو اُسے
بھی کا انتظار کر رہا ہوں ۔ شاعری کیا ، ایک دو ریڈیو ڈراموں کے علاوہ
و تین سال سے کچھ نہیں لکھا ۔ ایک طنزیہ مضمون ہے کہو تو بھیج دوں ۔

نریش کمار شاد ـــــــــــ نئی دھلی

آج ہی تین چار دن کے بعد بمبئی سے یہاں پہنچا ہوں تو آپ کا
نوازش نامہ نظر نواز ہوا ۔ بمبئی میں اگرچہ آپ سے اور واجدہ سے ملنے کا
آرزو مند تھا لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے نہیں مل سکا ۔ دورِ حیات واقعی مجھے
تقریباً باقاعدگی سے مل رہا ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں خواہش کے باوجود
اس میں باقاعدگی تو درکنار بے قاعدگی سے بھی نہیں لکھ رہا ہوں ۔ بہرکیف
آپ کے لطیف الفاظ میں آپ کی "خوش قسمتی" کی خاطر اب "مالی نقصان" بہت
جلد برداشت کرنے کا وعدہ کرتا ہوں ۔

ندا فاضلی ـــــــــــ اندور

سنجیدہ ادبی محفلوں میں دورِ حیات کا ذکر اکثر سنا ۔ کبھی کبھی
جو آپ کے "حُسنِ بے پروا" کا) دیکھنے کو بھی ملا ...

ہر بار خوب سے خوب تر کا احساس ہوا

اُردو رسائل کی لمبی چوڑی بھیڑ میں دورِ حیات نے جلد ہی اپنے کو
پہچانوا لیا ہے ! ایڈیٹروں کی جا و بیجا قصیدہ خوانی لکھنے والے "بونے پن" کا غماز
ہوتی ہے ۔ میں آپ کی تعریف بالکل نہیں کروں گا ۔ برنارڈ شا نے کہا بھی ہے کہ
کسی کے منہ پر اُس کی تعریف کرنا قتل کرنے کے مترادف ہے ۔

زیرِ نظر شمارے میں سب تو نہیں ! ہاں کچھ غزلیں ضرور پڑھنے کے
لائق ہیں ۔ عزیز جاوید ، فیضی وغیرہ کی غزلوں کا لب و لہجہ خوبصورت ہی نہیں
appealing بھی ہے ۔ آج کل کے بیشتر شعراء "نئے پن" کو صرف "فورم"
کے تجربوں تک ہی محدود کئے ہوئے ہیں ، . . . جو سراسر غلط فہمی ہے ۔

آج کی تخلیقات میں مشینی عہد کے نفسیاتی Complex کا
عکس و تجزیہ ضروری شرط ہے ۔ صرف "پرندہ اور پیڑ" کہہ دینے سے بات نہیں
بنے گی ۔ غزل ہو یا نظم ۔ نئے انسان کے خد و خال نمایاں طور پر نظر آنا چاہئے اور
میرے خیال میں یہی ایک کسوٹی ہے جس سے نئے اور پرانے کا فرق پہچانا جا سکتا ہے
کلاسکی ادب کے ٹھہراؤ اور سنجیدگی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے ۔ ہندی
کے نقاد اچاریہ نند دُلارے باجپئی نے پتے کی بات کہی ہے ۔

" نو ینتا لائیے لیکن اپنی وراثت سے منہ نہ موڑیئے "

معاف کیجئے "کلامِ جگر میں عصری رجحانات" دورِ حیات ایسے معیاری پرچے
میں شائع ہونے کے بالکل لائق نہیں تھا ۔ آپ تو اچھے پڑھے لکھے شاعر ہیں ۔ "بونے ،
ادیبوں" کی ایڈیٹرشپ میں اگر کوئی ہلکی چیز نظر آئے تو درگذر کی جا سکتی ہے مگر آپ ؟ ۔

غزل کے یہ شعر رپٹ لکھوانے والوں کو سُنا دیجئے ۔

یہ نقدِ دل و جاں بھی عوض اس کا نہیں ہے ۔۔۔ کس مول کا رکھتا ہے وہ سامان کہوں کیا

گر کیجئے شکایت کبھی اُس شوخ سے کوئی ۔۔۔ اُلٹا ہی تراشے ہے وہ بہتان کہوں کیا

تمہارے گیتوں کو آہنگِ درد کیا ملتا ۔۔۔ تم انجمن سے سدا دُور دُور گاتے رہے

رؤف آذر کی کیمسٹری کام کی چیز ہے ۔ ابراہیم رنگلا نے آج کے نئے ذہن کی ترجمانی
کی ہے ۔

اور ہاں "ایک قیمتی سوانح حیات" واقعی قابلِ قدر ہے ۔ اس سلسلہ
کو جاری رکھئے ۔

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی

جلد ۳ — ۲۰ مئی ۱۹۶۴ء — ۱۴
یکم جون ۱۹۶۴ء — شمارہ ۱۵

اس شمارے میں

قیمت: فی پرچہ — پچاس نئے پیسے
سالانہ — بیس روپے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

اب کی بار

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو ہندوستان کی زندگی کا ایک زریں دور ختم ہو گیا۔

اس تاریک دن کی سیاہ دوپہر نے ہمارے آسمان کے ایک ایسے آفتاب کو کھا لیا جس کی شعاعیں ۵۰ سال تک ہمیں زندگی بخش حرارت دیتی رہی تھیں۔

وہ رات کس قدر بھیانک بن کر آئی جب ہماری زندگیوں سے ایک ایسا ماہتاب روپوش ہو گیا جس کی نرم اور ٹھنڈی کرنیں شبنم کی طرح نازک اور مکھن کی طرح ملائم تھیں

اپنے محبوب وزیر اعظم کی موت پر دورِ حیات بھی خون کے آنسو بہا رہا ہے اور قوم کے اس عظیم غم میں برابر کا شریک ہے

ہفت روزہ

دوستانہ حیات

پریس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

جلد ۳ | ۱۰ جون ۱۹۶۴ء | شمارہ ۱۶

اس شمارے میں

قیمت

فی پرچہ : تیس ۳۰ نئے پیسے

سالانہ : دس روپے

ایڈیٹر

مظہر حسین

ان دس دنوں میں
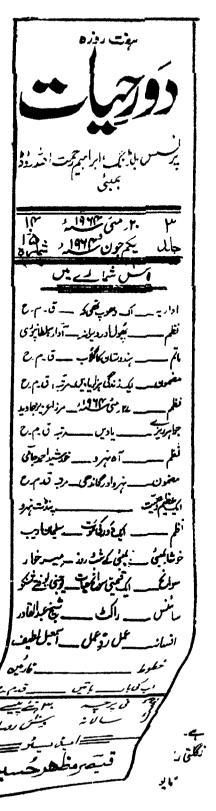
- الٰہ آباد کے سنگم میں بہانے کے لئے مرحوم وزیر اعظم پنڈت نہرو کی راکھ شانتی گھاٹ سے جمع کی گئی۔
- کمیونسٹ پارٹی کے بائیں بازو کے گروپ نے مطالبہ کیا ہے کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی واپس لے لی جائے۔
- صدر ایوب نے کہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا کنفیڈریشن ایک ناممکن چیز ہے۔ اس سے دونوں ملکوں کو نقصان پہنچے گا۔
- لال بہادر شاستری ہندوستان کے وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔
- مرحوم وزیر اعظم پنڈت نہرو نے اپنی وصیت میں کہا ہے کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے تعلق سے کسی بھی قسم کی مذہبی رسومات نہ کی جائیں۔
- اٹارنی جنرل نے رائے دی ہے کہ ڈپٹی منسٹر نین انس مسز تارکیشوری سنہا کے خلاف بدعنوانیوں کی چھان بین کرنے کے لئے کافی مواد موجود ہے۔
- نئے وزیر اعظم شاستری نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہر معاملے میں پنڈت نہرو کے نقش قدم پر چلیں گے۔
- کچھ واڑی کے ایک گاؤں جواہر نگر کے لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ مرحوم وزیر اعظم نہرو کے غم میں گاؤں میں ایک سال تک کوئی شادی کی تقریب نہیں ہوگی۔
- امریکہ کے ایک سائنس دان نے اعلان کیا ہے کہ امریکہ مئی ۱۹۶۸ء تک چاند پہ پہنچ جائے گا۔
- پرجا سوشلسٹ اور سوشلسٹ پارٹیاں ایک دوسرے میں ضم ہو گئی ہیں اور ایک نئی پارٹی سمیکتا سوشلسٹ پارٹی ظہور میں آئی ہے۔
- فیروز آباد کے اسٹیشن پر مرحوم وزیر اعظم کی راکھ کے درشن کرنے کے لئے اس قدر ہجوم ہوا کہ ۴ آدمی مجمع میں کچل کر مر گئے۔

●

حرمت الاکرام

خضرِ رہگذر

پنڈت جواہر لال نہرو کی مرگِ ناگہاں پر

سب آج تیرے لئے سوگوار ہیں نہرو
کہ گلستاں سے چلا روٹھ کر تو صورتِ بو
ہیں تیرے چاہنے والے اجل پہ چیں بہ جبیں
کہ اس نے لوٹ لیا لیلیٰ وطن کا سنگار
کہ اس نے چھین لیا زندگی کے دل کا قرار
کہ اس نے توڑ دیا اک منارۂ زریں
لرز رہی ہے افق پر طلوعِ نو کی کرن
وفورِ غم سے نگوں سر ہے ارتقا کا شعور
اجل نے ڈال دیا زندگی کے رخ پہ کفن
یہ کیسی سوچ میں غلطاں ہے عظمتِ جمہور
سلگ رہا ہے جنوں خیز نکہتوں کا عشق
چلی گلابوں کے تن سے رنگ و بو کی دھن
ہمالہ کہتا ہے، میرا صدی صدی کا غرور
اجل اک آن میں توڑے گی، یہ نہ جانا تھا
مجھی سے بیر تھا، میرا ہی سر جھکانا تھا!

بھڑک کے رہ گئے نہرو کہ شمعِ راہ گزر
ہوئی ہے اس طرح گل جیسے روشنی نہ رہی
سیاہیوں میں ہے گم کائناتِ فکر و نظر
وہ اک تصورِ فردا جسے لگا کے گلے
کسی کے سوختہ ساماں تمام رات جلے
خفا خفا سا ہے جیسے بکھر ہی جائے گا
یہ ایک اجنبی لمحہ، یہ ظلمتوں کا سفینہ
نگاہ کون سی اس لمحے سے ملائے گا؟

یہ کس کا سوگ مناتی ہے وقت کی تقدیر؟
کبوترِ امن کے کیوں رک گئے فضاؤں میں؟
سمٹتے جاتے ہیں کیوں ان کے نقرئی بازو؟
(غبار لبوں پہ اچھالا یہ کس نے دل کا لہو؟)
مذاقِ زیست بھٹکتا ہے کیوں خلاؤں میں؟
فغاں کہ مجلسِ اقوام کا دھڑکتا دل
ہے سرد سرد سا اس طرح جیسے برف کی سل
ہر اک ہے سکتے میں کیسا یہ قہر ٹوٹ پڑا!

یہ ایک رسمِ جہاں ہے کہ کوئی فخرِ جہاں
کوئی عظیم مدبر، کوئی بڑا فنکار
وطن کا کوئی جواں بخت کوئی نکتہ طراز
کئے ہوں جس کی نگاہوں نے فاش وقت کے راز
کوئی کبیر، کوئی میر، کوئی شوپنہار
کوئی سوباش، کوئی گاندھی، کوئی شیکسپیر
کوئی سروجنی، کوئی رفیع، کوئی ظفر
جلا کے فکر و تدبر کے ضو فروش دیئے
وداع ہوتا ہے جب آخری سفر کے لئے
تو چیخ پڑتی ہے نوعِ بشر کہ یہ کیا ہے!
ہمارے ساتھ اجل کا یہ کھیل کیسا ہے؟

ترے لئے بھی اسی طرح غم کا اک طوفاں
بساطِ خاک پہ ہر دل میں ہے شرار فشاں
ہر اک کے ہونٹوں پہ ہے شکوۂ اجل تاحال

مگر حیات نہیں ہے فقط طلسمِ نفس
نہیں یہ محض عناصر کا ایک رنگ محل
حیات اس کے سوا بھی کچھ اور ہوتی ہے
نہ چھو سکے جسے زنہار اجل کا دستِ ہوس
بجا کہ عام ہے فرشِ زمیں پہ رقصِ اجل
بلند تر ہے مگر نغمۂ حیات کی لے
یہ ایک راز جو تاریخ کی امانت ہے
مجاہدوں کے دہکتے لہو کی قیمت ہے
وہ سرفروش اجل سے خراج لیتے ہیں
سفینہ اپنا جو دل کے لہو میں کھیتے ہیں
اجل کا زہر بڑا خوش مزہ بھی ہوتا ہے
اجل کے جام میں آبِ بقا بھی ہوتا ہے
اجل ہزار سہی دشمنِ وفا لیکن
ہر اک پہ سحر چلے اس کا، یہ کہاں ممکن
یہ آدمی کی ہے فطرت، اجل سے ڈرتا ہے
مگر اجل کا نشانہ خطا بھی کرتا ہے
چلایا تجھ پہ بھی دستِ اجل نے تیر مگر
تری حیات کا جوہر فنا پذیر نہ تھا،
ترے وجود کے حق میں یہ تیر ہی تھا سپر
یہ تیر تجھ کو حیاتِ دوام بخش گیا

بنا دیا ہے تری موت نے امر تجھ کو
حیاتِ خضر ملی، خضرِ رہگذر تجھ کو

"خاکستر"

(پنڈت جواہر لال نہرو کی وصیت)

مجھے اس دیس کے لوگوں نے اتنا پیار بخشا ہے
کہ میرے جسم میں اس کی حرارت رقص کرتی ہے
مجھے ہر گام پر لوگوں نے عزت دی محبت دی
مرے الفاظ جس کی ماہیت سمجھا نہیں سکتے
یہ مانا مجھ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے پایا ہے
محبت کا یہ تحفہ اور عقیدت کا یہ سرمایہ
مگر مجھ تک تو ہم وطنوں کے اتنے پیار پہنچے ہیں
کہ میں جذبات کی شدت سے کچھ بھی کہہ نہیں سکتا
بدل اس پریم کا کیا ہو؟ صلہ اس پیار کا کیا ہو؟

مری خواہش ہے اپنے دیس پہ میں خونِ دل چھڑکوں
مری خواہش ہے میرا دیس ہو آزاد بندھن سے
وہ بندھن جن میں تفریق و عداوت کارفرما ہوں
وہ زنجیریں جو جسم و روح کی بالیدگی روکیں
وہ بندھن جو بہاروں کی فسوں زا تازگی روکیں
تمنا ہے یہ زنجیریں یہ بندھن کٹ کے گر جائیں
تو بغض و نفرت سے وطن آزاد ہو جائے

مگر ـــ ارمان یہ بھی ہے کہ ہم بھولیں نہ ماضی کو
کہ یہ میراث ہے اپنی، بڑی ہی بیش قیمت ہے
یہ ورثہ ہے محبت اور تہذیب و تمدن کا
مرے دل کی صدا یہ ہے نہ ٹوٹے رشتۂ الفت
رہے یہ روشنی قائم، رہے یہ سلسلہ قائم

مری یہ آرزو ہے جب میں مر جاؤں تو ہم وطنو!
چتا کے آتشیں شعلوں میں تم مجھ کو جلا دینا
مرا یہ جسمِ فانی راکھ کا جب ڈھیر ہو جائے
تو خاکستر اڑا دینا وطن کی ان فضاؤں میں
چھڑک دینا اسے کھیتوں میں تاکہ جزو بن جائے
وطن کی پاک مٹی کا ـــ جدا ہونے نہ پائے

مری کچھ راکھ کو سنگم کے پانی میں بہا دینا
کہ اس پانی سے میں بچپن سے الفت کرتا آیا ہوں
مری وابستگی اس سے ابھی تک یونہی قائم ہے
مجھے گنگا پیاری ہے کہ اس کے بہتے پانی میں
مجھے اس دیس کی تہذیب کی تصویر ملتی ہے

یوسف ناظم

دورِ حیات بیتی ۱

جواہر ریزے

جنوبی ہندوستان کے دورے کے موقع پر پنڈت نہرو مدراس کے قریب ایک جلسے میں تقریر کرنے جا رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے اُن کا درشن کرنے کے لئے جگہ جگہ اُن کی کار روکی۔

ایک جگہ جب کار روکی گئی تو پنڈت نہرو نے دیکھا کہ قریب ہی ایک بوڑھا بہت سارے غبارے لئے بیٹھا ہے۔ پنڈت نہرو اُس کے پاس گئے اور انتہائی محبت سے اپنا ہاتھ اُس کے گرد ڈال دیا۔

اُنہوں نے غباروں کی قیمت پوچھی ہر غبارے کی قیمت دو آنے تھی۔

پنڈت نہرو کی جیب میں اُس وقت پیسے نہیں تھے۔ دراصل وہ اپنی جیب میں پیسے رکھتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے سٹاف کے ایک شخص سے ۲۰ روپے قرض لئے۔

اُنہوں نے اُس بوڑھے کو روپے دے کر سارے غبارے لے لئے اور آس پاس جو بچے جمع ہو گئے تھے وہ غبارے اُن میں تقسیم کر دئے۔

○

مئی ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ میں ایک زبردست جلسہ تھا جس کی صدارت پرشوتم داس ٹنڈن کر رہے تھے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی پنڈت نہرو کو دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑ رہے تھے اور مجمع قابو سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ لوگ نعرے لگانے لگے۔ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام درہم برہم ہو گیا اور مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔

پنڈت نہرو مجمع کی بدنظمی دیکھ کر انتہائی غصے میں آ گئے اور اپنی چھوٹی سی چھڑی لے کر اسٹیج کے قریب لوگوں میں گھس پڑے۔ حفاظتی دستے کے ایک آدمی نے پنڈت نہرو کو اس طرح مجمع میں گھستے دیکھ کر اس خطرے کا احساس کیا جو پنڈت جی کو لاحق ہو سکتا تھا۔ وہ جھٹ اُن کے پیچھے دوڑا اور دونوں ہاتھ اُن کی کمر میں ڈال کر انہیں پوری قوت سے پیچھے کھینچنے لگا۔ پنڈت نہرو خود کو اُس کی آہنی گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کرنے لگے اور دونوں میں باقاعدہ جھپٹ ہونے لگی۔ حفاظتی دستے کا آدمی بہرحال تگڑا تھا۔ اُس نے پنڈت جی کی لاکھ زور آزمائی کے بعد بھی اُنہیں اپنی گرفت میں جکڑے رکھا۔ آخرکار پنڈت جی تھک گئے اور انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی تم جیتے لیکن اب تو میرا پیچھا چھوڑو"

○

پنڈت نہرو بہت صبح اُٹھنے کے عادی تھے۔ جب وہ سرکاری دورے پر ہوتے یا الکشن کے جلسوں میں شریک ہوتے تو اُن کی مصروفیت اور بڑھ جاتی اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ وہ ۲۴ گھنٹوں میں ۱۸ گھنٹے کام کرتے تھے۔

انتخابی جلسوں میں اُنہیں کھانے کے بعد چند منٹ آرام کرنے کا بھی مشکل ہی سے وقت ملتا۔ سفر کی صعوبتیں۔ پروگرام کی زیادتی۔ ملنے والوں کی بھیڑ اور حکومت کے پریشان کر دینے والے مسائل نے اُن کے مزاج کو جو بنیادی طور پر شاعرانہ تھا کچھ چڑچڑا بنا دیا تھا۔ لہٰذا نتیجے کے طور پر اُن کا مزاج کچھ باغیانہ قسم کا ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔

اُن کے ہمراہ ہمیشہ اخباری رپورٹروں اور فوٹوگرافروں کا ہجوم رہتا تھا۔ فوٹوگرافر اُن کی ہر حرکت اور ہر ہر موڈ کی فوٹو لیتے۔ پنڈت نہرو پہلے تو بُرا منہ بناتے پھر غراتے اور آخرکار بُری طرح جھڑک دیتے۔

لیکن جو لوگ اُن کی طبیعت سے واقف تھے وہ اُنہیں رام کرنا بھی جانتے تھے۔ ایک انتخابی جلسے میں ایک فوٹوگرافر نے پنڈت نہرو کو انتہائی غصے کے عالم میں پایا۔ وہ بار بار لوگوں اور پریس کے رپورٹروں پر بھڑک رہے تھے۔ فوٹوگرافر تجربہ کار تھا۔ اور ۱۲ سال سے پنڈت نہرو کے ہر سفر میں ساتھ رہا تھا۔ وہ سیدھا پنڈت نہرو کی طرف بڑھا اُن کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی جیب سے ایک سُرخ گلاب نکال کر اُن کی شیروانی میں ٹانک دیا۔

پنڈت نہرو کا غصہ اک دم ختم ہو گیا چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اُنہوں نے فوٹوگرافروں کو تصویر کھینچنے کی اجازت دیدی ❀

یوجینی یوفتے شنکو

ایک قیمتی سوانح حیات

میں نے کہا کہ یہ جارجیا کا شاعر نہیں ہے بلکہ اٹلی کا ایک پروفیسر ہے۔ میں نے بعد میں مکمل تعارف کرایا۔

'بہت اچھا۔ یہ بھی بہت اچھا ہے۔ میں اٹلی والوں کو بھی بہت چاہتا ہوں اور تم لوگ بالکل ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ کھانا تیار ہے آؤ میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی!'

اور پھر یہ ملاقات بہت بڑی سادہ اور خوشگوار بن گئی۔ ہم جلد ہی مرغ کھانے اور برانڈی پینے بیٹھ گئے۔

دیکھنے میں پاسترناک ۴۷ یا ۴۸ سال کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پوری شخصیت بڑی دلخوش کن اور بڑی شگفتہ اور تروتازہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک پھولوں بھری شاخ ہو جسے ابھی تراشا گیا ہو اور جس پر صبح کی نرم شبنم تھرک رہی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے پورے جسم پر روشنی کھیل رہی ہو۔ اس کے ہاتھوں کی چہکتی ہوئی حرکت سے لے کر اس کے معصوم چہرے تک جس پر بچوں کی سی مسکراہٹ تھی ایک نور سا پھیلا ہوا تھا لیکن اس میں تھوڑی سی اداکاری بھی شامل تھی۔

یہ واقعی بڑی روحانی جرأت کا کام تھا کہ اس نے اس تمام عرصے میں جبکہ مسکراہٹ کا موقع اور مقام نہیں تھا اپنی مسکراہٹ برقرار رکھی۔

اور شاید یہی اس کا بہترین دفاع تھا۔

لوگ پاسترناک سے ایک آدمی کی طرح متاثر نہیں ہوتے تھے بلکہ ایک رنگت، ایک خوشبو اور ایک آواز کی طرح متاثر ہوتے تھے۔

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آج میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک چھت بنانے والا جسے میں جانتا تھا مجھ سے ملنے آیا۔ اس نے جیب سے ایک شراب کی بوتل اور کباب نکالے اور کہا۔

"میں نے کچھ دن پہلے آپ کی چھت کی مرمت کی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کون ہیں۔ اب مجھ سے چند شریف لوگوں نے کہا ہے کہ آپ سچائی کے علمبردار ہیں۔ اس کے بارے میں ایک تقریب لازمی طور پر ہونی چاہیئے۔ آئیے اس خوشی میں ہم کچھ پئیں۔"

ہم نے شراب پی۔ کچھ دیر بعد اس نے مجھ سے کہا۔

'اب آپ ہماری رہنمائی کیجئے۔'

پہلے میں اس کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا۔

'میں کس چیز کے لئے تمہاری رہنمائی کروں؟'

'سچائی کے لئے جنگ کرنے آپ کو ہماری رہنمائی کرنی ہوگی۔'

"اب آپ لوگ جانتے ہیں کہ میرا ارادہ کسی کی بھی اور کسی کام کے لئے بھی رہنمائی کرنے کا نہیں ہے۔ میرے خیال میں شاعر ایک درخت ہے وہ ایک جگہ ساکت کھڑا رہتا ہے اور اپنے پتے سرسراتا رہتا ہے۔ اس سے رہنمائی کی توقع بیکار ہے۔"

اس نے ترچھی نظروں سے ہمیں دیکھا اور کہا۔

'خیر آپ کا خیال کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے یا نہیں ہے کہ شاعر ایک پتے سرسرانے والا درخت ہے اور کسی بھی معاملے میں کسی کی رہنمائی نہیں کرتا۔'

پھر اس نے مجھ سے چند نظمیں سنانے کی خواہش کی۔ میں نے Wedding پڑھی جو اسے کوئی خاص پسند نہیں آئی۔ پھر میں نے prologue پڑھی اور اس نے یہ پسند کی جب اسے ایک خاص شعر پسند آیا تو اس نے بچوں کی طرح تالیاں بجائیں۔ وہ بے چینی سے اپنی کرسی پہ پہلو بدلتا رہا اور جب میں نے نظم ختم کی تو وہ مجھ پر جھپٹ پڑا اور مجھے گلے لگایا۔ میں کچھ مایوس ہوا کیونکہ مجھے پاسترناک کا ذوق کچھ مشتبہ معلوم ہوا۔ prologue پہلی نظم کے مقابلے میں ذرا سطحی اور بناوٹی تھی لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میں غلطی پر تھا۔ ہم جب کچھ دنوں بعد دوسری بار ملے تو میں نے اسے اپنی نظم Loneliness سنائی۔ وہ نظم سن کر رونے لگا۔ جب میں نے نظم ختم کی تو اس نے کہا۔

'تم نے یہ نظم میرے بارے میں لکھی ہے میرے بارے میں اور ہم سب کے بارے میں۔"

پاسترناک کسی موڈ کا آدمی ہے اور اس نے prologue اس لئے پسند کی تھی کہ اس وقت یہ نظم اس کے موڈ کے عین مطابق تھی۔

ایک دن میں نے ان چار ملاقاتوں کا ذکر تفصیل سے لکھوں گا جب میں پاسترناک سے ملا۔ آخری بار جب میں اس سے ملا تو جدا ہوتے وقت اس نے بڑی گرمجوشی سے مجھے لپٹایا اور روسی رواج کے مطابق میرے خوب پیار لئے۔ اس کے ہونٹوں میں گلابوں کی خوشبو تھی۔

وہ ایک معصوم اور سیدھا سادھا آدمی تھا۔

اس لئے مغرب کے ان لوگوں کی حرکات انتہائی مجرمانہ تھیں جنہوں نے اس کا نیک نام سرد جنگ کے لئے استعمال کیا اور اس سے زیادہ قابلِ مذمت ہمارے ان ادیبوں کی کوشش تھی جنہوں نے اس کا نام ہمارے ادب سے مٹانا چاہا۔

یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اسے اپنے ملک سے محبت تھی اور اس کا مقصد ہرگز اسے بدنام کرنا نہیں تھا۔ کئی چیزیں ایسی تھیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ ایسا نہیں کہ وہ سمجھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ اپنی سادگی سے وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔

ہماری زندگی کے کئی واقعات اسے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے وہ وقت کی ندی کے دوسرے کنارے پر واقع ہو رہے ہیں۔ اس کی نگاہیں اس دھند کو چیر کر جو ندی پر ڈول رہی تھی۔ کئی چیزوں کو بالکل صاف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کی outlines شفاف تھیں اور اکثر چیزیں دھند کی وجہ سے بالکل ہی چھپ گئی تھیں۔

اس نے دیہاتی علاقے میں کئی سال گزارے اور وہ شاذ ہی پیریڈل کنو سے باہر گیا اور اس طرح اسے قدرتی نظاروں کے ساتھ تنہا زندگی بسر کرنے کا نادر موقع ملا۔ لیکن بڑے شہروں کے شور و شغب اور ہلچل سے دوری نے آج کی دنیا کی جدوجہد اور اہمیت کا احساس اس کے دل سے کم کر دیا تھا۔ اسے اس کا احساس تھا۔ جیسا کہ اس نے خود کہا ہے وہ دو عہدوں کے درمیان حد بندی کا ایک کھمبا تھا اور اسی میں اس کی عظمت اور اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا المناک پہلو چھپا ہوا ہے۔

۱۹۵۷ء میں میں دو آدمیوں سے ملا جو آگے چل کر میرے قریبی دوست بن گئے۔ آرٹسٹ اوسکر راپلیف اور سنگ تراش ارنیسٹ نزویستنی

ان سے ملاقات سے پہلے میں پینٹنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ Impressionist مصوروں کو میں جدید ترین سمجھتا تھا۔ کئی روسیوں کی طرح میں بھی پکاسو کی تصویروں کی نمائش جو ماسکو میں ہو رہی تھی نہیں دیکھ سکا۔ حکومت کی لاٹری میں کار کا انعام پانا آسان تھا مگر اس نمائش کی ٹکٹ ملنا ناممکن تھا۔ میں اخباروں میں مصوری کے نئے رجحانات کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھ چکا تھا لیکن جو لوگ جدید رجحانات کو اپنا رہے تھے انہیں بے ایمان، بدکردار اور کمیونزم کے دشمن کہا جا رہا تھا۔

لیکن یہ دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے جنگ لڑی تھی۔ جو کمیونزم کے سچے پرستار تھے اور جو abstract پینٹنگ اور سنگ تراشی میں مشغول تھے۔

ایسا نہیں کہ یہ دونوں بالکل ہی تجریدی (abstract) آرٹسٹ تھے۔ انہوں نے حقیقت پسندانہ مصوری بھی کی لیکن ان کی حقیقت پسندی بھی آج کل کی اور جدید تھی۔ اس کا کھوکھلے اور بے جان روسی آرٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے تجریدی آرٹ میں کئی تجربے کئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ماڈرن آرٹ سے کئی دھوکے باز اور منافع خور لوگ چپکے ہوئے ہیں لیکن اس میں کئی ایماندار اور محنتی لوگ بھی ہیں۔ کبھی کبھار وہ آرٹ کی غلط راہ پر بھٹک جاتے ہیں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے سیاسی نظریوں میں کسی قسم کا کھوٹ ہے۔ آرٹ کے اظہار کے طریقوں کے اختلاف کو سیاسی اختلافات سمجھنا غلطی ہے۔ مجھے اپنے اس خیال کے بارے میں پوری واسیلیف، ارنسٹ نزویستنی اور دوسرے نوجوان آرٹسٹوں سے مل کر پورا یقین ہو چکا ہے۔ کچھ دن بعد جب میں یورپ گیا تو میں کئی آرٹسٹوں سے ملا اور کئی کے کام دیکھے ان میں پکاسو، میکس ارنسٹ، چاگل، میرو، ہنری مور اور براک جیسے بڑے آرٹسٹ شامل تھے۔ میں کئی معاملات میں ان سے اختلاف کر سکتا ہوں لیکن میں کبھی ان لوگوں کی برائی نہیں کر سکتا جو اس قدر تندہی اور جذبے سے اپنا کام کرتے ہیں اور جو بے انتہا عزت کے مستحق ہیں۔

مجھے مصوری سے محبت ہو گئی۔ میرے گھر کی دیواروں پر اب اس آرٹ کی ہر صنف کی تصویریں آویزاں ہیں۔ تاثراتی، تجریدی اور حقیقت پسندانہ۔ یہ تصویریں ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں۔ اور نہ ہی ان سے میرے ذہن میں پریشان خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ میری دوست ہیں جب کبھی میں دل برداشتہ محسوس کرتا ہوں تو میں ان کے پاس جاتا ہوں اور ان سے خاموش بات چیت کرتا ہوں

جب میں آرٹ میں ہزاروں 'ازمس' isms کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ان سب میں حقیقت پسندانہ آرٹ بہتر ہے لیکن حقیقت پسندانہ آرٹ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں ہزاروں پہلو رکھتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے نمائندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ حقیقت پسندانہ کا مفہوم میرے پاس یہ ہے کہ جو بھی چیز زندگی سے متعلق ہو اور جس سے انسانی روح متاثر ہو۔ اس لئے ضروری نہیں کہ یہ تصویریں انسانوں، درختوں، پہاڑوں اور گھروں ہی کی ہوں۔ اگر اس کے برخلاف تصویریں انسانوں درختوں اور پہاڑوں کی ہوں اور ان میں زندگی اور متاثر کرنے کی قوت نہ ہو تو یہ تجریدی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں حقیقت پسندانہ اور تجریدی آرٹ کی بنیادوں کی پھر سے وضاحت کرنی ہو گی۔ ابھی جو کچھ میں نے کہا ہے اس مفہوم میں میں تجریدی آرٹ کے خلاف ہوں۔

(باقی)

(ترجمہ: ق۔م۔ سالک)

انشاء کی ظریفانہ شاعری

یوسف ناظم

انشاء اللہ خاں، خدا کے فضل سے ماشاء اللہ خاں کے بیٹے تھے اور تعالیٰ اللہ خاں کے باپ تھے۔ اگر یہ اپنا تخلص تعالیٰ، رکھتے تو آج ـــ انشاء اللہ تعالیٰ کہلاتے اور ہر وعدۂ فردا انہیں کے نام پر کیا جاتا۔ ماشاء اللہ خاں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کا نام انشاء اللہ خاں ہی ہو سکتا تھا لیکن تخلص کے معاملے میں ذرا قباحت ہوگی۔ ماشاء اللہ خاں کا تخلص مصدر تھا اور اس لحاظ سے انشا کا تخلص مشتق ہونا چاہیے تھا لیکن انشاء اللہ خاں غالباً زیادہ سعادت مند نہیں بننا چاہتے تھے، حالانکہ یوں دیکھا جائے تو ان کی ساری زندگی سعادت مندی کہیں؛ سعادت پسندی ہی میں گذری۔ رنگینی اس زمانے میں جزو مقصد حیات تھی۔ انشاء اللہ خاں نے اپنے لیے انشا کا تخلص چنا کیونکہ ان کی انشا بڑی اچھی تھی اور اپنے اندر دریا کی سی لطافت رکھتی تھی۔

انشاء اللہ خاں کی شاعری کے بیان میں ان کے والد کے نام کی تفصیل بیان کی جانی ضروری نہیں ہے لیکن یہ نام سنائے جانے کے قابل ہے کیونکہ یہ نہ صرف بحر طویل میں ہے بلکہ اگر چینی رسم الخط میں لکھا جائے تو ایسا معلوم ہو جیسے آپ قطب مینار کا نظارہ کر رہے ہیں۔ ان کے والد کا پورا نام مخبر الدولہ سید الملک حکیم سید ماشاء اللہ خاں بہادر مصدر جنگ نجفی المتخلص بہ مصدر تھا۔ اتنا بڑا نام رکھنے والے باپ کا بیٹا بھی بڑا ہی آدمی ہو سکتا تھا اور پھر ماشاء اللہ خاں تو سپاہی بھی تھے اور طبیب بھی اور شاعر تو تھے ہی۔ انشاء اللہ کو یہ ساری خوبیاں مفت ہاتھ آگئیں اور پھر ستم ہوا یہ کہ انشا بنگال میں پیدا ہوئے اور آپ جانتے ہیں کہ بنگال کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ تلوار کے بھی دھنی تھے اور سیف قلم کے بھی۔ اگر بندیل کھنڈ میں انہوں نے جاٹوں کو اپنی تلوار کی چمک دکھلائی ہے تو ساتھ ہی ساتھ میدان شاعری میں بھی مصحفی اور قتیل کو اتنے زخم پہنچائے ہیں کہ دونوں کا حلیہ بگڑ گیا۔ انشا کی سپاہ گری اور شمشیر زنی کا کوئی واقعہ سنانا اس لیے ضروری نہیں کہ ان کی ظریفانہ شاعری میں بھی وہی کاٹ ہے جو تلوار کی کاٹ میں ہو سکتی ہے۔

انشاء بڑے صاحب علم تھے اور اگر وہ چاہتے تو اردو ادب کے بڑے نقاد اور محقق بن کر زندہ رہ سکتے تھے لیکن انشاء نے علمیت کی دستار فضیلت کی بجائے اپنے لیے ظرافت کی ٹوپی چنی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ٹوپی ان کے سر پر ٹھیک سے بیٹھی یا کانوں پر اتر آئی۔

ہمارے عہد کی ظریفانہ شاعری پر نظر ڈالیے تو اب گمان ہوتا ہے کہ یہ شاعری مجموعی حیثیت سے تہی دامن اور منزل نارسیدہ ہے۔ آج تک دور کے شاعر جنہیں متقدمین کے نام سے پکارا جاتا ہے ظرافت کا مقصد محض خوش طبعی اور دل و دماغ کی تفریح اور طلب شہرت جانتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اکثر و بیشتر شاعروں نے ظرافت کو مسخرا پن، سب و شتم اور یاوہ گوئی کا ذریعہ بنایا تھا۔ یوں کہنے کو تو ہمارے ادب میں ظریفانہ شاعروں کی تعداد دو ڈھائی سو سے کم نہ ہوگی لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو زندہ رہ گئے ہیں اور کتنے ہیں جو زندہ رہ کر بدنام ہیں۔ سودا، انشاء، مصحفی اور رنگین وغیرہ متقدمین شعرا میں سے ہیں جنہوں نے مزاح گوئی کو اپنے مخالف کی تضحیک اور تذلیل کے لیے استعمال کیا اور اپنی شہرت کا سامان کیا۔ ان کے بعد کے آنے والے مزاح گو شاعروں میں نظیر اکبرآبادی، حالی اور اکبر الہ آبادی ہیں جنہوں نے مزاحیہ شاعری کو نسخۂ کیمیا سمجھا۔

حقیقی معنوں میں ظریفانہ شاعری کا صالح افتتاح، سودا کی شاعری سے ہوا۔ سودا کے بعد انشاء اور مصحفی کا نام آتا ہے۔ مصحفی بیچارے تو زبردستی اس میدان میں گھسیٹے گئے۔ ان کی شاعری جواب غزل ہے۔ استغنا نہیں۔ انشاء البتہ اپنی مرضی سے اس سمت میں چل پڑے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انشاء فطرتاً ظریف الطبع اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اگر انشاء شہنشاہ اکبر کے زمانے میں پیدا ہوتے تو بیربل وہی ہوتے۔ بذلہ سنجی کے وہ ماہر تھے۔ بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی ان کا پیشہ تھی۔ عبدالباری آسی نے اپنی کتاب "خندۂ گل" میں لکھا ہے کہ انشاء ظرافت ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔ محمد حسین آزاد کو بھی اس بات کی اطلاع تھی کہ انشاء طبیعت کے بے حد شوخ اور زبان کے بے حد بے باک تھے۔ آزاد نے آب حیات میں یہ بھی لکھا ہے کہ انشاء کی طبیعت کی شوخی اور زبان کی بے باکی محتاج بیان نہیں لیکن ہم سوچتے ہیں کہ سوچنا ہماری عادت ہے کہ انشاء جیسا ذی علم شخص جس نے دریائے لطافت جیسی بیش بہا

کتاب تیسرے صفحہ ادب کو دی گئی طرح ہجو یا شاعری میں الجھ کر رہ گیا۔ انشاء کی غزل گوئی بھی انہیں کلاسیکی ادب میں سر بلند اور زندہ رکھنے کے لئے کافی تھی۔

مانا کہ اس دور کی شاعری میں اور بالخصوص درباری شاعری میں سوائے رنگینی کے اور کوئی بات سمجھ میں آنے والی نہ ہوتی تھی لیکن شخصی ہجو کا اس درجہ پہ پہنچ جانا کہ مراتب نظر انداز ہو جائیں اور مزاج سے طبیعت مکدر اور منغض ہو جائے، ادب اور تہذیب سے بے گانگی ہے اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انشاء نے بڑی سوقیانہ ہجویں کہی ہیں۔ مصحفی اور مصحفی کا سوانگ نکلوا کر اپنی عظمت کو رسوا کیا ہے۔ سعادت علی خاں رنگین کے دربار میں ان کو ان کی بے باک اور برہنہ شاعری کی کھلی اجازت تھی۔ سعادت علی خاں روزہ رکھ کر نیم مردہ ہو گئے تو ہنسانے کی خاطر انشاء نے زنانہ لباس پہنا، ناک پر انگلی رکھی اور شعر پڑھا۔

میں تو کہتی تھی کہ نہ رکھ لے مری پیاری روزہ
جلدی رکھے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

کیا تعجب یہ برجستہ شعر سن کر نواب کا روزہ بھی جاتا رہا ہو۔

انشاء نے اپنی ظریفانہ شاعری کو قید و بند سے آزاد رکھا اور ہر وہ شعر کہا جس سے ان کے مخالف کی تضحیک اور تذلیل ہو سکتی ہو۔

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا، منہ خوک کا، لنگور کی گون

یہ شعر مصحفی کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ مصحفی تو انشاء کے لئے شاعری کا سامان تھے، مصحفی کا شعر ہے

تھا مصحفی بہ مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

انشاء یہ شعر سن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے انہوں نے اس شعر کی یوں داد دی ہے

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

تاہم انشاء نے مصحفی کی ہجو دل سے ہٹ کر جو ظریفانہ شاعری کی ہے اس میں اس عہد کی مخصوص اور پسندیدہ ظرافت کی جھلکیاں ہیں۔ ریختہ تو خیر شاعری کی صنف تھی ہی۔ اس زمانے میں ریختی بھی شروع ہو گئی اور انشاء نے اس رنگ میں بڑی ہلکی پھلکی اور چٹخارے دار باتیں کہی ہیں۔ شعر پڑھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد عورتیں بیٹھ کر آپس میں وہ باتیں کر رہی ہیں جو صرف چھپ کر کی جا سکتی ہیں۔ آپ بھی سنیئے۔

کچھ تجھے شرم بھی ہے بیٹھ پرے او کم بخت
تاڑ جائیں گے بڑے لوگ ارے او کم بخت

یہ تو عورت نے مرد سے کہا کہ عورت اپنی ہمراز عورت سے کہتی ہے۔

مردوا مجھ سے کہے ہے چلو آرام کریں
جس کو آرام وہ سمجھے ہے وہ آزار ہے نوج

اب مرد کی مرد سے گفتگو سنیئے۔

بلائیں میں نے جو لیں ان کی کل چچا نے پیار
تو کس مزے سے کہا بیگما نے چل گستاخ

لکھنؤ اسکول کا یہ انداز شاعری، داغ اور امیر مینائی کے عہد تک برقرار رہا۔

لکھنؤ کی عیش و عشرت کی فضا نے شاعری کا مزاج بالکل نسوانی کر دیا اور خالص نسوانی مزاج ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ اس میں تو بے حجابی تھی زلف اور چوٹی، کاجل اور مسی کی نپی تلی شاعری اور اس پر ظریفانہ شاعری کا کریلا اور نیم چڑھا کی مصداق تھی۔ جنس کی شاعری کا یہ دور لکھنؤ کے ادب اور خود اس دور کے شاعروں پر بڑا کٹھن گذرا ہے اور کئی اعلیٰ درجہ کے شاعر اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

انشاء، رنگین اور جرأت کی شاعری نے ظریفانہ شاعری کے نام پر فحش گوئی اور عریاں نگاری کو ہوا دی۔ انشاء کی قادر الکلامی اور زبان دانی اس صنف شاعری پر ضائع ہو گئی۔ ان کے ہاں اچھے اشعار بھی ملتے ہیں لیکن مبتذل اشعار کا غذی سکے کی طرح بہتات میں ہیں۔

کی جو سر ما کے اوٹ تکیے کی
لگ گئی ان کو چوٹ تکیے کی

دو باتیں کروں عرض میں خدمت میں تمہاری
صحبت مری اور آپ کی گر رات کو ٹھہرے
منظور اور بات جو کچھ ہو تو سنیئے
گلشن میں اک کنارے پہ چمپا کا جھاڑ خوب

ایسا معلوم ہوتا ہے باضابطہ سودا طے ہو رہا ہے۔

انشاء کے اس شاعرانہ سرمایے کو دیکھ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ شاعری کو پیشہ نہیں بنانا چاہیئے مگر کیا زمانہ تھا کہ مبتذل کلام کہنے کی قیمت ادا ہوتی تھی۔

ایک طالب علم لڑکی ہاسٹل کی زندگی سے تنگ آ کر ایک کمرے کی تلاش میں تھی۔ اتفاقاً ایک دن اخبار میں ایک خالی کمرے کا اشتہار نکلا۔ لڑکی فوراً کمرہ دیکھنے کیلئے گئی۔ بدقسمتی سے ایک نوجوان بھی کمرہ دیکھنے کیلئے وہاں موجود تھا۔ نوجوان نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کمرہ کی مالکہ نے دروازہ کھولا۔ اور قبل اس کے کہ نوجوان کچھ کہتا عورت نے کہا "معاف کیجئے یہ کمرہ شادی شدہ لوگوں کیلئے نہیں ہے" اور دروازہ بند کر لیا۔

نوجوان نے پھر بٹن دبایا۔ دروازہ کھلا۔ وہی عورت آئی اس نے دونوں کو غور سے دیکھا۔ نوجوان نے عورت سے کہا "محترمہ سنیئے۔ دراصل ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔" یہ سن کر عورت غصے میں بھری بولی۔ "پھر آپ دونوں کو اپنے آپ پر شرم کرنی چاہیئے" اور دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

ظفرالحسن

رات کی ایکسپریس

مشتاق کو مطالعہ کا شوق تھا۔
مگر بزرگوں کا ڈر تھا اس لئے دیر تک رات میں جاگتے رہنا ممکن نہ تھا۔ خاندانی روایات مطابق نو، ساڑھے نو بجے کے بعد سب اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے دس بجے تک کوٹھی کے تمام چراغ بجھا دئے جاتے۔ اور مرد عورتیں اور بچے سو جاتے۔ یہ طریقہ ایک زمانے سے رائج تھا اور اس کی خلاف ورزی کا نہ کسی کو خیال آیا نہ کبھی ضرورت محسوس ہوئی۔

والد کے انتقال کے بعد بارہ سالہ مشتاق کو کتب خانہ میں ایک پرانی مجلد کتاب ملی۔ پتہ نہیں کیوں مشتاق کو اس کتاب میں کوئی کشش محسوس ہوئی اور وہ چپکے سے کتاب لے کر اپنے کمرے میں پہنچا اور پڑھنے لگا۔ کوٹھی کی بتیاں یکے بعد دیگرے گل ہونے لگیں تو مشتاق نے اندر سے کمرے کا دروازہ بند کیا چراغ بجھایا ایک موم بتی جلائی اور کونے میں چھپ کے وہ مجلد کتاب پڑھنے لگا۔ پانچ دس منٹ کے اندر کوٹھی سنسان ہو گئی اس سناٹے میں یا تو دیوار سے لگی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی یا مشتاق کے دل کی دھڑکن۔ کبھی کبھار پتنگا اڑتا ہوا دیوار سے ٹکرا کر گرتا تو اس کی آواز سنائی دے جاتی ورنہ بالکل خاموشی رہتی۔ کوٹھی سمندر کے کنارے واقع تھی۔ اسی سناٹے میں لہروں کی آواز بھی آ جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ لہروں کی آواز نہیں ہے بلکہ کوئی آہ کر رہا ہے۔

مشتاق مطالعہ میں مصروف سب کچھ بھول چکا تھا۔ صرف اس مجلد کتاب کی ورق گردانی اسے یاد رہ گئی تھی۔ ضرور کوئی کشش تھی۔ جادو تھا، مقناطیسی طاقت تھی جس کی وجہ سے مشتاق شوق سے اس کتاب کو پڑھ رہا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ کتاب ختم کرنے سے پہلے نہیں سوئے گا۔ اس کتاب کا نام "رات کی ایکسپریس" تھا۔ اس میں ایک کہانی بیان کی گئی تھی جو مشتاق کی سمجھ میں نہیں آئی۔

کتاب کے پچاسویں صفحے پر ایک تصویر تھی جس پر مشتاق کی نظر پڑی اور فوراً ہٹ گئی۔ مشتاق اس تصویر کو غور سے نہیں دیکھ سکا۔ اسے کچھ خوف سا ہوا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں اس تصویر کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔ اس تصویر میں کیا بات تھی جس نے کمسن مشتاق کے دل پر اثر کیا۔

مشتاق کو غور و فکر کی عادت تھی۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ خیالی تصویریں بھی بناتا تھا۔ مگر مزاج کا ڈرپوک یا وہمی نہ تھا۔ مشتاق نے کوشش کی کہ پچاسویں صفحے پر اس کی نظر نہ پڑے تصویر دکھائی نہ دے۔

تصویر میں ایک سنسان ریلوے اسٹیشن دکھایا گیا تھا۔ رات کا وقت ہے پلیٹ فارم خالی پڑا ہے اور دور افتادہ مقام ہے۔ بجلی کی روشنی کے بجائے بجلی کے کھمبے سے ایک لالٹین باندھ دی گئی ہے۔ مدھم روشنی میں صاف دکھائی نہیں دیتا۔ لالٹین کے قریب ایک شخص کھڑا ہے مگر اس کا چہرہ دوسری طرف پلٹا ہوا ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ شخص کچھ سننے کا منتظر ہے شاید کچھ اندوہناک خبر کی تفصیلات آنے والی ہیں اور یہ دراز قامت شخص کسی سانحہ کا انتظار کر رہا ہے

کمسن مشتاق پچاسویں صفحے کی یہ تصویر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تصویر کا کہانی سے کوئی راست تعلق نظر نہ آیا۔ اس کے باوجود مشتاق چاہتا تھا کہ تصویر دکھائی نہ دے۔ اس کے لئے بڑا مشکل وقت تھا ایک طرف وہ مجلد کتاب رات کی ایکسپریس ختم کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف پچاسویں صفحے کی تصویر بار بار الٹ کر اس کے سامنے آ رہی تھی۔ مشتاق نے پن کی مدد سے اس صفحے کو چھپا دیا۔ پچاسویں صفحے کی تصویر مشتاق نے انچاسویں اور اکاونویں صفحے کے اندر پن کی مدد سے چھپا دی اور اطمینان سے کہانی پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ صبح اٹھا تو سب سے پہلے یہ کتاب چھپا دی تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ رات میں جاگ کر کوئی کتاب پڑھتا ہے۔

دوسری رات پھر پڑھنے بیٹھا۔ مگر پہلے جو کچھ پڑھا تھا وہ بھول گیا۔ اس لئے از سر نو پڑھنے لگا دوسری رات بھی دس بیس صفحے پڑھنے کے بعد سو گیا کہانی مکمل نہ کر سکا۔ تیسری رات بھی یہی ہوا۔ چوتھی رات بھی یہی ہوا۔ ہر رات یہی ہوتا رہا۔ مشتاق مشکل سے دس بیس صفحے ختم کرتا اور آنکھ بند ہو جاتی۔ پچاسویں صفحے تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ راتیں گذرتی گئیں مشتاق کی عمر بڑھتی گئی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مشتاق اس کتاب کو مستقل طور پر بھلا بیٹھا۔

کتاب کے پچاسویں صفحے کی تصویر سے بچپن میں ڈرنے والا مشتاق اب عمر کی پچاسویں منزل میں پہنچ گیا تھا۔ وہ کتاب اور اس کا پچاسواں صفحہ بھول چکا تھا۔ اپنے کسی کام سے اسے سفر درپیش ہوا لیکن واسطہ پڑا دور افتادہ اور سنسان مقام سے!

سنسان ریلوے اسٹیشن کا خالی پلیٹ فارم ہے۔ لکڑی کے کھمبے سے ایک لالٹین بندھی ہے۔ جس کی دھیمی روشنی میں ایک شخص دکھائی دے رہا ہے۔ دراز قامت چہرہ دوسری جانب پھیرا ہوا۔ اس شخص کو کچھ انتظار ہے۔ مکان کسی دہشت ناک شہر کی تفصیلات سننے کے لئے بے چین رہی۔ پلیٹ فارم کا منظر وہی تھا جو آج سے اڑتیس سال پہلے بارہ سالہ مشتاق نے کتاب "رات کی ایکسپریس" کے پچاسویں صفحے کی تصویر میں دیکھا تھا۔

مشتاق اب بچہ نہیں تھا۔ خوف کی کیا بات تھی۔ وہ اکیلا اس شخص کے پاس جا کر پوچھ سکتا ہے کہ ریل کب آئے گی!

عمر رسیدہ مشتاق کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بات کرنے میں کوئی حرج نہ تھا۔ سوال پوچھنے میں بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ وہ بڑھا، چند قدم چلا۔ دراز قامت شخص کے قریب پہنچا تو اس کے جسم میں کپکپی پیدا ہوئی۔ زبان سے کچھ کہہ نہ سکا۔ ہونٹ جیسے سِل گئے ہوں۔ گھوم کر وہ دراز قد شخص کے سامنے آ گیا۔ چہرہ پر نظر پڑی تو دیکھا کسی اور شخص کا نہیں مشتاق کا اپنا چہرہ تھا۔ حیران تھا کہ دوسرے شخص کو اس کا اپنا چہرہ کیسے ملا؟ اور خود مشتاق کا اپنا چہرہ کیا ہوا؟ ایسا محسوس ہوا جیسے مشتاق آئینہ دیکھ رہا ہو۔ اپنی آنکھوں سے اپنی ہی آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں۔ مشتاق کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ بھاگا اتنا تیز کہ ہوا بھی نہ چھو سکے۔ سیدھا گھر پہنچا اور دوسرے دروازے سے نکل کر اسٹیشن کے عقبی کمپاؤنڈ میں داخل ہوا اور وہاں سے سرپٹ بھاگتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے ہر طرف خموشی تھی پوری کائنات سو رہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے چند سکنڈ کے لئے رکا تو، مشتاق کو خود اپنے بھاگتے پاؤں کی آوازیں سنائی دیں جو اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ پھر بھاگا نہایت تیز۔

سڑک پر مشتاق بھاگ رہا تھا اس کے ساتھ سڑک کے دو رویہ درخت بھی دوڑ رہے تھے ان کے پیچھے دوڑنے والے قدموں کی آوازیں بھی بھاگ رہی تھیں۔ آدھ میل دوڑنے کے بعد سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان دکھائی دیا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اس مکان میں کوئی رہتا ہے۔ قبل اس کے کہ عقب سے آنے والے قدموں کی آوازیں مشتاق کو گھیرے میں لے لیتیں مشتاق اس گھر کے قریب پہنچ گیا اور بے تحاشہ دروازہ پیٹنے لگا۔ لکڑی کا دروازہ پیٹتے پیٹتے اس کی انگلیاں زخمی ہو گئیں مگر وہ مایوس نہیں ہوا۔ خاموش نہیں رہا۔ مسلسل پیٹتا ہی رہا۔ اندر سے جواب آیا مگر دیر سے۔ اندر کوئی تھا وہ دروازے کے قریب آ رہا تھا مگر آہستہ آہستہ اور اطمینان سے۔ مشتاق کو قدموں کی چاپ سنائی دی مگر ان میں بڑا وقار تھا۔ اطمینان تھا۔ غالباً کوئی اوپر کی منزل سے اُتر کر آ رہا تھا۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر سے اُتر کر آنے کی آواز مشتاق نے سنی۔ کچھ ڈھارس بندھی، دل مضبوط ہوا۔ دروازہ کھلا۔ مشتاق کے سامنے ایک دراز قد آدمی کھڑا تھا۔ ہاتھ میں موم بتی جل رہی تھی مگر اُس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ اس پر ایک عجیب قسم کا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔

دونوں میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی اس نے مشتاق کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ داخل ہوا دروازہ بند ہوا۔ بات کئے بغیر دراز قد آدمی آگے بڑھا مشتاق کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں اوپر کی منزل پر گئے۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پیش کی گئی۔ مشتاق اس پر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر ایک مجلد کتاب رکھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نووارد کو دکھانے کے لئے یہ کتاب رکھی گئی ہے اور اسے کتاب کے قریب ہی کرسی دی گئی ہے۔ میز پر موم بتی رکھ کر اور کچھ کہے بغیر دراز قد آدمی باہر کے باہر چلا گیا۔

مشتاق نے موم بتی کو دیکھا۔ غور کیا۔ شاید موم بتی اس نے پہلے کبھی دیکھی تھی۔ شاید اپنے ہی گھر میں دیکھی ہو۔ اس نے کتاب اُٹھائی یہ کتاب بھی پہلے کہیں دیکھی تھی۔ سیاہ ورق پر روشنائی کے دھبے تھے۔ یہ دھبے اُس نے پہلے بھی دیکھے تھے۔ ورق اُلٹے گئے بعد دیگرے بہت سے ورق اُلٹے عجیب معمہ تھا انچاسویں اور اکیاونویں صفحے کے اندر پچاسواں صفحہ پن کی مدد سے چھپا دیا گیا تھا۔

کانپتی ہوئی انگلیاں پہلے صفحے کی طرف لوٹیں۔ ڈرا ہوا مشتاق کتاب پڑھنے لگا۔ وہ معمہ حل کرنا چاہتا تھا۔ کہانی پڑھنا چاہتا تھا۔ پوری کتاب ختم کرنا چاہتا تھا۔

بچپن میں جو کہانی سمجھ میں نہ آئی تھی کیا وہ اس عمر میں بھی سمجھ میں نہ آئے گی؟ اس نے پوری کتاب پڑھنے اور سمجھنے کا تہیہ کر لیا۔ کتاب کا نام "رات کی ایکسپریس" تھا۔ ڈر اور خوف ضرور پیدا ہو چلا تھا مگر کہانی اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

یہ اس آدمی کی کہانی تھی جس نے بہت مدت پہلے اپنے بچپن میں ایک کتاب دیکھی تھی۔ کتاب کی ایک تصویر دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا۔ بڑا ہو کر وہ اس کتاب اور کہانی کو بھول گیا تھا۔ مگر ایک مرتبہ رات کے وقت اسے ایک دور افتادہ ریلوے اسٹیشن پر جانا پڑا خالی پلیٹ فارم پر اس نے ایک دراز قامت شخص کو دیکھا جو اپنا منہ دوسری طرف کئے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگتے بھاگتے چھوٹے سے گھر کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ کھلا ایک اور دراز قامت شخص نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ڈرا ہوا شخص اندر پہنچا دونوں مکان کی اوپر کی منزل پر گئے وہاں میز پر ایک کتاب رکھی تھی۔ اس کا نام "رات کی ایکسپریس" تھا اس کتاب میں ایک ایسے شخص کی کہانی لکھی تھی۔ جس نے بچپن میں ایک کتاب کے پچاسویں صفحے کی تصویر دیکھی۔ تصویر دیکھ کر وہ بچہ ڈر گیا تھا۔ اس نے پچاسویں صفحہ کی تصویر کو انچاسویں اور اکیاونویں صفحے کے اندر پن کی مدد سے چھپا دیا تھا۔

مختصر یہ کہ کہانی اور تصویر کی داستان ایک

ترجمہ محسن انجم

ایک عجیب و غریب آبی جانور

اکٹوپس

اکٹوپس آٹھ پیروں والا ایک پُر اسرار آبی جانور ہے۔ وہ اپنے آٹھوں پیروں سے ڈنک مارنے کا کام بھی لیتا ہے اسی لئے اُسے اُردو میں "ہشت نیش صدف" کہتے ہیں۔ اُن کی لمبائی تقریباً تین فٹ ہوتی ہے۔ اکٹوپس کی سو سے زیادہ قسمیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی سب سے چھوٹی قسم مشکل سے دو انچ لمبی ہوتی ہے۔ بحیرۂ روم میں اکٹوپس بہت زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کی زیادہ سے زیادہ لمبائی چھ سے سات فٹ تک ہوتی ہے۔ دیگر اور بعض سمندروں میں اس سے بھی زیادہ لمبائی والے اکٹوپس پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی لمبائی پچاس سے ساٹھ فٹ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کے لمبے اکٹوپس صرف بحرالکاہل ہی میں پائے جاتے ہیں۔

انسان سے خوف

اکٹوپس کے بارے میں عام طور پر مشہور ہے کہ وہ انسانوں کو زندہ نگل لیتا ہے کشتیوں کو اُلٹ دیتا ہے اور بحری سفر کرنے والے مسافروں کو پریشان کرتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بہت ہی کم سائنس دانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اکٹوپس انسانوں پر حملہ کرتے ہیں فریڈرک ڈوماز اور جے۔ وائی۔ کاسٹو نے آبی جانوروں کی مکمل تحقیقات کے بعد اپنی مہم کے تجربات کو ایک کتاب کی صورت میں شائع کروایا ہے۔ وہ اپنی کتاب 'خاموش دنیا' میں لکھتے ہیں کہ عام حکایات کے پیش نظر وہ اکٹوپس کے صرف تصور ہی سے کانپتے تھے لیکن ایک دن جب وہ سمندر میں سفر کر رہے تھے تو انہیں ایک چھوٹا سا اکٹوپس نظر آیا۔ چنانچہ ڈوماز نے ہمت کرکے اُسے کشتی میں کھینچ لیا۔ لیکن اکٹوپس خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگا اور اپنی دُم سے ایک خاص قسم کا رنگین اور خوبصورت مادہ خارج کرنے لگا۔ ڈوماز نے اُسے اپنے بازوؤں کے گرد لپیٹ لیا مگر چند ہی لمحوں بعد وہ خود بخود پھسل کر نیچے گر پڑا اور بھاگنے کی

دوسرے سے اس طرح منسلک تھے کہ نہ کہانی ختم ہو پاتی اور نہ تصویر کا معمہ حل ہوتا۔ البتہ کہانی میں جب تیسری مرتبہ اس مکان کا ذکر آیا جس میں بیٹھا مشتاق مطالعہ کر رہا تھا تو اُسے شبہ ہوا کہ وہ جس چکر میں پھنس گیا ہے اس سے نکلنا آسان نہیں۔ نہ کہانی ختم ہوگی نہ تصویر کا معمہ حل ہوگا۔ کہانی دس بارہ سالہ بچے کے شوقِ مطالعہ سے شروع ہوتی ہے اور زیرِ مطالعہ کتاب کا نام رات کی ایکسپریس بتایا جاتا ہے تفصیلات نئی نہیں تھیں وہی پُرانا چکر۔ وہی پلیٹ فارم وہی دراز قامت شخص۔ وہی چھوٹا سا مکان اس میں ایک اور دراز قامت شخص کا کتاب "رات کی ایکسپریس" پیش کرنا اور اس کتاب میں وہی بچپن کے مطالعے کی کہانی۔ ....

مشتاق نے کتاب سے اپنی توجہ ہٹائی اور سوچنا چاہا کہ اس مکان کے رہنے والے دراز قامت آدمی کے متعلق کوئی تفصیل معلوم کرے کہ اس نے اپنا چہرہ کیوں چھپا رکھا ہے۔ ابھی مزید غور کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ کسی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ مشتاق کا دراز قامت میزبان داخل ہوا۔ آنے سے پہلے اس لمبا سایہ ـــ انسان کے سائے سے بہت لمبا۔ دیوار پر پڑا۔ وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں آمنے سامنے تھے۔ میزبان نے اپنے چہرے سے وہ عجیب و غریب کپڑا جس سے چہرہ چھپ گیا تھا۔ میزبان کو معلوم تھا وہ چہرہ کس کا ہے۔ مشتاق نے چہرہ دیکھا اس کے لئے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ نجات کی صرف ایک صورت تھی وہ کرسی پر سے اُٹھا اور لمبے میزبان پر جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ مگر اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا ہی گلا دبوچ رہا ہے۔ دونوں ہی کی آوازوں اور چیخوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ معلوم نہیں تھا کہ ایک شخص کی آوازیں تھیں کہ دو کی۔

چند لمحوں کے بعد کمرے اور گھر میں خاموشی خاموشی چھا گئی۔ مکمل خاموشی۔ اس سناٹے میں یا تو گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دے سکتی تھی یا سمندر کی لہروں سے پیدا ہونے والی آواز جو آج سے اڑتیس سال پہلے سنی گئی تھی۔

مشتاق کو آخرکار نجات حاصل ہو گئی۔ وہ رات کی ایکسپریس میں چلا گیا دور بہت دور۔

رات کی ایکسپریس ایک کہانی تھی جو کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک معمہ تھا جو کوئی حل نہ کر سکا نہ بارہ سالہ مشتاق۔ نہ پچاس سالہ مشتاق۔

٭ ٭

کوشش کرنے لگا۔

مختلف رنگ

گرگٹ کی طرح اکٹوپس میں بھی اپنے ماحول کے مطابق رنگ بدلنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے عام تالابوں میں جہاں اس کو بطور نمائش رکھا جاتا ہے وہ اپنے رنگ کو تہہ میں پڑی ہوئی ریت کے مطابق زرد بنا لیتا ہے۔ سمندری چٹانوں میں وہ خاکستر رنگ میں پایا جاتا ہے۔ اور سمندری ہریالی کے گرد وپیش وہ سبز رنگ میں ملتا ہے۔ دھبوں والی سطح پر اس کا رنگ دھبہ دار ہوتا ہے۔ اس کی جلد پر مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے دھبے ہوتے ہیں۔ ضرورت پیش پڑنے پر اکٹوپس ان دھبوں کو اپنے ماحول کے مطابق ساٹھ گنا زیادہ پھیلا سکتا ہے اور جس رنگ کے نقطے زیادہ پھیل جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر وہی رنگ نمایاں ہو جاتا ہے اور دوسرے نقطے سکڑ جاتے ہیں جب کوئی دشمن اس پر حملہ کرتا ہے تو اس کا رنگ خوف سے ہلدی کی مانند زرد پڑ جاتا ہے۔ یہ موقع کی مناسبت سے رنگ پر رنگ بدلتا ہے۔

بازوؤں کے چابک

اکٹوپس پانی میں بہت تیزی سے چلتا ہے اگرچہ یہ چیز اس کی جسمانی بناوٹ کے بالکل خلاف ہے سمندر میں اس کے جسم میں پانی کی کافی مقدار جذب ہو جاتی ہے اور پھر پچکاری کی صورت میں باہر نکل جاتی ہے اور اس طرح اکٹوپس آگے کی طرف تیزی سے حرکت کرتا ہے۔ جب اکٹوپس اپنے شکار پر حملہ کرتا ہے تو اپنے بازوؤں کو چابک کی طرح تیزی سے حرکت دیتا ہے جب اکٹوپس کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ اپنے سے ایک سیاہی مائل مادہ خارج کرتا ہے۔ یہ سیاہی مائل مادہ انسان کیلئے غیر ضرر رساں ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ایک خاص آبی جانور (جس کی من پسند خوراک اکٹوپس ہے) جب اکٹوپس پر حملہ کرتا ہے تو اکٹوپس کے جسم سے نکلے ہوئے سیاہی مائل مادے کی وجہ سے وہ اپنے شکار کو پہچان نہیں سکتا اور نتیجتاً راستہ بھول کر دوسری طرف نکل جاتا ہے۔

۴۵ ہزار انڈے

اکٹوپس کی بعض قسمیں آبی چٹانوں پر لڑیوں کی صورت میں انڈے دیتی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق مادہ ایک وقت میں ۴۵ ہزار انڈے دیتی ہے مادہ اکٹوپس ان انڈوں کو بڑی احتیاط سے سیتی ہے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ وہ چھ سے آٹھ ہفتوں تک انڈوں کی فکر میں کھانا بھی نہیں کھاتی اور جان توڑ محنت کر کے انڈوں کی حفاظت کرتی ہے۔

اکٹوپس اپنے رہنے کے لئے چٹانوں میں محفوظ گھر بناتا ہے ان گھروں کو دیکھ کر ان کی ذہانت اور عقل پر تعجب ہوتا ہے۔ اکٹوپس کی خوراک کیکڑے اور چھوٹی مچھلیاں ہیں۔ شکار کو قابو میں کرنے کے بعد وہ اس کو پھاڑ دیتا ہے اور نگل جاتا ہے۔ اکٹوپس کی آنکھیں کارکردگی کے اعتبار سے انسانی آنکھوں سے بہت حد تک مشابہت رکھتی ہیں۔ کسی بھی آبی جانور میں انسان کی طرح حواس خمسہ نہیں ہوتے لیکن اکٹوپس میں یہ پانچوں حواس پائے جاتے ہیں اور اکٹوپس ان حواس کو بڑی عمدگی اور خوبصورتی سے کنٹرول کرتا ہے۔

بہترین ڈش

اکثر ملکوں میں اکٹوپس کو بطور خوراک استعمال کیا جاتا ہے۔ کم گہرے پانی میں اُن کو مچھلیوں کی طرح جال یا کنڈی لگا کر پکڑا جاتا ہے اور اُس کے بازوؤں کو کاٹ کر پکایا جاتا ہے۔ اٹلی وغیرہ میں یہ لوگوں کی مرغوب غذا ہے۔ اسے وہاں زیتون کے تیل میں پکایا جاتا ہے۔

اکٹوپس کی ذہانت کا امتحان کرنے کے لئے کئی سائنس دانوں نے بہت سے تجربات کئے۔

ایک زولوجسٹ ڈاکٹر پال شیلر نے ایک چھوٹے اکٹوپس کو ایک جار کا ڈھکن اٹھا کر کیکڑا پکڑنے کی تربیت دی۔ اسی قسم کا ایک اور تجربہ کیا گیا۔ ایک کیکڑے کو ایک سفید کاغذ پر رکھ دیا گیا اور اس کے ساتھ بجلی کا ایک تار لگا دیا گیا۔ اور اس کے قریب ہی ایک اور کیکڑا رکھ دیا گیا۔ جب اکٹوپس کو چھوڑا گیا۔ وہ پہلے کاغذ والے کیکڑے کی طرف جھپٹا تو اُسے بجلی کا شاک محسوس ہوا وہ بہت خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے ایک دوسرا کیکڑا کھانے کے لئے دیا گیا۔ اس طرح یہ تجربہ کئی بار کیا گیا تو اکٹوپس نے کاغذ کے کیکڑے کی طرف رُخ کرنا چھوڑ دیا اور دوسرے کیکڑے کو پکڑنا شروع کیا۔ پھر اُس کے دماغ کے کچھ حصے کاٹ دیئے گئے تو پھر اکٹوپس دونوں کیکڑوں میں بالکل امتیاز کرنے کے قابل نہ رہا۔ وہ بار بار کاغذ والے کیکڑے کی طرف بڑھتا رہا اور جھٹکے کھاتا رہا۔ ☆☆

ایک بہت مالدار شخص کا کتا گم ہو گیا۔ وہ ایک مقامی اخبار کے دفتر گیا اور اشتہار دیا کہ جو کوئی کتا تلاش کر لائے گا اُسے دس ہزار روپے دیئے جائیں گے۔

دوسرے دن اشتہار دیکھنے کے لئے وہ ایک اخبار کے اسٹال پر گیا اور اُس دن کا اخبار مانگا۔

اخبار والے نے کہا۔ "وہ اخبار تو نہیں ہے جناب"

"کیوں بھئی کیا سب فروخت ہو گیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا

"نہیں جناب آج وہ اخبار چھپا ہی نہیں۔ سنا ہے اخبار کا سارا اسٹاف ایک گم شدہ کتے کی تلاش میں گیا ہے جس کے لانے والے کو دس ہزار روپے انعام ملے گا۔"

دو شہر

رضیہ سلطانہ

بمبئی اور کلکتہ کا ایک سرسری [illegible]

میں آج جن دو شہروں کی کہانی سنا رہی ہوں
اور کلکتہ ہے۔ میں ایک عرصے تک بمبئی میں
ہوں اور میرا قیام کلکتہ میں ہے۔ ضرورت کے
مجھے اکثر کلکتہ سے بمبئی اور بمبئی سے کلکتہ آنا جانا
ہے۔ ان چکروں میں میرا دلچسپ مشغلہ یہ ہے کہ
شہروں کے درمیان جو واضح فرق نظر آتا
اُس پر نظر رکھوں۔ ان دو شہروں کے
یوں تو سینکڑوں باتیں ہیں جو ممکن ہے
کے لئے دلچسپی کا باعث نہ ہوں اور کچھ باتیں
بھی ہیں جو محسوس ہی کی جا سکتی ہیں کہی نہیں
تیں یا جن کا کہنا مناسب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے
مضمون میں چند عام دلچسپی کی چیزوں ہی کا ذکر
گی۔

ان دونوں شہروں کی امارت اور وسعت
میں کچھ کہنا لاحاصل ہے اور یہ قدر اُن میں نمایاں
مشترک ہے۔ آبادی میں یہ ایک دوسرے
نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شہروں سے مقابلہ کرتے
اگر یہی رفتار رہی تو تعجب نہیں کہ آبادی کے
سے پوری دنیا میں ان کا کوئی ہمسر نہ رہے۔
دیکھیے بے انتہا بھیڑ بھاڑ، چلنے کو جگہ نہیں
وقتوں میں چلتے ہوئے کسی کو دھکا لگ جاتا
جھگڑے ہو جاتے۔ خون خرابے کی نوبت
آ جاتی ہے مگر اب دھکم دھکا ان دونوں شہروں کی ایک
نمایاں اور مشترک خصوصیت ہے، لیکن اور دوسری
بہت سی چیزوں میں ان دو شہروں میں اتنا ہی فرق ہے
جتنا مشرق و مغرب میں۔ کلکتہ ہر لحاظ سے مشرقی شہر ہے
اور بمبئی مغربی۔

بمبئی میں بڑا ڈسپلن ہے۔ یہ بات
کہیں نظر نہیں آتی۔ دلی بھی اس معاملے میں اس کا
مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بمبئی کے لوگ بڑے کھرڈ اور پاک
صاف ہوتے ہیں مگر بات کرنے کا ان میں سلیقہ نہیں
اس کے برعکس اہلِ کلکتہ بہت کم اچھے لباس میں نظر
آتے ہیں مگر ان کی زبان پر شمالی ہند کی لوچ دار زبان کا اثر
ہے۔ یہاں جو لوگ باہر سے آ کر بس گئے ہیں ان میں سے
اکثر یوپی اور بہار کے ہیں اور اچھی زبان بولتے ہیں
اور سلیقے سے بات کرتے ہیں مگر بمبئی میں نیم انگریزوں
کی طرح بات کرنے کا طریقہ ہے۔

"تم کیا منگتا"
"کدھر جاتا ہے"

بعض عجیب الفاظ زبان پر چڑھ گئے ہیں
جنہیں عوام دورانِ گفتگو میں آزادانہ استعمال کرتے
ہیں جیسے "سالا"۔ اس قسم کے الفاظ کے استعمال
کا رواج کلکتہ میں نہیں ہے البتہ جن لوگوں کی مادری
زبان بنگالی ہے وہ مجھ سے پوچھتے تھے۔
"تم چائے کھائے گا۔ نہ پانی کھائے گا" تو
مجھے حیرت ہوئی لیکن بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اُن کی گرامر
ہی کچھ ایسی ہے۔

ایک بات مجھے عجیب لگتی ہے کہ ہندوستان
کے کسی بھی علاقے کو لے لیجیے وہاں کے عورتوں اور
مردوں کی گفتگو، چال ڈھال، رہن سہن اور آداب و
اخلاق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پنجاب کی عورتیں اور مرد
اپنی عادات و اخلاق میں ایک سے ہیں اور یہی حال
ہندوستان کے ہر علاقے کا ہے۔ ہم ان لوگوں کی حرکات و
سکنات، عادات و خصائل سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ
لوگ فلاں علاقے کے ہیں مگر اس معاملے میں بنگال
بہت نرالا ہے۔ عام طور پر یہاں کا مرد زیادہ کیجرڈ
نہیں ہوتا۔ نہ لباس میں، نہ چال ڈھال میں اور نہ ہی
بات چیت میں۔ وہ کافی جھگڑالو اور باتونی سمجھا جاتا ہے
لیکن عورت نسوانیت کی مکمل تصویر ہوتی ہے۔ حقیقی
معنوں میں ہندوستانی عورت تو یہیں ملتی ہے۔ عورت
کا اصل حسن اس کے Sublime ہونے میں ہے۔
ہر عورت یہاں ایک دیوی بنی ہوئی ہے۔ غریب عورت
میں بھی ایک شانِ نسوانیت ہے۔ اس سے میرا مطلب
ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہمارا شمالی عورت اچھی نہیں
ہوتی کہ ہمارا شمالی عورت کے اوصاف اور ہیں کہ
وہ بڑی محنتی اور گھریلو قسم کی ہوتی ہے۔ اسے جو بھی زندگی
مل جائے اُس سے مطمئن اور خوش رہتی ہے، وہ کبھی
آمدنی کی کمی سے اپنے گھر کے سکون کو متاثر نہیں ہونے
دے گی۔

بنگال میں عورت بہت مہذب اور وضعدار
ہوتی ہے لیکن مردوں میں یہ اوصاف نظر نہیں آتے۔
میں نے جب اس بارے میں چھان بین کی
تو معلوم ہوا کہ یہ سب تعلیم کا اثر ہے۔ بنگال میں تعلیم
کا چرچا پہلے عورتوں میں ہوا وہ اس میدان میں
بہت آگے بڑھ گئیں اور مرد پیچھے رہ گئے۔
بعض وقت مجھے بہت افسوس ہوتا ہے

جب میں دیکھتی ہوں کہ ایک حسین اور سراپا گریڈ عورت ایک ایسے شوہر کے ساتھ جا رہی ہے جو اپنی وضع قطع چال ڈھال اور لباس میں قطعاً اس بیوی کا اہل نہیں ہے۔ ذرا سوچیے ایک [illegible] پوش حسینہ کو جو اپنی کھلی ہوئی زلفوں کے ساتھ ایک ایسے مرد کے ساتھ جا رہی ہو جو لپیٹے تو ہے پر دھوتی اس طرح پہنے ہوئے ہے کہ اس کا آدھا حصہ کرتے کی جیب میں ٹھنسا ہوا ہو۔

بمبئی میں زیادہ تر عورتیں حسین ہیں یا حسین بن گئی ہیں کہ ہر عورت کا حسن قدرتی ہے؟ آج اسے زمانے کی ہوا نہیں لگی ہے اور وہ غیر ضروری بننے سنورنے کی قائل نہیں ہے کہ اس کی یہ خوبی قابلِ قدر ہے کہ جو کچھ اس کا حسن ہے وہ اصلی ہے اور صحت سب سے بڑا حسن ہے کہ لیکن بمبئی میں صرف مہاراشٹرین ہی نہیں بستے کہ اس شہر میں ہر قسم کے لوگ رہتے ہیں اور ہندوستان کے ہر علاقے کی عورت یہاں نظر آتی ہے۔

پہلے یہاں زیادہ تر پارسی اور اینگلو انڈین عورتیں نظر آتی تھیں لیکن اب سندھی اور پنجابی بھی کثیر تعداد میں یہاں آکر بس گئے ہیں۔

لیکن کلکتے میں بہت کم باہر کی عورتیں نظر آتی ہیں کہ ان کا قد عام طور پر چھوٹا ہوتا ہے گیسو اور چشم بنگال تو مشہور ہی ہے۔ بال چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں ایک قسم کی خوبصورتی ہوتی ہے کہ یہاں کی عورت مکمل ہندوستانی ہے، لباس اور وضع قطع میں۔ دو چوٹیوں کا رواج نہیں ہے مانگ میں سرخی بھری ہوتی ہے اور بال کھلے رکھے جاتے ہیں لیکن بکھرے ہوتے ہیں، زلفِ پریشاں کی قسم کے نہیں۔ یہ تو عام بنگالی عورتوں کی بات ہے مگر جو چند حسین عورتیں کبھی کبھی نظر آجاتی ہیں تو خدا کی شان نظر آتی ہے کہ دنیا بھر میں ان سے بڑھ کر حسین عورتیں شاید ہی کہیں ہوں کہ حسین آنکھوں اور خوبصورت بالوں کا امتزاج منگولین چہروں سے غیر معمولی حسن کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے کہ بعض چہرے میری آنکھوں میں ہیں۔ ہندوستان بھی عجیب جگہ ہے یہاں ہر چیز میں تضاد ہے کہ ایسی بھی بری شکلیں ہیں کہ کبھی اور نظر نہ آئیں اور ایسا بھی حسن ہے کہ آنکھوں کو یقین نہ آئے۔

کلکتہ بہت بڑا ہے مگر سوائے چند مقامات کے یہ شہر خوبصورت نہیں ہے۔ چورنگی، میدان کا علاقہ بلاشبہ بہت اچھا ہے کہ جنوبی کلکتہ میں بعض مقامات خصوصاً وہ علاقہ جو مصنوعی جھیلوں سے قریب ہے بہت اچھا ہے مگر عام طور پر یہاں گندگی بہت ہے۔ بمبئی کلکتہ کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے مگر اس کی خوبصورتی بے مثال ہے۔ قدرت نے بھی اس کو اپنی فیاضی سے نوازا ہے۔ اس شہر کا محلِ وقوع ایسا ہے کہ اسے خوبصورت بننے میں کوئی مشکل نہیں۔ شہر بمبئی جزیرہ پر ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہے کہ وہاں کے لوگ اسے شروع ہی سے سلیقے سے بنانے پر مجبور تھے۔

سمندر کی وجہ سے یہ شہر بہت پُرفضا اور خوبصورت لگتا ہے۔ کلکتہ کو یہ خوبی نصیب نہیں۔ سمندر ہی کی وجہ سے بمبئی میں بے انتہا تفریح کے مقامات نکل آتے ہیں کہ کلکتہ میں ایسے مقامات نہیں ہیں کہ ایک دو جگہیں ہیں لیکن کوئی کب تک جائے۔

ہاں، کلکتہ میں بہت سے قابلِ دید مقامات ہیں، وسیع میدان، وکٹوریہ میموریل اور میوزیم، میوزیم اتنا وسیع ہے کہ تفصیلی طور پر دیکھنے کے لیے کئی دن چاہئیں۔ یہاں کا علی پور کا چڑیا گھر ساری دنیا میں مشہور ہے۔ بمبئی کا رانی باغ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں کہ اس میں ساری دنیا کے پرندے اور جانور جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کو کئی باتوں میں لاثانی سمجھا جاتا ہے کہ اس کی تفصیل کے لیے ایک علیحدہ مضمون چاہیے۔ حال ہی میں اس میں ایک سفید شیر کا اضافہ ہوا ہے کہ اس چڑیا گھر کی خوبی یہ ہے کہ یہ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے کشش رکھتا ہے اور ایک بار دیکھنے سے دل سیر نہیں ہوتا۔ اسی لیے ہر چھٹی کے دن ایک میلا سا لگا رہتا ہے۔ کلکتے سے قریب ہی نباتاتی باغ ہے (BOTANICAL GARDEN) سارے ہندوستان میں اس جیسا باغ نہیں۔ یہاں کا بڑ کا درخت انتہا پھیلا ہوا اور وسیع ہے کہ اتنا بڑا درخت پوری دنیا اور کہیں نہیں ہے۔ ساری دنیا کے پودے یہاں لگائے گئے ہیں۔ اور جو لوگ Botany پڑھتے ہیں ان کے لیے یہاں کئی کئی دن گزارنا انتہائی ضروری ہے مگر دوسروں کے لیے بھی اس باغ میں بے شمار درخت اور پودے دلچسپی کا باعث ہیں۔ برازیل سے لائے ہوئے کنول کی یہ خوبی ہے کہ اس کے پتے کنگورے والے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ کشتی کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔

چورنگی کی سب ہی تعریف کرتے ہیں ہے تو خوبصورت مگر وہاں کی بھیڑ بھاڑ سے طبیعت گھبراتی ہے کہ پہلے اس کا یہ حال نہ تھا اب اتنے لوگ یہاں سے ہر وقت گزرتے ہیں کہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے بالکل قریب نیو مارکیٹ ہے کہ ایک چھت کے نیچے یہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے مگر جو لوگ شاپنگ کے لیے آتے ہیں وہ بھی کافی اونچے معیار کے ہوتے ہیں کہ بہت سے لوگ تو یہاں یوں ہی نظارے کے لیے آتے ہیں کہ بہت سی عورتیں تکا دیکھ کر گھومتی رہتی ہیں اور بہت سی نظریں قدردانی کے لیے جمع ہو جاتی ہیں کہ یہاں قیمتیں نسبتاً زیادہ ہوتی ہیں مگر بعض دفعہ چیزیں اچھی مل جاتی ہیں کہ ایسا کوئی مارکیٹ بمبئی کیا ہندوستان میں نہیں ہے۔ میں جب بھی گوری ہاٹ شاپنگ کے لیے جاتی ہوں تو مجھے بمبئی کا دادر یاد آتا ہے۔ بمبئی کے دورانِ قیام میں اکثر دادر ہی میں شاپنگ کرتی تھی جس طرح دادر مارکیٹ اوسط طبقے کے لیے موزوں ہے

سی طرح گوری ہاٹ کا مکٹ کلکتہ میں ہے۔ کلکتہ میں
ئی کلاباجیسی مارکیٹ نہیں ہے۔ کلاباتو بمبئی کا
ارنی وال ہے۔ ایسا کارنی وال کلکتہ میں کہیں نہیں
ہے۔

بمبئی کا نہ مالا بار ہل، نہ ہینگنگ گارڈس اور
مرین ڈرائیو، کلکتہ کو میسر ہے۔ ہوگلی ندی پر اگر
رین ڈرائیو بنا بھی لیں تو سمندر کی موجیں کہاں ملیں گی
ور اس پر روزانہ ہوا کھانے والے بمبئی کی طرح کہاں
سے آئیں گے۔ گیٹ وے آف انڈیا اور اس کی
پہاڑیوں کا منظر کلکتہ کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہاں
مچھلی کھانے والے بہت ہیں مگر ان کی پرورش کا شوق
نہیں۔ اس لئے تاراپور والا اکویریم جیسا کوئی اکویریم
نہیں۔ ہاں یہیں میں کلکتہ کو یہ بہت اچھی چیز مل گئی
ہے۔ وہ برلا پلانیٹوریم ہے۔ میدان کے مشرقی جانب
سینٹ کیتھڈرل St. Cathedral سے بہت
قریب یہ پلانیٹوریم بنا ہے۔ کہتے ہیں ایشیا میں اپنی
نوعیت کا یہ ایک ہی ہے۔ اس میں آسمان کے
تارے اور ان کی کیفیت دکھائی گئی ہے۔ اس عمارت
کا اندرونی حصہ بالکل آسمانی منظر پیش کرتا ہے۔
۴۵ منٹ کا یہ شو دیکھنے کے لئے سارے ہندستان
سے لوگ آتے ہیں۔ کلکتہ آنے والا ہر شخص اسے
دیکھنے ضرور جاتا ہے۔ اس وقت تو یہ کلکتہ کی نادر
چیز ہے۔

ہوڑہ برج یہاں کی بہت خاص جگہ
ہے۔ اس کو انجینیرنگ کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ ہوگلی
ندی جسے یہاں گنگا کہا جاتا ہے، اس مقام پر
کافی چوڑی ہے۔ پھر بھی ہوڑہ برج پورے کا پورا
پر دو کھمبوں پر لٹک رہا ہے۔ اس پر آمدورفت
کی اتنی کثرت ہے کہ دن بھر میں لاکھوں انسان اور
ہزاروں گاڑیاں گزر جاتی ہیں۔ اتنی بھیڑ بھاڑ ہوتی
ہے کہ پیدل چلنے والوں کو صرف پل پار کرنے کے لئے تقریباً
ایک گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ ٹرین چوک جانے کے خطرے
سے بچنا ہو تو آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے کا وقفہ اس
پل پر سے گزرنے کے لئے رکھنا چاہئے۔

اس پل پر سے بڑے بڑے جہاز اور چھوٹی
بڑی کشتیوں کا نظارہ کیا جا سکتا ہے جو ہوگلی ندی میں
کثرت سے ہوتے ہیں۔ روزانہ دو بار ندی میں پانی چڑھتا
ہے اور اس وقت ایک خاص منظر ہوتا ہے۔ پل سے
بالکل قریب ہی مقدس گھاٹ ہیں۔ صبح کے وقت
ہزاروں مرد اور عورتیں اشنان کے لئے آتی ہیں کیونکہ
ہوگلی ندی بھی مقدس ہے اور یہاں گنگا کہلاتی ہے۔
اس کے علاوہ شہر کے قریب بھی ایک نہر ہے
جسے ادی گنگا (چھوٹی گنگا) کہتے ہیں۔ جس وقت
سمندر میں پانی چڑھتا ہے تو اس میں بھی کافی پانی
آجاتا ہے اور کشتیاں چلنے لگتی ہیں۔ ورنہ یہ ایک
معمولی نالے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس نہر کے ذریعے
سامان دور دراز مقامات سے کلکتہ کو لایا جاتا ہے
مگر اس کی افادیت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ
اس میں ریت کی زیادتی ہو جانے کی وجہ سے یہ
نہر اتنی کارآمد نہیں رہی ہے اور اکثر اوقات کشتیاں
ریت میں پھنس جاتی ہیں، اور پھر پانی چڑھنے
کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ نہر یا چھوٹی ندی بڑی
مقدس سمجھی جاتی ہے اور عقیدت مند ہندو اس میں
اشنان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی نہر
پر مشہور کالی گھاٹ ہے۔

بمبئی میں ممبا دیوی کے علاوہ اور بہت
سی دیویاں ہیں، مگر کلکتہ میں صرف کالی ماتا کا راج
معلوم ہوتا ہے۔ بنگالی ہندو کالی ماتا کے بے حد
معتقد ہوتے ہیں۔ اس دیوی کا جہاں مندر ہے
اس علاقے کو کالی گھاٹ کہتے ہیں۔ یہاں رات
دن ہزاروں انسانوں کا مجمع رہتا ہے۔ کلکتہ پوجاؤں
کا شہر ہے اور یہاں کے باشندے بڑے فخر سے اس
حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ سال کے ۱۲ مہینوں
میں اُن کے ہاں ۱۳ پوجا [illegible] ہیں۔ مگر درگا پوجا
یہاں کا سب سے اہم تہوار اور بڑی پوجا کا موقع
ہے۔ اس زمانے میں بنگالی ہوش میں نہیں ہوتے
کوئی کام کے موڈ میں نہیں رہتا۔ کورٹ اور مدارس
کو لمبی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ مدارس تو مہینے ڈیڑھ مہینے
کے لئے بند ہو جاتے ہیں، دفاتر بھی ہفتہ دو ہفتے کے
لئے بند ہو جاتے ہیں۔ بنگالی مرد اور عورتیں اچھے
اچھے کپڑوں میں ملبوس پنڈالوں کے چکر لگاتے
ہیں جس میں درگا ماتا کے مجسمے نصب ہوتے ہیں۔
پنڈالوں کے سجانے میں زبردست مقابلہ ہوتا ہے۔

تھیٹر یہاں بھی ہیں، بیسٹرڈ کا لائٹ ہوٹل
جیوتی وغیرہ، مگر بمبئی اس معاملے میں بہت آگے ہے۔
ریگل، لبرٹی، مراٹھا مندر اور ایروز کا کوئی مقابلہ
نہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پکچر جانے میں وہ لطف
نہیں جو بمبئی میں ہے۔ پکچر تو وہی ہوتے ہیں، ایر
کنڈیشنڈ ہال بھی ہیں مگر بمبئی میں جو Crowd
ہوتا ہے وہ یہاں نہیں ہوتا۔ مجھے ان سنیما گھروں
کا تجربہ نہیں جہاں صرف بنگالی پکچرز دکھائی جاتی ہیں
مگر جہاں انگریزی اور ہندی کے پکچرز دکھلائی جاتی ہیں وہاں
کوئی اچھی gathering نہیں ہوتی۔ پکچر میں
تالیاں بجانا اور کھڑے ہو کر داد دینا اونچے درجوں
میں بھی عام ہے۔

بمبئی کی سڑکوں کے مقابلے میں یہاں کی
سڑکیں بہت چوڑی ہیں اور بہت دور دور تک
سیدھی ہوتی ہیں۔ بڑی سڑکیں اور شاہراہیں
یہاں بھی بہت صاف رہتی ہیں۔ یہاں کی اہم
سڑکیں روزانہ پانی سے دھلتی ہیں۔ گنگا کا پانی
شہر کے ہر علاقے میں پہنچا دیا گیا ہے۔ پانی بہتا
رہتا ہے اور لوگ اسی میں برتن دھوتے ہیں اور اسی
میں نہاتے ہیں اور اسی سڑک پر تھوڑی دور بہنے
کے بعد وہ پانی زیر زمین نالی میں چلا جاتا ہے۔ اسی
پانی سے پائپ کے ذریعے ہر روز صبح سڑکیں دھوئی
جاتی ہیں۔ اس قسم کا کوئی انتظام بمبئی میں نہیں ہے۔

اگرچہ بمبئی میں سڑکوں پر کوڑا کرکٹ کم ہوتا ہے مگر جا بجا دھبے نظر آتے ہیں۔ یہاں کی پارک اسٹریٹ اور اس کے قرب و جوار کی سڑکیں بہت اچھی ہیں ... پارک اسٹریٹ اپنی عمارتوں اور نائٹ کلب کی وجہ سے بالکل لندن کی اسٹرینڈ روڈ کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ ہر روز شام میں یہاں بہت چہل پہل رہتی ہے اور متمول لوگ نائٹ کلبس میں کھچا کھچ بھرے رہتے ہیں۔ باوجودیکہ یہ نائٹ کلب اور اس قسم کے بعض ہوٹل بہت گراں ہیں اور اوسط درجے یا اس سے بھی اونچے درجے کی دسترس سے باہر ہیں لیکن ان پر اتنا ہجوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنی باری کے لیے کیو میں کھڑے رہتے ہیں۔ یہ بھی ہندوستان کے تضاد کا ایک اور پہلو ہے کہ جہاں اس کے بہت سے باشندے ایک وقت کی روٹی کے لیے ترستے ہیں وہیں اس کے چند باشندے ایسے بھی ہیں جو روپیہ پانی کی طرح بہانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔

پارک اسٹریٹ اور اس کے قرب و جوار کی سڑکیں ایک زمانے میں مٹی کے تیل (Kerosene oil) سے دھوئی جاتی تھیں تاکہ خوب سیاہ نظر آئیں یہاں کی ریڈ روڈ مشہور ہے۔ اب تو یہ سڑک بھی دوسری اور سڑکوں کی طرح سیاہ ہے مگر جس وقت بنی تھی تو سرخ تھی۔ اسی لیے اس کا نام ریڈ روڈ پڑ گیا۔ یہ سڑک اتنی چوڑی ہے کہ پچھلی جنگ عظیم میں اسے ہوائی جہازوں کے اترنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جب بھی میں اس سڑک پر سے گزرتی ہوں تو کسی والا یہ ذکر کیے بغیر نہیں رہتا کہ ایک زمانے میں کوئی ہندوستانی اس سڑک سے نہیں گزر سکتا تھا۔ اگر کوئی ہندوستانی نظر آ جاتا تو شبے میں اسے گرفتار کر لیا جاتا۔ بمبئی کی طرح قرینے کی عمارتیں یہاں نہیں ملتیں۔ ایک بہت دلچسپ عمارت ہوگی جس پر ہم منزلہ ... ... بھی نظر آئے گی۔ بمبئی میں اتنا اونچا نیچ نہیں ہے مگر دونوں شہروں میں ایک برائی مشترک ہے۔ وہ یہ کہ کسی بھی بڑی اور شاندار سڑک کے تھوڑا پیچھے چلے جائیے اور گندگی کی کمی نہیں۔ کلکتہ میں گندگی زیادہ ہے اور بمبئی میں کم۔ پارک سرکس جو کہ بہت اچھی بستی ہے مگر اکثر جگہ سڑکوں پر بجائے نہر گندی نالیاں بہتی ہیں۔ بمبئی میں ایسا نہیں ہے کیونکہ وہاں کے لوگ شہری سوجھ بوجھ ذرا زیادہ رکھتے ہیں۔ یہاں کے رائج بھون کی دیواروں پر بھی (Don't Commit Nuisance) گندگی مت کرو لکھی ہوئی تختیاں ملیں گی۔ یہ تختیاں کلکتہ میں بہت عام ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تختیاں انگریزی میں ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گندگی کرنے والے انگریزی داں اور تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ بعض وقت تو آدمی سڑک گندگی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور وہاں سے گزرنا مشکل ہوتا ہے۔ بنگالی اپنے شہر کی اس گندگی پر بہت شرمندہ ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ اس کے ذمے دار باہر کے آنے والے ہیں، وہ نہیں۔

کلکتہ کی ٹیکسی سروس بمبئی سے اچھی ہے۔ کرایہ تو وہی ہے مگر ٹیکسی بڑی ہوتی ہے اور بمبئی کی طرح صرف تین آدمی لینے پر اصرار نہیں ہوتا۔ ٹیکسیوں کی تعداد بمبئی سے زیادہ ہے مگر پھر بھی کم ہے کیونکہ شہر بہت بڑا اور پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ بمبئی میں میں سردار جی کی ٹیکسی لیتے ہوئے گھبراتی تھی، اور انتہائی مجبوری کے عالم میں لیتی کیونکہ اکثر ایسا ہوا کہ سردار جی نے اترتے وقت جھگڑا کیا۔ کلکتہ میں اکثر ٹیکسی ڈرائیور سردار جی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ یہاں مروت اور شرافت کا نمونہ ہیں۔ پتا نہیں یہ فرق کیوں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کلکتہ کی پبلک ہی ایسی ہے کہ سردار جی برا برتاؤ نہیں کر سکتے، مگر میں نہیں سمجھتی کہ یہ وجہ صحیح تھی ہے۔ دلی میں بھی سردار جی ڈرائیور بہت اچھے اور نیک ہوتے ہیں۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ جہاں وہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں وہاں اپنی برادری کا احترام ان پر ایسا ہوتا ہے کہ وہ کوئی بری حرکت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بمبئی میں وہ ابھی زیادہ نہیں ہیں بلکہ کلکتہ اور دلی میں وہ بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

بمبئی اور کلکتہ کی بسوں اور ٹراموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ٹرام سروس یہاں کی بہت اچھی ہے۔ بھیڑ تو اس میں بھی ہوتی ہے اور بالکل اسی طرح جس طرح بمبئی کی مضافاتی ریل گاڑیوں (Local Trains) میں۔ مگر یہاں ٹرامیں شہر کے مختلف حصوں میں جاتی ہیں۔ کلکتہ میں ٹرام سروس کا ایک جال بچھا ہوا ہے جبکہ بمبئی میں ٹرام سروس بہت کم تھی اور اب وہ بھی دلی کی طرح بند ہو گئی ہے اور اغلب ہے کہ چند دنوں میں بالکل ختم کر دی جائے گی۔ ×

کلکتہ کی ٹراموں میں فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس ہوتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا کرایہ سکنڈ کلاس سے ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ چھ سات پیسوں میں سکنڈ کلاس اور سکنڈ کلاس میں لوگ لمبے لمبے فاصلے طے کرتے ہیں۔ یہاں کی ٹرامیں بہت تیز دوڑتی ہیں اتنی تیز کہ کبھی کبھی ٹرین کی رفتار تک پہنچ جاتی ہیں۔

لیکن بس سروس کی دوسری ہی روداد ہے۔ بمبئی میں بہترین قسم کی بس سروس اور اس سے سفر کرنا آسان ہے۔ کلکتہ کی بس سروس کیا ہے یہ مشکل ہے۔ ان بسوں میں بیٹھنے والوں سے زیادہ کھڑے رہنے والوں اور باہر لٹکنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں لوگ تین تین چار چار قطاروں میں نہ صرف سیٹوں کی سیدھی اور بائیں قطاروں کے درمیان کھڑے رہتے ہیں بلکہ دو سیٹوں کے درمیان بھی گھس جاتے ہیں۔ بیٹھنے والے کچھ نہیں کہتے۔

× آپ کی پیشین گوئی صحیح نکلی، ٹرام کلکتہ سے بالکل ختم ہو چکی ہے۔

لے وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ بیٹھنے
سیٹ تو ملی۔ باہر بھی لوگ لٹکتے ہیں۔ فٹ بورڈ
۲۰، ۲۵ مسافروں کا کھڑا رہنا تو عام اور معمولی
ت ہے۔ جن بسوں کا دروازہ سامنے کی طرف
ن سے قریب ہوتا ہے اس میں لوگ مڈگارڈ
ہک پیر لٹکائے ہوئے یا بیٹھے ہوئے نظر آتے
،۔ بعض اوقات تو پیر بھی ٹکے ہوئے نہیں ہوتے
لے ہوا میں لٹکتے رہتے ہیں اور وہ صرف ہاتھوں
سے اپنے کو سنبھالے رہتے ہیں، اس پر کمال
ہے کہ بس خوب تیز دوڑتی ہے کہ ان کی رفتار
بمبئی کی ایکسپریس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔
یاں کوئی ایکسپریس بس نہیں ہوتی کہ آفس کے
قات میں چند اسپیشل بسیں چلتی ہیں اُن کی
تار تو اور بہت زیادہ ہوتی ہے کہ بس تیز
چلانا ضروری ہے ورنہ ہنگامہ ہو جائے۔ مسافر
پسند نہیں کرتے کہ بس آہستہ چلے چنانچہ مجھے انتہائی
حیرت ہوئی جب میں نے یہاں کی بسوں میں یہ تختیاں
لکھی ہوئی دیکھیں ــــ "پاسنجروں سے استدعا
کی جاتی ہے کہ وہ بس ڈرائیور کو ۲۵ میل فی گھنٹہ
کی رفتار سے زیادہ تیز چلانے پر مجبور نہ کریں"۔

بسوں میں بے گنتی مسافر لیے جاتے
ہیں کیونکہ یہاں کوئی سسٹم نہیں ہے۔ بس اسٹاپ پر
رکنا ضروری نہیں جہاں بس رکی لوگ چڑھ جاتے
ہیں کہ صرف پیر یا انگوٹھا رکھنے کو جگہ ہو تو کافی ہے۔

ٹرافک لائٹ کے پاس لوگ مستقل کھڑے
رہتے ہیں تاکہ بس رکے تو چڑھ جائیں۔ وہاں
سے چند قدم چل کر بس اسٹاپ پر کون جائے ــ
اس میں یہ بات بھی ہے کہ اگر بس بہت بھری ہو
اور کوئی پاسنجر اترنے والا نہ ہو تو بہت ممکن ہے کہ بس
نہ رکے لیکن ٹرافک لائٹ پر ضرور رکے گی نتیجہ یہ
ہے کہ ٹرافک لائٹ کے پاس اس طرح کا مستقل
بس اسٹاپ قائم ہو جاتا ہے۔ یہاں کا کنڈکٹر بس

کی بھیڑ بھاڑ میں چھپا معلوم ہوتا ہے۔ غریب کسی
کونے میں دبا کھڑا رہتا ہے اور ٹکٹ لینے کے لیے
اس طرح بولتا ہے کہ گویا بھیک مانگ رہا ہے۔
لوگ فٹ بورڈ پر کھڑا رہنا اور باہر لٹکنا اس لیے بھی
پسند کرتے ہیں کہ ایک تو بس چلتے وقت ہوا خوب
لگتی ہے اور بڑا فائدہ یہ کہ ٹکٹ لینے کی نوبت نہیں
آتی، اور اگر نوبت آ بھی جائے تو کسی بھی بہانے سے
فوراً اتر جائیں۔ بمبئی کی بس سروس کا کنڈکٹر اس
کے مقابلے میں ڈکٹیٹر ہے، اگر بس میں ۱۲ مسافر کھڑا
ہونے کی اجازت ہے تو وہ ۱۰ لے گا، ۱۳ کبھی نہیں
لے گا، بس اسٹاپ کے سوا کوئی بس پر نہیں چڑھ سکتا
ٹکٹ ایسے وصول کرتا ہے جیسے کوئی فاتح اعظم خراج وصول
کرتا ہے۔ کئی بار میں نے بڑی بے بسی محسوس کی ہے کہ
کہ بہت بڑی بس ہے کوئی پاسنجر کھڑا نہیں ہے مگر کنڈکٹر
مجھے داخل نہیں ہونے دے گا کیونکہ اس کا ساتھی
کنڈکٹر غیر حاضر ہے۔

عورتوں کے لیے کلکتہ میں خاص مراعات ہیں۔
بمبئی میں اگر جگہ ملے تو ٹھیک ورنہ کھڑے رہیں چاہے
بچہ ہی گود میں کیوں نہ ہو۔ کوئی رحم کھائے تو اور بات
ہے ورنہ کھڑے رہ کر ہی سفر کرنا ہوگا۔ کلکتہ میں ایسا
نہیں ہے کہ یہاں اس معاملے میں عورتیں بہت
خوش نصیب ہیں۔ لیڈیز سیٹ مقرر ہوتی ہے مرد
بھی بیٹھ سکتے ہیں اگر عورتیں نہ ہوں تو، مگر کوئی
آجائے تو فوراً اٹھ کر جگہ دینی پڑتی ہے۔

چلتی بسوں میں لوگ چڑھتے اور اترتے
رہتے ہیں۔ صرف لیڈیز کے لیے اصلی معنوں میں بسیں
کھڑی رہتی ہیں، اگر کوئی خاتون چڑھنے والی ہو تو
ڈرائیور خود خیال رکھتا ہے، مگر لطف اس وقت
آتا ہے جبکہ کوئی خاتون اترنا چاہتی ہو اور کنڈکٹر
ڈرائیور کو اشارہ دیتا ہے "آہستہ لیڈی جاتا ہے"!
عورتیں اس پر بہت خوش ہوتی ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں حادثات بمبئی
کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کی
وجہ یہ ہے کہ سڑکیں سیدھی اور کشادہ ہیں ورنہ
ٹرافک کا جیسا اچھا انتظام بمبئی میں ہے وہ یہاں
نہیں، یہاں تو کسی بھی جانب سے گاڑیاں نکل
جاتی ہیں۔

کلکتہ میں مدارس بہت اچھے ہیں تعلیمی
معیار بمبئی سے اونچا ہے۔ کانونٹ کے داخلوں
میں وہی مشکلات ہیں جو بمبئی میں ہیں۔ چھٹیاں
بمبئی سے کہیں زیادہ ہیں۔ سال میں تین لمبی چھٹیاں
دسمبر، مئی اور اکتوبر یعنی پوجا کے زمانے میں۔ طلبا
کی ہڑتال یا کسی اور وجہ سے مدارس بند کر دینا
کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بیچارے والدین بڑی بڑی
فیس دے کر بچوں کو داخل کرتے ہیں شرکت
کے لیے کئی چکر کاٹتے ہیں لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
چند مہینے تعلیم ہوتی ہے، معیار جتنا سخت ہے اتنی
ہی سخت محنت کورس کی تکمیل کے لیے والدین کو ٹیوشن
کے ذریعے کرنی ہوتی ہے۔

کلکتہ کی آب و ہوا کے متعلق کچھ نہ پوچھیے
یہ اس لحاظ سے ہندوستان کا نمبر (۱) شہر ہے،
اس کے بعد مدراس اور بمبئی کا نمبر ہے۔ آخر فروری
سے گرمی شروع ہوتی ہے، چونکہ اطراف و اکناف
میں پانی جمع رہتا ہے اس لیے گرمی کے ساتھ رطوبت
شروع ہو جاتی ہے اور پسینا بہنے لگتا ہے۔ مئی
تک گرمی بڑھتی جاتی ہے، مگر اتنی تکلیف دہ
نہیں ہوتی جتنی کہ جون کے بعد ہوتی ہے۔ مئی
تک دو چار دن میں ایک بار بارش ضرور ہو جاتی
ہے، اس کو یہاں ... ویسٹر کہتے ہیں، اس کی وجہ
ٹھنڈا موسم ہوتا ... ہے۔ جون میں حالت خراب
ہو جاتی ہے، ... بہت جاتا ہے کہ یہ حال
ختم ... رہتا ہے، اس کے بعد موسم ٹھنڈا
ہو جاتا ہے اور سردیوں کا زمانہ عام طور پر اچھا سمجھا
جاتا ہے، اس وقت یہاں بڑی چہل پہل ہو جاتی ہے

خطوط

ڈویژنل آفیسر ہمدرد دواخانہ ـــــــــ دہلی

آپ کا تار ملا۔ ہمدردی اور محبت کا شکریہ۔ بدقسمتی سے کچھ اخباروں میں جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ (وقف) دہلی سے متعلق غلط خبر چھپ گئی۔ جب ہمیں معلوم ہوا تو جن اخباروں کے نام معلوم ہوسکے اُن کو تار دئے اور خطوط بھیجے۔ اُمید ہے ان اخباروں نے اب صحیح خبر بھی شائع کردی ہوگی۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس غلط خبر سے ہمارے کرم فرماؤں کو تکلیف ہوئی۔

پھر بھی ہمدرد دواخانہ ایک بہت بڑے صدمہ اور نقصان سے دوچار ہوا ہے۔ صورت یہ ہے کہ ۲۷ مئی ۶۴ء کی شام کو پنڈت جواہرلال نہرو کی موت کی خبر سے متاثر ہوکر بالکل اچانک طور پر ہمدرد دواخانہ دہلی کے ایڈمنسٹریٹر کا انتقال ہوگیا۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب مرحوم کا پورا نام ماسٹر عبدالمجید خاں تھا۔

ہمدرد دواخانہ دہلی کے متولی یعنی جناب حکیم حاجی عبدالحمید صاحب بفضل تعالیٰ بخیریت ہیں گو ان پر اپنے عزیز ساتھی کے انتقال کا زبردست اثر ہے۔

اس صحیح صورتِ حال سے آپ اپنے طور پر جتنے کرم فرماؤں کو واقف کراسکیں کرادیں۔ اس کے لئے ہم آپ کے شکرگزار ہوں گے۔

شاذ تمکنت ـــــــــ حیدرآباد

میں اچھا ہوں۔ تمہارا خط ملا تھا۔ جواب بروقت نہ دے سکا۔ معاف کردو۔

دورِ حیات چھپنے لگا ہے۔ درمیان میں مجھ پر غائب کیوں تھا۔ نظم بھیجوں گا۔ ضرور بھیجوں گا۔ کیا معاوضہ کی رسم اُٹھا دی ہے؟ ضرور لکھنا۔

ظ۔ انصاری صاحب کیا اب بھی تمہارے معاون ہیں؟۔

دورِ حیات کے سلسلے میں پبلک کا بے حد اصرار ہے کہ معیار کچھ اونچا ہو۔ کیا تم اس احتجاج کو سننا پسند کروگے!۔

جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ ضرور بھیجئے

مظفر حنفی ہسوی ـــــــــ بھوپال

باقاعدگی سے دورِ حیات دیکھ رہا ہوں۔ جانے میں غلط زاویے سے آنکتا ہوں یا کیا، کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ اوّلین دور والی بات اس پرچے سے اُٹھتی جارہی ہے۔ آپ کے اداریوں میں بھی ایک بانکپن ہوتا تھا۔ قاری مفت اس سے محروم کر دئے گئے۔

اداریہ محمود الحسینی صاحب کا مضمون جمہوریت کے متعلق دیکھا تھا۔ اس میں مقالہ نگار سے کئی جگہ مجھے بھی اختلاف ہے لیکن دیکھتا ہوں کہ کلیم سین نے اپنے جوابی مضمون میں جس نہج سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے وہ کچھ اس قسم کا ہے جیسے ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایک امیدوار اپنے مخالف کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سنجیدہ باتیں جب غیر سنجیدہ انداز میں کہی جاتی ہیں تو اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔

عشرت قادری ـــــــــ بھوپال

دورِ حیات تقریباً تاریخ اجراء سے اب تک برابر مل رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی کسی ہفتہ پرچہ ڈاک میں گم بھی ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی جمہوریت کا کوئی اصول ہو۔ اس لئے کہ شکایت کرنے پر کچھ اور بھی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی وضعداری کیلئے سراپا سپاس ہوں اور اپنی کوتاہ قلمی کے لئے دست بستہ معذرت خواہ۔

احفاظ حسن ـــــــــ بنگلور

آپ کے پرچے میں تنوع رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین مل جاتے ہیں جو آج کے اردو پرچوں کا وطیرہ نہیں ہے لیکن ایک بات ہے کہ ان میں گہرائی نہیں ہوتی۔ یہ صرف دل کو چھوکر نکل جاتے ہیں بس نہیں جاتے۔ کچھ ایسا انتظام کیجئے کہ ایک ہی مضمون ہو مگر چوٹی کا ہو۔ یہ اردو زبان کی خدمت ہوگی۔ ادب کے لئے تو کافی پرچے ہیں۔

ہفت روزہ

...ورچپاٹ

...س بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی ۳

جلد ... | ۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۲۵

اس شمارے میں

سالانہ : دس روپے

فی پرچہ : تیس پیسے

ایڈیٹر

قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- روس نے ہندوستان کو بغیر کسی شرط کے فوجی امداد دینے کی پیش کش کی ہے۔
- طالب علموں نے اڑیسہ اسمبلی میں گھس کر ہنگامہ برپا کر دیا۔
- گونڈہ کی انتخابی عذرداری کے فیصلے کی بنا پر یو۔ پی اسمبلی کے ممبروں نے سابق وزیرِ اعلیٰ مسز سی۔ بی گپتا کے خلاف اسمبلی میں تحریک مذمت کا مطالبہ کیا۔
- ملیشیا میں ہنگامی صورتِ حال کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ ملیشیا پر انڈونیشیا کے بڑھتے ہوئے فوجی حملوں کی وجہ سے لیا گیا۔
- ایک اطلاع کے مطابق چینی سپاہی سکم میں داخل ہو گئے ہیں۔
- مسٹر سورن سنگھ وزیرِ خارجہ برما کے دورے پر روانہ ہوئے۔
- مسٹر جے پرکاش نارائن اپنے ۵ ساتھیوں کے ہمراہ پاکستان کے خیر سگالی دورے پر روانہ ہوئے۔ وہ پاکستان کے لیڈروں سے کشمیر کے سوال پر بات چیت کریں گے۔
- مسٹر شاستری کی حکومت کے خلاف پارلیمنٹ میں تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی۔ ڈیڑھ سال کے عرصے میں یہ دوسری تحریک عدم اعتماد ہے۔ پہلی تحریک پنڈت نہرو مرحوم کی حکومت کے خلاف پیش ہوئی تھی۔
- کیرالا میں مسٹر شنکر کی کانگریسی وزارت عدم اعتماد کا شکار ہو گئی۔ آزادی کے بعد کسی وزارت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پاس ہونے کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔ پہلی وزارت جو تحریک عدم اعتماد کا نشانہ بنی پنجاب میں مسٹر سچر کی وزارت تھی۔
- اڑیسہ اسمبلی میں طلباء کے ہنگامے کو روکنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے وزیرِ اعلیٰ مسٹر بیرن مترا نے استعفیٰ دیدیا ہے۔
- خان عبدالغفار خاں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مصالحت کرانے کے لئے خود کی خدمات پیش کی ہیں۔
- دہلی میں سالسٹر جنرل مسٹر سانیال کو ڈاکوؤں نے قتل کر دیا۔

مظہر امام

غزل

کم ظرف ہیں، تنقید سے بیزار رہے ہیں
کہنے کو تو یہ لوگ قدح خوار رہے ہیں

زردار کے کوچے میں لئے پھرتے ہیں کشکول
جو انجمنِ ناز میں خوددار رہے ہیں

وہ بھی نہ ہوئے رسم محبت سے شناسا
جو لوگ کہ رسوا سرِ بازار رہے ہیں

جتنی بھی ہو تو قیمت تو لگا دیجے وفا کی
ہم جنسِ گراں ہی کے خریدار رہے ہیں

میری ہی طرح کرتے ہیں اک اک کی شکایت
جو اپنے ہی خوابوں کے پرستار رہے ہیں

افتخار اعظمی

چار شعر

تیرگی باعثِ رسوائی محفل ہوگی
آتشِ دل ہی جلے آج سحر ہونے تک

مشعلِ خونِ جگر یونہی فروزاں دیکھو
دوستو معرکۂ عشق کے سر ہونے تک

دیکھتا کیا ہے اٹھا اے راہروِ راہِ طلب
منزلیں دور ہیں سرگرمِ سفر ہونے تک

زخم گہرے ہیں عمل ہی کو مسیحا کرلیں
جانے کیا گذرے دعاؤں میں اثر ہونے تک

— جے پرکاش نارائن

تین محاذ

چین اور پاکستان کے بارے میں اپنی حالیہ تحریروں اور بیانات کے سلسلے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے، شری جے پرکاش نرائن جی نے پونا میں حسب ذیل بیان جاری کیا ہے۔

یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عوامی مسائل پر گفتگو کے دوران ہم لوگ کسی چیز کو صحیح سمجھنے کے بجائے غلط سمجھنے اور بدگمانی کے لئے زیادہ تیار رہتے ہیں۔ لیکن شاید اس کی شکایت مجھے نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ میں نے جان بوجھ کر ہی عوامی رائے پر جمے ہوئے گرد و غبار دُور کرنے اور روانی سے بے نیاز تالاب میں بڑے بڑے پتھر پھینکنے کی ذمہ داری قبول کی ہے۔ یہ باتیں میں اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ عوام کی نامقبولیت مجھے اچھی لگتی ہے۔ بلکہ کٹھنائی سہتے اور اپنا عوامی فرض سمجھتے ہوئے ہی میں ایسا کر سکتا ہوں۔ مگر میں یہ بھی کہہ دوں کہ میرے حالیہ بیانوں پر سرکاری حلقوں میں جو ردِ عمل ہوا ہے اس سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن دوسرے ردِ عمل دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے پیچھے غلط فہمیاں ہیں۔ جنہیں اگر ہو سکے تو میں دُور کرنا چاہوں گا۔

میرا یقین محکم ہے کہ آج کے حالات میں، ایک ساتھ ہم تین الگ الگ مورچوں پر نہیں لڑ سکتے ملک کے اندر غریبی اور بھوک اور سرحد پر چین اور پاکستان سے۔ ان مورچوں پر ایک ساتھ لڑنے کے معنی ہوں گے ہر مورچہ پر شکست کو دعوت دینا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم امریکہ سے گٹھ جوڑ کر لیں۔ لیکن میری نظر میں یہ قطعی نامناسب بات ہوگی۔ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ چاہے ہمیں فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے، ہم لڑتے ہی رہیں گے جو لوگ ایسا کہتے ہیں اُن میں اکثر آسودہ لوگ ہیں۔

غریبی کے مسئلہ کو اولیت دیں

اس لئے میری گزارش ہے کہ دیس کے لوگوں کو طے کرنا چاہئے کہ وہ پہلے کیا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں اولیت اس مسئلے کو دیں کہ ہر بھوکے کو کھانا اور ننگے کو کپڑا مل جائے۔ ہر تندرست آدمی کو ہم کام دے سکیں اور جہاں تک ہو سکے ہر ہندوستانی کنبہ کو اچھی طرح رہنے کے لئے کچھ کم سے کم آمدنی کا بھروسہ دلا سکیں ورنہ اگر بے اطمینانی اور غربت بڑھتی رہے گی اور ساتھ ہی مطلق العنانی اور بے نظمی پیدا کرنے کی دانستہ کوشش ہوتی رہے گی تو اس ملک کا مستقبل زبردست خطرے میں پڑ جائیگا داخلی مورچہ پر جو لڑائی لڑنی ہے، اس کے لئے آج جس قدر ممکن ہے اُس سے کہیں زیادہ ضرورت اپنی طاقتوں اور ذرائع کو یکسوئی کو مجتمع کرنے کی ہے۔ اس یکسوئی کا امکان پیدا کرنے کے لئے ہی میں یہ استدعا کر رہا ہوں کہ دوسرے دو مورچوں پر سمجھوتہ کیا جائے۔ میں گھٹنے ٹیکنے کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ لین دین کی بنیاد پر سیاسی سمجھوتے کی بات کر رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کوشش ناکامیاب ہو، لیکن یہ کامیاب بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کوشش کرنے والی ہے۔ کیونکہ ناکامیاب بھی رہتی ہے تو اس بیچ لوگوں کے مضبوط ہوں گے اور اس ملک کے لئے ہم زیادہ، بین الاقوامی تائید اور حسنِ اعتماد حاصل کر سکیں گے۔

اپنے مشوروں کو پیش کرنے سے پہلے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی کو بُرا بھلا کہنے یا ڈانٹنے ڈپٹنے کی بات نہیں سوچ سکتا۔ پھر وزیر اعظم کے لئے تو کسی بھی طرح نہیں جن کے لئے میرے دل میں انتہائی محبت و احترام ہے لیکن یہ ٹھیک ہے کہ ان کی لال قلعہ والی تقریر کی تعریف کے دوران ہی میں نے کہا تھا کہ مجھے اُن کا یہ کہنا اچھا نہیں لگا کہ چین کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی نہیں بدلی ہے۔ مجھے یہ اس وجہ سے اچھا نہیں لگا کہ میرے خیال سے ایسے رویے سے بین الاقوامی گرہیں ایک دم جم جائیں گی اور تعطل جوں کا توں بنا رہے گا۔ چین بھی یہی زبان استعمال کر سکتا ہے۔ میرے کہنے کا صرف اتنا ہی مطلب تھا۔

ہند پاک اختلافات

جہاں تک ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کا سوال ہے، میں نے اس سلسلے میں ایک نئے زاویۂ نظر کی بات کی ہے۔ اب تک دونوں طرف سے خاص طور پر یہی رُخ رہا کہ جن مسئلوں پر جھگڑا ہے اُن کے حل کرنے پر زور دیا جائے۔ ایک زمانے میں یہ اصول تھا کہ چھوٹے جھگڑوں سے شروعات ہو۔ جب ایک ایک کرکے وہ طے ہوتے جائیں تو بڑے سوال لئے جائیں۔ اس طرح کرتے کرتے جب دونوں ملک کشمیر پر غور کریں گے،

تب تک ایک موافق ماحول بنا رہے گا لیکن ایک طرح سے
دیکھا جائے تو یہ منفی نقطۂ نگاہ ہے اور اگرچہ اس سے کچھ
نتیجہ نکلے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ طریقہ ہمیں زیادہ دور
لے جائے گا۔ اگر مان لیجئے کہ چوٹی کانفرنس میں کشمیر کے
بارے ہی میں بات چیت ہو اور کوئی فائدہ نہ ہو تو دونوں
ہی ملکوں کے لئے تباہی کی بات ہوگی۔ آج تو ہندوستان
اور پاکستان دونوں ہی ملکوں میں کشمیر کے بارے میں
مفروضات اتنے پتھر جیسے ہو گئے ہیں کہ عوامی رائے
چوٹی کانفرنس کی کامیابی کے حسب حال نہیں ہوگی۔
اس لئے میں ایک مثبت طریقہ پیش کر رہا ہوں، یعنی
ایسا طریقہ جو ان جھگڑوں کے پس منظر کی طرف لیجاتا ہے
یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہندپاک تعلقات
کے بیچ خاص طور پر کشمیر کا مسئلہ انتہائی تکلیف دہ
ہے لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ آج دونوں ملکوں کے تعلقات
کی جو حالت ہے، وہ کشمیر ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ کشمیر
اس بیماری کی ایک نشانی ہے۔ اصل بیماری دونوں ملکوں
کے بیچ کی گہری بے اعتمادی ہے۔ ایک کو دوسرے پر شک
رہتا ہے کہ وہ اس کے خلاف خراب سے خراب منصوبے
بنا کر تیاری کر رہا ہے۔ جب تک یہ بے اعتمادی رہتی
ہے تب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ادھر یہ
بھی صحیح ہے کہ بے اعتمادی کہنے سے ہی دور نہیں ہوگی
اپنے ایک حالیہ براڈکاسٹ میں پریسیڈنٹ ایوب خاں
نے دل کی تبدیلی کی مانگ کی تھی اور کہا تھا کہ "ایسی تبدیلی
ہونے پر کوئی بھی مسئلہ حل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"
— یہ ایک بہت دانشمندی کی بات ہے۔ اب
فریقین کو مل کر یہ سوچنا چاہئے کہ یہ دل کی تبدیلی کیسے ہو؟
دوسرے الفاظ میں بے اعتمادی کی جگہ اعتماد کیسے پیدا ہو؟
میری عاجزانہ رائے ہے کہ اس کا راستہ یہ نہیں ہے کہ
ہم اپنے جھگڑوں اور اختلافات کا ڈھنکا پیٹتے رہیں بلکہ،
یہ ہے کہ ہم ایک ساتھ بیٹھیں اور یہ دیکھیں کہ کیا ایک
جیسے مفاد کے کچھ ایسے مسائل ہیں جن میں دونوں ملک
آپسی بھلائی کے لئے مل کر کام کر سکتے ہیں یا نہیں۔ میرا
پختہ یقین ہے کہ اس طرح کے بڑے بڑے مسائل ہیں جن
میں دونوں ملک آپسی بھلائی کے لئے مل کر کام کر سکتے
ہیں یا نہیں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس طرح کے بڑے بڑے
مسائل موجود ہیں اور اگر مل کر ان کی کھوج کی جائے تو اس
کا پتہ چلا اور پھر ایک ساتھ مل کر ان پر کام کیا جائے تو
بے اعتمادی کے موجودہ بادل چھٹ جائیں گے۔ دل
کی تبدیلی ممکن ہو سکے گی جب ایسا ہوگا، تو کشمیر
ایسا اہم مسئلہ بھی پیچیدہ نہیں رہے گا۔
ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اپیل کروں گا کہ یہ
ضروری نہیں ہے کہ جنہیں میں نے مثبت اور منفی نظریہ
کہا ہے، ان کو الگ الگ رکھا جائے۔ حقیقت میں
انہیں ساتھ ساتھ لیا جا سکتا ہے لیکن ایسی حالت میں
اگر کوئی مسئلہ جیسے کشمیر، حل نہیں ہوتا ہے تو
اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مشترکہ مفاد اور متوازی
کام کے دائرہ کی بیماری جو تلاش ہے وہ ختم ہو جائے
ایوب خاں نے مشترکہ دفاع کی بات پھر سے
دہرائی ہے۔ ہندوستان کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا
چاہئے۔ چاہے اس میں کتنی ہی دشواری کیوں نہ حائل
ہو۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک کشمیر کا مسئلہ طے نہ ہو جائے
تب تک ڈیفنس پر بات ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ٹھیک ہے
لیکن آج جو حالت ہے وہ یہ ہے کہ ہر فریق کشمیر کو اپنے
دفاع کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر مشترکہ دفاع کے
اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مسئلہ ایک دوسرا رخ لے لیگا۔
دفاع کا معاملہ خارجی پالیسی سے جڑا ہوا ہے
وہاں بھی اگرچہ ناوابستگی اور وابستگی کا زبردست تفاوت
ظاہر ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھتا کہ ایک سمجھوتے پر پہنچنا
ناممکن ہے۔ خاص طور سے ایسی حالت میں جبکہ وابستگی
اور ناوابستگی کا مفہوم بدل رہا ہے۔
مشترکہ مفاد کے دوسرے مسائل تو ظاہر ہی
ہیں جیسے صنعت، تجارت، رسل و رسائل اور لوگوں کی
آمد و رفت کی سہولت، اگر ان دائروں کی تلاش کی جائے
اور ان کے بارے میں سمجھوتہ ہو جائے، یا ملی جلی مشاورتی
کمیٹیاں بنیں، تو ان کمیٹیوں کے دو تین سال تک چلتے رہنے
سے ہی آپس میں اعتماد پیدا ہو جائے گا اور ایک دوسرے
کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ پھر ان کے ذریعے ان مسائل
کو حل کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ جو اس وقت باقی رہ
جائیں گے یا آگے اٹھیں گے۔

چین کا مسئلہ

چین کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے دو باتوں
پر زور دینا چاہتا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ سرحد کا جھگڑا،
لڑائی سے طے نہیں ہو سکتا۔ میں یہ بات اس لئے
نہیں کہہ رہا ہوں کہ اہنسا پر میرا یقین ہے بلکہ اس وجہ
سے کہ کھوئی ہوئی زمین واپس لینے کے لئے ہمیں جس طرح حملہ
کرنا پڑے گا۔ اس کا بوجھ ملک برداشت نہیں کر سکے
گا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی بھی فوجی
فیصلہ آخری ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہاری ہوئی پارٹی ہمیشہ
انتقام لینے کی کوشش کرے گی۔ اگر ہندوستان اور چین
کے بیچ لڑائیوں کا یہ سلسلہ چل پڑا تو مجھے اس کے تصور
سے ہی کپکپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی زور
دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ اس جھگڑے کا کوئی قانونی حل
بھی نہیں نکل سکتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ثبوتوں
کی بنیاد پر بھی یہ سلجھایا نہیں جا سکتا کیونکہ چین نے ہمیشہ ایسا
حل ماننے سے انکار کیا ہے۔
انہیں وجوہ سے میں نے یہ اپیل کی ہے
کہ چین سے ہمیں لین دین کی بنیاد پر سیاسی مفاہمت کرنی
ہوگی۔ یہ لین دین میں کوئی خود سپردگی کی بات نہیں ہے
کیونکہ یہ چیز آپسی رضامندی سے ہوتی ہے۔ سیاسی
سمجھوتے میں اس بات کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا
کہ سرحدی علاقے میں فریقین کے اصلی مفاد کیا ہیں۔
میرے خیال میں اقصائے چین میں چین کی ایک خاص
دلچسپی ہے۔ ہندوستان کو یہ مان لینا چاہئے۔ میں نے
سمجھوتے کے طور پر پٹے پر دینے کا مشورہ دیا ہے
لیکن چین کا مفاد تسلیم کرنے کے اور بھی راستے ہو سکتے ہیں

احمد فاطمی

ہند پاک دوستی ممکن ہے!

ہندوستان سکولرازم کے نظریہ پر یقین رکھنے والی ایک دنیاوی (سیکولر) اسٹیٹ ہے۔ جبکہ پاکستان مذہب کی بنیاد پر قائم ایک مذہبی ریاست ہے اس نظریاتی فرق کی موجودگی میں پاکستان کے ساتھ ہندوستان کی دوستی کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟ یہ سوال ہم کبھی اخبارات میں پڑھتے ہیں کبھی تقریروں میں سنتے ہیں۔ چائے خانوں، ٹرینوں اور بسوں میں بھی کبھی کبھی یہ دلیل سننے میں آتی ہے۔

نعروں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایک بار چل پڑے تو بس چلتے ہی جاتے ہیں۔ اس نعرے کا بھی کچھ یہی حال ہوا ہے۔ کسی خاص گروہ کی طرف سے کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر یہ نعرہ چلایا گیا تھا لیکن اب یہ نعرہ کسی خاص جماعت کی ملکیت نہیں رہ گیا ہے۔ اس دلیل کو استعمال کرنے والوں کا ایک گروہ بن گیا ہے جس میں پارٹی لیبل کا کوئی سوال نہیں ہے فرقہ پرور تو فرقہ پرور، کانگریس، سنگھٹ، سوشلسٹ کمیونسٹ اور دوسری غیر فرقہ پرور جماعتوں میں بھی اس دلیل کو استعمال کرنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہمارے علم میں ایسے متعدد اصحاب بھی ہیں جو انتہائی غیر فرقہ پرور اور بے حد شریف انسان ہیں اور ہندپاک دوستی کے نہایت درجہ خواہش مند بھی ہیں لیکن مذکورہ دلیل سے وہ بھی اس شک میں پڑ گئے ہیں کہ اس نظریاتی اختلاف کے ہوتے ہوئے کیا ہندپاک دوستی واقعی ممکن ہے؟

متضاد فکر رکھنے والے دو پڑوسی ملک اچھے پڑوسی بن کر نہیں رہ سکتے۔ یہ نظریہ دراصل کمیونسٹ سوچ کی دین ہے۔ ٹراٹسکی اس نظریہ کا سب سے بڑا سرخیل تھا جس نے "مستقل انقلاب" کا اصول پیش کیا۔ استالین نے بظاہر، اس نظریہ کو قبول نہیں کیا اور اس کے نتیجے میں ٹراٹسکی کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔ لیکن وہ تو اقتدار کی کشمکش کا محض باہری روپ تھا۔ عملاً استالین بھی اسی فریب کا شکار تھا لیکن دوسری بڑی لڑائی میں ملکی اور قومی مصلحتوں کے پیش نظر، قوت آزمائی کے لئے جو صفیں مرتب ہوئیں اس کے پہلے دور میں دنیا نے کیمونسٹ روس کو نازی جرمنی اور فاشسٹ اٹلی کے دوش بدوش اور آخری دور میں سشہنشاہیت پسند انگلینڈ اور سرمایہ دار امریکہ کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لڑتے ہوئے دیکھا۔

آج خروشچوف نہ صرف یہ کہ "بقائے باہم" کے اصول کا قائل ہے بلکہ اس "خیال" کی اگوائی کرنے والوں کی پہلی صف میں ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ چین اور کمیونسٹ روس کے درمیان یہی "خیال" اس وقت بظاہر نزاع کا سب سے بڑا سبب بنا ہوا ہے۔

کسی ایک شخص کے مشورے سے سارا ملک اس کے لئے بندھ نہیں جاتا۔ میں نے یہ مشورہ جان بوجھ کر دیا ہے تاکہ اس سوال پر ہمارے سوچنے اور غور کرنے میں جو جمود پیدا ہو گیا ہے، اس میں کچھ حرکت پیدا ہو اب یہ امکان نظر آ رہا ہے کہ چین کولمبو تجاویز کو مان لیگا (اگر لنکا کی وزیر اعظم کے الفاظ کی کوئی قیمت ہے) تو اس مسئلہ پر تازہ ڈھنگ سے سوچنے کی ضرورت نہایت سچی اور ضروری ہے۔

تبت کا سوال بھی اٹھایا گیا ہے۔ تبت کے بارے میں میرے خیال نہیں بدلے ہیں۔ لیکن سب چیزوں کو ملانا نہیں چاہئے۔ اگر سرحد کے جھگڑے بغیر طے کئے ہوئے چھوڑ دئے جائیں گے تو اس سے تبت کی، آزادی کچھ زیادہ نزدیک نہیں آجائے گی۔ ہندوستان اگر تبت کی مدد کرنا چاہتا ہے تو اس کی شروعات اقوام متحدہ میں اپنا زاویۂ نگاہ بدل کر ہی کی جا سکتی ہے۔

آخر میں میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ مجھے تو چین اور پاکستان کے سوال آپس میں مربوط جان پڑتے ہیں۔ اپنے ملک میں ایک ایسا طریق فکر ہے، جو یہ کہتا ہے کہ چین سے سمجھوتہ کر لیا جائے۔ لیکن پاکستان سے نہیں۔ دوسرے طریقے پر سوچنے والے لوگ اس سے الٹی بات کہتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ دونوں ہی غیر سالم نقطۂ نظر ہیں۔ ہم کو دونوں سوالوں کو ایک ساتھ لینا ہوگا۔

(بہ شکریہ بھودان تحریک)

اگر لڑائی جیتنے کے لیے کمیونزم اور فاشسزم کا اجتماعِ ضدین ممکن ہو سکتا ہے اور دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے کمیونزم، کیپٹلزم اور امپیریلزم کے یکجا ہونے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان جن کا صرف سیاسی بٹوارہ ہے جغرافیائی وحدت، تاریخی دھارے، نسلی اکائی، ثقافتی روایتیں زبان، رشتے داریاں اور ملکی مفاد مشترک اور ناقابلِ تقسیم ہیں ـــ دو دوست کی طرح: اچھے پڑوسی بن کر نہیں رہ سکتے۔

یہ صحیح ہے کہ سیکولرزم کا تصور صدیوں کے سماجی اور سیاسی سوچ کی نکھری ہوئی اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں ایک شہری دوسرے شہری کے درمیان کوئی امتیاز ریاست کی طرف سے نہیں برتا جاتا۔ کوئی مذہب، کوئی عقیدہ، کوئی ذات ہو، دستوری نگاہ میں اس کی ایک سی حیثیت ہے ہر شہری نہ صرف یہ کہ سماجی انصاف کا مستحق ہے، نہ صرف یہ کہ ملک کے تمام تر معاشی وسائل کے ذرائع اُس پر کھلے ہوئے ہیں بلکہ سیاسی حقوق میں بھی وہ برابر کا شریک ہوتا ہے۔ مذہبی ریاست میں غیر مذہب کے لوگوں کے ساتھ سیاسی امتیاز اکثر برتا جاتا ہے، جیسا کہ پاکستان میں بھی ہے۔ پاکستان کے موجودہ دستور کے مطابق پاکستان کا کوئی غیر مسلم شہری اس ریاست کا صدر نہیں ہو سکتا۔ وہاں کے دستور نے اپنے شہریوں پر یہ آئینی روک لگا رکھی ہے۔ جب کہ ہندوستان کے کسی بھی غیر ہندو شہری کے لئے انڈین یونین کی صدارت کا انتخاب لڑنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں۔

سیکولر ہندوستان اور مذہبی پاکستان کے دستور کے اس معنوی فرق کے باوجود، جو دوسرے بنیادی انسانی حقوق ہیں اُن سے پاکستان بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً پاکستان کے ہر غیر مسلم شہری کو اپنے مذہب پر قائم رہنے کا، آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کا، اونچی سے اونچی سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کا، ملک کے معاشی وسائل سے مقدور بھر فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ ہر غیر مسلم پاکستانی شہری کی جان، مال، عزت اور آبرو کی ضمانت دینا اور دستور میں ملے ہوئے اس کے کسی حق پر کسی گوشے سے اگر حملہ ہو تو اس کا بچاؤ کرنا حکومت کا فرض ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی فضا قائم کرنے کے لئے اتنی ساری قیمتی اور اہم بنیادیں موجود ہیں۔

اگر ان قدروں کی بنیاد پر، جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی آج قائم ہو جاتی ہے تو یہ بھی امید کی جا سکتی ہے کہ اس ترقی پذیر دنیا کے فکری رجحانات کے دھارے اور پڑوسی ہندوستان کی رواداری سے متاثر ہو کر کل پاکستان اپنے دستور کی اس ایک دفعہ کو بھی منسوخ کر دے، جو محض مذہب کی بنیاد پر پاکستان کے ایک شہری اور دوسرے شہری کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتی ہے۔ ایسا ہو جب بھی مذکورہ سیکولر قدریں اگر پاکستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیتی ہیں تو وہ ہندوستان پاکستان سیکولرزم اور انسانیت کی ایک گراں قدر خدمت ہوگی۔ اس لیے ان تمام عناصر سے جو سیکولرزم کے دلدادہ ہیں اور ان سب لوگوں سے جو پاکستان کے مذہبی اسٹیٹ ہونے پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں، ہماری یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ وہ ہند پاک دوستی کی مخالفت کرنے والوں کی تکذیب کریں اس کے حق میں اپنی آواز بلند کریں اور اس نیک کام کی سمت بڑھنے والے ہر قدم کی اخلاقی تائید اور عملی امداد کریں۔ (بہ شکریہ بھوپال ٹریبیون)

غزل

اجمیر چھوڑنے پر ایک تاثر

ممتاز راشد اجمیری

مجھ سے بچھڑے ہوئے یارانِ وطن کیسے ہیں
میرے شمشاد قد و سیم بدن کیسے ہیں

زرفشاں مانگ میں تاروں کی ضیا کیسی ہے
زلفِ شبگوں کے مہکتے ہوئے بن کیسے ہیں

آج بھی جن کے تصور سے ہیں روشن آنکھیں
وہ مرے شوخ غزالانِ ختن کیسے ہیں

مہکی مہکی سی ہے پھر آج مری تنہائی
مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے چمن کیسے ہیں

زخمہائے دلِ بے تاب کی مایوس نظر
ڈھونڈھتی ہے جنہیں وہ غنچہ دہن کیسے ہیں

زینتِ عارضِ گل، جن کا لہو ہوتا تھا
اے صبا وہ مرے یارانِ چمن کیسے ہیں

وہ حسیں شہر، وہ راہیں، وہ ہجومِ خوباں
راشدِ زار کے موضوعِ سخن کیسے ہیں

بمبئی کے شب و روز

آل انڈیا مشاعرہ

عیب کی نظروں کے خار، اس بندۂ عاجز نہنگار میرخوار کو ـــ کہ اپنی آنکھ کا شہتیر پہلے ہی نکلوا کر اور اُسے چھیل چھال کر قلم بنا چکا ہے ـــ اپنے قلم زاد یار طرحدار میخوار کے ساتھ چاروں کھونٹ گھومنے اور دوسروں کے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کا بڑا شوق ہے جہاں کسی تقریب یا تماشے کی سُن گن پائی، دل لگی کی ٹھہرائی، اسپرین کی ایک ٹکیہ نگل کر چائے کی ایک پیالی چڑھائی اور میاں میخوار کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر یہ جا اور وہ جا ـــ

کئی مہینوں کے بعد ۲ ستمبر ۶۴ء کی رات کو، بمبئی میں ایک "عظیم الشان "آل انڈیا مشاعرہ" تھا۔ ایرکنڈیشنڈ برلا ہال کی عمارت، موٹروں کے زیادہ اور انسانوں کے امڈتے ہوئے سیلاب میں کم گھری ہوئی تھی۔ میرخوار اس مشاعرے کی متوقع 'معرکہ خیزی' کا اندازہ کر کے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر پھرتی سے ٹکٹ گھر کی جانب بڑھا۔ مگر ٹکٹوں کے دام دیکھ کر ٹھٹک گیا اور سوچنے لگا کہ سب سے نچلے درجے کے دو ٹکٹوں کی رقم اتنی زیادہ تھی کہ اس سے بلیک مارکیٹ سے ۸ اور کنٹرول سے ۲۵ کیلو گرام گیہوں بآسانی خریدے جا سکتے تھے۔ لیکن بُرا ہو اس ذوقِ تماشہ بینی کا ـــ! میخوار بولے ـــ

"یہ مضائقہ ہے ـــ آخر یہ رقم مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کے امدادی فنڈ ہی میں تو جائے گی۔ !"

میخوار کے اس بھاری بھرکم جواز نے آتشِ شوق کو ہوا دی اور میرخوار نے اپنی جیب سے پسینے اور میل میں اٹے ہوئے "گلے بیلے" نکالے اور ٹکٹ گھر کی جانب بڑھ گیا۔

ہال کی اگلی اور درمیانی نشستیں تقریباً ۸۰۰ تماشائیوں سے پُر تھیں جبکہ پچھلی قطاروں میں بھی ـــ "اکا دُکا لوگ" نظر آ جاتے تھے۔ اسٹیج پر ممتاز سیاسی سماجی اور ادبی شخصیتیں 'وغیرہ' براجمان تھیں جن میں قابلِ ذکر ہیں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ مسٹر نائیک، لالہ شام ناتھ، نائب وزیر ریلوے۔ ڈاکٹر رفیق زکریا وزیر شہری ترقیات، سردار جعفری، مجروح سلطان پوری۔ جاں نثار اختر ساحر لدھیانوی، سکندر علی وجد، اعجاز صدیقی، وحید اختر قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعریٰ، بشر نواز، شاذ تمکنت، رفعت سروش، شعری بھوپالی، سرشار سیلانی، خمار بارہ بنکوی وغیر وغیرہ

بیشتر شعرا کے چہرے میرخوار کے یار میخوار کے چہرے کی مانند گلنار ہو رہے تھے۔ بلکہ کچھ تو ظرفِ میخوار سے شرط بد کر آئے تھے۔

خوش قسمتی سے مشاعرہ کے کنوینر اور اناؤنسر اختر الایمان 'بمبئی باہر' تھے بلکہ ایک اطلاع کے مطابق وہ قصداً غیر حاضر تھے۔ کیونکہ یہ مشاعرہ مشاعرہ کم اور "مینڈکوں کا جلوس" زیادہ تھا لہٰذا وہ اس دلدل سے دُور ہی رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے بحکم وزیر شہری ترقیات، اناؤنسنگ سردار جعفری کے ہاتھ آئی۔ دوسرے اناؤنسر تھے سکندر علی وجد ـــ!

محفل کے تمام 'ستارے' جمع ہو چکے تھے جبکہ میرخوار کے ستارے گردش میں تھے۔ سب سے پہلے تقریروں کے "گوناگوں" اور "رنگا رنگ" آتش بازی پیش کیے گئے ـــ کہ آجکل مشاعرے سے پہلے، ایک آدھ درجن طول طویل تقریروں کا "فیشن" ہٹ دھرمی کے ساتھ رواج پا رہا ہے۔ کم و بیش ایک درجن تقریروں میں ایک دوسرے کو علی المراتب خراجہائے عقیدت پیش کیے گئے۔ اور قومی یکجہتی کا خوب خوب ڈھنڈورا پیٹا گیا کہ ایسے موقعوں پر یہ ناریل بڑی آسانی سے ہاتھ لگ جاتا ہے۔

تقریر کرنے والوں میں وزیر اعلیٰ نائک نائب وزیر ریلوے شام ناتھ، سردار جعفری ـــ سکندر علی وجد، رفیق زکریا۔ عبدالحمید انصاری اور سراج حسن نقوی قابلِ ذکر ہیں۔

لیکن نہایت افسوس کی بات تو یہ ہے کہ کسی نے بھی اپنی تقریر میں قاضی سید غیاث الدین مرحوم کا ذکر تک نہیں کیا جو نہ صرف مولانا آزاد ایجوکیشنل

ٹرسٹ نے ۔ فی الحقیقت میں تھے بلکہ کالج کی یہ اسکیم بھی
خود ان ہی کی بنائی ہوئی تھی ۔ لیکن یہ امید کی جائے کہ
مرنے کے بعد ان لوگوں کو بھی کوئی یاد کرے گا جنہوں
نے قاضی سید غیاث الدین کو اتنی جلدی بھلا دیا ۔

طول طویل اور بیزار کن تقریروں کے خلاف
اظہار بیزاری اور احتجاجی تالیوں کے شور کے جواب
میں "تماشائیوں" کو دھمکی دی گئی کہ انہیں تمام تقریریں
خاموشی سے نگلنی ہی ہوں گی کہ ایسے مواقع روز روز نہیں
آتے ۔ ایک تقریر کے دوران اعلان کیا گیا کہ اس مشاعرے
سے ۲۵ ہزار روپے کی خالص آمدنی ہوئی ہے ۔ جو
غالباً بقول ایک سخنور، ان عطیات کی صورت میں وصول
کی گئی تھی جو محض بڑی شخصیات کے رعب یا خوشنودی
کی خاطر دئے جاتے ہیں ۔

۱۰ بجے مشاعرے کے اناؤنسر، مقرر
اور شاعر سردار جعفری نے اپنی نظم سے مشاعرے
کا آغاز کیا ۔ (اختتام بھی آپ ہی کے "شعروں" پر ہوا)
نظم نے محفل میں "گرمی" پیدا کر دی تھی ۔ اس مشاعرے
کا سب سے بڑا المیہ شاعروں کے پڑھنے اور انہیں
پڑھوانے میں بے ترتیبی ، بدنظمی اور بدسلیقگی کے
ساتھ ساتھ ، ہر شاعر کا بے ڈھنگا تعارف بھی تھا ۔

صرف ابتداء میں مشاعرے کی "فضا" کو مد نظر
رکھتے ہوئے جو بقول میرخوار تھی ہی نہیں ، باری باری "غزلگو"
شعرا کو پڑھوا کر مشاعرے میں گرمی پیدا کی گئی تھی مگر اس کے
بعد تمام شاعروں کو "ایک وحشتناک عالم ٹھنڈا ٹھنڈی" سے
گزرنا پڑا ۔ بیرون بمبئی کے ایک شاعر نے البتہ اپنے ترنم کے
طفیل تھوڑی بہت داد بٹور لی تھی ۔ ورنہ تماشبین حضرات
تو بالکل بھس تھے ۔ کیا مجال جو کسی شاعر کے لئے کسی کے منہ
سے داد و تحسین کے دو لفظ ادا ہو جاتے ۔ ہاں تالیاں البتہ
بڑے زور و شور سے بجتی رہیں اور سب جانتے ہیں کہ یہ
کس خوشی میں بجتی ہیں ۔ ہال کی "فضا" کو دیکھتے ہوئے
کہا جا سکتا ہے کہ بمبئی کے ایک مشہور فلمی شاعر نے "اعجاز"
دکھایا یا یوں کہئے کہ "ساحری" کی ۔ لیکن شکر ہے کہ اپنی دوبارہ
فلمی پر اس شاعر نے اپنی تقدیم سے متعلق کوئی "کالی نظم"
نہیں سنائی بلکہ مرحوم نہرو پر ایک اچھی سی نظم سنائی ۔

ابھی بہت سوں کو پڑھنا تھا مگر لوگوں نے
یوں برا سا منہ بنا کر فوج در فوج ہال خالی کرنا شروع کر دیا گیا
کہ شاعر حضرات انہیں اپنے کلام کی بجائے بے نقط کی سناتے
ہوں ۔ شاعر آتے رہے اور منہ لٹکا لٹکا کر جاتے رہے ۔
بیچ بیچ میں اسٹیج پر سستی جملے بازیاں بھی ہوتی رہیں ۔
ایسے موقعوں پر تماشائی بھی اپنے آپ کو فوری محسوس کر کے
محظوظ ہو لیتے تھے ۔۔۔ بمبئی کے دیگر تین بڑے شاعر
بھی بری طرح ناکام ہو چکے تھے ۔ مگر سب سے زیادہ مٹی پلید
ہوئی ایک شاعرہ اور ان نصف درجن نوجوان شعرا کی جو
جدید ذہن رکھتے ہیں اور جدید انداز میں کہتے ہیں ۔ میرخوار
کا خیال ہے کہ وہ لوگ اب تک شاعری سے نہ سہی ،
مشاعرہ بازی سے ضرور تائب ہو چکے ہوں گے ۔ ان
لوگوں کی بے چارگی ، بے بسی اور کسمپرسی کا اندازہ اس
بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب اورنگ آباد کے
ایک نوجوان شاعر اپنا نام پکارے جانے پر پڑھنے سے
ہچکچاتے ہوئے ، کترانا چاہ رہے تھے تو ڈاکٹر رفیق زکریا
نے ان کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ کہ بس اب
صرف سمجھنے والے ہی رہ گئے ہیں ۔۔۔ اس وقت
ہال میں صرف ۲۵ افراد تھے جو منتظمین اور شعرا کے
متعلقین میں سے تھے ایک مشہور اور نوجوان ہیئتی
شاعر بھی ناکام ہوئے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سردار جعفری
نے ان کا تعارف اس انداز سے کرایا کہ ان کی نظم خود
ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکی اور اس تعارف اور
انداز تعارف پر بہت سے شاعر ناراض ہو گئے ۔

ہال ۲ بجے رات تک کے لئے بک کرایا گیا
تھا اور سردار جعفری دو بجے تک مشاعرہ جاری رکھنے
پر مُصر تھے ۔ سب سے آخر میں سردار جعفری نے ایک واقعہ
سنانے کے بعد ، کہ اب انہیں ہر محفل اور ہر جلسے میں
لطیفے اور واقعات سنانے کی عادت سی ہو گئی ہے
اپنی ایک طویل نظم کے دو چار بند سنائے ۔ جس وقت
وہ شعر سنا رہے تھے تو میرخوار نے میرخوار کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا کہ وہ انہیں شعر کے علاوہ سب کچھ تسلیم
کرنے کو تیار ہیں ۔

اس مشاعرے کا ایک ادبی مذاق ایک
اور افسوسناک پہلو یہ بھی تھا کہ شاعروں کے تعلق سے
اس میں "نسلی" چھوت چھات برتی گئی تھی اور بمبئی کے
کسی بھی نوجوان اور ذہین شاعر کو مدعو نہیں کیا گیا تھا ۔
میرخوار اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہے جبکہ میرخوار کا
کہنا ہے کہ وہ رازہائے درون پردہ سے واقف
ہے ۔ اس مشاعرے میں بمبئی کے اور بمبئی میں دو چار
روز کے لئے مقیم بعض ایسے بن بلائے نوجوانوں کو
ضرور پڑھوایا گیا تھا جو شاعر کے علاوہ سب کچھ ہو سکتے
ہیں ۔ میرخوار نے جب بہت قریب سے ان نوجوانوں
کا جائزہ لیا تو اسے محسوس ہوا کہ ان نوجوانوں نے
اپنے جسم پر بہترین قسم کے گوند کی تہہ پر تہہ چڑھا
رکھی تھی ۔

رات کے دو بجے اس بے سر و پا مشاعرے
کا خاتمہ ہوا لیکن اس کی اس تاریخی اہمیت سے ہرگز
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بمبئی کی تاریخ کا عظیم الشان
بور مشاعرہ تھا جس کے انعقاد میں مشاعرے کے
منتظمین و متعلقین اور اناؤنسر سے لے کر خود میرخوار
تک برابر کے شریک تھے ۔۔۔ !

"دیکھو رابرٹ میں تمہیں ایک نصیحت کرنا
چاہتا ہوں ۔ تم جب بھی رات میں اپنے کمرے میں بیٹھو
تو دروازہ بند کر لیا کرو ۔ چابی میں سے تم صاف نظر آتے ہو ۔
میں ہر روز رات میں ۸ بجے تمہارے کمرے کے سامنے سے گزرتا
ہوں تو تم صوفے پر بیٹھے اپنی بیوی کا پیار کرتے نظر آتے ہو "

"یہ ناممکن ہے "

"نہیں میرے دوست میں سچ کہہ رہا ہوں "

"یہ ناممکن ہے ۔ میں دس بجے سے پہلے کبھی گھر نہیں آتا"

انور احمد سوپاروی

حکومت کے فرائض اور عوام کے حقوق

مہابھارت کی روشنی میں

ہندو مذہب کی کتابوں میں حکمرانی کی بابت اچھی اور اصلاحی باتیں پائی جاتی ہیں۔ بادشاہ کے کردار اور اس کے فرائض اور حقوق، اور رعایا کے حقوق اور ان کے فرائض سے متعلق متاثر کن اور سبق آموز تعلیمات کا پتہ چلتا ہے۔ مگر حکمرانی اور جہانبانی کی ہوس، تکبر اور نخوت کے ہاتھوں رعایا کے حقوق اور خوش حالی کی پامالی اور جاہ و جلال اور سطوت کی فتنہ انگیزیوں سے تصور ریاست و سلطنت تار تار ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی تاریخ کے گنے چنے دور ہی ایسے گذرے ہیں کہ جنہیں سنہری یا روشن کہا جا سکتا ہے۔ آج شہنشاہیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ نیا نظام حکومت قائم ہوتا جا رہا ہے جس کا تصور راز و منور، حقوق کے نور، فیض رساں ہے۔ مگر جب عمل کے قالب میں منتقل ہوتا ہے تو وہی تاریکی، وہی وحشت، وہی ناامیدی! تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایک کی جگہ ان گنت "بادشاہ" نظر آتے ہیں جنہیں عوام سے زیادہ اپنے وجود اور اپنے مفاد سے پیار ہوتا ہے۔

زیر نظر مضمون میں ہندومت کی مشہور زمانہ کتاب مہابھارت کے "سبھا پرو" (ادھیائے پانچواں) کا مختصر اقتباس پیش کیا جا رہا ہے جس میں بادشاہ (حکومت) کے فرائض اور عوام کے حقوق کا تذکرہ ہے۔ نارد (رشی) ایک سبھا (محفل) میں راجہ سے حکمرانی سے متعلق چند سوالات کرتے ہیں، جن میں بعض سوالات قابل غور ہیں۔ ان کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اے راجہ! تجھ پر سدا نیند کا غلبہ تو نہیں رہتا؟ تو روزانہ صبح سویرے اٹھ کر ملک کی اقتصادی حالت کے متعلق تدابیر سوچتا ہے نا؟

(۲) کیا تیرے تمام سرکاری افسر اور ملازم قابل اعتماد اور ایماندار ہیں؟ اور تو ان کی فطرت سے واقف ہے؟

ان میں ایسے لوگ تو نہیں جو کسی جرم کی پاداش میں نکال دیے گئے تھے اور انہیں پھر بحال کر دیا گیا؟

تجھے معلوم ہے تیرے ملک کے اندر جتنے بھی تمام استاد علم و عرفان میں کامل ہیں؟ اور ان کے شاگرد ان کی قابلیت سے مطمئن ہیں؟

(۳) تیری فوج کا افسر اعلیٰ (سیناپتی) خوشحال، بہادر، عقلمند اور پاکدامن ہے اور تجھے اس پر اعتماد ہے؟ دوسرے ماتحتی فوجی افسر بھی قابل، ذہین، وفادار اور خوش ہیں؟ کیا ان کی تنخواہ انہیں بروقت مل جاتی ہے؟

(۴) اے راجہ! لالچی، چور، شر پسند اور کام چور قسم کے لوگ تیری ملازمت میں تو نہیں نا؟ اور ایسی قماش کے اہلکاروں یا خود تیرے وجود سے تیری محترم رعایا کو کوئی تکلیف تو نہیں پہنچتی؟

(۵) تیرے ملک کے کاشتکار خوشحال ہیں؟ تیری مملکت میں آبپاشی کے لئے جگہ جگہ تالاب یا نہر کھدوائے گئے ہیں؟ یعنی تیرے ملک کے کسانوں کی فصل کا انحصار صرف بارش کے پانی پر تو نہیں؟

(۶) کاشتکاروں کو وقتاً فوقتاً تیری طرف سے امداد ملتی ہے یا نہیں؟ انہیں حسب ضرورت تقاوی مل جاتی ہے؟ اور تو ماہرین سے صلاح مشورہ کر کے کاشتکاری اور تجارت میں مناسب اور معقول سہولتیں اور مراعات دیتا ہے؟

(۷) ملک کی حفاظت کیلئے سرحدی علاقوں کے حکام تجھے وقتاً فوقتاً وہاں کے حالات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں؟ اور کیا تو ان کے انتظامی امور سے مطمئن ہے؟

(۸) تیرے ملک کے لوگ تیرے دشمنوں کے بہکانے میں آکر تیری مخالفت تو نہیں کرتے؟

(۹) تیرے ملک میں عوام کو فوجی تعلیم کا معقول انتظام ہے نا؟ اور جو لوگ تیری خاطر کسی میں کام آتے ہیں ان کی بیوی بچوں کی پرورش کا

اور دیکھ بھال کا بندوبست ہے یا نہیں؟
(۱۰) اندھے، اپاہج اور گونگے لوگوں کی پرورش سے تو غافل تو نہیں۔؟
(۱۱) کیا "کاریگر طبقہ" تیری نظرِ عنایت سے مستفیض ہوتا ہے؟
(۱۲) کیا تو اچھے کاموں سے خوش ہوتا ہے؟ اور رعایا میں سے اچھے کام کرنے والوں کو سراہتے ہوئے اُن کی حوصلہ افزائی کرتا ہے؟
(۱۳) کیا تُو نے تیرے جملہ ملازمین کو اُن کی تنخواہ اور بھتہ بروقت ملنے کا انتظام کر رکھا ہے؟ ورنہ ایسے خدمتگار مالک کو گزند پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔

مہابھارت کی مذکورہ بالا ہدایتوں کی روشنی میں اگر ہم خود ہندوستان کی ساری تاریخ کھنگال لیں تو شاید ہی کوئی بادشاہ اس کی کسوٹی پر پورا اُترے۔ ہاں چند بادشاہوں نے ان باتوں میں سے اکثر باتوں پر عمل کیا ہے۔
موجودہ حکومت کو ان میں سے چند روشن باتوں سے استفادہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے!

سعید فرحت

اکسٹرا بونڈ

بھگوان میں شردھا نہ رکھتے ہوئے بھی سنیل جب بھی انیتا سے ملتا وہ ایک دم بھگوان کا بھگت بن جاتا۔ انیتا نہ تو اتنی حسین تھی کہ اس کی مثال دینے کے لئے اُردو شاعری کے دیوان خالی کردئے جاتے نہ اتنی بدشکل تھی کہ بنی سنوری لڑکیوں کے جھرمٹ میں بالکل علٰحدہ لالٹین کی طرح دکھائی دے۔ وہ بس ایسی عام کنواری اور ہر دلعزیز لڑکی تھی جو اپنی چرب زبانی سے جلد ہی اگر ہر کسی کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتی تو اپنی جانب متوجہ ضرور کرلیتی۔ اور سنیل کے بارے میں یقیناً کہا جاسکتا تھا کہ وہ ہندوستانی اسکرین کے تندرست و توانا ہیروں کی طرح خوبرو نہ ہوکر بھی بیحد پُرکشش تھا۔ اور اگر اس کی شخصیت میں سے یہ عنصر نکال کر علٰحدہ رکھ دیا جاتا تب بھی اُس کا لباس، بات چیت کا انداز اُس کے بارے میں ہر ایک کو سوچنے پر مجبور کر دیتا۔

سنیل نے زندگی میں کئی لڑکیاں دیکھی تھیں اور بھلا دی تھیں۔ انیتا سے ملنے سے پہلے وہ اپنی زندگی میں آنے والی ہر لڑکی کو بس ایک راہرو سمجھتا جو کسی دوراہے پر یا کسی بس اسٹینڈ پر اس سے مل جاتا اور کسی چوراہے پر یا اگلے بس اسٹاپ پر جدا ہوگئی ہو۔ اس کی زندگی میں آنے والی ہر لڑکی بھی اُس کو ایسا ہی سمجھتی تھی۔ وہ انتہائی صدق دل سے اُس کی اس بات پر ایمان لے آتی تھی کہ انسان کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے مختلف کنوؤں کو سہارا لینا چاہئے۔ سنیل کے ہرجائی پن کے باوجود لوگ اس کو اوباش کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اس کا اعتراف اس کی فرم جے۔ کے۔ فائنینس کے مالک وی جے مکرشنن کو بھی تھا۔

وی۔ جے۔ کرشنن خالص تجارتی انسان تھا۔ سنیل کی غیر معمولی ذہانت نے اُس کے دل ودماغ پر عجیب سی چھاپ ڈالی تھی۔ اور وہ اُس کی غلط بات کو بھی آسانی سے رد نہیں کرتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے کاؤنٹر کا کام صرف تین گھنٹے میں انتہائی عمدگی سے مکمل کرلیتا جب کہ اُس کے ساتھی شام کے چھ بجے تک فائلوں سے مغز پچی کرتے رہتے تھے۔ اور کام کی زیادتی کا رونا روتے رہتے۔

پہلی بار انیتا اُس کے دفتر میں ایک سکریٹری کی ضرورت کا اشتہار دیکھ کر چند دیگر لڑکیوں کے ساتھ آئی تھی اور انٹرویو میں ناکام ہوگئی تھی ــــ اُس وقت سنیل نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ پتلی دُبلی عام نقش ونگار کی لڑکی کسی دن اُس کے ذہن اور ادراک کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیگی اور وہ اُس کے اس قدر قریب پہنچ جائے گا کہ اُس کو زندگی کے گذشتہ رومان پھیکے پھیکے دکھائی دیں گے۔

دوسری مرتبہ انیتا اُس کو ایک ٹیلیفون بوتھ پر ملی جہاں وہ ٹیلی فون آپریٹر کے فرائض انجام دے رہی تھی انیتا سنیل کو دیکھ کر خود ہی پہچان گئی۔ سنیل کو سوچنا پڑا تھا کہ اُس نے اس لڑکی کو پہلے کہاں دیکھا تھا۔

اور تیسری بار وہ اس کو ایک سنیما ہال میں ملی تھی۔ کوئی انگریزی فلم تھی۔ رش بہت تھا۔ انیتا بھی اس وقت تنہا تھی۔ اُس شام موسم بہت خوشگوار تھا۔ انیتا نے جو لباس پہن رکھا تھا اُس میں بھی بلا کی چبھن تھی۔ اس بار سنیل نے خود اُس کو پہچان لیا۔ وہ مسکرادی تھی۔ سنیل کو لگا تھا جیسے کتنے پھول ایک ساتھ کھل اُٹھے ہوں۔ انیتا چہک کر بولی تھی۔

"بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں آپ اکیلے ہیں اور کسی ساتھی کی تلاش میں ہیں اگر کسی کا انتظار نہ ہو تو آپ کا ساتھ میں بخوشی دے سکتی ہوں"

انیتا کا جملہ بے باک تھا لیکن سنیل کو حیرت نہیں ہوئی اس لئے کہ بارہا اُس کو ایسی کال گرلس مل چکی ہیں۔ جنہوں نے اس سے بھی کہیں آگے کی پیش کش کی تھی۔

سنیل نے جان بوجھ کر اُس کی بات کا جواب نہیں دیا اور بکنگ آفس سے دو ٹکٹ لے آیا انیتا خاموشی سے اُس کے ساتھ ہولی۔ ہال میں پہنچ کر

دونوں اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"آپ کسی اُلجھن میں ہیں؟" انیتا نے اُس سے ایک سوال کیا۔

"بہت بڑی اُلجھن ہے مس انیتا" سنیل نے اُس کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن انیتا اُس کی اُلجھن ذرہ بھر بھی متاثر نہ ہوئی اور عامیانہ لہجہ میں بولی۔

"اگر کوئی سیکرٹ اُلجھن نہ ہو تو بتا دیجئے"۔

سنیل نے ایک گہری نظر انیتا پر ڈالی اور مسکرا دیا۔ انیتا بھی مسکرا دیا۔ انیتا بھی مسکرا دی۔ سنیل نے سوچا انیتا کی مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔

"..... اُلجھن یہ ہے مس انیتا....." سنیل رُک گیا۔

انیتا جھنجھلا اُٹھی۔

"اب کہہ بھی ڈالئے۔ یہ پہیلیاں سی کیا بُجھا رہے ہیں۔؟"

"اُلجھن یہ ہے انیتا جی کہ اگر تم مجھ سے انٹرویو والے دن اتنی حسین لگتیں تو آج تک ہم نے محبت کی کئی منزلیں طے کرلی ہوتیں"۔

سنیل نے یہ جملہ کہہ کر انیتا کے چہرہ پر اس کا ردِ عمل تلاش کیا۔ کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انیتا میں وہ خاموش بیٹھی اپنے ننھے سے ہینڈکرچیف کے سرے کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ سنیل اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں محبت کے بین الاقوامی لفظ کا ردِ عمل پھیکا پڑ جائے تو بھگوان کا سہارا لینا ضروری ہوجاتا ہے اُس نے ہندوستانی اسکرین کے طرح جذباتی انداز میں کہا

"انیتا جی، آج تو تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے تمہیں بھگوان نے کافی فرصت میں بنایا ہے۔ چہرے کا ہر نقش، جسم کا ہر قوس سانچے میں ڈھلا ہوا دکھائی دیتا ہے"۔

اُس کی بات سُن کر انیتا کھل کھلا کر ہنس پڑی سنیل کو شبہ ہوا کہیں وہ انٹلکچول لڑکوں کی طرح ناستک تو نہیں ہے؟ پھر اُسے احساس ہوا کہ اُس کے قہقہے میں نقرئی برتنوں کی کھنکھناہٹ ہے۔

وہ ہنسی سے بولی اور یوں بولی جیسے وہ سچ مچ کی عورت نہ ہو، کسی فلم کی ہیروئن ہو جسے ڈائرکٹر نے یہ جملہ رٹا کر تیار کیا ہو۔

"بس اتنی سی یا کوئی اور اُلجھن تھی"۔

"بس اتنی سی"۔

سنیل نے کہا اِس مرتبہ سنیل کا لہجہ قدرے بیزاری لئے ہوئے تھا۔

"تو یہ بات پھر کے لئے اُٹھا رکھئے۔ یہ بتائیے یہ پکچر کیسی ہے؟" انیتا کا انداز سنیل سے بھی زیادہ روکھا پھیکا تھا۔

سنیل کوئی جواب دینے ہی جا رہا تھا کہ یکدم ہال میں اندھیرا ہوگیا۔ اور دونوں کی نظریں اسکرین کی جانب اُٹھ گئیں۔

پھر بہت دیر تک وہ دونوں خاموش ہوگئے کبھی کبھی رسمی سی بات چیت ہوتی۔ پکچر ختم ہونے کے بعد سنیل یہ سوچتے ہوئے انیتا سے جُدا ہوگیا کہ انیتا غیر معمولی لڑکی ہے۔ اس کو پاس لانے کے لئے اُسے کافی ریاضت کی ضرورت ہے۔

اُس کے بعد کئی دن تک انیتا اُس کو نہیں ملی۔ اس دوران سنیل نے ہر وہ جگہ چھان ڈالی جہاں کہیں انیتا کے ملنے کا امکان تھا۔ جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے انیتا کی جستجو بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چاہتوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اُس کا یہ اُصول فیل ہوگیا کہ زندگی کے راستے میں کسی لڑکی کا پیار بس میں سفر کرتے ہوئے مسافروں کی دوستی کی طرح عارضی ہوتا ہے اس کو اپنے اوپر غصہ آنے لگتا۔ وہ خود پر جھنجھلا اُٹھتا۔ وہ سوچتا تھا کہ کیا وہ عشق و محبت کی داستانیں جن کو تاریخی حیثیت حاصل ہے اور اخبارات میں چھپنے والے پیار و الفت کے واقعات حقیقت پر مبنی ہیں؟

دفتر میں کاؤنٹنٹ کا کام اُسے ۲۰ برس ت سفر کرنے لگا تھا۔ اُس سے ہردم خوش رہنے والا اُس کی فرم کا مالک وی۔ جی۔ کرشنن اُس کو بات بے بات جھڑکنے لگا تھا۔ لیکن فوری ملائمت اختیار کرلیتا۔ اور پھر بڑے دُلار سے سمجھایا کرتا۔

"اگر کسی لونڈیا وونڈیا کا چکر ہے تو شادی بنا ڈالو۔ یوں خون خشک کرنے سے کیا فائدہ"۔

اسے اپنے باس کا یہ جملہ سُن کر ہنسی آجاتی۔ کرشنن بھی ہنس دیتا اور مطمئن ہوکر سانس لیتا۔ کرشنن کے خوش رہنے کا ایک راز تھا اور وہ یہ کہ سنیل کے علم میں کمپنی کا پورا حساب کتاب تھا۔ سنیل اچھی طرح جانتا تھا کہ صاب نے کس کس جگہ انکم ٹیکس چوری کیا ہے۔ کہاں کہاں حساب غلط پیش کیا ہے۔ حساب کتاب کے اس گول مال کی تنخواہ اُس کو بلیک کی شکل میں ملتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندوستان کی مشہور فلمی ہستیاں جو حسابی معاملات میں کوری ہوکر بھی انکم ٹیکس آفیسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی ہیں۔ جس کا علم اُن کے سکریٹری کو ہوتا ہے اور ان فلمی اداکاروں کے سیکرٹری جس طرح اپنے مالکان کا حساب کتاب بناتے ہیں۔ اس میں سے وہ اپنے لئے اتنی ہی رقم نکال لیتے ہیں جو جائز طور پر وہ ٹیکس کی شکل میں حکومت کو دیتے۔ مگر سنیل وی۔ جی۔ کرشنن سے اپنا حقِ محنت ان فلمی سکریٹریوں کی طرح نہیں لیتا تھا۔ اس لئے کہ کرشنن خود بیوقوف نہ تھا۔ پھر بھی سنیل اچھی طرح جانتا تھا کہ فرم کا مالک اس کو آسانی سے ڈسمس نہیں کرسکتا۔ وہ بارہا اپنے ساتھیوں سے کہتا سُنا گیا تھا۔

"مجھے ڈسمس کرنے کے باس کو دو مہینے پہلے سوچنا پڑے گا"۔

اور ایک موسمِ بہار کی شام میں پھر اس کو انیتا مل گئی۔ جیسے اُس کو کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی اور گہرے اُودے رنگ کے

بغیر آستین کے بلاؤز میں وہ شام کی شفق کی ایک بدلی نظر آ رہی تھی۔

سنیل سے وہ بہت گرم جوشی سے ملی۔

اُنہوں نے وہ شام ایک ہوٹل میں ساتھ ساتھ گذاری۔

سنیل نے وہ ساری باتیں انیتا سے کہہ دیں جو وہ جُدائی کے دلخراش لمحوں میں برداشت کرتا آیا تھا۔

انیتا نے بھی یہی کہا کہ وہ اس کو بے حد پیار کرنے لگی ہے اور پیار کے اس بندھن کو زندگی کی آخری سانس تک نبھانا چاہتی ہے۔ دن بیتتے گئے۔ انیتا کہتی رہی سنیل سنتا رہا۔ سنیل کہتا رہا انیتا سنتی رہی

اور پھر سنیل نے محسوس کیا کہ انیتا اور وہ ہم خیال ہیں۔ ایک دن اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ انیتا سے شادی کر لیگا لیکن دوسرے دن اُس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ "شادی تو محبت کی موت کا نام ہے" اور جب یہ بات اُس نے انیتا سے کہی تو اُس نے بھی اثبات میں اُس کی بات مان لی وہ بولی۔

"محبت جدائی کا نام ہے۔ ملن تو محبت کا دشمن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس جنم میں ہم صرف محبت کریں اور اگلے جنم میں ہم دونوں شادی کر لیں مگر اس کے لئے بھی سے ہمیں سچا وعدہ کرنا پڑے گا۔"

سنیل کو یہ بات سُن کر اندازہ ہوا کہ انیتا قدرے مذہبی لڑکی ہے۔ اس کے بعد جب بھی انیتا سے ملتا، اُس کو یقین دلاتا کہ وہ بھگوان میں بہت شردھا رکھتا ہے

اور ایک دن انیتا نے اُسے بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ سنیل کو افسوس ہوا یہ بات سُن کر لیکن وہ اگلے جنم میں ملنے کی بات یاد کر کے خاموش رہا۔

اس شام بھی انیتا وہی ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی پہن کر آئی تھی جس میں وہ شام کی شفق کی بدلی معلوم ہوتی تھی۔ سنیل کو اس قسم کے ہلکے رنگ بہت پسند تھے۔ ان رنگوں سے وہ کئی معنی نکالتا تھا۔ ایک روز انیتا تیز رنگ کی ہری ساڑی پہن کر آئی تھی۔ پتا نہیں سنیل کو اس رنگ سے کیوں نفرت تھی۔ اُس نے انیتا سے کہا۔

"تم یہ ہرا رنگ مت پہنا کرو۔"

"کیوں؟"

انیتا متحیر ہو گئی۔ سنیل نے اُسے سمجھایا۔

"ہرا رنگ پتوں اور پودوں کا ہوتا ہے اور پتے اور پودے بہت جلدی خزاں سے جھلس جاتے ہیں میں چاہتا ہوں تم وہ رنگ پہنو جو سدا ایک سا رہے۔ تاکہ ہماری محبت کا رنگ بھی ایک سا رہے۔

انیتا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اور پھر اُس نے کبھی ہرا رنگ نہیں پہنا۔ اُس کے ساتھ وہ ہرے رنگ میں ملبوس ہر لڑکی کا مذاق اُڑاتی تھی۔ ایک دن ایک بے حد سیاہ رنگ کی عورت بہت بھدے انداز سے ہری ساڑھی پہنے سڑک سے گذر رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو تین کالے کلوٹے بچے تھے۔ انیتا نے سنیل کی توجہ اس عورت کی طرف رجوع کرائی تھی۔ اور اُس دن سے سنیل کے دماغ نے ہرے رنگ کی رہی سہی چاہت بھی نکال کر پھینک دی۔

انیتا نے اُس سے کبھی نہ بھولنے والا وعدہ لیا تھا اور اُس نے انیتا سے وعدہ کیا تھا کہ میں زندگی بھر تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔ پھر جب ہم دوسرا جنم لیں گے تب ہم شادی کر لیں۔

انیتا کی شادی ہو گئی وہ انیتا کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ وہ اُس کے شہر سے بہت دُور چلی گئی۔ اس کے دل و دماغ میں میٹھی میٹھی یادیں چھوڑ گئی۔ یہ یادیں وقت کے دھارے کے ساتھ بہہ جاتیں اگر انیتا اس کو پھر یاد نہ کرتی۔ لیکن اُس نے دو سطروں کا ایک خط ڈال کر سنیل کے دل میں دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دی گو کہ خط کا مضمون معمولی سا تھا۔ انیتا نے خیر و عافیت دریافت کی تھی لیکن سنیل کو ایسا لگا جیسے انیتا نے اُس کے دل کے ساز کو چھیڑ دیا تھا جو عرصے سے خاموش تھا

سنیل نے وعدے کے مطابق انیتا کے خط کا جواب نہیں دیا۔

اور ایک دن سنیل کی بھی شادی ہو گئی۔ اس کو اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ سنیل کی سسرال اسی شہر میں تھی جہاں انیتا بیاہ کر گئی تھی لیکن سنیل نے جان بوجھ کر انیتا کو شادی میں مدعو نہیں کیا۔

خوب دم کی ہوئی کافی میں زیادہ دودھ ڈالنے پر جو رنگ بنتا ہے ایسا ہی تھا اس کی بیوی کا رنگ۔ شبنم میں نہانے کے بعد کلیوں کے کھلنے سے جو حُسن پیدا ہوتا ہے ایسا ہی تھا اُس کی بیوی کے ہنسنے کا انداز۔ پُورنما کے چاند پر سے بادل ہٹ جانے کے بعد جو نکھار اور حُسن چاند میں پیدا ہوتا ہے ایسی لگتی تھی وہ آئینے میں بالوں کو سنوارتی ہوئی۔

یوں حسین بننا تو ہر عورت کی فطرت ہے۔ لیکن اُس کی بیوی حسین بھی تھی اور معصوم بھی۔ اور وہ اُسے بس چُپ چاپ دیکھا کرتا تھا۔ انیتا کے حُسن کی تعریف کرنے کے لئے جن تشبیہوں اور استعاروں کا اُس کے دماغ میں خزانہ جمع رہتا تھا۔ ان میں سے ایک لفظ بھی اپنی بیوی کے حُسن کی تعریف میں اُس کی زبان سے نہیں نکلا۔ جیسے وہ سارے جذبے انیتا اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ اور یہ لڑکی صرف اُس کی بیوی ہو۔

سنیل کبھی کبھی سوچتا کہ ہر حال میں خوش رہنے والی یہ عورت اس کی سرد مہری کی شاکی کیوں نہیں ہوتی بہت دن تک وہ انیتا کا نعم البدل اپنی بیوی کو بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ جس لباس میں وہ انیتا کو دیکھنا پسند کرتا، وہی لباس وہ بڑے چاؤ سے پہنتی تھی۔ جس ہرے رنگ سے سنیل کو نفرت تھی اُس رنگ کی کئی ساڑیاں اور بلاؤز تھے اُس کی بیوی کے پاس ایک روز اُس نے ہرے رنگ کا پورا سوٹ پہنا۔ بالکل ہری بھری بہار کی ڈالی لگ رہی تھی۔ سنیل حیران سا تکتا رہا۔ وہ سوچنے لگا اگر واقعی ہرے رنگ میں اتنی جاذبیت اُسے پہلے دکھائی دیتی تو وہ انیتا سے کہتا روز یہی ہرا ملبوس پہنا کرے۔ اس خیال کے تحت وہ زیرِ لب مسکرایا۔ اور پھر اچانک جیسے اُس کے ذہن میں کسی نے چٹکی لی۔ ہرے رنگ سے نفرت کا

جذبہ از سرِ نو عود کر آیا۔ اُس کے چہرے کی ساری شگفتگی رخصت ہو گئی ـــــ

اُس کی بیوی نے اُس کی بدلی ہوئی تیوری دیکھ لی اور شرمندہ سی ہو کر بولی۔

"میں اب کبھی یہ ہرا رنگ نہیں پہنوں گی"

اور جلدی سے اُس نے وہ لباس تبدیل کر دیا

سنیل خاموشی سے اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

کیا ہندوستانی بیوی اس طرح موم کی ناک ہوتی ہے۔

اس کے بعد زندگی کئی سال آگے بڑھ گئی۔

اور سنیل سوچتا رہا کہ انیتا کی یاد وہ کبھی نہ بھلا سکے گا۔ دوسرے جنم کا مطلب محض طفل تسلی ہے۔ ان دنوں انیتا اپنے گھر آئی ہوئی تھی اور اُس کی بیوی میکے گئی تھی۔ وہ انیتا سے اُسی طرح ملا تھا جیسے وہ اُس سے کبھی جدا ہی نہ ہوا ہو۔ ان دنوں انہوں نے محسوس کیا تھا جیسے زندگی کی رُوٹھی بہاریں پھر سے واپس آگئیں ـــ جب تک انیتا اُس کے شہر میں رہی زندگی حسین رہی، پھر زندگی اُداس ہو گئی، جب انیتا واپس چلی گئی اور اُس کی بیوی واپس آگئی۔

سنیل سوچتا وہ انیتا کے پیار کو کبھی نہ بھلا سکے گا۔ وہ سرگرانی جو انیتا تک محدود تھی اپنی بیوی کے لئے کبھی نہ محسوس کی۔ نہ ہی اس کی گاؤدُما بیوی اس کے سرد رویّے کی شاکی ہوئی۔

ایک دن یوں ہی اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تمہیں اگلے جنم پر وشواس ہے؟"

دوسرے جنم کی بات سُن کر اُس کی بیوی کا چہرہ ایک دم زرد ہو گیا، اور وہ خود بھی نادم ہو گیا۔ عورتیں کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ اُسے یہ سوال اپنی بیوی سے ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ ماہ و سال گذرتے گئے

انیتا ہر سال ایک مہینے کے لئے شہر آتی تھی۔ ان دنوں وہ بیوی کو میکے بھیج دیتا۔ زندگی کی روٹھی بہاریں پھر سے آکر اُن کے قدموں پر سرنگوں ہو جاتیں۔ گذرے زمانے کی کہانیاں دُہرائی جاتیں۔ انیتا ابھی تک ماں نہیں بنی تھی۔ اور وہ بھی باپ نہیں بنا تھا۔ اپنی اور انیتا کی زندگی کی اس ہم رنگی پر وہ خوش بھی تھا اور متعجب بھی۔

ایک دن انیتا نے اُس کو بتایا کہ اُس کے شوہر کا تبادلہ اسی شہر میں ہو رہا ہے۔ وہ یہ خبر سُن کر وہ خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ لیکن اب یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اپنی بیوی کی موجودگی میں یہ سب کس طرح کر سکے گا۔ بہت دن کے غور و فکر کے بعد اُس نے ایک حل ڈھونڈ نکالا۔ اُس نے اپنی بیوی کو تیار کر لیا کہ وہ کچھ سماجی سوشل کام کرے یا کسی ڈرامک سوسائٹی کی ممبر ہو جائے۔ اُس کی بیوی خود بھی یہ بات سُن کر خوش ہوئی جیسے سوشل سماجی کاموں کے بارے میں وہ خود پہلے سے پلان بنا رہی ہو۔

شروع دنوں میں وہ اپنی بیوی کے ساتھ دو ایک بار خود بھی میٹنگ اٹینڈ کرنے گیا پھر وہ اکیلی جانے لگی۔ انیتا اس شہر میں آگئی تھی۔ جس دن وہ اکیلا ہوتا انیتا کو فون کر کے بُلا لیتا۔

چھٹی کی ہر شام اُنہیں یکجا کر دیتی۔ پھر وہ دونوں پارک کے کسی ویران کنج میں ساتھ ساتھ بیٹھ جاتے۔ گذری باتوں کی تجدید کرتے۔

اُس شام آسمان دن بھر برستا رہا اور برس کر تھم گیا تھا۔ ہوا نم تھی اور بارش کی بوندوں نے ذرّہ ذرّہ کو نہلا دیا تھا۔ خلافِ معمول اُس کی بیوی نے اپنے اسی ہرے لباس کا سنگھار کیا تھا اور اُسکی طرف داد طلب اور خاموش التجائیہ کرتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ جیسے کہہ رہی ہو "آج موسم کی رنگینیاں کہہ رہی ہیں کہ کہیں چلا جائے"۔

سنیل ایک دم بوکھلا گیا تھا۔ اُس کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی بیوی نے اُس کی کمزوری پکڑ لی ہو۔ اس نے خاموش زبان میں اپنا حق مانگ رہی ہو اور وہ سوچ رہا تھا کہ بیوی سے کیسے چھٹکارا پائے۔

"نہیں۔ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہیں نہیں جا سکوں گا"۔ حالانکہ وہ آج شام انیتا کیلئے انگیج کر چکا تھا

اُس کی بیوی بغیر کچھ کہے بوجھل قدموں سے تنہا باہر چلی گئی۔ جب سنیل اُس کے ساتھ باہر جانے سے انکار کرتا تو خود ہی باہر چلی جاتی۔

موسم کے بے حد سہانی ہونے کا احساس سنیل کو انیتا کے ساتھ پارک میں داخل ہوتے وقت ہوا جہاں شاید محبت کرنے والوں ہی کیلئے قدرت نے اپنی ساری رعنائیاں بکھیر رکھی تھیں۔ انیتا کے ساتھ چلتے چلتے اُس کو لگ رہا تھا کہ اُس کے قدم ہوا میں پڑ رہے ہیں۔ عجیب مستی چھائی تھی ہر چیز پر ـــ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ اور وہ انیتا کے ساتھ ایک جھاڑی کی اوٹ میں بنچ پر بیٹھا تھا۔ آج اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ انیتا سے اگلے جنم میں ملنے کے وعدے کو دُہرائے۔ پارک میں بکھرے ہوئے جوڑے شاید محبت کے ان ہی الفاظوں کو دُہرا کر مسرور نظر آ رہے تھے۔ جس بنچ پر وہ بیٹھے تھے، اس کی دوسری طرف ایک اور جوڑا آپس میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی سنیل نے سُنا مرد کہہ رہا تھا۔ "آج پچھلے جنم کی باتیں دُہرانے کو جی چاہ رہا ہے"۔

پچھلے جنم کی بات سُن کر انیتا چونک پڑی تھی۔

اس لئے چونکی ہو گی، سنیل نے سوچا۔ وہ تو اگلے جنم کو مانتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئی تھی۔

دوسری طرف سے مرد کی آواز پھر سُنائی دی۔

"سچ سچ ہرے رنگ میں تم بالکل ہری بھری پھولوں کی ڈال سی دکھائی دیتی ہو"۔ مرد نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن میرے شوہر کو تو ہرے رنگ سے چڑ ہے" نسوانی آواز اُداس اور بجھی بجھی سی تھی۔

مرد کا قہقہہ اُبھرا۔ سرگوشی تیز آواز میں بدل گئی۔ مرد نے کہا۔

"عجیب اتفاق ہے میری بیوی کو ہرے رنگ سے نفرت ہے!!"

خطوط

مظفر حنفی ـــــــــــــــ بھوپال

"..... ۱۰ جولائی پیشِ نظر ہے۔ "آمدم بر سرِ مطلب" یعنی میں ابراہیم رنگلا صاحب کے خط کا ذکر چھیڑ دوں جس میں وہ "وادی گل کا شاعر" سے متعلق بات کہتے ہوئے دو جگہ خود واوین استعمال فرما کر میری غزل کو واوین کی وجہ سے گردن زدنی قرار دیتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یہ واوین (" ") لگانے کی بدعت کہاں سے چلی ہے؟!

اطلاعاً عرض ہے کہ اس "بدعت کے موجد" حضرت شاد عارفی مرحوم تھے جن سے میں مشورۂ سخن کرتا تھا۔ ایک بار شاد صاحب پر بھی یہی اعتراض ہوا تھا اور جواباً ناصر کاظمی نے لکھا تھا کہ شاد کی غزلوں میں ان "چلتے کے مکالموں" کی شمولیت ہی نے انہیں لہجے کا شاعر بنایا ہے۔ یہ تو ابراہیم رنگلا صاحب بھی جانتے ہوں گے کہ شاد عارفی متفقہ طور پر اردو کے دو تین شاعروں میں گنے جاتے ہیں جو شاعروں کے ہجوم میں اپنے انفرادی خدوخال کی بنا پر پہلی نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں۔ ہماری شاعری میں ان کی سی انفرادیت، جذبے کی تیزی اور طنز کی کاٹ کا جواب کہیں اور نہیں ملتا۔

دراصل شاعری میں (خصوصاً غزلوں میں) اکثر الفاظ اور فقروں کا استعمال لغوی مفہوم کے ساتھ نہیں ہوتا، جو لغت میں ملتے ہیں بلکہ موقع و محل کی رعایت سے شاعر مختلف مفہوم پیدا کرتا ہے۔ مشاعروں یا مخصوص نشستوں میں یہ بدلا ہوا مفہوم شاعر اپنے پڑھنے کے لہجے سے کسی خاص لفظ یا مصرع پر زور دے کر یا اپنی حرکات و سکنات سے واضح کر لیتا ہے۔ کاغذ پر وہ خاص بات علامتی نشانات (punctuation) کے مناسب استعمال سے پیدا کی جاتی ہے۔ ان خاص رنگ کی غزلوں میں جو شاد صاحب کہتے تھے یا میں کہنے کی کوشش کرتا ہوں (Punctuations) خصوصاً کوماز (commas) اور انورٹڈ کوماز (Inverted Commas) کی سخت ضرورت پڑتی ہے۔ کہیں یہ مکالمے کی صراحت کے لئے استعمال ہوتے ہیں، کسی جگہ طنز پر سان رکھنے کے لئے برتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کے ذریعے لہجے کا ٹھپہ لگایا جاتا ہے۔ اور کہیں کسی خاص بات کا دوسرا مفہوم ابھارنے کے لئے ان سے کام لیا جاتا ہے۔ میں عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ "شاد کی غزلوں میں واوین کی اہمیت" پر ایک مضمون لکھ ڈالوں۔ ابراہیم رنگلا صاحب نے میری اس سوچ کو ارادے میں بدل دیا ہے۔

اس مختصر سے خط میں اور زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے۔ پھر یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہے کہ ابراہیم رنگلا صاحب کہیں یوسف ایمان کی طرح شاد عارفی اور ناصر کاظمی کے متعلق بھی نہ پوچھ بیٹھیں "یہ صاحبان کون ہیں؟" ایک بار شاید پہلے بھی "حیات" ہی میں لکھ چکا ہوں کہ تنقید کرنا بری بات نہیں لیکن لہجے میں سنجیدگی ہونی چاہئے۔ آج وہی مشورہ پھر ابراہیم صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ ویسے اُن کے خط کا مختصر سا جواب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں انہیں واوین میں "نکتہ سنج" لکھ کر خاموش ہو جاتا۔

اُجاگر سنگھ ریولا ـــــــــــــــ پٹھان کوٹ

.... سرینگر میں "حیات" کا آزادی نمبر دیکھا۔ بہت خوبصورت پرچہ ہے۔ سورگباشی نہرو جی پر دونوں چیزیں پسند آئیں۔ ظ انصاری صاحب کا مضمون اور ساحل صیانوی کی نظم۔ کہانیاں تینوں جنس پر ہیں۔ لیکن واجدہ تبسم کی کہانی کافی تیز ہے۔ نظمیں تقریباً سب اچھی ہیں۔ خصوصاً جاں نثار اختر کی دونوں نظمیں۔ "شکستِ لمحات" چھپ چکی ہے۔ کم از کم ایسے نمبر میں مطبوعہ چیزیں نہیں آنی چاہئیں تھیں۔

مانک ٹالا اچھی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن "تبصرے پر تبصرہ" میں مجھے صوبائی جانبداری کی بو آتی ہے۔ ہر زبان کے چند اصول ہوتے ہیں۔ اگر آپ God کی بجائے Goed کہیں اور یہ اصرار کریں کہ ہم ہندوستانی ایسی ہی انگریزی کہتے ہیں تو یہ تو زیادتی ہوگی۔

غزل

مظفر حنفی

مجھے اداس دیکھ کر قریب آگیا ہے وہ!
فریب کھا گیا ہے وہ، فریب کھا گیا ہے وہ!

تصورات کی گرفت میں جب آگیا ہے وہ
ہر ایک گوشۂ حیات جگمگا گیا ہے وہ

مہ و نجوم کا غبار سا اُڑا گیا ہے وہ
نظر بکھر گئی مری کہ "جھلملا گیا ہے وہ"

ذرا سا التفات پا کے سوچنے لگا ہوں میں
اُسی کو میں پسند ہوں کہ مجھ کو بھا گیا ہے وہ

جہاں مجھے یقین تھا "وفا کی بات چل پڑی"
اُسی مقام پر نظر بچا بچا گیا ہے وہ!

بسی ہوئی ہے دل کے آس پاس درد کی مہک
سدا بہار پھول کچھ یہیں کھلا گیا ہے وہ

مری "زبانِ طنز" کی "نہ بات بن سکی کوئی"
مگر "عرق میں انفعال کے" نہا گیا ہے وہ

یہ اور بات ہے کہ شمعِ آرزو بجھی رہے
چراغ تو خیال میں کئی جلا گیا ہے وہ

ہزار تمکنت کے ساتھ "دوسروں کو چھوڑ کر"
مجھے ہی بار بار چھیڑتا ہوا گیا ہے وہ

خدا کرے کہ بے اثر نہ جائے "شرحِ آرزو"
کہ اختتامِ داستاں پہ چونک سا گیا ہے وہ!

مظفرِ خراب کو "نہ خار کیوں پسند ہوں؟"
بہار کے خلاف "اک ثبوت پا گیا ہے وہ"

اب کی بار

اِس شمارے میں دو بڑے اہم اور فکر انگیز مضمون شامل ہیں — ایک جے پرکاش نارائن کا ہندوستان کے سیاسی حالات پر اظہارِ خیال۔ اور دوسرا ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں — احمد خاں طلعی کا مضمون — یہ دونوں بڑے جرأت مندانہ اور حقیقت پسندانہ مضامین ہیں لہٰذا دونوں ملکوں کے عوام کی گہری توجہ چاہتے ہیں۔ اگر ملک میں اس قسم کی سیاسی رائے اور شعور رکھنے والوں کی چھوٹی سی اکثریت بھی قائم ہو جائے تو حالات بہت جلد بہتر ہو سکتے ہیں۔

تیسرا مضمون جو مہاجرات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے، نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ اور ہمارے اربابِ سیاست کے لئے دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔

○

حصۂ نظم میں اس مرتبہ ساری کی ساری غزلیں ہیں لیکن یہ سب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ سب شگفتہ و شاداب ہیں۔ اور یہ نئے اور نسبتاً نئے شاعروں کی فکر کا نتیجہ ہیں اور اُن جدید نظموں سے بدرجہا بہتر ہیں جو آج کل لکھی جا رہی ہیں۔ اس قسم کی غزلیں اُن لوگوں کو خاموش کرنے کے لئے کافی ہیں جو غزل کے خلاف سینہ کوبی کرتے ہیں۔

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳

جلد ۳ | یکم اکتوبر ۶۴ء | شمارہ ۶

اس شمارے میں

قیمت

ایک سال	دس روپے
فی پرچہ	تیس ۳۰ پیسے

ایڈیٹر:-

قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- صدر رادھا کرشنن روس کا نو روزہ دورہ ختم کر کے آئرلینڈ کے چار روزہ دورہ کے لئے ڈبلن پہنچے۔
- روس ہندوستان کو مزید مِگ ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر دے گا۔
- کمیونسٹ مشرقی جرمنی کے وزیر اعظم مسٹر گروٹ وُل کا انتقال ہو گیا۔
- بخشی غلام محمد سابق وزیر کشمیر اور اُن کے چھ ساتھیوں کو کشمیر میں گرفتار کر لیا گیا۔
- ناگا باغیوں سے جو حکومتِ ہند جو صلح کی بات چیت کر رہی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ ناگا باغیوں کو ناگالینڈ کے وزیر اعلیٰ کی شرکت پر اعتراض تھا۔
- مسٹر سین فرانسس لیماس وزیر اعظم آئرلینڈ نے کہا ہے کہ کشمیر کے حل کے لئے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان راست بات چیت ہونی چاہئے۔
- مسٹر بھٹو وزیر خارجہ پاکستان نے کہا ہے کہ غلام محمد صادق وزیر اعظم کشمیر کا بھی وہی حشر ہوگا جو بخشی غلام محمد کا ہوا ہے۔
- دہلی میں پینے کے پانی میں مرا ہُوا بچھو نکلا۔ یہ بچھو پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔
- جس پر ممبروں نے وزیر صحت ڈاکٹر سوشیلا نائر سے مستعفی ہو جانے کا مطالبہ کیا۔
- "بھارت بند" ہڑتال ناکام ہو گئی۔
- ایک اطلاع کے مطابق سستے غلّے کی دوکانوں کے ذریعے جو شکر حکومت عوام میں تقسیم کر رہی ہے وہ گھٹیا قسم کی ہے۔

دکھنی ادب کا ایک اہم ستون ۲۷ ستمبر ۶۴ء کو ہمیشہ کیلئے گرِ گیا!
مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب کے انتقال سے دکھنی ادب کو جو نقصان پہنچا
ہے اُس کی تلافی ممکن نہیں۔ اسی رعایت سے یہ بات بھی بغیر کسی جھجک کے کہی جا سکتی ہے
کہ اب اُن کی جگہ پُر ہونا مشکل ہے۔

دکھنی ادب پرستائش کی تمنّا اور صلے کی پروا سے بے پروا ہوکر کام کرنے والے
دو ہی تھے۔ ڈاکٹر زور اور ہاشمی صاحب اور یہ دونوں حضرات اللہ کو پیارے ہو چکے۔
ڈاکٹر زور کی سرگرمیوں کا میدان بہت وسیع تھا جس میں دکھنی ادب
بھی شامل تھا لیکن ہاشمی صاحب کا تو سب کچھ دکھنی ادب ہی تھا۔ مرحوم نے اسے
اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اور اس میدان میں جتنی تحقیق اور چھان پھٹک مرحوم
نے کی کوئی اور نہیں کرسکا۔

دکھنی ادب کو اب ایسا پُرخلوص اور بے لوث ادیب شاید ہی نصیب ہو۔

دورِ حیات اس صدمۂ جانکاہ پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

قاضی عیاذ انصاری

مغرب اور مشرق کی کشمکش اور علامہ اقبال

زیرِ نظر مضمون میں خلیفہ عبد الحکیم اور مولانا ابوالحسن علی صاحب کی اقبال پر نگارشات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً "روحِ اقبال" میرے سامنے اکثر رہی ہے ——— عیاذ انصاری —

مشرق و مغرب کی کہانی جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر وہ طویل بھی ہے۔ ایک زمانے تک یہ کشمکش صلیبی جنگوں کے نام سے ارضِ مقدس کی خاطر فلسطین کی سرزمین پر جاری رہی تو پھر نشاۃ ثانیہ کے بعد مغرب کی قوموں نے مشرق کے سرسبز و شاداب میدانوں کو للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ لیکن سلجوقی اور عثمانی ترک صدیوں تک یورپ کی ہر عسکری کوشش کو ناکام بناتے رہے، وہ ایسی آہنی دیوار تھے جس سے مغرب کی کوئی طاقت نبرد آزما ہونے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔

انگریزوں کی آمد

سولھویں صدی میں جب ترکوں کی عسکری طاقت زوال پذیر ہونے لگی تو مغربی طاقتوں کے لئے مشرق کا راستہ کھل گیا۔ بنگال میں سراج الدولہ کی شکست اور دکھن میں ٹیپو کی شہادت نے اس ملک میں مغربیوں کے لئے بے روک ٹوک غلبہ پانے اور اپنی من مانی کرنے کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

۱۸۵۷ء کی کوشش ناکام کے بعد پھر اس ملک میں مشرق و مغرب کی ذہنی کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ بقول مولانا ابوالحسن علی ——

"... تاریخ کی یہ ایک عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر جگہ حکومت کی شکست کے بعد عوام نے اپنے ملک کو حملہ آوروں کے ہاتھوں آسانی سے نہیں سونپ دیا ہے۔ پردیسیوں کے غلبہ پر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی راضی نہیں ہوئے۔ فاتح اور مفتوح کا دل، ایک سانس کیلئے بھی ایک دوسرے سے صاف نہیں رہا۔ خود اس ملک میں ۱۸۵۷ء کے بعد عرصہ دراز تک خانقاہوں کے خلوت نشین شیوخ مسجدوں کے ملّا اور مدرسوں کے مولوی انگریز سے برسر پیکار رہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ غلام علی نقشبندی سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل حضرت حاجی امداد اللہ اور ان کے بعد مولانا گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے جانشین شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا مدنی اور آزاد نے اس صدی کی دوسری دہائی تک غیر ملکی فاتحوں کے خلاف، ان کے تمدن و تہذیب، ان کے نظامِ اخلاق اور علم و عمل کے خلاف عوام کے جذبات کو انگیز رکھا۔ علامہ اقبال اس سو سالہ کشمکش کی آخری کڑی ہیں۔

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ،
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ
گوہرش تف دار و در لعلش رگ است
مشکِ ایں سوداگر از نافِ سگ است"

ترکی مفکّر خالدہ ادیب خانم نے اس کشمکش میں مغربی اور مشرقی ذہن کے فرق کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"... عام طور پر مشرقی جس چیز کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے وہ افراد کے باہمی تعلقات ہیں۔ معاشرت میں مروّت و اخلاق اس کی خمیر میں داخل ہیں۔ سکونِ قلب اور امن و عافیت اس کے خمیر میں ہیں۔ سارے عالم میں مشرق ہی

وہ خطہ ہے جو تمام زندہ مذاہب کا گہوارہ ہے جو لوگ مشرقی طرزِ طبیعت کے دلدادہ ہیں چاہے وہ یہودی ہوں یا ہندو، بدھ ہوں یا پارسی ہوں یا مسلمان ہوں یا عیسائی وہ یہی سمجھے ہیں کہ زندگی کی حقیقی قدریں اس کے حصے میں آئی ہیں اور اس نے جسم، مادّہ کی بے راحتی کو قربان کرکے زندگی کے جوہر کل روح کو پالیا ہے۔ اس کے برخلاف مغرب کا انسان، غیر محسوسات سے بے نیاز صرف مادّی قدروں کا قائل ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا اور چھو سکتا ہے وہی حاصلِ زندگی ہے غور و فکر اور مشاہدۂ باطن اس کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ زندگی کے اس مادّی تصور کی بدولت ہی جب وہ علومِ عقلیہ اور سائنس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے فطرت کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ جس طرح مشرق کے عارف روحانی تسکینِ قلب، تہذیبِ نفس اور تزکیۂ روح کی تلاش میں اپنی زندگیاں گزار دیتے تھے آج مغرب کے استاد اور پروفیسر اس کوشش میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں کہ وہ دنیا کو زیادہ سے زیادہ راحت و آرام دہ بنا دیں اور فطرت پر زیادہ سے زیادہ غلبہ حاصل کر لیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جس مذہب عیسوی نے مغرب کو یہ تعلیم دی تھی کہ اگر کوئی تمہارے گال پر تھپڑ مار دے تو اس کے سامنے دوسرا گال بھی پیش کر دو، پچھلے دو سو سال سے اسی مذہب کے پیرو، اسی جذبۂ مادّیت سے مغلوب، دنیا کے ہر امن پسند کے منہ پر تھپڑ مارتے رہے ہیں۔ مشرق کے کروڑوں انسانوں کو اپنا غلام بنا کر انہوں نے اس کام پر انہیں مامور کر دیا ہے کہ وہ اس چھوٹے سے خطۂ زمین کی اطاعت میں سرگرم رہیں جسے مغرب کہتے ہیں"۔

مشرق کی رُوح

کمزور اقوام کو لوٹنا، ان کو غلام بنانا، ہر قید و بند سے آزاد، لذّت و راحت، زرپرستی، سربلندی اور غلبہ اس جنسی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔ عالمِ روحانی کی منکر اور الحاد کی طرف مائل گویا مشرق کے اجتماعی نظامِ اخلاق کے خلاف یہ ایک طرح کی بغاوت ہے جسے ہم تہذیبِ مغرب کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ مشرق کے خلاف اس بغاوت کے یہی محرکات و عوامل تھے جو اقبال کی طبیعت میں بہ یک وقت جمع ہو گئے تھے۔ مغرب کے فلسفۂ حیات پر عبور حاصل کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ سب مادّی اور استدلالی عقل کا گورکھ دھندا ہے اور اس میں جوہر کی کمی اور روح کا فقدان ہے۔ عشق کی جو جاندار اصطلاح اقبال نے وضع کی ہے وہ دراصل مشرق کی یہی روح ہے اور یہی مشرقی ذہن کا تہذیبی ورثہ بھی ہے۔

اقبال کا عشق

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل ہے کہ اقبال کا عشق خالص اسلامی تصور پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک مشرق کے ادیان میں جو ایک طرح کی وحدت پائی جاتی ہے اقبال کے ذہن نے اسی وحدت کو عشق کی اصطلاح دی ہے۔ اقبال کا فلسفۂ خودی ہو یا انسانِ کامل کا تصور، اخلاق و عمل کی دعوت ہو یا تاریخ کے افسانے حیاتِ اجتماعی ہو یا عروجِ آدم کے ترانے، ان کے فکر کی ہر کڑی اس مرکزی ذہن سے جا ملتی ہے جسے ہم مشرقی ذہن بھی کہہ سکتے ہیں اور جسے وہ خود عشق کہتے ہیں۔

عشق را ما دلبری آموختیم
شیوۂ آدم گری آموختیم
وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب
آفتاب از ما و ما از آفتاب
راستیم اندر میانِ بستہ داغ ✳ برسرِ راہے نہادیم ایں چراغ

اقبال کی طبیعت میں مغرب کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کا بڑا محرک غلبۂ فرنگ ہے جو مشرق کے ذہن پر مسلّط ہو گیا ہے۔ وہ اس ذہنی غلامی کو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ مضر اور خطرناک سمجھتے رہے ہیں۔ ان کے فکر کا مرکز مغرب کا یہی ذہنی تسلط رہا ہے

رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاشقاں جز خدا ہیچ نیست

مغرب کی تنقید و تنقیص کرتے ہوئے جاوید نامہ میں اقبال نے اپنے مخصوص افکار کو ان اشعار میں جمع کر دیا ہے جو انہوں نے سعید حلیم پاشا، مصلح و مفکر ترکی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہے ہیں۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات
شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس
کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست
چشمِ شاں صاحب نظر، دل مردہ ایست

سعید حلیم پاشا

ترکی کو سعید حلیم پاشا نے یہی تلقین کی تھی کہ اسلام کی روحانیت اور اس کے نظامِ اخلاق میں کوئی خلل نہیں اور نہ ہی اس کے نظریۂ معیشت اور معاشرہ میں کوئی کوتاہی ہے۔ ایک صحت مند معاشرہ اور ثقافت و سیاست کی تعمیر میں اسلام اور اس کی تعلیم روک نہیں ہے۔ وہ جامد نہیں ہے حالات کے ساتھ وہ عروج کی نئی نئی راہیں سجھا سکتی ہے۔ اقبال کے فکر کا مرکزی کردار سعید حلیم پاشا ہے وہ مسلمان ہے ترک ہے اور مشرقی ہے۔ اور اس روحانیت کا داعی جسے اقبال نے روحِ مشرق کہا ہے۔

ہندوستان کی عظمت

اقبال اپنی پوری زندگی، ہندوستان

شروع کر کے الگ اور یکجائی طور پر ایران، شام اور فلسطین، حجاز اور ان سب سے زیادہ ترکی کے سیاق و سباق میں اقوامِ مشرق سے خطاب کرتے رہے ہیں۔ [illegible] سے پہلے اُنکی شاعری کا ابتدائی دَور تھا۔ مولانا حالی کی روایات کے حامل وہ ہندوستان کی عظمت کے گیت گاتے رہے۔ ہندوستان کی مشترک تہذیب کے نظری تصوّر کو اُن کی نواسنجی سے بڑی تقویت پہنچی۔ اُن کے مدّاح اور نقّاد یکسر تاان کر اُن کی اس ابتدائی شاعری کو قومی شاعری کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے ایک ہی سانس میں پھر اس المیّہ کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی شاعری کا یہ درخشاں ستارہ جلد ہی غروب بھی ہوگیا۔ حالانکہ ہندوستان کی سماجی زندگی میں نہ یہ دَور قومیت کے واضح تصوّر کا تھا اور نہ بحمداللہ یہ ستارہ کبھی غروب ہُوا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم اس دَور کے کسی بھی شاعر کو صحیح معنوں میں قومی شاعر کہہ سکیں گے۔ یوں ہندوستان کی مذہبی عظمت علامہ کو ہمیشہ عزیز رہی اور اس عظمت کی نغمہ سرائی تسلسل کے ساتھ ان کی شاعری کے دَور میں موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک ادبی سانحہ ضرور ہے کہ نئے شوالے کا یہ عظیم شاعر یورپ سے واپسی پر، صقلیہ جیسے عظیم شہر آشوب لکھنے پر یکایک کیسے مجبور ہوگیا۔

میں ترا تحفہ سُوئے ہندوستاں لیجاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رُلواؤں گا

سسلی کا سفر

دبی دبی آنسوؤں کی یہ جھڑیاں بالآخر سیلاب بن کر رہیں جس نے اسلامی ممالک کے ساتھ سارے مشرق کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اُردو ادب کے ایک طالبِ علم کے لئے یہ بات بڑی اہم ہے کہ آخر علامہ یورپ سے واپسی پر راستہ میں سسلی سے بے تعلق کیوں نہ گذر سکے اور اس بجھے ہوئے چراغ راہگذر کو آہوں اور آنسوؤں کی خراجِ عقیدت پیش کئے بغیر وہ آگے کیوں نہ بڑھ سکے۔ صقلیہ کی تخلیق کے بعد بقول شیخ عبدالقادر مرحوم "بلادِ اسلامیہ" یورپ سے واپسی پر ہندوستان میں کہی، علامہ کی پہلی نظم ہے اور عجیب تربات یہ ہے کہ یہ مشہور نظم بھی اک شہر آشوب ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یورپ کے قیام میں وہاں کا ہر قریہ اُن کے لئے فردوسِ نظر ضرور تھا لیکن بغداد و غرناطہ کی بربادیوں پر اُن کا چشمِ قلب وہاں ہمہ وقت نمناک بھی رہا ہے۔

بلادِ اسلامیہ کا چوتھا بند قسطنطنیہ پر ہے۔ میرے نزدیک یہ بات بڑی اہم ہے کہ دہلی، بغداد اور غرناطہ کے ساتھ علامہ نے آخر قسطنطنیہ کو اس شہر آشوب میں کیوں شامل رکھا۔

درخشاں سال

قسطنطنیہ کی طبعی اور جغرافیائی حیثیت نہ اُس وقت ایسی تھی اور نہ اب ہے کہ اسے کسی شہر آشوب میں شامل کیا جائے۔ اور اس وقت تو خلیفۂ اسلام اور اس کا دارالخلافہ، بابِ حکومت اور اس کا ظاہری طمطراق سب کچھ قسطنطنیہ میں موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اپنے ان تازہ رجحانات کو جو وہ یورپ سے لائے تھے، قطعیت دینے پر مائل تھے، سعید حلیم پاشا کے ربط میں علامہ کو ترکی کے مذہبی، سیاسی اور ثقافتی حالات کا بہ غور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ہمیں کوئی ایسی تاریخی شہادت ابھی تک میسّر نہیں آئی جس کی بنا پر ہم پورے وثوق کے ساتھ علامہ کی مغرب دشمنی کو ترکی کے ساتھ جوڑ دیں اور قسطنطنیہ کو مغرب کے غلبے کا شکار ثابت کر دیں۔ بخلاف اس کے جدید ترکی کی تاریخ میں [illegible] ایک درخشاں سال گنا جاتا ہے۔ انجمن اتحاد و ترقی کی کوششوں کا بار آور سال شفقت پاشا اور جاوید پاشا جیسے قوم پرور زعما کی مشکور مساعی کا سال۔ ہر طرف اصلاحات کے چرچے تھے۔ ترکی سلطنت میں بسنے والی مختلف قومیں ایک دوسرے سے گھل مل چکی تھیں اور پوری پوری توقع تھی کہ یورپ کا یہ مردِ بیمار بہت جلد ایک تنومند و توانا ترکی شہنشاہیت میں بدل جائیگا کہ عین اسی دَورِ انبساط میں ترکی قوم کی آنکھ میں ایسا تنکا آن گرا جس نے پھر آگے چل کر اس کے باصرہ ہی کو متاثر کر دیا۔ سیاسی نور و ظلمت کی یہ مثال تاریخ میں یادگار رہے گی۔

عثمانیوں کے دشمن

ریاستہائے بلقان کے عیسائی ایک طرف اصلاحات میں پیش پیش تھے تو دوسری طرف وہ عثمانیوں کے دیرینہ دشمن مشرقی یورپ کی حکومتوں کے ساتھ ترکی کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے کہ یکایک مقدونیہ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ بلقان کے عیسائیوں نے دوسری حکومتوں کی مدد سے مقدونیہ میں مقیم ترکی سپاہیوں اور مسلمان شہریوں پر ایسا شبخون مارا کہ ایک ہی رات میں تیس ہزار ترک بچے بوڑھے، عورتیں اور مرد اُن کی وحشت اور بربریت کا شکار ہو گئے۔ اس سانحہ کی خبر ہندوستان پہنچی تو مولانا محمد علی نے کامریڈ میں ایک دردناک اپیل شائع کی اور ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک طبّی مشن کی تشکیل کر کے ایک نمائندہ وفد بلقان کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کیلئے ترکی بھیجا۔ ہندوستان کی سماجی تاریخ میں اس وفد کو ایک اہم موڑ کی حیثیت حاصل ہے۔ [illegible] کے بعد ہندوستانیوں کو کسی بیرونی ملک کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کا یہ پہلا موقع نصیب ہُوا تھا۔ قسطنطنیہ میں بابِ حکومت کو انہوں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جب یہ وفد واپس لوٹا تو ملک کے گوشے گوشے سے اس کی پذیرائی میں صدائے تحسین بلند ہوئی۔ علامہ کی شعری صلاحیتیں اس وقت 'ترانۂ ملّی' کی تخلیق کی طرف مائل تھیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

نیا موڑ

آج کے ہندوستان کی سماجی زندگی میں اس ترانے کی اہمیت سے چاہے تو کوئی مصلحتاً انکار کر دے،

لیکن علامہ کے ذہنی ارتقا کی یہ ایک واضح منزل ہے۔ اب وہ کھل کر اس تصور کو پیش کرنے لگے تھے جسے اب تک وہ استعاروں اور کنایوں کی زبان میں دبے دبے پیش کر رہے تھے۔ ترانۂ ملّی کے بعد، فاطمہ بنت عبداللہ، شمع و شاعر، خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام جیسی انقلابی نظموں کی تخلیق ہوتی رہی اور پھر ان کے فکر کا رخ شکوہ اور جوابِ شکوہ کی طرف پھر گیا۔ وہ مشرق کی اجتماعی زندگی میں ایسے صحت مند تمدن کی یاد تازہ رکھنا چاہتے تھے جو مٹھی بھر نفع خوروں کی دست بُرد سے پاک ہو۔ وہ ایک ایسے معاشرہ کا خاکہ سامنے رکھنا چاہتے تھے جو اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ اقتصادی، سیاسی اور سماجی نظریوں میں بھی ہم آہنگ رہے۔ ادھر ہندوستان میں قومیت کا مغربی تصور زور پکڑ رہا تھا۔ ہوم رول سے رولٹ ایکٹ اور پھر تحریکِ عدم تشدد اور خلافت کی تحریک سے گزرتے ہوئے ہندوستان کی قومیت کا تصور بالآخر ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کی دلدل میں پھنس گیا۔

بانگِ درا

یہی وہ زمانہ ہے جب علامہ کی مشہور معرکۃ الآرا کتاب "بانگِ درا" کی اشاعت ہوئی۔ اس دور کے سماجی حالات میں بانگِ درا کا ذکر اس لئے بھی ناگزیر ہے کہ ۱۹۲۰ء کی تحریکِ خلافت میں قومی یکجہتی کے عظیم مظاہرہ کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کی مایوسیوں سے دوچار ہو کر اقلیت کے قوائے ذہنی کا مفلوج ہو جانا قرینِ قیاس تھا اگر بانگِ درا کی تہذیبی قوت بر وقت اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اس عالمگیر اخوت کے اسلامی تصور میں گم ہو گئے جس کے لئے انہوں نے ۱۹۱۲ء میں بلقانی وفد اور ۱۹۲۰ء میں عدم تشدد اور خلافت کی تحریک کو لبیک کہا تھا۔ بانگِ درا کتاب نہیں تھی، اعجاز تھا، سحر تھا جس نے مغرب سے مشرق تک اور ہمالہ کی بلندیوں سے راس کماری کی پستیوں تک ہندوستان کے گوشے گوشے کو منوّر کر دیا۔ اثر و نفوذ کے اعتبار سے ہندوستان کی کسی بھی زبان کی کسی بھی کتاب کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا جو بانگِ درا کو حاصل ہوا۔ کونے کونے میں اس کی بازگشت تھی۔ ہر ہاتھ میں یہ کتاب اور ہر زبان پر اس کے اشعار تھے۔ اس مقبولیت اور محبوبیت کے باوجود اس کتاب سے ساتھ ایک ناانصافی یہ بھی ہوئی کہ ہم نے اسے مشرق و مغرب کی کشمکش سے الگ اسلامی نظریوں کا زاویہ سمجھ بیٹھے اور واسطہ اور ذریعے سے زیادہ اسے مقصد سمجھ کر سینے سے لگائے رہے اور ایک اہم موڑ کو منزل سمجھ کر ہم کھو کر بیٹھ رہے۔

فرقہ وارانہ فسادات

ہماری سماجی تاریخ میں ۱۹۴۷ء وہ منحوس سال ہے جب ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ راولپنڈی سے شروع ہو کر یہ آگ، یوپی، بہار اور بنگال میں، کلکتہ تک پہنچ چکی تھی۔ بمبئی اس کی زد سے بچا تھا نہ ناگپور۔ "بانگِ درا" بھی اسی فرقہ وارانہ منافرت سے بچ نہ سکی۔

یہ ہماری سیاسی اور سماجی بے بصری کی کھلی دلیل ہے کہ جس مقصد میں سارے مشرق کو مشترک اور متحد ہونا تھا اس کے ذرائع اور وسائل میں ہم ایک ہی ملک میں ایک دوسرے سے روگرداں رہے۔ اس کشمکش میں "بانگِ درا" ایک کتاب سے زیادہ، ایک دور کی حیثیت رکھتی ہے اور ایک اہم موڑ کی نشان دہی کرتی ہے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد صقلیہ سے لے کر طلوعِ اسلام تک مشرق میں سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اقبال کے لہجے کی تبدیلی، میں یہیں اس کے فکر کی پرواز کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو لوگ 'بانگِ درا' کو بہشتی زیور سمجھ کر اُسے محض اسلامیات تک محدود رکھتے ہیں اُن کی کم مائیگی پر جس قدر بھی آنسو بہائیے کم ہے۔ لیکن جو اسے ہندوستان کے مفاد کے مغائر سمجھ کر اس سے احتراز کی پالیسی پر کاربند رہے ہیں انہوں نے ہندوستان کی سماجی تاریخ کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔

یہاں یہ بات ایک مرتبہ اور دُہرا دینا چاہیئے کہ ہر بڑے آرٹسٹ کے آرٹ کی تہہ میں ایک مخصوص تصور کارفرما رہتا ہے جو بڑی حد تک اُس کی فطرت کے تصور کا تابع رہتا ہے۔ اقبال کا تصورِ حیات اگر اسلام کے نظامِ اخلاق کا تابع ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ شاعر کے احساس و شعور کی قوتوں کو اگر کوئی مخصوص تصورِ حیات نہ ملے تو اس کی شخصیت بے مقصدی میں گم ہو کر رہ جائے گی اور اس کا وجدان کبھی بھی ایک وحدت بن کر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

بانگِ درا کے بعد

'بانگِ درا' میں مغرب کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کا اظہار دبے دبے سُروں میں ہے۔ 'بالِ جبریل' اور 'ضربِ کلیم' میں اس کی لَے تیز ہو گئی ہے۔ اور پھر مشرق کے سیاسی اور سماجی حالات کے ساتھ ساتھ 'جاوید نامہ' اور 'پس چہ باید کرد' میں یہ لَے پھر تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

★

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سُرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد

★

وہ آنکھ کہ ہے سُرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے، نمناک نہیں ہے

★

ہوشمند از خمِ اُو مے نخورد
ہر کہ خود را اندریں میخانہ مُرد

★

اے زکارِ عصرِ حاضر بے خبر
چرب دستیہائے یورپ را نگر
عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت
چشمِ اُو بے نم ، دلِ اُو سنگ و خشت

★

علم از و رسواست اندر شہر و دشت
جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت

کٹھ مُلّائیت

مغرب کی تنقید و تنقیص میں جو شدت ہمیں اقبال کے دورِ آخر کے فرمودات میں ملتی ہے بقول خلیفہ عبدالحکیم اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اقبال مشرق پرست اور کٹ مُلّا ہے ۔ انہوں نے فرطِ محبت میں اقبال کی مدافعت کرتے ہوئے اپنے اس خود ساختہ اعتراض کو نرم کر کے اُنہیں مشرق پرستی اور کٹ مُلّائیت سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے ۔ میرے خیال میں خلیفہ صاحب کی یہ تنقید بالکل غیر ضروری ہے ۔ انہوں نے مشرق و مغرب کی کشمکش میں اقبال کے فکر کو متعین کرنے کی بجائے اُنہیں ایک سماجی ریفارمر کی حیثیت سے دیکھا ہوگا ۔ وہ یہ بات بھول گئے ہونگے کہ مشرقی ذہن کی وحدت تاریخی نوعیت کی ہے ۔ حضرت موسیٰ سے لے کر اقبال اور گاندھی تک سب مافوق البشر انسانوں نے مشرق کے اس ذہن کو تقویت پہنچائی ہے مغرب کی کورانہ تقلید میں صورت پرست ہو کر ہم زیادہ عرصہ تک مشرق کی اُس روحِ حیات سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے ۔ جیسے علامہ نے بڑی چابکدستی سے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے ۔ شرمائی شرمائی اور لجائی لجائی یہ روح بقول اُن کے ابھی بدن کی تلاش میں ہے ۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مشرق کو لباس تو پوری طرح میسر آ گیا لیکن اُس روح کی تلاش ابھی باقی ہے جس طرف علامہ نے اشارہ کیا ہے

ترکی کی کشمکش

مشرق و مغرب کی کشمکش میں علامہ کے فکر کو متعین کرنے کے لئے ہمیں ایک مرتبہ پھر مشرق کے سیاسی مسائل میں ترکی کی کشمکش کا مطالعہ کرنا چاہئے ۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کے ساتھ ترکی نے بھی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور اقوامِ مغرب اُس کے حصے بخرے کر کے اُس کو صفحۂ تاریخ سے مٹانے کی سازش میں معروف تھیں کہ مصطفےٰ کمال کی تلوار نیام سے باہر آئی ۔ مٹھی بھر ترکوں کو اکٹھا کر کے اُس نے مغرب کی تمام طاقتوں سے از سرِ نو جنگ چھیڑ دی ۔ ۱۹۲۰ء میں خلافت کا سقوط کر کے اُس نے ترکی شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا ۔ اور ایک نئی ترکی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک جدید ترکی کے اصلاحات کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے کے بعد علامہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں اُن کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد" اس اضطراب کی وجدانی کیفیت ہے ۔ مصطفےٰ کمال نے مذہب کو ریاست سے خارج کر دیا ۔ قرآن کی تعلیم کو سرکاری مدارس میں خلافِ قانون قرار دے دیا ۔ ترکی زبان کا رسم الخط رومن کر دیا ۔ معاشرت میں ہر اُس چیز پر احتساب تھا جو مشرقی تھی اور شرعی تھی ۔ ہر اُس چیز کو لبیک کہا جو مغربی تھی اور غیر شرعی تھی ۔ اس نے درویشوں اور مولویوں کی داڑھیاں تک ترشوا دی تھیں ۔ 'جاوید نامہ' میں مصطفےٰ کی تہذیب و تربیت کے لئے ایک نظم مخصوص ہے ۔ علامہ نے اس نظم میں افسوس ظاہر کیا ہے کہ کمال جو تجدید کا آرزومند تھا ، جو رسوم و قیودِ کہن سے آزادی حاصل کر چکا تھا اُس نے تقلیدِ فرنگ کو اپنا شعار بنا لیا اور ترکی کی زندگی میں ان چیزوں کو شامل کر دیا جن سے خود فرنگ تلخ تجربوں کے بعد بیزار ہو چکا ہے ۔

تو بگو و کعبہ را رختِ حیات
گر ز افرنگ آیدش لات و منات

نئے لات و منات

"کعبے میں گھسے ہوئے پُرانے مشرقی بتوں کو توڑ کر مغرب کے آوردہ نئے لات و منات کو متمکن کر کے مصطفےٰ کمال نے کوئی تجدید نہیں کی یہ محض تبدیلئ اصنام ہے ۔ عشقِ مشرق کے ساتھ اگر عقلِ فرنگ کی آمیزش کرتا تو ایک جہانِ نو پیدا کر سکتا تھا ۔ وہی جہانِ نو جو تمام عالم کا شیرازہ بند . لاشرقیہ و لاغربیہ ، جس عالم کا احترام مقصودِ حیات ہے ، جس کے آدمِ خاکی کے عروج سے انجم سہمے جاتے ہیں ۔

لیکن بطنِ فطرت میں ایک اور جہانِ نو پرورش پا رہا تھا ۔ علامہ کے وصال کے دو ہی برس بعد ، جو پیدا ہونے والا تھا ۔ پچھلی جنگِ عظیم نے مغرب کے طلسمِ ساحری کو تارِ عنکبوت کی طرح توڑ کر رکھ دیا ۔ مشرق کے سارے ملک ایک ایک کر کے مغرب کی دستبرد سے باہر ہو گئے ۔ برِ صغیر ہند و پاک کی آزادی ، اقوامِ مشرق کی لمبی داستان کا ایک اہم باب بن گئی ۔ دورانِ جنگ ہی میں ہندوستان کی قسمت کا ستارہ جگمگانے لگا تھا اور اس روشنی کا انعکاس سارے مشرق پر پڑ رہا تھا ۔ مشرق و مغرب کی سیاسی کشمکش جو کم و بیش دو صدی سے اس ملک میں جاری تھی ، مغرب کی شکست میں ظاہر ہو رہی تھی ۔ جنگ کے فاتح جرمنی اور جاپان کو تو سرنگوں کرنے میں پُوری طرح کامیاب رہے لیکن مشرق میں اُن کی استعماریت کی جڑیں ہل گئیں ۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے برطانیہ کا تسلط کیا اُٹھا ، مغرب کی بساطِ سیاست ہی اُلٹ گئی ۔ ایشیا کے ساتھ افریقہ کے چھوٹے بڑے ملک ایک ایک کر کے آزاد ہونے لگے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے ۔ استعماریت کی اس

یہ شکست میں جہاں مشرق کی ہر محاذ پر جیت ہوئی وہاں یہ حقیقت بھی آئینے کی طرح نقشلی بنگی مشرق کا وہ ذہن جو صدیوں تک مغرب سے برسرِ پیکار رہا سیاسی طاقت حاصل کرتے ہی خود ہی دفعتاً شکست خوردہ محسوس کرنے لگا ... آج ان کا ... جو ... تصور کسی جگہ بھی ابھر کر سامنے نہیں آیا

لوٹ پیچھے کی طرف...

ہماری زندگی کے ہر شعبے میں مادی ذہن کارفرما ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں مشرق و مغرب کی کشمکش پر اب فوقیت حاصل ہے جو بالادستی مغرب کو حاصل تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے۔ مغرب کا جو ذہن ہمارے ذہنی ورثہ سے متصادم ہے اس کی روح و مزاج سے پوری پوری واقفیت کی ضرورت ہے تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی وہ ظاہر ہو ہم اسے پہچان لیں۔ علامہ کے کلام کی افادیت اس لئے اب پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ہر ہر قدم پر ہمیں اُن کے فرمودات میں اس مغربی ذہن کے تار و پود نظر آتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم مغرب کی ذہنی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک طرح کی ذہنی بغاوت ہے جس سے مشرق کا پورا معاشرہ متاثر ہے۔ طبیعتیں ہر قید و بند سے آزاد، مطالباتِ نفس کی پوری تکمیل، مغرب پرستی، عہد شکنی، دروغ گوئی، خیانت اور نفاق میں ہم پیش پیش ہیں تو دولت اندوزی، سربلندی اور غلبہ ہمارے تخیل پر سوار ہے۔ اس ذہنی انقلاب کو ہم معاشرہ کے عبوری دور سے تعبیر کر کے خود کو زیادہ عرصہ تک دھوکا نہیں دے سکتے ہیں ایک بار پھر مشرق کے اس تہذیبی ورثہ کی طرف لوٹنا ہے جسے اقبال نے عمر بھر عبادت کی طرح اپنے فکر و ذکر کا مرکز بنائے رکھا۔

داشتیم اندر میانِ سینہ داغ
برسرِ راہے نہادم ایں چراغ

غزل

مظفر حنفی

اگر ہزار "خوشامد پسند" ہوتے ہیں
تو صاف گو کبھی زمانے میں چند ہوتے ہیں

شکار کر نہیں پاتے جو آسمانوں کو
وہی غریب اسیرِ کمند ہوتے ہیں

یہی جو مشقِ ستم کر رہے ہیں درپردہ
"پئے عوام" بڑے درد مند ہوتے ہیں

کہاں گئے وہ بیانات "بعدِ آزادی"
نہ ہو سکے ہیں نہ ہم سربلند ہوتے ہیں

جنہیں پسند نہیں "شیوۂ زباں بندی"
وہ دردمند سلاخوں میں بند ہوتے ہیں

ضرور ہے کہ وہاں "شیر نر" بھی نکلیں گے
کئی ہزار جہاں گوسفند ہوتے ہیں

"بڑا ہے نام مظفر کا کج کلاہوں میں
اگر جناب "وجاہت پسند" ہوتے ہیں

سہارا دیکر

خاور بانکوٹی

دستِ فطرت کے حسیں شہکار ہیں
کوہساروں کے یہ دلکش سلسلے ــــــ
جنگلوں کے سبز آنچل بن کے لہراتے ہوئے
پنچھیوں کی بولیوں میں، زمزمے گاتے ہوئے
مستیاں سی اپنے نظاروں سے برساتے ہوئے!

اور شہروں کی طرف جاتے ہوئے
راستے ہم نے بنائے ہیں یہ، پتھر توڑ کر
ہم بھی اپنے عہد کے فرہاد ہیں
ہم کو مرجانا نہیں آتا مگر سر پھوڑ کر!!

اوم پرکاش صراف

پاکستان میں دو دن

شری اوم پرکاش صراف ریاست جموں و کشمیر کے مشہور جرنلسٹ ہیں۔ ابھی حال ہی میں شیخ محمد عبداللہ کے ہمراہ خیر سگالی مشن کے ساتھ پاکستان گئے تھے۔ شری جواہر لال نہرو کی موت کی وجہ سے صراف صاحب پاکستان میں صرف دو روز قیام کر سکے۔ اُن کے سفر کی یہ پوری روداد ہم معاصر "بھوداں تحریک" کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ——— اِدارہ

۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا۔ بھارت اور پاکستان کے نام سے دو آزاد ممالک دنیا کے نقشے پر ابھرے۔ مہاراجہ ہری سنگھ جموں و کشمیر کو آزاد رکھنا چاہتے تھے۔ مگر بڑے پڑوسیوں کی خوشنودی کے بغیر آزادی خواب زیادہ اور حقیقت کم ہوتی ہے۔ مذہبی تعصب نے بیشتر ہندوؤں اور مسلمانوں کو پاگل بنا دیا تھا۔ یہ ریاست بھی تعصب کی آگ سے جھلسنے لگی۔ مختلف وجوہات کی بنا پر جن میں بلاشبہ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے ساتھیوں کا بڑا ہاتھ تھا، وادیٔ کشمیر بہت حد تک محفوظ رہی مگر صوبہ جموں میں ہندو اور مسلمان گتھم گتھا ہو گئے پاگل پن کے اس دور میں بھی جا بجا انسانیت کی اکا دکا سنہری مثالیں ملتی ہیں۔ مگر مجموعی طور پر اس تاریخی حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ باہمی، بداعتمادی نے دونوں بھائیوں کے قلب و ذہن کو بڑی طرح جکڑ لیا تھا۔ چنانچہ کہیں ایک بھائی کا خون بہا کہیں دوسرے بھائی کا۔ جس کے نتیجے میں یہ ریاست بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔

دس برس قید

شیخ محمد عبداللہ جنہیں جنگ کی حالت میں بھارتی کشمیر کی باگ ڈور سونپی گئی ۱۹۵۳ء میں نہ صرف وزارتِ عظمیٰ سے الگ کر دیئے گئے بلکہ نظر بند بھی۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں انہیں رہا کرنے کے بعد اپریل ۵۸ء میں پھر رہا کر دیا گیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انہیں کشمیر سازش کیس میں ملزم بنایا گیا۔ اس طرح کم و بیش ساڑھے دس برس کی قید کے بعد گذشتہ ۸ر اپریل کو انہیں باعزت طور پر رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد بھارتی وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو سے بات چیت کے نتیجے میں شیخ صاحب بھارت اور پاکستان کو ایک دوسرے کے نزدیک لانے کے لئے کام میں جٹ گئے۔ پرانا بھائی چارہ کیسے پھر سے قائم ہوگا! اس کی روپ ریکھا، خدوخال کیا ہوں گے! اس بحث میں اُلجھے بغیر انہوں نے اس سہ گونا بنیاد کا اعلان کیا جس پر باہمی اعتماد کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ پہلی بات یہ تھی کہ کسی بھائی کو یہ احساس نہ ہو کہ اس کی ہار ہوئی۔ دوسری یہ کہ بھارت میں رہنے والی اقلیتیں خطرے میں نہ پڑ جائیں جس کے لئے ضروری ہے کہ ہندو اکثریت سیکولرازم کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ تیسری بات یہ تھی کہ بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو خوشگوار کرتے ہوئے جموں و کشمیر کے عوام کی خواہشات کو مدِنظر رکھا جائے۔

شری نہرو کی رضامندی سے شیخ صاحب نے اعلان کیا کہ وہ پاکستان جا کر پریزیڈنٹ ایوب سے ملیں گے تاکہ دونوں ملکوں میں رواداری کے جذبات کو تقویت پہنچا کر انہیں جلد سے جلد آپسی جھگڑوں کو صلح و صفائی کے ساتھ نپٹانے کے واسطے آمادہ کیا جا سکے۔ ۲۰ر مئی کو سری نگر سے دلی روانگی کا

و[illegible] سے الٹ [illegible] تعصب و نفرت [illegible] ماحول [illegible] فطری [illegible] انسانی تھا۔ مجھ پر ہمدردی اور ندامت کے ملے جلے جذبات نے [illegible] تھا۔ [illegible] اس کا باپ [illegible] کے بقول ریذیڈنسی [illegible] پر کہیں کام کیا کرتا تھا ۱۹۴۷ء میں باپ قتل ہو گیا۔ اس کی ماں اسے اور ایک اور چھوٹے بیٹے کو ساتھ [illegible] بہ مشکل جان بچا سکی تھی [illegible] ذمہ داری [illegible] بھی تھی [illegible] کر اپنی زندگی اجیرن نہیں بنانا چاہتا۔ وہ ہمدردی کا محتاج بھی نہیں۔ اس کی نگاہیں حال اور مستقبل پر ہیں۔ وہ ترقی کی دوڑ میں برابر کا حق چاہتا ہے اور بس۔ اُسے اپنے اوپر، اپنی صلاحیتوں کے اوپر پورا پورا اعتماد تھا اور وہ زندگی سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اور اب وہ اپنی ٹیکسی کھینچ رہا تھا۔ چھوٹا بھائی کسی افسر کے ساتھ اسٹینوگرافر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ جب اُسے پتہ چلا کہ میں ہندو ہوں تو میں نے اُس کے چہرے پر فرشتوں کی سی مسکراہٹ دیکھی اور جب میں ٹیکسی سے اتر کر کرایہ دینے لگا تو اُس نے کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔

خوبصورت اخبار

راولپنڈی میں اُردو اخبارات کی صوری و معنوی خوبیوں نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ دلّی کے اُردو اخبار تو کیا وسیع تر حلقۂ اشاعت رکھنے والے ہندی اخبار بھی پاکستان کے اُردو اخبارات سے کہیں پیچھے ہیں۔ افتتاحیہ مقالوں میں ہندوستان دشمنی کا وہ عنصر نمایاں نہ تھا جو اکثر بھارتی اخبارات میں پاکستان کے بارے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ہر عمر اور ہر مزاج کے قارئین کی دلچسپی کے لیے کسی قسم کا مواد بڑے بے تکلف طریقے سے پیش کیا جاتا ہے۔ [illegible] سب سے بڑی بات یہ جو مجھے وہاں ایک ہفتہ روزہ قیام کے دوران میں محسوس ہوئی پاکستان [illegible] اس حد تک "اسلامی" نہیں ہے جس کا تصور پاکستان کے ایک دینی ریاست کے دعوے سے ہو سکتا ہے۔ بلکہ پوری پاکستانی ریاست پر اسلام کا اثر [illegible] "ماڈرن ازم" کا زیادہ ہے۔ اسی طرح جیسے ہر بھارتی [illegible] پر [illegible] یہ ایک نیک شگون ہے کیونکہ [illegible] ہے کہ مذہبی اقدار قوانین میں [illegible] جیسے اسلامی اصولوں سے پوری [illegible] "مذہبی سیاسی ایریج" [illegible] ہندوستان کے قریب ہی ہو سکتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان اس طرح ایک دوسرے کے نزدیک آ سکتے ہیں اور عالمی سیاسیات میں کوئی اہم اور موثر رول ادا کر سکتے ہیں۔

پُرانے کانگریسی

آنے والے سانحۂ عظیم سے قطعاً بے خبر ۲۷ مئی کی صبح کو ہم مظفرآباد روانہ ہوئے۔ پاکستان کے ہوم منسٹر جناب خان حبیب اللہ خان بھی ہمراہ تھے۔ اور شیخ صاحب کے ساتھ قافلے کی اگلی کار میں بیٹھے تھے۔ راولپنڈی چھوڑنے سے قبل شیخ صاحب اور میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ مرحوم کی رہائش گاہ پر ایک الگ کمرہ میں کوئی پون گھنٹے تک بات چیت کرتے رہے۔ اس اثنا میں برآمدے میں خان صاحب کی پُرکشش شخصیت کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے سنا تھا کہ آپ ایک پُرانے کانگریسی ہیں اور فرقہ وارانہ خیالات سے کوسوں دُور۔ جیسا سُنا تھا، ویسا ہی پایا۔ ہندو پاک اقلیتوں کی بات چلی۔ انہوں نے ہوم منسٹر شری گلزاری لال نندا سے اپنی حالیہ ملاقات کا تذکرہ کیا اور شیخ میرواعظ ملاقات کے اختتام تک ہمیں مشغول دیکھا۔ ان کی بات چیت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ آپ ایک انتہائی مخلص انسان ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ ہندو مسلم بھائی بھائی کی مانند رہیں۔ نندہ صاحب کے بارے میں بھی اُنہوں نے بڑی اچھی رائے ظاہر کی اور کہا کہ کوئی وجہ نہیں کہ اگر مرکزی حکومتیں پوری کوشش کریں تو برصغیر میں امن واتحاد کی فضا پیدا نہ ہو۔

خان صاحب کے ساتھ اُن کے جائنٹ سکریٹری مسٹر نیازی بھی تھے۔ جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ آپ "آزاد کشمیر" کے سربراہ مسٹر خورشید کے بدظن ہیں [illegible] مسٹر نیازی کے بلند پایہ پٹھان کردار سے متاثر پایا۔ اگرچہ مجھے اُن سے بات چیت کا موقع نہیں ملا۔

آزاد ہند فوج

میں اوپر ذکر کرنا بھول گیا ہوں کہ راولپنڈی میں بریگیڈیر راجہ حبیب الرحمٰن سے بھی ملاقات ہوئی۔ آپ ہی وہ فرزندِ وطن ہیں جنہوں نے نیتاجی سبھاش چندر بوس کی زیر قیادت آزاد ہند فوج میں کام کیا تھا اور پھر انہیں کے ساتھ ہوائی جہاز کے حادثے میں زخمی ہوئے تھے جس کے بعد نیتاجی کی زندگی و موت کے معمّے کا آغاز ہوا تھا۔ راجہ صاحب آزاد ہند فوج سے فارغ ہونے کے بعد جموں آ چکے تھے اور ہمارے دفتر اخبار "رہبر" میں بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا مسعودی نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور محترم والد صاحب کی بابت پوچھا اور کچھ اس قسم کی باتیں کیں جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس قسم کی علٰحدگی سے خوش نہیں ہیں۔ میں حیران تھا کہ جہاں حبیب الرحمٰن نیازی اور حبیب الرحمٰن ایسی شخصیتیں موجود ہوں وہاں بھارت اور پاکستان کو نہرو اور ایوب کی قیادت میں ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب لانے میں

کونسا امر مانع ہو سکتا ہے۔

راولپنڈی سے سری نگر کی شاہراہ پر جگہ جگہ شیخ صاحب کا اسی طرح استقبال ہو رہا تھا جیسے جمّوں سے سری نگر کے راستے پر ہوا تھا۔ البتہ نعروں میں ماحول کے مطابق کافی فرق تھا۔ "شیرِ کشمیر زندہ باد" کے علاوہ "پاکستان زندہ باد"۔ "فیلڈ مارشل ایوب زندہ باد" اور قومی نعرہ "کشمیر ہمارا" کے نعروں سے آسمان گونجتا تھا۔ مگر افسوس کہ ہندو مسلم سکھ اتحاد کا نعرہ کہیں بھی سُنائی نہ دیا۔ وجہ ظاہر تھی کہ ایک تو اس علاقے میں غیر مسلم نفی کے برابر ہیں۔ دوسرے پاکستان کی بنیاد جس نظریے پر رکھی گئی ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے نعرہ سے اس کی تردید کا پہلو نکلتا تھا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی کہ دو قومی نظریہ پاکستان کو معرضِ وجود میں لانے کا موجب تو بنا اور اس لحاظ سے یہ نظریہ پاکستان کی سب سے بڑی طاقت ہے لیکن پاکستان کا حال و مستقبل تو اس ملک میں بسنے والے سبھی لوگوں کی یک جہتی سے ہی وابستہ ہو سکتا ہے اور اسی لحاظ اب اس نظریے کو اس کی سب سے بڑی کمزوری پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ شیرِ کشمیر کے دَورۂ پاکستان سے وہاں یہ بہت بڑا فائدہ حاصل کیا جا سکتا تھا کہ "شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد۔ "ہندو مسلم سکھ اتحاد" کے نعروں سے فضائیں گونج اُٹھتیں تو عوامی سطح پر غور و فکر کو ایک صحت مندانہ موڑ دیا جا سکتا ہے۔

آزاد کشمیر

مری کے دلکش مقام پر خاص طور سے شاندار استقبال ہوا، جلسہ و جلوس کے علاوہ ایک بڑے ہوٹل میں ناشتہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں تین چار سو مہمان (یا میزبان) شریک ہوئے۔ میری میز پر بائیں طرف مقامی ڈپٹی کمشنر تھے اور دائیں طرف خفیہ پولیس کے اعلیٰ افسر سفید کپڑوں میں ملبوس، میرے ساتھ بات چیت کے دوران دونوں نے اپنی سرکاری حیثیت کو چھپانے کی کوشش کی مگر جلد ہی راز کھُل گیا۔ ہر مقام پر میری گاندھی ٹوپی اور جواہر جیکٹ بجائے خود باعثِ کشش بنی تھی اور سیکیورٹی والوں کے لئے شاید کسی حد تک پریشانی کا سبب بھی۔

پروگرام کے مطابق ہمیں ۱۲ بجے دوپہر کو مظفر آباد پہنچنا تھا۔ مگر ½۱۲ بجے ہم ابھی کوہالہ پُل عبور کر رہے تھے۔ دلّی سے روانہ ہونے کے ٹھیک ۴۸ گھنٹہ کے بعد میں "آزاد کشمیر" میں داخل ہو رہا تھا۔ (دلّی اس وقت اُجڑ رہی تھی) کوہالہ پل کے اُس پار "آزاد کشمیر" کے حاکم شیخ صاحب کا استقبال کر رہے تھے ہماری کار پُل کے بیچ میں رُک گئی۔ نیچے دریائے جہلم بہہ رہا تھا جو پاکستان اور کشمیر کی سرحد ہے۔ میرے خیالات چند لمحوں کے لئے پھر قدرت و انسان کا مقابلہ کرنے میں کھو گئے۔ جہلم کا دایاں کنارہ دھرتی کو ویسے ہی فیضیاب کر رہا تھا جیسا کہ اس کا بایاں کنارہ۔ مگر ایسا مشترکہ سرچشمۂ فیض بھی انسان کو انسان سے ملانے کے بجائے اُسے جدا کرنے کے کام آ رہا تھا۔ ہمارے قافلے کو اسکارٹ کرنے والی پاکستانی پولیس، گاڑی پُل کے اُس پار ہی رُک گئی۔ اب ہماری حفاظت کی ذمہ داری "آزاد کشمیر" کی پولیس پر تھی۔

پاکستانی سکھ

کوہالہ پُل سے مظفر آباد تک ہر مقام پر شیخ صاحب کا شایانِ شان سواگت کیا گیا۔ راستے میں ایک کار خراب ہو گئی تو کچھ دیر کے لئے قافلے کو رُکنا پڑا۔ ہم سب اُتر کر ٹہل رہے تھے کہ کرنل عدالت خاں مل گئے۔ کچھ نہ پوچھیے کتنے خوش تھے۔ جب قافلہ چلنے لگا تو ہماری کار ہی میں بیٹھ گئے اور پھر کونسی بات تھی جو اُنہوں نے نہ کی۔ ان کی یہ پختہ رائے تھی اور میں بھی اس سے متفق تھا کہ اگر حاکم لوگ فرقہ وارانہ رواداری کے حامل ہوں تو کبھی فرقہ وارانہ فتنہ و فساد کھڑا نہیں ہو سکتا۔ مظفر آباد کے گرد و نواح میں اس وقت بھی کچھ سکھ بہن بھائی آباد ہیں۔

کرنل موصوف نے بتایا کہ جب وہ بھارتی کشمیر سے پاکستانی کشمیر میں آئے تو اُنہوں نے سب سے پہلے یہی کام کیا کہ جن لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا، اُنہیں پھر اصلی مذہب میں داخل کیا گیا۔

دو بجے کے قریب ہم "آزاد کشمیر" کی راجدھانی مظفر آباد پہنچے جہاں پہلی بار بھارتی اخبار نویسوں کو اور پھر بھارتی کشمیر کے ایک اخبار نویس کو داخل ہونے کی اجازت دی گئی تھی۔ ہند و پاک کی تاریخ میں ایک نئے دَور کا آغاز ہوا تھا۔ عالمی سیاسیات میں ایک نئی طاقت جنم لے رہی تھی۔ دونوں میں کتنی معنی خیز تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے دل اب جُڑنے ہی والے تھے۔ مگر جلد ہی ساری خوشیاں سارا جشنِ استقبال ماتم میں بدل گیا۔

سانحۂ عظیم

سری نگر اور مظفر آباد کو ملانے والی روشنی دلّی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بُجھ گئی۔ شیخ صاحب غم کے دریا میں ڈوب گئے۔ اچانک آسمان پر بھی کالے بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ گویا قدرت بھی اشکبار تھی۔ جموں و کشمیر کے بیسیوں مہاجرین وہاں ملے۔ ایک کے بعد دُوسرا بغلگیر ہو رہا تھا۔ سترہ برس کے بعد پھر ملن کی کتنی خوشی تھی اور یہ خوشی کس قدر رنج و غم کے ساتھ ٹل جاتی کہ ہم فوراً بچھڑنے والے ہیں اور خدا جانے پھر کب ملیں گے۔ ؟ مل بھی سکیں گے یا نہیں ! سترہ برس کی طویل جُدائی میں اکثر صورتیں بھی بدل چکی تھیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے منحوس واقعات سے پہلے ہندو مسلم جس طرح شیر و شکر ہو کر رہتے تھے وہی جذبہ اُبھر آیا تھا۔ جمّوں کی کتنی ہی گلیوں اور محلوں کا ذکر آیا۔

...ے تھے۔ اس اختصار سے بچوں کو شکایت تھی۔ چنانچہ ... دن ایک تیز و طرّار قسم کے لڑکے نے اپنی اور ساتھیوں ... شکایت بیان کرتے ہوئے کہا۔

"باپو جی آپ ہمیں اکثر گیتا کا پاٹھ سُنایا ... تے ہیں۔ گیتا میں جب ارجن بھگوان کرشن سے کوئی ... سوال بھی کرتے ہیں تو بھگوان کرشن طویل جواب ... یتے ہیں۔ اور آپ ہمارے طویل سوالوں کا بھی مختصر ... اب دیتے ہیں۔"

گاندھی جی نے مُسکرا کر جواب دیا۔ "بھگوان کرشن ... پاس تو صرف ایک ہی ارجن تھے اور میرے پاس تو ... بھگوان کی دیا سے ارجنوں کی پوری ایک فوج ہے۔ ... ایں غلطی پر ہے!؟"

تمام بچے ہنس پڑے۔

●

ایک دفعہ ایک چینی سیّاح تبّت سے ہوتا ہُوا ہندوستان آ رہا تھا۔ جب وہ تبّت پہنچا تو ... ئی لامہ سے بھی ملاقات کی۔ اپنے آئندہ پروگرام کے متعلق دلائی لامہ سے مخاطب ہو کر سیّاح نے کہا کہ

"اب میں ہندوستان جا رہا ہوں اور سب سے پہلے گاندھی جی کی شہرت سُنی تھی۔ چنانچہ اُس نے ... چاہا کہ تبّت اور ہندوستان میں دوستی کی بنیاد مضبوط کرنے کے لئے گاندھی جی سے خط و کتابت کی جائے۔ اس لئے اُنہوں نے ایک دستی خط چینی سیّاح کو دیدیا اور تاکید کردی کہ اسے گاندھی جی تک پہنچا دے۔ چنانچہ جب وہ چینی سیّاح ہندوستان پہنچا تو اپنے پروگرام کے مطابق سب سے پہلے گاندھی جی سے ملاقات کی اور دلائی لامہ کا خط گاندھی جی کو دے دیا۔

گاندھی جی دلائی لامہ کے خط کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے سیّاح کے سامنے ہی لفافہ چاک کیا۔ خط تبّتی زبان میں لکھا ہوا تھا جو کہ گاندھی جی نہیں جانتے تھے۔ اُنہوں نے سیّاح سے پوچھا کہ کیا آپ تبّتی زبان جانتے ہیں۔ اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ گاندھی جی نے بہت کوشش کی لیکن ایسا کوئی شخص نہ مل سکا جو تبّتی زبان جانتا ہو۔ چنانچہ گاندھی جی نے گجراتی زبان میں دلائی لامہ کے خط کا جواب لکھ کر بھیج دیا۔ (غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دلائی لامہ کو گجراتی زبان سے بالکل واقفیت نہ ہوگی!)

●

گاندھی جی کے ساتھ ساتھ ہر وقت پریس رپورٹروں کا ایک گروہ رہتا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے یہ نمائندے اُن کا پیچھا نہ چھوڑتے اور طرح طرح کے سوالات کر کے اُنہیں پریشان کرتے تھے۔ اکثر جب گاندھی جی صبح سویرے ٹہلنے کے لئے نکلتے تو اخباری نمائندے اُنہیں چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے ٹہلنے کے وقت میں تبدیلی کرلی اور صبح پانچ ہی بجے ٹہلنے کے لئے گھر سے نکل پڑے۔ لیکن اُنہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اُس وقت بھی چند اخباری نمائندے گیٹ کے قریب کھڑے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی ... ... اور ... ... نمائندے دُم کی طرح پیچھے پیچھے چل پڑے۔

ایک نمائندے نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ سنت مہاتماؤں کو مرنے کے بعد جنّت نصیب ہوتی ہے۔ اس طرح آپ ... ہیں اور آپ کو بھی جنّت ہی نصیب ہوگی۔"

گاندھی جی نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"مجھے جنّت میں جگہ ملے یا دوزخ میں مگر مجھے یقین ہے کہ اخباری نمائندوں کا ایک ہجوم وہاں بھی میرے ساتھ ضرور ہوگا۔"

★

خطوط

انور احمد ———— مئو پارہ

دورِ حیات کا آزادی نمبر دیکھا۔ کتنی عمدہ چیزیں پیش کی ہیں۔ اس مرتبہ افسانوں کا انتخاب مجھے نہیں بھایا۔ مہندرناتھ کا "رشتہ"، "سلیقہ بھی ایک کلا ہے" (سلمیٰ صدیقی) اور "ٹرانسسٹر" (جیلانی بانو) نے البتہ اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اور نظمیں سبھی جاندار اور دلکش ہیں۔

آصف فیضی کا مقالہ "ہندوستان میں تمدنی وحدت" جامع اور پُراثر ہے تاہم ایک جگہ اسلام سے متعلق اُن کی رائے گراں ہے۔ لکھتے ہیں:

"... اور اسی طرح اسلام جو مساوات اور اخوت کا دعویدار بننے کے باوجود قوم کو شیعہ، سُنّی، مقلد اور غیر مقلد، شیخ اور سید میں بانٹ دیتا ہے، کیونکر رواداری کا علمبردار مانا جا سکتا ہے۔"

مذکورہ تفریق (جو مسلمانوں کی خود کردہ ہے) اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر معرضِ وجود میں ہرگز نہیں آئی بلکہ یہ خود مسلمانوں کے ذہنی فتور اور تعلیمات کو واضح طور پر سمجھنے کی نااہلی کا نتیجہ ہے۔ کیا سرکاری قوانین سے روگردانی اور عام بیزاری سے ان قوانین کی افادیت اور اہمیت کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔؟ اسلامی اخوت اور مساوات کو سب سے بڑا نقصان خود مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کے مغرور اور "سرکش" امیروں سے پہنچا ہے۔ آج بھی اگر فراخدلی سے ہم ان پر عمل کریں تو تفریق کا یہ مصنوعی پردہ اُٹھ سکتا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ان تعلیمات کو عمل کی کسوٹی پر نہ پرکھتے ہوئے انہیں بے جان اور غیر مفید سمجھ بیٹھیں۔

★ مضمون نگار نے مذہبِ اسلام پر اعتراض نہیں کیا ہے بلکہ اُس کے پیرووں نے جو عملی صورت پیدا کی ہے اُس پر تعریض کی ہے ورنہ ظاہر ہے کہ یہ تقسیم نہ تو اسلام کے ساتھ ہوئی اور نہ اُس کی تعلیمات میں کہیں بھی اس کا ذکر ہے۔ (مدیر)

مظہر امام ———— گوہاٹی (آسام)

آزادی نمبر آپ کی خوش ذوقی کا آئینہ دار ہے۔ بہت سے اچھے لکھنے والوں کو آپ نے جمع کر رکھا ہے۔ اکثر مضامینِ نظم و نثر پسند آئے۔

آسی رام نگری ———— مغل سرائے

کل بنارس میں ایک عزیز کے ہاں "دورِ حیات" دیکھا۔ بہت اچھا پرچہ ہے۔ مندرجات کا انتخاب اور ترتیب و تدوین بہت خوب ہے ———— دورِ حیات دیکھ کر انتہائی مصروفیات میں بھی اس کے لئے لکھنے کو جی چاہنے لگا۔ جلد ہی کوئی چیز بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

اب کی بار

اس شمارے میں عیاذ انصاری کا فکر انگیز مقالہ بڑے غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن عیاذ انصاری نے اقبال اور اُن کی شاعری کو ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور یہ زاویہ میرے خیال میں اب تک ہمارے محققین کی نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ چند وجوہات کی بنا پر اس مقالے کے کچھ حصے عیاذ صاحب نے خود ہی حذف کر دئے ہیں۔ اگر کہیں بات تشنہ محسوس ہو تو اسے مصلحت کا تقاضا سمجھ لیا جائے۔

دوسرا بڑا دلچسپ اور مفید مضمون اوم پرکاش صراف کا ہے۔ ایسے مضامین پاکستان اور ہندوستان میں دلوں کی کدورت دُور کرنے اور دوستی اور بھائی چارگی کی فضا قائم کرنے میں بڑے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ اس قسم کے مضامین لکھے جائیں، تاکہ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد ۳ | ۲۰ اکتوبر سنہ ۶۴ء | شمارہ ۲۸

اس شمارے میں

قیمت:
ایک سال ____ دس روپے
فی پرچہ ____ تیس پیسے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- سپریم کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں کہا ہے کہ قانون ساز اسمبلیاں خودمختار اور مطلق العنان نہیں ہیں ۔ وہ اپنی خودمختاری کے باوجود دستورِ ہند کے حدود میں کام کرنے پر مجبور ہیں ۔
- آندھرا پردیش میں سیلاب کی وجہ سے ۱۰۰ آدمی ہلاک اور تقریباً ۲۰ ہزار متاثر ہوئے
- پورے ملک میں گاندھی جینتی منائی گئی ۔
- حکومتِ ہند نے کمپنیوں کے ٹریبونل کے سامنے ایک درخواست پیش کی ہے جس میں ٹائمز آف انڈیا کے مالکان و ڈائرکٹرز اور جنرل منیجر مسٹر پی۔ کے۔ رائے کو ان کے عہدوں سے ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا ہے ۔
- غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے وزیر اعظم شاستری قاہرہ پہنچ گئے ۔ اس کانفرنس میں ۵۸ ملک حصہ لے رہے ہیں ۔
- فرانس کی خبروں میں کہا گیا ہے کہ چین نے ایٹم بم تیار کر لیا ہے ۔
- مسٹر بھابھا ہندوستانی سائنس دان برائے ایٹم نے کہا ہے اگر ہندوستان چاہے تو ۱۸ ماہ میں ایٹم بم تیار کر سکتا ہے ۔
- قاہرہ کی غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس میں صدر ٹیٹو اور صدر سوکارنو میں بقائے باہم ۔ نظریات کے بارے میں اختلاف ہو گیا ۔ ایسا ہی اختلاف ہندوستان اور انڈونیشیا کے درمیان بھی پایا جاتا ہے ۔
- قاہرہ کی کانفرنس نے فیصلہ کیا ہے کہ مسٹر شومبے کو کانفرنس میں شریک نہ ہونے دیا جائے ۔ لہٰذا اُن کے قاہرہ پہنچتے ہی انہیں نظر بند کر دیا گیا ۔

میں اپنے اجنبیِ شہر و خوش نگاہ کے ساتھ
جو سحر خانۂ عالم کی سیر کو نکلا
تو ہنس کے ، بیتے ہوئے چند اُداس لمحوں نے ـــ
"بہت ہی شاداں و فرحاں ہو آج ؟" ـــ مجھ سے کہا
سہم کے میں نے خطاکار طفل کی مانند
شفیق ساعتِ مسرور کی طرف دیکھا
شفیق ساعتِ مسرور ! مادرِ مظلوم !!
لئیمِ وقت کی باندی
کنیزِ گردشِ دہر ـ

●

نیا انٹلکچول

ابراہیم رنگلا

جس محلّے میں ہے ہمارا گھر
وہیں رہتے ہیں ایک اہلِ نظر
خیر سے آپ ایک کالج میں
کچھ پڑھاتے بھی ہیں ـ
ایک درجن میں پون درجن کم
یہ کتابوں کے بھی مصنّف ہیں
بات جب بھی ادب کی چھڑ جائے
ایلیٹ اور پاؤنڈ سے لے کر
سارترے کو بھی طفلِ مکتب جان
اس طرح بات اپنی رکھتے ہیں
جیسے آیات ہوں صحیفے کی
"نئے شاعر کو ماریے گولی
یہ نہیں جانتے ادب کیا ہے
سارترے فلسفی تو ہے صاحب
لیکن اُس کو ادب سے کیا مطلب
شیکسپیئر عظیم ہے کیونکہ
سبھی اس کو عظیم کہتے ہیں"
محفلِ شعر اور ادب میں ہمیں
نابغے یوں بہت ملیں گے مگر
نابغوں کے ہیں فالشاف جناب

ہند پاک دوستی کے لئے چند تجاویز

احمد فاطمی

ہند پاک دوستی اور خوشگوار تعلقات کی اہمیت بلکہ ناگزیریت کا اظہار، وقت پر ہند سرکار کرتی ہے اور پاکستان سرکار بھی!

ہند سرکار کی اس خواہش کو کروڑوں، ہندوستانیوں کی تائید حاصل ہے اور اسی طرح — جیسا کہ ہم عوام کے دلوں کو جانتے ہیں — ہمیں یقین ہے، صدر ایوب کو بھی لاکھوں اور کروڑوں پاکستانی عوام کی حمایت حاصل ہوگی!!

لیکن اس نیک جذبے کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کسی قابلِ ذکر حد تک، قریب آنے میں اب تک ناکام رہے ہیں۔

کیوں —؟

اُدھر پاکستان کہتا ہے، جب تک کشمیر کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اُس وقت تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوستی کی کوئی ٹھوس بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔

اِدھر ہندوستان کے سنجیدہ طبقے کا یہ، خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ طے بھی ہو جائے — تو پاکستان کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا کرے گا۔ دراصل پاکستان ہندوستان کے ساتھ دوستی اور خوشگوار تعلقات قائم کرنا چاہتا ہی نہیں ہے۔

عدم اعتماد

لیکن ہماری رائے میں ہندوستان اور پاکستان کے بیچ دوستی کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ ہے باہمی اعتماد کی کمی۔ پاکستان کا ہندوستان پر اور ہندوستان کا پاکستان پر اعتماد نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی نیت پر شک کرتے ہیں۔

اس لئے سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت اس کھوئے ہوئے اعتماد کو بحال کرنے کی ہے۔ اگر ان دو ملکوں کا ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہو گیا تو اگر ایک دوسرے کے خلوصِ نیت پر یقین پیدا ہو جائے تو دونوں ملکوں کے مسائل ایک دوسرے سے اتنے زیادہ وابستہ ہیں اور ان کے درمیان اتنی ساری مشترک قدریں ہیں کہ دوستی اور خیر سگالی کی بنیادیں فراہم ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعتماد قائم کرنے کے لئے کیا تدبیریں اختیار کی جائیں۔

پانچ نکات

اس کے لئے ہم حسب ذیل پانچ نکاتی پروگرام کی تجویز پیش کریں گے۔

(۱) دو مہذب پڑوسی ملکوں کے درمیان جس نہج کے تعلقات ہوتے ہیں اور جو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بھی ایک حد تک قائم ہیں۔ ان کے دائرے کو اور زیادہ وسیع کیا جائے، مثلاً اخبار نویسوں، یونیورسٹیوں، کسانوں اور مزدوروں وغیرہ کے خیر سگالی کے وفد ایک دوسرے ملک کا کثرت سے دورہ اور سماج کے ہر طبقے کے ساتھ، رابطہ قائم کریں۔ پاکستان کے اخبار نویسوں پر ہندوستان میں اور ہندوستان کے اخبار نویسوں پر پاکستان میں جو نقل و حرکت پر آج پابندیاں عائد ہیں، وہ ختم ہونی چاہئیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی یونی ورسٹی میں پاکستان کے اور پاکستانی یونیورسٹیوں میں ہندوستان کے طلبا بڑی تعداد میں داخل کئے جائیں۔ ان تدبیروں سے ایک، دوسرے ملک کو اور ایک دوسرے ملک کے عوام کو بہتر طور پر سمجھنے کے مواقع ملیں گے اور ایک دوسرے ملک کے خلاف بہت ساری غلط فہمیوں کا سدِ باب ہوگا۔

(۲) ہندوستان اور پاکستان کے درمیان غیر سیاسی نوعیت کے جو مسائل ہوں اُنہیں غیر سیاسی سطح پر حل کرنے کی دونوں طرف سے سنجیدہ کوشش کی جائے۔ مثلاً دونوں بنگال میں سیلاب کا جو مسئلہ ہے وہ خالصتاً انسانی نوعیت کا مسئلہ ہے اور اسی سطح پر اُسے حل کرنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ ایسا ہونے سے دونوں ملکوں میں انسانی قدریں فروغ پائیں گی۔

(۳) ہند پاک تجارت کے حلقے کو مقدور بھر وسیع کیا جائے۔

تیس۳۰ اختلافی مسائل

(۴) ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں جن کی تعداد تیس کے ادھر اُدھر ہے، اُن میں جو سب سے کم پیچیدہ ہیں انہیں سب سے پہلے سلجھانے کی کوشش کی جائے نسبتاً مشکل اور پیچیدہ سوال کو بتدریج ہاتھ میں لیا جائے۔ آسان سوالوں سے پہلے اور مشکل مسئلوں سے بعد میں نمٹنے کی وکالت ہم اس لئے کرتے ہیں کہ آسان سوال آسانی سے حل ہو جائیں گے اور ایک مسئلے کا حل دوسرے مسئلے کے حل کا دروازہ کھولے گا۔ اس طرح مسئلے درجہ بدرجہ حل ہوتے چلے جائیں گے۔ اور ساتھ ساتھ باہمی اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

(۵) سب سے آخر میں کشمیر کے مسئلے کو سلجھانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ اس بڑے مسئلے کو ہم ٹالنا بھی نہیں چاہتے۔ اس مسئلے کو پاکستان جو اہمیت دیتا ہے، اس سے بھی ہم واقف ہیں۔ پاکستان کے موقف سے قطع نظر بھی اس مسئلے کی جو اہمیت ہے، اُس سے بھی ہم غافل نہیں ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ہم اس سوال کو سب سے آخر میں لینے کے حق میں ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کا مسئلہ دونوں ملکوں کے لئے ایک نفسیاتی اور جذباتی سوال ہو گیا ہے۔ اس سوال پر دونوں حکومتوں کا اپنا اپنا ضدّینی موقف ہے اور، ابھی تک، کوئی بھی سرکار اپنے موقف سے رتی برابر بھی ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آتی۔ سترہ برسوں سے یہ قصّہ چل رہا ہے۔ اس مدت میں کئی مرتبہ یہ سوال سلامتی کونسل کی بحث کی زینت بنا، کئی بار ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حکومتی سطح پر مذاکرے ہوئے۔ اور ہر دفعہ، پہلے مرغی یا پہلے انڈا کی لایعنی بحث پر بات ختم ہو گئی۔ کیا ہندوستان کی، کیا پاکستان کی، کوئی بھی حکومت اس مسئلے پر نئے سرے سے سوچنے کے موڈ میں ہے۔ نہ آج وہ اس کی جرأت ہی کر سکتی ہے۔ جرأت کرے بھی تو مخالف پارٹیاں اسے عمل میں نہیں آنے دیں گی۔ وہ حکومت ہی شاید ٹوٹ جائے۔

پہلے اور بعد

لیکن کشمیر کے سوال کو آخیر میں ہاتھ میں لیا جاتا ہے اور اس سے قبل ہند پاک کے تمام نزاعی مسئلے سلجھ چکے ہوتے ہیں تو اس وقت دونوں ملکوں کے درمیان اعتماد و خیر سگالی کی ایک ایسی فضا قائم ہو چکی ہوگی کہ جس میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے ساتھ ساتھ دونوں ریاستوں کے عوام اور مخالف سیاسی جماعتوں میں بھی کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی مخلصانہ خواہش پیدا ہو چکی ہوگی۔ ایسی حالت میں کشمیر کا مسئلہ، اتنا پیچیدہ اور مشکل نہیں رہ جائے گا۔ جتنا آج معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت مذاکرے کی میز پر ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے جب آمنے سامنے بیٹھیں گے اُن میں سودے بازی کے جذبے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی بلکہ ہندوستان پاکستان کے اور پاکستان ہندوستان کے مفاد پر خلوص اور ہمدردی سے غور کرے گا، اور دونوں مل کر کشمیر کے مفاد پر نظر رکھیں گے۔ آج تو ہندوستان اور پاکستان کی صرف اپنے اپنے مفادوں پر نظر ہے اور ان دو مفادوں کی ٹکر میں بیچارے کشمیر اور کشمیریوں کا مفاد معدوم ہو گیا ہے۔

ہماری بصیرت ہم سے یہ کہتی ہے کہ ہند و پاک مفاہمت کی کوشش کا کشمیر سے آغاز کرنے کے مقابلے میں کشمیر پر اختتام کرنے میں کامیابی کے بہتر اور زیادہ امکانات ہیں۔

عوام کی ذمہ داری

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی ساری ذمہ داری حکومتوں ہی کی نہیں ہے۔ اس نیک کام میں عوام کو بھی حصہ لینا چاہیئے۔ اس ضمن میں ہماری حسب ذیل تجویزیں ہیں

(الف) "ہندوستان پاکستان مفاہمت گروپ"، INDIA PAKISTAN CONCILATION GROUP کے طرز پر پاکستان میں بھی قومی عصبیتوں سے بالاتر افراد پر مشتمل کوئی ادارہ قائم کیا جائے جو پاکستان میں بھی ہندوستان کی طرح پاک ہند مفاہمت کے جذبے کو فروغ دینے کی تدبیریں کرے اور ضرورت محسوس ہونے پر اپنی قومی حکومت کے طور طریقے پر بھی بے لاگ تبصرہ کر سکے۔

(ب) مذکورہ گروپ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ایک ایسی ٹیم بنائے جس کا کام اپنے ملک کے صحیح حالات سے اپنے ہم وطنوں اور دوسرے ملک کے باشندوں کو باخبر کرنا ہو۔ خصوصاً فرقہ وارانہ کشیدگی اور — خدانہ کرے — فرقہ وارانہ فسادات کے نقصانوں کی صحیح تفصیل پیش کرنا اس ٹیم کا خاص کام ہو۔ وہ ٹیم ایسے ملکوں پر مشتمل ہو جن کی ایمان داری مسلّم اور کسی بھی شک و شبہے سے پرے ہو۔ پچھلے برسوں ہندوستان اور پاکستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ اور وقتاً فوقتاً فساد کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ جس ملک میں کوئی واقعہ ہوا وہاں کی حکومت کے پیش کئے ہوئے اعداد اور مقدار کو دوسرے ملک نے صحیح نہیں مانا اور دوسرے غیر معتبر ذریعوں سے حاصل شدہ افواہوں پر اپنے تصوّر کا محل کھڑا کیا۔ ہندوستان کے بعض واقعات کی خبر پاکستان کے اخباروں میں بے حد مبالغہ کے ساتھ چھپی، یہ بات ہم بھی جانتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے واقعات کے ساتھ ہندوستان میں بھی ہوا ہوگا۔ ایسا ہمیں ماننا چاہیئے۔ اگر ہند پاکستان میں ایسی ایجنسیاں قائم ہو جاتی ہیں، جو

فراز عابدی

میرے مکان کے قریب ایک پارک تھا۔ جب طبیعت پریشان ہوتی، میں اُس پارک میں چلا جاتا وہاں میری ساری تلخیاں، پریشانیاں دُور ہو جاتیں۔ ٹھنڈی ہوا جسم کے مساموں میں گھس کر مجھے فرحت بخشتی۔ مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ اُس پارک کا کوئی نام نہ تھا۔ اُس کی حدیں گیندے کے پودوں اور لوہے کی سلاخوں سے گھری ہوئی تھیں۔ پارک میں طرح طرح کے لوگ آتے تھے جو بیشتر غریب، پریشان اور مفلوک الحال ہوتے۔ بچے فٹ بال کھیلتے، ایک دوسرے سے لڑتے اور گالیاں بکتے تھے۔ مجموعی طور پر اُس پارک میں کچھ اس طرح سے شور ہوتا تھا۔

"لیجیے لیجیے! دھر سالے.....!"

"تمہاری ماں کی..... سالے فٹ بال دھر نہیں کھیل سکتے!"

"آج پھر شیخ صاحب کی لونڈیا باھر نکلی تھی۔"

"بے کاری، گرانی اور ٹیکس میں دن رات ترقی ہو رہی ہے۔"

"فلم 'میرے محبوب' کے بعد سادھنا نکھر آئی ہے۔"

"ای ہمار گیند ہو!"

"دھت تمہاری....."

اس شور شرابے کے باوجود مجھے بہت سکون ملتا تھا۔ شاید اِس لئے کہ پارک کا ماحول عام گھریلو ماحول سے مختلف تھا۔ اُس پارک میں لکشمی بھی آیا کرتی تھی۔ اُس کے ساتھ سیما اور منٹو ہوتے اور ان سب کا بوڑھا چاچا دیانند بھی۔ لکشمی جوان اور قبول صورت تھی۔ کبھی میں اُسے دیکھتا کبھی وہ مجھے دیکھتی اور نظریں جھکا کر نرم نرم گھاس پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔

ایک دن بوڑھا چاچا سیما اور منٹو کو ڈانٹ رہا تھا۔

"قاعدے سے بیٹھو نہیں تو مار بے دو لپیڑا!"

کچھ دیر تک دونوں سہمے رہے پھر منٹو نے سیما کی چوٹی کھینچ لی۔ دیانند نے اُسے دو دھول رسید کئے اور کہا۔ "کھڑا ہو جا نہیں تو مار بے دو لپیڑا!"

منٹو سہم کر کھڑا ہو گیا اور منہ بسورنے لگا۔

"ابے اب کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ نہیں تو جھنپڑیا دیب!"

منٹو رونے لگا۔ دیانند اُسے چپ کراتے

فراہم کی ہوئی خبریں دوسرے ملک میں بھی مستند اور معتبر مانی جائیں تو ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ ہندوستان اور پاکستان پر بند ہو جائے گا۔

مشترکہ رسالہ

(ج) ہندوستان یا پاکستان سے کوئی ایسا تعلیمی (EDUCATIVE) اور معلوماتی ——— INFORMATIVE جریدہ نکالا جائے جس کے ایڈیٹروں کے بورڈ میں ہندوستان اور پاکستان دونوں دیس کے شہری ہوں۔

دونوں دیسوں کے نوجوان، خصوصاً طلباء بھی اِس مہم میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ قلمی دوستی کا اِس زمانہ میں بہت رواج ہے۔ کتنے ہی ہندوستانی اور پاکستانی لڑکے لڑکیوں کے بدیسوں میں قلمی دوست ہیں لیکن ہماری اطلاع کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کے شہریوں کے درمیان قلمی دوستی کا سلسلہ تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کے بچے بچیاں ایک دوسرے کے ساتھ قلمی دوستی قائم کرنے کا فیصلہ کر لیں تو بظاہر یہ "مائی کمی" دو ملکوں کے رشتے استوار کرنے کی سمت چونے گارے کا کام کرے گی۔

اُوپر ہم نے چند تجویزیں پیش کی ہیں لیکن وہ حرفِ آخر کا درجہ نہیں رکھتیں! وہ محض ایک سمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان خطوں پر اور مزید پروگرام بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔

گڑ ستے پارگیا۔ اُسے پھُولوں کی لالچ دلائی۔ منٹو چپ ہوگیا۔ منٹو کو پھول بہت پسند تھے۔ دیانند نے سیما سے کہا ــ" اسے گود میں لے جاکر پھُول توڑنے دے!" سیما نے ایک پھول چڑھائو۔ اُس نے کہا "ہم گڈو کالیت نہیں، بُخی دیتے نہیں، تب ان کا لیتیں گُڈ کا ماں "ـ

کچھ دیر بعد سیما اور منٹو گیندے کے بہت سے پھُول توڑ لائے۔ لنگوٹ باندھے ہوئے دو بچے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے پیلے پیلے پھولوں کو دیکھ رہے تھے۔ سیما اور منٹو کو پھُول چُنتے دیکھ کر اُن کی ہمت بڑھی۔ وہ تیسرا پھول توڑ رہے تھے کہ دیانند

" ابے لونڈے! پھُول توڑتا ہے، بھاگ!!"

لونڈے بھاگ گئے۔

دوسرے دن میں نے سیما اور منٹو کو گلاب کے کئی پھول لاکر دئے۔ دونوں بہت خوش ہوئے اور پھول لے کر دوڑتے ہوئے لکشمی کے پاس پہنچ گئے۔ منٹو اپنے آگے پھول رکھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے جو کچھ اُسے یاد تھا کہنے لگا۔

"جے شری رام، جے جے ہرے رام...

.... جے سنکٹ موچن جے ....

.... اٹ پٹ جھٹ پٹ مجھ کو دو پربھو.

.... حلوا، پوری، پھُول بتاشا ....

.... سنکٹ ہرلو سنکٹ موچن ...

.... جے ہری اوم جے شنکر ......"

لکشمی مُنہ پر دوپٹے کا کور رکھے ہوئے ہنس رہی تھی۔ سیما کبھی ہنستی کبھی سنجیدہ ہو جاتی دیانند دونوں ہاتھ کی اُنگلیاں آپس میں پھنسائے ہوئے بہت غور سے منٹو کی "پرارتھنا" سُن رہا تھا۔ سیما نے منٹو کے آگے سے ایک پھُول اُٹھالیا۔ دیانند کو غصہ آگیا۔

"یہ کیا کرتی ہو؟ خبردار جو اس کی پوجا میں بادھا ڈالی لیڈیا دیب! ہاں بیٹے کہیے؟"

منٹو کہہ رہا تھا۔

"جے بھگوان، جے بھگوت گیتا.....

...... جے اللہ ...... اللہ ہو اکبر......"

"چُپ بے!" دیانند نے بڑے زور سے ڈانٹا۔ "مارت مارت پگلا بنا دیب جو یہ کہا"

منٹو سہم کر چُپ ہوگیا۔ لکشمی کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ سیما نے بڑی حیران کُن نظروں سے اپنے چاچا کی طرف دیکھا۔ مجھے دیانند کی شخصیت بہت دلچسپ معلوم ہوئی۔

ایک دن سیما اور منٹو مجھے اپنے چاچا کے پاس لے گئے۔

"آداب"

دیانند نے کوئی جواب نہ دیا۔ لکشمی نے نظریں جھکالیں۔ میں نے محسوس کیا دونوں ایک تکلف ماحول میں ڈوب گئے ہیں۔ لکشمی آزادانہ مسکراتی تھی نہ دیانند بچوں کو بات بے بات ڈانٹتا تھا۔ میں وہاں سے جانے کو ہوا کہ دیانند میرے لئے اپنی بچھی ہوئی چادر کا ایک کونا خالی کرتا ہوا بولا۔ "بیٹھئے"

"شکریہ! یہ بچے بہت پیارے ہیں"

میں جانے سے پہلے مسکراتا ہوا آگے بڑھا لیکن لکشمی کی نظریں میرے قدموں سے اُلجھ کر رہ گئیں۔ میں اور آگے نہ بڑھ سکا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

"یہاں بیٹھئے نا!" دیانند نے چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں"

"آپ کرتے کیا ہیں؟"

"میں...؟" میں نے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا۔ "کہانیاں لکھا کرتا ہوں۔ مہیندر کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا"

لکشمی کے ہونٹوں پر ہزاروں گلاب کھل اُٹھے

"اچھا! تو آپ وہی مہیندر ہیں جو......

جو......" اور لکشمی کے ہونٹ آپس میں مل کر شرمانے لگے۔ وہ اپنا نرم نرم ہاتھ ہری ہری گھاس پر پھیرنے لگی میں نے دیانند کی نظروں سے بچ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں وہی مہیندر ہوں"

"آپ ہندی ہی میں کہانیاں لکھتے ہیں؟"

"بیشتر! کچھ افسانے اُردو میں بھی لکھے ہیں"

اسی طرح کی باتوں میں شام گہری ہوگئی۔ ہم اپنے اپنے مسکن کی طرف لوٹ آئے۔

ایک دن جب میں نے سیما اور منٹو کو ٹافیاں اور گلاب کے پھول دئے، لکشمی نے ایک پھول لے لیا دیانند نے مجھے اپنے گھر چائے پر مدعو کیا۔ پہلے میں ٹال گیا۔ اُس کے بے حد اصرار پر میں نے وعدہ کرلیا۔

"کیسے آئیے گا؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ـــ؟"

"آپ کو ہمارا پتہ تو معلوم نہیں ہے"

وہ ہنسا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اپنا پتہ بتانے لگا۔ "اس سڑک پر ناک کی سیدھ جانے پر داہنے ہاتھ میونسپلٹی کا نل ہے۔ اُس نل کے بغل سے ایک گلی جاتی ہے۔ گلی کے اُس پار کی سڑک کے اُس پار کی گلی میں دائیں طرف جاکر بائیں طرف مُڑتے ہی ایک مندر نظر آئے گا۔ اُس مندر کے پیچھے کے میدان کے اُس پار کی سڑک کے اُس پار کی گلی کے....."

"چاچاجی!" منٹو بیچ میں بول پڑا

"ہمارے گھر گلاب کا پودا ہے نا"

"ہاں ہے!" دیانند نے اُس کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا پھر مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "میں نے آپ کو پتہ تو بتایا ہی نہیں۔ اس سڑک کی سیدھ میں جائیے تو داہنے ہاتھ میونسپلٹی کا ایک نل ہے۔ نل کے بغل سے ایک گلی جاتی ہے۔ گلی کے اُس پار کی سڑک کے اُس پار کی گلی میں دائیں طرف جاکر بائیں طرف مُڑتے ہی ایک مندر نظر آئے گا۔ مندر کے......"

"اور چاچاجی!" منٹو بول پڑا۔

"اُس گلاب کے پودے میں پھول بھی کھلتے ہیں سبھی نا۔!"

"ہاں جی! چپ بیٹھو نہیں تو لپڑ یا دوں گا اوہ! میں نے آپ کو پتہ تو بتایا ہی نہیں۔۔۔"

"میں آ جاؤں گا۔" میں نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

"پتہ جانے بغیر کیسے آئیے گا۔ بہت آسان راستہ ہے۔ اس سڑک کی سیدھ میں۔۔۔"

لکشمی نے مجھے پتہ سمجھایا۔ میں نے دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے چلا آیا۔

لکشمی زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی۔ مڈل فیل ہو کر گھر پر بیٹھ رہی تھی۔ اُسے اُردو پڑھنے کا شوق تھا۔ لیکن یہ شوق دیانند کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا۔ ہم دونوں اکثر پارک میں ملتے۔ دیانند کو اس پر اعتراض نہ تھا۔

وہ ایک خوبصورت شام تھی۔ میں تھا۔ لکشمی تھی۔ پارک کا وہ مخصوص کونا تھا۔ معطر ٹھنڈی ہوائیں تھیں۔ نظروں سے اوجھل آفتاب اپنی مدھم ہوتی ہوئی کرنوں کو آہستہ آہستہ سمیٹ رہا تھا۔ لکشمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ذرا اُدھر دیکھئے۔"

میں نے دیکھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک نیم برہنہ آدمی سویا ہوا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک گندگی کا مجسمہ تھا۔ ایک شرارتی لڑکا اُس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ لڑکے نے زمین سے کاغذ کا ایک ٹکڑا اُٹھایا اُس کی بتی بنائی اور سوئے ہوئے آدمی کی ناک میں بتی پھرا کر بھاگ گیا۔ سویا ہوا آدمی ایک زوردار چھینک کے ساتھ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے نیند بھری آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا اور بھاگتے ہوئے لڑکے کی طرف مٹی کا ایک ڈھیلا اُچھال کر سو گیا۔

"ہنستی ہو لکشمی! یہاں جانور اور آدمی میں فرق مٹ گیا ہے۔"

یہ بات لکشمی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بہت دیر تک میری ہم خیال تھی۔۔۔

ایک طرف دو نوجوان بیٹھے ہوئے تھے اُن کے جسموں پر صرف انگوچھے تھے۔ پہلے نے دوسرے کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ "ابے لبے سن!"

"اماں ہٹو۔۔۔۔۔ کی نہیں تو دیکھنے بھی نہیں دیتے سالے۔"

"ابے اُسی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ آج اس کے ساتھ کیسے ہے سالی۔"

"واہ بیٹا! ابے وہ دوسری ہے۔"

"نہیں بے چڑیا کوئی کے: وہی ہے سالی، بڑھو والی۔ پوچھو! جانے ہے؟"

"بیٹا! ہمت نہیں پڑے گی۔ بڑے بڑے بہہ گئے گدھوا کہے کتنا پانی۔"

"کیا بات کرتے ہو بچے بھائی! اب تو پوچھ کر رہوں گا۔ میرا نام ٹنگارو ہے ٹنگارو! کچھ بولے گا سالا تو زمین پر بچھا دوں گا۔"

وہ کھنکارا۔ میں نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے جلدی سے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بجا ہے بڑے بھائی!"

میں نے وقت بتا دیا۔ وہ مطمئن ہو کر اپنے ساتھی سے مخاطب ہو گیا۔ جیسے وہ یہی سوال کرنا چاہتا تھا۔

"اُٹھئے یہاں سے!" لکشمی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیوں؟" میں مسکرایا۔ "اِن کی بھی باتیں سنو لکشمی! یہ اپنی دنیا کے عظیم ترین آدمی ہیں۔"

"آپ کی منطق ہی نرالی ہے بڑے آئے نیک کہیں کے۔ اُٹھئے۔"

ہم وہاں سے اُٹھ کر کشتی میں آ بیٹھے۔

کئی دن گزر گئے۔ لکشمی پارک نہ آئی۔ میری اُلجھنیں تشویش میں بدل گئیں۔ میں اُداس ہو گیا۔ غم غلط کرنے کے لئے وہ پارک سب سے حسین سہارا تھا لیکن وہاں بیٹھ کر میں اور اُداس ہو گیا۔ خود کو اکیلا پاتا اور چاروں طرف بہاریں دیکھتا تو ایک عجیب سی خلش ہوتی۔

ایک دن میں گلاب کے پھول اور ٹافیاں خرید کر لکشمی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مکان کے باہر سیما اور منٹو ایک لڑکے کو پیٹ رہے تھے۔ دونوں مجھے دیکھ کر خوشی سے چیخے نہ دوڑ کر مجھ سے لپٹے بلکہ لڑکے کو پیٹتے رہے۔ میں نے پیٹنے کی وجہ پوچھی۔ منٹو نے کہا۔ "یہ مسلمان ہے۔"

"لیکن مارتے کیوں ہو؟"

"کیوں نہ ماریں؟" سیما نے جواب دیا۔

"یہ مسلمان ہے اور ہم ہندو ہیں۔ ایک دن اس نے اپنے گھر کے قریب مجھے اسی لئے مارا تھا۔"

میں نے پٹتے ہوئے بچے کو چھڑا لیا۔ وہ چھوٹتے ہی بھاگ گیا۔ میں نے جیب سے ٹافیاں نکالیں۔ منٹو ٹافیاں دیکھ کر بہت خوش ہوا لیکن سیما نے اُس کا ہاتھ کھینچ لیا۔

"لو، یہ ٹافیاں ہیں!"

"ہم نہیں لیں گے۔"

"کیوں؟"

اُس نے ایک خوبصورت انگوٹھی اُٹھائی اور اُس کی قیمت دریافت کی۔

"پانچ سو روپے۔" دوکاندار نے آہستہ سے نرم لہجے میں کہا۔

اُس نے حیرت اور تعجب کے مارے سیٹی بجائی اور انگوٹھی کو اپنی جگہ رکھ دیا۔ کچھ دیر کے انتخاب کے بعد اُس نے ایک اور انگوٹھی کی قیمت پوچھی۔

"دو سو بیس جناب" دکاندار نے اور بھی آہستگی سے کہا

دی مغل حج

(۱) بمبئی سے بحری جہازوں کی روانگی: ہم نہایت مسرت کے ساتھ ۱۹۶۵ء کے حج کیلئے جہازوں کی روانگی کے عارضی پروگرام کا حسب ذیل اعلان کرتے ہیں۔ قانون کے مطابق قطعی تاریخوں کا اعلان ہر جہاز کی روانگی سے پندرہ روز پہلے کیا جائے گا۔

رمضان سے قبل جہازوں کی روانگی

اسلامی کی روانگی ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو بمبئی سے متوقع ہے۔

رمضان کے بعد جانے والے جہازوں کی روانگی کی متوقع تاریخیں

نام جہاز	روانگی کی متوقع تاریخ	نام جہاز	روانگی کی متوقع تاریخ
مظفری	۶ر فروری ۱۹۶۵ء	اسلامی	۵ر مارچ ۱۹۶۵ء
مسعودی	۸ر فروری "	مظفری	۱۰ر مارچ "
محمدی	۱۱ر فروری "	محمدی	۱۶ر مارچ "
اسلامی	۱۴ر فروری "	اسلامی	۲۴ر مارچ "
مظفری	۲۲ر فروری "	مظفری	۲۷ر مارچ "
محمدی	۲۸ر فروری "		

(۲) کرایہ: بمبئی سے جدہ اور جدہ سے بمبئی کو واپسی کے اخراجات مندرجہ ذیل ہوں گے۔ ہر حالت میں واپسی ٹکٹ ہی جاری کئے جائیں گے

بمبئی / جدہ / بمبئی

فرسٹ کلاس	کرایہ	خوراک	جدہ کے محصول	کرایہ مکان	جدہ کے سفری اخراجات	کل میزان
بالغوں کے لئے	۱۱۵۷/۱۰	۱۲۸/۵۰	۶۶/۷۵	۱۲/۳۷	۴/-	۱۴۱۹/۷۲
بچے ۳ تا ۵ سال	۵۷۸/۵۵	۸۹/۲۵	-	-	-	۶۶۷/۸۰
بچے ۱ تا ۳ سال	۵۷۸/۵۵	-	-	-	-	۵۷۸/۵۵
ڈیک کلاس						
بالغوں کے لئے	۴۲۴/۲۰	۵۵/۶۵	۶۶/۷۵	۱۳/۳۷	۴/-	۵۶۳/۹۷
بچے ۳ تا ۵ سال	۲۱۲/۱۰	۲۷/۸۲	-	-	-	۲۳۹/۹۲
بچے ۱ تا ۳ سال	۲۱۲/۱۰	-	-	-	-	۲۱۲/۱۰

محمدی اور مظفری میں دس اور مسعودی میں دو برتھ والے آٹھ کیبن ہیں جن کے ساتھ غسل خانے بھی ملحق ہیں۔ اُن کا کرایہ فرسٹ کلاس کے علاوہ فی برتھ مزید بیس روپے یکطرفہ دینا ہوگا۔ کسی جہاز میں ایک برتھ کی کیبن نہیں ہے۔

(۳) پابندیاں: حاجیوں کی عام
کردی گئی ہیں۔ جن کی رُو سے انہیں حج کو جانے
پر غور کرلیں ۔۔۔ (الف) ۵ اور ۱۴ سا
(ب) ایسے لوگ جنکے پاس
(ج) ایسے حضرات کو جو گزشتہ
اجازت نہ دیجائے
(د) ایسی خواتین جو د
(ہ) وہ اشخاص جو مند
(۱) دماغی امراض۔ (۲) دق یا سل (۳)

(۴) ریزرویشن کے قوا

ہیں۔ (سوائے پردہ نشین خواتین) اشد
کردیں اور فوٹو کی مزید چار کاپیاں اور بھیج
ہر عازم حج کو الگ فارم پر د
ایک سال کے بچے کا سفر خرچ نہ پڑے
یا سرپرست کے دستخطوں سے بھیجی
پیدائش کا سرٹیفکیٹ منسلک کیا
کہ درخواست دہندہ نے گذشتہ
بھی ہونا ضروری ہے کہ درخواست
ذیل تفصیلات ہونا ضروری ہے۔
(۱) پورا نام (۲) باپ یا شو
ہندوستانی یا غیر ہندوستانی۔ (۷) پیشہ
میں اپنے وارث کا نام اور اس بات کی صرا

...ن لمیٹڈ

۱۹...ء

...مندرجۂ ذیل زمرہ کے اشخاص پر پابندیاں عائد
...۔ عازمینِ حج درخواست بھیجنے سے پہلے ان پابندیاں

...۸۰ روپے سے کم ہو۔ حج کو جانے کی اجازت نہ پا سکیں گے۔
...اسے دوران فریضۂ حج ادا کر چکے ہیں حج بدل کی بھی

...ت چار یا اُس سے زیادہ مدت کی حاملہ ہوں؛
...ہوں میں مبتلا ہوں۔
...(۵) متعدی کوڑھ (۶) دیگر شدید متعدی امراض

...دہندوں کے لئے جن میں خواتین بھی شامل
...رخواست کے فارم پر پاسپورٹ سائز کا فوٹو چسپاں
...کم عمر کے بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔
...جس کی دو کاپیاں ہونی ضروری ہیں۔ اگرچہ
...رخواست بھی علٰحدہ فارموں پر اُس کے باپ
...صحیح عمر درج ہو جس کی تصدیق کے لئے باقاعدہ
...کے ساتھ ایک حلف نامہ اس امر کا ہونا چاہئے
...یں کیا اور مستند ڈاکٹر کا ڈاکٹری سرٹیفکیٹ
...قابل ہے یا نہیں۔ درخواست میں مندرجہ

...(۴) عمر (۵) تاریخِ پیدائش (۶) قومیت
...م ڈاکخانہ، ضلع اور ریاست (۹) ہندوستان
...شتہ ہے۔ (۱۰) جہاز کا نام جس میں جگہ درکار ہے

اگر اس جہاز میں جگہ نہ ہو تو دوسرے جہاز کا نام مع تاریخِ روانگی۔ (۱۱) درجہ جس میں جگہ مطلوب ہے۔
(۱۲) پچھلا حج کس سال ادا کیا تھا۔ (۱۳) ترسیلِ زر کی تفصیلات یعنی ڈرافٹ کا نمبر، بنک کا نام اور ڈرافٹ کی رقم (۱۴) دستخط درخواست دہندہ (۱۵) درخواست کی تاریخ

بحری جہاز میں جگہ کا ریزرویشن کرانے کیلئے طریقہ حسب ذیل ہوگا

(الف) ڈیک کلاس: (۱) مقررہ فارم پر درخواست کی دو کاپیاں ٹھیک ٹھیک خانہ پُری کر کے اور اُس کے ساتھ ۱۴ سال سے زیادہ عمر کے ہر بالغ کا پُورا کرایہ ۹۶۳/۹۴ روپے بھیجا جائے ۳ سے ۵ سال تک کی عمر کے بچے کی درخواست کے ساتھ ۲۳۹/۹۲ اور ایک سال سے ۳ سال کی عمر کے بچوں کی درخواست کے ساتھ ۲۱۲/۱۰ پیشگی بھیجے جائیں۔

(۲) تمام رقومات بنک ڈرافٹ ہی کے ذریعے بھیجی جائیں۔ ڈرافٹ مغل لائن کے نام ہونا چاہئے جو بمبئی میں وصول کیا جاسکے اور بذریعہ رجسٹری بھیجا جانا چاہئے۔ صرف وہ حضرات جو ایسی جگہوں پر رہتے ہیں جہاں بنک نہیں ہیں بیمہ کے ذریعہ روپیہ بھیج سکتے ہیں۔ منی آرڈر یا چیک کسی حالت میں قبول نہیں کئے جائیں گے۔

(۳) جس لفافے میں بنک ڈرافٹ یا نقد روپیہ بھیجا جائے اُس کے بائیں کونے پر اس ریاست کا نام جس سے کہ درخواست دہندہ کا تعلق ہے ضرور لکھنا چاہئے اور یہ بھی صراحت ہونی چاہئے کہ روانگی رمضان سے قبل مطلوب ہے یا رمضان کے بعد جن لفافوں پر ان امور کی صراحت نہ ہوگی وہ واپس کر دئے جائیں گے۔

(۴) کسی لفافے میں سات سے زیادہ درخواستیں نہ بھیجی جائیں اور یہ ساتوں درخواستیں ایک ہی صوبے کے لوگوں کی ہوں ورنہ درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی۔

(۵) جو درخواستیں مقررہ شرائط کو پُورا نہ کریں گی وہ مسترد کر دی جائیں گی۔

(۶) سیٹوں کے رجسٹریشن کا کام گورنمنٹ کے مقرر کردہ ضابطے کے مطابق ہوگا اور دس نومبر ۱۹۶۴ء کے بعد شروع ہوگا جو کہ درخواستوں کی وصولیابی کی آخری تاریخ ہے۔

(۷) رجسٹریشن ہو جانے پر ایک رسید "بی" فارم پر جاری کی جائے گی جس میں جہاز کا نام اور رجسٹریشن کا سلسلہ نمبر ہوگا۔ درخواست دہندگان کو بعد کی تمام خط و کتابت میں یہ سلسلہ نمبر لکھنا ہوگا۔

(۸) ڈیک کلاس کے عازمین حج کو اپنی رسید (بی فارم) حفاظت سے رکھنا چاہئے کیونکہ اُن کو ٹکٹ اسی وقت دیا جائے گا جب کہ وہ اس فارم کو بمبئی میں ٹکٹ گھر کے عملے کے حوالے کر دیں۔ یہی فارم اُن کی شناخت کا ذریعہ ہوگا۔

(ب) فرسٹ کلاس: اس کلاس کے ریزرویشن کے قواعد بھی وہی ہوں گے جو ڈیک کلاس کے

(سلسلہ جاری)

ریزرویشن کے لئے ہیں نیز یہ کہ مقررہ فارم پر درخواست کو دو کاپیوں کے ساتھ ۱۴ سال سے زیادہ عمر کے ہر بالغ کو پورا کرایہ ۱۴۱۹/۶۲ اور ۳ سے ۵ سال تک کے بچے کا پورا کرایہ ۶۶۷/۰۰ اور ایک سے ۳ سال تک کے بچے کا کرایہ ۵۵/۵۷۵ اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ اور حلف نامہ بھیجا جائے۔

فرسٹ کلاس کے ان عازمین حج کو جو اپنے ساتھ ملازم لیجانا چاہتے ہیں۔ ملازمین کے ڈیک کلاس کیلئے پیراگراف ۵/۷ کے مطابق درخواست بھیجنی چاہئے تاکہ گنجائش کے مطابق ملازمین کی جگہ کا ریزرویشن کردیا جائے۔ ڈیک کلاس کی بکنگ کی میعاد ختم ہونے کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

(۶) **ویٹنگ لسٹ**: ڈیک کلاس ہو یا فرسٹ کلاس کسی کے لئے بھی ویٹنگ لسٹ کا اعلان نہیں کیا جائے گا۔ تمام وہ درخواستیں جن کے قطعی ریزرویشن کے لئے غور نہیں کیا جا سکا اُن کی کچھ فیصدی تعداد ہر ایک کلاس کی ویٹنگ لسٹ پر رکھی جائے گی۔ ویٹنگ لسٹ پر آنے والے عازمین حج کو کینسل ہونے والی سیٹوں کے عوض سیٹیں الاٹ کی جائیں گی اور یہ الاٹمنٹ ایک ترتیبی ضابطے کے تحت ہوگا۔ الاٹمنٹ ہونے پر عازمین حج کو فوراً اطلاع کی جائے گی۔ جن درخواستوں کو ویٹنگ لسٹ پر نہیں رکھا جائے گا انہیں درخواست گزار کو واپس کردیا جائے گا۔

(۷) **بکنگ کی ابتداء**: پہلے سے تمام اطلاع کے لئے مشتہر کیا جائے گا۔ جس تاریخ کو مقرر کیا جائے گا اس سے پہلے کوئی درخواست وصول نہیں کی جائیں گی اور یہ کہ تمام درخواستیں بذریعہ رجسٹری یا بیمہ کے لفافوں میں مندرجہ بالا طریق کے مطابق بھیجوانا ضروری ہیں تاکہ وہ کمپنی کے پاس ۱۰ نومبر ۱۹۶۴ء کے دن یا اس سے قبل موصول ہوں جو درخواستیں اسکے بعد موصول ہونگی انہیں واپس کردیا جائے گا۔

(۸) **منسوخی**: اگر کوئی شخص اپنی نشست منسوخ کرانا چاہتا ہو تو اسے اس امر کی اطلاع کہ اس کیلئے جو نشست بک کی گئی ہے خواہ وہ فرسٹ کلاس ہو یا ڈیک کلاس، منسوخ کردی جائے، کم از کم ۳۱ دسمبر ۱۹۶۴ء تک پہنچ جانی چاہئے۔ ایسا نہ کرنے پر رقم واپس کراتے وقت کرایہ کی رقم میں سے دس فیصد کٹوتی کی جائے گی۔ جن اشخاص کے نام ویٹنگ لسٹ پر ہوں گے اور ما بعد نشست منسوخ کے عوض الاٹ کی جائے گی۔ اگر وہ کمپنی کو نشست منسوخ کرانے کے بارے میں اپنے ارادے کی اطلاع اس جہاز میں جس کے لئے نشست بک کی گئی ہو کی تاریخ روانگی سے دس دن قبل نہیں دیں گے تو انکے کرایہ کی رقم بھی ری فنڈ کرتے وقت دس فیصد کاٹ لی جائے گی۔

(۹) **ناموں کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی ریزرویشن میں تبدیلی کی اجازت ہوگی۔**

(۱۰) **غیر ملکی اصحاب**: تمام ایسے اشخاص جو ہندوستانی قومیت نہ رکھتے ہوں اور بمبئی تا جدہ حاجیوں کے جہاز میں نشستیں چاہتے ہوں اُن کے لئے لازم ہے کہ ہندوستان میں متعین اپنے ملک کے ڈپلومیٹک نمائندوں کے ذریعے درخواست ارسال کریں۔ نیز اُن کے پاس انٹرنیشنل پاسپورٹ ہونا ضروری ہیں جو سعودی عربیہ حکومت کی طرف سے باقاعدہ تصدیق شدہ ہوں۔ ان کے پاس ویزا بھی ہونا ضروری ہے اس کے علاوہ ان کے پاس کارآمد واپسی ویزا ہونا چاہئے تاکہ فریضۂ حج سرانجام دینے کے بعد وہ واپسی سفر پر بمبئی کے لئے جدہ سے جہاز پر سوار ہوسکیں۔ ایسے عازمین کو صرف ڈیک کلاس میں جگہ پیش کی جاسکتی ہے بشرطیکہ کسی بھی جہاز میں کوئی جگہ خالی نہ ہو۔

(۱۱) **عازمین حج کی خدمت میں** التماس ہے کہ وہ نوٹ فرمالیں کہ جدہ سے بمبئی لوٹنے کے لئے نشستوں کا انتظام جدہ میں انڈین ایجنسی کے تحت ہے جو جدہ میں اُن کی آمد کے حساب کی ترتیب سے دیا جاتا ہے۔

(۱۲) حج کے سلسلے میں مزید تفصیلات معلوم کرنے کے لئے براہ کرم ایگزیکٹو آفیسر پورٹ حج کمیٹی کرناک روڈ بمبئی کے پتے پر خط و کتابت کریں۔

(۱۳) ریزرویشن کا طریق کار معلوم کرنے کے لئے مندرجۂ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

دی مغل لائن لمیٹڈ ۱۶، بنک اسٹریٹ، فورٹ، بمبئی ۱

نور سپرکاش

کہانی کی کہانی

میرے کمرے پر تین قسم کے لوگ آتے ہیں۔ ایک قسم ہے میرے ان ملنے والوں کی جن کے ساتھ میں نے یوں ہی رشتے سے باندھ رکھے ہیں دوسری قسم ان کی ہے جو ازراہِ ہمدردی مجھ سے ملنا پسند کرتے ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کے جب آنے کے امکانات ہوتے ہیں تو واضح طور سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ آرہے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ جب آتے ہیں تو آتے ہی، دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ جس سے اجنبیت کا احساس بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی کہ کم از کم اصولوں کے پابند تو رہتے ہیں۔

رہی تیسری قسم تو یہ سب میرے خدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں انہیں کے ماتحت کام کرتا ہوں کوئی وقت ہو، دن ہو یا رات، سردی ہو یا گرمی، بارش ہو یا دھوپ۔ دھڑام سے دروازہ کھولتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار جی چاہتا ہے کہ ان کی عینکیں پھوڑ دوں۔ اور کانچوں کی کرچیں ان کی آنکھوں میں ڈال دوں یا پھر ان کے بال، نوچ نوچ کر سمجھاتا رہوں کہ اخلاق کیا ہے؟ اصول کیا ہوتے ہیں؟ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹانا کیوں ضروری ہے۔؟ مگر میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ چونکہ میں انہیں کے ماتحت کام کرتا ہوں۔ اور انہیں کے دئے ہوئے روپوں پر زندگی گزارتا ہوں۔

اور جو روپیہ دے کر کام لیتا ہو وہ خدا کے برابر ہوتا ہے خدا کے اوپر نہیں تو خدا سے کم بھی نہیں ہوتا۔ ان میں اکثر اخبار کے اڈیٹر اور فلموں کے ڈائرکٹر ہوتے ہیں۔ جب میں انہیں دیکھتا ہوں تو میری روح فنا ہو جاتی ہے اگر میں کسی نئے کردار میں الجھا ہوا ہوں یا نئی کہانی کو سانچے میں ڈھال رہا ہوں تو کردار غائب ہو جاتے ہیں اور کہانی ایسے بھاگ جاتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ!

کل اتوار تھا اور مہراجی منہ میں سگار دابے کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے لکھنے کی میز پر تیس ۳۰ روپے پٹکے اور کہا۔ "اگلی اتوار کی صبح ہی میں نئی کہانی لینے آجاؤں گا۔"

میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف ان کا منہ دیکھتا رہا۔

تیس ۳۰ روپے میں کیا ہوتا ہے؟ تیس روپوں میں ایک کہانی نہیں بنتی۔ ایک کہانی کے لئے کئی راتوں کی نیند قربان کرنی پڑتی ہے۔ خون جلانا پڑتا ہے۔ نہ سکھ ملتا ہے اور نہ شانتی۔ بیوی کے شکایت بھرے خطوط جن میں بنئے کے تقاضے، کمرے کا کرایہ! بچے کا علاج اور پھر میرا خرچ، کھانا، کپڑا، کرایہ، چائے سگریٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ اس سے تو کچھ نہیں ہوتا یہ تو مرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہیں — مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔

"مہراجی ٹھیک ہے۔ اگلی اتوار کی صبح تا نئی کہانی کی تخلیق آپ ہی کے حوالے کروں گا۔"

"آپ اس طرح میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"بس یوں ہی۔ کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا تیس ۳۰ روپے کم ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔ یہ تو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔"

مہراجی میرے طنز کو سمجھ نہ سکے اور ہنستے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جوتوں کی آواز میرے کانوں میں اب بھی گونج رہی ہے یوں لگتا ہے جیسے اسی ٹیبل پر بیٹھے بیٹھے سات دن گزر گئے ہوں۔ اور مہراجی کے جوتوں کی آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی ہے اور وہ کمرے میں داخل ہو رہے ہیں۔ تیس ۳۰ روپے میں بچے کی دوائی کے لئے خرچ کر چکا ہوں مگر آج پیر ہے ابھی پانچ دن اور رہیں اور ان پانچ دنوں میں مجھے نئی کہانی لکھنی ہے۔

آج کل میں بورڈنگ میں رہتا ہوں۔ میرے کمرے میں تین لوگ اور ہیں۔ ایک بنگالی، ایک مدراسی اور ایک گجراتی۔ تینوں صبح ہی اٹھ کر کام پر چلے جاتے ہیں۔ شام کو جب لوٹتے ہیں تو مجھے دیکھ کر کھوکھلی ہنسی ہنستے ہیں اور کہتے ہیں۔ "اچھے ہو نا؟"

میں بالکل اچھا نہیں ہوتا مگر مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے۔ "ہاں اچھا ہوں۔"

جیسے وہ مجبوری کی کھوکھلی ہنسی ہنستے ہیں اسی طرح مجھے بھی کھوکھلا جواب دینا پڑتا ہے۔

"کوئی نیا 'فسانہ' لکھا؟"

میں نے کہا۔ "کوئی نیا فسانہ نہیں لکھا۔ ابھی تو سوچ رہا ہوں۔"

سوچ رہا ہوں۔ مہراجی کو جو کہانی دینی ہے اس میں اس مدراسی کے کیریکٹر کو پیش کروں۔ کم بخت کو کوئی زبان نہیں آتی۔ صرف تامل بولتا ہے۔ کبھی کبھار بار باری اُردو بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کیا ہی اچھا سائی سب بھاشائیں ختم ہو جائیں اور صرف تامل کا زور ہو تو مجھے سب سے بڑی نوکری ملے گی۔ خوب دھن ملیگا پھر میں بورڈنگ چھوڑ کر فلیٹ میں آرام سے رہوں گا بنگالی کا کہنا ہے بنگالی ہی اچھی زبان ہے اور اسے اتحاد ملنا چاہیئے۔ گجراتی دن رات سُوں چھے، آں چھے اور پیسے کی رٹ لگائے رہتا ہے۔ جب کبھی زیادہ ہی خوش ہو جاتا ہے تو کہتا ہے "امارو گجرات ماں...."۔

بنگال کی بنگالی ہے اور گجرات کی گجراتی، اور مدراس کی تامل۔ مگر اس اُردو زبان کو کسی خاص زمین کی ضرورت نہیں۔ جس زمین میں بھی اس کا بیج بو دو یہ اُگے گی۔ پھولے پھلے گی اور سرسبز و شاداب ہو کر لہلہائے گی۔..... مگر کہانی اس سے آگے نہیں بڑھتی ان لوگوں کی تکرار میں پر رُک جاتی ہے اور صرف ایک تکرار سے کہانی نہیں بنتی۔ یہ تو دماغ کے کسی کونے میں جنم لیتی ہے۔ پھر پروان چڑھتی ہے اور دل میں آگ سی لگا دیتی ہے اور جب تک فنکار اسے لکھتا نہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اور جب مکمل ہو جاتی ہے تو پڑھنے والے کی رُوح پر چھا جاتی ہے اور کہانی کار کے لیے ایک نیا استحان اُس کے دل میں پیدا کرتی ہے۔

یہ مدراسی اور یہ گجراتی اور یہ بنگالی مجھے نئی کہانی نہیں دے سکتے۔ اسی لئے میں نے اب اُن کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔

سامنے کی بلڈنگ میں تیسری منزل پر جب کھڑکی کے پٹ کھل جاتے ہیں تو نجانے کیوں میرے دل میں تھوڑی سی جگہ ہو جاتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ لڑکی میرے دل میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔

ٹھیک ہے اُسکی کہانی ٹھیک رہے گی۔ جس کی آنکھوں میں سمندر کی گہرائیاں ہیں اور جس کے بال کمر تک لٹک رہے ہیں اور جس کے ہونٹوں پر لبِ ساتبسم ہے۔ وہ مجھ سے عشق کرنے لگتی ہے۔ مگر دولت یا پھر سماج دیوار بن کر ہم دونوں کے بیچ میں حائل ہو جاتا ہے — پھر ہیرو کی موت.... نہیں نہیں۔ ہیروئن کی موت۔ یا پھر دونوں کی موت یہ کہانی خوب جچے گی...... اور مہراجی بھی خوش ہو کر کہیں گے۔

"واہ بھئی رائٹر ڈائلاگ کتنا اچھا لکھا ہے!"

مگر اس لڑکی نے مجھے دیکھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دئیے ہیں۔ اُسے مجھ سے پیار نہیں۔ نفرت ہے۔ میں نفرت کو پیار میں کیسے بدل سکتا ہوں۔ کہانی آگے کیسے بڑھ سکتی ہے۔ جبکہ اُس نے مجھے دیکھ کر کھڑکی بند کر دی ہے۔ اور میرے دل کا ایک کونہ جو اس کے لئے تھوڑی دیر کے لئے کھلا تھا، بند ہو گیا ہے، اور کہانی ابھی تک ادھوری ہے۔

ہمارا سیٹھ جی سڑی گلی ترکاریاں کھلاتا ہے۔ اوپر سے احسان جتاتا ہے۔ نوکروں کو صرف بیس روپے تنخواہ دے کر پچاس روپے کے فارم پر دستخط لیتا ہے۔ اُس کا کیس بھرا جاتا ہے اور وہ حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ پھر اُسے سزا ہوتی ہے اور نوکروں کو برابر تنخواہ ملنی شروع ہوتی ہے۔ سڑی گلی ترکاریاں بند کر دی جاتی ہیں — یہی پلاٹ ٹھیک رہے گا۔ مگر پولیس یہاں کبھی نہیں آتی۔ چونکہ ان لوگوں کے لئے بھتہ مقرر ہے۔ جب پولیس بورڈنگ میں نہیں آتی تو سیٹھ کو کیسے حوالات میں بند کیا جاسکے گا۔؟ کیسے اُسے سزا ہوگی؟ نہیں وہ نہ ہی حوالات کے اندر جا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے سزا ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہاں یہاں پولیس نہیں آسکتی لو۔ پولیس اس لئے نہیں آتی کہ اُسے بھتہ ملتا ہے۔ اسی لئے کہانی آگے نہیں بڑھتی۔ وہ سڑی گلی ترکاریاں کھلاتا رہے گا اور نوکروں کو بیس روپے دے کر پچاس روپے کے فارم پر دستخط لیتا رہے گا۔ یہ باتیں کہانی میں لکھنے قابل تھوڑی ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔ دیکھو اس کمبخت رائٹر کو، کچھ موافق اور مناسب پہلو ملا ہی نہیں۔ اسی لئے سڑی گلی ترکاریوں کا ذکر کر رہا ہے۔ جیسی سیٹھ جی کی سڑی گلی ترکاریاں ہیں ویسی ہی سڑی گلی کہانی ہے اور جو بدبو ان ترکاریوں سے آتی ہے، وہی بدبو کہانی سے بھی آ رہی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق نہ لکھنا ہی بہتر ہے۔ رہا روپوں کا سوال، وہ تو مہراجی بھی چیف ایڈیٹر سے کہانی کے لئے چالیس روپے لے آتے ہیں۔ مگر مجھے صرف تیس ہی دیتے ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ مگر ایسی حقیقتوں کو کون بیان کرے گا۔ لوگ کہانی چاہتے ہیں حقیقت نہیں۔ چنانچہ میں نے اس خیال کو بھی ترک کر دیا ہے۔

ٹھیک ہے میرے سر کے اوپر بجلی کا پنکھا چل رہا ہے۔ ہر رات کو سونے سے پہلے میں مدراسی سے اس کی رفتار کم کرنے کے لئے کہتا ہوں لیکن جب میں سو جاتا ہوں تو مدراسی اُٹھ کر پنکھا تیز کر دیتا ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ پنکھا گھومتے گھومتے نیچے آجائے گا اور کسی آدمی کا سر پھوڑ دے گا۔ پھر اخبارات میں خبریں چھپیں گی۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا سب لوگ سوئے رہتے ہیں اور پنکھا اوپر چلتا رہتا ہے جیسے خداوند آسمان کی بلندیوں پر ہے اور نیچے رہنے والے زمین کے لوگ اپنا کام برابر کرتے رہتے ہیں پنکھا اگر گر بھی جائے تو اس کے نیچے ایک چھوٹا سا ٹیبل ہے۔ اس ٹیبل پر دھڑام سے گرے گا۔ اور خاموش ہو جائے گا۔ مگر اس خاموشی سے کہانی تھوڑے ہی بن سکتی ہے۔ اس کے لئے تو شور چاہیئے چاہیئے۔ آدمی کے نام کا شور — دبدبہ! کولھو کے بیل تو جُتت جاتے ہیں۔ مگر آواز بہت سے آتی

ہے۔ لگتا ہے جیسے بیلوں کی صدائیں رہٹ میں بند کی گئی ہیں۔ مگر اس آواز میں کوئی نہیں سن سکتا۔ اس لئے کہ لکڑی کی آواز ہوتی ہے۔ پھر پنچھی کی آواز کو کون سن سکتا ہے؟ اس لئے کہانی آگے نہیں بڑھ سکتی ...... میرے نزدیک لحاف میں منہ دے کر پڑے رہنے کا نام نیند ہے۔ چونکہ مجھے بالکل نیند نہیں آتی۔ میرے ہی افسانوں کے کردار یا پھر نئے پلاٹ دماغ میں گردش کرتے رہتے ہیں اور مجھے سونے نہیں دیتے۔ سکون نہیں ملتا۔ اس لئے میں کچھ بھی لکھ نہیں پاتا۔ مگر ان چیزوں سے مہراجی کو کیا لینا دینا ہے۔ وہ تو روپیہ دے چکے ہیں۔ اور انہیں کہانی کی ضرورت ہے ——— لوگ کہتے ہیں اس کے لئے تو سرسبز گھاٹیاں چاہئیں پاس میں بہتی ہوئی ندی ہو۔ آسمان کھلا ہوا ہو چاروں طرف پھول ہی پھول ہوں۔ پھر ایک الھڑ حسینہ اس پار اتر کر بانسری والے کے ہاتھوں سے بانسری چھین لے اور کہے۔

"تم یہ بانسری بجانا بند کر دو۔ دیکھو اس سے میری روح نکل جاتی ہے۔ نجانے تمہاری لے میں کتنا درد ہے ۔!"

پھر یہی درد کی لے پیار کی لے بن جاتی ہے اور وہ ایک روز گاؤں والوں کے ڈر سے اس ندی میں کود کر ایک ساتھ اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ مگر یہ سب تصوراتی کہانیاں ہیں۔ ان میں حقیقت کا کوئی پرتو نہیں۔ میں اپنی کہانی کو حقیقت کے بہت قریب دیکھنا چاہتا ہوں اس طرح کہ کہانی پر حقیقت ہی کا گمان ہو۔ ورنہ کہانی صرف پریوں کے دیس کی کہانی ہو سکتی ہے یا کسی اور ملک کی ہو سکتی ہے اپنے ملک کی نہیں۔ ہندوستان کی نہیں۔ ایسی کہانیاں لوگ کہتے ہیں۔ پہلے یہاں پر بھی تھیں۔ مگر اب کہیں نظر نہیں آتیں۔ آج سنیچر ہے۔ کہانی ابھی تک ادھوری ہے یا ہو سکتا ہے کہ میرے دماغ کے کسی کونے میں جنم لے رہی ہو لیکن میں ابھی تک کاغذ پر نہیں اتار سکا۔ اس کہانی کی قدر ہی کیا جو دماغ ہی میں پلے، بڑھے اور سامنے نہ آئے مگر نجانے ایسی کتنی کہانیاں جنم لینے سے پہلے ہی مر چکی ہیں۔ میرا دماغ اب کہانیوں کا مزار بن چکا ہے جیسے کوئی مردہ قبر کے باہر نہیں آ سکتا۔ اسی طرح دماغ میں مری ہوئی یہ کہانیاں باہر نہیں آ سکتیں میں نے ان پر پلاستر بھی چڑھا دیا ہے تاکہ وہ کبھی باہر آنا بھی چاہیں تو نہ آ سکیں۔ اس لئے کہ ان میں زیادہ تر حقیقتیں ہیں اور لوگوں کو حقیقتیں پسند نہیں آتیں اور مجھے صرف کہانی لکھنی ہے حقیقت نہیں ——!

اتوار کی صبح ہے۔ میں ابھی ابھی جاگا ہوں سامنے کی بلڈنگ میں تیسری منزل پر جو لڑکی رہا کرتی ہے اور جو کبھی کبھار کھڑکی کے پٹ کھول کر مجھے دیکھنے لگتی ہے اور جو میرے دل کے کھلے ہوئے دریچے سے میرے دل میں آنا چاہتی ہے۔ جس سے میں تصورات میں عشق بھی کر چکا ہوں، بڑی طرح پٹتی جا رہی ہے۔ اس نے کل رات دھندا کرنے سے انکار کر دیا تھا ...... باپ کے انتقال کے بعد بچپن ہی میں اس کی ماں بھی مر گئی تھی۔ اس لوگ نے اسے پالا پوسا اور جوان کیا تھا۔ تاکہ اصل کا اصل اور سود کا سود ملے۔ مگر کل رات اس نے صاف صاف دھندا کرنے سے انکار کر دیا۔

مہراجی کے جوتوں کی آواز میرے کانوں تک آ رہی ہے اور میرے عشق کے حوصلے پست ہو رہے ہیں۔ مگر اس لڑکی کی بلند ہمتی دیکھ کر مجھ میں بھی قوت آ گئی ہے۔ میں بھی آج مہراجی سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ کہانی کی کہانی نہیں لکھی جاتی۔ یہ میرے بس کا روگ نہیں ہے!

رؤف اذہر

ایک نظم اور ایک افسانے پر بحث

انجمن نوجوان مصنفین کی رُوداد

انجمن نوجوان مصنفین کی گذشتہ پندرہ روزہ ادبی و تنقیدی مجلس میں، جو ۲۰ ستمبر ۶۴ء کو مہندر ناتھ کی صدارت میں صابو صدیقی پالی ٹکنک میں منعقد ہوئی تھی، سب سے پہلے بھیم سین نے ایک چاق و چوبند اور فرض شناس فوجی سپاہی کی کہانی سنائی جو ایک حادثے کے تحت اپنے جہاز کے راستے سے اُڑن طشتری کے ذریعے، امن خلوص اور محبت کی بے حد ترقی یافتہ دنیا مریخ میں پہنچ جاتا ہے اور وہاں سے دو روز بعد ایک مریخی دوشیزہ کے ساتھ، محبت، امن اور صلح کی نیک خواہشات اور دعاؤں کے بھاری جہیز اور تحائف سمیت اپنی دنیا میں لوٹ آتا ہے جہاں اُنہیں شبہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ڈیوٹی پر بحال نہ کرتے ہوئے اس جوان اور اس کی بیوی کو نفسیاتی معائنے کے لئے ایک ہسپتال میں قید کر دیا جاتا ہے۔

مہندر ناتھ نے کہانی پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ کہانی کا انداز Science fiction کا ہے۔ مجھے دلکش اندازِ بیان پسند آیا۔ البتہ انجام جاسوسی معلوم ہوا۔ یہ بات کہ ہم مریخ میں جائیں اور محض عشق کر کے چلے آئیں، سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا ہم دنیا میں رہ کر اس مسئلے پر بات نہیں کر سکتے۔

بھیم سین: کہانی میں مریخ کی آب و ہوا یہ کہتی ہے کہ ہم لوگ ترقی کے ساتھ تسخیرِ خلا کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے چھوٹے بڑے مسائل کے ساتھ ہی یہ مسئلہ بھی ہے کہ چاند پر کس کا قبضہ ہوگا۔ کہانی کے سپاہی کو اس دنیا میں جنگ سے فرصت نہیں ملی۔ ہمارے ہاں نسلی امتیازات اور جھگڑے ہیں لیکن وہاں لوگ جس طرح اسے سمو لیتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں۔ ہمیں ویسا ہی بننا پڑے گا ورنہ زندگی میں خلیج حائل ہو جائے گی۔

مہندر ناتھ: مریخیوں کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں۔ مریخی لڑکی اس انداز سے پیش آئی کہ ہم مرعوب ہو گئے۔ ہمارے ہاں فسادات کے ساتھ ہندو مسلم دوستی بھی ہے۔ جب ہم حقیقت پسندانہ تفہیم لیتے ہیں تو اسے اس دنیا ہی میں deal کیوں نہیں کرتے۔ Fantasy کا انداز کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ جنگ اور فسادات پر بے شمار ناول اور کہانیاں لکھی گئی ہیں اور وہ ہمیں پسند بھی آئی ہیں اس لئے کہ اُن کے کرداروں کا خمیر کہیں اور سے نہیں زمین اور یہیں کی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ اس طرح کی لڑکیاں جو مرمٹیں، عشق کریں اور شادی بھی کر لیں — ہندوستان میں بھی مل جاتی ہیں اس بناء پر نہیں کہہ سکتے کہ مریخی ہم سے اچھے ہیں۔ دنیا میں ہر جگہ اچھے لوگ بھی ملیں گے اور بُرے بھی۔

بھیم سین: ہم نے مریخیوں کو دیکھا تو نہیں لیکن ہمارے ہاں اُن کے بارے میں گھٹیا لٹریچر موجود ہے۔ جنگ باز دنیا کی گندگیوں میں پھنسے ہوئے لوگ مریخ کے باشندوں کو بھی اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے اُنہیں اچھا سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مہندر ناتھ: ہم کسی بات کا فیصلہ محض تصورات اور کتابوں کی بنیاد پر نہیں کر سکتے۔ کہانی کے شاعرانہ اور تصوراتی اندازِ بیان کی وجہ سے بنیادی چیز دب کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک عام چیزوں سے انسان کا تعلق ہے خود ہندوستان میں اور دنیا کے ہر خطے میں اچھے اور بُرے لوگ دوش بدوش ملیں گے دراصل بحث کا موضوع یہ ہے ہی نہیں۔ آپ کا مریخ کے لوگوں کو اچھا [illegible] کرنے سے کیا مطلب۔ محض کتابوں کا حوالہ دے کر ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔

مقبول عالم: کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اس ایٹمی دور میں ہم خاطر خواہ ترقی کے باوجود ذہنی اور اخلاقی طور پر پس ماندہ ہیں۔ Sputnik کے مصنف نے اس کے اظہار کے لئے مریخ سے تعلق پیدا کر دیا ہے۔ کہانی کے آخری حصے کی وجہ سے جس میں دفاعی معاملات میں چاق و چوبند رہنے کی وجہ سے ہماری برتری ظاہر ہوتی ہے، کہانی کی کمزوری دب جاتی ہے۔

بحث کے خاتمے پر قیصر الجعفری نے ایک غزل
پش کی جو پسند کی گئی بعد ازاں مرزا عزیز جاوید نے
نظم بعنوان "الوالغیم کے نام" سنائی جس میں شاعر
تنہائی کے ساتھ ساتھ انسان کے بنیادی درد کی
رف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج اس "عہدِ
تش و آہن" میں انسانوں کا مشترکہ احساس غم اور
ائی کا ہے۔ مشینی عہد جس میں ہم آج بُری طرح
رشے ہوئے ہیں ایک نئے معاشرے، نئے دَور اور
ئے عہد کو جنم دے رہا ہے جو دراصل غم اور اُداسیوں
عہد ہے۔

بحث کا آغاز کرتے ہوئے قیصر الجعفری
نے دریافت کیا۔ "عہدِ آتش و آہن" سے
اعر کی کیا مُراد ہے۔ جو ترقیات کی طرف ہمارے
ہن لے جاتا ہے جبکہ آگے چل کر "اُداسیوں کا
میر" کہنے سے ہمارے ذہن گمراہ ہو جاتے ہیں۔

عزیز جاوید: سائنس کا تعمیری پہلو ہمارے
سامنے ہے۔ میری مُراد اس کے تخریبی پہلو سے
ہے۔ اس دَور میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، دھوئیں
ور بارود کے ڈھیر تلے اور ہر لمحہ کائنات کی فنا اور
تہذیب کے مٹنے کا احساس شدید ہوتا جا رہا ہے۔

مہندر ناتھ: یہ شاعر کا اپنا ذاتی تاثر
ہے۔ جہاں تک اُداسیوں کا تعلق ہے، شاعر کو
بڑی چھوٹی ملنی چاہیئے تاکہ وہ سوچ سکے کہ اس کی زندگی
یں خوشیوں کا اضافہ ہوا یا نہیں۔ ذاتی تاثر پیش
کرنے کا حق رائٹر کو ملنا چاہیئے۔ پڑھنے اور سُننے
والوں کی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ مجھے نظم اچھی لگی
خوشی کے بعد غم کا آنا بڑی صحت مند چیز ہے اور کچھ دیر
پر اُداس ہونا بہت بڑی بات ہے۔ آج ہندوستان میں
جو کچھ ہو رہا ہے کیا اُسے دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ
اُداسیوں کا دور نہیں ہے!

مقبولِ عالم، البرٹ اور نوبل پرائز یافتہ
سینٹ جان زندگی بھر موت کے بارے میں لکھتے رہے
لیکن ان سے کسی نے نہیں پوچھا کہ آپ زندگی کے بارے
میں کیوں نہیں لکھتے۔ ہر ادیب جس نقطۂ نظر سے زندگی
زندگی کو دیکھتا ہے اسی انداز سے پیش کرتا ہے۔

قیصر الجعفری: اگر عزیز جاوید کی ہر تخلیق،
غم انگیز ہوتی تو ہم تسلیم کر لیتے کہ ان کا رنگ ہی یہی
ہے۔ میرا اعتراض تو یہ ہے کہ اس ایک لفظ،
"عہدِ آتش و آہن" سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہ
محدود ہے اور وہ ایک رُخ دیکھ رہا ہے۔ اُس نے
پورے عہدِ آتش و آہن کو کنڈم کر کے رکھ دیا ہے۔

عنایت اختر: جب ہم ادب میں یہ لفظ
"عہدِ آتش و آہن" استعمال کرتے ہیں تو یہ کسی
خاص نقطۂ نظر کی علامت بن جاتا ہے جس کی وضاحت
ہم اپنی تخلیق میں کرنا چاہتے ہیں۔ انسان کی ترقی و
آزادی کی طرف جانے کے بعد اس لفظ کا استعمال
ایک اچھی علامت بن جائے گا۔ لیکن آج انسانی زندگی
میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اور اُداسی ہے تو ہم اپنے
آپ کو امید افزا اور اپنی رجائیت ثابت کرنے
کیلئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ نکھرا ہوا ایٹمی دَور ہے
آج دنیا میں مشترکہ احساس غم اور تنہائی کا ہے نہ
جس کی طرف شاعر اشارہ کر رہا ہے۔ مشینوں کا
استعمال صحیح ہے یا غلط ہم نہیں کہہ سکتے۔ مشینی
خرابی کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے کہ نئے اور
مشینی عہد کی دین میں جو ہم جکڑے ہوئے ہیں اور
ہمارے ہاں جس معاشرے نے جنم لیا ہے اور جو عہد
جنم لے رہا ہے وہ اُداسیوں اور غموں کا عہد ہے
مشینی دَور کے آجانے سے ہم بے حس ہوتے جا رہے
ہیں اور ایک ساتھ رہنے کے باوجود ہم ایک دوسرے
کے لئے اجنبی بنتے جا رہے ہیں۔ فنکار کے ہاں تنہائی
کا احساس شدید ہو گیا ہے۔ وجہ آپ تلاش کیجئے
مشین بذاتِ خود اس کی ذمہ دار نہیں ہے۔ شاعر
اس عہد کے تعمیری پہلو کا منکر نہیں ہے۔ مشین
اور تنہائی کے روایتی موضوع سے ہٹ کر شاعر نے
تنہائی کے ساتھ ساتھ اس بنیادی درد کی طرف اشارہ کیا
گیا ہے۔ جس کا احساس اس صدی کا مشترکہ احساس ہے

حمید سوہنی: بحث ایک لفظ پر ہے۔ شاعر
نے یہ بات کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہم جو اپنی زندگی
میں کسی طرح کی تنہائی یا مایوسی محسوس کرتے ہیں۔ ہماری
دنیا میں سائنس کے ذریعے ترقی ضرور ہوئی ہے۔ لوگوں
نے فائدہ بھی اُٹھایا ہے لیکن سب سے زیادہ اثر ہمارے
دماغ پر جنگ کا ہوتا ہے۔ جب بھی ہم اُس سے متعلق
خبریں اور بیانات پڑھتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر
جنگ چھڑ جائے تو انسان کا کیا ہوگا۔ انسانی ذہن،
سائنس کی دین کی طرف جانے کی بجائے جنگ اور
تباہی کی طرف جاتا ہے اور اتنی ترقی کے باوجود انسان
اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ سائنسی دور میں،
انسان کو سہولتیں میسّر آنی چاہیئے تھیں لیکن وہ مٹھی
بھر لوگوں کے سوا اور کسی کو میسّر نہیں۔ نظم پڑھ کر بے بسی
اور تنہائی کے جذبے کے ساتھ ہی پڑھنے والا نفرت
بھی محسوس کرتا ہے کہ اس عہدِ آتش و آہن نے شاعر
یا انسان کو کچھ نہیں دیا۔ شاعر نے نظم میں اپنے خیالات
کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اُداسیوں کا پیمبر، نقش بہ
دیوار، قہقہہ اور رقیبِ دردِ حیات سے اشارہ تھا
ہے کہ فرد اور ذاتی زندگی کے درد کی بات نہیں ہے
بلکہ لاکھوں محنت کشوں کا درد ہے جو اس دَور میں
خوش حال نہیں ہیں۔ نظم کامیاب ہے اور اس خیال
کے تحت جو شاعر نے پیش کیا ہے 'عہدِ آتش و آہن'
سے بہتر کوئی لفظ استعمال کرنا ممکن نہیں۔

مہندر ناتھ: آج ہمارا شاعر ذہنی طور پر
زیادہ (Mature) ہو گیا ہے لیکن وہ محسوس
کرتا ہے کہ یہ بات کیا ہے کہ انسان ساری خوشیوں
سے محروم ہے۔ آج اُداسیوں اور تنہائی کا احساس
نئی پود کے لئے فالِ نیک ہے۔

خطوط

میرزا عزیز جاوید ـــــــــــــــــــــــ بمبئی

اِس شمارے کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ اس شمارے سے دوحیات کا اعتبار بنتے جاتے رہ گیا۔ اگر ضیاء انصاری صاحب کا مضمون (علامہ اقبال) اس میں شامل نہ ہوتا۔ اوم پرکاش صاحب کا مضمون "پاکستان میں دو دن" بھی آپ کے بہت کام آیا۔

لینے میں زیادہ پیار سے نیچے اور قوت سے پیچھے اکثر ہاتھ سے بے ہاتھ ہو جاتے ہیں۔ مجھ کو یہ سادات "عاشقی کے چلتوں جاتی رہی تھی۔ اندیشہ ہے "دوحیات" کی عزت آپ کی آنے والی مدتوں کے سبب "ہندی کا سلام" کہہ کر آپ کا آنگن سونا نہ کر جائے۔ اب دیکھئے نا مظفر حنفی صاحب کی غزل جو صرف جاوید واوین کی پتی اور پھونگی سے آراستہ ہے۔ حنفی صاحب کا مطلع ہے ؎

اگر ہزار "خوشامد پسند" ہوتے ہیں
تو صاف گو بھی زمانے میں چند ہوتے ہیں

اس مطلع کے لہجے اور موضوع پر گفتگو بے سود ہے۔ کہنا صرف اتنا ہے کہ (خوشامد پسند) واوین کے بغیر بھی قاری کے ذہن میں وہی مفہوم پیدا کرتا ہے جو مظفر حنفی صاحب چاہتے ہیں۔ اس کے بعد تیسرے شعر میں (مشقِ ستم) اور چوتھے (عوام) کی تراکیب کو بھی حنفی صاحب کے ہاتھوں واوین کا بار اٹھانا پڑا۔ اسی طرح چوتھے شعر میں (بعد آزادی) اور پانچویں میں (شیوۂ زبان بندی) چھٹے میں (شیر تر) اور ساتواں یعنی مقطع کے دونوں مصرع ـــ غرض الّا ایک شعر کے پوری غزل واوین کی کارچوبی سے معمور ہے۔ جائے حیرت کہئے یا مقامِ افسوس کہ مطلع کے بعد کا شعر جس میں بکمال اقتدار (اسیرِ کمند) کی ترکیب بہ نفسِ نفیس موجود تھی، واوین کی کلغی سے محروم کر دی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مطلع کے بعد کے شعر کی طرح دوسرے اشعار بھی واوین کی قید سے آزاد ہوتے تو مجھ جیسے قاری کو حنفی صاحب کی غزل سمجھنے میں تامل نہ ہوتا مگر واوین کا سبب تلاش کرنے میں اتنا وقت گنوایا کہ جو کچھ پایا وہ بھی پھنسا یا والی بات ہو گئی۔

مجھ سے قبل ابراہیم رنگلا صاحب نے بھی خبط کی حد تک واوین کے استعمال کی بدعت پر اعتراض کیا تھا جس کا جواب مظفر حنفی صاحب نے پتہ نہیں کس درجے کی سنجیدگی سے دیا۔ ابراہیم رنگلا صاحب کا جواب دیتے ہوئے حنفی صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ بدعت کے موجد حضرت استاد عارفی تھے جن سے میں مشورۂ سخن کرتا تھا" تو پھر ہم یہ سمجھ کر کہ واوین کا راز شاد صاحب سے حنفی صاحب کو سینہ بہ سینہ ملا ہے اور صرف اتباع واوین ہی سعادت تلمیذی ہے تو اپنی تمام باتیں واپس لیتے ہیں۔ حنفی صاحب اپنے جوابی خط میں ابراہیم رنگلا سے ناصر کاظمی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ـ "ابراہیم رنگلا صاحب کہیں یوسف اقبال کی طرح شاد عارفی اور ناصر کاظمی کے بارے میں نہ پوچھ بیٹھیں ـــ یہ صاحبان کون ہیں؟" تو حنفی صاحب کے لئے یہ بھی اطلاع ہے کہ ناصر کاظمی کو ادب کی تازہ شاخ برگ بار کی حیثیت سے سب جانتے ہیں ستون کی حیثیت سے نہیں اور جب ناصر کاظمی کا کوئی تیسرے درجہ کا گرویدہ ناصر کاظمی کو ستون کی حیثیت دیتے ہوئے ناصر کی مخلصانہ رائے کو ادبی حکم نامہ قرار دے گا تو اس وقت ضرور پوچھا جائے گا کہ ناصر کاظمی کون ہیں ـــ؟

ابکی بار

اس شمارے میں ہند پاک دوستی پر ایک مضمون شامل ہے۔ اس میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ ہر شخص کی توجہ کی طالب ہیں۔ اس میں جو تجویزیں رکھی گئی ہیں وہ بھی ایسی ہیں جن پر عمل کرنے سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ فضا قائم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس قبیل کے مضامین کی آجکل بڑی شدید ضرورت ہے۔ اور ہم ایسے مضامین کو دوحیات میں شکریے کے ساتھ شائع کریں گے۔

حصۂ شعر میں دو نظمیں ہیں ـــ میرزا عزیز جاوید اور ابراہیم رنگلا کی۔ عزیز جاوید کی نظم میں غزل کی سی مٹھاس اور گہرائی ہے لیکن کچھ تشنہ سی محسوس ہوتی ہے۔ غالباً یہی نظم کا حسن ہے۔ ابراہیم رنگلا کی نظم جدید تر شاعری کا لہجہ لئے ہوئے ہے۔ اگر اس میں علم کی گہرائی ہے تو عزیز جاوید کی نظم میں فکر اور جذبے کی گہرائی۔

اس شمارے میں دو کہانیاں بھی شریک ہیں جن کے متعلق اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ آپ انہیں پڑھ ڈالئے۔

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد ۳	۳۰ اکتوبر ۱۹۶۴ء	شمارہ ۲۹

اس شمارے میں

قیمت

ایک سال ———— دس روپے
فی پرچہ ———— تیس پیسے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

اِن دس دنوں میں

- ٹوکیو میں اولمپک کھیلوں کا آغاز ہوگیا۔
- مشہور فلمساز گرودت کا حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا
- پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ مسٹر رام کشن نے سردار پرتاپ سنگھ کیروں سے کہا ہے کہ وہ اسمبلی سے استعفیٰ دیدیں۔
- قاہرہ میں غیر جانبدار ملکوں کی کانفرنس ختم ہوگئی۔ کانفرنس نے نوآبادیاتی نظام اور سامراجیت کے خاتمے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔
- چین نے کہا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ سرحدی جھگڑے میں ایک انچ بھی نہیں ہٹے گا۔
- کراچی میں صدر ایوب اور وزیرِ اعظم شاستری کی ملاقات ہوئی۔ شاستری جی قاہرہ سے واپس ہو رہے تھے۔
- روس نے پہلا مسافر خلائی جہاز فضا میں چھوڑا۔ اس جہاز میں ۳ مسافر تھے۔
- بمبئی میں چرنی روڈ اسٹیشن پر مضافاتی ٹرین کی تاریخ میں پہلا حادثہ ہوا جس میں ۵ ہلاک اور ۲۸ زخمی ہوئے۔
- ۱۹۶۴ء کا امن کا نوبل پرائز مارٹن لوتھر کنگ کو ملا۔ کنگ امریکہ کے حبشی ہیں۔
- روس کے وزیرِ اعظم مسٹر خروشچیف نے استعفیٰ دیدیا ہے۔ اُن کی جگہ مسٹر کوسی گن مقرر ہوئے۔
- مسٹر خروشچیف نے روسی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری کے عہدے سے بھی استعفا دیدیا ہے اور اس جگہ مسٹر برزنیف آ گئے ہیں۔ مسٹر برزنیف دو ماہ پہلے تک روس کے صدر تھے۔

محمد علوی

نیا دن

ابھی چاند کے ہاتھ
کالے درختوں کو سہلائیں گے
زرد پتے
ہوا کے بدن میں اُتر جائیں گے
بہت بیتے دنوں کا
کوئی ایک لمحہ
مری آنکھ سے
اشک بن کے گرے گا!
اور پھر اک نیا دن
پُرانے مکانوں کی گندی چھتوں پر
برہنہ پھرے گا!!

○

ندا فاضلی

موڈ

آج کچھ لُٹتا ہوا ہوں
یہ نہ سمجھو زندگی سے تھک گیا ہوں
چند لمحوں کو اندھیرا بڑھ گیا ہے
ہر کمر کی شاخ کملائی ہوئی ہے
ہر نظر کا پھول مرجھایا ہوا ہے
آئینے چہروں کے دُھندلے ہو گئے ہیں
چوڑیوں کے گیت تھک کر سو گئے ہیں
راستے سنسان بے رونق دُکانیں
شہر! گم سُم سا دکھائی دے رہا ہے
پھر کسی ناول کا اک رنگین جملہ
بے تکلف دوست کی اک آدھ گالی،
ٹیڑھی میڑھی بدنما سی کوئی ڈالی،
بیچ رستے میں پھدکتی شوخ مینا
یا بھری بانہوں میں اک چونچال بچہ
میرے غم کی گتھیوں کو کھول دے گا
خشک ہونٹوں میں تبسم گھول دے گا
اور اس جادو گری کا نُور لے کر
میں جدھر دیکھوں گا چہرے کھل اٹھیں گے
ہر کمر کی شاخ لہرانے لگے گی —
ہر نظر کا پھول، مُسکانے لگے گا
سُونے سُونے راستے سجنے لگیں گے
چوڑیوں کے گیت پھر بجنے لگیں گے
آج کچھ لُٹتا ہوا ہوں!!!
یہ نہ سمجھو!!

سید شہاب الدین دسنوی

ٹیکنیکل تعلیم
نئے دائرے اور نئی منزلیں

ایک بار جواہر لال نہرو نے بڑی حسرت کے ساتھ کہا تھا۔

"دنیا جبکہ خلائی دور میں داخل ہو چکی ہے، ہم ہندوستانی ابھی چھکڑے کے زمانے سے نکل کر بائیسکل کے عہد تک پہنچے ہیں"۔

اس بلیغ فقرے میں، انہوں نے اپنے ملک کی صنعتی اور ٹیکنیکی رفتار کی پوری تاریخ سمو دی۔

ہندوستان میں برطانوی دورِ حکومت کا یہ خاصہ رہا کہ انہوں نے یہاں تعلیم، صنعت و حرفت اور زراعت کو اسی حد تک اور اسی انداز سے ترقی دینے کی کوشش کی کہ جس سے ہندوستان کو ترقی تو نہ ہونے پائے لیکن اُن کی اپنی ضرورتیں پوری ہوتی جائیں۔ کالج کھولے گئے، یونیورسٹیاں بھی قائم کی گئیں۔ مگر غرض یہ تھی کہ ان میں سے جو تعلیم یافتہ طبقہ نکلے وہ انگریزی عملداری کو چلانے میں حکمرانوں کی مدد کرے۔ لیکن تعلیم کے بنیادی مقصد سے بے بہرہ رہے۔ یہی حال ٹیکنالوجی کا ہوا۔ بلکہ یہاں تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ ترقی ہونے ہی نہ پائے۔ یہ عجیب تماشے کی بات ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں انجینئرنگ کی تعلیم کو آج سے ایک سو برس پہلے رواج دیا، رڑکی کا تھامسن کالج اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا۔ لیکن اس میں اور آگے چل کر اسی طرح کے دوسرے اداروں میں نے دیگر جو زور ڈالا گیا وہ سب کا سب سول انجینئرنگ پر تھا۔ وجہ صاف تھی۔

دیسی حکمرانوں کے محلات، مکانات، دفتروں کی عمارتیں، وغیرہ چاہیے تھیں جنکا انگلستان سے منگوایا جانا ممکن نہ تھا، اسلئے ضرورتوں کے تحت یہاں سول انجینئرنگ کی تعلیم کا انتظام کیا جانا لازمی تھا۔ کچھ عرصہ بعد میکانیکل اور الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبے بھی کھولے گئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ریلوے، اور برطانوی مشینوں کی مدد سے قائم کئے ہوئے کارخانوں کے کام، بڑے بڑے انگریز افسروں کے تحت چلتے رہیں۔ ہندوستانیوں کے لئے اپنے کارخانے قائم کرنے اور اپنی مشینیں بنانے کی گنجائش کہاں رہ سکتی!

پچھلی عالمی جنگ تک یہی صورت حال قائم رہی۔

جب جنگ چھڑی تو اس وقت پورے ہندوستان میں ۳۶ انجینئرنگ کالج تھے جن سے ڈگری حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس کے آگے پوسٹ گریجویٹ یا ریسرچ کا انتظام ایک آدھ ادارے میں تھا، عام طور سے اعلیٰ تعلیم کے لئے طلباء کو یورپ یا امریکہ جانا پڑتا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں جب جنگ چھڑی تو اس کے ساتھ ہی بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا بھی احساس ہوا کہ ہندوستان میں انجینئروں اور ٹیکنیکل کام جاننے والوں کی اتنی کمی ہے کہ جنگی ساز و سامان کے سلسلے میں اس وسیع ملک سے کسی خاطر خواہ امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ بھی تو ممکن تھا کہ برطانیہ ہم [illegible] سے کوئی جنگی مدد حاصل نہ کرتا اور اس دور اندیش قوم کے سامنے اپنے مستقبل کا بھی تصور تھا جس کی ساخت اور صنعتی ضرورتوں کا احساس ہے۔ اس سے اندازہ لگایا گیا تھا، اسی سبب کے پیش نظر مختلف سطح پر ٹریننگ دینے کے لئے کچھ فوراً نئے ادارے کھولے گئے۔

سارجنٹ اسکیم

۱۹۴۴ء میں ہندوستان میں تعلیم کے افق پر ایک نئی روشنی چمکی۔ حکومت ہند کی مرکزی مشاورتی کمیٹی نے قومی تعلیم کا ایک نہایت جرات مندانہ منصوبہ یا اسکیم تیار کی جو "سارجنٹ اسکیم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ سارجنٹ اسکیم نے تعلیم کے ہر پہلو اور بالخصوص ٹیکنیکل ایجوکیشن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور اس کے مواقع بڑھانے کا پلان تیار کیا۔ کچھ عرصے تک اس اسکیم پر غور کیا گیا اس میں ترمیم و تنسیخ کی تجویزیں کی گئیں۔ لیکن جب برطانوی اقتدار ختم ہوا تو صورت حال بدل گئی۔ بدیسی حکومت کی جگہ قومی حکومت نے لے لی اور نئے منصوبے بنائے گئے۔ ملک کی ضرورتوں کا نئے سرے سے جائزہ لیا گیا اور اس کی روشنی میں تیز قدم اٹھائے گئے۔ چنانچہ آزادی سے قبل جہاں صرف ۳۶ انجینئرنگ کالج تھے ان میں کل ۲۲۰۰ طلباء زیر تعلیم تھے، وہاں پچھلے سال تک ۱۱۸ کالج قائم ہو چکے تھے جن میں ہر سال ۲۱۰۰۰ طلباء کے داخلے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اس طرح گنے چنے انجینئرنگ

اسکولوں کی جگہ ملک میں اب ۲۴۸ پالی ٹکنک طرز کے ادارے قائم ہیں جن میں گزشتہ سال تک ۳۸۰۰۰ طلباء ۱۶ مختلف کورس کی تعلیم میں مشغول تھے۔ ہندوستان میں منصوبہ بندی کے تحت جہاں ایک طرف ٹکنیکل تعلیم میں کئی گنا وسعت پیدا ہوئی وہیں صنعتی ترقی کی رفتار بھی تیز سے تیز تر ہو گئی۔ پھر بقول جواہر لال نہرو ہم چرخے کے عہد سے نکل کر ایٹمیکل کے عہد میں پہنچ گئے لیکن اس کے ساتھ یہ احساس بھی بڑھتا چلا گیا کہ ابھی منزل دور ہے، راہ دشوار اور صبر آزما۔

جس طرح جسم کو صحت مند رکھنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اُس کی ضروریات کے ہر پہلو پر احتیاط کی نگاہ رکھی جائے تاکہ کوئی ایک عضو یا حصہ کمزور نہ رہ جائے اسی طرح تعلیمی منصوبہ بندی میں بھی احتیاط برتنا ضروری ہے تاکہ کوئی ایک پلہ بلا وجہ بھاری نہ پڑ جائے۔ ٹکنیکل تعلیم اور صنعت کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ صنعتوں میں بجلی اور مشین کے علاوہ انسانی طاقت سے کام لیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی تعداد اُن کاریگروں کی ہوتی ہے جو براہ راست مشینوں پر کام کرتے ہیں۔ ان کے کام اور بنائے ہوئے سامان کی مناسبت اور موزونیت کی جانچ پڑتال سپروائزر کرتے ہیں۔ اُن کے علاوہ وہ بڑے انجینئر ہوتے ہیں جن پر کام کی آخری صورت کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ٹکنیکل تعلیم کے ایک اچھے اور ترقی پسند نظام میں ان تینوں قسم کے عملے کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہونا چاہئے تاکہ ہر پہلو مضبوط ہو۔ صنعت کو ترقی دینے کے ذمہ دار وہ مٹھی بھر لوگ بھی ہوتے ہیں جو ریسرچ اور تحقیق کا کام بھی کرتے ہیں ان کا میدان بہت وسیع ہوتا ہے۔ ریسرچ کرنیوالے نہ صرف نئی سائنسی انکشافات کے ذریعے نئے اور بہتر طریقے دریافت کرتے ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ، اخراجات میں کمی اور انسانی مشقت کا بچاؤ ہو سکے بلکہ وہ صنعتی پیداوار کو بہتر سے بہتر بنا کر اس قابل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ دوسرے ممالک کی پیداوار سے مقابلہ کر سکیں اور اپنے ملک کی تجارت کو فروغ دے کر ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنا سکیں۔

نئے تقاضے

ان اصولوں کے پیش نظر آزادی کے بعد ہندوستان میں تعلیمی نظام پر غور کرنے کی خاطر جب مختلف کمیشن اور کمیٹیاں مقرر ہوئیں تو ٹکنیکل تعلیم پر خاص طور سے توجہ کی گئی۔ ایک اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ یونیورسٹی کے دائرے سے باہر اعلیٰ ٹکنالوجی کے چار ادارے قائم کئے گئے جن کا مقصد صنعتوں کے بدلتے ہوئے حالات اور ٹریننگ میں مطابقت پیدا کرتے رہنا تھا۔

ایسے ادارے جنہیں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کا نام دیا گیا، کھڑگپور، بمبئی، مدراس اور کانپور میں قائم ہوئے اور بعد کو دلی میں بھی۔ یہ ایک نیا تصور تھا جس سے دور رس نتائج کی توقع ہے۔

عام انجینئرنگ کالج میں ڈگری تک کی تعلیم ہوتی ہے اور اُن کا تعلق یونیورسٹی سے ہوتا ہے۔ یہاں سے نکلے ہوئے نوجوان کچھ مدت کی مزید ٹریننگ کے بعد کارخانوں اور صنعتوں میں انجینئر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں جہاں ایسے کالجوں اور ان میں پڑھنے والے طلباء کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوا وہیں نئے تقاضوں کے ماتحت نئے نئے کورس بھی شروع کئے گئے۔ مثلاً

Petroleum Tech. Aeronautical Engg.
Ceramics, Naval Architecture
Elec: Electronics. Tele. Comm.

وغیرہ یہ سب اہم اور مفید کورس ہیں لیکن دنیا میں ٹکنالوجی کی موجودہ رفتار کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دوسرے بیسیوں شعبوں کا انتظام کرنا باقی ہے۔ ایک اور پہلو جس کی طرف یونیورسٹیوں کو متوجہ ہونا ہے۔ وہ پوسٹ گریجویٹ اور ریسرچ کا انتظام ہے اس سلسلے میں کام کم ہوا اور جو ہوا وہ ابھی ناکافی ہے۔

اُستادوں کی کمی

۱۹۶۰ء میں پروفیسر Thacker کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث کی۔ کمیٹی نے تین قسم کی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کی سفارشات پیش کی (۱) ایک سال کا پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کورس جس میں کسی ایک مخصوص اور محدود موضوع پر کام ہو۔ (۲) ماسٹر آف انجینئرنگ کا دو سال کا کورس جس میں زیادہ وسیع مطمح نظر کے تحت تعلیم دی جائے۔ (۳) پی ایچ ڈی جس کے لئے کم سے کم دو سال تک کسی ادارے میں تحقیقی کام یا ریسرچ میں گزارنا۔ Thacker کمیٹی نے پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کے لئے ۱۵۰۰، ایم ای کے ۱۲۴۰ اور ڈاکٹریٹ کے لئے ۱۰۰ نشستوں کی سفارش کی تھی۔ لیکن چار سال گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان سفارشات کے بہت کم حصوں پر عمل کیا جا سکا ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم ابھی اس منزل پر ہیں جہاں ڈگری کالجوں کے لئے جتنے استاد چاہئیں وہ بھی میسر نہیں ہوتے ہیں اگر آگے بڑھنے میں تو اور بھی مشکلیں پیش آئیں گی۔

منزل کی طرف

یونیورسٹی سے نیچے پالی ٹکنک کی سطح ہوتی ہے جس میں میکانیکل، الکٹریکل اور سول انجینئرنگ کے ڈپلوما کورس کا انتظام ہوتا ہے جہاں پہلے مختلف صوبوں میں اوورسیر اسکول یا انجینئرنگ اسکول کے نام ایک آدھ ادارہ P.W.D کی ضرورتیں پورا کرنے کی خاطر ہوا کرتا تھا وہاں اب کوشش اس بات کی ہو رہی ہے کہ ہر ضلع میں کم سے کم ایک پالی ٹکنک ہو جائے۔ پچھلے سال تک ۲۴۸ پالی ٹکنک میں سے اتر پردیش میں ۲۹، میسور میں ۲۸، مدراس میں ۲۰، مہاراشٹر میں ۲۳ اور آندھرا پردیش میں ۲۰ پالی ٹکنک تھے جن میں Industrial Engg. [illegible]

لال قلعہ

سید عبدالقادر ہاشمی

لال قلعہ دہلی جس پر ہر سال یوم آزادی ویوم جمہوریہ کے موقع پر قومی پرچم بڑے اہتمام سے لہرایا جاتا ہے۔ جسکی فصیل سے سربراہ مملکت قوم کو مخاطب کرتا ہے جس کے عالیشان ایوانوں میں معزز بیرونی مہمانوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اپنی ایک انفرادی حیثیت اور شاندار تاریخ رکھتا ہے۔ گذشتہ تین سو سال کے درمیان یہ قلعہ زمانے کے کئی انقلاب وانتشار سے گذرا۔ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ اس کی ہیئت میں تبدیلی کی کوشش کی گئی اور اس کے نام بھی تبدیل کئے گئے لیکن اپنے وسیع دامن میں خاک وگل کی ملی جلی تاریخ سموئے ہوئے یہ عظیم الشان قلعہ آج بھی ہندوستان کی ثقافتی وقومی زندگی کا ایک اہم جزو بنا ہوا ہے۔

لاگت اور مدتِ تعمیر

۱۶۳۸ء میں مغلیہ خاندان کے پانچویں تاجدار شہاب الدین محمد شاہ جہاں صاحب قران ثانی نے دریائے جمنا کے شرقی کنارے اس کا سنگ بنیاد رکھا اور نو سال کی لگاتار محنت اور اس زمانے کی لاگت کے مطابق ۵۰ لاکھ روپیوں کے صرفہ سے اس کی تعمیر مکمل کی گئی اسکی شکل متوازی الاضلاع جیسی ہے۔ شمال سے جنوب تک اس کا طول ۳۰۰۰ فٹ اور مشرق سے مغرب تک اسکا عرض ۱۶۰۰ فٹ ہے اس کے چاروں طرف ایک گہری اور چوڑی خندق بنی ہوئی ہے۔ اس کے دو عدہ باب الداخلے لاہوری دروازہ اور دلی دروازہ ہیں جس دروازے کا رخ پرانی دلی کی طرف ہے اس کا نام اس مناسبت سے "دلی دروازہ" رکھا گیا۔ قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد شاہ جہاں نے دریائے جمنا کی جانب کے دروازے سے داخل ہو کر قلعہ کو ملاحظہ کیا تھا مشہور مورخ فرگوسن نے اس لاہوری دروازہ کی نہایت شاندار الفاظ میں تعریف کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"نہایت وسیع محراب سے داخل ہوتے ہوئے آپ اپنے آپ کو اس گنبد نما مقام میں پاؤگے جسکی مجموعی لمبائی ۳۷۵ فٹ ہے اور یہ باب الداخلہ موجودہ تمام محلات کے باب الداخلوں میں سب سے عمدہ ہے۔"

تختِ طاؤس

قلعہ کے اندر "دیوان عام" کا عظیم الشان ایوان ہے۔ یہاں مغل بادشاہ سفید سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھ کر اپنا عام دربار منعقد کیا کرتے تھے یہ ایوان ۵۰۰ فٹ لانبا اور ۲۰۰ فٹ چوڑا ہے۔ جسمیں اونچے اونچے ستونوں کی ایک لمبی قطار چلی گئی ہے۔

دیوان عام سے متصل رنگ محل ہے۔ یہ ۱۵۳ فٹ لانبا اور ۶۹ فٹ چوڑا ہے۔ اس کی چھت چاندی کی تھی جس پر سونے کا کام کیا گیا تھا۔ پلاسٹر کے چند

Leather tech, Metallurgy Mining وغیرہ جیسے جدید مضامین بھی شامل ہیں، ڈپلوما حاصل کئے ہوئے نوجوان کارخانوں اور صنعتوں میں ان جگہوں کو پر کرتے ہیں جو کاریگروں کے کاموں کی دیکھ بھال کیلئے ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سپروائزر بنتے ہیں صنعتی تعلیم کا کوئی نظام کاریگروں کی ٹریننگ کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کرسکتا پہلے یہ کام صنعتیں اپنے طور پر خود ہی انجام دیا کرتی تھیں مگر اب صورت حال بالکل مختلف ہے۔ روز بروز ٹرنرز، فٹر، الکٹریشن، ویلڈر وغیرہ کی مانگ بڑھتی جارہی ہے ان کی ٹریننگ کے لئے Industrial Trg. Institute. قائم کئے گئے ہیں۔ لیبر منسٹری کی رپورٹ کے مطابق ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۳۸۰ I.T.I تھے جن میں ۸۰،۴۳،۷۰ طلبا کو ایک سال یا ڈیڑھ سال کی ٹریننگ دی جارہی تھی۔

غرض تکنیکل تعلیم کے اس ہمہ گیر نظام سے ایک طرف ان رجحانات کا پتہ چلتا ہے جو اس ملک میں آزادی کے ساتھ پیدا ہوئے۔ اور دوسری طرف ان منزلوں کی نشاندہی ہوتی ہے جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں، بلاشبہ راہیں دشوار گذار ہیں لیکن رجحانات کے نمادیے صحیح ہیں۔ اس لئے یقین ہے کہ ہمت اور استقلال کی مدد سے ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوسکیں گے

(آل انڈیا ریڈیو بمبئی کی اجازت سے)

— ❖ —

نشانات آج بھی عظمت پارینہ کی گواہی دے رہے ہیں۔

دوسرا ایوان "دیوان خاص" ہے جس کے ۳۲ مرمریں ستون اپنے عہد کی عمدہ کاریگری کا زندہ ثبوت ہیں۔ اس کی اصل چھت کو اسکا سونا حاصل کرنے کیلئے لوٹ لیا گیا۔ اور موجودہ چھت سرخ رنگ کی ہوئی لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔ شہرۂ آفاق تخت طاؤس بھی یہیں رکھا گیا تھا اس دیوان کے ایک محراب پہ فارسی کا یہ شعر ؎

گر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

لکھا ہوا ہے۔

باعث حیرت

دیوان خاص کے جنوب میں سنگ مرمر کا بنا ہوا "برج" ہے جہاں سے مغل شہنشاہ طلوع آفتاب کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ اس میں "تسبیح خانہ" بیٹھک اور خوابگاہ واقع ہیں۔ مرکزی کمرہ کی جالی پر لگے ہوئے ڈھال پر رکھی ہوئی "میزان عدل" شہنشاہ کے انصاف پسند مزاج کی یاد دلاتی ہے۔

دیوان خاص کے شمال میں شاہی حمام ہیں جنمیں سرد اور گرم پانی کی سربراہی کا انتظام اور موریوں سے اس کے اخراج کے طریقے اسقدر عمدہ ہیں کہ آج بھی ماہرین کے لئے حیرت کا باعث ہیں۔

اس کے قریب ہی وہ چھوٹی سی "موتی مسجد" ہے جو اورنگ زیب نے ۱۶۵۷ء میں تعمیر کروائی تھی اور یہ مسجد خوبصورتی کے لحاظ سے شاید ہندوستان کی سب سے خوب صورت مسجد ہے۔

لال قلعہ کے پرشکوہ دروازے، مضبوط فصیل، گہری خندق، عالیشان ایوانات وغیرہ فن تعمیر اور صناعی کے نادر نمونے جہاں اس کی عظمت رفتہ کا زندہ ثبوت ہیں وہیں اس قلعہ میں ایسے واقعات بھی ہوئے ہیں جنہیں تاریخ کا المیہ کہا جا سکتا ہے

مختلف دور میں اس کے مختلف نام رہے ہیں شاہجہاں نے اس کا نام "قلعہ مبارک" رکھا۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اسے "قلعہ معلی" کہا جاتا تھا اور انگریزی دور سے اب تک یہ "لال قلعہ" کے نام سے موسوم ہے۔ "قلعہ معلی" کی ٹکسالی اردو اور اس کے شاعر ہمارے ادب اور ہماری ثقافتی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

بربادی

اس کے ساتھ ساتھ یہ قلعہ بعض تاریخی سانحات کا بھی جائے وقوع رہا ہے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے اس کا سہاگ "تخت طاؤس" چھین لیا۔ ۱۷۹۸ء میں غلام قادر روہیلے نے اسے آگ لگا دی اور ۱۸۵۷ء میں اس کے محلات منہدم کر دیئے گئے اس کے ہرے بھرے باغات برباد کر دیے گئے۔ اسکے شیش محل کو انگریزی فوجوں نے غدر کے بعد باورچی خانہ میں تبدیل کر دیا۔ انسانی طاقتوں کے علاوہ قدرتی عناصر نے بھی اس کی بربادی میں حصہ لیا۔ زلزلوں نے بھی اسے دھکہ پہنچایا لیکن لال قلعہ زمانے کے ہر وار کو سہہ گیا یہ بات قابل غور ہے کہ شاہ جہاں نے دیوان خاص کے محراب پر

گر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

درج کرایا تھا اور قدرت کی ستم ظریفی اور تاریخی کا حزینہ ہے کہ شاہ جہاں کی فردوس اس کے ورثا کے لئے مقتل گاہ بن گئی۔ اس ایوان میں غلام قادر روہیلہ نے مغل بادشاہ شاہ عالم کی آنکھیں نہایت بے رحمی سے نکال کر اندھا کر دیا۔

۱۳ مارچ ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ نے اپنے عمامہ کو محمد شاہ کے عمامہ سے بدل لیا اور محمد شاہ کے عمامہ میں چھپے ہوئے کوہ نور کو حاصل کر لیا۔

آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کو، جسکے جد امجد نے اس ایوان میں ۱۷۱۶ میں انگریزوں کو بنگال دیوانی عطا کی تھی ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے جلا وطنی کا حکم دیدیا۔

آزاد ہند فوج کے سورماؤں پر بھی اسی قلعہ میں انگریزوں نے مقدمہ چلایا تھا۔

لیکن ملک کی آزادی کے بعد اس کی تقدیر نے بھی پلٹا کھایا۔ دن بہ دن یہ قلعہ ہمارے قومی ثقافتی امور کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ اس کی ترمیم و تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس کی نگہداشت کا بھی موثر انتظام ہے۔

جیل کے وارڈن نے جب دیکھا کہ ملاقات کے دن ہر قیدی ملنے اس کے دوست اور رشتے دار آتے ہیں۔ لیکن ایک بدنصیب سے ملنے کوئی نہیں آتا تو اس نے اس قیدی کو بلوایا اور بہت محبت سے پوچھا۔

"کیا تمہارا کوئی دوست رشتہ دار نہیں۔"

"ہیں صاحب مگر وہ سب یہیں ہیں۔"

— ٭ —

دو دوست انور اور جمیل بڑے کامیاب تاجر تھے اور دونوں ہمیشہ ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی فکر میں رہتے۔

ایک دن انور نے اپنی کار میں ٹیلیفون لگوالیا جمیل نے جب یہ خبر سنی تو اسے بڑا طیش آیا اور اس نے بھی اسی دن اپنی کار میں ٹیلیفون فٹ کروا لیا اور انور کو فون کیا۔

"ہلو انور میں جمیل بول رہا ہوں۔ میں اپنی کار سے تمہاری کار کو فون کر رہا ہوں"

"اچھا جمیل۔ لیکن ذرا ٹھہرو یار دوسرے ٹیلیفون کی گھنٹی بھی بجنی شروع ہو گئی ہے اس سے بات کر کے تم سے بات کرتا ہوں"

انگریزی مضمون

فیض انصاری

رشوت خوری

سب سے زیادہ نفع بخش تجارت جو معیوب نہیں

جنوبی امریکہ میں رشوت خوری سب سے زیادہ نفع بخش تجارت ہے اور پھر ایسی تجارت جو قانون کی نگاہ میں کوئی جرم ہے نہ سماج کے نزدیک قابل لعنت فعل بلکہ اس کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہمارے ملک میں تعمیرات کی ٹھیکیداری کے منافع بخش بیوپار کو۔ آج جبکہ ہمارے ملک میں بھی رشوت خوری ایک چلتی ہوئی منافع بخش تجارت بن چکی ہے اور ہم اسے جڑ بنیاد سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کے ممالک میں جاری و ساری ایسی تجارت کے حالات جہاں ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے وہاں ایک ایسا تازیانہ بھی کہ اگر ہم اس لعنت کو ایمانداری سے ختم نہ کر سکے تو ایک دن ہم خود ختم ہو جائیں گے۔

وے نیزویلا کے تانا شاہ ہیریج پینج سے ایک بار کسی ٹیلی ویژن کے نامہ نگار نے سوال کیا "کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنے ملک کے خزانے سے ایک ارب روپئے چرائے ہیں؟"

اس پر اس سابق مطلق العنان نے بلا کسی جھجک اور ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔

"اگر آپ کسی جنوبی امریکی ملک کے صدر ہو جائیں تو آپ کو روپے چرانے کی ضرورت نہیں پڑیگی"۔ رشوت خوری اور سیاسی کرپشن جنوبی امریکہ کے ملکوں کی بہت پرانی بیماری ہے۔ سیاست داں حکام اپنی جیب تو بھر لیں گے ہی یہ بات سارے جنوبی امریکہ میں تسلیم شدہ ہے (صرف کیوبا اس لعنت سے دور ہے وہ بھی آج سے!) دراصل یہ وہاں کی تقریباً روایت بن گئی ہے نچلے اور متوسط طبقوں میں پیدا ہونے والے مطلق العنان یا صدر حکومت (ان دونوں میں وہاں کوئی فرق نہیں ہوتا) چند دنوں میں لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔

جو صدر حکومت الگ ہونے سے پہلے کروڑ دو کروڑ روپیہ رشوت نہ لے وہ احمق بلکہ احمق اعظم کہلاتا ہے

اوکٹوے پاج کے لفظوں میں کرپشن جنوبی امریکہ میں ایک آرٹ ہے لیکن مصور کا آرٹ نہیں کیوں کہ اس کے لئے جو طریقے اپنائے جاتے ہیں وہ کئی بار بڑے بھونڈے اور بھدے ہوتے ہیں۔

اوکٹوے پاج نے "ٹروجیلو" کے دور حکومت میں ڈومنکن حکومت کا کرپشن" کے موضوع پر ایک انتقادی مضمون لکھا تھا اور اس کی قیمت اس کو اپنی زندگی سے ادا کرنی پڑی تھی۔ مطلق العنان ٹروجیلو کے گرگوں نے انتہائی بے رحمی سے اس کا خون کر دیا تھا۔

ڈومنکن ریپبلک کا تانا شاہ جنرل لیمبر رافیل لی یونیوس ٹروجیلو جنوبی امریکہ کے ان سیاست دانوں کا نمونہ ہے جنہوں نے کرپشن کو عظیم تجارت کا روپ دیا وہ ایک غریب کلرک کی بارہ اولادوں میں سے ایک تھا لیکن مرتے وقت اڑھائی ارب روپے کی جائیداد چھوڑ گیا

ہر فرد بادشاہ

آزاد ڈومینکن میں ٹروجیلو خاندان کا ہر فرد اپنی جگہ ایک بادشاہ تھا۔ ٹروجیلو کا باپ ہوزے ٹروجیلو محکمہ ڈاک کا ایک معمولی ملازم تھا لیکن وہ ایک دولت مند زمیندار اور کافی کے باغوں کے مالک کی حیثیت سے مرا۔ اسے سانتا ماری لامینور کے گرجے میں دفنایا گیا۔ جہاں کرسٹوفر کولمبس کا مردہ گڑھا ہوا ہے۔

ٹروجیلو کی ماں ڈونا ماریہ جو ایک جاہل مطلق دیہاتن تھی ملک کی "پہلی عورت" اور "مادر وطن" کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن ڈونا ماریہ تھی غضب کی تاجر عورت۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ٹروجیلو کے عنان حکومت سنبھالنے کے بعد ڈونا کو پتہ چلا کہ حکومت نے ہزاروں روپلوں کے

بل نہیں بھگتنے ہیں۔ بس اس نے ایک کاروبار کھول دیا۔

سرکاری نوکروں کو ان کے بہت دنوں کی واجب الوصول تنخواہ کا بقیہ سرکاری خزانے سے ڈونا کی معرفت ملنے لگا۔ ڈونا اس کا کچھ فیصدی دلالی کی صورت میں لے لیتی اور کبھی کبھی ان کا پچاس سے اسّی فیصد تک وہ وصول کر لیتی تھی۔ جن بیوپاریوں اور ٹھیکیداروں کے بل بقیہ ادائیگی کے پڑے ہوتے ان سے بھی وہ [illegible] وصول کرتی اور بھگتان کرا دیتی صرف [illegible] پھر بھی اس چالاک عورت نے اس آسان تجارت سے بیالیس لاکھ روپے بنا لئے۔

ٹروجیلو کا بھائی ہیکٹر بیک وقت تاجر اور زمیندار دونوں تھا وہ اور بونیٹو پورکس مچھلی کا تیل نکالنے والی ایک کمپنی میں ساجھے دار تھے ملک میں کھپنے والا اسّی فیصد تیل اسی کمپنی کا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ گنے کے ایک عظیم فارم کا بھی مالک تھا کافی کے بہت سے باغ بھی اس کی ملکیت تھے۔

ڈھائی ارب روپے

جس دن کنگال کاؤن کرسٹو مال کے ایک گندے جھونپڑے میں رافیل ایل ٹروجیلو کا جنم ہوا تھا اس روز اس گھر میں ایک وقت کا بھی کھانا نہیں تھا۔ لیکن ساٹھ سال بعد ۳۰ لاکھ ڈومینیکنوں کا یہ خود ساختہ رہنما لگ بھگ اڑھائی ارب روپوں کی جائیداد کا مالک بلا شرکت غیرے بن چکا تھا۔

مشہور ڈومینیکی مورخ ڈاکٹر [illegible] نے لکھا ہے "مطلق العنان ٹروجیلو کی نجی آمدنی اور سرکاری آمدنی میں فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ کوئی بھی ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ ٹروجیلو کی نجی جائیداد کہاں ختم ہوتی ہے اور کہاں سے سرکاری جائیداد شروع ہوتی ہے۔ ٹروجیلو نے شروع کئے ہوئے بہت سے کاروبار چپ چاپ سرکار کے کھاتے میں اتر گئے ہیں۔ ان دونوں کو [illegible] مگر بہت سے ڈومینیکنوں دبی زبان سے یہ بتایا کرتے ہیں "یہ دھندا گھاٹے میں چل رہا ہے تو سرکار کا ہے اور منافع میں چل رہا ہے تو ٹروجیلو کا ...!"

اب اگر ٹروجیلو بروقت اڑھائی ارب کی جائیداد چھوڑ گیا تو اس میں تعجب کیا۔ کیوبا کا "باقیتسا" اور نکاراگوا کا "ساموزا" بھی [illegible] درجے کے ہو رہا۔

کیوبا کا قصہ

[illegible] ہے کہ ۱۹۵۹ء میں جب باقیتسا کیوبا سے بھاگا تو اس وقت وہ کچھ نہیں تو ایک ارب روپے کی جائیداد کا مالک تھا۔ اس کی آمدنی کے ذریعے غضب کے تھے۔ ان میں سے ایک تھا "تمباکو [illegible] کاروباری قرضوں میں دلالی"۔ کیوبا کے کارخانوں کو ترقی دینے کی اسکیم کے تحت حکومت نئے کارخانے کھولنے کے لئے اڑھائی لاکھ سے لیکر اڑھائی کروڑ تک کے قرضے دیا کرتی تھی۔ باقیتسا ایسے لوگوں کو قرضے دلاتا جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ مشین کس چڑیا کا نام ہے اس میں باقیتسا کا وزیر خزانہ اور دوسرے بڑے آفیسر بھی شریک ہوتے تھے۔ محض کاغذی پلاننگ کے بل پر قرض کی منظوری دیدی جاتی۔ کہتے ہیں کہ باقیتسا اپنی طے شدہ دلالی ۳۵ فیصد لیتا تھا چاہے دوسروں کو کچھ بھی ملے۔

باقیتسا کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ تھا قومی لاٹری جنوبی امریکہ کے لوگ بڑے قمار باز ہوتے ہیں۔ ان میں کیوبا کے لوگوں کا تو جواب ہی نہیں۔ حکومت کی جانب سے ہر ہفتہ لاٹری نکلتی تھی اور یہ کرپشن کا چور دروازہ ہوتی تھی۔ اس کے راستہ کروڑوں روپے غائب کر دیے جاتے اور یہ سیدھے صدر مملکت، فوجی حکام اور اعلیٰ افسروں کی جیبوں میں چلے جاتے۔

معمولی اسٹینوگرافر

صدر مملکت باقیتسا لاٹری کی دیکھ بھال خود کرتا تھا تو مادام باقیتسا قمارخانوں کی نگرانی کرتی تھی باقیتسا کے دور حکومت میں امریکی کمپنیوں اور مقامی سرمایہ پرستوں نے بہت سے ایسے ہوٹل کھول رکھے تھے جہاں پر ہر قسم کے عیش و عشرت کے ساتھ قمار بازی کے بڑے بڑے اڈے بھی کھلے عام چلتے تھے اور ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صدر مملکت کی بیوی کو چلا جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ حصہ آمدنی کا ۳۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہوتا تھا۔ جہاں تک باقیتسا کے دولت بٹورنے کا تعلق ہے اس نے فاحشہ عورتوں کو بھی نہیں بخشا اس کے دلال چکلوں، ہوٹلوں اور چند گھنٹے کے لئے کرایہ پر دینے والے "ہوٹلوں" تک سے ان کی آمدنی کا چوتھائی وصول کرتے تھے۔

اس طرح فلوجیہ نیسیو باقیتسا جو ایک معمولی خاندان کا فرد تھا اور فوج میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ صدر مملکت بن کر صرف دس سال میں کروڑپتی بن گیا۔

جو حقائق ٹروجیلو اور باقیتسا کے بارے میں ناقابل تردید ہیں وہی نکاراگوا کے ساموزا وینی جوئیلا کے [illegible] اور جنوبی امریکہ کے تقریباً تمام حدود ہائے مملکت کے بارے میں بھی ٹھوس حقیقتیں ہیں

نوکری دلانا

جنوبی امریکہ میں کرپشن کا دوسرا ذریعہ ہے "نوکری دلانا" چونکہ وہاں آئے دن حکومتیں بدلتی رہتی ہیں بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے یہ دھندا بڑے پیمانے پر چلتا ہے ہر نیا مطلق العنان صدر مملکت ایوان صدر میں قدم رکھتے ہی اپنے حامیوں اور مددگاروں کو

عوام واکرام سے نوازنا شروع کر دیتا ہے۔ وزارت کے ارکان اور سفارت خانے کے عہدے داروں سے لیکر صوبوں کے چھوٹے آفیسروں تک کی آسامیوں پر ایسے لوگوں کو نامزد کیا جاتا جنہوں نے صدر کے لئے جان جوکھوں میں ڈالی تھی اور ایسے لوگوں کے لئے چھوٹے عہدوں سے سیدھے جنرل اور کرنل ہو جانا ناممکن بات نہیں۔

ایسے حالات اور ایسی بدکرداری میں غرض مندوں اور ابن الوقت عناصر کو حکومتوں کا تختہ الٹنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ جب حکام وقت ہی رشوت خور ہو جائیں اور کرپشن کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کریں تو حکومتوں کے ایوانوں میں زلزلے کیوں نہ آئیں جو لوگ رشوت دے کر حکومت کے تخت پر بیٹھتے ہیں وہ ان ہی رشوت خوروں کے ہاتھ اپنی مٹی بھی پلید کروا لیتے ہیں۔

متحدہ ریاست امریکہ کی کاروباری انجمنیں اور ادارے بھی وہاں کرپشن کو پنپنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ وہ سیاست دانوں کو خرید لیتے ہیں اور حکومت کے تختے الٹ دینے کی کامیاب سازشیں کرتے ہیں۔ اس کے لئے وہ بے شمار روپیہ سرکاری نوکروں میں بانٹ دیتے ہیں اس طرح وہاں کی سیاسی زندگی اور سیاسی ماحول تباہ ہو جاتا ہے۔

حکومت میں کرپشن

مشہور امریکی سرمایہ کار جیمس ہالینڈ نے جس کا جنوبی امریکہ میں کافی لمبا چوڑا کاروبار تھا ۱۶ جولائی ۱۹۶۰ء کو ہوسٹن کی چیمبر آف کامرس میں کہا تھا۔ "ہماری کمپنیاں جنوبی امریکہ میں حکومت کی مشینری میں کرپشن پھیلاتی ہیں تاکہ انہیں وہ مراعات حاصل ہو سکیں جو کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتے اس بدکرداری اور رشوت ستانی کے ماحول میں

عوام الناس کی حالت کیا ہوگی اس کا تصور کوئی زیادہ مشکل نہیں۔ اگر وہ کیوبا کی نئی حکومت کی حمایت کرتے ہیں تو اس میں تعجب کیا؟ کیوں کہ دوست، اور دشمن دونوں گواہ ہیں کہ کیوبا کی موجودہ حکومت نے وہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی سے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔

کیوبا کے شدید دشمن اخبار "ٹائم" تک نے لکھا ہے کہ "فیڈل کاسترو نے سرکاری اور سماجی زندگی سے کرپشن کے صفائے اور حقیقی انصاف و جمہوریت کے قیام کو اپنے انقلاب کی بنیاد بنایا تھا۔ اس نے سرکاری اور نیم سرکاری حلقوں سے کرپشن اور اندھا دھند رشوت خوری کی جڑیں کاٹ کر رکھ دیں"

کرپشن جنوبی امریکہ کا سب سے بڑا سر درد ہے (جیسا کہ آج ہندوستان کا) اس کی جڑیں بہت گہری ہیں (جیسے کہ ہندوستان میں ہیں) اس کی روایات بہت پرانی ہیں (جیسے کہ ہندوستان میں پرانی ہیں) جو اسپینی نوآبادی کے کرپشن سے شروع ہوئی (جیسی کہ ہندوستان میں برطانوی حکام سے شروع ہوئی) وائسرائے اور کمانڈر سے لے کر چھوٹے موٹے ملازموں تک ہر اسپینی حاکم کا ایک ہی اصول ہوتا تھا (جیسا کہ گورا چرلاٹ ہی میں یہاں پر انگریز کا ایک ہی اصول ہوتا تھا "لوٹو اور حکومت کرو") کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرو جس سے اسپین لوٹ کر رئیسانہ زندگی گزاری جا سکے (جیسا کہ آزادی کے بعد ہمارے وزراء اور حکام کا مقصد بن گیا ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ روپیہ بٹورو تاکہ نوکری یا وزارت چھن جانے کے بعد عیش و آرام کی زندگی گزاری جا سکے) جنگ آزادی اور اس کے بعد کے زمانے کی منتشر سماجی اور سیاسی زندگی نے جنوبی امریکیوں کو اس بدکرداری اور مجرمانہ عادتوں کا مرتکب بنا رکھا ہے اور آئے دن ترقی ہی ہو رہی ہے۔

دراصل اس سماج دشمن اور ملک فروشانہ زہر کو جو حکام طبقے کے رگ رگ میں سرایت کر گیا ہے نکال باہر کرنے کے لئے وہاں بھی کیوبا جیسے انقلاب کی سخت ضرورت ہے۔

("منسٹرم" کے شکریہ کے ساتھ)

ایک نوجوان لڑکی اور اس کی ماں ڈاکٹر کے پاس بغرض معائنہ گئے۔

"محترمہ کپڑے اتاریئے"

"لیکن میں مریض نہیں ہوں۔ میری ماں ہے" لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔

"اوہ معاف کیجئے۔ اچھا بیگم صاحبہ آپ اپنی زبان دکھا دیجئے"

—*—

ایک بہت مشہور ڈاکٹر ایک چھوٹے ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ۔ آپ تو شاید ڈاکٹر ڈی سوزا ہیں؟ سیما کے نام سے مشہور ہیں" چھوٹے ڈاکٹر نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہاں میں مشورہ لینے آیا ہوں"

"آپ اور مجھ سے مشورہ لینے۔ لیکن آپ اپنا علاج خود کیوں نہیں کر لیتے"

"میں نے اس پر غور کیا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ فیس بہت زیادہ ہے"

—*—

ماں نے دیکھا کہ اسکی ۸ سالہ بچی پڑوسی کے لڑکے کے ساتھ بری طرح لڑ رہی ہے۔ ماں نے دونوں کو چھڑایا اور لڑکی سے کہا۔

"دیکھو آئندہ میں تمہیں جان کے ساتھ مارپیٹ کرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتی تم عورت ہو اُسے باتوں سے ہرا

مضمون نمبر ۲ جنوری - فروری ۶۵

جسم اور سائے

بلّوب دِل

سرلیش جین سیٹھ مُرلی دھر کا اکلوتا لڑکا تھا مُرلی دھر جو چھ سات ملوں کا مالک اور سٹّے کا کنگ سمجھا جاتا تھا۔ لاکھ دو لاکھ روپے کا اوپر نیچے ہو جانا اسکے لئے معمولی بات تھی اور کبھی کبھی تو اس کا پانچ پانچ لاکھ روپیہ سٹّے بازار کی نذر ہو جاتا لیکن اس کے باوجود اس کے ماتھے پر شکن تک نہ ابھرتی اور وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا رہتا۔ مُرلی دھر نے اپنے بیٹے سرلیش کو اپنا کام کاج سنبھالنے کے لئے اپنے نقشِ قدم پر چلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ لیکن سرلیش کو اس کاروباری زندگی سے رتّی بھر لگاؤ نہ تھا، کیونکہ بچپن ہی سے وہ لاابالی طبیعت کا مالک تھا اور جوانی کی بہاروں میں قدم رکھتے ہی وہ اس کی رنگینیوں میں کھو گیا تھا۔ بعض اوقات وہ اپنے باپ کی تجوریوں میں سے دس دس ہزار روپے صاف کر دیتا۔ جیب میں پیسے نہ ہونے کے باعث اکثر وہ مارواڑی سیٹھوں سے باپ کے نام پر ادھار لے جاتا اور دادِ عیش دیتا۔

سیٹھ مُرلی دھر اپنے لڑکے کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا جب تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں تو اس نے ماہانہ خرچ دینا بند کر دیا۔ لیکن ان تمام سختیوں اور پابندیوں کا یا وجود سرلیش پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا اور وہ ہمیشہ کی طرح زندگی کی رنگینیوں میں اترتا چلا گیا۔ کہیں نہ کہیں سے وہ روپیہ انتظام کر کے زندگی کا لطف اٹھانے وہاں پہنچ جاتا جہاں نوٹوں کی جھنکار پر پاؤں رقص کرتے ہیں، جہاں نوٹوں کے لئے مصنوعی مسکراہٹیں انسانوں کا خیر مقدم کرتی ہیں، اور جہاں چاندی کے سکوں کے عوض الھڑ جوانیاں اپنا سب کچھ پیش کر دیتی ہیں۔

آج سرلیش گے لارڈ ہوٹل کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اس کے چہرے سے اداسی اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ شاید آج رات کو رنگین بنانے کے لئے پیسوں کا کہیں سے بندوبست نہ ہوا تھا۔ سرلیش نے گے لارڈ کا جائزہ لینے کے لئے ایک سرسری نظر دوڑائی۔ سامنے والی میز پر دو حسین لڑکیاں ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے میں مصروف تھیں۔

ہر طرف فضا میں موسیقی بکھر رہا تھا۔ سازندوں کے قریب والی میز پر ایک لڑکی تنہا بیٹھی سگرٹ پی رہی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ اپنی پریشان زلفوں کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیتے ہوئے سگرٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑ رہی تھی۔

گے لارڈ کی ہلکی ہلکی دھیمی روشنی رومانی ماحول میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

حسین لڑکیاں، رنگ برنگی ساڑھیاں، دچست شلوار اور قمیص میں ملبوس اپنے بوائے فرینڈز (boy friends) کے جھرمٹ میں بانہوں میں بانہیں ڈالے داخل ہو رہی تھیں۔

سرلیش کا بے قرار دل کسی لڑکی کے قریب ہونے کیلئے مچلنے لگا۔

"کیا بات ہے اتنے سنجیدہ کیوں ہو؟" راجکشور نے اُس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

راجکشور اُس کا خاص دوست تھا اور ہر بات میں سرلیش کا ساتھ دیتا تھا۔

لیکن سرلیش بدستور برابر والی میز کی طرف دیکھتا رہا جہاں ایک خوبرو نوجوان کے ساتھ دو خوبصورت لڑکیاں بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"اُدھر کیا دیکھ رہے ہو؟" راجکشور نے اُسے اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟"

"کیوں تم اس کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"اس لئے کہ میں اسے ہمیشہ لڑکیوں میں گھرا ہوا پاتا ہوں، اور لڑکیاں ہیں کہ اس پر دل و جان نثار کرتی ہیں۔"

"اس کے پاس کار ہے، دولت ہے، شہرت ہے، خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ مہذب یافتہ اور پھر..."

"لیکن یہ تمام خوبیاں تو مجھ میں بھی ہیں لیکن پھر بھی کوئی لڑکی مجھ بدنصیب کے ساتھ پیار کرنے کو تیار نہیں اور اگر کسی نے میرے ساتھ میل جول بڑھایا بھی تو وہ اپنا اُلّو سیدھا کر کے نو دو گیارہ ہو گئی۔"

"بھئی یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے۔" کشور نے سرلیش کو چڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس نوجوان سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

"وہ کیوں۔"

"اس لئے کہ میں اس سے مل کر ان لڑکیوں کے بہت قریب ہو جاؤں گا۔"

"کیا تم اس لڑکے کو جانتے ہو؟"

"ہاں تھوڑا بہت۔ اسکا نام پال ہے۔ میں اسے ملوا دوں گا۔"

سرلیش کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا۔ اور اس نے قدرے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"مگر کب؟"

"ذرا دم تو لینے دو۔ پہلے ان لڑکیوں کو تو چلا جانے دو۔"

"ٹھیک ہے ——— پر یہ تو بتاؤ کہ یہ لڑکا کام کیا کرتا ہے؟"

"تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا درخت گننے سے۔"

آرکسٹرا اب ذرا اونچے سروں میں بج رہا تھا۔ کئی حسین جوڑے ڈانس کرنے میں مصروف تھے لیکن سرلیش کی نظروں کا مرکز پال اور وہ دو لڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں لڑکیاں پال سے ہاتھ ملا کر چلی گئیں۔ پال اب اکیلا رہ گیا تھا۔ سرلیش نے کشور کا ہاتھ دباتے ہوئے پال کی طرف اشارہ کیا۔ کشور نے فوراً پال کو اپنی میز پر آنے کی دعوت دی۔

پال جس نے کالا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ بلا کا اسمارٹ و خوبصورت لگ رہا تھا۔ پال مسکراتا ہوا انکی میز پر آ گیا۔

"چائے پیو گے؟"

"نہیں کشور پھر کبھی۔ ابھی مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

"ارے یار بیٹھو تو سہی۔ ہم سے ناراض ہو گیا؟"

کشور نے زبردستی پال کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا اور پال انکار نہ کر سکا۔

"یہ ہیں میرے دوست سرلیش جین۔" اور یہ ہیں پرنس پال۔"

دونوں نے بڑی گرمجوشی کیساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر خوشی کا اظہار کیا۔ سرلیش نے سوالیہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تو آپ پرنس ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"آپ کام کیا کرتے ہیں ——— میرا مطلب ہے جب سے ہندوستان آزاد ہوا ہے۔ راجاؤں کی حکومتیں بھی ختم ہو گئی ہیں۔ اب تو ہر کس و ناکس نے اپنا کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر لیا ہے۔"

"آپ کا کہنا ٹھیک ہے لیکن مجھے تو اپنے بارے میں علم نہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔"

"لیکن آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟"

"پال صاحب میں ———"

کشور نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"جی ان کا کیا ہے ان کی تو پانچوں انگلیاں ہمیشہ گھی میں ڈوبی رہتی ہیں۔ باپ کی چھ سات ملیں ہیں۔ تین چار فیکٹریاں ہیں۔ نو دس فلک بوس عمارتیں ہیں اور یہ اپنے والدین کے اکلوتے ہیں۔ میرا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔"

پال نے ٹوٹے ہوئے دل سے کہا۔

"آجکل کے راجاؤں اور پرنس لوگوں سے تو آپ بہت زیادہ خوش نصیب ہیں۔ ہمارے لئے تو اب محض نام کے ہی رہ گئے ہیں۔"

اتنے میں ایک نوجوان جسکی نظریں کسی کو بے چینی کے ساتھ تلاش کر رہی تھیں۔ پال پر پڑیں۔ وہ میز کی طرف بڑھا۔ اس کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور سو سو کے دس نوٹ پال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجئے ایک ہزار گن لیجئے۔"

پال نے بڑی لاپروائی کے ساتھ کیساتھ نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"گننے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں ہر انسان کی نیت و فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"مسٹر راکیش آپ کے پاس اپنی کار تو ضرور ہوگی۔"

"جی ہاں باہر کھڑی ہے۔"

"تو پھر چلئے ——— مجھے امید ہے کہ آپ لوگ برا نہیں مانیں گے کیونکہ کام پہلے ہونا چاہئے۔ مسٹر سرلیش میں آپ سے پھر کبھی ملوں گا۔"

پال چلا گیا اور اس کی دولت کے بارے میں سرلیش کے ذہن میں کئی شکوک پیدا ہو گئے۔ اس نے کشور سے کہا

"مجھے لگتا ہے پال ضرور اسمگلنگ کرتا ہے۔"

"دیکھو سرلیش خدا کی باتیں خدا جانے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ آج رات کا کیا پروگرام ہے؟"

"آج کی رات میری زندگی کی پہلی ڈراؤنی رات ہو گی"

"یعنی دونوں جیبیں بالکل خالی ہیں۔"

"ہاں۔ آج میرا ہاتھ کہیں سیدھا نہیں پڑا۔ لیکن تمہاری جیب میں کتنا مال ہے؟"

"یہی کوئی تیس چالیس روپے ہوں گے۔"

"تیس چالیس روپوں سے کیا خاک ہو گا۔ رات کو رنگین و پر کیف بنانے کے لئے کم از کم دو سو روپوں کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر ———؟"

سرلیش نے اپنی چمکتی ہوئی گھڑی اتار کر کشور کو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو چار سو روپے کی گھڑی ہے۔ اسے کسی کے پاس دو سو میں گروی رکھ کر شراب اور شباب کا بندوبست کرو۔"

کشور نے فوراً نگرانی جیب میں ڈالی اور باہر نکل گیا۔

رات جوان ہو چکی تھی ساری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور سرلیش شراب کے نشے میں چور ایک نوخیز جوانی کے ساتھ اپنا دل بہلا کر گھر واپس لوٹ رہا تھا۔

اپنی کوٹھی کے گیٹ پر پہونچتے ہی سرلیش کے کانوں سے رونے کی آوازیں ٹکرائیں۔ ایک لمحے کے لئے اُس کا نشہ اتر گیا۔ وہ فوراً ٹیکسی سے اتر کر کوٹھی کے اندر داخل ہوا۔ بڑے کمرے میں تمام رشتہ دار نوکر چاکر اور پڑوسی سر جھکائے آنسو بہا رہے تھے۔ سُرلیش کی ماں دہاڑیں مار مار کر اپنا سر پیٹ رہی تھی۔ چھوٹی بہن چاچا کے سینے سے لگی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ چاچا کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے سامنے سیٹھ مرلی دھر کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ سیٹھ مرلی دھر موٹر کے حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔

باپ کی لاش دیکھ کر سرلیش کے اوسان خطا ہو گئے اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈنے لگا وہ دیوانہ وار ماں کے سینے سے لپٹ گیا اور پاگلوں کی طرح رونے لگا۔ ماں نے اپنے بچے کو سینے سے لپٹا لیا اور بین کرنے لگی۔

کچھ دنوں تک اس حادثے نے سرلیش کو بہت زیادہ غمزدہ اور ملول رکھا لیکن وقت کے ساتھ زخم بھرنے لگا اور کچھ دنوں بعد وہ وہ سب کچھ بھول گیا

پال سے اس کے مراسم کافی استوار ہو چکے تھے پال بھی رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ لہٰذا دونوں ایک ہی کشتی کے مسافر تھے لیکن آج تک سرلیش پال کے کاروبار کے بارے میں کچھ نہ جان سکا تھا۔ کئی مرتبہ سرلیش نے پال سے شراب کے نشے میں اس کے کام کاج کے بارے میں پوچھا بھی تھا لیکن پال ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ تلاش کر موضوع کا رُخ بدل دیتا اور سرلیش کو ہمیشہ مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا۔

آج پال نے تاج محل ہوٹل میں سرلیش سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن کسی وجہ سے پال کو دیر ہو گئی۔ کافی چہل پہل تھی۔ بمبئی کی نامی گرامی ہستیاں خوشنما لباسوں میں ملبوس لندن کی مشہور و معروف رقاصہ ریٹا اینجل کا ڈانس دیکھنے کے لئے آئی تھیں۔ آج پہلی مرتبہ مس ریٹا اینجل ہندوستان میں اپنا رقص پیش کر رہی تھی۔

دفعتاً چاروں جانب سے روشنیاں گل کرا دی گئیں۔ قمقمے بے جان ہو گئے اور لوگوں کی نظریں ریٹا کو ڈھونڈنے لگیں۔

ساز گونجنے لگے اور موسیقی فضا میں بلند ہونے لگی اور ریٹا کونے کے دروازے سے ہال میں داخل ہوئی کئی بے چین نگاہیں ریٹا کے نیم برہنہ جسم کو چھونے لگیں رقص شروع ہوا سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ ریٹا مدہوش ہو کر ناچنے لگی۔ رقص۔ تالیاں۔ رقص۔ برہنہ نگاہیں۔ نیم برہنہ جسم۔

روشنیاں جلا دی گئیں اور قمقموں میں ایک نئی پھر جان آ گئی۔ پال سرلیش کے ساتھ بیٹھا تالیاں بجا رہا تھا۔

"تم کب آئے پال" سرلیش نے تعجب سے پوچھا۔

"میں نے تمہیں ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اُس وقت میں کاؤنٹر پر کھڑا ایک ضروری ٹیلی فون کر رہا تھا۔"

پال کو پریشان دیکھ کر سرلیش نے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا آخر۔۔۔۔ آخر ان لوگوں کو میرے بارے میں کیسے پتہ چل گیا۔"

"کن لوگوں کو"

"پولیس۔۔۔۔۔ نہیں نہیں میرا مطلب ہے اگر یہاں سے چلیں۔" پال کے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

"مگر جانا کہاں ہے"

"سرلیش بابو زخم بہت گہرے ہو چکے ہیں۔ یہ الزام۔۔۔۔ میرا مطلب ہے یہ داغ میرے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔"

سرلیش کا شک یقین میں تبدیل ہو رہا تھا اسلئے مزید حالات جاننے کیلئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"آخر صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کیا ماجرا ہے۔ دوست کے آگے پہیلیاں کیوں ڈال رہے ہو۔"

"تم اٹھو تو سہی۔ اب تو صرف شراب ہی میرے ذہن کی پریشانی کو دور کر کے مجھے سکون بخش سکتی ہے۔"

پال زبردستی سرلیش کو اٹھا کر ہوٹل کے باہر لے آیا وہ آج پہلی مرتبہ سرلیش کو اپنے گھر لے جا رہا تھا پال کا فلیٹ آ گیا۔ دروازہ کھلا۔ دونوں اندر داخل ہوتے ہی پال سرلیش کو بٹھا کر خود دوسرے کمرے میں شراب کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ پال کا خوبصورت گھر بیش قیمت چیزوں سے آراستہ تھا کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر سرلیش پال کے ذوق کی دل ہی دل میں داد دینے لگا۔

اتنے میں پال اور اس کے ہمراہ ایک خوبصورت سڈول جسم کی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ لڑکی کو دیکھتے ہی سرلیش فوراً سکتے کے عالم میں آ گیا اور اُسکا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پال نے اس لڑکی سے تعارف کراتے ہوئے سرلیش سے کہا۔

"سرلیش یہ ہے میری بیوی نرملا اور تمہاری بھابی ہے"

سرلیش کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی کی رہ گئیں اور وہ حیرت و استعجاب سے لڑکی کے چہرے کو گھورتا رہ گیا۔

ریچھوں کی ایک ٹولی جنگل میں گھوم رہی تھی اچانک ایک کاروان کے سامنے آکر رکی جسمیں آٹھ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ بوڑھے ریچھ نے کار کی طرف بغور دیکھا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"۸ آدمیوں کو ایک ڈبے میں بند کر دینا انتہائی غیر انسانی حرکت ہے۔"

مُظفر حنفی

بجیا تم کیوں روتی ہو؟

چنانچہ پورا بیاہ جس کا ذمہ تھا۔

علی بابا گھبرا کر ہار گئے۔ مولانا آزاد کی تقریر بھی منہ دیکھنے والی دھمکی بھی کارگر نہ ہوئی آپا نے جو فیصلہ کر لیا تھا اس سے ٹس سے مس نہ ہوئیں ان دنوں گھر میں آئے دن ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔

"بی بی ۔۔۔!"

"اے ہے ۔ کچھ کہو گی بھی ۔۔؟"

"میں کہتی ہوں۔ بی بی! تم یہ تو سوچو یہ بجیا کی زندگی بھر کا سوال ہے۔" جمال میاں جیسا ایسے کہاں سے مل سکتے ہیں جو ۔۔۔۔"

"اے بی بی! اب بس کرو۔" آپا فوراً بھڑک اٹھیں۔ "تم صبح ہی دبلی کیوں ہوئی جاتی ہو شہر کے اندیشے میں۔ لڑکی میری ہے۔ مجھے تم سے زیادہ اس کی بہتری کی فکر ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں تم لوگوں کی چالیں۔ چاہتے ہیں کسی طرح یہ شادی کا نہ ہونے پائے۔ لڑکا اچھا ہے تو رہا ہے تو اب یہ شادی تو ہو کر رہیگی۔"

"لیکن میری بھی تو سنو۔"

"تاریخ بھی بہن! اس معاملے میں کسی کی نہیں سننے کی میں۔ بھلا تمہیں کیا سوجھی۔ تین سال سے تم سے کسی بھلے گھر کے لڑکے کے لئے کوشش کرنے کو کہتی تھی اس وقت تو کسی کے کان پر جوں نہ رینگی اور اب جو ایک اچھے گھر سے پیغام آیا ہے تو سب کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگے۔"

"اے بہن! مجھے کیا کرنا ہے۔" سعدیہ بہن کو بھی تاؤ آگیا" میں نے سوچا تم کو بعد میں کہو گی کہ کسی نے بتایا نہیں سو آج اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب تم جانو تمہارا کام جانے۔"

وہ اپنی شلوار سنبھالتی چل دیتیں۔

"ممانی سنتی ہو ۔۔؟"

"کیا ہے بھئی ۔۔؟"

"ممانی! سارے گاؤں میں اس بات کا چرچا ہے تم کو سوجھی کیا ہے؟"

اور آپا دوپٹے میں گوٹا ٹانکنا چھوڑ کر اپنا ماتھا ٹھونکنے لگتیں۔

"ہائے اللہ! میں کیا کروں! جسکو دیکھو بدشگونی کرتا چلا آرہا ہے۔ اے لوگو میں پوچھتی ہوں کیا کوئی مجھ سے زیادہ میری لڑکی کو چاہتا ہوگا؟ یا میں جان بوجھ کر اپنی لڑکی کو کنوئیں میں دھکیل دوں گی۔؟"

"بس تم اسی طرح بگڑنے لگتی ہو۔" شاکرہ باجی کہتیں۔ "ٹھنڈے دماغ سے سوچو کر اپنے لوگ منع کرتے ہیں اس سارے معاملے میں تو آخر کچھ تو بات ہوگی۔"

"ہاں ہاں میں سب سمجھتی ہوں۔" آپا کی آواز بتدریج بلند ہوتی جاتی۔ "ڈاکٹر سلیم کے گھرانے کو کون نہیں جانتا۔ خاصے سید ہیں۔ اپنے گھر کے کھاتے پیتے ہیں۔ یہی بات لوگوں کو زہر لگ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا گھاٹا ہو سکتا ہے۔؟ پڑھا لکھا ہے۔ فوج میں نوکر ہے۔ خدانخواستہ اگر کوئی جسمانی کمی ہوتا تو سرکار اندھی تھوڑی تھی کہ بھرتی کر لیتی۔ نوکری سے پہلے ڈاکٹری معائنہ ہوتا ہے۔ ہاں۔"

"بھئی ہم نے تو سب سے یہ یہی سنا ہے کہ لڑکا ٹھیک نہیں ہے۔"

"اے ہے! اس لڑکی کو کیسے سمجھاؤں؟ بیٹی آجکل اچھے لڑکے بہت کم ملتے ہیں۔ لڑکیوں کی بھرمار ہے اس لئے ایک اچھی جگہ رشتہ ہوتے ہوئے دیکھ کر سبھی کو جلن ہوتی ہے چاہتے ہیں کہ جھگڑا کر کسی طرح شادی رکوا دیں ۔۔ ابکے وہ دوبارہ گھر میں آئیں ان کو جواب نہ دیا تو یہی لوگ جگر آج لڑکے میں کیڑے نظر آتے ہیں کل کو شہد کی مکھیوں کی طرح لپکیں گے اپنی اپنی چھوکریاں لے کر۔۔"

اور ایک دن تو میری بھی شامت آگئی ۔۔

"آپا ۔۔!"

"یا خدا ۔۔" وہ پھر اپنا سر ٹھونکنے لگیں۔۔ "اس لڑکی کا جی کام میں نہیں لگتا۔ شادی کے دس دن رہ گئے ہیں سارا انتظام کرنا ہے اور اس سے اب تک ایک دسترخوان تیار نہیں کیا گیا۔ آپا آپا کر کے میرا دھیان الگ بٹاتی ہے۔"

"ٹانک تو رہی ہوں ستارے اس میں ۔" میں روہانسی ہو کر کہتی "تم تو چاہتی ہو منہ میں تالے لگائے بیٹھی رہوں۔"

"اے لو! یہ پگلی آنسو بہانے لگی۔ بول نا کیا کہتی ہے"۔ وہ کچھ پچھتاتیں۔

"یہ طرح طرح کی افواہیں کیسی سنائی پڑتی ہیں؟ لوگ کہتے ہیں جمال بھائی کے پاؤں میں رعشہ ہے!"

"اے چپ لڑکی! تیرے منہ میں خاک۔" اور اسی پر بس نہ کر کے وہ میری پیٹھ پر ایک دوہتڑ جما دیتیں اور میں اوئی اللہ کر کے رہ جاتی۔

پھر میں اور میری سہیلیاں بجیا کو سمجھانے کی کوشش کرتیں بجیا مجھ سے دو ہی سال بڑی تھیں اس لئے کوئی جھجک ایسی بات کرنے میں محسوس نہ ہوتی۔

"بجیا! بجیا! تم نے ہی کر دیا اچھا! جب وکیل پوچھے

آئیں ۔ "

اور بجیا سر جھکائے بڑے بڑے آنسو روئے جاتیں لوگ باگ جنہیں بجیا سے ایک معصوم و مظلوم لڑکی سے ہمدردی تھی، آپا کو سمجھا کر ہار گئے۔ لیکن وہاں تو دل میں یہی خیال گھر کر گیا تھا کہ حاسد لوگ نہیں چاہتے کہ ان کی لڑکی اتنے اچھے خاندان میں ہماری لڑکی جائے اسی لئے بہکاتے ہیں۔ خیر باتیں انہیں اپنے فیصلے کے جواز میں۔

"نا بہن! شریفوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ ایک بار ہاں کہدی سو کہدی۔"

کبھی کہتیں۔ "وہ تو لڑکے والے پہلے ہی کہتے تھے کہ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے کسی کی باتوں میں نہ آنا میں کانوں کی اتنی کچی نہیں ہوں۔ یہ شادی ہوگی۔ ہوگی ہوگی!"

اور ہمارے ابو میاں پردیس میں تھے۔ اپنی تجارت میں مشغول۔ کاروبار چھوڑ کر وہ لڑکی کی شادی جیسے حقیر مسئلے میں اپنا قیمتی وقت کیسے برباد کرتے؟ پھر ان کی وضعداری بھی تو کوئی چیز تھی۔ مثالیں دیتے تھے لوگ۔ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا لڑکی آپا کی ہے جو چاہیں کریں۔ فرض کی ادائیگی ضروری ہے۔ جوان جہیل لڑکی کو زیادہ دن بٹھائے رکھنا معیوب ہے۔ نکاح کے دن وہ بھی آجائیں گے!

اور اس طرح یہ گاڑی اس عمیق غار کی طرف بڑھتی رہی جس میں گرا کر بجیا کو سسکا سسکا کر زندہ رکھنا تھا۔

"میں نے اور میری سہیلیوں نے روتی بلکتی بجیا کے کان کھا ڈالے۔

"بجیا نہیں کر دینا اچھا!"

"شرم کی کیا بات ہے بجیا۔ تم کو ہماری قسم!"

"تم ذرا سی گردن پھر ہلا دینا ہم لوگ کہہ دیں گے بجیا کو منظور نہیں۔"

"یہ عمر بھر کا سودا ہے! بجیا! عمر بھر کا!"

اور بجیا کی سسکیاں اور بڑھ جاتیں اور ہمارے ننھے ننھے دل اور زور سے دھڑکنے لگتے۔ ہائے اللہ کیا ہوگا اب؟

چنانچہ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ نہدی بجیا اور ننھو چچا جب نکاح کے وقت بجیا کی منظوری لینے آئے تو انہوں نے سر ہلا دیا 'نہیں' میں نہیں۔ ہاں کہہ کر!

اور ہم سب سہیلیاں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ میراثنیں کاہے کو بیاہی بارسیں دردناک سے بین گاتی رہیں اور بجیا شہنائیوں کے غمناک سروں کے درمیان ڈولی میں سوار کر دی گئیں اور سب نے دروازوں اور جھروکوں سے جھانک جھانک کر دیکھا گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے دولہا کے پیر بری طرح ڈگمگا رہے تھے اور آپا نے چمکتی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ کہا۔

"میں نے پہلے ہی رمضان سے کہا تھا کہ نگوڑے جوتے چھوٹے پڑیں گے دولہا میاں کے پاؤں میں!"

اور اب تین سال بعد گھر میں میری شادی کے ہنگامے برپا ہوئے۔

بجیا حیران ہیں کہ کیا کریں؟ شادی کے چند ماہ بعد ہی وہ گھر واپس آگئیں تھیں۔ کبھی واپس نہ جانے کے لئے۔ ہمارے دولہا بھائی کے نہ صرف پیر ہی میں رعشہ تھا بلکہ دماغ بھی کچھ ڈھیلا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے شروع میں ان کے بھائی ڈاکٹر سلیم نے سفارش کر کے انہیں فوج میں بھرتی کروا دیا تھا شاید کسی افسر کے ویٹر تھے۔ ڈسچارج ہونے پر اُن کی اماں اور بھائی کو شادی کی فکر ہوئی چنانچہ جال بچھا اور بیچاری بجیا پھنسیں۔ پھر کرنا خدا کا کچھ ایسا ہوا کہ ڈاکٹر سلیم کی پہلی بیوی مر گئیں اور دوسری جگہ جہاں ان کی شادی ہوئی وہ محترمہ ایک ہی چالاک تھیں لہٰذا انہوں نے کان بھر بھر کر ڈاکٹر صاحب کو بھائی اور ماں سے الگ کر دیا۔ دولہا بھائی پیروں اور دماغ کی کمزوری کے باعث کسی کام کے نہ تھے۔ خرچ چلتا تو کیسے! دوسرے تیسرے مہینے ڈاکٹر صاحب کو رحم آتا تو کچھ دے دیتے جس میں رو رو کر گذر ہوتی۔ ایسے سرد ماحول میں نزلہ عضو ضعیف بجیا پر ہی گرا اور وہ میکے پہنچا دی گئیں۔

ابو میاں نے کہا۔ "ارے بھئی میں اپنی بیٹی کو عمر بھر کھلا پہنا سکتا ہوں۔"

"ابو میاں! کیا انسان صرف کھانے پہننے کے لئے پیدا ہوا ہے؟"

"ارے بوا! ہم نے صبر کیا! اللہ بڑا انصاف کرنے والا ہے۔"

آپا تم اب صبر کے سوا کر ہی کیا سکتی ہو؟ لیکن بجیا بیچاری کیا کریں؟

لیکن فی الحال تو بجیا کی حیرانی ان کی اپنی نہیں، میری وجہ سے ہے کل ہی انہوں نے مجھے کلیجے سے چمٹا کر اور رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔

"شمو آپا کو کیا ہو گیا ہے؟ اور شمو یہ ابو میاں نے کانوں میں تیل کیوں ڈال رکھا ہے؟"

"بجیا کچھ بتلاؤ تو میرا جی ہوتا ہے!"

"کچھ نہیں۔" وہ سسکیاں لیتی ہوئی مانجھے خانے سے باہر چلی گئی تھیں اور آج پھر صبح سے مانجھے خانے میں بیٹھی سسک رہی تھیں۔ میں جانتی ہوں ان کے دل کا چور۔ کتنا ظلم ہے کہ وہ مجھے چمٹا کر تسکین بھی نہیں دے سکتیں اپنے دل کو۔

اس بار آپا نے پچھلے تجربے سے سبق حاصل کرتے ہوئے تمام ہوش مندیاں کر لی ہیں۔ میرے لئے بر تلاش کرتے ہوئے انہوں نے وہ احتیاط برتی ہے اس کی بھنک میرے کانوں میں پڑ چکی ہے۔ انہوں نے خاص طور پر ایسا بر ڈھونڈا ہے جس کے پیر و ہاتھ میں رعشہ اور دماغ میں خلل نہ ہو، جو دولتمند ہو۔ جس کی دولت میں حصہ بٹانے کے لئے کوئی بھائی یا رشتہ دار نہ ہو۔ جس سے شادی کے بعد مجھے مائکے نہ بیٹھنا پڑے۔ جو مجھے لاڈ پیار سے رکھے۔

اور بجیا مجھ کو بھی بلک بلک کر رو رہی ہیں۔ مجھے ان کے رونے پر ہنسی آتی ہے بجیا تم کیوں روتی ہو؟ یقین رکھو

خطوط

وشوا ناتھ درد ——— نئی دہلی

"دوحیات" گزشتہ دو ڈھائی ماہ سے برابر مل رہا ہے۔ اور میں آپ کی اس عنایت کے لئے جہاں شکرگزار ہوں آپ کا، وہاں آپ سے نادم بھی ہوں۔ کیا کروں "تلاش" کے مستقبل کے بارے میں گزشتہ چار پانچ ماہ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اسے زندہ رکھا جائے یا پھر...! آخر اپنے ملک میں اُردو کے اچھے جریدہ کا زندہ رہنا کہاں تک ممکن ہے، اس کے بارے میں خود آپ کی بھی کچھ نہ کچھ رائے تو بن چکی ہوگی ——!

مدہوش بلگرامی ——— بمبئی

"دوحیات" کا آزادی نمبر جو آپ نے مہیندرا اینڈ مہیندرا کو ارسال کیا تھا، نظر سے گزرا۔ اور پڑھ کر خوشی ہوئی کہ بمبئی سے اتنا صاف ستھرا اور معیاری پرچہ نکلتا ہے۔ اس شمارے کی ساری غزلیں، نظمیں اور افسانے معیاری ہیں۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کریں۔

ڈاکٹر م۔ ا۔ قاضی ——— بمبئی

"دوحیات" ملا۔ یاد آوری کا شکریہ اُردو صحافت نگاری میں دوحیات یقیناً کامیابی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کرے دوحیات ہمیشہ سرسبز اور مقبولِ خاص و عام بنتا رہے۔

میں اس کی ترقی کا دل سے خواہاں ہوں۔

محمد امین جیراج پوری ——— بمبئی

دوحیات کا آزادی نمبر پڑھا، پرچہ قابلِ تعریف ہے۔ ظ۔ انصاری صاحب کا مضمون سفرنہرو کا ہے لیکن ظ صاحب نے اُسے اپنا لیا۔ ہندناتھ۔ سلمیٰ صدیقی۔ انور معظم۔ جیلانی بانو۔ یوسف ناظم کے طنزیے بہترین اور معیاری ہیں۔ نئے اور اچھے مزاح و طنز نگاروں سے متعارف کرانے کا شرف پرچہ حاصل کریگا۔

کچھ باتیں ناگفتنی ہیں چاہتا ہوں وہ بھی گوش گذار کر دوں۔ واجدہ تبسم کا افسانہ "چاندنی" کے ان جملوں پر غور کیجئے ——"اب جب بیٹی کی شادی ہونی پڑتی تو کون سی بات چھوٹی۔ پانچ سو کی اٹی کے پاس کون بساط تھی —— دس جس بھی محفل میں گئیں ——" دوم استاذالاساتذہ مولانا شہاب مالیرکوٹلوی اپنے مضمون میں افسانہ نگار کو پنجابیت کے نام پر غلط اُردو لکھنے کی چھوٹ دے رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ "جو اُردو لکھنو یا دہلی کے چند گھرانوں کی زبان خدا اُن گھرانوں کو مبارک کرے" ایسا لکھنا کیا غلط اُردو لکھنے کو مہمیز نہ کریگا ——؟

اب کی بار

اس شمارے میں دو نظمیں۔ دو مضامین اور ایک ترجمہ اور دو افسانے شامل ہیں۔ نظمیں جدید ذہن کی پیداوار ہوتے ہوئے بھی خبسی تشنگی سے دور اور مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ یہ جدید نظم کے لئے بہ فالِ نیک ہے۔ آج غزل میں ایک آدھ شعر بھی کام کا نکل آئے تو بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔ آج جدید نظم کے دریا میں ایسی نظمیں غزل کے شعر کے مترادف ہیں

ٹیکنیکل تعلیم پر مضمون بڑا اہم اور مفید ہے۔ یہ آئندہ دان طبقے کے نوجوانوں کو نئی منزل کا پتہ دیتا ہے اور کچھ ایسے راستے دکھاتا ہے جو اب تک اُنکی نظروں سے اوجھل تھے

کرپشن دنیا کے ہر ملک کے لئے ایک لعنت بنا ہوا ہے۔ ہم ہندوستانی بھی اس کے شکار ہیں اس مضمون کو وجہِ تسلی نہ بنایئے۔ بلکہ اس کے آئینے میں ہمارے اپنے کردار کی بھی جانچ کیجئے۔

"لال قلعہ" ایک تاریخی مضمون ہے۔ اس میں کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے ہم ناواقف ہونگے۔ یہ یقیناً دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

افسانوں میں ایک نام بالکل ہی نیا ہے افسانوی دنیا میں لیکن الجھو دانیال قطع نظر کیا عتبار سے بھی لیکن تفہیم میں نیا پن نہیں ہے اِن بات کہنے کا انداز ضرور تیکھا ہے۔ دوسرا نام جانا پہچانا ہے اور اس لحاظ سے افسانہ ٹھیک۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

۱۹۶۴ء کا امن کا نوبل پرائز حبشی لیڈر ڈاکٹر مارٹن لیوتھر کنگ کو ملا ہے۔ ڈاکٹر کنگ امریکی باشندے ہیں اور ان کی عمر ۳۵ سال ہے۔ ابتک امن کا نوبل پرائز پانے والوں میں وہ سب سے کم عمر ہیں۔

امریکی میں سیاہ فام لوگوں کی جدوجہد سے متعلق ان کی کتاب "ہم انتظار کیوں نہیں کرسکتے" Why we can't wait پچھلے ماہ لندن میں چھپی ہے۔

نوبل پرائز جو الفریڈ نوبل کی ۶۸ ویں برسی پر ۱۰ دسمبر کو اسٹاک ہوم میں دیا جائیگا ۲،۹۲،۵۰۰ روپیوں کا ہے۔

○

۱۹۶۴ء کا ادب کا نوبل پرائز فرانس کے مصنف جین پال سارترے کو دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے چند وجوہات کی بناء پر یہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔

○

مشہور امریکی اداکار اور مصنف ایڈی کینٹر کا انتقال ہو گیا۔ پچھلے چند سالوں سے وہ فلموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے اور اپنا تمام وقت لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔

○

اوسکر ولیمس مشہور امریکی شاعر کا ۶۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں اور anthologies ۲۰ لاکھ سے زیادہ تعداد میں فروخت ہوئیں۔

○

لندن میں مقیم ہندوستانی اور پاکستانی وہاں ایک اردو کانفرنس کے انعقاد کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کانفرنس ہفت روزہ ہوگی۔ جس میں سیمینار۔ سمپوزیم۔ مباحثے اور تقریریں ہوں گی۔ دو دن مقالے افسانے اور موسیقی کے ہوں گے۔ آخری دن مشاعرہ ہوگا جس میں پاکستان اور ہندوستان کے ۱۶ مقبول شاعروں کے علاوہ دوسرے ملکوں کے شاعر بھی شرکت کرینگے۔

○

بمبئی سے عنقریب دو اردو روزنامے نکل رہے ہیں جو فوٹو آفسیٹ پر شائع ہوں گے۔ ان کے نام "قومی جنگ" اور "الاخبار" ہیں۔

بجیا! تمہاری تھوڑا رونے اور سسکنے کے لئے پیدا نہیں ہوئی
بجیا یہ تو تمہاری اپنی کمزوری تھی۔ ایک بار سسرال کر ہاں
بٹنے کا خمیازہ تم اب تک رو رو بھگت رہی ہو اور شاید
عمر بھر بھگتو گی۔ لیکن میری طرف سے مطمئن رہو بجیا! بجیا!
بجیا چپ رہو بجیا تم نہ روؤ۔ میں تمہارے ان مقدس
اور مظلوم آنسوؤں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے رونا پسند نہیں
ہے۔

میری پیاری بجیا!
یقین رکھو جب نکاح خوانی کے وقت لوگ میری منظوری
لینے آئیں گے تو میں صرف سر ہلا کر نہیں کہہ دینے پر ہی اکتفا
نہیں کروں گی بلکہ سب کے سامنے صاف صاف کہہ دوں گی
کہ لوگو! مجھے اس دمہ کے مریض ساٹھ سالہ لکھ پتی سے
شادی کرنا منظور نہیں جس کے ساتھ میری سوتیلی ماں مجھے
مارنا چاہتی ہے!
ہنسو بجیا! ہنسو!
ہائے اللہ! بجیا تو اب بھی رو رہی ہیں!!!

—— ✦ ——

۴۸۹

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳

شمارہ ۳۰	یکم نومبر ۶۴ء	جلد ۳

اس شمارے میں

قیمت

ایک سال ـــ دس روپے

فی پرچہ ـــ ۲۰ پیسے

ایڈیٹر

قیصر مظفر حسین

ان دس دنوں میں

- یورپ کے اکثر کمیونسٹ ممالک میں مسٹر خروشچیف کی برطرفی کی وجہ سے جو غم و غصہ پایا جا رہا ہے اس کے تحت روس میں مسٹر خروشچیف کو بدنام کرنے کی مہم کو روک دی گئی ہے
- امریکہ کے سابق ریپبلکن صدر مسٹر ہربرٹ ہوور کا انتقال ہوگیا۔ وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۳ء تک امریکہ کے صدر رہے۔
- ہندوستان اور آسٹریلیا کے درمیان تیسرا ٹسٹ جو کلکتے میں کھیلا جا رہا تھا بارش کی وجہ سے اختتام کو نہ پہنچ سکا۔
- ہندوستان نے ہاکی کا اولمپک فائنل جیت لیا مقابلہ پاکستان سے تھا۔
- صدر رادھا کرشنن نے کہا ہے کہ چین کو اقوام متحدہ کا ممبر قبول کر لیا جائے۔
- شمالی رہوڈیشیا برطانیہ کی ۷۰ سالہ غلامی سے آزاد ہوگیا۔ نئی جمہوریت جمہوریہ زیمبیا کے نام سے قائم ہوئی ہے۔
- ٹوکیو میں اولمپک کھیلوں کے مقابلے ختم ہوگئے۔
- ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بنگلور ہندوستان کا مہنگا ترین شہر ہے۔ بنگلور کے بعد مدراس۔ بمبئی۔ حیدرآباد۔ دہلی اور کانپور بالترتیب مہنگے شہر ہیں۔
- جاپان کے وزیر اعظم مسٹر ہیڈو اکیڈا خرابیٔ صحت کی وجہ سے مستعفی ہوگئے۔
- مدراس کے ڈاکٹر چیرین بمبئی کے گورنر مقرر کئے گئے ہیں۔
- اڑیسہ میں طلباء نے پھر ہنگامے شروع کر دئے۔
- کانگریس کے ایک پُرخلوص خادم اور سابق ریاست بمبئی کے وزیر فنانس مسٹر وی۔ ایل۔ مہتا کا انتقال ہوگیا۔
- مسٹر داسپا وزیر صنعت حکومت ہند کا انتقال ہوگیا۔
- کمپنیوں کی عدالت نے ٹائمز آف انڈیا کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے ڈاکٹر آر سی کوپر کو بورڈ آف ڈائرکٹرز کا چیرمین مقرر کیا ہے۔ حکومت ہند نے ٹائمز آف انڈیا میں انتظامی اور مالی بے ضابطگیوں کے خلاف عدالت میں درخواست پیش کی تھی۔
- ہندوستان اور سیلون کے درمیان سیلون میں مقیم "بے وطن" ہندوستانیوں کی قومیت کے بارے میں فیصلہ ہوگیا۔ یہ فیصلہ ۲۵ سال کی لیت و لعل کے بعد ہوا ہے۔
- مسٹر شاستری نے کہا ہے کہ چین کا ایٹم بم بنا کر ایشیا کو ڈرانا ایک بیکار حرکت ہے۔

شاد عارفی
غزل

ابھی تو موسمِ ناخوشگوار آئے گا — پھر اس کے بعد پیامِ بہار آئے گا

خلوصِ عہدِ وفا سازگار آئے گا — کبھی تو "مرحلۂ اعتبار" آئے گا

جس انجمن میں دلوں کے قرار لٹتے ہیں — اُس انجمن میں پہونچکر قرار آئے گا

"لبِ شگفتہ و غنچے پاش پر" شگوفوں پر — کروگے غور جہاں تک نکھار آئے گا

"یہی ہے بزمِ طرب آفریں" ... تو جاتا ہوں — یہ چارہ گر نے کہا تھا۔ "قرار آئے گا"

"سوالِ بیش و کمِ مے" نہیں ... مگر ساقی — کبھی تجھے بھی "شعورِ شمار" ... آئے گا

پکارنے پہ جب آیا تو تیرا دیوانہ — کسی بھی نام سے ... تجھکو پکار آئے گا

"نثارِ حسنِ محبت رہی ہے" ۔ دیکھو گے — کلی کے ساتھ ہی شاخوں پہ خار آئے گا

جو ہے مزاجِ بہارِ چمن سے ناواقف — برائے سیرِ چمن۔ بار بار آئے گا

جنھیں قیاس و شواہد سے واسطہ ہے انھیں — یقینِ گردشِ لیل و نہار آئے گا

"یہ پختہ کارِ تغزل" ۔ "خیال کے بل پر"
"غزل کے ۔ شہر ۔" "قفس میں" گزار آئے گا

ظ ۔ انصاری

جان پہچان

ریڈیو صاحب

بھئی، ارے ملاقات ہوئی آپ کی؟ ان کا نام تو اب یاد نہیں آتا کہ ماں باپ نے کیا رکھا تھا اور خود انہوں نے کیا نام تجویز کیا ہوگا لیکن لوگوں کی زبان پر ان کا ایک نام چڑھ گیا ہے۔ آئیے ریڈیو صاحب۔

جدھر سے گزریں گے آواز پڑے گی! ارے جناب' ریڈیو صاحب، کدھر چلے، بھئی۔ ایسے نہیں جا سکتے۔ دو باتیں ہم سے بھی کرتے جائیے۔ بازار سے اگر یہ لپکتے ہوئے گزریں تو دوکاندار انہیں دیکھتے ہی اپنے تھڑے پر آجاتے ہیں۔" تو ریڈیو صاحب۔ کوئی تازہ (Announcement) ادھر بھی سناتے جائیے۔"

ہاں جو دوکاندار اپنے گاہکوں میں الجھے ہوئے ہوں وہ ریڈیو صاحب سے نظر چار کرتے کتراتے ہیں ایسا نہ ہو علیک سلیک کے بہانے اندر گھس آئیں اور بیچ گھماتے ہی تازہ سماچار سنانا شروع کر دیں۔

ریڈیو صاحب جیسا نام اچھا ہے، ویسے ہی یہ خود بھی بڑے اچھے اور نایاب آدمی ہیں۔ ممکن ہے جب ملک سے بے روزگاری بالکل ختم ہو جائے یا اگر کبھی ہنگامی ضرورت کے وقت ہٹے کٹے بے مصرف آدمیوں کو جنگ میں بھرتی کیا جانے لگے تو ریڈیو صاحب اپنا جانشین مقرر کئے بغیر سدھار جائیں اور ہم ڈھونڈتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا۔

ریڈیو صاحب کیا کرتے ہیں، کہاں پیٹ بھرتے ہیں' کہاں سے سگریٹوں پر سگریٹیں پھونکتے ہیں، کہاں سے آسمان پھاڑ کر پیوند لگاتے ہیں اور سوٹ بنواتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ہر روز کوئی نہ کوئی واردات ایسی ہو جاتی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی لیکن ریڈیو صاحب اس کی تہہ کو پہنچ جاتے ہیں اور بازار کے اس سرے سے اُس سرے تک، ایک چکر ریڈیو صاحب نے لگایا نہیں کہ سارے شہر میں بس وہی افواہ دوسری صبح تک چکر لگاتی رہتی ہے۔

"ارے میاں، تم نے سنا، وہ جو کلن خاں تھے نا اپنے ارے وہی جو ایک بار اسمبلی کی ممبری کے لئے اٹھے تھے۔ وہ سٹے میں ۲۰ ہزار ہار گئے۔ عدالت سے دیوالیہ کا سرٹیفکٹ لینے والے ہیں — مگر صاحب، جواب نہیں ہے رائے بہادر دُرگا داس کا۔ بیٹے کا رشتہ جے پور کے ایسے گھرانے میں کر رہے ہیں کہ ایک ہی ہاتھ میں وارے کے نیارے ہو جائیں گے۔

رات ہز ہائی نس سر آغا خاں کا تار آیا تھا کلو سنار کے ہاں۔ اسے ہوائی جہاز سے روم بلایا ہے موتیوں کے ہار کا ایک خاص ڈیزائن تیار کرانے کے لئے۔

ارے میاں، یہ کیا کتابیں بیچ رہے ہو فضول فضول اسمیں کیا رکھا ہے اشرفیاں رولنا چاہو تو جاؤ تم بھی بھشتیوں کے احاطے میں کوئی پرانا مکان لے لو۔

ریڈیو صاحب، بس اتنا کہیں گے اور آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں گے کہ اب پوچھیے، کیا پوچھتے ہو؟ آپ پوچھیں گے، پرانا مکان کیوں لے لیں ریڈیو صاحب۔ آخر اتہ پتہ تو دیجئے۔ بس یہ سنتے ہی ریڈیو صاحب کی باچھیں کھل جائیں گی۔ کیونکہ آپ نے اپنی ذات کے لئے ایک طرح سے اُن کی اہمیت تسلیم تو کر لی۔ اور اب وہ شروع ہو جائیں گے۔

میاں یوسف صاحب۔ تم ہو کہاں، نسبت کی بھی خبر ہے؟ جو بھشتیوں کے احاطے میں مولانا عبدالقدوس نے پرانا گھر کرائے پر لیا تھا۔ بارش میں اس کا ایک در بیٹھ گیا۔ تم جانتے ہو کیا ہوا پھر؟ در گر جانے سے چھت کے قریب ایک سوراخ سا نظر آیا تھا جس میں سے کوئی چیز چمک رہی تھی مولانا نے اس پر اپنی لاٹھی ماری تو اندر سے چھناکا ہوا، اب جو اینٹیں نکال کر دیکھتے ہیں تو اشرفیوں سے بھری ہوئی دیگ تھی۔

اسے کہتے ہیں کہ خدا جسے دیتا ہے چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ انھوں نے اشرفیاں پگھلا کر سونا بنا لیا کوئی ڈیڑھ من سونا ہوا۔ ذرا سوچو تو کس نے سینت کر رکھا ہوگا اور کون ابھی تک اٹھائے گا اس سے۔

سنا ہے، مولانا اس خبر کو سرکار سے بھی چھپائے بیٹھے ہیں مگر ہمیں کیا پڑی ہے ان کی دولت ہے جو چاہیں کریں۔ سننے میں آیا ہے اگلے سال پارلیمنٹ کے الکشن کے لئے بھی کھڑے ہوں گے اور ابھی سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ خوب مرغ اڑائے جا رہے ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔

اتنا کہہ کر ریڈیو صاحب اگلا قدم بڑھا دیں گے، اچھا بھئی چلے یوسف صاحب۔ ذرا کام ہے۔

حالانکہ ریڈیو صاحب کو اس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا کہ ایسی خبر کو ذرا دوسرا رنگ دے کر دس بیس آدمیوں کو شام تک سنا ڈالیں۔ اگر آپ تجربہ کار آدمی نہیں ہیں تو ریڈیو صاحب کے لفظوں پر یقین کر کے فوراً بھشتیوں کے احاطے میں مولانا عبدالغفور یا عبدالقدوس کی تلاش شروع کر دیں گے۔ اور کئی دن کی تحقیق کے بعد پتہ چلے گا کہ اس نام کے کوئی بزرگ اس محلے میں نہ تو کبھی تھے نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔

ریڈیو صاحب بڑے آدمی نہیں ہیں۔ اچھے خاصے بھلے مانس ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں کیپسٹن کا سگریٹ پیتے ہیں۔ پیتے کیا ہیں، سگریٹ سے سگریٹ جلاتے ہیں۔ دو چار زبانیں ایک ساتھ بول جاتے ہیں۔ اور اشعار تو اتنے یاد ہیں کہ بس۔

بات بات پر ایک مزے کا جملہ - اور دو ایک شعر شعر وہ سنائیں گے یہ کام آپ کا ہے کہ موقعہ محل کے مطابق ان سے کوئی معنی نکالنے میں کامیاب ہو جائیں۔ کل شام کسی نے انہوں نے خیریت پوچھی وہ بولا - اب تو حال اچھا ہے، بس ریڈیو صاحب نے فوراً سوئچ گھمایا اور میڈیم ویو ——— پر بولے

ہاں بھئی۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

سننے والے نے غضب کیا کہ بیمار کے لفظ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے کہیں اتنا کہہ دیا ریڈیو صاحب۔ بیمار تو نہیں ہوں مگر رات بڑوس میں قوالی ہو رہی تھی سو نہیں سکا۔ صبح سے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اتنا کہنا تھا کہ ریڈیو صاحب کی نوک زبان پر دوسرا شعر آپہنچا

نزلہ بھی ہے، زکام بھی ہے درد سر بھی ہے
جاناں ہمارے حال کی تم کو خبر بھی ہے؟

وہ بیچارہ سیٹا گیا، اور سوچنے لگا کہ اس شعر کا بھلا کیا موقعہ تھا، ٹالنے کو اس نے کہیں یہ کہہ دیا، نہیں نزلہ زکام کی شکایت نہیں ہے، یوں ہی معمولی سا درد سر ہے جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ریڈیو صاحب نے پھر کہا ــــ

درد سر کے واسطے صندل بتلاتے ہیں طبیب
اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے

وہ غریب بولانے پچھتایا۔ ابھی اس شعر کو گھسنے اور لگانے میں معروف تھا کہ ریڈیو صاحب آگے بڑھ کر تازہ ترین گرما گرم خبریں سنانے لگے۔ دن کے ۲ بجے کا وقت اور شام کو ۸ بجے کے بعد سے رات گئے تک ریڈیو صاحب کے خاص پروگرام ہوتے ہیں کسی نے چھیڑنے کو کہا:

"ریڈیو صاحب - آپ نے یہ دونوں وقت اپنے خاص پروگرام کے لئے کیا کسی خاص مصلحت سے رکھے ہیں؟"

انہوں نے نہایت بے تکلفی سے جواب دیا "میاں کیا خاص، کیا عام اصل بات یہ ہے کہ میں صحت کا ذرا خیال رکھتا ہوں۔ کھانے کے بعد فوراً کوئی محنت کا کام کرنا ہو یا سو جانا ہو مناسب نہیں ہے سوچ سمجھا ہوں کہ کیوں نہ بازار کا ایک چکر لگاؤں ممکن ہے کہ کسی کو ضرورت آپڑی ہو اس کا کام مجھ سے نکل جائے۔ میں تو خلق خدا کا بھلا چاہتا ہوں اور پھر یہ بھی ہے اس گھنٹے دو گھنٹے میں میرا کھانا بھی ہضم ہو جاتا ہے۔

ریڈیو صاحب کا تو کھانا ہضم ہوا لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کا کھانا ریڈیو صاحب بد ہضم ہو جاتا ہے مثلاً اگر ریڈیو صاحب ذرا دس منٹ پہلے کھانا کھا کر باہر نکل آئے اور کسی کو تازہ بتازہ خبر سنانی شروع کردی، "سنا بھئی، تم نے جو برما کی حکومت کے بلاوے کا اعلان کرتے پھر رہے ہو وہ سب جھوٹ ہے۔ انہیں برما کی حکومت تو کیا سوویٹ والے بھی نہیں بلا رہے ہیں وہ تو ان کا محض پروپیگنڈا ہے میں نے سب پتہ چلا یا ہے دراصل وہ اس بہانے یوپی کا زیور بیچ کر ذرا عیش اڑانے باہر کے ملکوں میں چاند کی سورج رہے ہیں؟"

اب آپ کی جو شامت آئی تو آپ نے اتنا کہہ دیا: "نہیں نہیں۔ میں نے تو اخبار میں خود پڑھا تھا کہ برما کی حکومت کا دعوت نامہ ان کے نام خاص طور سے آیا تھا،" بس اب کیا ہے - پہلے وہ اُن صاحب کی سوانح عمری سنائیں گے - پھر اخباروں کی اندرونی مصلحتوں کا پورا چارٹ پیش کرینگے - اور دعوت ناموں کی قسمیں اور ان کی الگ الگ نوعیتیں بتائیں گے۔ پھر برما کا جغرافیہ پھر ریل کا سمندری جہاز اور ہوائی جہاز کے سفر کی تفصیلات پھر ان صاحب کی جھوٹی خبر کی اصلیت - اور آپ تلملاتے رہ گئے۔ بار بار گھڑی دیکھیں گے۔ اب ۳ بجے اب چار بجے - اب پورے پانچ بجکر دس منٹ ہو گئے چلئے۔ چھٹی ہوئی دوپہر کا کھانا ملا گیا - اب آپ اکھٹا رات کو ہی دونوں وقت کا کھانا کھائیے گا بشرطیکہ ریڈیو صاحب کے خاص پروگرام میں نہ پھنس گئے کیونکہ یہ پروگرام وقت کی قید سے ہمیشہ آزاد ہوتا ہے

~~~

ممتاز راشد اجمیری

غزل

پھول سا کومل جسم تھا اسکا چاند سا روشن چہرہ تھا
یاد کریں اور رو دیں ہیں ہم کو اک شخص نے چاہا تھا

زخموں کی دوکاں سجا کر نگری نگری گھومے ہیں
وہ سوداگر نہیں ملا ہم نے دل جس کو بیچا تھا

کیسے گہر تھے جنکی شہرت گلشن گلشن پھیل گئی
اشک جہاں ٹپکے تھے یارو وہ تو جلتا صحرا تھا

کونے تباں سے اپنی صدا ناکام نہیں واپس آئی
ہر کھڑکی میں پھول کھلے تھے۔ ہر دروازہ مہکا تھا
~~~

رابندر ناتھ ٹیگور
سید ناصر بغدادی

بادشاہ کی کہانی

کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔

جب ہم بچے تھے تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ پریوں کی کہانی میں بادشاہ کون تھا اور نہ ہی اس میں کچھ مضائقہ تھا کہ وہ شلادتیا کہلاتا ہے یا شلیمان! اس کا وطن مالوف کاشی ہے یا کناوج! وہ بات جو ایک سات سالہ بچے کے ننھے دل کو دھڑکانے اور مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہوتی تھی وہ تو صرف یہی تھی۔

کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا!"

مگر اس دور جدید کے سامعین میں یہ بات منقلب ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کہانی کی اٹھان اور ابتدا اس طرح ہو رہی ہے تو وہ بے اختیار ناقدین کی صف میں آجاتے ہیں اور یہ پیچ اور تجسس سوالوں کی بوچھار کر دیتے ہیں۔ ایسے سوالات جن میں حقیقت معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔

"کون سا بادشاہ تھا؟"

اور اس پر داستان گو کو بے اختیار محتاط اور چوکنا ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سننے والوں کے تجسس اور خواہش کو تسکین دینے کے لئے اس کو ہر بات کی گتھی سلجھانا ہی پڑے گی۔ اور وہ بجائے کہانی کو اس طرح شروع کرنے کے بالکل نئے طریقے سے اس کی ابتدا کرتا ہے۔

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا جس کا نام اجاتا ساترو تھا"

ظاہر ہے سامع کی تجسس طبیعت صرف اس سے سکون حاصل نہیں کر سکتی وہ اپنی عینک کو درست کرتے ہوئے پوچھتا ہے۔

"کون سے اجاتا ساترو کی بات کر رہے ہو؟"

داستان گو سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہے۔

"اسکول کے ہر بچے کو معلوم ہے کہ تین اجاتا ساترو گزرے ہیں جن میں سے پہلا بیسویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا تھا اور صرف دو سال آٹھ مہینے زندہ رہ کر مر گیا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہے کہ معتبر ذرائع سے بھی یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ اس کے دور حکومت کی مدت کیا تھی؟ دوسرے اجاتا ساترو سے مورخین کما حقہٗ واقف ہیں۔ اگر تم تاریخ کی نئی انسکلو پیڈیا سے استفادہ کرو گے تو ....."

اس پر موجودہ دور کے سننے والے کے وہ شکوک وشبہات تحلیل ہو جاتے ہیں جو اس نے داستان گو کی ذات سے وابستہ کر رکھے تھے۔ وہ آپ ہی آپ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کو داستان گو کی باتوں پر اعتبار کرنا چاہیئے اور خود سے کہتا ہے کہ یقیناً داستان گو کی کہانی حقیقی، اصلاحی اور تعمیری بنیاد پر قائم ہے۔ وہ راست بازہے۔"

انگریزی میں ایک مقولہ ہے

"مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔ میں تم کو حقیقت سے آگاہ کر دوں گا۔"

ایک سات سالہ بچہ جو بڑے ذوق وشوق اور دلچسپی سے پریوں کی کہانیاں سنتا ہے۔ اس مقولے سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ابھرے ہوئے سوالات کا گھونٹ دیتا ہے اور کہانی سننے کے دوران خاموش ہی رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا صاف اور خوبصورت جھوٹ کسی بچے کی طرح عریاں اور معصوم ہوتا ہے۔ وہ سچائی کی طرح دیکھا جا سکتا ہے مگر اس دور حاضرہ کے لاجواب جھوٹ کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کو بحث وتحمیص کے ذریعہ سچ ثابت کیا جاتا ہے۔

جب ہم نوعمر اور کمسن تھے تو ہمیں اچھی اور پیاری چیزوں سے بخوبی آگاہی تھی۔ ہم اچھی طرح پہچان سکتے تھے کہ کونسی کہانی حقیقت پر مبنی ہے۔ ہم نے کبھی تنقید سے کام نہیں لیا تھا۔ ہمیں تو صرف سچائی سے واسطہ تھا اور ہمارے نازک دھڑکتے دلوں کو علم تھا کہ حقیقت کا محل کدھر ہے اور ہم کس طرح وہاں پہنچ سکتے ہیں اور اب سچائی کو ثابت کرنے کے لئے ہم بے شمار صفحات سیاہ کر دیتے ہیں جب کہ حقیقت صرف اتنی ہے۔

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا"

مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے جب کلکتہ میں پریوں کی کہانی شروع ہوئی تھی۔ اس وقت بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر بارش اس طرح ہوتی رہی تو سارا شہر سیلاب کی نذر ہو جائے گا ہمارے گھر کے سامنے گھٹنوں گھٹنوں پانی بھر گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں ایک انجانی امید کی لہر کروٹ بدل رہی تھی۔ میرے دل میں ایک یقین پیدا ہو گیا تھا کہ آج میرا استاد نہیں آسکے گا۔ اور میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا۔ مجھے اس وقت اپنے گھر کے سامنے بہتے ہوئے پانی کا منظر بے حد دلفریب اور دیدہ زیب معلوم ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی پانی کی شدت کم ہونے لگتی تو میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگتا اور میں سوچتا کہ اگر بارش تھم گئی تو یقیناً مجھے پھر پرانی مصیبت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور میں آپ ہی آپ دعائیں مانگنے لگتا۔

"اسے میرے بھگوان! ساڑھے سات بجے تک زوروں سے بارش ہوتی رہے"

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک بے بس اور مجبور لڑکے کو صرف بارش ہی اذیت سے بچا سکتی ہے۔ اس آفت سے بچنے کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا۔

لیکن افسوس! میری دعا قبول نہ ہو سکی۔

حسب معمول اپنے وقت پر میں نے استاد کو چھتری لئے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس وقت میری کیا حالت ہوئی! وہ ناقابل بیان ہے۔ امید کے سارے دیئے ایک ہی لمحے میں میرے سینے کے طاق میں بجھ کر رہ گئے۔ میرا دل بیٹھ سا گیا۔ غم کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آ گیا۔ میں نے سوچا کیا ہی اچھا ہو اگر اگلے جنم میں میں استاد ہو جاؤں اور یہ استاد میرا شاگرد! پھر تو میں گن گن کر اس سے بدلے لوں، وہ پٹائی کروں کہ جناب کی طبیعت ہی ہری ہو جائے!

جوں ہی میں نے اس کو دیکھا پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا اپنی ماں کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس سمے میری ماں اور دادی آمنے سامنے بیٹھی تاش کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہی تھیں چونکہ بارش اور بادل کی وجہ سے سرشام ہی فضا پر اندھیروں کی چادر پھیل گئی تھی۔ اسلئے کمرے میں لیمپ روشن ہو گیا تھا۔ میں کمرے میں پہنچکر بے ساختہ اماں کے برابر بستر پر سر ٹیک گیا۔

"ماتا جی! ماتا جی! استاد آ گئے۔ ایسے وقت میں جبکہ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے اب آپ ہی بتلایئے میں کس طرح پڑھ سکتا ہوں"

میرا لہجہ اتنا مایوس کن اور درد سے لبریز تھا کہ میری ماں کو میری باتوں پر یقین آ گیا۔

"اچھا!" وہ بولیں اور پھر ملازم سے کہا کہ وہ جا کر استاد سے کہدے کہ آج میں نہیں پڑھ سکوں گا۔

اور تب میری جان میں جان آئی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میری ماں نے میری پشت پناہی نہ کی ہوتی تو شاید میری سانس کی ڈوری ہی ٹوٹ جاتی اور اگر یہ نہ ہوتا تو میرا بے ہوش ہو جانا لازمی تھا۔ یہ بات واضح ہے کہ میری ماں نے میری بیماری کی قطعی پروا نہ کی اور یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ میری بیماری کس حد تک حقیقت سے ہمکنار ہے اور کس درجہ خطرناک۔ وہ پھر توجہ اور انہماک سے اپنے کھیل کی طرف متوجہ ہو گئیں اور میں دل ہی دل میں اپنی جان کے بچنے کی خوشی میں مسکرانے لگا لیکن یہ بات ہر ایک اچھی طرح جانتا ہے کہ بہانہ کو زیادہ دیر تک چھپانا ایک سات سالہ بچے کے لئے کس قدر مشکل ہے۔ مجھے جب یقین ہو گیا کہ استاد اپنے گھر کے قریب پہنچ چکا ہوگا تو میں نے اپنے اوپر سے بیماری کی چادر اتار کر پھینک دی اور اپنی دادی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"گرنی! مجھے ایک کہانی سناؤ نا؟" میرے لہجے سے خوشامد ظاہر تھی۔ مجھے یہ درخواست بار بار گرنی کے سامنے پیش کرنی پڑی مگر ان دونوں نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور چپ چاپ کھیل میں مصروف رہیں۔ آخرکار میری ماں نے عاجز آ کر کہا

"بیٹے! ضد نہ کرو پہلے کھیل ختم ہو جانے دو پھر تمہیں کہانی سنا دیں گے"

مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

"گرنی! میری اچھی! سنا دو نا؟" میں نے اپنی ماں سے کہدیا کہ وہ کل اپنا کھیل ختم کر سکتی ہیں اور آج وہ گرنی سے کہدیں کہ وہ مجھے ایک پیاری سی کہانی سنا دیں۔ آخرش میری ماں نے سارے کارڈ بیزاری سے ایک طرف پھینک دیئے اور بولیں۔

"بہتر ہے! تم وہی کرو جو تمہارا جی چاہے!— اب میں تمہیں نہیں روکوں گی۔" شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ چونکہ میری طبیعت ناساز ہے اسلئے ممکن ہے کہانی کا سحر میری طبیعت کے بوجھل پن کو معدوم کر دے۔ جیسے ہی میری ماں اپنے کمرے کی سمت چل پڑیں میں گرنی سے لپٹ پڑا۔ میں نے انکی گردن میں اپنے نازک ہاتھوں کا ہالہ ڈال دیا اور کہانی سنانے کے لئے ضد کرنے لگا اور انہیں میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دینا ہی پڑا۔ اور کہانی شروع ہو گئی۔

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ تھا۔ اسکی ایک ملکہ تھی"

کہانی کی یہ ابتدا مجھے بہت پسند آئی۔ یہ بہت اچھی بات تھی کہ اس بادشاہ کی صرف ایک ملکہ تھی، عموماً ایسی کہانیوں میں عموماً بادشاہ رانیوں کے معاملے میں بہت ہی فراخ دل اور فضول خرچ واقع ہوتے ہیں۔ یہ میری عادت تھی۔ جوں ہی میں سنتا کہ بادشاہ کی دو رانیاں ہیں تو میرا دل غم کی شدت ڈوبنے لگتا۔ ظاہر ہے ان میں سے ایک تو یقیناً ناخوش اور غمگین ہو گی مگر گرنی کی کہانی میں یہ خطرہ گذر چکا تھا۔ اس بادشاہ کی صرف ایک ملکہ تھی۔ گرنی نے کہانی جاری رکھی۔

"بادشاہ کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ سات سال کی عمر میں مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ بچے کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟ اور اگر وہ پیدا نہ ہوا تو بادشاہ کیوں دل برداشتہ ہو گیا۔ وہ تنہا بھی زندگی گذار سکتا تھا۔ اس کے بعد تو ہم بالکل نہیں چونکے جب ہمیں پتہ چلا کہ بادشاہ نے بیٹا حاصل کرنے کی غرض سے جنگل کی راہ لی۔ ہاں اگر اس کی بجائے اگر میں ویرانے کی سمت نکل پڑتا تو اس کے لئے میرے پاس معقول جواب نہ تھا۔ وہ یہ کہ میرے استاد نے میری جان پھانسی کے تختے پر لٹکا دی ہے— مگر کہانی میں تو بادشاہ نے جنگل کی راہ لی تھی۔ اور اپنے پیچھے ملکہ اور ایک چھوٹی سی لڑکی چھوڑی تھی جو چند سالوں بعد ایک خوبصورت اور پری پیکر شہزادی بن گئی۔

بارہ سال تک بادشاہ جنگل میں بیٹا حاصل کرنے کی تدبیریں کرتا رہا۔ پوجا پاٹ اور دعائیں کرتا رہا اور اپنے ملک، اپنی ملکہ، اپنی بیٹی اور دنیا سب کو بھول بیٹھا۔ اس کو نہ اپنی ہوش رہی اور نہ ہی کسی کی! دوسری طرف

شہزادی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔ اس کی شادی کی عمر بھی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ مگر بادشاہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ملکہ اس صدمے سے نڈھال ہو گئی اور سوچنے لگی کیا میری پری وش بیٹی بن بیاہے ہی رہ جائے گی!

اف بھگوان! میرے بھی کیا نصیب ہیں!!

پھر ملکہ نے بے شمار آدمیوں کو بادشاہ کے پیچھے بھیجا تاکہ وہ اس کو کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ نکالیں۔ آخر کار تلاش بسیار کے بعد بادشاہ کا پتہ چلا اور وہ پھر اپنے محل میں آگیا۔ آتے ہی اس نے ملکہ سے پوچھا۔

"وہ حسین دوشیزہ کون ہے؟ جس کا بے مثل حسن سونے کی طرح دمک رہا ہے۔ وہ کس کی بیٹی ہے؟"

ملکہ نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا — اور چلّا کر بولی۔

"میں بھی جنم جلی ہوں۔ ارے کیا آپ اپنی بیٹی کو بھی نہیں پہچانتے؟"

اس کی یہ بات سن کر بادشاہ بھونچکا رہ گیا —

"کیا وہ میری بیٹی ہے؟ مگر میں تو جب یہاں سے گیا تھا وہ ننھی منی گڑیا جیسی تھی۔"

"کیا آپ کا خیال ہے وہ بارہ برس گزر جانے کے بعد بھی بچی ہی رہتی!" ملکہ کے لبوں سے ایک یخ بستہ آہ نکل گئی —

"تم نے ابھی تک اس کی شادی کیوں نہیں کی؟" بادشاہ نے پوچھا۔

"آپ باہر تھے میں آپ کی غیر موجودگی میں اس کیلئے مناسب شوہر کیسے ڈھونڈھتی؟"

یہ سن کر بادشاہ جذبات کی آگ سے جل کر سرخ ہو گیا —

"کل صبح میں محل سے باہر جس شخص کو دیکھوں گا اسکے سنگ شہزادی بیاہ رچا دوں گا۔"

بادشاہ نے اپنے الفاظ کی لاج رکھ لی جو کچھ اسکلنے کہا وہ کرکے دکھا دیا۔ دوسرے دن علی الصبح وہ محل سے باہر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی تجسس آمیز نگاہیں چاروں طرف گھومنے لگیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک سات سالہ برہمن زادے کو آتے دیکھا۔ اس کو دیکھ کر بادشاہ نے کہا۔

"میں تمہاری شادی اپنی بیٹی سے کروں گا۔"

کس میں اتنی طاقت تھی کہ اس آواز کے خلاف نعرہ ہائے احتجاج بلند کر سکتا۔ بادشاہ کی مخالفت کر سکتا اس کی رائے کی خلاف ورزی کرتا۔ دوسرے ہی لمحے اس لڑکے کو طلب کیا گیا اور چند گھنٹوں کے اندر بیاہ کے رسومات ادا ہو گئے —

اس موڑ پر میں گرنی کے اور قریب آگیا اور اشتیاق سے پوچھا —

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

اس وقت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اس سات سالہ بچے پر رشک کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنے پنکھ پھیلائے آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے قریب جلنے والے لیمپ کی روشنی لحہ بہ لحہ کم اور مدھم ہوتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ گرنی کی آواز بھی لحظہ بہ لحظہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ فضا پُر اسرار تھی۔ ماحول عجیب تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ برہمن زادہ میں خود ہوں اور وہ شہزادی جس کا حسن سورج کی کرنوں سے زیادہ روشن، چاند کی چاندنی کی زیادہ حسین تھا میری شریک حیات! جیسے گرنی میری کہانی خود مجھے سنا رہی تھیں! اگر گرنی ادیب ہوتیں تو ان کو اس کہانی کی تخلیق کے بعد کتنے دشوار اور الجھے ہوئے سوالات سے دوچار ہونا پڑتا۔ سب سے ان سے یہی پوچھا جاتا کہ آخر بادشاہ کو تخت چھوڑ کر جنگل جانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اس بارہ سال کے طویل عرصہ میں شہزادی کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟ اور اس کے بعد یعنی شہزادی کی شادی کے بعد تو اچھا خاصا ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا! ایک عورت ایک ننھے کم عقل اور نافہم لڑکے سے شادی ہو جانا!! یقیناً ایک اچھوتی اور تعجب خیز بات ہے۔ بھلا اس کو کون مان سکتا ہے!

لہٰذا اس موڑ پر میں نے مسرت اور خوشی کو یک لخت پوچھ لیا۔

"اس کے بعد کیا ہوا؟"

گرنی نے کہانی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا

"شہزادی مایوسی کے عالم میں اپنے ننھے شوہر کے ساتھ دن گزارنے لگی۔ ان کے لئے ایک علحدہ محل تھا جو ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ اور پیراستہ تھا۔ شہزادی کو اپنے کم عمر شوہر کا بہت خیال تھا۔

اس پر میں پھر اچھل پڑا جیسے واقعی شہزادی کو میرا ہی خیال ہو!

"پھر کیا ہوا؟"

پھر وہ لڑکا اسکول جانے لگا۔ وہاں نئے نئے سبق پڑھنے لگا۔ جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس کے ہم جماعت اس سے پوچھنے لگے۔ تمہارے ساتھ محل میں جو خوبصورت عورت رہتی ہے وہ کون ہے؟

مگر اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا وہ خود اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ اس کو صرف اتنا ہی یاد تھا کہ ایک دن وہ گھر سے کسی کام سے نکلا تھا کہ اس حقیقت میں گرفتار ہو گیا۔ ان باتوں کو گذرے اتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ اب آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے ان کے خاکے بھی معدوم ہو گئے تھے ..... اس طرح چار پانچ سال بیت گئے اس کے ساتھی ہمیشہ اس سے یہی سوال کرتے رہے: "تمہارے ساتھ محل میں جو خوبصورت عورت رہتی ہے وہ کون ہے؟" — یہ سن کر لڑکا ہمیشہ اسکول سے رنجیدہ ہو کر گھر آتا اور شہزادی سے پوچھتا۔

"میرے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تمہارے ساتھ

محل میں جو خوبصورت عورت رہتی ہے وہ کون ہے؟ اس پر مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ بھگوان کیلئے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ تم کون ہو؟

اس پر شہزادی کہتی۔

آج کا دن گذر جانے دو۔ میں تمھیں کسی اور دن بتادوں گی — اور ہر روز وہ لڑکا اس سے یہی پوچھتا۔ تم کون ہو؟ اور شہزادی یہی جواب دیتی: آج کا دن گذر جانے دو میں تمہیں کسی اور دن بتادوں گی" اسطرح چار پانچ سال اور بیت گئے —

آخرکار ایک دن وہ لڑکا بے چین اور بے تاب ہو گیا —

" اگر آج تم نے مجھے نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟ — او خوبصورت عورت!! تو میں یہ محل چھوڑ دونگا

اس پر شہزادی بولی

" یقیناً کل تمہیں بتادوں گی "

دوسرے دن برہمن زادہ جیسے ہی اسکول سے لوٹا شہزادی سے بولا

" اچھا اب مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ "

" رات کے کھانے کے بعد میں تمھیں سب کچھ بتادوں گی " شہزادی بولی —

" بہتر! برہمن زادے نے کہا اور اپنے کمرے میں آکر گھڑیاں گننے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل جائے تاکہ وہ شہزادی کی حقیقت سے آگاہ ہو سکے۔ دوسری طرف شہزادی نے سولہ سنگھار کیا اس نے ایک ایسا دیدہ زیب اور بھڑکیلا لباس پہنا جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ شام ختم ہونے کے بعد برہمن زادے نے اپنا کھانا ختم کیا۔ اس جیسے جلدی کھانے کے صلے میں اس کو دنیا کی دولت مل جائے گی اس کے بعد وہ فوراً اپنے آرام دہ اور قیمتی بستر پر چلا گیا —

اور جب پاتال رات ہو گئی تو شہزادی چپکے سے برہمن زادے کے کمرے میں آہستہ آہستہ داخل ہوئی تاکہ اپنی اصلیت سے اس کو آگاہ کرے۔ مگر جونہی وہ اس کے بستر کے قریب پہنچی ایک زہریلا جانور لڑکے کی طرف بڑھا اور اس کو کاٹ لیا۔ دوسرے ہی لمحے لڑکے کا چہرہ زہر کے اثر سے پیلا پڑ گیا۔ اس کا جسم کپکپانے لگا۔

اس لمحے میرا دل ڈوب سا گیا۔ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا

" پھر کیا ہوا؟ "

" پھر...... گرنی نے کہا ....

مگر کہانی کو مزید سنانے سے کیا فائدہ؟ — اس سے ہمیں ایسی باتیں معلوم ہونگی جن کا ظہور پذیر ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ ایک سات سالہ بچہ یہ بالکل نہیں جانتا کہ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ مگر ایک بچے کی قوت معلومات کبھی تسلیم نہیں کرتی وہ معلوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ دادی کو مرنے کے بعد بھی دوبارہ زندہ کرے تاکہ پھر اس کو وہ کہانی سنانا شروع کر دے اور اس کو استاد سے بچالے۔ یہ ہے ایک سات سالہ بچے کی کہانی!!

اور جب بادشاہ کی کہانی ختم ہوتی ہے تو ایک سات سالہ بچے کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی ہیں اور چند لمحوں بعد وہ نیند کی پرسکون آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ اور جب وہ صبح بیدار ہوتا ہے تو اس کے ذہن میں اس کہانی کے واقعات گردش کرتے ہیں مگر جب وہ اسکول کی کتاب کے چند صفحات الٹتا ہے تو دوبارہ زندگی اور روشنی کی دنیا میں واپس آجاتا ہے —

سید محمد جامی

غزل

دیکھے جو مرے جیب و گریباں کے دریچے
حیران ہیں بہت ماہِ درخشاں کے دریچے

صحرا کے بگولے ہوں کہ اس زلف کے حلقے
کچھ فرق سے ہیں خانۂ ویراں کے دریچے

وہ حبس ہے ماحول کا دم گھٹنے لگا ہے
بس کھول دو اب شہرِ نگاراں کے دریچے

گھنگھور اندھیرا ہے ہر اک راہگزر میں
کیا بند ہوئے کعبۂ جاناں کے دریچے

گزرے جو اُدھر سے تو مرا نام نہ لینا
اے بادِ صبا ڈھینگے زنداں کے دریچے

مجھ رندِ بلانوش سے ہرگز نہ اُلجھنا
بہہ جائیں گے زاہد ترے ایماں کے دریچے

ہم قید اسی فصل میں ہو جاتے ہیں جامی
جس فصل میں کھلتے ہیں گلستاں کے دریچے

احمد فاطمی

کُل ہند مُسلم مشاورتی اجتماع پر ایک نظر

کُل ہند مسلم قائدین کا مشاورتی اجتماع، جو آٹھ مسلم تنظیموں کی تحریک پر ۸ر اور ۹ر اگست کو لکھنؤ میں ہونے والا تھا، وہ بہ خیر و خوبی انجام پاگیا۔ ڈاکٹر سید محمود کا خطبۂ صدارت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبہ استقبالیہ اور اجتماع کی منظور شدہ تجویزیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن عناصر نے اس اجتماع کو مسلم جماعتوں کی سازش سے موسوم کیا تھا، انہیں اس اجتماع کے خطبے اور تجاویز پڑھ کر اپنے غلط اندازے کا احساس ہوچکا ہوگا۔ جن عام مسلمانوں نے اپنی تمام تر امیدیں اس اجتماع کے ساتھ جوڑ رکھی تھیں، انھیں شاید ناامیدی ہوئی ہوگی اور جو لوگ ڈاکٹر محمود، مولانا علی میاں اور مولانا محمد منظور نعمانی کے شعور کے سیاق و سباق کی چھاپ اس اجتماع کے فیصلوں میں دیکھنے کے آرزومند تھے انہیں بھی غالباً مایوسی ہوئی ہوگی۔

لیکن ہمہ جہتیت کی کمی اور حاصلات کی تشنگی کے باوجود آٹھ متفرق اور بڑی حد تک متضاد مسلم جماعتوں کا آپس میں مل بیٹھنا اور نکتوں پر سب کا اتفاق ہوجانا، اپنے آپ میں ایک بڑی بات ہے۔ خلافت کے واقعہ کے بعد عالیہ فسادات کا سانحہ غالباً پہلا موقع ہے جب اتنی ساری مسلم جماعتیں ایک ایشو پر متفق الرائے ہوسکی ہیں۔ اس اجتماع کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کے لئے ۲۱ اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل پانے والی ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ اس کمیٹی میں ایسے مخلص اور عالی ظرف لوگ لئے جائیں جو اس خدمت کو انجام دینے کے علاوہ، جو اجتماع کی طرف سے انہیں سونپی گئی ہے۔ پارٹی لیبل اور پارٹی مفاد سے اوپر اٹھ کر ایسی فضا بنائیں کہ یہ مسلم جماعتیں، جو اپنی طاقت اب تک ایک دوسرے کو توڑنے کے منفیانہ کام میں صرف کرتی رہی ہیں، وہ اب ایک دوسرے کو جوڑنے کے مثبت عمل میں خرچ کریں۔ ہم پورے غور و خوض کے بعد یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر یہ مسلم جماعتیں پارٹی لیبل اور پارٹی جھنڈے کو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول کر صرف مسلمانوں کے مسئلوں کو اپنے پیش نظر رکھیں تو نوے پچانوے فی صدی مسئلوں میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جائیگی۔

راقم سطور کو مسلم قائدین کی تقریروں پر غور کرنے سے پہلی چیز یہ محسوس ہوئی کہ ہمارے مسلم قائدین کے "ہوش" اور "جوش" کی دھارائیں متوازی سمت میں نہیں بلکہ مخالف سمتوں میں بہہ رہی ہیں۔ اہلِ ہوش میں جوش نہیں اور اصحاب جوش ہوش سے قاصر ہیں۔ ہوش اور جوش کی دوری مٹا کر انہیں ایک دوسرے کا تتمہ بنانے کی تدبیریں اگر تلاش کی جاسکیں تو خیالات کی پونجی میں ایک قیمتی اضافہ ہوگا۔

دوسری چیز یہ محسوس ہوئی کہ ہمارے مسلم قائدین کے دل میں تڑپ ہے، سینہ میں جلن ہے، صرف دل ہی نہیں آنکھیں بھی ان کی اشکبار ہیں، واقعات کی تفصیل کے بارے میں بھی دوسروں کے مقابلہ میں شاید وہ زیادہ باخبر ہوں لیکن جو دردناک سانحے ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرے ہیں ان پر ان کی آنکھیں کچھ ایسی اٹک گئی ہیں کہ اس کے آگے وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اجتماع سے منظور ہو کر جو تجویزیں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان میں نہ تو ڈاکٹر محمود کے رچے ہوئے سماجی شعور کی کوئی نمایاں جھلک نظر آتی ہے، نہ مستقبل اور انسان کی بنیادی نیکی پر اس یقین کی جو ہندستان کے علمائے کرام میں مولانا علی میاں اور محمد منظور نعمانی کی سوچ کا خاص حصہ ہے، کوئی واضح چھاپ نظر آتی ہے۔

تیسرا احساس اس بات کا ہوا کہ چونکہ مسلم تنظیموں کا دائرۂ عمل صرف مسلمانوں تک ہی محدود رہا اور غیر مسلم عوام کے ساتھ ان کا عام طور سے کوئی رابطہ نہیں، اس لئے ہندستان کے غیر فرقہ پرور عناصر کی تعداد کا، جو بہت بڑی ہے۔ اکثر کو صحیح علم نہیں ہے۔ بعض تو یہ تک نہیں دیکھ پاتیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کی سنگینی کو کم کر کے پیش کرنا یا جرائم پیشہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرنا، بعض ارکان حکومت کا انفرادی عمل تو ہوسکتا ہے لیکن جہاں تک سرکار کا تعلق ہے، فرقہ وارانہ فساد کے ہتھکنڈوں کو ناکام بنا کر

جو طاقتیں ملک میں ابھرنا چاہتی ہیں، اپنے ارادوں میں خدانخواستہ کامیاب ہوگئیں تو ان کی پہلی چوٹ، آج کی جمہوری سرکار پر پڑے گی، اس لئے ان فسادوں کو حکومت کی پشت پناہی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

اجتماع کی منظور شدہ تجویزیں ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلوں کی ادھوری تصویر پیش کرتی ہیں، فسادات سے پیدا ہونے والے حالات سے نمٹنے کی ایک راہ تو تجویز بتاتی ہیں، لیکن فساد جہاں سے نکلتے ہیں اس کی تدبیروں پر وہ کوئی روشنی نہیں ڈالتیں ان سترہ برسوں میں ملک کے اندر جو فسادات ہوئے ہیں اور ان کے نتیجے میں ملک کے اور خاص طور پر مسلمانوں کے جو نقصانات ہوئے ہیں، ان کا اشارہ تو تجویزوں میں موجود ہے لیکن، ان فسادوں کے اسباب وعلل کیا ہیں، ان کی چھان بین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ باجے اور گائے کے سوال پر جو ہندو مسلم جھگڑے آزادی سے پہلے ملک میں ہوا کرتے تھے، ان کی نوعیت الگ تھی اور آج جو فسادات ہوتے ہیں ان کی نوعیت جدا ہے۔ ان دونوں کے فرق کو سمجھنا چاہیئے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے معاشرے پر جو نتیجے مرتب ہوتے ہیں، بے شک ان کی بھی بڑی اہمیت ہے، اور ادھر بھی ہماری توجہ ضرور جانی چاہیئے لیکن ان سرچشموں کو بند کرنا، جہاں سے فرقہ واریت کے سوتے پھوٹتے ہیں، اہم ترین خدمت ہے آج کا فساد جسے فرقہ وارانہ فساد کے نام سے پکارا جاتا ہے وہ کوئی مستقل شے نہیں ہے۔ اس کی جڑیں بہت دور تک اور مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی تلاش اور جستجو پر معلوم ہوگا کہ فرقہ واریت محض اس کا ظاہری روپ اور سرخی ہے۔ دراصل وہ ایک نظریاتی سوال اور ایک انسانی مسئلہ ہے اور ان کو کامیاب کرنے کے لئے نہ صرف دنیا کے حالات اور اپنے دیس میں چلنے والی مختلف دھاراؤں سے باخبر رہنا ہوگا، بلکہ ان دھاراؤں میں کودنا بھی ہوگا۔ اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دینی ہوگی اور تنگ نظری اور فسطائی ذہنیت سے لڑنے والی اور انسانی قدروں کو بلند کرنے والی ملک کی دوسری طاقتوں کے ساتھ اپنی طاقت جوڑنی ہوگی۔ اس ملک کو جن خطوط پر رواں دواں دیکھنے کی ہم آرزو رکھتے ہیں۔ اسے متشکل کرنے کی ذمہ داری حکومت اور اکثریتی فرقہ کی مان کر ہمیں خاموش نہیں بیٹھ جانا چاہیئے بلکہ اپنی طاقت ملک کی دوسری صالح طاقتوں کے ساتھ ملا کر ملک کے سیکولر اور جمہوریت پسند محاذ کو اپنے عملی اشتراک سے مضبوط بنانا ہوگا۔

لیکن ان فسادوں کی ظاہری شکل کو ہی اگر تھوڑی دیر کے لئے، ہندوستانی مسلمانوں کا اصل مسئلہ مان لیا جائے، جب بھی اس مسئلہ کو تین حصوں۔ فرقہ وارانہ فساد کو روکنے کے لئے مسلمان کیا تدبیر کریں فرقہ وارانہ فساد کی حقیقت کیا ہے اور فساد ختم ہونے پر کیا کریں ۔ میں بانٹ کر ہر مرحلہ کے لئے الگ الگ پروگرام مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ فرقہ وارانہ فسادوں کے روکنے میں مسلمان معاون نہیں ہوسکتے ہیں، ایسا مان بیٹھنا، مسلمانوں کو انتہائی بے بس اور مجبور مان بیٹھنا ہے۔ جو نادرست بھی ہے اور نامناسب بھی۔

اجتماع کی اکثر تجویزوں کا روئے سخن کی جانب ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے قائدین کا عوام کے مقابلہ میں تعزیر کی قوت پر زیادہ بھروسا ہے حکومت کی طرف متوجہ ہونا فی نفسہٖ غلط نہیں ہے یہ حکومت ہماری ہے کہ اسے بنانے میں سب کا ہاتھ ہے۔ جمہوری نظام میں سرداری عوام کی ہوتی ہے اور سرکار کی حیثیت منیم یا ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ اپنے ملازم کو ہدایت دینے کا مالک کو بہر حق حاصل ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کا حکومت سے مطالبہ کرنا ناجائز نہیں ہے لیکن حکومت سے مانگ کرنے کی بجائے یا اس کے علاوہ مصیبت زدوں کی امداد کے لئے اس ملک کے ایک ایک گھر میں جاکر چندہ مانگنے کا پروگرام بنایا جاتا، تو جتنے گھروں سے چندہ ملتا، گویا بدی کے خلاف اتنے ووٹ ملتے اور اس طرح خیر کی طاقت مجتمع ہوتی، بنگال میں اجڑے ہوئے مسلمانوں اور ہندوؤں کو بسانے کا کام کرنے کے دوران سروادیہ کے لوگوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی امداد قبول نہیں کریں گے، جو صرف ہندوؤں یا صرف مسلمانوں کے لئے دی جائے گی، کئی امدادیں محض اسی وجہ سے نامنظور کر دی گئیں، لیکن ہمارا تجربہ وہاں یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر لوگوں کو کافی تاسف ہوا اور بعد میں بلا تخصیص صرف مصیبت زدوں کی امداد کی خاطر وہ اپنے حصے کی رقم ہمارے دفتر میں بھیجا کرے۔

اسی طرح یہ ہو سکتا ہے کہ فساد زدہ علاقوں میں اجتماعی تعزیری ٹیکس عائد کرنے کا اصول حکومت تسلیم کرے، تو یہ فسادات رک جائیں لیکن اگر ایک فرقہ کے خلاف دوسرے فرقے کے لوگوں کے دلوں میں نفرت نے گھر کر لیا ہے تو کیا یہ تعزیری ٹیکس اس نفرت کو بھی مٹا سکیں گے کیا یہ نفرت کا وہ ناگ دوسری شکل میں ڈسے گا؟ نفرت کو تو مقامی نیک لوگوں کا اور مدد حاصل کر کے ہی محبت سے بدلا جا

جواب طلب امور کے لئے
ڈاک خرچ بھیجنا نہ
بھولئے

افسانہ

گدھا

فراز عابدی

"وہ گدھا کس کا ہے؟"

اب اس سوال پر ہر کوئی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کیونکہ جھگڑے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ تنازعہ کا باعث صرف وہ گدھا تھا۔ دینے تو بہت زور شور سے اعلان کر رہا تھا کہ وہ گدھا اسی کا ہے اور مرلی دھر بھی اپنا دعویٰ اُگلے باندے کا مرتا زندگا ہا بلا کر اور چیخ چیخ کر خود کو اس گدھے کا مالک ظاہر کر رہا تھا۔ دونوں دھوبی تھے اور ان کے مکان بالکل آمنے سامنے تھے۔

صبح ہوتے ہی یہ ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے تو لوگوں نے توجہ نہ دی۔ دھوبیوں میں ایسی چیخ چیخ آئے دن ہوا کرتی ہے لیکن معاملہ گروہ بندی تک آ پہنچا تو محلے کے کچھ مخلص آدمیوں کو واقعی تشویش لاحق ہو گئی لیکن اُن کے سامنے بھی یہ مسئلہ تھا کہ دھوبیوں کو سمجھایا کیسے جائے۔ دھوبی نیچ ذہن کے اور جاہل سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اُن سے بات کرنا بھی توہین سمجھتے ہیں۔ مرلی دھر ایسا ہی محتاط طبیعت اور نفاست پسند آدمی تھا۔ جھگڑے کو نپٹانے کے لئے وہ اپنی نفاست پسندی بالائے طاق رکھ کر دھوبیوں کو سمجھا رہا تھا کبھی کا ہاتھ پکڑ کر کسی کی پیٹھ ٹھونک کر اور کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کر چپ کرا رہا تھا۔ چند اور آدمی بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

دینے اور مرلی دھر کے مکانوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک کے عین وسط میں وہ گدھا کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نہ اس طرف کھسکتا نہ اُس طرف۔ اچانک مرلی دھر کے آدمیوں نے اُسے اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ لیکن گدھے کے پیر زمین سے نہ اُکھڑے۔ اس پر دونوں بڑے بوکھلائے جانے لگے۔ دینے ایک موٹا سا سونٹا لیکر جھپٹا۔ مرلی دھر اُس کے راستے میں حائل ہو گیا اور دو تین آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا۔ مرلی دھر "صبر سے کام لو... صبر سے کام لو فیصلہ ابھی ہو جائیگا۔"

چند لمحوں تک گدھا اطمینان سے کھڑا رہا پھر اس نے اچھل کر ایک زوردار دولتی جھاڑ دی۔ کئی آدمیوں کے چوٹیں آئیں اور گالیاں بکتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ گدھا اپنی جگہ پر جما رہا۔

"بس! مرلی دھر کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔ تیرے لوگوں کے آدمیوں نے گدھے کو اپنی طرف لے جانے کی ناکام کوشش کر لی اب دینے کو بھی موقع ملنا چاہیئے۔"

دینے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لئے گدھے کے قریب آیا۔ اس نے گدھے کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، کانوں میں گدگدی کی اور جھک کر پیار بھرے لہجہ میں بولا "بچو! کیوں تنگ کرتا ہے؟ تو ہمارا گدھا ہے نا! بہت نخرے دکھا چکا، اب چل! اب چل... شاباش!!"

گدھے نے اپنی جگہ جنبش بھی نہ کی۔

دینے اس کی دم اینٹھ اینٹھ کر اپنی طرف کھینچنے لگا گدھا ذرا سا کسمسایا اپنے لمبے لمبے کانوں کو پھڑپھڑایا اور اگلی ایک ٹانگ کو اٹھا کر زمین پر پٹکتے ہوئے اپنی جگہ پر مضبوطی سے جم گیا۔ دینے نے جھک کر اس کی گردن میں اپنی باہیں حائل کر دیں اور اس کے کان کے پاس منہ لیجا کر کہنے لگا۔

"بچہ تنگ مت کر! ساتھ تجھ پر لادی نہیں لادونگا تجھے گھاٹ پر نہیں لیجاؤں گا۔ چل! چل کر ہری ہری گھاس کھالے اور تھان پر آرام کر۔ وہ دیکھ تیری کوٹھری میں ہرا کا ہری گھاس رکھی ہے۔"

جب گدھا کسی صورت سے اپنی جگہ نہ ہٹا تو دینے اُسے پیٹنے لگا۔ ہیرا احتجاج کرتے ہوئے چیخا۔

"دہائی! دہائی! سرکار کی!!... ہرے رام... ہائے گدھوا کو پیٹیل جات ہو۔ ارے مر جاوے رے دنوا سالے! تہرہ کبہریں کیڑا پڑے......"

مرلی دھر نے اسے سمجھایا "صبر سے کام لو صبر سے کام لو! ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے۔"

دینے کے آدمی گدھے پر ٹوٹ پڑے۔ گدھے نے دولتی جھاڑی۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا جو ہیرا کے آدمیوں کا ہو چکا تھا۔ ہیرا آگے بڑھ کر بولا۔

"فیصلہ دیصلہ کچھ نہیں سرکار! اکو ہمار گدھا ہو۔ پوچھ لیں جائے الکو کمہار سے۔ بلا لیں جائے الکو کے وہی بتائی کہ ای کیکر گدھا ہو۔ ہم اوسے خرید لی ہے ایکا!"

"ای غلط ہے! جھوٹ ہے!" دینے سینے پر ہاتھ مار کر بولا "ای ہمار گدھا ہے۔ ہم رحمو سے چھینٹ لیا ہے ایکا۔ کیوں جھوٹ بولتا ہے ہیرا کے بچے! سالے بے ایمان!!!"

بےایمان تم ہو! سالا تم ہو! کالی بچے تو ہم تہار لادی نکال لوں گا، سالا!"

"ارے ایں! ایں!" مرلی دھر چیخ کر بولا "پیچھے ہٹو۔ بجرا ما ر! پکڑو... پکڑ لو اسے..."

تم کیوں لڑ رہے ہو آپس میں۔ جھگڑا صلح صفائی سے طے کر لو۔!"

"فیصلہ ابھی ہونا چاہئے ابھی!" دینے اپنے سونٹے کو لہراتے ہوئے بولا۔

"ارے ہاں ہاں! ابھی لے فیصلہ!" ہیرا خم ٹھونک کر آگے بڑھا۔ "بلائی جائے اگو کے۔!"

"ہم بھی کہوں گا صاحب کہ رحمٰن کو بلایا جائے فیصلہ ابھی ہوگا۔"

"لیکن ابھی اس وقت اگو اور رحمٰن کو کیسے بلایا جا سکتا ہے؟" حاجی مقصود نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "دونوں دور دراز گاؤں میں رہتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو حاجی جی!" مرلی دھر نے کہا "بہتر تو یہ ہے کہ تم لوگ یہ معاملہ پنچایت میں طے کر لو لیکن پریم اور محبت سے، لڑ جھگڑ کر نہیں۔!"

"صاحب! پنچ وینچ سے کچھ نہ ہوگا یہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم تو فیصلہ ابھی لیں گے۔"

"دینے کے بچے! اب تو فیصلہ ابھی ہوگا۔ ہٹ جاؤ آپ لوگ! چلو ہٹو!"

افراتفری مچ گئی۔ لوگ ایک دوسرے پر چیخنے لگے۔ گالیوں اور چیخ پکار کا ایک طوفان آگیا۔ قریب ہی مسٹر فیسٹو کا مکان تھا۔ وہ خود کو مسٹر فیسٹو کہتا تھا اور ہمیشہ ڈھیلے سے سوٹ، پرانی گندی ہیٹ اور پھٹے ہوئے جوتے پہن کر باہر نکلتا۔ لوگوں پر خواہ مخواہ رعب جمانے کی کوشش کرتا۔ محلے کے جاہل لوگ اس سے مرعوب ہو چکے تھے۔ کیونکہ وہ اپنی زبان میں ایسی انگریزی بولتا تھا جس سے اس کے جاہل مخاطب مرعوب ہو جاتے۔

شور سن کر اس نے جلدی سے اپنا سوٹ پہنا۔ ہیٹ سر پر جمائی اور بید لہراتا ہوا غضبناک انداز میں مجمع پر جھپٹا۔ قریب پہنچ کر ڈپٹ کر بولا۔

"وہاٹ دس جھڑپ یو سالہ ہیرا؟ ناٹ اباؤٹ دس نو گڈ بیک اینڈ گراؤنڈ؟ آئی ٹو کٹ یور ہیڈ اینڈ کوئیک فاسٹ!" مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ جیسے تلاطم لہریں یکایک برف ہو گئی ہوں۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ مسٹر فیسٹو بید اپنی ہتھیلی پر مارتے ہوئے گرجا "ہیری یو ناٹ اینی شیم! وہاٹ اباؤٹ دس جھگڑنگ۔؟"

ہیرا نے دینے کا گریبان چھوڑ دیا اور ڈنڈا پھینک کر دوڑتا ہوا مسٹر فیسٹو کے قدموں میں آ رہا۔ اس کے پیر پکڑ کر بولا۔

"سرکار! حضور! صاحب! یہ دونوں سالہ چار گدھوں کے اپن کہتا ہو۔ اکری تہاری کی - - - - -"

مسٹر فیسٹو نے اس کی پیٹھ پر ایک بید رسید کرتے ہوئے اسے پرے دھکیل دیا اور اپنی میلی پتلون کی مٹی ہوئی کریز پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بگڑ کر بولا

"وہائی ٹچنگ می یو گندا دھوبی!"

ہیرا بڑا ملنے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔

"شٹ آؤٹ یو دماغ چٹ!" فیسٹو نے ... کی پیٹھ پر دوسرا بید رسید کرتے ہوئے کہا اور اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھنے لگا۔

"پلیز ٹیل می! وہاٹ از دس جھگڑنگ؟"

اس آدمی نے اس کا مفہوم سمجھ لیا اور سب کچھ بتانے لگا۔ سب کچھ جان لینے کے بعد اس نے مجمع کو مخاطب کیا

"پلیز ڈونٹ گو جھگڑنگ! آئی ایم گیونگ یو مائی فیصلہ۔"

پھر اس نے دینے کو قریب آنے کا اشارہ کیا جب وہ پاس آیا تو اسے ایک بید مارتے ہوئے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"دس گدھا از ناٹ یور، نار یور، اٹ از آف خط استوا!"

کسی کی سمجھ میں اس کا فیصلہ نہ آیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جھگڑا بڑھنے لگا۔ اس بار فیسٹو کی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ اس نے آخری بار اپنی انگریزی میں ڈانٹا اور چپکے سے وہاں سے کھسک گیا۔

معاملہ طول پکڑتا گیا۔ مرلی دھر، حاجی مقصود اور چند دوسرے مخلص آدمی دور کھڑے تشویش ناک نظروں سے لڑتے جھگڑتے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ مقصود نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"معمولی جھگڑے کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جا رہا ہے۔ آج کل زمانہ بہت نازک ہے نہ جانے یہ بیوقوف کیا کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہو!" مرلی دھر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود ان کے معاملے میں دخل دے کر ان میں صلح و صفائی کرا دیں۔"

سب لوگوں نے مرلی دھر کی رائے سے اتفاق کیا۔ بڑی مشکل کے بعد ہیرا اور دینے کا جوش ٹھنڈا کر کیا! اور پنڈت دیا شنکر کے صحن میں پنچایت بیٹھی۔ مقدمہ پیش ہوا۔ ہیرا اور دینے نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے بیان کر آگاہ کیا۔ مولوی ریاست علی نے کھنکار کر کہا۔

"یہ بات ظاہر ہے کہ زیادتی ہیرا کی طرف سے ہوئی۔"

"زیادتی ہیرا اور دینے کی طرف سے ہوئی ہے مولوی صاحب!" پنڈت دیا شنکر نے زور دے کر کہا۔

مولوی ریاست علی کو پنڈت دیا شنکر کی بات ناگوار گذری۔ انہوں نے حاجی مقصود سے کہا۔ "آپ کا کیا خیال ہے حاجی صاحب؟"

"بھئی دیکھئے! ہم پنچایت میں بیٹھے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں جس سے معاملہ الجھ جائے۔"

کافی رد و کد کے بعد مرلی دھر کو ایک منطق سوجھی اس نے کہا۔

"میرے خیال میں گدھے کو گھاٹ پر بھیجا جائے اور اس پر کپڑوں کی گٹھڑی لاد کر شہر کی طرف ہانک دیا جائے۔ ہیرا اور دینے کے گھر میں سے وہ جس کے گھر جائے گدھا اسی کا سمجھا جائے۔"

چہ میگوئیاں ہوئیں۔ کچھ لوگوں نے اختلاف کیا۔ بالآخر یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ گدھا گھاٹ پر بھیجا گیا اور کپڑوں

کو گنٹھری لاکر ادھر ادھر کی طرف ہانک دیا گیا۔ گدھا آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ ہیرا اور دینے کے گھر کے پاس پہنچا تو پھر ایک جگہ اڑیل گدھے کی طرح اڑ گیا۔ لوگوں کے دبے دبے جوش ٹھنڈے پڑ گئے۔

فیصلہ نہ ہو سکا۔ ایک بار پھر پنچایت بیٹھی۔ کچھ دیر تک بحث و مباحثہ کے بعد مقصود نے کہا۔

ایک بار گدھے کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر چھوڑ دیا جائے۔ میرا خیال ہے گدھا کسی خاص چیز کو دیکھ کر بھڑک رہا ہے۔"

یہ بات لوگوں کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ اس تجویز پر عمل کیا گیا۔ لیکن اس بار لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ گدھا ہیرا اور دینے کے مکانوں سے آگے نکل گیا ہے وہ آہستہ آہستہ ایک طرف چلا جا رہا تھا۔

بھئی اب کیا ہوگا۔ اس کمبخت نے تو اچھا خاصا مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ کسی گھاٹ لگتا ہی نہیں ہے مقصود بولا۔

"میرے خیال میں اس گدھے کا پیچھا کرنا چاہیئے دیکھیں کہ جاتا کہاں ہے۔" مرلی دھر نے کہا۔

لوگوں نے مرلی دھر کے خیال کا مذاق اڑایا لیکن حاجی مقصود اور مرلی دھر گدھے کے پیچھے چلتے رہے کئی لوگوں نے از راہ تمسخر کچھ دور تک ساتھ دیا لیکن پھر اکتا کر چھٹنے لگے۔ آخر میں صرف چار آدمی گدھے کے پیچھے رہ گئے۔ ہیرا، دینے، مرلی دھر اور مقصود جیسے جیسے گدھا آگے بڑھتا گیا مقصود کی حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ بار بار کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا لیکن مرلی دھر کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھ کر خاموش ہو جاتا۔

وہ ایک گاؤں میں نکل آئے۔ مقصود نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یہ آخر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"بس۔ ۔ !" مرلی دھر نے اشارے سے اُسے خاموش کر دیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

آخر کار وہ گدھا رحمن کی جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔

دینے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو امڈ آئے۔ وہ دوڑ کر گدھے سے لپٹ گیا اور اُسے بے تحاشا پیار کرنے لگا۔ رحمن اپنے گھر پر کئی آدمیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا جب دینے نے اُسے سب کچھ بتایا تو رحمن نے کہا "ہاں صاحب! یہ گدھا میں نے دینے کو دیا تھا۔"

مرلی دھر ہیرا سے مخاطب ہوا "اب بتاؤ۔ !"

ہیرا کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"حضور! یہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ گدھے کی عقل پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہک سکتا ہے۔"

مرلی دھر نے رحمن سے کہا "گاؤں کے چودھری کو بلا لاؤ! کہنا کہ ایک معاملہ چکانا ہے۔"

کچھ دیر بعد چودھری آگیا۔ اس نے سب کچھ جان لینے کے بعد مرلی دھر سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ مگر چونکہ یہ معاملہ میرے گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے مجھ پر لگاوٹ کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں آپ دونوں میں سے کوئی سرپنچ بن جائیں۔"

مقصود نے مرلی دھر کو سرپنچ بنانے کی سفارش کی۔ رحمن کی جھونپڑی کے باہر مٹی کے بنے ہوئے چبوترے پر مرلی دھر کی صدارت میں پنچایت ہوئی رحمن نے ایک بار پھر کہا کہ اس نے وہ گدھا دینے کو اپنی خوشی سے دیا تھا۔ گاؤں کے چند دھوبیوں نے رحمن کی تائید کی۔ فیصلہ بہت جلد ہو گیا۔ مرلی دھر نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"ہم پنچوں نے اس معاملے پر کافی غور و خوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ گدھا دینے کا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہی گدھا آپس میں تنازعہ کا باعث بن گیا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ گدھا رحمن کے یہاں پیدا ہوا۔ اسی گھر میں اس کی نشو و نما ہوئی اسی گاؤں کی لہلہاتی ہوئی گھاس کھا کر جوان ہوا۔ یہاں کا ماحول اس گدھے کو بھا گیا ہے۔ اب وہ یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کی خواہش پر جبر کرتے ہوئے اُسے کسی اور کے حوالے کر دیں۔ اس لئے پنچ ایک مت ہو کر یہ فیصلہ کرتی ہے اس گدھے کو رحمن کو سونپ دیا جائے اور رحمن اُسے پھر دینے یا کسی اور کو نہ دے۔"

دینے کو یہ فیصلہ پسند نہ آیا۔ لیکن اب کسی میں چوں چرا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس لئے سب لوگ خالی ہاتھ لوٹے۔ کچھ دور جانے پر انہوں نے دیکھا کہ ایک انسپکٹر اور دو کانسٹبل ایک آدمی کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ وہ آدمی رو رو کر کہہ رہا تھا۔ "سرکار! مجھے وہاں نہ بھیجو۔ میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔"

مرلی دھر نے بڑھ کر انسپکٹر سے پوچھا "صاحب! کیا بات ہے؟"

انسپکٹر اُسے چند لمحوں کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا پھر بہت بے رخی سے جواب دیا "کچھ نہیں! یہ ہمارے ملک کا باشندہ نہیں ہے لیکن یہیں رہنا چاہتا ہے۔ ہم اسے اس کے ملک میں پہنچا دیں گے۔"

وہ آدمی گڑگڑایا۔

"سرکار! یہ ظلم ہے۔ میں اسی ملک میں پیدا ہوا ہوں یہیں کے اَن جل سے میری نشو و نما ہوئی۔ میں اسی ماحول میں سانسیں لیتا رہا ہوں۔ یہ میرا وطن ہے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا مجھے گھر سے مت نکالو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پولس اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئی۔

مرلی دھر کا جی مکدر ہو گیا۔

نہ جانے کیوں یہ احساس اس کے دل پر چھا گیا کہ ابھی اس کا فیصلہ ادھورا ہے ابھی اس پر عمل نہیں ہوا ہے۔

میر خمار

بمبئی کے شب و روز

پچھلے دنوں بمبئی میں کے ایچ آرا کی ۵۰ ویں سالگرہ پر دوستوں کی ایک کمیٹی "نے ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے "جشنِ آرا" منایا۔

بین الاقوامی شہرت کے مالک کے ایچ آرا ان چند ذہین فنکاروں میں سے ایک ہیں جن پر ہم ہندوستانیوں کو بجا طور پر فخر ہے۔ آرا کی غیر معمولی ذہانت اسکول یا کسی اور مکتبۂ فکر و فن کی مرہونِ منت نہیں بلکہ ذاتی کاوش اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت عوام، فنکار اور نقادوں پر ان کی پہلی نمائش (۱۹۴۲ء) کے موقع پر ہی روشن ہو چکی تھی کہ وہ فنِ مصوری میں انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔

مصوری کے جس جس شعبے میں انہوں نے تجربے کئے اس میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ ان میں

بھی تو ان کا شمار دنیا کے بڑے فنکاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک اور چونکا دینے والا تجربہ، اردو اشعار کو زیر پینٹنگ کی مدد سے کینوس پر منتقل کرنے کا تھا جس میں برش اور قلم کا سرے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا مگر اس میں مصوری اور مجسمہ نگاری کے عناصر اور تاثرات موجود تھے کیونکہ دونوں ہی کے بنیادی لوازمات بروئے کار لائے گئے تھے۔

جشن دو تقریبوں پر مشتمل تھا۔ تصویروں کی نمائش اور مشاعرہ۔ ۲۰ اکتوبر کی شام کو ۴ بجے پرنس آف ویلز میوزیم میں انا کمار کے چیرمین ڈاکٹر ہومی جے بھابھا نے آرا کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح جس میں ملک اور بیرون ملک کی معزز ہستیوں، آرا کے پرستاروں اور دوستوں کے علاوہ عوام اور اخباری نمایندوں نے بھی شرکت کی۔

ڈاکٹر بھابھا نے آرا کی شخصیت، زندگی اور فن پر مختصر اور جامع تقریر کی۔ اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "میں آرا کے لئے زرخیز اور بار آور مستقبل کیلئے دعاگو ہوں کہ انہوں نے نہ صرف بے شمار اعلیٰ ترین فن پارے پیش کئے ہیں بلکہ ہمارے ان گنت لمحات کو پُر مسرت اور خوشگوار بنایا ہے۔ اس موقع پر دوستوں کی جانب سے آرا کو تحائف پیش کئے گئے۔ نمائش،

کے فن پاروں پر مشتمل تھی۔ جشن کے پُر مسرت موقع پر تمام تصاویر کا مساوی اور برائے نام قیمت رکھی گئی تھی۔ بے شمار تصاویر آرٹ گیلری کی زینت تھیں میر خمار کو یہ جان کر قطعی حیرت نہیں ہوئی کہ نہ صرف وہ سب بلکہ بغیر فریم کی وہ تمام تصویریں بھی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں جو ڈھیر کی شکل میں ایک میز پر رکھی تھیں اور برائے فروخت نہیں تھی۔

۲۱ اکتوبر کی رات کو کاما ہال میں جشن کے سلسلے کی دوسری تقریب یعنی مشاعرہ تھا جو درحقیقت حیدر خان پٹھان کی کوششوں سے سرزد ہوا تھا۔

کاما ہال کے اسٹیج پر مدعو اور غیر مدعو دونوں قسم کے شعرا جلوہ افروز تھے جن میں سردار جعفری، امجد صدیقی، مظفر شاہجہانپوری، یوسف ناظم، عزیز جاوید، ظفر گورکھپوری اور قیصر جعفری کے علاوہ اناؤنسر کی دریافت "ایک صاحبزادی مہر النساء سوز" قابلِ ذکر ہیں۔ صدارت اعجاز صدیقی نے کی۔ مشاعرے سے قبل ڈاکٹر ونتا طا اور اعجاز صدیقی کے علاوہ سردار جعفری نے ایک نہایت خوبصورت تقریر کے ذریعے آرا کے فن اور شخصیت کا جائزہ لیا اور کہا کہ ایک فنکار کا دوسرے فنکار سے جذباتی رشتہ ہوتا ہے اور اسی رشتے کا ذریعے ہم اردو کے شاعر آج یہاں جمع ہیں۔

سردار جعفری کی تقریر حاصلِ اجتماع تھی کیونکہ اس کے بعد ایک سنجیدہ اجتماع بچکانہ اناؤنسنگ کی نذر ہو گیا۔

سنا ہے کہ اناؤنسنگ کے لئے پہلے کسی اور صاحب کو بلایا گیا تھا مگر جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ کچھ لوگ ان کے کندھے پہ بندوق رکھ کر شاعروں کا شکار کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے ہی بھاگ کھڑے ہوئے ان کے بھنجے اناؤنسنگ کا قلمدان کنکر جو چیز وہ اناؤنسر کے ہاتھ آ گیا بڑی مشکل سے میر خمار نے دو چار ایسے لوگوں کو تلاش کیا جو انہیں جانتے تھے لیکن انہوں نے یہ کہکر میر خمار کو خاموش کر دیا کہ کیا آپ نے اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے والی مثل نہیں سنی۔ اناؤنسر صاحب اگر سمجھے سامنے نظر تو آ رہے تھے۔ مگر ان کے ڈائیلاگ اسٹیج پہ موجود شعرائے کرام تک کی سمجھ سے بالاتر تھے۔

ہال میں ہیلنے اور گمگمیانے کی آوازیں ہال میں مسلسل ابھر ابھر کر ڈوب رہی تھیں آخر کار غلط سلط ڈھنگ سے مشاعرہ کنڈکٹ کرنے کا بجائے اور اچھے خاصے مشاعرے کو چوپٹ کر دینے والے اناؤنسنگ سے تنگ آ کر بعض مدعو شعرا اور سامعین نے واک آؤٹ تک کر دیا۔ ادھر دیگر شاعروں کا جھنجھلانے بیچ و تاب کھانے اور بور ہونے کا منظر بھی قابلِ دید تھا اس کے باوجود اکثر شعرا نے مشاعرے کے دوران سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ سوائے ایک صاحبزادی "مہر النساء سوز" کے۔ جو زمانے کسی خوش فہمی کسی ضرورت اور مجبوری کے تحت یا کسی تکلیف کا بہانے "شاعرہ" بنی یا بنا دی گئی ہے۔ جب انہیں اپنا کلام سنانے کے لئے مائک پر بلایا گیا تو وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ سیف الدین سیف کی غزل - ع

مجھ کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا - گانے لگیں کچھ شاعر جو کے ایک آدھ نے دبے لفظوں سے کہا بھی کہ صاحبزادی سیف کی غزل پڑھ رہی ہیں۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

- میر تقی میر کی زندگی پر ایک فلم بنائی جا رہی ہے ۔ جسے اشوک کمار ڈائرکٹ کرینگے ۔ اس فلم کی شوٹنگ لکھنؤ اور دہلی میں ہوگی ۔ اس فلم کے لیے ایک مناسب کہانی کی تلاش ہے جو بالکلیہ تاریخی اور ادبی حقائق پر مشتمل ہوگی ۔ کہانی کے انتخاب کیلئے بمبئی کے تین چوٹی کے ادیبوں کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں ۔

●

- مارچ ۱۹۶۵ء سے بمبئی سے ایک ماہوار رسالہ "اظہار" شائع ہو رہا ہے ۔ اداریے میں باقر مہدی ۔ قاضی سلیم اور گرشن چندر ہونگے یہ رسالہ بین الاقوامی ادب کے ترجموں پر زیادہ توجہ دیگا ۔

●

- ماسکو میں غیر ملکی ادب کی لائبریری میں کرشن چندر کی کتابوں کی نمائش ہوئی اس نمائش میں کرشن چندر کی ۸۴ کتابیں رکھی گئی تھیں روس میں کرشن چندر کی "شکست" ، "ایک عورت ہزار دیوانے" اور "جب کھیت جاگے" بہت مقبول ہیں ۔

●

- بمبئی میں یوم کبیر کے سلسلے میں جو مشاعرہ ہونیوالا ہے اس میں فیض شرکت نہیں کرینگے ۔ یہ مشاعرہ ہندوستانی بک ٹرسٹ کی طرف سے ہو رہا ہے ۔

ادھر کمرہ مصبر سے بے خبر غزل گاتی جاتی رہی مگر افسوس کہ مقطع گانے سے قبل ہی کوئی ستم ظریف زور سے چلایا کہ یہ سیف کی غزل ہے ! قصہ مایہ" بالکل" صاحبزادی نے بھی تھی اور چارہ نا چار مگر حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے مقطع میں سوز کی جگہ اصل تخلص سیف ہی ادا کیا جبکہ دوسروں کی لاعلمی سے فائدہ اٹھا کر سیف کے بجائے "سوز" پڑھا جاتا تھا ، غزل ختم ہوئی تو اس صدی کے سب سے بڑے دانشمند "یعنی اقبال نسر مدظلہ" نے اس بیان کے مطلق ہی کہ ابھی آپ نے فلاں کی غزل سنی ، موصوفہ کو دوبارہ غزل گانے کی دعوت دی اور آپ کی انھوں نے کیا ؟ ایک غزل گائی ۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اس موقع پر میر خوار ایک بات سوچ رہا ہے ۔ آپ کی اور اس کی زندگی میں ایسے مواقع ضرور آئے ہونگے کہ کوئی صاحبزادی یا صاحبزادے "اپنا کلام" سنا رہے ہیں ، آپ جو محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی مشوق ہے اس پردہ زنگاری میں بلکہ بعض اوقات آپ یہ جانتے بھی ہیں کہ مشوق فلاں ہے ! مگر آپ خاموشی سے خون کے گھونٹ پیتے ہیں اور کچھ کر نہیں سکتے ۔ (اگر پڑھنے والوں کا ذکر چھوڑئیے تو نہ چوری کبھی نہ کبھی پکڑی جاتی ہے) ایسی "شاعرات" اور شاعروں کو آپ چاہیں تو معنوی شاعر کہہ لیجئے یا تحقیق شاعروں کی ناجائز اولاد قرار دیجئے جاہے تو دنیائے ادب کے ٹلکی نام دے کیجئے ۔ لیکن آخر اس ملک گیر بیماری کا علاج کیا ہے ؟

خیر ۔ یہ تو ایک پیراگراف معترضہ "تھا بات چل رہی تھی کا مالیگاؤں والے مشاعرے کی جس میں سامعین کی تعداد گو بہت زیادہ نہیں تھی مگر یہ سنجیدہ شعراء کی خوش قسمتی تھی کہ صرف واہ واہ اور سبحان اللہ کرنیوالے سامعین کے بجائے سنجیدہ ، باذوق اور ستھرا مذاق رکھنے والے افراد نے کلام سنا اور سب سے زیادہ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ اردو کے شعراء ایک مصور اور ایک فنکار کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے تھے ۔

●

ندا فاضلی ________ رگوا لیار

...... یعنی یہ آپ بیچارے نئی نظم کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں .... ڈکشن اور کنٹینٹ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے ...
نئی نظم کا موضوعاتی پھیلاؤ مشین یگ کے سمے بودھ Time Sense کا مرہون منت ہے ... جسکے اظہار کیلئے نیا لہجہ نیا
اسلوب اور نیا پیرایہ ایک لازمی شرط ہے!
آج کے آدمی کی نفسیاتی گتھیاں اور تجربوں کی عکاسی کے لئے نئی علامات اور نئی امیجیس کی تلاش میری رائے میں، ایک نیک
قدم ہے ... آج کے کسی پڑھے لکھے آدمی کے بدن پر پگڑی اور انگرکھا، مضحکہ خیز ہی لگے گا! نئی اور شہر انسان کے بجائے اگر کوئی کور
اور میلا لکھ رہا ہے تو چہرہ کیوں نیا بنایا جائے!
اور یوں بھی خیال جیسے بہتے سکوں کی مانند ہوتے ہیں! جو زیادہ استعمال سے گھس پٹ جاتے ہیں ان کی تصویر کشی دھندلی پڑ جاتی ہے!
جہاں تک غزل کا سوال ہے ...... اس میں بھی نئے پرانے کا فرق نظر آتا ہے!
نئی غزل آزادی کے بعد کی پیداوار ہے .... اسکا جنم انہیں حالات میں ہوا ہے جن میں نئی نظم نے آنکھ کھولی نئی غزل صحیح معنوں میں
نئی نظم کا ہی ایک روپ ہے! جسکی روایتی حدبندیاں کبھی کبھی نئے ذہن کے تجربے میں رکاوٹ بھی بن جاتی ہیں!
ضروری نہیں آپ مجھ سے متفق ہوں .... میں نے تو صرف اپنی رائے ظاہر کی ہے!

مہدی حسن ________ (آسنسول)

.... مظفر حنفی صاحب سے قطع نظر بھی کئی شاعر واوین کا استعمال کرتے ہیں۔ اکثر جگہ
یہ استعمال بامعنی ہوتا ہے لیکن اتنی ہی تعداد بے معنی استعمال کی بھی گنائی جا سکتی ہے ذو معنی بات کہنے اور
طنز کی دھار میں تیزی پیدا کرنے کے لئے بعض اوقات واوین کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن میرے خیال
میں مظفر حنفی کی غزلوں میں واوین کا استعمال بسا اوقات ضروری نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے
جیسے انھیں بس ایک عادت سی ہو گئی ہے واوین لگانے کی بالکل اسی طرح جیسے چند لوگوں کو ان پر
اعتراض کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں واوین لگانا اپنے قارئین کو کور نظر اور سست
فہم سمجھنا ہے۔
عزیز جاوید کے چند اعتراضات کی معقولیت سے میں متفق ہوں لیکن لہجے سے نہیں جھلاہٹ میں سنجیدہ
بات بھی اپنا اثر کھو دیتی ہے اور یہی ان کے خط کی اور چند اعتراضات کی خامی ہے ایسی بحثیں ہونی چاہئیں۔ ادبی
پرچے ان مسئلوں کو نہیں اٹھائیں گے تو کون اٹھائے گا لیکن ان کے لئے حدبندی کی ضرورت ہے ورنہ بحث کا لطف ختم ہو جاتا ہے۔
کیا آپ یا فریقین میں سے کوئی یہ بتلانے کی زحمت کریگا۔ کہ واوین کا استعمال کب اور کس زمانے میں یا کس شاعر
نے شروع کیا۔ داغ تک تو اسکا رواج نہیں تھا۔ ہو نہ ہو بیسویں صدی کے شعراء نے عجز بیان کے طور
پر استعمال کرنے لگے ہیں۔

اب کی بار

اس شمارے میں حضرت شاہ عارفی مرحوم کی ایک غزل شامل ہے۔ مرحوم نے یہ غزل "خیال" کامٹی میں اشاعت کے لئے بھیجی تھی ہم فیض انصاری صاحب مدیر خیال کے ممنون ہیں کہ انھوں نے "دورِ حیات" کو اس غزل کی اشاعت کے قابل جانا مرحوم کی اور دو غزلیں بھی فیض صاحب نے بھجوائی ہیں جو آئندہ شماروں میں پیش کی جائیں گی۔

○

اس شمارے میں ظ۔ انصاری صاحب کا ایک پرلطف مضمون "ریڈیو صاحب" بھی شامل ہے۔ ظ صاحب نے یہ مضمون بہت پہلے لکھا تھا اور آج وہ اسکی اشاعت کے خلاف ہیں لیکن اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ ظ صاحب ہی کا معلوم ہوتا ہے۔ وہی شوخی وہی لطیف طنز وہی اچھلتے کودتے ہوئے جملے اور زبان کا وہی چٹخارہ جو آج ظ صاحب کا طرۂ امتیاز ہے اس مضمون میں بھی ملے گا۔ یہ مضمون ظ صاحب کی خفگی کا خطرہ مول لیکر شائع کیا جا رہا ہے۔

○

ٹیگور کی کہانی کا ترجمہ اور فراز حامدی کا گلدستہ بھی پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ ممتاز راشد کے چار شعر بہت شگفتہ اور رباعی بہار قسم کے ہیں

مشرا ے یا۔ نقیبہ پرنٹر پبلشر نے ادبی پرنٹنگ پریس اور اجمل پریس میں چھپوا کر پرنسس بلڈنگ رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳ سے شائع کیا۔ ملکیت صدحیات پبلکیشنز

دور حیات

...بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی

جلد ۳	۱۰ اور ۲۴ نومبر ۶۴ء	شمارہ [illegible]

اس شمارے میں

قیمت

ایک سال — دس روپے ۱۰

فی پرچہ — تین پیسے ۳

ایڈیٹر

قیصر مظہر حسین

دس دنوں میں

- مسٹر شاستری نے کہا ہے کہ ہندوستان ایٹم بم نہیں بنائیگا۔
- مسٹر ایس کے پاٹل نے گوا میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ گوا ابھی اور دس سال تک حکومت کے زیر نگرانی رہیگا اسکے بعد عوام کی مرضی سے یہ فیصلہ کیا جائیگا کہ آیا گوا مہاراشٹر میں شامل ہو یا مرکز کے تحت رہے۔
- مسٹر گھوسلا حکومت ہند کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو برطرف کردیا گیا۔ ان کا بینک بیلنس ان کی [illegible] دیکھتے ہوئے بہت زیادہ تھا۔
- آزادی کے بعد پاکستان میں پہلی بار عام انتخابات منعقد ہوئے مغربی پاکستان میں ۱۱ نومبر [illegible] تک عوام جمہوریت کے بنیادی ممبر منتخب کرینگے۔ مشرقی پاکستان سے بھی ۴۰ ہزار ممبر منتخب [illegible] یہ ۸۰ ہزار ممبر جنوری ۶۵ میں حکومت کا صدر منتخب کرینگے جسکے لیے صدر ایوب اور مس [illegible] میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔
- شاہ ابن سعود اپنے بھائی امیر فیصل کے حق میں سعودی عرب کے تخت سے دستبردار ہوگئے ہیں۔
- کہا گیا ہے کہ مسٹر کرو شچیف ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے جسم پر فالج کا حملہ ہو سکتا ہے۔
- مسٹر چاولا نے کہا ہے کہ گوا کے تعلق سے مسٹر پاٹل نے جو بیان دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ گوا کے عام انتخابات میں مہاراشٹر گومنتک پارٹی کی کامیابی اسبات کی دلیل ہے کہ گوا فوری طور پر مہاراشٹر میں ضم ہونا [illegible]
- امریکہ میں صدر کے انتخاب میں صدر جانسن نے سینیٹر گولڈ واٹر کو بری طرح شکست دی۔
- [illegible] نے ایک آرڈیننس جاری کیا ہے جس کی رو سے مخالف صحافیوں کو [illegible]
- مسٹر چو این لائی روس کے دورے پر ماسکو پہنچے۔ روس کے نئے لیڈروں کے [illegible]
- گنتور (آندھرا پردیش) میں آل انڈیا کمیٹی کا سہ روزہ اجلاس شروع ہوا جس میں ہندوستان کے ایٹم بنانے پر زور دیا [illegible]
- بمبئی میں حکومت کے اسپتالوں میں ڈاکٹروں نے تنخواہ زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے ہڑتال کر دی۔
- بھاگلپور میں ایک منٹ تک بارش ہوئی جسکے قطرے پیلے تھے۔
- وزیر اعظم شاستری نے آل انڈیا کانگریس کے اجلاس میں اعلان کیا کہ ہندوستان ایٹم بم نہیں بنائیگا۔
- روس کے نئے لیڈروں نے کہا ہے کہ روس اور چین کے بیچ کشیدگی کم ہو [illegible] ہندوستان اور روس کے تعلقات پہلے کی طرح خوشگوار رہینگے۔
- کیرالا میں اناج نہ ملنے کی وجہ سے عوام نے گوداموں کو لوٹ لیا۔

باقر مہدی

اتنا چاہا تھا ـــــ!

اتنا چاہا تھا کہ ہر خواہشِ غم کی خاطر
راکھ چنگاری بنی، شعلہ بنی، درد بنے
زندگی فکرِ مہ و سال سے آزاد رہے
یہ تصور نہ رہے کل کیلئے جینا ہے

ولولے اتنے ہوں سرکش کہ خیالات کا لاوا برسے
اور پھر سلسلۂ سود و زیاں کے حلقے
ٹوٹ کے خاک پہ یوں تڑپیں کہ جیسے کتنے
خواب دیرینہ ہوئے یادوں کی خلش چھوڑ گئے

میں نے سوچا تھا جہنم ہی میں رہنا ہے اگر!
کیوں نہ گمراہ رہوں اور ہر اک منزل پہ
دل پکارے کہ کوئی اپنا ہے کوئی اپنا ہے
دوست یا دشمنِ جاں آ جائے
صرف میں اتنا کہوں
توڑ دو خوف کی زنجیروں کو
اور کوئی بھی سہارا نہ ہے
اس جہنم میں یہی کافی ہے ہم سرکش ہیں!

مگر ایسا نہ ہوا
دوست یا دشمنِ جاں
خود فریبی کے طلسمات میں آتے ہیں اسیر
اپنے جینے کا صلہ مانگتے ہیں
آج تک سلسلۂ سود و زیاں باقی ہے

قیصر الجعفری

غزل

پھولوں کا غم کہیں کہ حدیثِ صبا کہیں
چپ ہیں چمن میں لوگ، کہیں بھی تو کیا کہیں

در پردہ تم بھی خونِ تمنا میں ہو شریک
قاتل کسے کہیں جو تمھیں آشنا کہیں

اڑتا ہے جو غبار، برستا ہے ذہن پر
وہ دل کہاں سے لائیں جسے آئنہ کہیں

کانٹے چبھیں تو پاؤں کی رفتار تیز ہو
چھالے لہو اڑائیں تو ہم مرحبا کہیں

یونہیں رواروی میں گذرنے سے فائدہ؟
کچھ چھوڑ جائیے کہ جسے نقشِ پا کہیں

قیصرؔ کشاکشِ غمِ دوراں ہے اور ہم
اس زندگی کو جرم کہیں یا سزا کہیں!

ایک غلط فہمی

بمبئی کے ماہنامے "صبح امید" نومبر [illegible] میں ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کا ایک خط چھپا ہے جس میں "دور حیات" کا بھی ذکر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے۔

"۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مسٹر قاضی (مرحوم سید غیاث الدین) نے اپنے رسالہ "دور حیات" کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس ہفت روزہ کا واحد مقصد یہ ہوگا کہ حکومت کی صنعتی اور حرفتی اسکیموں سے اردو دان طبقہ کو آگاہ کیا جا سکے تاکہ قومی ترقی میں وہ بھی اپنے ہموطنوں کے دوش بدوش چل سکیں لیکن گزشتہ تین سال سے رسالہ مذکور نے ایک "صنعتی نمبر" بھی شائع نہیں کیا۔ اگر یہی سرمایہ جو رسالہ مذکور پر لگایا گیا ہے "صبح امید" کو دیدیا جاتا تو قاضی صاحب ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہو جاتے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دور حیات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب شدید غلط فہمی کا شکار ہیں اگر رسالے کا واحد مقصد اردو دان طبقہ میں صنعتی بیداری پیدا کرنا ہوتا تو ہندوستان بھر کے ادیبوں کا تعاون حاصل کرنے کا اور تخلیقات کا معاوضہ پیش کرنے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ منجملہ کئی مقاصد کے دو صفحات کا یہ بھی ایک مقصد تھا جسے ڈاکٹر نامی نے واحد مقصد قرار دیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں دور حیات کے پہلے شمارہ کا اداریہ ہوتا (جسے وہ اب بھی پڑھ سکتے ہیں) تو وہ شاید ایسی بات نہ لکھتے۔

دوسری بات سرمائے سے متعلق ہے۔ اس باب میں بھی ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ دور حیات میں نہ قاضی صاحب مرحوم کا ذاتی سرمایہ لگا ہے اور نہ ہی کسی ادارے کا۔ مولانا آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ کا صرف نام ہی نام تھا ورنہ شروع ہی سے دور حیات کا ٹرسٹ سے تعلق ختم ہو چکا تھا اور وہ چند ہمدردوں کی مدد سے آگے بڑھ رہا تھا جن میں بلا شبہ قاضی صاحب بھی تھے۔ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد دور حیات کے انتظام کی ذمہ داری ایک سوسائٹی نے سنبھال لی جو پبلک رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ بھی ہے۔ یہ سوسائٹی جس میں بمبئی کے سربرآوردہ ہمدرد اور ادب دوست شخصیتیں شامل ہیں اس کے اخراجات کی کفیل ہے۔

یہ باتیں دور حیات کے صفحات پر کئی بار دہرائی جا چکی ہیں لیکن شاید ڈاکٹر صاحب نے ان پر توجہ نہیں کی امید ہے کہ اب، دور حیات کے بارے میں یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ مرحوم قاضی صاحب کے ذمے سرمایہ لگانے یا دینے کا فرض نہیں تھا بلکہ وہ ایک اچھا معیاری اور مفید پرچہ نکالنے اور چلانے کے خواہشمند تھے۔ وہ اس خواہش کو پورا نہیں کر سکے۔ اب یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے کہ ہم ان کی خواہش کی تکمیل کی کوشش کریں۔

میں نے "صبح امید" کا وہ نمبر نہیں دیکھا جس کی ڈاکٹر نامی نے تعریف کی ہے ورنہ میں بھی ان کا ہمنوا ہو جاتا۔

فیصل مظہر حسین

سید محمد ہادی

ہندپاک دوستی کیلئے چند تجاویز

۳۰ اکتوبر سنہ ۶۴ء کی اشاعت میں ایک
چھوٹا سا مضمون "دورِ حیات" میں ہندوستان اور پاکستان
کی دوستی کے متعلق آپ نے چھاپا ہے اور اس میں چند تجاویز
تعلقات کو بہتر بنانے کی ——— پیش کی گئی ہیں مثلاً
یہاں کے بہت سے طلبہ وہاں لکھنے پڑھنے کیلئے جائیں اور
وہاں کے یہاں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئیں اور مال
تجارت بہت سا وہاں سے یہاں آئے اور یہاں کا وہاں
جائے وغیرہ وغیرہ۔

میری رائے ناقص میں یہ سب تجاویز قبل از وقت ہیں
جو تیزی اور گرمی اور شدت ان بیس پچیس برسوں میں ان دونوں
حصوں میں رہی ہے وہ ابھی کل کی بات ہے اور لوگ ان کی
تلخیوں کو نہ ادھر بھولے ہیں نہ ادھر۔ اس لئے ایسی خیرسگالی
کی تجاویز محض کاغذی ہونگی اور قبل از وقت ہونگی۔
یاد رکھنا چاہئے کہ سخت امراض کی دوا بھی زیادہ تلخ ہوتی
ہے۔ اسلئے نفسیاتی اور فطری اور حقیقت پسندی کا تقاضا
آج یہ ہے کہ مرض کو اپنے نیچرل کورس پر ابھی دس بیس
برس اور چلنے دیا جائے۔ ان دس بیس یا تیس برسوں میں
کسی کا کچھ بگڑا نہیں جاتا ہے۔ ممالک کی تاریخ میں دس
بیس برس کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے۔

جب ایک عملداری جاتی ہے اور دوسری آتی ہے
تو نئی آنیوالی عملداری کو پرانے ہوا خواہ کبھی پسند نہیں کیا
کرتے۔ چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ کیا آپ
نے دیکھا نہیں کہ مغلوں کے آنے پر پٹھانوں نے ان کو تادیر
ہندوستان میں جمنے نہیں دیا اور ہمایوں پچیس برس تک
ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اکبر بادشاہ کو تمام عمر پٹھانوں
سے جنگ کرتا رہنا پڑا۔ راجپوتوں کو اس نے صرف اسی لئے
اتنا اپنایا کہ وہ پٹھانوں کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں
نہیں رہ سکا تھا۔ برطانوی طاقت آئی تو مغلوں اور
ہندوستان کے دوسرے عظیم راجاؤں اور بادشاہوں کو
تباہ کرنے میں کمال دانشمندی سے برطانیہ نے پورے سو سو
برس لگا دئے اس لئے کہ قدم جما جما کر آگے بڑھایا جائے۔
سب جانتے ہیں کہ ٹھگوں پنڈاریوں اور چھوٹے موٹے
رجواڑوں کی لڑائیاں پورے سو برس تک ہوتی رہیں
وہی شکل آج ہے۔ عجلت کرنے کی ضرورت نہیں۔
سیاسی بصیرت اور دوربینی کی ضرورت زیادہ ہے۔
پشت در پشت گذر جانے پر انشاء اللہ وہ وقت آجائیگا
جبکہ ایسے لوگ نہ ادھر ہونگے نہ ادھر ہونگے جنہوں نے
تقسیم کا خونچکاں منظر اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ بیس
یا تیس برس کی بات ہے۔ انشاء اللہ ادھر اور ادھر صرف ایسے لوگ
سطح پر رہ جائینگے جنہوں نے ان واقعات کی تفصیل
یا تو صرف پڑھی ہوگی یا سنی ہوگی۔ ظاہر ہے شنیدہ کے بود مانند دیدہ"
وہ مجموعۂ افراد ادھر بھی ادھر بھی ایسا ہوگا جو شاید اس
تلخ کامی کے ساتھ نہ سوچے جیسے کہ آج کے لوگ سوچ
رہے ہیں۔ ادھر بھی اور ادھر بھی۔

ہاں نفسیاتی اور فطری طور سے وہ ایسا وقت ہوگا
جبکہ آپ کی یہ پانچ اور بہت سی تجاویز بروئے کار آسکیں
گی۔ میدان جنگ میں جبکہ تلواریں چمک رہی ہوں۔
گولیاں برس رہی ہوں پل ٹوٹ رہے ہوں دیار و معابد
میں آتشزدگیاں ہو رہی ہوں۔ گھر جل رہے ہوں۔
اسوقت کسی کا یہ کہنا کہ دوستی کا ہاتھ بڑھایا جائے ایک غیر
نفسیاتی غیر فطری اور حقیقت پسندی کے خلاف ایک شے ہے۔
آپ نے تاریخ میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کہ جرمنی انگلستان
فرانس۔ امریکا اور روس کی آپس میں کیسے کیسے دشمن
رہ چکے ہیں۔ لیکن دو چار نسلوں کے بعد حالات
واقعات عالم نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ یہ سب آج
آپس میں دوست بنے ہوئے ہیں۔ ایک دن باری
تعالیٰ ہمارے لئے بھی لائیگا کہ در و دیوار سے اتحاد
و اتفاق کی آوازیں نکلیں گی اور یہ عقدۂ لاینحل
خود بخود حل ہو جائیگا۔

زلف سے نہیں کھلتا ہے کار بستہ حیران ہوں
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر بہ آسانی

رشیدہ ملا

کچھ مرغیوں کے بارے میں

"زارِ روس کے زمانے میں مرغیوں کو گیہوں کی روٹی کھلانے پر روسی حکومت نے ایک عورت کو گرفتار کرلیا" —— ایک خبر

عالم تبصرہ نگار (ادارہ خواتین عالم) کی جگہ فاضل پڑھیں) نے تبصرہ فرماتے ہوئے بندی کو صلاح دی کہ فرصت کو غنیمت جانے اور مرغیوں کی یاد میں آنسو بہانے کی بجائے کچھ ٹھوس کام کرے یعنی ریسرچ کرے۔ از راہ مہربانی آپ نے موضوع بھی تجویز کر دیا۔ جی ہاں، پہلے انڈا یا پہلے مرغی، والی پہیلی بوجھنی تھی۔ سنا ہے صدیوں سے دانشور اس مسئلہ پر سوچ رہے ہیں مگر ریسرچ خرچ کے باوجود ہنوز جہاں کے تہاں ہیں۔ تھاہ ہی نہیں ملتی۔ ہم تو صاحب بہت کم سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ نہ مرغی پہلے آئی نہ انڈا۔ پہلے تو مرغے میاں گھڑے گئے۔ پھر ان کی پسلی سے مرغی بیگم کٹ کٹ کرتی تشریف لائیں اور پھر انڈا اتحادِ باہمی کا پیغام لے آیا۔ سوچنے کی بات ہے جس خدا نے حوا کو اولیت نہ دی وہ مرغی کو کیونکر پہلے پیدا کر دیتا —— اوہ آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس روسی عورت کا کیا بنا۔ نئے اخبارات اس ضمن میں خاموش ہیں۔ سنا ہے کہ قیاس کا گھوڑا یہ خبر لایا ہے کہ وہ جیسی گئی تھی اس سے آدھی ہو کر باہر نکلی۔ نہ ذہن میں مسئلہ کا حل تھا اور نہ قبل ازیں کتاب۔ قیدخانے میں ذہنی ورزش صرف بڑے لوگ کرتے ہیں۔ چھوٹوں سے کولہو کے بیل کی طرح جسمانی مشقت لی جاتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح پڑھی تو معلوم ہوا کہ ایک بار چنا حضورِ میکائیل میں حضرت انسان کی گستاخ دہنی کی شکایت لے کے پہنچا کہ کونپل جیسے ہی نکلتی خلق خدا کے منہ وا ہو جاتے ہیں۔ ساگ بنتا ہے۔ جو بچے بھونے جاتے ہیں گھنگنی پکائی جاتی ہے اور ......

تفصیل یاد نہیں۔ قصہ مختصر چنے میاں کے بیان کا لب لباب یہ تھا کہ تا دم حیات اسے دانتوں کی چکی میں پیسا جاتا، چنے کی بیسنی ٹکیاں تل کر فرشتوں کی نیت بگڑ گئی اور سب کے سب کھانے دوڑ پڑے۔ بیچارے کو بھاگتے ہی بنی۔ معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ مرغی برادری بھی خدمت میکائیل میں حاضری کا ارادہ رکھتی تھی مگر چنے کا حشر دیکھ کر ہمت نہیں ہوئی۔ چنا پیدائش کے بعد کام و دہن کی آزمائش سے گذرتا ہے اور مرغی آنکھ کھولنے سے پہلے ہی تیر بہدف کا نشانہ بنتی ہے۔ چنے کی چٹکی جیسی شخصیت نے فرشتوں کا ایمان متزلزل کر دیا تو مرغیاں تو دفعتاً اعتبار سے ملاؤں کے ایمان کا جز بن گئیں۔ ملاؤں پر ہی کیا موقوف ہے ہم سے پوچھئے تو عرض کریں کہ مرغی کا ضیافت کے بغیر تصور بھی نہیں جا سکتا۔ وہ تقریب کچھ بھی ہو۔ بے مرغی پارٹی کرنے میں کیا مزہ رکھا ہے! اس سے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی بھبھوت مل کر ہمالیہ کی گپھا میں چلا جائے۔ سائنس کی ترقی سے ہم بیحد خوش ہیں کہ پیڈرو کے بھاگوں پولٹری فارم کھلے۔ ورنہ اس قحط الزماں کے زمانے میں جبکہ چیز کار مشکل سے ملتے ہیں لیڈروں کی تواضع کے لئے مرغیاں کہاں سے آتیں۔

پالنا عورت کے خمیر میں داخل ہے۔ بچوں کے علاوہ بھی وہ الا بلا بہت سی چیزیں پالتی ہے۔ مثلاً روگ، سوگ اور کبھی کبھار رشتہ بھی۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ مرغیاں پالنے کا کام صرف عورتیں کرتی تھیں چونکہ پالنا ایک مشقت طلب امر ہے اسلئے مرغیاں ضرورتاً زیادہ پالی جاتی تھیں اور تقریباً کم ضرورت کھانے کھلانے کی بھی ہوتی تھی۔ زیادہ ان کا خرچ نکالنے کی بھی۔ اب تو یہ خالص گھریلو کام گھر بدر ہوا جا رہا ہے۔

پولٹری فارم کیا وجود میں آئے کہ کایا ہی پلٹ گئی عورتوں کی جگہ مرد سنبھالے ہوئے ہیں اور نوکروں کی جگہ مشینیں آگئی ہیں۔ رہی مرغیاں سو ان کا تو یہ عالم ہے کہ رہائی جھنجھٹ نہ سینے کی دعا دیتے ہیں سائنس کو کہ لے دے کے بس ایک ہی کام کرتی ہیں انڈے دینے کا اور انڈے دینے کے بعد شتر بے مہار کی طرح یوں اینڈتی پھرتی ہیں گویا انڈا نہ دیا ہو رفع حاجت کی ہو۔

شیر شیرنی سے زیادہ شاندار ہوتا ہے۔ مور مورنی سے زیادہ بہتر نظر آتا ہے اور مرغا مرغی سے زیادہ موہنی شکل رکھتا ہے سینہ پھلا کے، اکڑ اکڑ کے یوں مرغا بنا پھرتا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیئے۔ مرغے کو اپنی مردانہ وجاہت، ہیبت پر بڑا ناز ہے۔ علی الصبح جبکہ دنیا پڑی سوتی ہے بانگ دے کر اظہار ناز کرتا ہے تاکہ سند رہے اور دن بھر کام آئے مرغی کی بانگ صرف مرغیوں کو مرعوب کرنے کے لئے ہوتی ہے اللہ والے کہتے ہیں کہ نمازیوں کو خواب غفلت سے جگانے کیلئے صدا لگاتا ہے ایسی کوئی بات نہیں مرغا موذن تھوڑے ہی ہے کہ نماز کا اہتمام کرتا پھرے فلمی گانے وہ گا نہیں سکتا۔ سیٹی وہ بجا نہیں سکتا۔ پریم پتر وہ لکھ نہیں سکتا۔ اللہ نے گلا دیا ہے بس اسی سے جنس لطیف کو ورغلانے کا کام لیتا ہے۔ اور لوگ ہیں کہ غریب کے گلے کو مذہب کے شکنجے میں جکڑ لینا چاہتے ہیں۔ مرغیاں مرغوں کی اکڑ فوں سے قطعی نالاں نہیں کیونکہ سمجھتی ہیں کہ ناز بانداز اور ادا فطری ہے۔ مرغے مرغیوں کی [illegible] کو اہمیت نہیں دیتے کیونکہ جانتے ہیں کہ جو برستے ہیں وہ گرجتے نہیں۔

اگر آپ کے پاس ایک عدد لمبی سی کار، ایک عدد گڑیا سی میم صاحب، ایک عدد گھنے بالوں والا کتا اور تین چار عدد چھوٹا صاحب ہوں تو آپ یقیناً امیر کہلائیں گے کہ انہیں معقولات سے امارت معلوم کی جاتی ہے۔

رہی ماکولات کا معاملہ تو عرض ہے کہ ہر صاحب زر کیلئے مرغی کھانا ضروری ہے۔ بالفرض اگر آپ سبزی خور ہیں تو پھر شریکِ گفتار پر صبر کیجئے کہ سوائے اسکے کوئی چارہ ہی نہیں۔ واللہ پیٹ کسی مقدر نہیں پھر کیا کریں کہ بنا کے رہا نہیں جاتا کہ شری کھنڈ میں وہ بات کہاں جو بوٹی مرغ کی سی یعنی میاں مرغے کی سی یا بی مرغی جیسی ان کی آل اولاد کی طرح آپ کو شاید معلوم نہیں کہ خان خاناں ایک ملازم محض اس بنا پر مصاحب بنا دیا گیا کہ وہ مرغی شناس نکلا۔ مرغی شناسی کو اسلئے اہمیت دی گئی کہ وہ عہد رفتہ کی مرغی خوری کا ٹھاٹ تھی اور مرغی خوری کی اس لئے سرفرازی کی گئی کہ وہ امارت کی مظہر تھی اور یہ نیک فریضہ خان خاناں نے اسلئے انجام دیا کہ وہ میر الامرا رہا تھا اور امیروں کو نوازنا اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ تذکرہ یہ کہ خان خاناں کے انہی کاموں نے اُسے جانِ جاناں بنا دیا تھا۔

مرغی خور کا ذکر غیر حرام خور کی یاد دلاتا ہے مگر میں بیان مرغی چور کا کھولوں گا۔ خیال رہے مرغی چور اس تاریخی طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جو انقلاب فرانس کے ایام میں روٹی مانگنے ملکہ کی محل تک جا پہنچا تھا اور جسے ملکہ نے یہ کہکر چلتا کر دیا تھا کہ روٹی نہیں ملتی تو کیک کیوں نہیں کھاتے۔ چرانا چونکہ فعل قبیح ہے اسلئے چور کو بنظر ذلت دیکھتے ہیں ہم آپ حق بجانب ہیں۔ مرغی چور کے ساتھ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اُسے نہ صرف ذلت بلکہ حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہم نے تو لوگوں ہی کہتے سنا ہے "ہت تیرے کی مرغی چرائی۔ ارے کا یہ چرائی ہوتی وونڈیا چرائی ہوتی، عزت چرائی ہوتی۔ شرم نہیں آتی مرغی چراتے ہوئے"۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کی پیٹھ ٹھونکنا چاہئے جو بولتی شے کو چرانا کمالِ جرأت چاہتا ہے۔ مرغی چور کی تعریف میں زبان فارسی میں ایک بڑی اچھی مثل رائج ہے جو فی زمانہ یاروں کے ذہن سے اتر گئی ہے لہٰذا یاد دہانی درج کئے دیتے ہیں۔ "چہ دلاور است دزدے کہ درکف مرغ دارد"۔

مرغی چور نوٹ فرمالیں کہ ہم یہ کار ثواب فی سبیل اللہ انجام دے رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ستائش کی تمنا یا صلہ کی پروا ہرگز نہیں ہے۔

لوکیوسیلن کی سفارش پر اٹھارہ دیشوں نے اپنا قومی پرندہ چنا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ بھارت سرکار مرغ کا چناؤ کرےگی کہ بلحاظ شہرت تاج محل کے بعد مرغ مسلّم کا نمبر آتا ہے۔ فہرست دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ مسند اعزاز پر مور براجمان نظر آیا۔ معلوم ہوتا ہے جج صاحبان صورت کے غلام تھے۔ جم جم کرتے پروں کو دیکھ کر لٹو ہو گئے اور جو اپنی جان پہ کھیل کر پیٹ کو طراوٹ بخشتا ہے اسے یکسر فراموش کر بیٹھے۔ دل کو بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے کہ حکومت شمال نے شتر مرغ کو اپنا قومی پرندہ قرار دیا ہے۔ افسوس صرف یہی ہے کہ شتر مرغ شتر زیادہ اور مرغ کم ہوتا ہے۔

اردو کی ایک مشہور کہاوت ہے "گھر کی مرغی دال برابر" ہیں تو سچ پوچھئے اس کہاوت میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر ہماری بیگم کے پندار کو اس سے ٹھیس پہنچتی ہے۔ انکا خیال (خیالِ خام) یہ ہے کہ چونکہ صرف مرغی کا بنیا مردوں کے تصرف میں ہے اسلئے جنسی فرق برقرار رکھے گئے زبان دانوں نے باہم سازش کرکے مرغی کی مٹی پلید کرادی ہے۔ کئی بار کہا کہ بابا یہاں مرغی سے فرد نہیں بلکہ جماعت یعنی برادری مراد ہے مگر وہ میری سنتی ہی نہیں۔ بقول شخصے انکا تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ والا معاملہ ہے۔ جان مصیبت میں پڑی ہے بتائیے کیا کروں؟ ادھر بیگم مرغا مرغی کی بحث لئے بیٹھی ہیں ادھر صاحبزادے ہر روز اسکول میں مرغی بنائے جاتے ہیں اور صاحبزادی آئے دن بیاض پر انڈے لے کر آتی ہیں۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے اپنی تو یہ حالت ہے کہ سپنا دیکھتے ہی پکار اٹھتے ہیں۔

؎ کہ بیچارے کے اعصاب پہ مرغی ہے سوار

جسطرح ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے اسی طرح مجھے ہر سو مرغیاں ہی مرغیاں دکھائی دیتی ہیں۔ معذرت بھی اپنی خوشی سے نہیں لکھا مرغیوں نے لکھوایا ہے۔

غزل

کیلاش ماہر

خون پلکوں پہ جما ہو جیسے — شاخ میں پھول کھلا ہو جیسے!

اپنی رسوائی ہے شہروں، شہروں — بے گناہی کی سزا ہو جیسے!

پرسشِ غم پہ ترا چپ رہنا — صدمۂ ترکِ وفا ہو جیسے

لوگ تکتے ہیں سرِ راہ مجھے — میری ہی لغزشِ پا ہو جیسے

آج بھی زلفِ دوتا کا سایہ — غمِ ہستی کی دوا ہو جیسے

اُڑ گئی نیند مہ و انجم کی — تیرا افسانہ چھڑا ہو جیسے

عشق پابندِ روایت ہوگا، — یہ بھی قسمت میں لکھا ہو جیسے!

میں خلاؤں میں کھڑا ہوں مبہوت — ہر صدا اسکی صدا ہو جیسے

ابن فرید

رشید احمد صدیقی بحیثیت نقاد

رشید صاحب کی نقادانہ حیثیت پر لکھتے ہوئے بے ساختہ رشید صاحب کے ایک صدارتی خطبہ کے وہ جملے یاد آتے ہیں جو انھوں نے نقادوں کو عبرت دلانے کے لئے فرمائے تھے۔

تنقید اور تنقید نگار کے سلسلے میں یہاں ایک بشارت کا اعلان ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ آپ نے بچپن میں ایک روایت سنی ہوگی کہ جب ملک الموت ہر ایک کی روح قبض کر چکیں گے تو باری تعالےٰ فرمائے گا کہ اب ملک الموت کی روح قبض کرو اس وقت یہ چیختے چنگھاڑتے مشرق کو بھاگیں گے کبھی مغرب کو، کبھی اتر کو کبھی دکھن کو، کبھی نیچے کبھی اوپر لیکن ان کی ایک پیش نہ جائے گی اور ان کو پچھاڑ کر ان کی روح قبض کر لی جائے گی۔

ہمارے تنقید نگار ملک الموت کے اس انجام کو نہ بھولیں۔

رشید صاحب ادب میں "ملک الموت" کی حیثیت سے کم اور "رشید صاحب" کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا اصل موضوع طنز و مزاح سے بھرپور انشائیہ نگاری ہے جس میں انھوں نے نازک خیالی، ژرف نگاہی، ندرت بیان، بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے ایسے نمونے پیش کئے ہیں کہ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا ہے۔ لیکن انشائیہ نگاری سے ہٹ کر انہوں نے کبھی کبھی تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ تنقید ان کا اصل میدان نہیں ہے اسلئے اس طرف شاذ و نادر ہی متوجہ ہوتے ہیں مگر جب توجہ کرتے ہیں تو بقول کلیم الدین احمد ٹھنڈے دل سے سمجھ بوجھ کر" لکھتے ہیں اور " سنجیدگی اور متانت کا برابر خیال رکھتے ہیں "۔ رشید صاحب کا تنقید کے میدان میں معاصرین نے انہیں بھی "ملک الموت" بنا دیا ہے اور اب چاہے وہ مشرق کو بھاگیں یا مغرب کو، اتر کو یا دکھن کو، نیچے یا اوپر، لیکن تنقید نگاروں سے ان کی ایک پیش نہیں جاتی، کیونکہ بقول کلیم الدین احمد "ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں" اور جب مل جاتے ہیں تو جا ہے لاکھ پردوں میں چھپیں پہچان لئے جاتے ہیں

رشید صاحب کا بھی یہی حال ہے۔ باوجودیکہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے نقادوں کے لئے اس کا اعتراف کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

رشید صاحب نے صرف تنقید کی ہے بلکہ تنقید میں بھی اپنا منفرد اسلوب اختیار کیا ہے تنقید نگار خواہ ملک الموت ہی کیوں نہ ہوتا ہو لیکن انھوں نے کبھی اس بد مذاقی کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ وہ روح قبض کرنے بھی آتے ہیں تو انتہائی شرافت، مروت اور دل داری سے کام لیتے ہیں۔ ان کے اس مزاج کو اکثر ناقدوں نے غلط سمجھا ہے چنانچہ کلیم الدین احمد نے اسے "کج روی" قرار دیا ہے۔ آل احمد سرور کے نزدیک "وہ بہت سے اچھے پہلوؤں پر نظر نہیں کر پاتے .... وہ بہت سے قیمتی تجربات کو نہیں پرکھ پاتے"۔ پرنسپل عبدالشکور سمجھتے ہیں کہ "رشید صاحب کی تنقیدی نظر کس حد تک محدود ہے"۔ رشید صاحب پر یہ تنقیدیں تنقیدیں نہیں محاکمے ہیں۔ کیونکہ رشید صاحب تنقید کرتے ہوئے کبھی جارحیت کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ ان کی سنجیدگی اور متانت انہیں کچھ حدود کے اندر رکھتی ہے جس کی بنا پر وہ غالب، اقبال کا بھی اعتراف کرتے ہیں اور فانی اور اکبر کا بھی! — اپنے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے وہ اپنی نظر صرف متعلق باتوں پر رکھتے ہیں، غیر متعلق پر وہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ ان کے یہاں تنقیدی موازنہ ہوتا ہے لیکن مرعوب کرنے کے لئے چھوٹے بڑے ناموں کو جمع کرنے کی کوشش نہیں ہوتی۔

یہ اصول ان کے یہاں وزن اور وقار پیدا کرتا ہے۔ نقادوں نے ان کے اس سلجھے اور پاکیزہ شعور کا احساس کرنے کے بجائے انہیں "کج رو" یا "محدود تنقیدی نظر کا حامل" قرار دے دیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تنقید میں ایک ہمدردانہ اور صحت مند رجحان کو متعارف کرایا ہے۔ وہ تنقید کو ایک خوشگوار فریضہ بنانا چاہتے ہیں۔ تخریب یا تبلیغ کا آلہ نہیں چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ:

میں ادب میں تخلیقی اپج کی خود روی یا بیگانہ روی کو جتنا سراہ سکتا ہوں تنقید میں اسی قدر اصولوں سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی کا قائل ہوں۔

اصولوں سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی ان کی تنقیدوں میں قدم قدم پر نظر آتی ہے جو انہیں صرف ناقد ہی نہیں بلکہ ادب کا مزاج داں بھی بنا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ ادیب یا ادب کے بارہ میں حسن کے پہلو زیادہ تلاش کرتے ہیں اور ان کی دل کھول کر داد دیتے ہیں لغزشوں پر وہ ہیچ تاب کھانے بلکہ دردمند مصلح کی طرح دل جوئی سے کام لیتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ بات تنقید کے لئے کچھ زیادہ موزوں و مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ علی گڑھ رشید صاحب کے ہر موئے بدن میں سرایت کر چکا ہے۔ سرسید نے اپنے اصلاحی تحریک میں اس حکمت کو پیش نظر رکھا تھا، حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں بڑی جرأت مندی سے کام لیا تھا احترام و اعتراف کا دامن ان سے بھی کسی مرحلے پر نہیں چھوٹا تھا۔

رشید صاحب نے بھی غلطی کی۔ وہ کہ اس اصلاحی انداز کو
اختیار کیا اور زورِ حق شعر کی وہ دلکشی میں اسے مدنظر
رکھا بلکہ مزاحاً تنقید میں بھی اسے برتنے پر مجبور ہو گئے۔
جس نے ان کے بیان میں علم، بردباری، سنجیدگی، متانت اور
وقار پیدا کر دیا۔ رشید صاحب بھی اگر چاہتے تو تنقید کی بجائے
کے اعصابی تشنج کے میلاپ میں بہتے تو شاید ان کے یہاں
وہ حاصل نظر نہ آتے جو اب نظر آ رہی ہیں۔

تنقید کے سلسلے میں رشید صاحب کے کچھ واضح اصول
ہیں جن کے ذریعہ نہ صرف اصول تنقید سے آگاہی ہوتی ہے
بلکہ رشید صاحب کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے میں بھی بڑی
مدد ملتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان کی تشریح ان ہی کے الفاظ میں
پیش کی جائے۔

تنقید کی دو بڑی اور منفرد حیثیتیں ہیں ادبی اور انسانی
ادبی تنقید تمام تر کارناموں سے سروکار رکھتی ہے، اور انسانی
تنقید شخصیتوں سے۔ یہاں تک، یہاں ایک دوسرے میں خلط
ملط ہونے کے باوجود ان دونوں قسم کی تنقیدوں کی الگ الگ
پہچان بڑی آسانی سے پہچانی جا سکتی ہیں جن کے پیش نظر ہمیں
ہر دور میں تنقید کے دو مختلف دبستان نظر آتے ہیں۔ ان
میں آپس کے بعض فروعی اختلافات کے علاوہ ایک بڑا
فرق ہمیشہ اس فن یا انسانی معیار قدر کا رہا ہے۔

زاویہ نظر کی اک ذرا سی تبدیلی تنقید کے دو اہم پہلو اجاگر
کرتی ہے یعنی مقصدی اثر یا تجزیہ۔ بعض خلط ملط ہونے کے
امکانات یہاں بھی کچھ کم نہیں لیکن تنقید کا رجحان دیر تک
چھپا نہیں رہتا اور ہم بڑی آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں
کہ نقاد نے بے فکر و کاوش تجزیہ کیا یا نادارانہ نتائج کو
پیش کر دینا ہی کافی سمجھا ہے یا اس کو توجیہ و تعبیر کے لئے
اس کے سبب اور اثر اور مقصد کا تعین بھی ضروری خیال
کیا ہے۔

تفصیلات میں آئیں گے تو ان پہلوؤں کی نوعیت تبدیل ہوتی
جائیگی اور تنقید کا خام مواد ہمیں زندگی اور اس کی
عکاسی کی مختلف شکلوں اور منزلوں میں ملے گا مثلاً تنقید کے
دو ازلی مطالبات صداقت سے متعلق ہیں یعنی ناقد ادیب
سے کس نوعیت کی عکاسی کا طالب یا خواہاں ہے؟ جو موجود ہے
یا وہ جو ہونی چاہئے۔ یا مثلاً حسن و صداقت میں سے کون سی
قدر زیادہ اعلیٰ اور برتر ہے اور جب ایسے موقع پیش آ جائیں کہ
جہاں حسن کا مطالبہ کچھ اور ہو اور صداقت کا تقاضہ کچھ
اور تو کس کو ترجیح دی جائے؟

ان امور کی روشنی میں اگر ہم رشید صاحب کی تنقید کا
جائزہ لیں تو ہمیں وہ نہ تو خالصتاً ادبی نقاد نظر آتے ہیں
اور نہ خالصتاً انسانی نقاد۔ بلکہ ان کے یہاں ان دونوں
حیثیتوں کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

ادبی نقاد کی حیثیت سے وہ اصولوں سے قریب
اور معیار روی پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ چنانچہ انہیں حضرت
عبدالرحمن بجنوری اور حالی کے یہاں بھی ایک طرفہ پن نظر
آتا ہے حالی کے یہاں انہیں آرٹ کی بات ہلکی ہوتی
نظر آتی ہے۔ وہ (حالی) اصلاح پسندی جذبہ
کر کے نقد جانچتے نہیں بلکہ تبلیغ کرنے کا وسیلہ بنا لیتے ہیں۔
یہ ان تمام بے راہ رویوں کی بڑی اچھی نشاندہی کرتے
ہیں جنہوں نے تنقید کو اس کے جائز منصب سے ہٹا کر اسے
تبلیغ شاعری یا مبالغے میں محدود کر دیا ہے۔

انسانی نقاد کی حیثیت سے وہ ادب و شخصیت
کی باہمی اثر اندازی کا اعتراف کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں
ان کا یہ فقرہ ادب اور ادیب کے تعلق کے سلسلے میں بہت مشہور
ہے کہ کوئی شاعر بڑا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مقبول آدمی
نہ ہو۔ تنقیدی نظریہ کی حیثیت سے اس رائے سے
شدید اختلاف کیا گیا ہے لیکن رشید صاحب جس پہلو پر
زور دینا چاہتے تھے اس پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ فقرہ واضح
طور پر اس حقیقت کا غماز ہے کہ رشید صاحب ادب میں مقصد
کے علمبردار ہیں۔ یہ مقصدیت، بقول آل احمد سرور صاحب کے
ایک اخلاقی تصور کی نمائندگی کرتی ہے، لیکن مقصدیت کے
سلسلے میں وہ بے محابہ تجلی کے بجائے حجاب اور جلوے کے
بجائے نقاب کے زیادہ قائل ہیں "۔ اس حجاب اور نقاب
کے باوجود رشید صاحب کو اعتراف ہے کہ۔

فن کو شخصیت یا شخصی رجحانات سے الگ کر کے رکھنا
اور دیکھنا ایسا ہی ہے۔ جیسے "اندرون قعر دریا تختہ
بند کر دئے جانے والوں سے "دامن تر مکن" [1]
کی توقع رکھی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رشید صاحب خود بھی فن کو اپنی
شخصیت یا اپنے شخصی رجحانات سے الگ رکھنے
میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ وہ جب فانی پر
قلم اٹھاتے ہیں تو انہیں غالب اقبال سے بھی
آگے بڑھاتے ہیں۔ اس لئے کہ فانی کے یہاں غم
کے ساتھ وفاداری ہے اسی طرح جب جگر کی غزل
گوئی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں
کہ موجودہ بحرانی و ہیجانی دور میں غزل جگر
ہی کے سہارے آگے بڑھے گی "۔ فانی و جگر کے سلسلے
میں یہ فیصلے اگر ایک طرف فنی ہیں یا "ادبی" تو
دوسری طرف شخصیاتی یا انسانی بھی ہیں کیونکہ رشید
صاحب کے ذہن پر ان دونوں شعراء کی شخصیات
کے بڑے حسین اثرات تھے۔ وہ اصولی حیثیت
سے فن اور ادب کی تقسیم تو کر لیتے ہیں، لیکن عملاً
یہ تقسیم ان کے لئے ممکن نہیں ہوتی کیونکہ ان کے نزدیک
فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں
ہیں ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا
یا اس سے علیحدہ ہو۔

چنانچہ جب بھی وہ نقد و تبصرہ کی طرف مائل ہوتے
ہیں تو تنقید کی انسانی حیثیت کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں
مقصدی تاثر کو وہ بہرحال اہمیت دیتے ہیں۔
تنقید محض کی وہ کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن
جلد ہی ان اصولی باتوں سے گھبرا جاتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کے نزدیک "رشید احمد صاحب
نے بعض بنیادی مسئلوں کی طرف توجہ دی ہے" اس لئے
کہ اردو ادب کے بنیادی مسائل یا اصول ادب سے
ان کی واقفیت گہری ہے۔ رشید صاحب کے اس وصف
کا اعتراف تقریباً ہر نقاد نے کیا ہے کہ ان کا رجحان

---

[1] اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ ای — باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش
(دریا کی گہرائیوں میں تختے سے باندھ کر ڈال دیا اور اب کہتے ہو کہ دیکھنا دامن تر نہ ہونے پائے ہشیار رہنا۔) ایڈیٹر

کلاسیکی ادب کی طرف ہے وہ اپنے ماضی سے وابستہ رہنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد کے خیال میں اس رجحان نے انھیں روایتی نقاد بنا دیا ہے۔

لیکن ادب کے معاشرتی ورثہ اور تہذیبی پس منظر کو اگر زیادہ اہمیت دی جائے تو جدید ادب کو اس کے ماضی سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ادیب و شاعر کا ذہن ایک دن میں نہیں بنتا، معاشرے کی دور رس حیثیتیں ایک دن میں متعین نہیں ہوتیں اور نہ علائم و رموز ایک شب میں عام فہم ہو جاتے ہیں بلکہ ادیب و شاعر نسلاً بعد نسلاً خیال و فکر کی دنیا آباد کرتا رہتا ہے تب کہیں جا کر وہ اور اس کا قاری اس سے مانوس ہوتے ہیں۔ یہی حال قدروں کا بھی ہے جن کے استحکام کے بعد ہی رموز و علائم متعین ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ایمائیت کے پس منظر میں یہی تہذیب اور یہی اقدار کارفرما ہوتی ہیں جو ہر فرد کے ذہن سے قریب تر ہوتی ہیں۔ ان حقائق کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ ہر ادب کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس مزاج سے آگاہی نہ ہو تو نقاد ادب کی پہنائیوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ نئی بحثیں سے خراشیں تو ضرور پیدا کرتا رہے گا لیکن عقدے حل نہ کر سکے گا۔ اس طرح اس کا فیصلہ سطحی تو ہو گا صحیح و سچا نہیں!۔

رشید صاحب نے کلاسیکی ادب کی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اس وجہ سے وہ نہ صرف بنیادی مسئلوں کو حل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں بلکہ اپنے ادب کے بنیادی مسئلے تلاش کرنے اور حل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اردو شاعری اردو نثر کے بنیادی اسلوب اردو کا ارتقاء وغیرہ ان معدودے چند عنوانات میں سے ہیں جن پر رشید صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ اور تنقیدی بصیرت کا کچھ ایسا ثبوت دیا ہے کہ کلیم الدین احمد کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔ کلاسیکی ادب کے سلسلے میں بالعموم ذہن میں جو تصور آتا ہے وہ "ادب محض" کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت اس سے قدرے مختلف ہے کیونکہ رشید صاحب ہی کے الفاظ میں فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں کلاسیکی ادب کے خالق بھی انسان ہی تھے اور کچھ قدروں کے حامل بھی اسلئے اسے مقصدیت سے عاری تصور کرنا زیادہ بصیرت افروز بات نہیں ہے۔ اردو ادب کو خوش قسمتی سے روزِ اول ہی سے زندگی سے قریب تر رہنے کی ضرورت پڑی تھی۔

دکن میں بہمنی و عادل شاہی ادوار میں بیشتر کام مذہبی مجالس کے لئے ہوا۔ شمالی ہند میں بھی یہ سلسلہ متروک نہیں ہوا۔ صوفیاء کی اشاعتِ دین کی جد و جہد کے علاوہ خاندان ولی اللہ کی ادبی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے؟ - میر "خانہ خرابی" کی طرف مائل ہوئے تو وہ بھی "خانہ ویرانی" ہی کی وجہ سے غدر کے گرد و پیش دہلی میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں جو آفت و خیز ہوئی اس نے بقول نیاز فتحپوری مومن ایسا بلند مقصد کا شاعر اور بقول نگار ساں دتاسی میر امن ایسا بلند مبلغ پیدا کیا۔ غالب، ظفر، آزردہ، وغیرہ کی مقصدیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ - ان کے شانہ بشانہ سرسید کی اصلاحی تحریک بھی نشو و نما پا رہی تھی جس نے اردو ادب کو مقصدی ادب کے بیش بہا خزانے سے مالا مال کر دیا۔

چنانچہ اردو ادب میں عالم عروج میں شعوری طور پر مقصد کی طرف راجح ہو گیا۔ مقصدیت کا یہ رجحان ہمیں اردو ادب کے پورے کلاسیکی سرمائے میں ملتا ہے۔ چنانچہ اس سرمائے سے گہری وابستگی رکھنے والے میں بھی مقصدیت کا رجحان ہونا لابدی ہے رشید صاحب کے یہاں مقصدیت کی تلاش کا جو رجحان ملتا ہے وہ زیادہ تر اسی کلاسیکی ادب کا مرہونِ منت ہے۔ شاعری کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اپنی مقصدیت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔

"شاعری کو حقیقت اور انسانیت کا ترجمان ہونا چاہئے نہ یہ کہ وہ کس زبان، کس قوم، کس ملک، کس زمانہ، اور کن روایات کی ترجمان ہے۔ شعرائے اردو کے سامنے میر۔ غالب انیس۔ حالی۔ اکبر یا اقبال، حسرت۔ اصغر۔ فانی و سہیل۔ نہ ہونے چاہئیں بلکہ ان کے سامنے الوہیت کے وہ اسرار ہونے چاہئیں جن سے انسانی ہستی مرکب ہے جن کے دریافت یا انکار کرنے کی آرزو شرفِ انسانیت و معیارِ ترقی ہے اور جن کا حصول انسانی زندگی کا مقدس نصب العین ہے"

اس امر کی مزید وضاحت وہ "آشفتہ بیانی میری" میں کرتے ہیں۔

"میں مذہب اخلاق کو افکار و اعمال میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسیکس کو شعر و ادب میں۔"

ایک اور مقام پر وہ اپنے مقصدی رجحان کا اظہار تنقید کے سلسلے میں بھی کرتے ہیں

"اعلیٰ تنقید ہمیشہ اعلیٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیقات کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنیوالا کائنات کی عظمت اور فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں"

لیکن مقصد کی تلاش میں وہ سیاسی انتہا پسندی کے قائل نہیں ہیں۔ ادب بہرحال ادب ہے اس لئے ادب کا نقطۂ نظر ترقی پسند ہونے کے ساتھ انصاف پسند بھی ہونا چاہئے۔ ایک ادب پارہ یا ادبی تنقید میں اگر فن کو نظریاتی عصبیت پر قربان کیا جائے تو یہ طرزِ عمل رشید صاحب کے نزدیک مستحب نہیں ہے۔ ادب پارہ میں اگر فن کے بنیادی اوصاف نہیں ہیں تو وہ ادب نہیں ہے کچھ اور ہے۔ ایسی صورت میں اس کا جائزہ ادبی صنف کی حیثیت سے نہیں لیا جا سکتا۔ ایک سیاسی یا تبلیغی تحریک تک محدود رکھنا کافی ہو گا۔ اس امر کا احساس رشید صاحب کو شدت کے ساتھ ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"سیاسی استیلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا ہے آرٹ اور ادب کے خدمت گزاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا سرشار نہ ہونا چاہئے کہ وہ ادب کے صحیح خد و خال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔"

رشید صاحب باوجود اس کے کہ ہمیشہ اخلاقی ادب کے نظریے کی طرف مائل رہے لیکن انھیں سے کہنا تھا ہر اس مکتبِ خیال کی تائید کی یا اس سے جزوا اتفاق کیا جس میں انھیں ادب کی صالح قدروں کا احترام نظر آیا۔ ایک عرصے تک وہ اس بنا پر ترقی پسند تصور کئے جاتے رہے

اس لئے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک میں سیاسی رجحان کو پنپتا دیکھا اور جب سیاسی استیلا کا غلبہ ہوا تو انہوں نے کنارہ کشی اختیار کی۔ وہ اپنے ادبی نظریے سے ہٹنا نہیں چاہتے۔ اس چیز نے فائدہ پہنچایا یا نقصان یہاں اس سے بحث نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انہیں اپنا توازن کھونے نہیں دیا۔ ایک تنقید نگار میں توازن باقی رہے تو اس سے اچھی کیا بات ہوگی؟ وہ کچھ عرصے کے لئے نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن جب لاتعلقی (Detachment) کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا تو اس کی دیانت، دانشمندی، اور احترام کا اعتراف ناگزیر ہو جائے گا۔

کلاسیکی ادب کی طرف رجحان کی وجہ سے رشید صاحب کے یہاں تاثراتی تنقید کا پرتو نظر آتا ہے۔ تاثراتی تنقید کو بالعموم اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا کیونکہ اس طرح کا نقاد وجدان کو معیار قرار دیتا ہے۔ خارجی عوامل کی اس کے یہاں زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ انفرادی فیصلہ کا یہ درجہ اتم احترام کرتا ہے۔ کیفیت اور کمیت پر دوسری معقول کو قربان کر دیتا ہے۔ رشید صاحب کے یہاں بھی یہ امور ایک حد تک داخل ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ رشید صاحب ادب پر اجتماعی اثرات کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں مشرق اور مغرب کا فرق کارفرما ہوتا ہے۔

مغربی اور مشرقی کلاسیکی ادب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی۔

مغربی کلاسیکی تنقید کا یونانی ذہنیت سے بڑا گہرا تعلق ہے اس لئے اس میں ادب پر بھی منطق کے قاعدے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے رومانی تنقید و تخیل کو تمام تر اہمیت دیتی ہے۔ علم کے دائرے میں اگر یہ دونوں قسم کی تنقیدیں یہ صورت اختیار کرتی ہیں کہ کلاسیکی تنقید کچھ روایتی اصولوں کو اٹل مان کر ان کے مطابق ادب کو جانچتی ہے اور رومانی تنقید افراد کی صلاحیتوں کا جائزہ تاثرات کے انداز سے لیتی ہے۔

اگر ہم بہ نظر غائر دیکھیں تو یہ حقیقت ہم پر واضح ہو جائے گی کہ مغربی کلاسیکی ادب کے برخلاف مشرقی کلاسیکی ادب کا رجحان تخیل کی طرف ہے۔ اس لئے ہر وہ نقاد جو مشرقی کلاسیکی ادب کو سمجھنے کی کوشش کرے گا ——— رومانی تنقید کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اس طرح رشید صاحب کے یہاں تاثراتی پہلو کا وجود حق بجانب ہے وہ مشرقی ادب کا جائزہ اس کے حدود میں رہ کر اور اس کے عوامل کے ساتھ ہمدردانہ انداز میں لیتے ہیں۔

انگریزی تنقید سے استفادے نے جہاں ہمارے ادب میں پختگی، فنی لطافت اور وسعت مطالعہ پیدا کی وہاں اس نقص کو بھی بری طرح پروان چڑھایا ہے کہ ہم اپنے ادب کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے اجنبی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ ہم اپنے ادب کے ساتھ مخلص رہ سکتے ہیں، نہ اس کے مزاج کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ تعمیری فریضہ انجام دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں بلکہ ایک عجیب شتر گربگی پیدا ہو جاتی ہے۔

رشید صاحب کے نزدیک یہ طوائف الملوکی ناقابل برداشت ہے۔ تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا، وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کارناموں کے پرکھنے کا فن۔ ظاہر ہے کہ بہترین کارناموں کو پرکھنے کے لئے انتہائی دیانت، دانشمندی اور احترام سے کام لینا پڑے گا، ترقی پسندی کے ساتھ انصاف پسندی بھی ہونی چاہیے۔ تنقید نگار نہ پولیس کی طرح روزنامچہ تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشین فرشتوں کی مانند اعمال نامے مرتب کرتا ہے۔ یہ کیسی تنقید ہے کہ امت زیادہ گنہگار ہے پیغمبر کی، خدا بیگم کا اور جنت دوزخ خالق کی۔ یہ امت کا حشر ہو کے پیغمبر کے ساتھ اور اسی کے خدا کے سامنے ہوتا آیا ہے۔ یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی ناکام رہے اس لئے کہ سرسید کامیاب رہے، اور سرسید ناکام رہے اس لئے کہ کانگریس کامیاب رہی اور کانگریس اس لئے ناکامیاب رہی کہ جینا پر روس کا قبضہ ہو گیا اور روس ناکامیاب رہے گا اس لئے کہ رشید احمد صدیقی جگر صاحب پر کچھ فرما رہے ہیں۔ میں اپنے اکثر نقادوں سے کہوں گا

دل نہ بہم بجز بہ اطعنہ مزن بنر ترتیب ما

رشید صاحب کی تنقید میں یہی دیانت، دانشمندی اور احترام رچا بسا ہوا ہے۔ اپنی تنقید کے لئے اگر مشرق کی امت کا انتخاب کرتے ہیں تو یورپ کا پیغمبر یونان کا خدا اور روس کی جنت دوزخ کو ایک ہی میدان حشر میں جمع کرنے کی سعی رائیگاں نہیں کرتے وہ تنقید کرتے ہیں تو نہ صرف ادب سے وفادار رہتے ہیں بلکہ اس تہذیب معاشرے اور اخلاقی اقدار کے ساتھ بھی مخلص رہتے ہیں جس میں اس ادب نے نشو و نما پائی ہے اس طرح ان کا تخیل کو اہمیت دینا تاثرات کا احترام کرنا اور کیفیت و کمیت کو جائز مقام دینا اس مخصوص تنقیدی بصیرت کی غمازی ہے جس سے مستفاد ذہن ابھی تک فیضیاب نہیں ہو سکے ہیں یہ وصف رشید صاحب کی محدودیت یا بے لطافتی نہیں ہے بلکہ ان کی نقادانہ پختگی اور رشتی ژرف نگاہی ہے اگر اردو ادب کو چند ایسے ہی ہوش مند نقاد میسر آ جائیں تو ادب کی تقدیر ہی بدل جائے۔

رشید صاحب کی تنقید بھی ان کے تخلیقی مضامین کی طرح تخلیقی صلاحیتیں رکھتی ہے تاثراتی تنقید یوں بھی اصولاً تخلیقی تنقید ہوتی ہے۔ اس لئے رشید صاحب کے یہاں تنقید کا تخلیقی بن جانا تعجب خیز امر نہیں ہے تنقید میں ان کا اسلوب اپنے اندر بڑی ندرت رکھتا ہے اس میں تازگی اور شگفتگی ان کے مزاج کی شوخی کی پیداوار ہے تنقید میں بھی وہ ایسے چونکا دینے والے فقرے چست کرتے جاتے ہیں کہ قاری پر ایک کیف طاری ہو جاتا ہے مثلاً غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔" "جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں؟" "غالب نے نثر اور نظم دونوں کو زیری بھی دی دلبری بھی!" "میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں۔ تجربات میں شاعری کا نہیں۔" ایسے جملوں میں صرف شوخی ہی نہیں بلکہ ذہانت بھی پائی جاتی ہے اور یہ ذہانت اس وقت تک اثر انگیز نہیں ہو سکتی جب تک بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی روایات کا صحیح شعور نہ ہو

رشید صاحب کے پختہ شعور میں کلام نہیں ہو سکتا انہوں نے اپنے ماضی کی روایات اور اس کی اقدار کو

ـــــــہ اگر ہماری خوبیوں سے تمہارا دل نہیں رجھتا تو خواہ مخواہ ہماری برائیوں کا طعنہ کیوں دیتے ہو ــــــ ایڈیٹر ۔۔

خوب اچھی طرح سمجھا اور پرکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہ مختصر سے جملے میں بہت بڑی حقیقت کو تراش کر نگینے کی طرح رکھ دیتے ہیں۔ ایسے جملوں کو بالعموم بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کہہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں پنہاں نئے اور اچھوتے خیال کی قدر نہیں کی جاتی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:۔

"اس طرح رشید صاحب کے تنقیدی اسلوب میں ایک بڑا دل موہ لینے والا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ اس انداز کو لوچ اور بانکپن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ تیکھا پن اس کو کہہ سکتے ہیں۔ یہ تیکھا پن رشید صاحب کے تنقیدی اسلوب میں جگہ جگہ نمایاں ہوتا ہے۔ یہ تیکھا پن رشید صاحب کے یہاں ایک رعنائی اور حسن پیدا کر دیتا ہے۔ تنقیدی حقائق کو زندگی بخش دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رشید صاحب کی تنقید میں انسان دوستی اور ہمدردی کے عوامل نمایاں کر دیتا ہے۔ تیکھے پن بذلہ سنجی اور شوخی میں یہ حقائق سے دور نہیں جا پڑتے بلکہ اور بھی زیادہ قریب آ جاتے ہیں۔ ان کا یہ انداز اخلاقی مراحل میں بھی میانہ روی سے دست بردار نہیں ہونے دیتا بلکہ اس اسلوب ہی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی تنقید میں ایک خوشگوار انفراد اور رجائی (Optimistic) زاویۂ نظر کو پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

ان کے اس اسلوب کی مثال اردو تنقید میں نہیں ملتی۔ آل احمد سرور نے رشید صاحب کے اسلوب کو اختیار کرنے کی کوشش کی مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ وہ رشید صاحب کی جیسی شوخی اور شگفتگی پیدا نہ کر سکے بلکہ جلد ہی جذب و مستی میں کھو گئے۔ یوں بھی دونوں کے طبائع کے بنیادی فرق کی وجہ سے ایک کے لئے دوسرے کے اسلوب کا اختیار کرنا ممکن نہ تھا۔ اس طرح رشید صاحب نہ صرف تنقیدی بصیرت اور مقصدیت کے لحاظ سے تنقید نگاروں میں منفرد ہیں بلکہ اپنے تنقیدی اسلوب کے لحاظ سے بھی منفرد ہیں۔

کلیم الدین احمد نے اردو تنقید کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے حالانکہ رشید صاحب کو بھی نہیں بخشا ہے۔ لیکن جیسا اعتراف انھوں نے رشید صاحب کا کیا ہے شاید ہی کسی اور تنقید نگار کا نہیں کیا۔

"اگر رشید صاحب داعی کاہلی سے دست بردار ہو کر غور و فکر کی عادت ڈالتے، اگر وہ طبیعت کی کج روی کو سلامت روی میں تبدیل کر سکتے تو زیادہ کامیاب ہو سکتے۔"

یہ اعتراف ہی اس امر کی دلالت ہے کہ رشید صاحب نے حالانکہ تنقید کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے لیکن ان چند تنقیدی مضامین کی بنا پر جو انھوں نے گاہے بگاہے لکھے ہیں اپنی بے پایاں تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اگر بحیثیت انشا پرداز اور طنز نگار منفرد ہیں تو بحیثیت نقاد بھی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

قطعات

چندر پرکاش شاد

کچھ کمی جلوۂ بہار میں ہے
بے قراری بھی اس قرار میں ہے
یہ کلی جو چٹکنے والی ہے
ایک جھونکے کے انتظار میں ہے

اک انوکھی امنگ آ جائے
اک نرالی ترنگ آ جائے
اشکِ خوں کو بھی نذرِ گلشن کر
کچھ بہاروں پہ رنگ آ جائے

●

نہ صبا سے نہ پھول سے مطلب
باغ میں مثلِ خار جیتے ہیں
زندگی بے نیاز ہے ہم سے
ہم بھی بیگانہ وار جیتے ہیں

سوچتا ہوں یہ کیا تماشا ہے
فرقِ انجام و ابتدا کیا ہے
پھر کسی نے سحر کے پردے سے
مجھ کو جامِ حیات بخشا ہے

●

یونس شرر

یہ بچہ میرا ہے

زینب نے جیل کے مضبوط آہنی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے جیل کی اونچی اونچی دیواروں پر الوداعی نظر ڈالی اور باہر احاطے میں آگئی۔ پھر آہستہ آہستہ چل کر وہ اُس جیلر کے بنگلہ پر پہنچ گئی۔ جہاں وہ آج تک کام کرتی رہی تھی۔ اس کو آتا ہوا دیکھ کر لان میں کھیلتے ہوئے بچے دوڑ کر اسکے قریب آگئے۔

"آنٹی۔ آگئیں"! سب بچے ایک ہو کر چیخنے لگے۔ اور وہ سب کو پیار کرتی ہوئی اندر بنگلہ میں چلی گئی۔

"بیگم صاحبہ"! بیگم نسیم نے زینب کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ پھر اس کے قریب ہو کر اُسے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کو چھوڑنے کے لئے دروازے تک اسکے ساتھ آئیں۔

"زینب آیا کرنا۔! دیکھو بھول مت جانا۔! یہ بچے تمہیں بڑا پیار کرتے ہیں"!

"ہاں"! زینب نے بے خیالی میں کہا۔

جب وہ دروازہ سے باہر نکلی تو بچے اُس سے آنٹی! کہکر لپٹ گئے۔ اور سب ایک زبان ہو کر چلانے لگے۔

"آنٹی کو اب ہم نہیں جانے دیں گے۔! آنٹی کو اب ہم نہیں جانے دیں گے"

وہ بچوں کے درمیان کھڑی مسکراتی رہی "اچھا۔ مت جانے دینا۔ مگر مجھے چھوڑو تو"! یہ کہکر وہ لان کی طرف بڑھی اور نسیم جیلر کا سب سے چھوٹا بچہ سہیل دوڑ کر دروازہ پر کھڑی ہوئی ماں کے پاس جاکر رونے لگا۔

"ممی۔! ممی۔! آنٹی جا رہی ہے۔! اب ہمیں کون پڑھائے گا"!

"میں ہی پڑھاؤں گی"! زینب نے پلٹ کر سہیل کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

"تم تو جا رہی ہو"!

زینب ہنس دی اور اُس نے سہیل کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک لمحہ کیلئے اُسکے ذہن کے گوشہ گوشہ میں کشمکش سی ہونے لگی اور وہ سوچنے لگی۔

"مگر وہ جائیگی کہاں"! پھر وہ اس کا کوئی جواب نہ پا کر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اُسکی نگاہیں خلاؤں میں دور کسی چیز کی تلاش میں کھو گئیں۔ اُس نے اُس بے خیالی میں آہستہ سے سہیل کو گود سے نیچے اُتار دیا اور پھر بوجھل بوجھل قدموں سے باہر بنگلہ سے باہر نکل کر آئی۔

"مگر وہ جائیگی کہاں؟ اور اُسے کون سہارا دیگا"؟ بار بار یہ سوال اسکے ذہن میں گونج رہا تھا۔

آج وہ ایک عرصے کے بعد جیل سے رہا ہو کر نکل رہی تھی۔ مگر اب نہ اسکی کوئی منزل تھی نہ کوئی اُسکے لئے راہ تھی۔ تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔

زندگی ویران بنجر علاقے کی طرح اسکے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ اب تک وہ نسیم جیلر کے یہاں اپنا اچھا برا وقت کاٹ آئی تھی۔ وہ اُس پر کافی مہربان تھا۔ اُس نے اسکو اپنے بچوں کو پڑھانے پر معمور کر دیا تھا۔ جہاں وہ بچوں کے ساتھ اپنا دن بڑی آسانی سے کاٹ لیتی تھی۔ وہ نسیم جیلر کے بنگلے سے کافی فاصلہ طے کر آئی تھی۔ مگر سہیل کے رونے اور ضد کرنے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

"ممی۔! آنٹی کو روک لیجئے نا"!

اس آواز پر اس کے قدم بار بار رک جاتے۔ وہ بار بار پلٹ کر سہیل کو دیکھتی۔ اسکی آنکھوں میں سہیل کی معصوم صورت گھوم رہی تھی۔ پھر بہت سارے بچے اسکی آنکھوں کے سامنے آنکھ مچولی سے کھیلنے لگے۔ نعیم، زرینہ، شمیم، ملیحہ، سب بچے ایک ہو کر ایک کے پیچھے ایک۔ ای چھک۔! ای چھک! کرتے ہوئے ریل کے ڈبوں کی طرح گذرنے لگے۔

اچانک قریب سے کسی بچے کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے اسکا اپنا بچہ اُسے پکار رہا ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اُس نے سوچا۔

"میرا بچہ تو اب کافی بڑا ہو گیا ہوگا۔ وہ تو اب گھٹنوں چلتا ہوگا۔ اور اب میں جاؤں گی تو۔۔۔۔" وہ کچھ سوچتے سوچتے رکی "مگر وہ تو۔۔۔۔ اب مجھے پہچانے گا۔۔؟ مگر ہاں وہ مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا۔ مجھے پکارتا ہوگا۔۔۔ ممی۔۔۔ ممی۔۔۔"

اس کی باچھیں خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔

"جب میں گھر پہنچوں گی تو وہ ممی کہکر لپٹ جائیگا"! اس کا دل خوشی کے مارے تیزی سے دھڑکنے لگا اور اسکی آنکھیں چمک اٹھیں، پھر ایکدم جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "اگر اس نے یہ پوچھ لیا کہ ممی پاپا کہاں ہیں۔؟ تو وہ اس کا کیا جواب دیگی"؟!

اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ لیں اور خوف سے اس نے گھبرا کر اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں اسے اپنا وجود گہرائیوں میں ڈوبتا معلوم ہوا اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

پھر اسکی نگاہیں کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش میں دور تک گئیں اور پھر واپس آگئیں۔ اسکے ذہن میں پرچھائیاں سی ابھریں اور پھر ڈوب گئیں اور پھر اُسے بھولے ہوئے واقعہ کی طرح کچھ یاد آنے لگا

رات گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ ہر طرف پراسرار خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سب کی نگاہوں سے بچتی بچاتی گھورے کی جانب بڑھ رہی تھی اسکا دل بڑی طرح دھڑک رہا تھا۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں اس نے ایک سفید کپڑے میں لپٹے ہوئے نوزائیدہ بچے کو اٹھا رکھا تھا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا قریب کھڑے ہوئے درختوں
میں ایک لمحہ کے لئے سرسراہٹ پیدا ہوئی وہ چونک کر پلٹی پھر
اُسے کسی کے دبے دبے قدموں کی چاپ سنائی دی اسے
ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ وہ
ایک لمحہ کے لئے رُکی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر گلی میں مڑ گئی۔
گلی دور تک خاموش و سنسان پڑی تھی۔

گلی کے دونوں طرف دور تک جھگیوں کا سلسلہ چلا گیا
تھا۔ کسی کسی جھونپڑی میں دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے
قریب ہی گلی کے نکڑ سے ذرا آگے بڑھ کر میونسپلٹی کی لالٹین
روشن تھی۔ کبھی کبھی کسی چوکیدار کی آواز اس خاموشی
اور سکوت کو توڑتی ہوئی دور دور تک جاتی ہوئی معلوم ہوتی۔
وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے قریب جا کر رک گئی۔ اُس نے بچہ کے
منہ پر سے کپڑا اٹھا کر دیکھا۔

بچہ اسکے لئے آسمان پر چودھویں کے چاند کی طرح
روشنی بنکر پھیل گیا۔ اس نے دل سوز مسکراہٹ سے
اسے دیکھا پھر سینہ سے لگا کر بھینچ لیا اور بوجھل بوجھل
قدم اٹھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

وہ ایک کوڑے کے ڈھیر کے قریب جا کر رک گئی
اس نے ہاتھ میں لئے ہوئے بچہ کو ایک بار پھر پیار سے
دیکھا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ سے
بچہ کو کوڑے کے ڈھیر پر ڈال کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک
جھٹکے کے ساتھ واپس مڑی۔ مگر اُس سے پلٹا نہ گیا۔
اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا دل وہیں رہ گیا ہو
بچہ زمین پر گرتے ہی رونے لگا تھا۔ اس کے رونے
اور بلکنے کی آواز اس سے نہ سُنی گئی۔ اُسکا دل
چاہا وہ اسے گود میں اٹھا لائے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی
اس نے اپنے کانوں پر زور سے ہاتھ رکھ لئے اور
بال نوچ ڈالے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے وہاں نہ رک
سکی۔ تیزی سے گلی میں آگئی۔ پاس کی جھونپڑی سے کوئی
چیخا۔ کون ہے ؟۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ بچہ اب زور زور سے رونے لگا تھا۔
وہ گلی کے نکڑ پر کھڑی ہوئی تھی۔ آواز کے کچھ دیر بعد کوئی
تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کوڑے کے ڈھیر کی
طرف بڑھا۔ کپڑے میں لپٹے ہوئے بچہ کو اٹھا کر
آواز دی۔

" ارے رحیمن کی ماں۔! ارے رحیمن کی ماں۔؟

" کیا ہے "؟

" دیکھنا یہ کس کا بچہ ہے "؟

رحیمن کی ماں نے باہر آکر بچہ کو گود میں لیتے ہوئے چیخی۔
اس حرامی پلے کو پھینکنے کے لئے یہیں جگہ ملی تھی "!
پھر وہ کچھ دیر تک خاموش رہی۔ اس نے تجسس
بھری نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ پھر چیخی۔
" ارے او منحوس۔! ارے او صادق۔! ارے او کلو۔!
دیکھو تو غضب ہو گیا۔ پہلے تو حرامزادیاں اپنے
یاروں کے پاس چلی جاتیں۔ اب چھنال اپنے عیبوں
کو چھپاتی ہیں۔ ارے ہماری بھی بہو بیٹیاں ہیں۔ ارے
ہماری بھی عزت ہے۔!
ہماری بھی جوان جوان بیٹیاں ہیں "۔ رحیمن کی ماں
ابھی تک چیخ رہی تھی۔

باہر میدان میں لوگوں کا خاصا ہجوم ہو گیا تھا۔

اور زینب گلی پر [illegible] دور کھڑی تھی۔

" میرے خیال میں پولیس کو خبر کر دینا چاہیئے۔"

پھر کوئی تھانے کی طرف دوڑا۔ زینب سہم کر اور سمٹ
گئی۔ اس کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بوڑھی
عورت کی ننگی ننگی گالیاں سنکر اسکا خون کھول
رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھی گالیاں سننے پر۔ کیونکہ
اس میں اسکا ہی قصور زیادہ تھا۔ اس نے
جمیل کے ملتے ہی اپنی مانگ میں چاند تارے بھرنے
کے خواب دیکھ لئے تھے۔ بہاروں میں وہ جھولا جھولنے
لگی تھی۔ صندل کی مہک اور گلاب کی خوشبو اُسکے رگ
و پے میں بس گئی تھی۔

جمیل کو پا کر وہ اپنے آپکو بھول گئی تھی۔ محبت
میں پیار بھری باتوں میں دور تک دریا
کے دھارے کی طرح بہہ گئی تھی جو اس کی
راتوں میں چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے
لگا تھا اسکی تمام دنیا اسے چاندنی میں نہائی
ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اُسکے دل میں جذبات
اور امنگوں کا طوفان اُمڈنے لگا تھا۔

پھر ایک روز اس نے اپنے آپ کو جمیل
کے حوالے کر دیا۔ وہ قریب بیٹھے ہوئے
جمیل کی گود میں گر گئی۔

"جمیل۔! میں تمہاری ہوں۔"

جمیل نے اسے اپنی باہوں میں بھینچ کر سینے سے
لگاتے ہوئے کہا۔

"جانی۔! میں بھی تمہارا ہوں۔! تم اب فکر
نہ کرو۔ اب ہم بہت جلد ایک دوسرے کو پالیں گے۔
میں اب تمہارا کلاس فیلو ہی نہیں۔ بلکہ تمہارا
جیون ساتھی۔ اور پولیس کا ایک افسر ہوں"۔!

جواباً زینب جمیل کے ہونٹوں پر پھیلتے ہوئے
مبارک الفاظ سنکر اس سے لپٹ گئی۔ "خدا تمہاری
زبان مبارک کرے "۔! جمیل نے مسکرا کر اسے
دیکھا اور پھر اپنے تشنہ لب اسکے ہونٹوں پر
رکھ دیئے پل جھپکتے ہی زینب کو ایسا لگا جیسے
اسکی تمام کائنات لٹ گئی ہو۔ وہ کپڑے جھاڑ کر
چلی تو اس سے چلا نہ گیا اُسکے ذہن میں بجلیاں
کوندتی رہی تھیں۔ اس کا تمام جسم ڈھیلا پڑ گیا
تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"جمیل۔! اب کیا ہوگا۔؟"

جمیل نے مسکرا کر کہا ...

"گھبراتی کیوں ہو۔! ہم دونوں کو ایک دن شادی
کرنی ہی تھی "۔!

" مگر "۔

وہ کچھ کہتے کہتے رُکی۔ پھر جیسے اس کے خیالات
کا تمام سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے ذہن پر بہت
زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔ تو اسے اب

اپنی کہانی کا سلسلہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ کہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اور کہاں ختم ہو گئی۔

جمیل دور بہت دور اس پر قہقہے لگاتا ہوا نظر آ رہا تھا ذہن کے گوشے گوشے سے جمیل کی ہر آواز ابھرتی اور ڈوب جاتی۔

"میں تم جیسی فاحشہ لڑکی سے شادی کرکے زندگی برباد کرنا نہیں چاہتا، تم جیسی لڑکیاں تو لڑکوں کو اپناتی ہیں۔!" وہ اس آواز کو برداشت نہ کر سکی۔ اس نے زور سے اپنے دونوں کان بند کر لیے اپنے چاروں طرف دیکھا اور زور سے چیخی۔

"جمیل ـ"!

اُسے اپنا وجود گہرائیوں میں ڈوبتا معلوم ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو اُن بھولی بھالی لڑکیوں میں سے تھی جو جوانی کے نشے سے سرشار ہو کر راتوں کی تنہائیوں میں کسی خوبصورت شہزادے کی آمد کے خواب بنتی ہیں ان کا شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر اُن کو ڈولی میں لینے کے لئے دروازہ تک آتا ہے ــ وہ شرما کر سمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر خواب ٹوٹ جاتا ہے ــ وہ آنکھ کھول کر دیکھتی ہیں تو دور تک تنہائی اور ویران کے مہیب تاریک سائے ان کے گرد پھیلے ہوتے ہیں ــ زینب نے بھی یہی خواب بنے تھے۔ اور اب وہی تنہائی وہی ویرانی وہی تاریکی اس کی زندگی میں پھیلی ہوئی تھی۔

بچے کے رونے کی آواز کافی تیز ہو گئی تھی۔ بڑھی غصے سے تلملائی جا رہی تھی ــ بچے کے زور سے رونے کی آواز پر وہ بے چین ہو رہی تھی... ایک منہ پھاڑ رہا ہے! اگر چپ نہ ہوا تو حرامی کا گلا گھونٹ دوں گی" اور پھر اس نے زور سے بچہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں ـ! نہیں ایسا نہ کرنا ــ" زینب تڑپ گئی۔ اسکی ممتا نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ اس کے سامنے اسکے بچہ کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

بچہ کی رونے کی آوازیں سُن سُن کر میدان میں آدمیوں کا ٹھٹھ لگ گیا تھا۔

"کسی منچلے نے ہجوم میں سے آواز لگائی ـ
"بھئی یہ کس کا بچہ ہے"!

تو ماں نے دانت پیس کر جواب دیا "ہوگا کسی کتیا کا ــ" حرامزادیاں پہلے تو مزے اڑاتی ہیں اور لا وارث بچے جنگل میں گرا جاتی ہیں"

پھر کسی نے قریب آ کر بچہ کو دیکھتے ہوئے کہا
"ماسی ــ ابھی یہ تو زندہ ہے ـ کتیا کیسی ہوگی"؟

زینب کا جیسے خون کھول گیا۔ اس سے یہ جملے اپنے بچے اور اپنے متعلق برداشت نہ ہو پائے وہ گلی کے نکڑ پر سے کھڑی ہوئی چیخی۔

"نہیں ـ! نہیں میں ایسا نہیں ہونے دونگی۔! یہ میرا اپنا ہی جسم ہے۔ یہ میرا اپنا ہی خون ہے۔ کیا ہوا اگر وہ......! ہے تو میرا ہی ــ! میرا خون .... میرا خون ......!!

وہ تیزی سے ہجوم کو چیرتی ہوئی درمیان میں گھس گئی۔ لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے ـ وہ درمیان میں کھڑی چیخ رہی تھی ـ
"اسے مجھے دیدو ـ! اسے مجھے دیدو ـ!
اسکی ملامت نہ کرو۔ اسے کچھ نہ کہو ـ! یہ بچہ میرا ہے۔ اسکی ماں بھی زندہ ہے ـ! اس کا باپ بھی زندہ ہے ــ"

وہ لاوے کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ لوگ حیرت سے اُسے منہ پھاڑے تک رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی ــ

"ہاں ـ! ہاں ـ! یہ میرا ہی بچہ ہے ـ! یہ میرا ہی بچہ ہے"!
اس نے آگے بڑھ کر بوڑھی کی گود میں سے بچہ کو جھپٹ لیا ـ اور بچہ کو گود میں لیکر زور سے سینے سے لگا کر بھینچ لیا پھر وہ تیزی سے ہجوم کو چیرتی ہوئی گلی کی طرف واپس مڑنے لگی تو کسی نے اُسے آواز دی۔

"ٹھہرو ـ"!
اس نے پلٹ کر دیکھا تو پولس انسپکٹر کی آواز تھی۔ جو موقعہ واردات پر پہنچ گیا تھا ــ وہ دیر تک بت بنی ایک گہری سوچ میں واپس مڑی انسپکٹر کی آواز اسکے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھی ـ یہ اسکی جانی پہچانی آواز تھی ــ اور وہ اس لہجہ سے بھی مانوس تھی ـ وہ تیزی سے اسکے قریب آئی۔ پولیس انسپکٹر چیخا ـ

"پکڑو اس کتیا کو پکڑ کر جب بچے پالے نہیں جاتے تو جنتی کیوں ہیں ــ"!

دو پولیس والے اسکی طرف بڑھے۔ اسکا دل چاہا وہ پولیس انسپکٹر کا منہ نوچ لے۔ اور چیخ چیخ کر کہے ـ
"یہی وہ کتیا ہے! یہی وہ بدمعاش ہے ـ! جس نے اسے ہی ایک کھلونے رسوا بدنام کیا ہے ـ یہی وہ ..." مگر وہ کچھ نہ کر سکی جیسے اس کے ہونٹ سل گئے تھے ـ زبان خشک ہو گئی تھی
"اُدھر ــ" "حرامی کی اولاد"!! اس کا دل چاہا وہ اپنی اس بے بسی اور مجبوری پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے ــ وہ واپس مڑی ــ "ذلیل! کمینے۔! تجھ میں اتنی جرات کہاں کہ تو دنیا والوں کے سامنے یہ کہہ سکے کہ یہ بچہ میرا ہے"!!

پھر اسکی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئیں ــ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور پھر تھوڑی دور جا کر وہ دھڑ سے زمین پر جا پڑی ــ

رام سرن نگینہ

نہرو پٹھانوں کے دیس میں

> جواہرلال نہرو کے ساتھ ہند و پاک دوستی کی ساری امیدیں بندھی ہوئی تھیں وہ بنیادی طور پر امن کے پجاری تھے اور سیکولرازم میں انکا گہرا وشواش تھا اور وہ اس کے ستون تھے ان کے دل میں فرقہ واریت کا نام ونشان تک نہ تھا اُن کے ساتھ ۴۰ سال دوستی اور تعلقات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ عوام کے آدمی تھے اور اقلیتوں کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ہندوستان کی اقلیتوں کو ان کی وجہ سے بڑا اطمینان تھا۔
>
> خان عبدالغفار خاں

خون کے قطرے

وزیرستان پر بمباری کے خلاف احتجاج کیلئے جب پنڈت جواہرلال نہرو صوبہ سرحد گئے تو اس وقت کے انگریز گورنر مسلم لیگ اور غنڈہ عناصر نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کردیا اور ملاکنڈ ایجنسی میں ان پر پتھراؤ کیا پنڈت جی کی ٹھوڑی پر گہرے زخم آئے آپ نے سفید رومال سے جب ٹھوڑی کو دبایا تو خون کے قطرے رومال پر جم گئے اس پر آپ نے مسکرا کر کہا چلو اچھا ہی ہوا پٹھانوں کے دیس میں میرا خون بھی گرا ہے۔ اور واقعی خون کے ان چند قطروں نے پٹھانوں کو پنڈت جی کا اس قدر گرویدہ بنا لیا کہ یہ بے لوث محبت اور عقیدت پٹھانوں کے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی!

سرورباب

سیواگرام کی طرح پشاور سے ۱۵ میل پر ایک مرکز ہے سرورباب ..... جسے خان عبدالغفار خان نے جنگ آزادی کے دنوں میں قائم کیا تھا۔ اور جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے نیتاؤں نے قدم رکھا شریمتی اندرا گاندھی خصوصی طور پر اس مرکز سے وابستہ رہیں "پنڈت جی اپنے سرحدی دورے کے دنوں جب سرورباب پہنچے تو لاکھوں آدمیوں نے آپ کا پرجوش سواگت کیا یہ پہلا موقع تھا کہ پٹھان عورتیں بھی ہزاروں کی تعداد میں اپنے نیتا کو دیکھنے کے لئے اکٹھی ہوئیں مجھے خوب یاد ہے کہ جب ایک لڑکی نے اسٹیج پر آ کر پنڈت نہرو کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور اُن کی جے کے نعرے لگائے تو پنڈت جی نے اسے فرط محبت سے چوم لیا اور اور کہا ....

"اس ملک کی پٹھان بچیوں نے بھی جب آزادی کا بیڑا اٹھا لیا ہے تو اب کوئی طاقت اسے غلام نہیں رکھ سکتی اور یہ ساری بیداری خان عبدالغفار خان کی ہے!"

بادشاہ خان زندہ باد

حریت پسندوں کے ایک جلسہ میں خان عبدالغفار خان بھی تقریر کر رہے تھے اور پنڈت جواہرلال نہرو کی حریت پسندانہ خوبیوں کا ذکر فرما رہے تھے کہ لوگوں نے پرجوش انداز میں جواہرلال نہرو زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے، پنڈت جی کو جوش آگیا وہ کھڑے ہوکر خود سامنے آگئے اور تین بار زور دار آواز سے کہا "خان عبدالغفار خان زندہ باد" ساری فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ .....

پٹھانی لباس

پنڈت جواہرلال نہرو جس دیس میں بھی جاتے تھے لوگ انھیں اس دیس کا نیا پہنتے تھے وہی لباس وہی انداز۔ جب پشاور میں پنڈت جی تشریف لائے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور انھیں لنگی باندھی گئی پٹھانی طرز کی واسکٹ پہنائی گئی۔ لمبا کرتہ، گھیرے دار پائجامہ اور چپل ..... پنڈت جی بالکل پٹھان ہی معلوم ہوتے تھے، جب ایک نوجوان نے انہیں آئینہ دکھلایا تو وہ بے اختیار ہنس پڑے ..... کہاں ہلکی دھوتی اور کرتہ اور کہاں پٹھانی لباس ......

گنا

اگر کوئی لیڈر اپنے آپ کو ہر رنگ میں رنگ سکتا تھا تو وہ صرف نہرو ہی تھے وہ بلا تکلف اور بغیر کسی بناوٹ کے عوام میں مل جایا کرتے تھے۔ سرحد کے دورہ میں جب آپ اتمان زئی پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے کچھ تحائف بھینٹ کئے ایک پٹھان گنے لیکر آیا اور پنڈت جی کے آگے رکھ دیا ایک دوسرا نوجوان آگے بڑھا اور اپنے دانتوں سے گنا چھیلنے لگا اس پر پنڈت جی نے جھٹ سے گنا اپنے دانتوں میں داب لیا اور لگے چھیلنے ...... وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

عدم تشدد اور پستول

ملاکنڈ ایجنسی میں جب پنڈت جی پر غنڈوں نے پتھراؤ کیا تو اس وقت ڈاکٹر خاں صاحب موٹر سے کود پڑے اور پستول نکال کر غنڈوں کو للکارا جس پر غنڈوں نے فرار کی راہ لی موٹر جب واپس خانصاحب کے بنگلے پر آئی تو پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ خانصاحب آپ تو عدم تشدد کے پجاری ہیں پھر یہ پستول کس لئے تھا؟ خانصاحب نے جواب دیا "پنڈت جی! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں اگر آج پستول نہ ہوتا تو شاید ہم بھی نہ ہوتے"

ناچ

نٹ کھٹ جواہر بہرفن مولا تھے۔ سرحد کے دورہ میں خدائی خدمتگاروں والوں نے ایک رات کو دیہاتی ناچ کا پروگرام بنایا ایک بڑے میدان میں پٹھانوں

طالب علموں کا مسئلہ

من موہن چودھری

جمشید پور، ناگ پور، بھوپال، کٹک ۔ ملک میں جگہ جگہ بے امنی کا ماحول پیدا ہوا اور بڑھ رہا ہے۔ اس میں میں طالب علم اگوا بنے ہوئے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں ان کے کام کا ایک سانچہ بن گیا ہے ——

بس والے سے یا ٹرین کے ٹی۔ ٹی سے کچھ جھڑپ ہوتی ہے، دوکان دار سے کچھ جھگڑا ہوتا ہے۔ کہا سنی ہوتی ہے، مار پیٹ ہوتی ہے، لوگ جمع ہو جاتے ہیں، فساد ہو جاتا ہے، پولیس آتی ہے، لاٹھی چارج کرتی ہے۔ آنسو گیس چھوڑتی ہے، گرفتاریاں ہوتی ہیں، ہڑتال کی جاتی ہے، اَن شن ہونے لگتا ہے اور الزام نیز جوابی الزام لگایا جاتا ہے، ان سب کی وجہ عوامی زندگی میں بھاری گڑبڑ پیدا ہو جاتی ہے۔

اور پچھلے چند سالوں میں ایک نیا نقشہ سامنے آیا ہے ۔ اقتدار کی اونچی مسندوں پر بیٹھنے والے مخصوص لیڈر واقعات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں، طلباء کو طرح طرح کی نصیحتیں کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ ڈسپلن کے کیا منافع ہیں، ملکی وفاداری کی کتنی ضرورت ہے اور ان کیا سیاست سے الگ رہنا چاہیے ساتھ ہی موجودہ طرز تعلیم کی خامیوں پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن مسئلہ کو سمجھنے اور حل کرنے کے لئے ذرا بھی کچھ نہیں کرتے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ آزادی کے بعد سے طلباء کے ذریعہ فساد برپا کئے جاتے رہے ہیں لیکن اس سمت ذمہ دار لوگوں نے کتنا کم کام کیا ہے۔

تشویش ناک صورت حال

دوسرے دیشوں میں بھی نوجوانوں کے ذریعہ فسادات نے حالات کو فکر انگیز بنا دیا ہے یہاں تک کہ روس سے بھی بے امنی کی اطلاعات ملی ہیں دنیا بھر میں اس طرح کا سلسلہ چلنے کے کچھ عام اور ایک جیسے اسباب ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے ضروری ہو سکتا ہے کہ ان کو سمجھنے کے لئے، سماجیات کی بنیاد پر ان کی گہری چھان بین کی جائے، باریک بینی سے جائزہ لیا جائے ۔ ——

—— حال ہی میں بہار سرکار نے ایک اونچی سطح کا کمیشن مقرر کیا ہے اس میں بہت سے ملکوں کے ماہرین ہیں۔ یہ کمیشن سبھی سطحوں پر تعلیم کے سارے مسئلوں پر غور کرے گا۔ ہمیں امید ہے کہ وہ مناسب حل سجھائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کچھ باتوں کی طرف توجہ دلانے کی جرأت کریں گے، جو بہت واضح ہیں اور کسی کی بھی آنکھ میں کھٹکتی ہیں۔

بالو گری کی تعلیم

ہم ان باتوں کو ایک ایک کرکے لیں گے؛ دھیان میں جیسی آتی جائیں گی، پیش کرتے جائیں گے اور ان کی کم زیادہ اہمیت کا تعین نہیں کریں گے۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے کچھ ناامیدی سی پیدا ہو گئی ہے یہ طریقہ بڑی حد تک زبانی اور علمی فوقیت پر مبنی ہے اور اونچی سطح پر کچھ ماہرانہ تربیت کے علاوہ ایسا کوئی علم و ہنر اس میں نہیں سکھایا جاتا جس سے طالب علم کسی پیداواری کام کے قابل بن سکیں، یہ صرف ان کو بابو گری یا منشی کالر والے کام کے لائق بنا دیتا ہے۔ لیکن ایسے ملک میں جہاں تعلیم کی آسانیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں، اس طرح کی نوکریوں کی کمی ضرور پڑنے لگے گی اور اس وقت بھی

بے روزگاروں کی تعداد نے اس ملک میں بھیانک شکل اختیار کر رکھی ہے۔

اس کے علاوہ امتحانوں میں فیل ہونے والوں کی فی صدی تعداد بہت بڑی ہے۔ اس کی وجہ سے بھلے ہی نوکری تلاش کرنے والوں کی تعداد میں کمی آ جائے، لیکن کل ملا کر مایوسی کا جو ماحول بنتا ہے، اس میں تو فرق نہیں آئے گا۔

ان مایوسیوں اور بے یقینیوں کی وجہ سے طلباء کی طالب علمی کی زندگی کو گھن لگ جاتا ہے اور وہ چڑچڑے بن جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن کی دردناک صورتوں پر غور کیجئے۔ ہوسٹل کی پوری آسانیاں ان کو نہیں ملتیں اور بڑی بڑی کلاسوں کی وجہ سے معلموں کے ساتھ ان کا رابطہ نہیں رہ جاتا۔ کچھ کلاس تو عام جلسہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں کلکتہ کے کالجوں میں ایک ایک کلاس میں ڈھائی ڈھائی سو طالب علم رہتے ہیں!

سماجی قدروں کی کمی

ہمارے سارے سماجی نظام میں یہ اہمیت نہیں رہ گئی ہے کہ مثبت، سماجی اور انفرادی قدریں طلباء کے اندر بیدار کر سکے معلموں کے ساتھ براہ راست رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسی قدروں کی ا ——

افزائش کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ بھی ختم ہو گئی پھر ٹی وی، ریڈیو اور نیز نظر بھی بنتا جاتا ہے اور افق کے دائرے بھی نئے بنتے جاتے ہیں، روزمرہ کی زندگی کا ڈھانچہ بھی ایسی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے کہ ماں باپ کو اپنی اولاد سے رابطہ رکھنے کی

کم فرصت ملتی ہے اور ان سب باتوں کی وجہ سے سماجی آداب اور اخلاق کی جو تعمیر و تربیت گھر میں ہوتی تھی، وہ نہیں ہو پا رہی ہے۔ نوجوان دو گھوڑوں کے بیچ میں پڑ گیا ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں ان کشیدگیوں اور بے اطمینانیوں کو نہیں بھولنا چاہئے، جو ہمارے سماج کے بیچ ہیں۔ ان کا اثر نوجوانوں پر بھی پڑتا ہے۔ ایسی دنیا میں، جہاں ہر بات کے لئے لائسنس لگانی پڑتی ہو، آدمی جہاں بھی جاتا ہو، اسمبلی کے ممبران ایک دوسرے پر گالی کی بوچھار کرتے ہوں، وہاں طلبا کے پُرسکون رہنا اور ایک نادانستہ نیا ذہنی مسئلہ ہی ہے۔

اکثر طلبا کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ سیاست میں حصہ نہ لیں اور ان کی بیماری کا الزام سیاست دانوں پر لگایا جاتا ہے، جو بات بات میں دخل اندازی کرتے ہیں۔ بہت سے معاملات میں یہ بات صحیح ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ملک کے مستقبل کے شہریوں سے یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آدرش سے خالی ماحول میں رہیں اور اسی میں اپنا ارتقا کریں۔

تعلیم متوازن ہو

نوجوانوں میں جسمانی اور جذباتی طاقت کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ اُن کا تقاضہ ہوتا ہے کہ وہ کسی کو اپنائیں، ذاتی اور سماجی نقطۂ نظر کی بھی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ خطرات برداشت کرنے کا بھی ان میں شوق ہوتا ہے ایک متوازن طرز تعلیم کو اپنے پروگرام کی ترتیب کے وقت ان سب باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ خاص طور سے ہندوستان جیسے ترقی کی راہ پر گامزن ملک میں، جہاں تضادی اور معاشی عدم توازن کے مسائل ہیں، سماج میں اُتھل پتھل ہے اور انتشار کی فکر ہے۔

یہ بہت ہی ضروری ہے کہ نوجوانوں کے سامنے ایک ایسا منضبط ڈھانچہ رکھا جائے جس میں وہ اپنے کو ڈھال سکیں اور نئے سماج کی تعمیر میں ایک جاندار اور مثبت پارٹ ادا کر سکیں۔

اس لحاظ سے طلباء کے درمیان ایک سنجیدہ سیاسی کارروائی مفید ہوگی۔ لیکن آج حالت یہ ہے کہ دیس اور انسانی سماج کے سامنے جو سوال ہیں، ان میں ہمارے سیاست دان کوئی ایسی گہری اور سنجیدہ دلچسپی نہیں لیتے کہ نوجوانوں کو فیضان حاصل ہو سکے۔ اور نہ اس پس منظر میں، بیکاری، آدرشوں کی جو ٹکر ہو رہی ہے، اس پر ہی سنجیدگی سے غور کرتے ہیں اُن کے پاس دینے کی بس ایک ہی چیز ہے — وہ یہ کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر وہ حالات کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور وقتی مسئلوں پہ کچھ جذباتی اُبال لانے پر سکون محسوس کرتے ہیں

نوجوان تحریک کی ضرورت

اس لئے آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ ایک منضبط نوجوان تحریک چلائی جائے جس میں انقلابی سماجی عنصر ہو اور جو وقتی سیاسی آتار چڑھاؤ سے بالکل الگ ہو۔ اس تحریک کی یہ بھی خوبی ہونی چاہئے کہ وہ نوجوانوں سے مقصدیت کی اپیل کرے اسے ایک نشانے کی حیثیت دے اور اس کے لئے ایثار کرنے کی ترغیب دے اور جب تک طرز تعلیم میں سولہ آنے تبدیلی نہیں ہوگی اس مقصدیت کو، باہر کی جو خامیاں ہیں، انھیں بھی پورا کرنا ہوگا۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر، "کشور شانتی دل"، "شانتی سینا" کے نوجوان جذبہ کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس کی چھوٹی موٹی شروعات کے حاصلات اُمید افزا ہیں۔ آج کے حالات کو سدھارنے میں اس کا بڑا بھاری کام ہو سکتا ہے، شرط یہ ہے، کہ پبلک اس میں دلچسپی لے اور "ماں باپ سنگھ" یا "شہری دل" کی شکل میں اس کا ہاتھ بٹائے۔

لیکن اب یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ماں، باپ بیدار ہو جائیں، تعلیم کے معاملے میں عملی دلچسپی لیں اور تعلیم کے طریقوں میں انقلابی ترمیم کا حکومت سے موثر مطالبہ کریں۔

اب جبکہ ایک تعلیمی کمیشن سرکار نے مقرر کر دیا ہے، تب تو اس طرح کی دلچسپی لینا اور سرکار پہ دباؤ ڈالنا زیادہ ضروری ہے۔

ایک نوجوان افسانہ نگار نے انگریزی کے عظیم ادیب سامرسٹ ماہم کو برائے تنقید اپنی چند کہانیاں بھیجتے ہوئے لکھا۔ محترم! آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا میں اپنی کہانیوں میں مزید آگ بھر دوں؟

ماہم نے لکھا: بہتر ہو اگر آپ اسکے برعکس کام کریں!

●

ایک ان پڑھ: مولوی صاحب السلام علیکم!

مولوی صاحب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ!

ان پڑھ: مولوی صاحب! میرا نام کریم بخش ہے رحمت اللہ نہیں ہے

●

ایک فوجی افسر نے چند سپاہیوں کو دعوت دی جب میز پر کھانا چنا گیا تو افسر نے ان سے کہا کہ کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑو جس طرح ایک دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہو۔

ذرا دیر میں کھانا ختم ہونے لگا تو ایک سپاہی نے کچھ کھانا جیب میں رکھ لیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" افسر نے پوچھا

"جو دشمن ختم نہیں ہوتے انھیں قید کر رہا ہوں" جواب ملا

●

نہرو کی شخصیت کے چند پہلو

میں اپنے کمرے کے دریچے سے سمندر، اس کی عظمت اور وسعت کا نظارہ کرتا ہوں۔ وطن کے لئے جواہر لال نہرو کی محبت کا تقابل صرف اس بیکراں، اتھاہ اور بے آرام سمندر ہی سے کیا جا سکتا ہے جس کی وسعت اور گہرائی کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔

جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو ذرے ذرے سے محبت کی، محبت — جو لامحدود تھی۔ انھوں نے عظا کاروں سے بھی محبت کی اور ان کی بے آرام طبیعت زندگی بھر تمام لوگوں کی بھلائی کے لئے سرگرداں رہی۔

جواہر لال نہرو کی تابناک جھلکیاں آج بھی میرے ذہن میں روز اول کی طرح تازہ ہیں جب وہ بندرگاہ پر گاندھی جی کو رخصت کرنے آئے تھے جو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔ جواہر لال کی مسرت بھری پر جوش ہستی کی دلفریبی تھی — جادو تھا۔ **جنگ آزادی** کے دوران، لاٹھی چارج کے موقعوں پر اور شہر کے بے پناہ اژدہام والے جلسے جلوسوں میں بارہا وہ دلفریب اور تند و تیز چہرہ دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔

پھر آزادی کے بعد نیشنل کانگریس سیشن کے موقع پر کشمیر آنے کے بعد پر سکون کمرے میں انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں وہ بغیر کسی محافظ کے بے حد مسرور و مطمئن نظر آرہے تھے۔ وہاں ویجے لکشمی پنڈت بھی موجود تھیں۔ یہ سب میرے لئے ناقابل فراموش ہے۔ ان کا چہرہ اور شخصیت ہمیشہ کے لئے لوگوں کے دلوں پر نقش ہو چکی ہے۔

ہیرا

گاندھی جی کی سکریٹری راجکماری امرت کور اپنی یادداشت سے ایک واقعہ بیان کرتی تھیں جو گاندھی جی سے جواہر لال کے بے ربط انداز گفتگو کے متعلق تھا۔ جب امرت کماری نے گاندھی جی سے دریافت کیا کہ انھوں نے اس نوجوان کا وہ ناگوار انداز کیوں کر برداشت کیا تو انھوں نے فوراً جواب دیا: جواہر لال کو تم اتنا نہیں جانتیں جتنا کہ میں۔ میں اس کی درشتی کا برا نہیں مانتا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کھرا اور سچا ہے۔ وہ ہیرا ہے ہیرا جیسا کہ اس کا نام ہے۔ ملک کی رہنمائی کے طویل عرصے میں وہ عظیم خصوصیات یعنی بے لوث اور پُرخلوص طبیعت اور بے لوث خدمت کا جذبہ دنیا میں بہترین سمجھی جاتی ہیں، جواہر لال کی یہ خصوصیات پیدائشی تھیں جنھوں نے بدلتے ہوئے غیر یقینی اور ناسازگار حالات میں طاقت و ستونوں کا کام دیا۔ بڑے سے بڑے وقت میں بھی ان کا شیشے کی طرح شفاف اور نمایاں خلوص ہی ایک ایسی شے تھی جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

بعد میں اپنی وطنی خدمات کے سلسلے میں انھوں نے بے لوث قربانی بھی دی جبکہ ابتدائی چند برسوں میں وہ مصنوعی عیش و آرام اور اس کے پس منظر سے نبرد آزما رہے جس کے لئے اس طرح کی خدمات کے درمیان جنھیں وہ انجام دے رہے تھے کوئی جگہ نہیں تھی۔

کون سوچ سکتا تھا کہ جواہر لال اپنا عیش و آرام تج کر بھی طور پر اپنی زندگی کے سولہ قیمتی سال قید و بند کی صعوبتوں کی نذر کر دیں گے؟ اس وقت کا ماحول اور فضا ناقابل تصور تھی لیکن وہ کامیابی سے بڑھتے چلے گئے اور جلد ہی گاندھی جی کی صحبتوں سے فیض اور کسان تحریک کے تجربات نے ان کی آتش حب الوطنی کو ہوا دی۔

پسرو باپ

اپنے والد موتی لال کے کسی عملی اقدام یا سمجھنے سے قبل ہی جواہر لال اپنے لئے ایک دشوار گزار راستہ اختیار کر چکے تھے۔ باپ نے بیٹے سے بحث و تمحیث کی مگر بے سود! بیٹا پہلے ہی سچائی کا علم بلند کر چکا تھا۔ لہٰذا میں خود موتی لال نے بھی اپنی بے حد منفعت بخش پریکٹس چھوڑ کر قومی جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کئی سال تک نہرو خاندان کو بے یقینی اور پریشانیوں کا سامنا رہا جیسا کہ جواہر لال کی چھوٹی بہن مسز کرشنا ہتھی سنگھ نے اپنی خود نوشت سوانح حیات WITH NO REGRETS میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ درحقیقت وہ تمام تکالیف بغیر کسی رنج و افسوس کے برداشت کی گئیں کیونکہ یہ سب کچھ ایک عظیم مقصد کے لئے تھا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ آزمائشوں اور تجربات کی بھٹی میں جواہر لال کا امتیازی کردار اور بے مثل شخصیت از خود ڈھل رہی تھی۔

عوام کا محبوب

اُن کی باغی فطرت جس پر قابو مشکل تھا اپنے لیڈر کے عدم تشدد کے اصول میں ڈھل گئی تھی اور پھر اسی اصول کے تحت وہ بڑے جوش و خروش سے ملک کو آزاد کرانے میں جٹ گئے۔ اس خلوص مقصد ہی کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی اُن پر بھرپور اعتماد کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ء کے لاہور کے کانگریس کے اجلاس میں پہلی بار آزادی کی تجویز پاس ہوئی اور جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔

اُس زمانے میں لاہور ہندوستان کا سب سے زیادہ فیشن پرست شہر تھا اور صدہا جوان مرد اور عورتوں نے آزادی کے جذبے سے متاثر ہو کر اپنا سب عیش و آرام تج دیا اور آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ جن لوگوں نے ۱۹۲۹ء کے کانگریس سیشن میں

شرکت کی وہ پنجاب کے جلیانوالہ باغ کے اُس جوش و خروش کی گواہی دینگے جو جواہر لال نہرو کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے نوجوانوں کے دل میں مچل رہا تھا ۔ اُن دنوں جوانی کا عالم جنت کے حصول سے کم نہیں تھا ۔

تبدیلی

آزادی کے ساتھ باغی جواہر لال نہرو کا تصور تیزی سے بدلنے لگا اور اس کی جگہ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا تصور ابھرنے لگا ۔ جیسا کہ مسز کرشنا ہتھی سنگھ نے لکھا ہے ، حالات نے اور شاید ان تمام عوامل نے جو اقتدار اور قوت کے شانہ بشانہ چلتے ہیں بھائی کی زندگی کو کافی حد تک بدل دیا تھا اور یہ بڑی قابل افسوس بات تھی ۔ ابھی جواہر لال میں وہ آگ اور وہ تڑپ باقی تھی جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی تھی ۔ ہزاروں ذمہ داریاں جنہیں وہ کسی دوسرے کے سپرد نہیں کرنا چاہتے یا دوسرے اُن کے اہل نہیں ہو سکتے انھیں اپنے بوجھ تلے دبائے ڈال رہی ہیں ۔ اُن کے نصیب میں آرام نہیں ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہر وقت کوئی نہ کوئی فکر انھیں کھائے جا رہی ہے اور یہ فکریں کبھی ختم نہیں ہونگی ۔

غمِ جہاں

دہلی میں میں نے جواہر لال کو مختلف موقعوں پر دیکھا ہے اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ یہ جواہر لال بہت مختلف ہے ۔ فکروں اور پریشانیوں سے انھیں کبھی بھی چھٹکارا نہیں ملا گو وہ ملک کے سب میں بڑے عہدے پر فائز تھے لیکن اصلیں کی ایک ایسی شخصیت تھی جس نے آزادی کے بعد کے خطرناک اور منتشر حالات میں لوگوں کو بڑی مضبوطی سے اپنائے رکھا ۔

ملک کی سب میں بڑی ذمہ داری نے ان کے نظریات کو کچل دیا تھا اور وہ مایوسی جو پورے ملک پر چھائی ہوئی تھی اُن کے چہرے پر بھی دیکھی جا سکتی تھی گو انھوں نے اسے چھپانے کی لاکھ کوشش کی ان سب باتوں کے باوجود وہ آگے بڑھتے گئے اور ان کے ساتھ ملک بھی اور اس وقت ملک میں جو سائنسی ترقی نظر آتی ہے وہ صرف اسی ایک ذات کا ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے ۔

خوابوں کا شہزادہ

جواہر لال نہرو ہندوستان کو ایک ترقی یافتہ اور مضبوط صنعتی ملک دیکھنے کے خواہشمند تھے لیکن وہ آخر تک ایک تخیل پرست اور خوابناک وادیوں کے راہی رہے اپنی تخیل پرستی کے باوجود دنیا میں امن برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے ایک بہادر سپاہی کی طرح جنگ کی یورپ کی بڑی بڑی قوتیں بھی رہنمائی اور مشورے کے لئے ان کی طرف دیکھتی تھیں ۔

دنیا کا کوئی بھی ملک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ایسا نہیں تھا جہاں امن کے پیغمبر امن کی آواز نہ گونجی ہو اگرچہ چینی حملے سے انھیں ناقابل بیان صدمہ پہنچا تھا لیکن انھوں نے اس کے باوجود امن کی پالیسی نہیں چھوڑی ۔

پنڈت نہرو کی درخشاں شخصیت کے کئی دلکش پہلو ہیں اور ہر پہلو ایک سے بڑھکر ایک ہے وہ سحر انگیز شخصیت جو عوام کے لئے ایک دیوتا کی حیثیت رکھتی ہے ۔ وہ باغی شخصیت جو انگریزی سامراج کی لاٹھیاں کھاتی رہی ایک قابل وزیر اعظم ۔ ایک تخیل پرست اور خوابوں کی وادی میں رہنے والا حسن کار اور سب میں بڑھکر ایک عالمگیر شہرت رکھنے والا ادیب جسکی کتابیں ہماری آئندہ نسلیں بڑی محبت اور احترام سے پڑھینگی ۔

رتنا گیری

خاور بانکوٹی

آدمیت کے حسیں پھول یہاں کھلتے ہیں
یہ زمیں ، میرے تصوّر کا چمن ہے جیسے !
لوگ اخلاص و محبت سے یہاں ملتے ہیں
دو برس پہلے یہ محسوس کیا تھا مَیں نے
اِن کی محفل میں جب اِک جام پیا تھا میں نے

○

یہ زمیں آج مگر " میرا وطن " ہے جیسے
جسکے موسم سے مَیں گھبرا کے چلا آیا ہوں
بُغض و نفرت کے وہی پھول یہاں کھلتے ہیں
لوگ ، اُنہی اپنوں کی مانند ، یہاں ملتے ہیں
جن کی محفل سے میں اُکتا کے چلا آیا ہوں

رفعت سروش

آئیں بائیں شائیں

ب نیکمک ہوں۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ میں لکھک تھا۔ بکتا تو بہت کم ہوں، سوچتا زیادہ ہوں۔ لغت میں غلط ہے نہیں۔ ورنہ میں تو اپنے آپ کو "سوچک" ملا۔ ویسے میں لکھنے کے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں نہ۔ کیا لکھوں، کیسے لکھوں، کیونکر لکھوں۔ یہی سوچ سوچ کر الجھ جاتا ہوں۔ اور اسی ادھیڑ بن میں کبھی کبھی ہ آدھ بار قلم اٹھایا بھی تو دو چار کٹی پٹی سطروں کے سوا نہیں لکھ پایا۔ اسلئے آج بجائے لکھنے کے سوچنے بیٹھ گیا ہوں۔ ویسے یہ عادت ہے بُری۔ مگر کیا کروں تنے کی عادت جڑ پکڑتی جا رہی ہے اور لکھنے کی عادت ٹتی جا رہی ہے، آپ اگر میری یہ تحریر دیکھیں تو آپ کو یا محسوس ہوگا کہ دماغ کا کیڑا کا غذ پر رینگ رہا ہے، ماغ کے کیڑے کے خیال سے ابکائی آتی ہے —— مگر بال ہی کونسی خوبصورت چیز ہے —— ویسے خوبصورتی آج ہے ہی کہاں۔ میری تحریر سے بڑ کر اس دور حسینان میں خوبصورتی نہیں ملتی۔ کل جس چیز کو بدنمائی کہتے تھے ہ وہ حسینوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی حال تحریروں کا ہے، دب شعر کا ہے، کل اکھڑے اکھڑے فقرے اور بے ربط جملے لکھنا عیب میں شمار ہوتا تھا، آج اسے ادب لطیف ہا جاتا ہے۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا، مگر بات بننے میں ہی نہیں آتی۔ چچا غالب بھی ایسی منزل سے گزرے ہونگے اور اسی عالم میں انھوں نے پکارا ہوگا۔ "کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے" مگر ان کے یہاں پکار کا سلیقہ تھا، شعور تھا، اس لئے آج تک اُن کی بات کی جاتی ہے۔ ہم کیا کریں کہ ہمیں بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ ورنہ اقبال کی طرح شکوہ ہی کرتے اور مزے سے خود ہی جواب شکوہ فرماتے۔ مگر وہ ذہنی قلابازیوں کے زمانے گئے۔ اب تو دو اور دو چار کا زمانہ ہے، جو سوچو وہ لکھو، اور جو لکھو اُسے نہ سوچو کہ کیا لکھا ہے، پلٹ کر دیکھنے کی فرصت کہاں آج کے انسان کو۔ زندگی کا سفر تیز —— اور تیز —— اور تیز ہوتا جاتا ہے۔ کتنا مضحکہ خیز یہ خیال ہے "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" —— کیوں صاحب! آخر کیوں۔ ؟ گردشِ ایام کو کیا پڑی ہے کہ پیچھے کی طرف دوڑے۔ وہ ایک دستور، ایک نظام، ایک اصول کی تابع ہے، —— کل کی باتیں آج افسانہ بن گئی ہیں۔ "آج" "کل" کو افسانہ بن جائیگا —— مگر آج اور کل کا یہ افسانہ لکھنا میرے بس کا کام نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو کسی فسانہ طراز کی زبان دراز کا محتاج ہے —— محتاج! —— کتنا جھولی قسم کا لفظ ہے "اس قسم اسالیب" نثر کے لفظ جو آ کر قلم خود بخود رک گیا۔ سوچ کی دھارا ادھر پڑ گئی۔ تیز رفتاری میں ٹھہراؤ آ گیا، —— ندی تیز رو ہو، بس اسکی خوبی ہے، اگر گہری ندی بھی ہو، مگر ٹھہری ہوئی ہو تو اس کا وجود بیکار ہے —— "ندی گہری سہی ٹھہری ہوئی ہے" —— اس ایک مصرعہ میں مجاز نے اقبال پر تنقید کی تھی —— مجاز اگر جم کر ادب پر تنقید کا کام کرتے تو شاید اردو ادب کو ایک خوش طبع نقاد مل جاتا۔ نقاد لوگ بڑے کھرے اور خشک قسم کی مخلوق ہیں —— کوئی بھی آدمی اگر یہ دعویٰ کرے میں نقاد ہوں تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ اس میں حسِ لطیف کی کمی ہے۔ "حسِ لطیف" اور تنقید میں خدا واسطے کا بیر ہے، بھلا اس آدمی میں حسِ لطیف کیسے باقی رہ سکتی ہے جس کا کام ہی دوسروں کے کیڑے نکالنا ہو، دوسروں کی عیب جوئی کرنا ہو۔ کہتے ہیں عیب جوئی بھی ایک بڑا فن ہے —— ہوگا بھئی —— ہمیں تو بات جچتی نہیں۔ آپ ہی فرمائیے۔ اگر آپ کوئی اچھا خاصا کام کر رہے ہیں اور آپ پر کوئی برس پڑے کہ آپ کے کام میں یہ خامی ہے، یہ خرابی ہے یہ نقص ہے، تو پہلے تو آپ جھنجھلائیں گے اور پھر موقعہ ملا تو آپ اس شخص سے کہیں گے کہ اچھا صاحب! اگر میرے کام میں خرابی ہے تو آپ اسے ٹھیک کر کے دکھلائیے —— زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عیب جو آدمی نمونہ کے طور پر کچھ کر کے دکھا بھی دیا کرتا ہے۔ مگر ادب کی دنیا کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں عیب جو بھی نقاد وہی ہے جسے کیڑے نکالنے تو خوب آتے ہوں لیکن خود کام کر کے دکھلانے کی صلاحیت بالکل نہ ہو۔ اگر اس میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ یعنی اس نے خود بھی ادب کی تخلیق کرنا شروع کر دیا —— تو پھر وہ عیب جو کہاں رہا۔ پھر تو وہ بھی اس زمرہ میں شامل ہو گیا جس کے کیڑے نکالنا اس نے اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

—— کہیں کوئی نقاد سُن تو نہیں رہا ——

نقادوں سے میری ویسے بھی نہیں بنتی —— مگر جانتا مجھے ان سے کوئی بیر نہیں۔ یہ تو گویا مقطع میں سخن گسترانہ "بات" آن پڑی جس میں مجبور ہو گیا۔ —— مجبوری —— مجبوری بھی عجب راستہ کا روڑا ہے۔ انسان کو زندگی کا چھوٹا سا سفر طے کرنے میں قدم قدم پر سیکڑوں مجبوریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجبوریوں کی اتنی قسمیں ہیں کہ آدمی انہیں گننے سے مجبور ہے۔ ہاں شاید سب سے بڑی مجبوری ہے پیسے کی مجبوری ——

تبصرے

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ۔

شکنتلا

شکنتلا ۔ ہندوستان کے عظیم شاعر کالی داس کی ناٹک ابھگیان شکنتلا کا اردو ترجمہ ہے اور مترجم ہیں اردو کے مشہور شاعر حضرت منور لکھنوی ۔

شکنتلا ، صرف ہندوستان کی تقریباً سبھی زبانوں میں بلکہ یورپ اور ایشیا کی اکثر زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے ۔ اردو میں اس کے کئی ترجمے موجود ہیں جن میں سب سے تازہ ترجمہ غالباً ساغر نظامی کا ہے جو چند سال پیشتر ہی شائع ہوا ہے ۔

کسی بھی ترجمے کے حسن کو جانچنے کا ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ دیکھا جائے کہ اس میں اصل کی روح کہاں تک پوشیدہ ہے اگر یہ طریقہ دسترس سے دور ہو تو IN-DIRECT طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور دوسرے ترجموں کے مقابلے میں اسے رکھکر جانچا جاتا ہے ۔ پہلا طریقہ میری دسترس سے دور ہے اس لئے میں اسی دوسرے طریقے کو اپنانے پر مجبور رہوں ۔

میری نظر سے شکنتلا کے دو تین ترجمے گزرے ہیں ایک ساغر نظامی کا ۔ دوسرا قابیہ زیدی کا اور تیسرا کسی انیسویں صدی کے غیر معروف شاعر کا جسکی زبان گوارا نہ ہی تھی لیکن آج کی اردو سے کافی مختلف لیکن جس میں بڑی عمدہ منظر کشی اور بلا کی روانی تھی اور جس میں مناظر کے اعتبار سے بحریں بھی بدلتی تھیں ۔ میری رائے میں منور صاحب کے ترجمے اور اس ترجمے میں بڑی مناسبت ہے ۔

کبھی ترجمے میں اصل کی روح کو سمو دینا ایک معجزے سے کم نہیں ادب کی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ لوگ اصل کو بھول گئے اور ترجمے پر فریفتہ ہو گئے ۔ کالی داس کی شکنتلا کو تو لوگ شاید ہی بھول سکیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ لوگوں کے فریفتہ ہونے کے لئے منور صاحب کے ترجمے میں کافی حسن موجود ہے ۔

کسی کتاب کا ترجمہ بشرطیکہ اُسے خلوص دل تخلیقی نیت سے کیا جائے بڑی محنت اور جانکاہی چاہتا ہے یہ بڑا ہی THANKLESS JOB ہوتا ہے بہتر سے بہتر ترجمہ پیش کرنے پر بھی لوگ اسے تخلیق کے ہم پلہ نہیں سمجھتے جب صورت حال یہ ہو تو مترجم کو اسکی لگن اور ایک اچھی کتاب کا اچھا ترجمہ اپنی زبان میں پیش کرنے کی خواہش ہی ترجمے کی طرف مائل کر سکتی ہے ۔ منور صاحب اگر چاہتے تو اس ترجمے کی بجائے کوئی دوسری کتاب تخلیق کر لیتے لیکن وہ اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں نام و نمود کی خواہش گرد راہ بن چکی ہے جو شخص بیسوں کتابوں کا مصنف اور مترجم بن چکا ہو اسے تو اب تخلیق میں بھی وہ کشش محسوس نہ ہوتی ہوگی اب تو کوئی حسین ترین خیال کوئی آسمانوں کی بلندی کو چھوتا ہوا خیال ، اور فکر دامن تھامے آ جھپٹے ۔ یہ ناول کوئی کتاب ہی ایسے شخص کو اپنی طرف مائل کر سکتی بالکل اسی طرح جس طرح شعر خود غالب سے الفاظ میں ڈھل جانے کا مطالبہ کیا کرتا تھا ۔

منور صاحب کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی میرے خیال میں اسکا محاکاتی حسن اور وہ نزاکت بیان ہے جسکے نہ ہونے سے زیر نظر ترجمہ اس قدر حسین ترجمہ نہ ہوتا ۔ یہ نزاکت بیان ہی کا معجزہ ہے کہ ہمیں اس ترجمے میں بھرپور جذبات نگاری ملتی ہے ۔ اکثر مقامات پر منور صاحب نے ترکیبیں لگا کر کرداروں کے ان جذبات و احساسات کو بیان کیا ہے جو اس خاص موقع پر اُن کے دل میں تھے ۔ جہاں میرے خیال میں اگر یہ نہ بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ منور صاحب نے ایسے موقوں پر جذبات نگاری کیلئے جو زبان استعمال کی ہے جو اتنی مکمل اور بلیغ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی نشاندہی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بحیثیت مجموعی ترجمے کی زبان بڑی سلیس شستہ اور رواں ہے لیکن بعض بعض جگہ سنسکرت یا سخت قسم کی ہندی کے الفاظ کے استعمال نے روانی میں رکاوٹ سی پیدا کر دی ہے " یگیہ ۔ سندھیا بترین ۔ جیکر ورتی ، پردکل ۔ کچھن ۔ مرگ چھوزن برنواس ۔ برتھا ۔ مارتج ۔ آدتیھ وٹ اور کئی ایسے الفاظ ہیں جن سے اردو والے ناواقف ہیں ۔ کہیں کہیں مفہوم واضح ہو جاتا ہے لیکن بعض اوقات صرف ایک لفظ کی وجہ سے مطلب سمجھ میں نہیں آتا ۔ اکثر مقامات پر منور صاحب نے ثقیل سنسکرت الفاظ کے معنی صفحے کے نیچے دئے ہیں اگر ان الفاظ کا اردو بدل ملنا مشکل تھا تو ان کے بھی معنی دیدئے جاتے اس سے مطلب اور مفہوم واضح ہو جاتا لیکن میرے خیال میں اسے ترجمے کی خامی ہرگز نہیں کہا جا سکتا یہ تو اردو ہی کی تنگ دامانی ہوئی اس ترجمے کا چوتھا ایکٹ بڑا جاندار ہے شکنتلا کی رخصتی کا منظر منور صاحب نے اس خوبصورتی سے کھینچا ہے اور اس ایکٹ کے منظوم مکالموں اور بیان میں اس قدر روانی ہے کہ دل واقعی خون ہو جاتا ہے اور کہیں یہ شک تک بھی نہیں ہوتا کہ ہم ہزار سو سال پہلے کی ایک کتاب کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں ۔ اس منظر میں جو زندگی رچی ہوئی ہے وہ شاید ہی کسی ترجمے میں ملے شاید یہی وہ منزل ہے جہاں ترجمے اور تخلیق کا فرق مٹ جاتا ہے ــــــ اردو کتابوں کی روایتی خامیوں سے یہ صاف ستھری کتاب بھی پاک نہیں ہے ۔ کتابت کی غلطیاں اس میں بھی موجود ہیں ۔ شاید یہ نظر بد کا علاج ہوں ۔

اس خوبصورت کتاب کی قیمت صرف ۶ روپئے ہے جو کتاب کے گٹ اپ سے قطع نظر اس محنت کو دیکھتے ہوئے بہت ہی کم ہے جو منور صاحب نے کی ہے ۔ یہ کتاب آزاد بک گھر ۲۹ ــ ۱۵۲۸ فیض گنج ۔ دریا گنج دہلی کے علاوہ ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہے ۔

خطوط

واحد پریمی ــــــ بھوپال

"... دورِ حیات" میں مرزا عزیز جاوید کا خط نظر سے گذرا۔ بھائی یہ مرزا عزیز جاوید کون صاحب ہیں۔ میں نے تو انھیں صرف دو تین بار "دورِ حیات" ہی میں دیکھا ہے۔

مرزا صاحب (عزیز جاوید) کتنے اچھے شعر گو ہیں اس کا اندازہ ان کی اس نظم سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو زیر بحث شمارہ میں شریک ہو اور جو قطعی نامکمل و مہمل ہے۔ انداز بیان بھی بچکانہ ہے اور مندرجہ ذیل مصرعہ تو:

سہم کے میں نے خطا کار طفل کی مانند

خلاف وزن ہی ہے جس شخص کو "سہم" کا صحیح تلفظ تک نہ معلوم ہو اُس کا شعر گوئی کا دعویٰ کہاں تک درست ہے اس کا فیصلہ خود قارئین دورِ حیات کر لیں گے۔ رہی سخن سنجی کی بات تو وہ بھی مرزا صاحب کے پورے خط سے ظاہر ہے آپ لکھتے ہیں:۔

"مظفر حنفی صاحب کی غزل جو صرف جا و بیجا واوین کی تپی اور بھونگی سے آراستہ ہے"۔

مرزا صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

حنفی صاحب کا مطلع ہے۔

اگر ہزار "خوشامد پسند" ہوتے ہیں
تو صاف گو بھی زمانے میں چند ہوتے ہیں

اس مطلع کے لہجہ اور موضوع پر گفتگو بیسود ہے کہنا صرف اتنا ہے کہ خوشامد پسند واوین کے بغیر بھی قاری کے ذہن میں وہی مفہوم پیدا کرتا ہے جو مظفر حنفی صاحب چاہتے ہیں۔

اچھا خدا مرزا صاحب بتائیں تو کہ خوشامد پسند سے کیا مفہوم سمجھے لہجہ اور موضوع پر گفتگو نہ کرکے انھوں نے اپنی قابلیت کا بھرم رکھ لیا تھا مگر اسے خوشامد پسند پر اظہار خیال کرکے کھول دیا۔ مرزا صاحب کی معلومات کے لئے یہ عرض کر دوں کہ "خوشامد پسند" دو صورتوں میں مستعمل ہے۔ ایک تو خوشامد پسند، ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو دوسروں کی خوشامد پر پھولے نہیں سماتے اور دوسرے ان لوگوں کیلئے مستعمل ہوتا ہے جو خود خوشامد کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ مظفر صاحب نے خوشامد پسند کو واوین میں دے کر یہی بات واضح کی ہے کہ ان کا اشارا خوشامد کرنے والوں کی طرف ہے جس سے طنز بھرپور ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ بھی مظفر صاحب نے جہاں جہاں واوین کا استعمال کیا ہے وہ ضرورت کے تحت کیا ہے۔ مرزا صاحب انکی اہمیت نہ سمجھیں یا انھیں بے ضرورت جانیں تو یہ مرزا صاحب کی "دانشمندی" ہے اس میں مظفر صاحب کا کیا قصور؟ دیکھئے یہاں واوین میں لفظ دانشمندی کتنا لطف دے رہا ہے۔ یقیناً مرزا صاحب بھی اس سے "لطف اندوز" ہونگے اور یہی واوین کی اہمیت کا راز ہے۔

اسی طرح اگر مرزا صاحب صرف اتباعِ واوین کو "سعادت تلمیذی" سمجھتے ہیں تو یہ انکی ذہانت و لیاقت ہے"۔ ورنہ دیکھنے میں آیا ہے کہ "سعادت تلمیذی" جیسے الفاظ سے مرزا صاحب جیسے خود رو اور خود ساختہ علامہ نا واقف ہی ہوتے ہیں ناصر کاظمی کو ستون کی حیثیت دے دینا بھی مرزا صاحب جیسے "عقلمندوں" کا کام ہے ورنہ مظفر صاحب نے اپنے خط میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو بلکہ میرا خیال ہے کہ مظفر صاحب نے تو ناصر کاظمی کا نام مرزا صاحب کے الفاظ میں محض "شاخِ برگ بار" کی حیثیت ہی سے لیا ہے اور وہ بھی اس لئے لیا ہے کہ ناصر کاظمی کا تذکرہ واوین کی اہمیت پر مضمون لکھنے کے سلسلے میں آ چکا تھا ورنہ شاید وہ ناصر کاظمی کا نام بھی نہ لیتے۔ لیکن ہاں میں ضرور یہ عرض کروں گا کہ ناصر کاظمی کی حیثیت مرزا صاحب جیسے شاعروں کے سامنے ستون ہی کی ہے مظفر صاحب کی حیثیت تیسرے درجہ کی ہے۔ یا اول درجہ کی اس کا فیصلہ اہلِ نظر بہت پہلے کر چکے ہیں"۔ دورِ حیات" ہی کے کئی شماروں میں مظفر صاحب کی تخلیقات پر ادارہ کی طرف سے توصیفی نوٹس دیئے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نوٹ درج ذیل ہے۔

"مظفر حنفی آج اس رنگ کے منفرد شاعر ہیں اس رنگ کی غزلیں شاد عارفی مرحوم کہتے تھے اور بھی کئی لوگ کہتے تھے لیکن انھیں وہ رنگ نصیب نہ ہو سکا۔ آج بھی لوگ کہتے ہیں لیکن مظفر حنفی کا رنگ شاید ہی کسی کا ہے"[1]

[1] بحث سے قطع نظر توصیفی نوٹ جاوید صاحب کے لئے بھی لکھے گئے ہیں (ادارہ)

ادبی اور تہذیبی خبریں

● جشنِ مجاز کمیٹی کی جانب سے ۶ر فروری ۷۵ء کو جشنِ مجاز منایا جائیگا - جسمیں ادبی اور فلمی شخصیتیں حصہ لینگی - مجاز کے فن اور شخصیت پر تقریریں ہونگی اور فلم کے پلے بیک سنگرس ان کا کلام گائینگے - پچھلے دنوں اِسی کمیٹی کی جانب سے یومِ مجاز منایا گیا ، جسکے مشاعرے میں بمبئی کے تمام ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی -

●

● ہندی کے مشہور ادیب جناب ظہور بخش کا بھوپال میں انتقال ہو گیا -
۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات میں اُن کا گھر اور ایک بڑی وسیع لائبریری تباہ ہو گئی تھی - کچھ سال پہلے ہندی کے ادیبوں نے انھیں ہر قسم کی مدد پہنچانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور وہ پھر پرسکون زندگی گزارنے کے قابل ہو گئے تھے -

●

● حیدر آباد کے عوامی شاعر غلام سرور ڈنڈا کا حیدر آباد میں انتقال ہو گیا - ڈنڈا حیدآباد کے ہر دلعزیز اور مقبول شاعر تھے - اُن کی موت سے دکنی شاعری کو زبردست نقصان پہنچا ہے -

●

● اورنگ آباد میں جو برسوں اردو کی اشاعت و ترقی کا مرکز رہا ہے اور جہاں مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی تھی ایک "اردو منزل" کی تعمیر کیلئے جناب سکندر علی وجد بڑی سرگرمی سے کوشش کر رہے ہیں وجد صاحب پچھلے دنوں خرابی صحت کی وجہ سے قبل از وظیفہ پر سبکدوش ہوئے ہیں اور اورنگ آباد میں رہنے لگے ہیں - وہ اب اپنا تمام تر وقت اردو کی ترویج و ترقی کے لیے صرف کرینگے -

●

● علیان کنک میں ریل کے ایک حادثے میں قیصر الجعفری کے چھوٹے بھائی ظفر احمد کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے "رنگ حنا" کی اشاعت کچھ دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی ہے "رنگ حنا" قیصر الجعفری کے کلام کا انتخاب ہے جسے دورِ حیات پبلکیشنز شائع کر رہا ہے -

اب کی بار

اردو رسالوں کی مجبوریوں سے اردو والے واقف نہیں ہونگے تو اور کون ہوگا -
انہیں مجبوریوں کے تحت اس بار خسروکر نمبر پیش کرنا پڑ رہا ہے - مجبوریوں کی فہرست تو کافی طویل ہے لیکن ان میں اہم ترین دو ہیں -
● دورِ حیات کو اب تک کاغذ کا کوٹا نہ ملنا -
● اور بازار سے نیوز پرنٹ کا غائب ہو جانا
انہیں مجبوریوں کے تحت پرچہ تاخیر سے چھپ رہا ہے اور اچھے اور قیمتی کاغذ پر چھپ رہا ہے
کبھی کبھی مصیبت میں بھی کوئی نہ کوئی خوشگوار پہلو نکل آتا ہے -

●

دورِ حیات نے اس ماہ اپنی اشاعت کے چار سال پورے کر لئے - جنوری میں ہم سالگرہ نمبر پیش کر رہے ہیں دُعا کیجیے کہ ہم اسکے اور کئی سالگرہ نمبر آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں -
● کاغذ کا کوٹا ملنے پر بھی کسی رسالے کو اور وہ بھی اُردو کے رسالے کو ۴ سال تک نہ صرف جاری رکھنا کر جانا ہے سہا آج کے زمانے میں بڑی ہمت کا کام ہے - ان ۴ سالوں میں کتنی رسالوں کو کوٹے مل گئے لیکن بیچارہ دورِ حیات ہی ایک ایسا کم نصیب ہے جسے حکومت کی طرف سے کاغذ کا ایک پرزہ بھی نہیں ملا - کسی نے سچ کہا ہے حکومت کے کام حکومت ہی جانتی ہے - م
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

ہفت روزہ
دورِ حیات
پرنسس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، بمبئی ۳

جلد ۳ | یکم تا ۲۰ دسمبر ۱۹۶۴ء | شمارہ ۴۲-۴۳-۴۴

اس شمارے میں

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

قیمت: ایک سال - دس روپے
فی پرچہ ۲۵ پیسے

۱۹۶۴ کے اہم ہندوستانی واقعات

جنوری

۱۔ مہاراشٹر کے چیف منسٹر نائیک نے شراب بندی کے قانون میں نرمی پیدا کرنے کا اعلان کیا۔
۱۔ جنرل راجندر سنگھ جی سابق کمانڈر انچیف کا دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔
۷۔ وزیر اعظم نہرو پر کانگریس سیشن کے موقع پر بھونیشور میں فالج کا حملہ ہوا۔
۱۰۔ مغربی بنگال میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔
۲۲۔ لال بہادر شاستری اور ڈی سنجیوا مرکزی وزارت میں شریک کئے گئے۔
۱۵۔ سرینگر میں حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے والوں پر پولیس نے ۳ مرتبہ گولی چلائی۔

فروری

۳۔ اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلے پر بحث شروع ہوئی۔
۶۔ راجکماری امرت کور کا ۷۵ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔
۱۴۔ سوشلسٹ پارٹی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی نے ضم ہو جانے کا فیصلہ کیا۔
۱۵۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی نے اشوک مہتا کو پارٹی سے نکال دیا۔
۲۸۔ مسٹر غلام محمد صادق مسٹر شمس الدین کی بجائے کشمیر کے وزیر اعظم بنائے گئے۔

مارچ

۲۳۔ یو پی اسمبلی کے اسپیکر نے یو پی ہائیکورٹ کے دو ججوں کو گرفتار کرنے کے احکام جاری کئے۔

اپریل

۸۔ شیخ محمد عبد اللہ سابق وزیر اعظم کشمیر کو جیل سے رہا کر دیا گیا۔
۱۴۔ مسٹر مہاویر تیاگی کو مرکزی وزارت میں شریک کیا گیا۔

مئی

۲۰۔ ڈاکٹر بھابھا کا لندن میں انتقال ہو گیا۔
۲۴۔ شیخ محمد عبد اللہ ہندوستان اور پاکستان میں مصالحت کرانے کی غرض سے راولپنڈی پہنچے۔
۲۷۔ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کا دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ ان کی جگہ گلزاری لال نندہ کارگزار وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔

جون

۹۔ مسٹر لال بہادر شاستری کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا۔
۱۱۔ مسٹر اشوک مہتا کانگریس میں شامل ہو گئے۔
۱۴۔ داس کمیشن رپورٹ کے پیش نظر پنجاب کے وزیر اعلیٰ سردار پرتاپ سنگھ کیروں مستعفی ہو گئے۔
۲۲۔ مسٹر لال بہادر شاستری پر ہلکا سا دل کا دورہ پڑا۔

جولائی

۱۔ مسٹر لال بہادر شاستری نے لندن میں دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت ملتوی کر دی۔
۶۔ مسٹر رام کشن پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔
۷۔ بائیں بازو کے کمیونسٹوں نے اپنی الگ پارٹی بنائی۔
۱۹۔ سردار سورن سنگھ ہندوستان کے پہلے وزیر خارجہ بنائے گئے۔

اگست

۱۲۔ مہاراشٹر اسمبلی کے ایک ممبر کو ہوتے ہوئے اسمبلی میں مار دھاڑ کرنے پر گرفتار کر لیا گیا۔

اگست

۲۸ - مہاراشٹر ہائیکورٹ نے ممبئی کے ٹیکسی ہڑتال بند کرنے کی حکومت کی تجویز منظور کر لی۔

۳۰ - کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کامراج پلان ختم کرنے اور اس پلان کے تحت جو وزیر نکالے گئے تھے ان کو پھر سے وزیر بنانے کی تجویز مسترد کر دی۔

ستمبر

۵ - مسٹر جے پرکاش نرائن پاکستان کے خیر سگالی کے دورے پر روانہ ہوئے

۸ - کیرالا میں شنکر وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہوگی۔ اس میں چند کانگریسیوں نے حکومت کے خلاف ووٹ دیا۔

۱۰ - کیرالا میں صدارتی حکومت قائم کر دی گئی۔

۱۸ - لوک سبھا میں مسٹر شاستری کے خلاف تحریک عدم اعتماد نامنظور ہوگی۔

۲۲ - کشمیر میں سابق وزیر اعظم بخشی غلام محمد کو گرفتار کر لیا گیا۔

اکتوبر

۱ - مہاراشٹر کے وزیر شراب بندی مسٹر ایس بیگا رکو جنھوں نے مستعفی ہونے سے انکار کر دیا تھا برطرف کر دیا گیا۔

۱۴ - مرکزی حکومت نے چوتھے پنج سالہ منصوبے کو جس میں ۲۲ ہزار کھرب روپیہ خرچ ہوگا منظور کر لیا۔

۱۵ - ہندوستان نے آسٹریلیا کے خلاف دوسرا ٹسٹ میچ بمبئی میں جیت لیا۔

۲۳ - ہندوستان نے ٹوکیو میں پاکستان کو اولمپک ہاکی میں شکست دیدی۔

۲۹ - مسٹر ڈاسیا مرکزی وزیر صنعت کا دل کی حرکت بند ہوجانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔

۲۹ - سیلون کی وزیر اعظم مسز بھنڈرا نائکے اور وزیر اعظم شاستری میں سیلون میں بسنے والے بے ملک شہریوں کے بارے میں سمجھوتہ ہوگیا۔

نومبر

۷ - گنتور کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں کئی ممبروں نے ایٹم بم بنانے کی پرزور تائید کی۔

۹ - کیرالا میں اناج کے گوداموں کو لوٹ لیا گیا۔

۱۲ - "ترون بھارت" کے ایڈیٹر مسٹر کیتکر نے پونا میں اعلان کیا کہ انھیں گاندھی جی کے قتل کا پہلے سے علم تھا۔

۱۴ - ڈاکٹر چیرین نے مہاراشٹر کے گورنر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔

۱۵ - اڑیسہ میں طلباء نے ہنگامے شروع کئے۔

۲۸ - بمبئی میں عیسائیوں کی ۳۸ ویں کانگریس شروع ہوئی

دسمبر

۱ - پروفیسر ہلدانے کا بھونیشور میں سرطان کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔

۲ - پوپ پال ششم عیسائیوں کی کانگریس میں شرکت کے لئے بمبئی پہنچے۔

۲ - وزیر اعظم شاستری برطانیہ کے ۴ روزہ دورے پر روانہ ہوگئے۔

۱۷ - ہندوستان نے پاکستانی ہائی کمیشن کے ایک عہدیدار کو سازش کے الزام میں ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دیا۔

پیغام

پروفیسر منظور حسین شور

صحرا موڑ پہ پا تو سوئے گلستاں نہ دیکھ
دامن ہو چاک چاک تو بکھری دھجیاں نہ دیکھ

اڑ جا چمن کو لے کے سوادِ چمن سے دور
رنجِ قفس نہ کھینچ غمِ آشیاں نہ دیکھ

ہو زندگی کو راس تو آنسو بھی ہے شراب
برقِ تپاں کو دیکھ چمن کا زیاں نہ دیکھ

دیوانہ وار جوششِ بہاراں میں رقص کر
گل سینہ چاک... سرو سمن خونچکاں نہ دیکھ

پر آسماں میں تول، خلاؤں میں ڈوب جا
گلشن میں رنگ و بو کی پراگندگیاں نہ دیکھ

عہدِ رواں کو آگ کا دریا سمجھ کے چل
شعلوں میں ناچ، خاک کی چنگاریاں نہ دیکھ

منزل ہو سامنے تو کڑی دھوپ سے نہ ڈر
رستے میں چل تو سایۂ ابرِ رواں نہ دیکھ

دریا شناس ہو تو کسی موج کو پکار
ساحل پہ ڈوبتی ہیں کہاں کشتیاں نہ دیکھ

طوفاں سے کر کلام، ہوا کا مزاج پوچھ
اڑتے ہوئے ہوا میں فقط بادباں نہ دیکھ

سنکے ہوا تو اور بھی کشتی کو تیز کر
موجِ سبک خرام کی جولانیاں نہ دیکھ

جس سمت کی ہوا ہو سفینے کو موڑ دے
جاتی ہے لے کے موج کہاں سے کہاں نہ دیکھ

کشتی ہی کیا جو موج کا سینہ نہ چیر دے
کشتی کو دیکھ! موج کی طغیانیاں نہ دیکھ

چڑھ کر اتر ہی جائے گا سیلابِ ماہ و سال
سیلابِ ماہ و سال میں ڈوبا جہاں نہ دیکھ

بجھتا ہے اک دیا تو سلگتے ہیں سو چراغ
تو صرف اک چراغ سے اٹھتا دھواں نہ دیکھ

نجمِ سحر سے پوچھ سلگتی کرن کا راز
وقتِ سحر چراغ کو ظلمت فشاں نہ دیکھ

جلوے میں آفتاب سے کچھ تو بھی کم نہیں
تاریک ہو زمیں تو سوئے آسماں نہ دیکھ

منزل بھی تو، چراغ بھی تو، روشنی بھی تو
سوئے قمر نہ دیکھ سوئے کہکشاں نہ دیکھ

سنگینیٔ حیات چٹانوں سے جا کے پوچھ
نازِ حریر و تمکنتِ پرنیاں نہ دیکھ

ٹوٹے ہیں مطربوں کے جگر میں ہزار تیر
نغموں کے تیر کھا کے سوئے نغمہ خواں نہ دیکھ

تو آنسوؤں کی فطرتِ عالی پہ غور کر
ہونٹوں کے قہقہوں کی تنگ ظرفیاں نہ دیکھ

عرفاں ہو تو کر کسی انساں کی تلاش
پہلوئے خشت و سنگ میں قلبِ تپاں نہ دیکھ

سینے کا داغ اور، جبیں کا نشاں ہے اور
سینے کا داغ دیکھ جبیں کا نشاں نہ دیکھ

بہروں کی انجمن میں نہ نغمہ طراز ہو
بوجہل کے مزار پہ دے کر اذاں نہ دیکھ

بے نوروں کی ظلمتوں سے سمجھ کر نباہ کر
چہروں کے آفتاب کی تابانیاں نہ دیکھ

اندھے یہودیوں کو متاعِ ہنر نہ بیچ
بازارِ کوفیاں میں سجا کر دکاں نہ دیکھ

یہ دورِ انقلاب بھی کچھ مستقل نہیں (ق)
اپنے وطن میں آپ کو بے خانماں نہ دیکھ

رک جا کسی حبیب کی دیوار کے قریب
گلیوں کا سوگ شہر کی ویرانیاں نہ دیکھ

مہتاب و کہکشاں پہ ہے فکر و نظر کا دام
فکر و نظر کے پاؤں میں بندِ گراں نہ دیکھ

کر ساری کائنات میں انسانیت کو عام
دیوارِ چین و سرحدِ ہندوستاں نہ دیکھ

میں شاعرِ حیات ہوں میرا پیام سن!
میری زمیں نہ دیکھ، میرا آسماں نہ دیکھ

غزل

جمیل مظہری

جنوں نے بھی نہ چھینی یہ متاعِ زندگی میری

خودی کا اضطرابِ منفعل ہے بے خودی میری

محبت کے عذابِ مستقل سے بچ گیا یہ دل

کہ ہر موقع پہ میرے کام آئی کاہلی میری

یہ کیا کم ہے اتارا ہاتھ میں نے انکے کاندھوں سے

ہوئی تخفیفِ زحمت دوستوں کو بیرخی میری

جب آیا دل سے ہونٹوں تک غم اسکی بیوفائی کا

تو احساسِ زیاں نکلی محبت مظہری میری

وشوا ناتھ درد

زندگی کا ہر خلا یوں بھی چھپاتے آئے ہیں

ہم تجھے ہر موڑ پر اپنا بتاتے آئے ہیں

دوستوں کا دل نہ ٹوٹے تھا یہی پیشِ نظر

ہم فریبِ دوستی دانستہ کھاتے آئے ہیں

ہم کسی کے رازداں ہونے کا دم کیسے بھریں

ہم تو اپنے رازِ اندروں کو بتاتے آئے ہیں

ہے ازل سے تا ابد یہ منزلِ ادراکِ نو

ہم جنوں کے ساز پہ یہ گیت گاتے آئے ہیں

دشمنوں سے بچ کے نکلیں ہم تو نکلیں کس لئے

دوستوں سے دشمنی کے راز پاتے آئے ہیں

کیا کریں ہم تیری خاطر اے دلِ ایذا پسند

حادثے ہر موڑ پر دامن بچاتے آئے ہیں

درد ہم سے دل لگی کرتا ہے دنیا کا

ہم بہ فیضِ چشمِ پُرنم مسکراتے آئے ہیں

جواہر لال نہرو

مذہب، فلسفہ اور سائنس

موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ ہندوستان اپنے ماضی سے بڑی حد تک اپنا تعلق منقطع کرے اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کرے کہ اس کے حال کی تصویر اُسکے ماضی کے رنگوں میں نہ ڈھلنے پائے کیونکہ ہمارے ماضی کی سیاہ پرچھائیاں ہمارے ارتقا کے لئے سدِ راہ ہوتی ہیں۔ ماضی کی تمام جامد اور مردہ روایات کو ہمیں یکسر فراموش کر دینا ہوگا اور محض زندہ روایات سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا ہوگا کیونکہ یہ ہم میں ہر لحظہ نئی امنگ اور نیا جوش پیدا کرتی رہتی ہیں۔ ہم ان روایات کو کبھی نہیں بھول سکتے جنھوں نے ہماری نسل کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھا ہے۔ ہندوستانیوں کے زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے جواب، بزرگوں کی دانشوری، زندگی کی لازمی توانائی اور حرکت، آباؤ اجداد کی فطرت، ان کے تجسس اور ذہنی اثر و تحریک کا جذبہ، ان کے خیالات کی بے باکی، ان کے ادبی، فنی اور تمدنی کارہائے نمایاں، صداقت، حُسن اور آزادی سے اُن کا گہرا عشق، ان کی قائم کردہ بنیادی قدریں، ان کا مختلف پُراسرار حیاتی نظاموں کا شعور، اُن کی اپنے طرزِ زندگی سے جداگانہ طرزِ حیات کو برداشت کرنے کی قوت، ان کی دوسروں اور ان کے تمدنی کمالات کو خود میں سمو لینے کی صلاحیت اور اُن کے امتزاج سے ایک علیحدہ اور مخلوط تمدن کو جنم دینے کی خواہش یہ ماضی کی وہ زندہ اور حیات بخش روایات ہیں جن سے ہم کسی بھی صورت اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتے!

یہی نہیں بلکہ ہم اُن بیشمار تجربات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جن کی مدد سے ہمارے آباؤ اجداد نے ایک خوبصورت نظامِ حیات کی بنیاد رکھی تھی اور جو اب بھی ہمارے تحت الشعور میں موجود ہیں۔ ہم کو اپنے اس عظیم ورثہ پر سدا فخر رہے گا۔ اگر ہندوستان نے ان کو فراموش کر دیا تو پھر اُسکی وہ حیثیت اور اس کا وہ نام برقرار نہ رہ سکے گا جو آج ہمارے لئے مسرتوں کا باعث ہے اور جس پر آج ہمیں بجا طور پر ناز ہے۔

گرد و غبار

ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جب ہم ماضی سے اپنا رشتہ توڑنے کی سوچتے ہیں تو اس کا مطلب اس کی حیات بخش روایات اور قدروں سے رشتہ توڑنا نہیں بلکہ اس سے مراد زمانے کے اُس گرد و غبار سے اپنا دامن بچانا ہے جس نے ہندوستان کے داخلی حسن اور اس کی اہمیت کو اپنے میں لپیٹ کر ہماری نظروں سے پوشیدہ کر رکھا ہے، ان فضولیات اور اضافیات کی بجائے خود کو محفوظ رکھنا ہے، جنھوں نے ہندوستان کی روح کو نہ صرف مجہول بنا دیا ہے۔ بلکہ جمود کی تاریکیوں میں بھی دھکیل دیا ہے، اُسے جمود کا شکار بنا کر اُس کے ارتقا کے لئے سدِ راہ ہوئی ہیں۔ ہمیں تو اپنے متقدمین کی دانشوری کی اصل کو اپنے ذہن میں تر و تازہ رکھنا اور موجودہ حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے اُسے اپنانا ہے۔ ہمیں غور و فکر کے ان تمام روایتی طریقوں سے چھٹکارا پانا ہے جو یقیناً ماضی میں کبھی کارآمد رہے ہوں گے۔ لیکن اب جو ہمارے حق میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہو سکتے، اس لئے ہماری نظروں میں ان کی کوئی اہمیت باقی نہیں۔ ہمیں انسانی نسل کے تمام کارہائے نمایاں کو اپنا سمجھنا ہوگا اور انسان کے پہلے سے زیادہ پُرجوش اور سرگرم ایڈونچر میں دوسروں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہوگا لیکن اس کے لئے پہلے ہمیں اس احساس کو اپنے دل میں بیدار کرنا ہوگا کہ یہ کسی مخصوص قوم یا علاقے تک محدود نہیں بلکہ اس کا حق انسانی قوم کو حاصل ہے، چاہے وہ اس دنیا کے کسی بھی خطے پر آباد ہو۔ صداقت، حُسن اور آزادی کی اہمیت اور محبت کا جو جذبہ ہمارے دلوں میں مردہ ہو چکا ہے اُسے دوبارہ نئی زندگی دینی ہوگی۔ کیونکہ اسی سے انسانی زندگی کا ایک متعین، بامعنی اور واضح تصور ہمارے ذہنوں میں اُبھرتا ہے ہمیں اُس زندہ نظریہ اور ایڈونچر کی اُس روح کو پھر ایک بار اپنے قلب و ذہن میں تازہ کرنا ہوگا، جنھوں نے ہماری نسل کے ان لوگوں کو خلاقانہ مقام عطا کیا جو ہمارے تمدن کی مستحکم بنیاد

جدا کر کے پرکھی جاتی ہے۔ جو بیک وقت اسے محدود بھی کرتی ہیں اور مکمل بھی تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصلیت محض اتنی ہے کہ وہ انسانی ذہن کے ارتقاء کی سدِّ راہ بنا ہے اور ایک ایسا عقیدہ بھی جو گمراہ کن ہے کیونکہ درحقیقت تمام واقعتیں باہم الجھے ہوئے تانے بانے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

مذہب اور انسانیت

اس میں ذرا شک نہیں کہ مذہب نے انسانیت کے ارتقاء میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے؛ اُس نے انسانیت کی قدروں اور اس کے معیار کا تعین کیا ہے اور انسانی زندگی کی رہنمائی کیلئے ٹھوس اُصول پیش کئے ہیں۔ لیکن اپنی ان تمام خوب کاریوں کے باوجود اُس نے صداقت کو مقررہ شکلوں اور عقیدوں میں مقید کرنے کی کوشش بھی کی ہے اور ساتھ ہی اُن رسوم و روایات کی سرپرستی بھی کی ہے جو جلد ہی اپنی اصلیت کھو کر فضولیات کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ مذہب نے انسانی ذہن پر نامعلوم اور اجنبی طاقت کی ہیبت طاری کر کے اور اُس کی پراسراریت کا سکّہ بٹھا کر اُسے اس قابل ہی نہیں رکھا کہ وہ اُس اجنبی اور غیبی طاقت کو سمجھنے کی کوشش کر سکے اور معاشرتی دشواریوں کو دور کرنے کے لئے جد و جہد کا کوئی باقاعدہ پروگرام مرتب کر سکے۔ مذہب نے انسان کے ذوقِ تجسس اور تخلیقی قوتوں کو اُبھارنے کے بجائے اُسے قدرت، عبادت گاہوں اور معاشرتی نظام، غرض کہ ہر موجود سے ہم آہنگ ہونے، اس کے ساتھ گھاٹے پر سمجھوتہ کرنے کا فلسفہ دیا ہے۔

آہنی خول

فوق فطری عنصر میں اندھے عقیدے نے نہ صرف یہ کہ معاشرتی سطح پر ایک قسم کی غیر ذمہ داریت کو جنم دیا ہے بلکہ منطقی غور و فکر اور تحقیق کی جگہ بھی جذباتیت اور حیثیت کو دے دی ہے۔ مذہب نے بلاشبہ لاتعداد انسانوں کو ایک عجیب سکون، راحت اور طمانیت بخشی ہے اور معاشرے کو اپنی قدروں کے سہارے مستحکم بنایا ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچایا ہے اس نے اس تغیر اور تبدل اور ارتقاء کے شعور کے متعلق، جو معاشرے کا جزو لاینفک ہے انسانی ذہن کے رجحان پر بڑا منفی اثر ڈالا ہے اور اُسے قعرِ جمود میں ڈھکیل دیا ہے۔ فلسفہ نے اس قسم کے کئی خطرات سے اپنا دامن بچاتے ہوئے انسانی تجسس کی پرواز اور ذوقِ تحقیق کو نئی قوت بخشی ہے لیکن یہ امر کسقدر تعجب خیز ہے کہ اس نے بالعموم زندگی اور اس کے روزمرہ کے مسائل سے قطع تعلق، قطعی نتائج پر اپنی نظریں جمائیں اور پھر انہیں بھی انسانی زندگی سے ہم آہنگ کرنے میں ناکام ہو کر خود کو ایک آہنی خول میں بند کر لیا ہے۔ منطق اور عقلیت نے بلاشبہ فلسفہ کی رہبری کی ہے اور مختلف راہوں پر بڑی دور تک اس کا ساتھ بھی دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ منطق اور عقلیت سے وابستہ تھی اور حقائق سے اس کا زیادہ تعلق نہ تھا۔

سائنس کی دنیا

فلسفہ کا تو یہ حال رہا اور سائنس نے اس کے بالکل برعکس، قطعی نتائج کو نظر انداز کر کے محض حقائق ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ اس نے انسانی دنیا کو پستی کے اندھیرے سے یکایک ترقی کی روشنی میں گھسیٹ لیا؛ اسے ایک نمایاں اور تابناک تہذیب بخشی؛ علم کے ارتقاء کی بیشمار راہیں کھولیں اور انسانی طاقت کو اس قدر بڑھا دیا کہ پہلی بار اس کے لئے یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے طبیعی ماحول پر فتح پا کر اسے اپنے خواہشات کے مطابق ڈھال سکے۔ اب انسان کی حیثیت ایک ارضیاتی دھارے کی سی ہو گئی

جس نے سیارہ زمین کی سطح پر کیمیاوی، طبیعی اور کئی اور مختلف طریقوں سے تبدیلیاں کیں۔ گو کہ انسان، اب بھی کوتاہیوں کی تلافی کے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ کر عمل میں لانے کی قوت حاصل کر چکا تھا اور اسے اپنی تخلیقی خواہشات سے ہم آہنگ بھی کر سکتا تھا، پھر بھی اس میں چند ضروریات اور حیاتیاتی عناصر کا نقصان تھا۔ اس وقت ہمیں نہ تو قطعی مقاصد کا کوئی علم تھا اور نہ ہی فوری مقاصد کا کوئی شعور کیونکہ سائنس نے اس وقت تک زندگی میں مقصدیت کا کوئی واضح اور متعین تصور پیش نہیں کیا تھا۔ اُس وقت قدرت کو مسخر کرنے والا طاقتور انسان خود پر قابو پانے سے قاصر تھا؛ ایک بے قابو عفریت کی طرح بے تحاشہ دوڑا جا رہا تھا، وحشت اور بربریت کے راستے پر تباہی و بربادی کے راستے پر۔ لیکن اب اس امر کا کافی امکان نظر آتا ہے کہ شاید حیاتیات نفسیات اور اسی قبیل کی دوسری سائنسوں اور حیاتیات اور طبیعیات کا شعور انسان کو، خود کو سمجھنے اور خود پر قابو پانے میں پہلے سے زیادہ مدد کر سکے یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ قبل اس کے کہ اس قسم کا ارتقا انسانی زندگی پر اطمینان بخش حد تک اثر انداز ہو، انسان اپنی تہذیب کو، جسے کہ اُس نے بڑی محنت، لگن اور کوشش سے جنم دیا ہے، خود اپنے ہی ہاتھوں خاک میں ملا دے ایسی صورت میں اسے از سرِ نو اپنی جد و جہد کا آغاز کرنا ہوگا۔

سائنس اور صداقت

اگر سائنس کو آزادی کے ساتھ، کھلی فضا میں، ترقی کرنے کا موقع دیا جائے تو پھر اس کے ارتقا کی کسی یقینی منزل کا تعین ہمارے لئے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سائنسی مشاہدہ، ہر قسم کے انسانی تجربات کے اس بحرِ ذخار کے تمام زیر و بم سے ہمیں پوری طرح واقف نہیں کر سکتا۔ ہاں فلسفہ کی مدد سے اس سلسلے میں چند قدم آگے ضرور بڑھا جا سکتا ہے اور اس سمندر میں غوطہ زن ہونے کا خطرہ بھی مول لیا جا سکتا ہے اور جب سائنس اور فلسفہ بھی اس بات میں ہماری مدد نہ کر سکے تو اس صورت میں ہمیں فہم و ادراک کی ان قوتوں پر اعتماد کرنا ہوگا جن کے ہم مالک ہیں، کیونکہ انسانی ذہن کی موجودہ تشکیل کے پیش نظر ایک ایسی مقررہ حد ضرور ہمیں نظر آتی ہے جس کے آگے انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں۔ پاسکل نے بھی ایک مقام پر بڑے خوبصورت لفظوں میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔

انسانی عقل اور سائنسی طریقہ کار کی ان حدود کا صحیح احساس حاصل کرنے کے بعد ہی انہیں ایک مستحکم بنیاد اور پس منظر کے طور پر استعمال کی اہمیت دینا ہمارے لئے ناگزیر ہے؛ کیونکہ ایسے کئے بنا کسی بھی حقیقت یا صداقت کو گرفت میں نہیں لایا جا سکتا۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہم صداقت کے کسی ایک جزو کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنی زندگی پر اس کا اطلاق کریں، بجائے اس کے کہ اس صداقت کو کلیتاً سمجھنے کی کوشش میں ہم کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں اور موجودات کے اسرار کی عقدہ کشائی کی کوشش میں ناکام رہ کر اپنی بے بسی پر کفِ افسوس ملتے رہ جائیں۔ فی زمانہ ہر ملک اور اس کے باشندوں کے لئے اپنی زندگی پر سائنس کا اطلاق ضروری بن چکا ہے اور جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس اطلاق سے بھی زیادہ اہم کچھ اور ہے؛ سائنسی طریقہ کار کی مدد سے صحیح تک رسائی کی کوشش، حوصلہ مندانہ لیکن تنقیدی سائنسی مزاج، صداقت اور جدید علم کی تلاش، کسی بھی شے کو بنا پرکھے قبول کرنے سے انکار کی جرأت، نئے شواہد کی روشنی میں پچھلے نتائج میں ترمیم و تنسیخ کرنے کی صلاحیت، پہلے سے سوچے ہوئے نظریے کے بجائے مشاہدے میں آئی ہوئی حقیقت پر اعتماد کی خوبی، ذہنی قوتوں کی حسین تربیت یہ سب

انتہائی ضروری ہیں اور وہ بھی نہ صرف سائنس کے زندگی پر اطلاق کے لئے، بلکہ خود انسانی زندگی اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے بھی۔

جال

وہ سائنسدان جنہوں نے سائنس ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، فی زمانہ ان کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے مخصوص حلقوں سے باہر نکلتے ہی سائنس کی حقیقت کو مطلقاً فراموش کر دیتے ہیں بہر تسکین تک رسائی کے لئے، زندگی گزارنے کی ایک تنظیم کے لئے غور و فکر کی کارروائی کے لئے، عمل کرنے کے لئے اور اپنے ساتھیوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے سائنسی مزاج اور طریقۂ کار کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح بڑے پیمانے پر عملی کام کرنے کے لئے شاید ہی کوئی تیار ہو اور اگر کسی نے ہمت بھی کی تو اسے جزوی کامیابی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ لیکن اس تنقید کا اطلاق سائنس پر نہیں بلکہ نسبتاً بڑے پیمانے پر ان تمام احکام اجتماعی پر بھی ہوتا ہے جنکا ایک جال سا مذہب اور فلسفے نے ہمارے گرد بن رکھا ہے اور جس میں ہم کچھ اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہاں سائنسی مزاج ضرور اس باب میں معاون ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اس راہ کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے جس پر اپنی فلاح و بہبود کے لئے انسانی زندگی کو گامزن ہونا چاہئے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسانی قلب و ذہن پر پہرے نہ بیٹھے ہوں اور محض اسی صورت میں انسان سائنسی مزاج کا حامل ہو کر ترقی کی شاہراہ تک پہنچ سکتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم سائنسی دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں میں حتیٰ کہ ان کے رہنماؤں میں بھی اس سائنسی مزاج کا بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے

کوہ زندگی

سائنس کا تعلق محض مثبت علم کے حلقۂ اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن جس مزاج کو وہ جنم دیتی ہے وہ اس حلقۂ اثر کی قید سے خود کو بآسانی آزاد کر لیتا ہے۔ علم کے حصول، صداقت کے احساس، نیکوکاری اور حسن کی ستائش کو انسان کے قطعی مقاصد قرار دینا بیجا نہ ہوگا لیکن خارجی تحقیق کے سائنسی طریقۂ کار کا اطلاق ان سب پر کسی طرح بھی ممکن نہیں اور زندگی کی ہر وہ موجود جس میں حیاتیاتی قوت ہو مثلاً فنون اور شاعری کے باب میں حسیات حسن کے اثرات کو پیدا کرنے والے جذباتیت اور نیکوکاری کا اعلیٰ اخلاقی احساس وغیرہ علم کے اس حلقۂ اثر میں نہیں آتے ممکن ہے کہ نباتیات اور حیوانیات کے ماہرین کو قدرت کے حسن اور کشش کا کبھی احساس نہ ہو سکے، ایک ماہر عمرانیات انسانیت کی قدروں سے قطعی ناآشنا ہو، لیکن اس کے باوجود جب ہم زندگی کی اس اقلیم کی سیر کرتے ہیں جہاں سائنسی طریقہ کار کی رسائی ناممکن ہے یا وہ زندگی کی ان بلندیوں پر پہنچتے ہیں جہاں فلسفہ کی حکمرانی ہوتی ہے اور الٰہی جذبات ہمیں مسحور کر دیتے ہیں اور اس شدت کا ہم بغور و خوض مطالعہ کرتے ہیں تو اس مقام پر بھی ہمیں سائنسی مزاج اور طریقۂ کار کی ضرورت کا شدید احساس ہوتا ہے۔

مذہب کی دنیا

مذہب کا طریقۂ کار اس سے قطعی جداگانہ ہے چونکہ اس کا تعلق ان امور سے ہوتا ہے جو خارجی تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے اس لئے اس کا تمام تر انحصار جذبات اور وجدانیات پر ہوتا ہے اور اسی لئے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسی طریقۂ کار سے کام لیتا ہے حتیٰ کہ ان امور کو بھی اسی طریقۂ کار کی روشنی میں دیکھنے سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتا ہے جنکی تحقیق اور مشاہدہ انسانی ذہن کے لئے خارجی طور پر ممکن ہے۔ منظم مذہب، دینیات سے اپنا رشتہ جوڑ کر اور اکثر اوقات بیشتر روحانی قدروں کو نظر انداز کر کے اپنی بنیاد کے مستقل مفاد کے پیش نظر ایک ایسے انسانی ذہن کی تعمیر کرتا ہے جو سائنسی طریقۂ کار سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا اور اس وقت تنگ نظری، عدم برداشت، ضعیف الاعتقادی، توہمات، جذبات اور نامعقولیت کو جنم دیتے دیر نہیں لگتی اس صورت میں انسانی ذہن محدود ہو جاتا ہے اور اس کا مزاج ایک غلام اور مقلد محض کا مزاج بن جاتا ہے۔

خدا کا وجود

والٹیر نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا کا وجود نہیں ہے تو بھی اس کے وجود کو تسلیم کرنا بہت ضروری ہے۔ شاید یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا بلکہ میں تو پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ انسانی ذہن نے ہمیشہ ایسے ذہنی تصورات اور تخیلات کو رائج کرنے کی کوشش کی ہے جنہوں نے انسانی ذہن کے ساتھ ساتھ ترقی کی منزلیں طے کی ہیں! لیکن اس کے برعکس قول میں بھی کچھ صداقت ضرور موجود ہے؛ ہاں اس کا خیال رہے کہ خدا کے وجود کے اقرار کے بعد بھی انسان کلیتہً اسی کی ذات پر منحصر ہو کر نہ رہ جائے، اس کی ساری توقعات اسی سے وابستہ نہ ہو جائیں، کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فوق فطری عناصر پر از حد اعتماد، انسان کی خود اعتمادی، اسکی صلاحیتوں اور تخلیقی قابلیتوں کے حق میں سم قاتل ثابت ہوا ہے پھر بھی ان روحانی اور رومانی تخیلات پر بھی اعتماد کرنا چاہئے ورنہ ہماری زندگی، اغراض و مقاصد سے بے نیاز ہو کر اپنی کسی بھی منزل کا تعین نہ کر سکیگی۔ خدا کے وجود پر ہمارا ایمان ہو یا نہ ہو لیکن یہ سراسر ناممکن ہے کہ ہم اس غیبی قوت میں ذرہ بھر بھی عقیدہ نہ رکھیں جو دراصل اس مادے کا جزو لاینفک ہوتی ہے جو اسے حرکت کرنے، تغیر پذیر ہونے اور ارتقا کی منزلیں طے کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے اور جسے ہم کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں؛ چاہے ہم اسے تخلیقی اور حیات بخش دھارے کے نام سے

پکاریں یا حیاتیاتی قوت کا نام دیں، وہ معاملے اور مخفی ہیں ڈھلنے والی ایسی حقیقت ہے جس میں اتنی ہی صداقت ہے جتنی کہ انسانی زندگی میں، جبکہ ہم موخر الذکر کا موازنہ موت کی قوت سے کرتے ہیں۔ ہمیں اس کا احساس ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہم ایک نامعلوم خدا کی قربانگاہ پر عبادت کرتے اور قربانیاں دیتے ہیں، یہ قربانیاں مثالی بھی ہوتی ہیں، ذاتی بھی اور قومی اور بین قومی بھی۔ کوئی مابعد الطبیعیاتی مقصد ہمیں اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے گو کہ عقل کے نزدیک اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ مقصد ایک کامل انسان کے وجود کا اور ایک نسبتاً زیادہ خوبصورت دنیا میں سانس لینے کا مبہم تخیل ہے جو شاید ہی کبھی روشن حقیقت بن سکے اس احساس کے باوجود ہم میں موجود ابلیس جسے ہم حیاتیاتی دھارا کہہ سکتے ہیں ہم پر چھایا رہتا ہے اور نتیجۃً ہم نسل بعد نسل اسی راستے پر گامزن رہتے ہیں۔

محدود مذہب

جیسے جیسے علم کی روشنی پھیلتی جاتی ہے، مذہب کا حلقۂ اثر محدود ہوتا جاتا ہے! زندگی اور قدرت کا جس قدر زیادہ شعور ہم حاصل کرتے ہیں اسی قدر ہم کو فوق فطری عناصر کی اثر اندازی پر اندھی عقیدت سے نجات ملتی جاتی ہے۔ ہر وہ موجود جسے ہم سمجھ سکتے ہیں اور قابو میں رکھ سکتے ہیں اس کی تمام تر پراسراریت ہمارے لئے ختم ہو جاتی ہے کاشت کاری کی کارروائیاں، ہماری غذا، ہمارا لباس، ہمارے معاشرتی تعلقات۔ ان سب پر ایک طویل مدت تک مذہب اور اس کے اجارہ داروں کا گہرا اثر تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ اثر کم ہوتا گیا اور اب سائنسی مشاہدے اور مطالعہ کی روشنی میں ان کی افادیت کا جائزہ لیا جاتا ہے پھر بھی ان میں سے کچھ اب تک بری طرح مذہبی اعتقادات اور ان سے منسلک توہمات کے زیر اثر دبے پڑے ہیں فیصلہ کن اسرار اب بھی انسانی ذہن کی دسترس سے بہت دور ہیں اور شاید ہی کبھی حل ہو سکیں لیکن اس صداقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ زندگی اب بھی حسین اور دلکش نظر آتی ہے بلکہ اس نے کبھی ختم نہ ہونے والی نت نئی دریافتوں کا علم حاصل کرنے، مسلسل مرقعوں کی نقاب کشائی اور نئے طرز زندگی تک رسائی کی تجربہ آمیز حوصلگی بھی انسان کو عطا کی ہے اور جس کے طفیل انسانی زندگی نسبتاً زیادہ مکمل اور حسن دلفریبی کی رعنائیوں سے مالا مال ہوتی جا رہی ہے۔

اچھوتا المیہ

ہمیں شاید سے سائنسی مزاج اور اس کا طریقۂ کار اور ماضی کے لئے تعظیم و تکریم کا جذبہ ہی ہمیں زندگی سے لڑنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے؛ نتیجۃً، ہم میں زندگی کا ایک سالم شعور ترقی پذیر ہوتا ہے اور جو اپنے وسیع حلقۂ اثر میں محض ماضی اور حال کے سارے نشیب و فراز ہی نہیں سمو لیتا بلکہ نہایت اطمینان اور متانت کے ساتھ مستقبل کی طرف ہماری رہبری بھی کرتا ہے۔ یہ سچائی کسی طور جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ہمارے ماضی میں تغیروں کی ملہ صورتی موجود ہے اور جو زندگی کی ان خوبصورتیوں اور رعنائیوں کی نشاندہی بہ شاندہ ملتی ہے جو ہمیں دنیوی آلام و مصائب سے وقتی نجات دلاتی ہیں۔ زندگی کے سفر میں انسان کی حیثیت غم اور خوشی کے ایک انوکھے مرکب کی سی ہے، اس لئے وہ ذہنی تجربات حاصل کرنے کے بعد ہی ترقی کر سکتا ہے۔ روح کی عرق ریزی اتنی ایک بڑا اور اچھوتا المیہ ہے۔ خارجی حادثات اور ان کے نتائج تو ہم پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہی ہیں ساتھ ہی داخلی خوف اور کشمکش کی بنا پر شدید ترین صدمات کا بار گراں بھی ہمارے ذہن کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جب ہم خارجی سطح پر ترقی کی سوچتے ہیں (اور جیسا کہ ہمیں سوچنا بھی چاہئے، اگر ہمیں زندہ رہنا ہے، پنپنا ہے) تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمیں خود اپنے وجود میں دنیا کے تمام انسانوں کے مابین اور اپنے ماحول میں امن و سلامتی کی ایک ایسی خوبصورت فضا قائم کرنی ہے جس میں سانس لیتے وقت صرف ہماری طبعی اور مادی ضروریات ہی پوری نہ ہوں بلکہ ان داخلی اور تخیلی قوتوں اور حوصلہ مندانہ مزاج کی تسکین بھی ہو سکے جنہوں نے انسان کو ٹھیک اسی وقت سے ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے جب سے کہ اس نے خیالات اور عمل کی مملکت کے مصائب سے پُر سفر کو شروع کیا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اس سفر کا کوئی قطعی مقصد بھی ہے یا نہیں لیکن اس کے مکافات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور جب کہ وہ کچھ ایسے نسبتاً قریبی مقاصد کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے جن کا حصول ممکن ہے اور جو ہمیں پھر ایک نئے ارتقا کی راہ پر لگا سکتا ہے۔

طویل فاصلے

سائنس نے مغربی دنیا پر اپنا پورا تسلط جما رکھا ہے، وہاں کا ذی روح اسکی طرف خاص توجہ دیتا ہے اور اسے خراج عقیدت پیش کرتا ہے اس کے باوجود مغرب اب تک حقیقی سائنسی مزاج کے لئے فضا کو سازگار نہیں بنا سکا ہے! اسے تو اپنی تخلیقی ہم آہنگی کی روح اور جھلک پیدا کرنے کا دشوار گزار مرحلہ طے کرنا ہے ہندوستان کا مسئلہ تو اور زیادہ توجہ طلب ہے۔ اب تک کی ترقیات کے مشاہدے کے پیش نظر ہمیں مغرب کی بہ نسبت زیادہ طویل فاصلہ طے کرنا ہے۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ ہمیں اپنے اس سفر میں نسبتاً کم رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے کیونکہ ہندوستانی تخیل کی اصل بنیاد، اس کے مابعد مظاہر سے قطع نظر، گذشتہ کئی سالوں سے سائنسی مزاج اور طریقۂ کار اور ذہنی قوت سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اس کی جڑیں صداقت کی تحقیق کی بیباکی، انسانی اغراض کے شعور، احساسات اور عمل کے اتحاد، حتیٰ کہ ہر موجود کی الوہیت اور افراد اور جماعتوں کے آزادانہ باہمی تعاون کی مدد سے حاصل کئے ہوئے ارتقا میں ملتی ہیں اور جو ہمیں آزادی اور انسانی ارتقا کی مقابلتاً زیادہ اعلیٰ و ارفع منزلوں کی طرف گامزن رکھتی ہیں۔

دور حیات
کا
آئندہ شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا

پریم چند

ظ انصاری

میں نہیں جانتا کہ پندرہ منٹ کی اس گفتگو میں فلسفی پریم چند کا ذکر کہاں سے شروع کیا جائے۔ یہ ذکر ان کے مونٹ سے کمبل ست بھی شروع ہو سکتا ہے، اُن کے الجھے ہوئے بالوں سے ان کی روزمرہ کی زندگی سے بھی شروع ہو سکتا ہے ساتھ ہی ایک درجن ناولوں سے بھی۔ اور ہندوستان میں بیسویں صدی کی شروعات سے بھی پریم چند کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان سب میں پریم چند کی شخصیت پوری کی پوری موجود ہے۔ دراصل یہ شخصیت خود پہلودار نہیں ہے بلکہ مسطح اور ہموار ہے۔ جیسے شیشے کے ایک صاف روشن ٹکڑے پر سورج کے کئی کئی رنگ ابھرتے نظر آتے ہیں، اسی طرح پریم چند کی زندگی اور ان کی تحریریں ایسی ہی سادی نیچرل اور بے تکلف۔ ان کا اپنا کوئی الگ رنگ نہیں ہے۔ اس میں وہ سارے رنگ ہیں جو افق سے ابھرتی ہوئی روشنی میں ملے جلے پائے جاتے ہیں۔

اردو کی ایک عظیم الشان نظم میں یہ کہانی بیان کی گئی ہے کہ جب شیطان کو جنت سے نکال دیا گیا تو ہزاروں سال کے بعد شیطان سے ایک دن اچانک بڑے خاص فرشتے جبرئیل کی ملاقات ہو گئی۔ جبرئیل نے اس سے دنیا کا حال پوچھا۔

ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو؟

شیطان نے جواب دیا:

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

اس جواب کی عظمت وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو ہر وقت دیکھتے ہوئے شیطان اور ان دیکھے خدا دونوں سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اصل میں شیطان (یا ابلیس) کی یہ حقیقت پسندی اور ادبیت ہے کہ اس نے ہزاروں لاکھوں برس کی اس دنیا کی ساری کشمکش کو ایک سانس میں خلاصہ کر کے کہہ دیا۔

اور زندگی کے ہر پہلو کو اس کی اہمیت کے مطابق برابر کی جگہ دے دی کہ اس میں دکھ ہے اور دکھ کے ساتھ باہمی ہمدردی اور نبھانا بھی ہے۔ اس میں کٹھنائیاں ہیں اور محرومیاں ہیں اور پھر ان محرومیوں اور مشکلوں سے نجات پانے کی کوششیں ہیں۔ "درد و داغ" سے نکلنے کی جستجو ہے۔ آرزوئیں ہیں۔ کلپنا ہے کہ یوں نہ ہوتا بلکہ یوں ہوتا۔

یوں کہتے، یوں کہتے، یوں کہتے، جو یار آتا

کیونکہ پریم چند کا جیون بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوا ہے اور اس میں اپنے زمانے کی یہی کیفیت بھری ہوئی ہے:

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

اس عہد کے ہندوستان کی طرح پریم چند کے پھیلے ہوئے ادب میں بھی "سوز و ساز اور درد و داغ" کی جگہ زیادہ ہے اور "جستجو و آرزو" کی جگہ اس کے بعد ہے اور اس سے کم۔ تلاش ہے اس قوت کی جو ڈوبتے ہوئے ہندوستان کو، دیہات کی غریب جنتا کو اس "درد و داغ" سے نجات دلائے۔ آرزو ہے اس سماج کی جہاں محنت کش عوام کھل کے سانس لے سکیں سر اٹھا کے چل سکیں اور زندگی میں لوٹ کھسوٹ، دھاندلی اور زبردستی کے بجائے بھائی چارے سے رہ سکیں۔ وہ قوت کہاں ہے؟ کہاں سے آئے گی؟ یہ تلاش ۳۶ برس تک پریم چند کو ادھر سے ادھر لئے پھری۔ اور جتنا وقت اس تلاش کو گزرتا گیا اس تلاش کا دھارا مستقل ہوتا گیا۔ اس کی ٹھوس کی روشنی بڑھتی گئی۔ اور تلاش کرنے والے میں تھکن کی جگہ قوت آتی چلی گئی۔ صداقت کی یہی تلاش حقیقت پسندی (Realism) عقلیت پسندی (Rationalism) اور ترقی پسندی (Progressivism) کا سب کا جوہر ہے، سب کا نچوڑ ہے۔

پریم چند کے قلم نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت کا ہندوستان آج کا ہندوستان نہیں تھا۔ سیاسی زندگی میں مکمل آزادی کا لفظ ابھی کانوں کے پردے سے ٹکرایا نہیں تھا۔ سماجی انتشار کا وہ حال تھا جن کا اندازہ ہندوستان کے بارے میں کارل مارکس کے خطوں سے کیا جا سکتا ہے۔ سماجی اصلاح اور سیاسی حقوق دونوں کی چیونٹی کی رفتار تھی۔ اور چیونٹی کی اس رفتار کے نیچے کروڑوں ہاتھی پسے ہوئے تھے۔ وہ کروڑوں انسان جو ایک زراعتی ملک میں پیداوار کا اصل ذریعہ اور لوٹ کھسوٹ کا اصلی مرکز ہوتے ہیں غریب کاشتکار ان کی کوئی تنظیم نہیں تھی لیکن بے چینی ضرور تھی ان کی انفرادی آواز نہیں تھی لیکن کراہ موجود تھی — یہ بے چینی اور یہ کراہ موجود تھی۔ مگر ادب میں اسے ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ پریم چند اس معاملے میں پہلے شخص تھے جنہوں نے شروع شروع رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر انھوں نے صرف اسی کراہ کو ریکارڈ کیا، اسی کراہ سے اسی بے چینی سے، اور انھیں لوگوں کی "جستجو اور آرزو" سے انھوں نے اپنا فن تعمیر کیا اور پھر اس فن کو دیہات کی اسی غریب جنتا کے لیے صرف کر دیا۔

لینن نے ایک موقع پر ہیگل کی Dilectics کے بارے میں کہا تھا کہ ہر ایک خاص شے، حقیقت یا خیال صرف ایک جزو یا ایک حصہ ہے پوری حقیقت یا خیال کے لئے اصلیت کے اور بھی کئی حصے ضروری ہیں جو یوں دیکھنے میں بے تعلق اور قائم بالذات (Stable in themselves) معلوم ہوتے ہیں .... ٹھیک اسی طرح پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کی سچائی جاننے کے لئے اس عہد کے اور زندگی کی سچائیوں کا جاننا ضروری ہے جن کا وہ محض ایک حصہ، بلکہ میں کہوں گا کہ ایک سچا عکس ہیں۔

آپ کئی صدیوں کا ہندوستانی ادب ترتیب کے ساتھ دیکھ جائیے تو آپ کو بے ترتیبی کے باوجود اس کے اندر (content) میں ایک گہری ترتیب نظر آئے گی۔ قصے کہانیوں میں پہلے کبھی (Mythological)

دیومالا کے قصے کہانیاں دہرانے نظر آئیں گے۔ دیوی
دیوتا، جن پری کا سے ہوتے ہوتے فنکار دوق زمین کا
طرف اترتا ہے تو بادشاہوں اور راجاؤں کے سنگھاسن
دربار اور مغل ڈیوڑھی میں اسے ٹھکانا ملتا ہے۔ یہاں
جن پریاں، دیوی دیوتا گم ہوتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ
راجہ مہاراجہ، رانی مہارانی اور ان کے مصاحب، ان
کے رتن بڑھتے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں پہنچ کر کہیں بڑے
چھوٹے شہر اور ان کا خوش حال درمیانی طبقہ نظر آتا ہے
ان میں بیچ کے اور اوپر کے کھاتے پیتے لوگ ہیں جن کی بڑی
بڑی جائدادیں ہیں بینکوں میں روپیہ بھرا ہے۔ بیٹھے ہوئے
رومان لڑاتے ہیں۔ خیالی بحثیں کرتے ہیں اور بہت ہی
SOPHISTICATED (سفسطائی)
انداز میں الجھی ہوئی پہیلی کے تماشائی کی طرح زندگی کے مسائل
پر رائے زنی کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ موڑ آتا ہے جہاں سے
پریم چند شروع ہوتے ہیں، یہ ہے بیسویں صدی کے آغاز
کا عام آدمی جو چھوٹے قصبوں اور دیہات میں بستا ہے
جسے بحثیں کرنے کی فرصت نہیں۔ ہل کاندھے پر ہے۔
بیل آگے آگے ہیں۔ سامنے پیاسا کھیت کھڑا ہے۔ جس
سے مہاجن کا قرض، زمیندار کا لگان اور سرکار کے ٹیکس
بھرنے ہیں۔ پریم چند اس آدمی کے درمیان رہ چکے تھے
اس کے دکھ سکھ کو، اس کے طور طریق کو اس کی زبان اور
بولی ٹھولی کو، سب کو خود اسی کی طرح پہچان چکے تھے۔
ان کی نظر ایک تماشائی کی نظر نہیں تھی۔ ان کی نظر جینے اسی
چلتے پھرتے جیتے جاگتے، ہنستے کھلکھلاتے آدمی کی "جستجو و
آرزو" کی نظر تھی۔ جو ایک منزل کے بعد دوسری منزل
طے کرتی رہتی ہے۔

پریم چند نے بھی ایک منزل سے دوسری منزل طے کی ہے
اول اول انھوں نے بھی دوسرے مشہور اہل قلم کی طرح اور
اس زمانے کی ایک طاقتور تہذیبی لہر کے ساتھ پیچھے کی
طرف پلٹ جانے میں قوم کی نجات دیکھی۔ جیسے ان کا نظریہ
کا کہانیوں میں ملتا ہے یا "راجپوت کی بیٹی" اور "سر
پرغرور" وغیرہ میں نظر آتا ہے کہ ہندوستانی سورماؤں کے
تصویروں میں افسانوں کا رنگ بھر کر گویا انھوں نے مغربی
تمدن اور انگریزی تہذیب کے خلاف قوم کے ہاتھ میں تلوار دی۔
یہ اس زمانے کا عام چلن تھا۔ اردو میں تو یہ ایک
چلن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور عبدالحلیم شرر
اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ لیکن راجپوتی شان اور تلوار یا
سان کردہ اور ان سے کسی طرح کسان، زمیندار اور سرکار
کا سوال سلجھتا نظر نہ آیا تو پریم چند نے ایک قدم اور
آگے بڑھایا۔ انھوں نے اپنے کرداروں میں ہردے پری ورتن
(Change of Heart) کا نسخہ لگائی
اور اس سے زنگ آلود قلعے کھولنے شروع کئے۔ جس
سے بُرا آدمی کسی ایک مثالی قوت کے اثر سے، کسی
غیبی آواز سے بالکل بدل جاتا ہے اور اچھے آدمی
کی زندگی اختیار کر لیتا ہے۔ اور اس طرح ایک ایک آدمی
کے بدلنے سے ـــــ سماجی زندگی بدل سکتی ہے
پریم چند کی کہانی "نمک کا داروغہ" اس کی ایک
مثال ہے۔

وہ ابھی قلب ماہیت (ہردے پری ورتن)
کی اسی منزل میں تھے کہ ہندوستان میں سوراج، برطانوی
گورنمنٹ سے ترک تعلق اور آزادی کے نعرے بلند ہونے
شروع ہوئے۔ اب ہندوستانی سیاست کے خد و خال ابھرنے
لگے تھے اور اسی کے ساتھ فکری {Theoritical}
Ideological تہذیبی اور ادبی رخ بھی بنتے
جا رہے تھے۔ پریم چند نے سرکاری نوکری سے تو استعفا دیا
ہی، لیکن زندگی کی اور معاش کی آزاد جدوجہد میں
روزی روزگار کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے میں سماج کا
کچا چٹھا ان کے سامنے اور کھلا اور اب ان کے افسانوں
میں طبقاتی کشمکش کے چھینٹے بھی نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں
نرم، کہیں گرم۔ ان کے ہاں مرکزی کردار کسان، کھیت
مزدور (Landless Peasant)
غریب کسان اور چھوٹے شہروں کا معمولی کلرک یا بے سرمایہ
آدمی ہے باقی تمام کردار ان کے تعلق ظاہر ہوتے ہیں اور
ہم ان دوسرے کرداروں کا طبقاتی کردار پہچانتے ہیں۔
یہ کیفیت رفتہ رفتہ نکھرتی جاتی ہے لیکن طبقاتی
تنظیم تک پہنچتے پہنچتے مدھم ہو جاتی ہے۔ طبقاتی
آپس میں مصالحت بھی اور ٹکراؤ سے کترا کر نکل جانے
کی صورت پریم چند کے ۱۹۳۰ء تک کے افسانوں اور
ناولوں میں عام ہے۔ ایک اور صورت جو پریم چند
کی ان تحریروں میں عام طور سے اس کے بعض افسانوں
پائی جاتی ہے یہ ہے کہ ان کے ناولوں اور افسانوں
میں [illegible] ہے۔ ان میں طوفانی آہنگ
نہیں۔ اور اس ٹکراؤ کی فضا میں جو کردار ابھرتے ہیں
وہ اچھے، بہت اچھے اور انتہا درجے کے اچھے
لوگ تو ہیں لیکن انتہا درجے کے برے لوگ نہیں
سوائے ایک آدھ موقع کے، یہ برے لوگ
بھی یا تو بے نقاب ہوتے ہیں یا سماج پر سے ان
کی گرفت کمزور پڑ جاتی ہے اور بہتر لوگ طاقت
میں آ جاتے ہیں۔ پریم چند اس اصلاح پسندی
کے آئیڈیل میں برنارڈ شا کی طرح ہیروئن کا کردار
تراشنے تک تو نہیں پہنچے لیکن ہاں بہتر قسم کے
ٹائپ کیریکٹر ضرور انھوں نے دیئے۔ گاندھی جی
کی تحریک جس نے عام جنتا کی جاگرن ـــــ
ـــــ کو ایک دائرے میں سمیٹا، پریم چند
کا آدرش بن گئی۔

"سیوا سدن"، "رنگ بھومی" (چوگان ہستی)، "نرملا"
"غبن"، "پریم آشرم"، "گوشۂ عافیت" جیسے ناول
لکھنے والے پریم چند کا آخری ناول "گئو دان"
ہے اور قریب قریب آخری کہانی "کفن" ہے۔ ان
کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کے ذہن
اور فن، ان کے شعور CONSCIOUSNESS
ـــــ اور ان کے قلم کی بے باکی نے بیس برس
میں واقعی بڑا فاصلہ طے کیا اور ان کی وہ گہری
انسانیت دوستی جو "جستجو و آرزو" کی دین
تھی پھر بھی بے چین رہی انھیں تمنا تو ہے کہ یہ ظلم اور
جبر کا ڈھانچہ کسی طرح ٹوٹ کر گرے،

فرنگی حکومت سے نجات ملے۔ مہاجنی اور مہاجنی تہذیب سے آگے کی منزل آئے، لیکن ان کو یقین نہیں کہ یہ کیسے ہوگا۔ ایک بے یقینی کی سی حالت ہے۔ اور گورکی کے لفظوں میں "یہی بے یقینی اور بے اطمینانی بڑی مبارک ہے"۔

پریم چند نے اپنے آخری زمانے میں ایک مضمون "مہاجنی تہذیب" لکھا تھا جس میں آگے بڑھتی ہوئی سرمایہ دارانہ تہذیب سے وہ سخت بیزار بھی نظر آتے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے برطانوی رومانیت پسند ادیبوں کی طرح وہ بھی اس سے منھ موڑ کر نکل جانا چاہتے ہیں لیکن کالرج یا ورڈسورتھ کی طرح مناظرِ قدرت کی گود میں پناہ نہیں لیتے۔ اور نہ گورکی کی طرح ان کی پشت پر کارخانوں کی چمنیاں دھواں اڑا رہی ہیں اور نہ ان کے سامنے میں مزدوروں کے انقلابی پرچم لہرا رہے ہیں۔ پریم چند اپنے اور گورکی کی زندگی کا سارا دکھ لئے ان دونوں کے بیچ کھڑے ہوئے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اب کدھر جانا ہوگا گزرتے ہیں، زندگی کی آخری گھنٹی بجی اور سنہ ۱۹۳۶ء میں لیو ٹالسٹائی اور گورکی کے ساتھ آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ آخری دنوں میں انھوں نے ہندستان کے ترقی پسند مصنفوں کی پہلی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے جو کچھ کہا اور لکھا تھا اسے سامنے رکھئے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ کی سچائی اگلی منزل کی سرحدوں کو چھو رہی تھی۔ اور وہ دھندلکوں کے پار جا رہی تھی۔ یہ ان کی لگاتار ۳۰ برس کی سچائی، گہری انسانیت دوستی اور فن کارانہ بصیرت کا بہترین ثمرہ اور سب سے رسیلا پھل تھا۔

پریم چند کے پاس یقیناً ٹالسٹائی کا سا ادبی قد تو نہیں ہے اور نہ شکسپیر کی سی ہمہ گیری ہے۔ نہ ملٹن کی گونج ہے، نہ بائرن کا مچلاپن ہے اور نہ فردوسی کا شکوہ اور شاہنامہ ہے۔ لیکن برطانوی سامراج کے پنجے سے نکلنے کی جد و جہد کرنے والے ہندستان کی غریب جنتا کا شاہ نامہ انھوں نے بڑی جگر داری سے لکھا ہے۔ اور ایسا لکھا ہے کہ آج بھی ہم ان کے پیش کئے ہوئے ٹائپ کیرکٹروں مثلاً ٹھاکر سجن سنگھ، سورداس، سکینہ، پریم شنکر، ہوری، گوبر اور دھنیا کو پہچان سکتے ہیں۔ لوگ جارج ایلیٹ کا فرضی رمولا کو روم کی گلیوں میں ڈھونڈتے پھرتے تھے، فلابیر کی فرضی مادام بواری کو پیرس کے گلی کوچوں میں پہچانا گیا ہے، پریم چند کے دئے ہوئے یہ چہرے بھی ہندستان کے ایک ایک قصبے اور گاؤں میں پہچانے جا سکتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں کیونکہ پریم چند اپنی ذہنی زندگی میں انہیں کے درمیان سانس لیتے رہے ہیں۔ پریم چند کا ہندستان اصلی گویا مکمل ہندستان ہے صرف قصے کہانی کا نہیں ہے

دگر از آنکہ ز تدبیر چمن شد نسیم
دانگہ در شادیٔ ضمیر گل و نرگس آراست

(وہ اور ہیں جو ہوا کے جھونکے کی طرح باغ کی سیر کرتے ہیں۔ ایک یہ وہ بھی ہے کہ سیر کرنے والے پھول پتی کے سینے میں اتر جائے۔)

آئے تھے ناصح کبھی دل بہلا گئے
کر گئے کچھ عرض، کچھ فرما گئے

جینے والے غم سے گھبرائیں گے کیا
لوگ دنیا دار تھے گھبرا گئے

ہم نے چھلکائی ہے آنکھوں سے شراب
آپ کے گیسو تو بس لہرا گئے

جب کبھی تیری زلف سے خوشبو اڑی
گلستاں میں پھول ٹھوکر کھا گئے

آج ہے دنیا کا یہ معیارِ غم
لوگ میخانوں سے بھی گھبرا گئے

پا سکے شاہد نہ اپنوں کا بھی پیار
زندگی سے لوگ کیا کیا پا گئے

"اور یہ نہیں دیکھتے کہ اٹھ تو بجے گئے اور ابھی تک منہ پہ پانی کا چھینٹا بھی نہیں پڑا۔ گشن تو کچھ آپ کے باسی سانس کی وجہ سے ہو گی۔"

"باسی سانس؟ واللہ! باسی کباب سنتے آئے تھے لیکن یہ باسی سانس بالکل نئی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال ہٹاؤ اسے لئے میرا بینڈ چھوڑ دو اور کھڑکی کھول دو۔ اگر میرے ساتھ ساتھ تمہارے باسی کباب جیسے ابھرے ہوئے نتھنوں میں بھی تازہ ہوا پہنچے۔"

"یہ بھی اچھی زبردستی ہے کہ ابا تو تم اور بینڈ پکڑوں میں۔ گویا میں تمہاری بارش کی ہوں۔"

"نہیں بابا نہیں!! لعنت ہے اس پر جو تمہارا بینڈ پکڑے اب چھوڑتا ہوں لیں! مگر لللہ! مزید کچھ بولے بغیر اب کھڑکی کھول دو، ورنہ میرا دم گھٹ جائیگا۔"

شاہدہ بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور ارشد لکھنے والی میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ارشاد کو کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر وہ پلٹ پڑی۔

"اب وہاں کہاں؟ پہلے جا کر منہ ہاتھ تو دھو لو۔ ایک دن چڑھے تک سوتے رہے دوسرے خدا خدا کر کے اٹھے تو اب لکھنے والی میز پر آ جمے۔"

"میں نے تم سے ہزار بار کہا کہ کام کے وقت ٹوکا مت کرو کہ تمہارے ٹوکنے سے مجھے وہ کانا بنیا یاد آ جاتا ہے جو ہفتہ بھر اپنا قرض مانگنے آن موجود ہوتا ہے لیکن ......"

"... اُف وہ! اماں کھڑکی تو کھلی لو!"

"اور تم یہاں بیٹھے رہ گئے منہ ہاتھ دھونے نہیں جانا ہے جیسے۔"

"جاتا ہوں بابا! جاتا ہوں۔" ارشد نے قلم میز پر پٹکتے ہوئے کہا۔ "تمہارا حکم کبھی ٹلا ہے۔ واہ وا! واہ رے اللہ کی شان، ہائے رے اپنا مقدر! وہ کہیں اور سنا کرے کوئی بلکہ وہ کہیں اور عمل کرے کوئی۔"

شاہدہ نے کھڑکی کھول دی۔ ہوا کا ایک شگفتہ جھونکا ارشد کے چہرے کو گدگداتا ہوا گزر گیا۔ دفعتہً وہ سڑک پہ جاتے ہوئے ایک آدمی کو دیکھ کر چونک پڑی۔

وہ کھڑکی پہ جھک کر اسی طرح دیکھنے لگی پھر گردن گھما کر بولی۔

"ذرا دیکھو تو سہی! وہ ریاض بھائی ہی ہیں نا!"

"ہاں صاحب! ریاض ہی ہونگے آپ نے کہا ہے تو ریاض ہی ہونگے۔ ظاہر ہے کہ کہا ہوا بھول تو ہو نہیں سکتا۔ یہاں کون کافر لفظ اعتراض زبان پر لاتا ہے۔"

"توبہ ہے اللہ! ذرا دیکھو تو سہی، ان کا عجیب حلیہ ہے۔ اے یہ ریاض بھائی ہی ہیں نا!"

"یہ بھی خوب رہی۔ گویا ریاض بھائی سوئی کا ناکا ہیں اور آپ بوڑھی کھوسٹ ہیں اور اس وقت دن نہیں رات ہے کہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ جیسا تم نے کہا ہے تو ریاض ہی ہونگے اور کون ہوگا سالا ..... اوہو..... میرا مطلب ہے ... معاف کرنا! اس وقت شدت سے ایک کپ چائے کی طلب محسوس ہو رہی ہے۔ تمہارے ریاض بھائی تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ویسے تم اس وقت تصدیق کیوں طلب کر رہی ہو؟ کیا تم نے دوسرا استعمال کرنا چھوڑ دیا ہے جو میں نے حکیم خطرے جان متگی کے یہاں سے لا کر تمہیں دیا تھا، لاحول ولاقوۃ! یہ نام بھی عجیب ہے کہ حکیما نہ خیال!! جی کا تخلص معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال وہ سُرمہ ......"

"... اللہ بچائے اس سُرمے سے معلوم ہوتا ہے جیسے آنکھوں میں پسی ہوئی مرچیں پڑ گئی ہوں۔ دس پندرہ منٹ بعد کوئی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ سر کا درد الگ ہے۔ لیکن ذرا دیکھو تو! یہ ریاض بھائی کو کیا ہوا۔ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑے ہوئے، بدن کو مریضوں کی طرح جھکائے ہوئے قدم اس طرح آہستہ آہستہ رکھ رہے ہیں جیسے انہیں تکلیف ہو۔"

"واللہ یرقان کے مریض معلوم ہو رہے ہیں۔"

"آپ کے منہ میں خاک! اے لو، اسی طرف آ رہے ہیں۔ اور آپ یہاں کھڑے ہیں ذرا باہر جا کر پوچھئے تو سہی۔"

"پوچھنا ہی چاہیئے۔ تمہارا حکم ہو اور مجھ سے تعمیل نہ ہو... ہائے آہ مرے مکر... خیر چلو بھئی چلو......" ارشد کمرے سے نکل گیا۔ شاہدہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ باہر کے دروازے پر ریاض سے ملاقات ہو گئی۔ ارشد نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ارے بھئی ریاض ..... میرا مطلب ہے اماں ریاض... یہ آخر ..... یعنی کہ ہوا کیا ہے تمہیں؟"

"کچھ نہیں یار! شکر ہے خدا کا کہ میں یہاں پہنچ گیا۔ چلو اوپر چلو!"

"اوپر تو چلیں گے ہی۔ لیکن تم کمان بنے ہوئے کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"کچھ تکلیف ہے ریاض بھائی —؟" شاہدہ نے پوچھا

"تکلیف! ارے بھابی جان پر بنی ہوئی تھی۔ لیکن شکر ہے خدا کا، میں یہاں پہنچ گیا۔ آپ لوگ اوپر تو چلئے۔"

"چلتے ہیں بھئی چلتے۔ میں اور کھڑکی میں سے تمہاری یہ حالت دیکھ کر تو میری آدھی جان تو نکل گئی تھی۔"

"اور پوری جان کیوں نہیں نکل گئی تھی؟ یقین مانئے گا ریاض بھائی! میں نے کھڑکی میں سے آپ کو دیکھ کر ان سے کئی بار کہا کہ ذرا دیکھنا تو ریاض بھائی کو کیا ہو گیا ہے لیکن حضرت کرسی پر سے ٹس سے مس نہ ہوئے، ہاں مگر ان کی آدھی جان نکل گئی تھی۔ بڑے ......"

"ملاحظہ کیا آپ نے! یہ میری بیوی ہیں۔ خیر اگر غیر بیوی ہوتیں تو صبر کر لیتا لیکن یہ مشرقی بیوی ہو کر مجھے کوس رہی ہیں ذرا ان کی جوانی کا سن دیکھئے۔"

"محترمہ کا کمسنی ملاحظہ فرمائیے پھر اس خاک نصیب بد تمیز کی عمر پر نظر کیجئے اور پھر غور فرمائیے کہ مجھ پر کیا بار ہے۔ کہ تمہاری جان کیوں نہ نکل گئی۔ اور وہ بھی آدھی پوری جان نہیں بلکہ پوری کی پوری یعنی مسلم جان کیوں نہ نکل گئی تمہاری۔ اور میں پوچھتا ہوں محترمہ کہ ریاض کو دیکھ لینے کے بعد بھی اسے پہچانا کیوں نہیں؟ بلکہ پوچھا مجھ سے جا کر تھا کہ یہ ریاض بھائی ہیں یا سرکس کا کوئی مسخرا۔"

"اے اے! جھوٹ نہ بولو۔ میں نے سرکس کا مسخرا کب کہا تھا۔ میں ریاض کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"ہاں صاحب! آپ کیوں سوچنے لگیں، جھوٹا تو میں ہوں۔ دروغ باف تو میں ہوں بلکہ ازلی، نسلی اور اصلی کذاب تو میں ہوں میں!!! اور آپ اپنے ریاض بھائی سے اتنی محبت کرتی ہیں کہ دیکھ کر پہچان نہ سکیں جب تک میں نے تصدیق نہ کر دی، معاذ اللہ! ان کو یقین آیا۔"

"یہ جھگڑے تو آپ لوگ فرصت پر اٹھا رکھئے۔

میں یہاں اس حالت میں زیادہ دیر تک نہیں کھڑا رہ سکتا۔"
"معاف کرنا! یا ماموں جو میں تمہارے متعلق بھول گیا تھا خیر میں
کیا بھول تا بھلا دیا گیا تھا۔ یہ کمبخت بن بڑی ہیں ایک تو ہوتی ہی
ہیں حیثیم احمق دوسرے چھت تک مرتی ہیں نئے سر کو اٹھلی ہیں ڈال
کر ادھر سے موسل ہیں رکھ دیتی، انہیں چین نہیں آتا
بہرحال، چلو اوپر، چلو چلو! اور آپ بھی تشریف لیجیے
چلنے محترمہ! لیکن ٹھہرو!
رُک جاؤ ریاض! ذرا اپنا ہاتھ تو دکھانا۔"
"مجھے کوئی مرض نہیں ہے یار! دراصل....
ارے ارے..... یہ ہاتھ نہ کھینچو، اسے پیٹ پر رہنے
دو ورنہ قیامت آجائے گی۔"
"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہارے پیٹ میں قیامت
بھی ہوتی ہے۔ اچھا لاؤ، بایاں ہاتھ لاؤ!"
"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ارشد! میں تمہیں کیسے
سمجھاؤں کہ ......"
"سمجھانے یا بتانے کی ضرورت نہیں ـــ نبض خلاف
معمول تیز چل رہی ہے۔ ہوں ہوں ...... ٹھیک ہے۔
میں نے کہا سنتی ہو! آخر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا"
"خاک سوچا ہے آپ نے! چلیے ریاض بھائی چلیے!"
"ہاں ہاں، لے چلو! سہارا دے کر لے چلو! اور ہاں! بیگم
میرے بستر پر آرام سے لٹا دینا اور کمرے کی کھڑکیاں کھول
دینا اور بجلی کا پنکھا چالو کر دینا۔ میں ابھی آتا ہوں۔"
"لیکن میری بات تو سنو ..... اماں ارشد!"
"نہ نہ! سننے سنانے کا وقت ختم ہو گا ـــ اور سنو!"
ارشد نے شاہدہ کو اپنی طرف کھینچا اور اسے کچھ فاصلے
پر لے جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولا۔
"ریاض کی پتلون دھو دینا!"
"پتلون دھو دینا! کیا مطلب"
"اُف توبہ! آہستہ بولو!" اس نے شاہدہ کے چہرے
کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "اب اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔
پتلون دھو ڈالنا میں ابھی آتا ہوں۔"
ارشد ایک طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دواؤں کا بکس لیے ہوئے اپنی خوابگاہ
میں داخل ہوا۔ دواؤں کا بکس کافی پرانا تھا۔
اوپر کا پرانا کپڑا جگہ جگہ سے اُدھڑا ہوا تھا اور گرد و
غبار کے بہت سے داغ نمایاں تھے۔ ریاض تب پلنگ
لیٹے ہوئے اس کی چارپائی پر سو رہا تھا اور شاہدہ
کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ ارشد دواؤں کا بکس
اٹھائے ہوئے ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے ایک
نظر دیکھ کر شاہدہ سے پوچھا۔
"دھو دی پتلون؟ کیا تھا وہ، زرد یا کائی کے رنگ
کا؟ اور یہ بجلی پنکھے کی ہوا میں نے ریاض کو کھلانے
کے لیے کہا تھا یا آپ کے لیے کہا تھا ـــ
تھا ـــــــــــ کہ آپ صاحب بہادر کی ہمشیرہ
...... میرا مطلب ہے اہلیہ محترمہ بن کر خود ہوا کھائیں؟
پنکھے کا رُخ ادھر کر دو! اور ہو کیا ریاض اتنی سو گیا؟"
شاہدہ نے اس کے سوالات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا کاٹھ کباڑ اٹھا لائے ہیں؟"
"یہ کاٹھ کباڑ ہے؟ میرے اکلوتے شغل کو کاٹھ کباڑ
کہہ رہی ہو۔ میرے آبا و اجداد کا یہ محبوب مشغلہ تھا
بلکہ پیشہ تھا! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حکیم زادا جان
مرحوم کے دواؤں کا بکس ہے جسے میں بہت احتیاط
سے رکھتا ہوں۔"
"احتیاط کی جتنی تو یہ بکس خود ہی کھا رہا ہے۔ ویسے
ریاض بھائی کو کوئی مرض نہیں ہے۔"
"تمہیں کیا معلوم کہ مرض در مرض کیا ہوتا ہے۔" ارشد
نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ "وہ چھوٹی سی گول میز لاؤ!
دیکھتی نہیں، ریاض کے چہرے کا رنگ کتنا زرد
ہو رہا ہے۔ انڈے کی زردی بھی اس قدر زرد نہیں
ہوتی۔ ارے تھرما میٹر کدھر ہے۔"
"چہرے کا رنگ اس لیے زرد ہے کہ کھڑکیوں پر
ٹنگے ہوئے آپ کے محبوب زرد رنگ کے پردوں سے روشنی
چھن چھن کر اندر آ رہی ہے۔ توبہ ہے! اس کمرے کی سیاہ
چیز بھی زرد نظر آتی ہے۔"

اب اس زرد لے میں ہی پر کچھ دیتی رہے گی۔
وہ گول میز ادھر اٹھا لاؤ!"
شاہدہ نے گول میز لا کر اس کے قریب رکھ دی
اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے لی۔
"ہائیں ہائیں! انجکشن لگاؤ گے کیا؟"
"ہائیں ہائیں، اُف ری! ہائے قسم کے زنانہ الفاظ
میرے سامنے مت بولو! ذرا اپنے جین سے بھیگ
ـ بیکن رکو! ان کی آستین اوپر اٹھاؤ!"
"میں کہتی ہوں میری بھی سنو گے یا اپنی ہی ہانکے
جاؤ گے۔ ریاض بھائی بھلے چنگے ہیں۔ دراصل راستہ
میں ان کی پتلون کا بٹن ٹوٹ گیا تھا ـــ!"
ایک فلک شگاف قہقہے کے ساتھ ریاض اٹھ بیٹھا۔
"کیا کہا؟ پتلون کا بٹن ٹوٹ گیا تھا!" ارشد نے
کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اُس کے ہاتھ سے برش
چھوٹ گئی۔
"کمال کر دیا ارشد!" ریاض نے ہنستے ہوئے کہا
پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "واقعہ یہ ہے کہ میں تمہارے ہی
پاس آ رہا تھا۔ جب تمہارے مکان کے قریب پہنچا تو
کمبخت پتلون کا بٹن ٹوٹ گیا بس تو وہی ہوا کہ ؎
قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا"
"شعر میں قدرے ترمیم کر کے یوں کہیے ریاض بھائی!"
شاہدہ نے کہا اور گنگنانے لگی ؎
"قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں سے بیلٹ
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا"
"واقعی بھابی!" ریاض نے ہنستے ہوئے کہا۔
"لاحول ولا قوۃ!" ارشد نے کہا اور دواؤں کا بکس
اٹھا کر بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔
"میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میرے بازو کی مچھلیاں
پھڑک رہی ہیں ضرور کوئی دھوکا ہو گا ـــ"

"مولانا عبدالحق بحیثیت نقّاد"

یونس ولی دیب

مولانا نے علی گڑھ کی اس فضا میں تربیت پائی جو علم و ادب کا گہوارہ تھی قوم مغرب سے جس قدر بھی ممکن تھا استفادہ حاصل کر رہی تھی۔ سماجی اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان کی ترویج و اشاعت پر بھی زور دیا جا رہا تھا۔ ادب اور شاعری سے زندگی کو سنوارنے کا کام لیا جا رہا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مغرب کی تقلید میں ناول اور افسانے لکھے جا رہے تھے شاعری میں مواد اور ہیئت کے تجربے ہو رہے تھے۔ خیال اور تصوراتی دنیا کی جگہ اصلیت اور صداقت پر زور دیا جا رہا تھا۔ ذہن ادب کو سنوارنے اور نکھارنے کے لئے تنقید بھی پنپ رہی تھی۔ مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" کے ذریعہ تنقید کی ایک نئی بنیاد ڈالی۔ شاعری کے اصول و ضوابط مقرر کئے۔ مولوی عبدالحق کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے اُن سے زیادہ قرب حاصل رہا اس لئے اُن پر حالی کی شخصیت کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اپنی تنقیدوں میں مولانا نے حالی کے اصول کو مشعل راہ بنایا اور اس سے آگے بڑھا۔

سنگم

انگریزی سے ناواقفیت کی بنا پر مولانا حالی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے مگر عبدالحق صاحب مغربی علوم سے بخوبی واقف تھے آپ کے زمانے میں علی گڑھ کی فضا بہت کچھ بدل چکی تھی۔ علی گڑھ اب صرف عربی و فارسی کا ہی مرکز نہ تھا بلکہ سائنس، فلسفہ اور دیگر علوم اور زبانوں کا مرکز بن چکا تھا۔ آپ نے اس سے پورا استفادہ حاصل کیا اور آخر تک کرتے رہے۔ آپ نے کافی طویل عمر پائی اس لحاظ سے وہ قدیم اور جدید کے درمیان کی ایک کڑی تھے۔ آپ ہی کے سامنے فن تنقید نگاری کی ابتدا ہوئی اور بعد سے زیادہ ترقی بھی اسی طویل عرصے میں تنقید مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی مثلاً تاریخی تنقید، تاثراتی اور وجدانی تنقید۔ عملی اور علمی تنقید۔ تقابلی تنقید۔ مارکسی، عمرانی اور نفسیاتی تنقید اور مولانا ہر ایک سے متاثر ہوئے۔ مگر چونکہ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اس لئے علمی تنقید اور تاریخی تنقید کے ساتھ ساتھ مشرقی طرز تنقید سے وابستہ رہے۔ چنانچہ خیالات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی خوبیوں کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ "اردو تنقید کا ارتقاء" کے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں۔

" شے ایک ہوتی ہے لیکن اس کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک باطن۔ دوسرا ظاہر۔ ادب کا بھی ظاہر اور باطن ہے۔ ظاہر اسلوب بیان اور الفاظ کا صحیح استعمال ہے باطن خیال یا موضوع جو اصل مقصد ہے۔ حسن بیان خیال میں دلکشی پیدا کر کے لوگوں کے دلوں میں اسے جاگزیں کرتا اور تحریک کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں اصل غایت خیال ہے اور حسن بیان ذریعہ۔ لیکن طرز بیان کے محاسن اور اس کے اسقام اس لئے جدا نہیں ہو سکتے۔"

تحقیق تنقید

وہ ادب یا ادیب پر سرسری نظر ڈال کر نہیں نکل جاتے بلکہ ان کی نظر غائر تحقیق اور تجزیے کا دامن نہیں چھوڑتی ہمارے یہاں عموماً تنقید اور تحقیق دو الگ الگ چیزیں سمجھی جاتی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ تحقیق، تنقید سے الگ نہیں۔ اگر تنقید میں ریاضت اور تحقیق سے کام نہ لیا گیا تو وہ جامع اور مکمل تنقید نہیں ہو سکتی۔ مولانا عبدالحق جیسے محقق ہیں ویسے نقاد۔ اور شاید محقق پہلے ہیں نقاد بعد میں۔ انہیں تاریخ سے خاصی دلچسپی ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی کوئی تصنیف یا تالیف تحقیق سے خالی نہیں۔ وہ اُس وقت تک قلم نہیں اٹھا سکتے جب تک کسی چیز کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں سطحیت کا گذر نہیں مگر قطعیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے جو ویسے تو تحقیق کی خامی سمجھی جاتی ہے مگر مولانا کی تحقیق اتنی جامع ہوتی ہے کہ وہ مزید تحقیق کی گنجائش نہیں رکھتے۔ مولانا نے اُن کتابوں کو ادبی شان بخشی جنہیں ادبیت سے خالی سمجھا جاتا تھا۔ قطب مشتری۔ معراج العاشقین۔ مرحوم دہلی کالج۔ تذکرہ گلشن ہند۔ باغ و بہار۔ نکات الشعراء وغیرہ اُن کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں وہ شاعر کے کلام کو اُس کے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کی روشنی میں پرکھتے ہیں شاعر یا ادیب کی ذاتی زندگی اور اس کے ماحول کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بغیر غور و فکر کے نتیجہ اخذ کرتے ہیں یہ خصوصیت اُن کی تنقیدوں میں ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔

جدید ذہن

وہ ادب کو کوئی جامد چیز نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ نئی چیز بُری نہیں ہے بشرطیکہ وہ اچھے ڈھنگ سے برتی جائے۔

" نئے اسلوب اور اظہار کے نئے ڈھنگ کوئی جرم نہیں لیکن نئے ڈھنگ کیوں نامعقول ہوتے ہیں؟ اس لئے نہیں کہ وہ نئے ہیں بلکہ اس لئے کہ اُن کے برتنے والے میں خامی ہے اگر شاعر کے خیالات میں جدت تازگی اور گہرائی ہے اور اُن کا اظہار حسن اور سلیقے سے کر سکتا ہے تو نئے اسلوب ایک نہ ایک دن ضرور مقبول ہو کر رہیں گے" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: —

" ادب میں نیا اور پُرانا کوئی چیز نہیں جس ادب میں تازگی، جدت اور گہرائی ہے خواہ وہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو پرانا ہے" "لا = را" ن م راشد

منصفانہ تنقید

بے باکی اور صاف گوئی تنقید کی خاص جان ہے نقاد وہ منصف ہوتا ہے جس کے نزدیک اپنے اور پرائے کی تفریق نہیں ہوتی۔ مولانا کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ حتی الامکان جانبداری سے پرہیز کرتے ہیں۔

خلوص اور نیک نیتی ہر جگہ نمایاں ہے۔ وہ سیدھے سادے الفاظ میں خوبیوں کو بھی کھول کر سراہتے ہیں اور کمزوریوں کو بھی ہمدردانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مقدمہ عام طور پر کسی تصنیف کی تشہیر کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ عبدالحق وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے مقدمے کی اہمیت پر توجہ دی۔ یہ انہیں کی ذات تھی جس نے مقدمے کو تنقید کا جز قرار دیا۔ اچھے تبصرے وہی مانے جاتے ہیں جن میں کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیالات کا اظہار ہو۔ عبدالحق کے تبصرے بھی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ وہ مختصر اور جامع الفاظ میں بے باکی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

" روح ادب " کے تبصرے میں لکھتے ہیں "

"حضرت جوش ایک مستعد پرجوش اور جدت پسند شاعر اور نثار ہیں نثر میں جابجا جدت سے کام لیا ہے اور فرضی تصویروں میں اصلیت کا رنگ دکھایا ہے۔ استعارات اور تشبیہات کی اس قدر بہتات ہے کہ مسلسل پڑھنے سے جی اکتا جاتا ہے۔ اور کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑتی ہے۔ طرز تحریر کے ساتھ خیالات میں انوکھا پن دکھایا ہے لیکن ان میں

جوش کے مجموعہ آیات و نغمات کے متعلق ان کا یہ جملہ کافی مشہور ہے کہ جوش کے کلام کو پڑھ کر لطف و سرور حاصل ہوتا ہے لیکن اس میں بلندی فکر اور تاثیر نہیں۔"

عقیدت

ان کے یہاں تاثراتی تنقید کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ مولانا حالی سے آپ کو عقیدت ہے۔ چنانچہ ان کا بیان آتے ہی آپ کے سنجیدہ دماغ میں جذبات کی لہر پیدا ہو جاتی ہے۔ "مکتوبات حالی" تاثراتی اور وجدانی تنقید کی اچھی مثال ہے۔ لیکن یہ رنگ ان کی طبیعت کے خلاف ہے اس لئے جذباتی رنگ میں بعض جگہ بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے درجے سے گر جاتے ہیں۔ تبصرہ "جواہرات حالی" میں لکھتے ہیں۔

"لیکن اصل شے جو دوسری جگہ ڈھونڈے سے نہیں ملتی وہ درد ہے جو ان کے کلام میں پایا جاتا ہے اردو شاعری میں یا تو یہ میر کے حصے میں آیا ہے یا حالی کے حصے میں۔ مولانا حالی جب قوموں کے عروج و زوال اور مصیبت زدوں کی بپتا بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو دنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ....

خامی

مسدس کی اہمیت تسلیم۔ مسدس اپنی نوعیت کی پہلی چیز تھی اس میں بھی شبہ نہیں کہ اس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان بڑے سوز و درد بھرے انداز میں بیان کی گئی ہے مگر اس کے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ "دنیا کا کوئی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"۔ تنقید میں اس قدر قطعیت نقاد کو اپنے منصب سے ہٹا دیتی ہے اور اس کے معیار کو پست کر دیتی ہے۔ پھر وہ "الفاظ کا اتحاد صنفی" کے تبصرے میں اسی طرح الجھ جاتے ہیں اور حالی کی عقیدت میں شبلی کو بری طرح گرا دیتے ہیں اور یہاں وہ بیک وقت بت شکن اور بت پرست دونوں نظر آتے ہیں۔ "الفاظ" کے مضمون نگار اس غلطی کے مرتکب ہوئے تھے کہ انہوں نے شبلی کے مقابلے میں دوسروں کو گھٹا دیا تھا تو مولانا کو بجائے جوابی کارروائی کرنے کے بڑی سنجیدگی سے اسے سمجھانا تھا جیسا کہ مولانا حالی کیا کرتے تھے مگر افسوس کہ مولانا بگڑ کر یہ کہہ جاتے ہیں کہ "جو لوگ کتابوں سے زبان سیکھتے ہیں وہ زندہ زبان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اصل زبان یہی ہے اور یہی رہے گی مولانا شبلی مرحوم کا یہی حال تھا وہ دوسروں کے مقلد ہیں اور سب سے بڑے مقلد مولانا حالی کے ہیں خاص کر سوانح نویسی اور تنقید انہوں نے حالی سے سیکھی ہے۔ اور زبان میں آزاد، حالی اور نذیر احمد سے خوشہ چینی کی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی نثر میں کوئی خصوصیت نہ پیدا کر سکے۔"

سرسید کی سوانح

جہاں تک علمیت اور زبان دانی کا تعلق ہے مولانا شبلی نے اپنا لوہا منوایا ہے بلکہ وہ باقاعدہ ایک اسکول کے بانی ہیں۔ ان کی علمیت کو مولانا حالی اور نذیر احمد بھی تسلیم کرتے تھے۔ سوانح نویسی میں بھی وہ ممتاز تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو سرسید حالی کے ہوتے ہوئے ان سے اپنی سوانح لکھوانے پر اصرار نہ کرتے مگر افسوس کہ مولانا نے اپنی عقیدت کے جوش میں شبلی کو حد سے گرا دیا۔ اس سے شبلی کا تو کچھ نہ ہوا البتہ مولانا اپنے مقام سے گر گئے۔ اور اس میں شک نہیں کہ اگر مولانا حالی ہوتے تو اس تحریر سے انہیں سب سے زیادہ صدمہ ہوتا۔ بہر حال تفصیل کی گنجائش نہیں نقاد کا کام شہرت بخشنا اور تاج اتارتے رہنا نہیں ہے اسے شخصیت سے گریز کرنا چاہئے۔

پکچر جانے کیلئے دیر ہو رہی تھی اور بیوی کا سنگار کہیں ختم ہونے ہی میں نہیں آرہا تھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد شوہر نے ٹہلنا شروع کیا۔ کچھ دیر بعد پیر پٹکنا اور پھر بال نوچنا۔ جب وہ ان تمام مرحلوں سے گزر چکا تو اس نے جھنجھلا کر پوچھا
"اب تم کتنی جلد تیار ہو جاؤ گی۔" صبح اور تسلی [illegible]

●

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ آپ کی بیوی ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔"
"اس میں افسوس کی کیا بات۔ میں نے بہت پہلے موٹر چلانا سیکھ لیا تھا۔"

●

"محترمہ آپ کہتی ہیں کہ آپ کا ایک بچہ ۴ سال کا ہے اور دوسرا ۵ سال کا۔ اور پھر آپ کے شوہر کے انتقال کو ۶ سال ہو گئے۔"
"ہاں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو زندہ ہوں۔"

●

"دیکھئے محترمہ آپ کے شوہر کو مکمل آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور جب تک یہ دونوں چیزیں انہیں میسر نہیں ہوں گی وہ صحتیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ خواب آور گولیاں لیجئے اور ....."
"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ یہ گولیاں میں انہیں کب دوں"
"یہ انہیں مت دیجئے۔ یہ تو آپ خود استعمال کیجئے۔"

واجدہ تبسم

تین کتابیں

میں اکثر دن کتابیں پڑھتی رہتی ہوں یہ میری ہابی بھی ہے اور میرا شوق بھی۔ چند کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسرے دن ہی ذہن سے اتر جاتی ہیں اور چند برسوں گزر جانے پر بھی باسی نہیں پڑتیں ان کی اقدار دائمی ہوتی ہیں اور وقت کی گرد انہیں دھندلا نہیں سکتی اگر ایسی کتابوں کا تذکرہ کرنے بیٹھوں تو ایک عمر گذر جانے پر بھی ختم نہیں ہوگا لیکن یہی شمار گنوا دینے کی بات بری کتابوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

ہر زمانے میں اچھی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ ہمارا زمانہ بھی اس سے مبرا نہیں ہے گو اس زمانے میں اچھی اور قابل مطالعہ کتابوں کی تعداد نسبتاً کم ہے لیکن میں کہتی ہوں کہ یہ تناسب ہمیشہ رہا ہوگا۔ اور پھر اچھائی اور برائی تو اضافی چیزیں ہیں اس کا زیادہ تر دارومدار خود اپنی پسند یا معیار پر ہوتا ہے

مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا آج کا عہد شاعری کا عہد ہے تقسیم ہند کے بعد شعراء کی تعداد اس قدر تیزی سے ابھری ہے کہ بعض وقت تو حیرت سی ہونے لگتی ہے۔ اس کے برعکس نثر میں میدان تقریباً صاف نظر آتا ہے۔ افسانہ۔ ڈرامہ اور تنقید کی وادیاں سنسان سی نظر آتی ہیں کبھی کبھار کوئی آہٹ سی ملتی ہے پلٹ کر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ خود ہمارے کان ہی بج رہے تھے۔ جب صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے پلڑا شعر ہی کا بھاری رہیگا۔

● پچھلے دنوں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں وحید صاحب کی "اوراقِ مصور" سردار جعفری صاحب کی "لکھنؤ کی پانچ راتیں" اور حضرت منور لکھنوی کی "آبگینہ شکستہ" قابل ذکر ہیں۔

اوراقِ مصور وحید صاحب کی شعری کاوشوں کا مجموعہ ہے جہاں تک مجھے یاد ہے وحید صاحب کے اس سے پہلے تین مجموعے نکل چکے ہیں اور غالباً یہ چوتھا ہے۔ اس مجموعے کی بیشتر تخلیقات پچھلے مجموعوں میں آچکی ہیں

—— مگر چونکہ قابل قدر چیزوں کی بھی ہے اس مجموعے میں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں۔ وحید صاحب ہمارے شاعروں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو بڑی قابل احترام ہے اور اب دھیرے دھیرے زمانے کی نظر لگتی جارہی ہے ممکن ہے آج سے ۲۰-۲۵ برس بعد ہم اس قسم کی شاعری کے لئے ترس ترس جائیں جو اس نسل نے ہمیں دی ہے۔ تھوڑا بہت ترسنا تو ابھی سے شروع ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں وحید صاحب کے شعری محرکات کو انگیز کرنے میں فطرت کو بڑا اور اہم دخل رہا ہے اُن کی بیشتر نظمیں یا تو فطری مناظر پر ہیں یا پھر فطرت سے ان کا گہرا رشتہ ہے۔ دیکھا جائے تو ایک طرح سے ان کی دو مشہور اور خوبصورت نظمیں "ایلورا" اور "اجنتا" بھی اس رشتے میں باندھی جاسکتی ہیں۔ روایات کا احترام اور ماضی کی خوشگوار فضا سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا بھی وحید صاحب کی شاعری کا ایک بڑا وصف ہے۔ ان کی نظموں میں ہمیں بڑا شریفانہ اور پاکیزہ ماحول ملتا ہے یہ بات ہمیں نظم "رقاصہ" تک میں ملیگی۔ شاعر تو اس عنوان کے بہانے پتہ نہیں کیا کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں اور کہتے آئے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وحید صاحب نے اس قسم کے موضوعات کے لئے بھی ایک حد مقرر کر رکھی ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی پھلانگنا نہیں چاہتے۔ سستی گری ہوئی یا چھچھورپن لئے ہوئے کوئی بات ان کی نظموں یا غزلوں میں نہیں ملیگی۔ ایک وضعدارانہ بانکپن۔ ایک باوقار اور پُر تمکنت سی فضا پورے کلام پر چھائی ہوئی ہے۔ ان کے عشق میں بھی مجنونانہ کیفیت نہیں بلکہ بڑا رکھ رکھاؤ اور بڑی طہارت ہے اور بعض جگہ تو وہ افلاطونی ہو گیا ہے۔

لوگ وحید صاحب کو اجنتا کا شاعر کہتے ہیں۔ بلاشبہ اجنتا خوبصورت نظم ہے اتنی خوبصورت کہ اجنتا کے غار دیکھتے وقت وحید صاحب کی تصویر آنکھوں میں پھر جانا لازمی ہے لیکن میری دانست میں ان کی اور بھی کئی خوبصورت نظمیں ہیں "کاروانِ زندگی" کو بڑی اہمیت دیتی ہوں۔ میری رائے میں یہ اردو کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گرے کو ELEGY لکھنے کے لئے ۱۸ سال لگے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ نظم کہتے وقت وحید صاحب کو ۱۸ سال نہیں تو ۱۸ سالوں پر چھا جانے والے طویل کرب سے ضرور گزرنا پڑا ہوگا۔ اس میں صرف فکر ہی نہیں بلکہ جذبے کی بھی گہرائی ہے۔ زندگی اور اس کے تعلق سے انسان کے ارتقاء کی مختلف منزلیں پیش کرنے میں وحید صاحب جس مشاہدے سے گزرے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ لیکن اسے اردو زبان کی بدنصیبی کہہ لیجئے یا کچھ اور کہ یہ حسین کتاب بھی کتابت کی غلطیوں سے نہیں بچ سکی۔ یہ غلطیاں تو ہر کتاب میں ہوتی ہیں لیکن اس کتاب میں غلطیاں دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔

دوسری کتاب سردار جعفری صاحب کی "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ہیں۔ عنوان تو اس کا یہی ہے لیکن ان پانچ راتوں میں کئی سالوں کی کہانی پوشیدہ ہے یہ افسانے نہیں ہیں لیکن ان میں افسانوں سے بڑھکر رنگینی اور دلکشی ہے۔ یہ تنقید کی کتاب نہیں ہے لیکن ہمارے عہد کی سماجی اور سیاسی حالات پر بڑی حقیقت پسندانہ تنقید ہے۔ یہ شعر کا مجموعہ نہیں ہے لیکن اس کے نثری مضامین کی زبان اس قدر رس بھری ہے کہ اکثر جگہ میں دھوکا ہوا کہ کہیں یہ ایک صفحے والی بلینک ورس تو نہیں ہے۔ یہ کتاب پڑھکر مجھے ان لوگوں پر بے حد غصہ آیا جنہوں نے جعفری صاحب کو افسانے سے چھین کر شعر کے حوالے کردیا۔ یہ کتاب پڑھکر مجھے احساس ہوا کہ اگر جعفری صاحب راستہ نہ بھٹکتے اور افسانہ سے اپنا عہد وفا نبھاتے تو ہمیں کس قدر قابل قدر ادبی ورثہ ملتا۔

لکھنؤ کی پانچ راتیں ہماری پچھلے ۲۰، ۲۵ سالوں کی ادبی سماجی اور سیاسی تاریخ کی ایک ہلکی سی جھلک بھی پیش کرتی ہیں جسکی یاسیت اور شگفتگی کا بڑا حسین امتزاج ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ہمیں پہلی بار جعفری صاحب کی زندگی کے حالات اور ان عوامل کو جاننے کا موقع ملا جنھوں نے انہیں ادب کی راہ دکھائی۔ یہ کتاب جتنی دلچسپ ہے اتنی سبق آموز بھی ہے۔ ہم آج کے ادیب و شاعر اس کتاب سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ ——

—— خلوص۔ محبت ایثار اور جانفشانی کا سبق بہت سی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اس کتاب میں ان کا ذکر ازرہی انداز اور بالکلیہ حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ملتا ہے۔ یہ کتاب ان واقعات تجربات حادثات اور محسوسات کو پیش کرتا ہے جن سے جعفری صاحب خود گزرے ہیں۔ انگریزی میں اس صنف پر بہت ساری کتابیں ہیں جو آنے والی ادیبوں کی [illegible] کے لئے مشعل راہ کا کام دیتی ہیں لیکن اردو میں ان کی تعداد [illegible] ہے بہت پہلے میں نے سمرسٹ مام کی THE SUMMING UP پڑھی تھی جس میں مام نے اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں گو پوری طرح زندگی کے تجربات سے بحث نہیں کرتی لیکن اس میں اپنے ماحول کی اس قدر بے جھجک اور بے تکلفانہ عکاسی ہے اور اکثر اوقات باتیں اس قدر سیدھے سادھے اور براہ راست انداز میں کی گئی ہیں کہ دل کو چھو لیتی ہیں اور اس کے مقابلے میں مام کی کتاب پھیکی نظر آتی ہے یہ سراسر جعفری صاحب کی زبان کا جادو ہے۔

تیسری کتاب حضرت منیر لکھنوی کی شکنتلا ہے شکنتلا کالی داس کا سنسکرت ڈرامہ ہے جسکا دنیا کی تقریباً ہر ترقی یافتہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے خود اردو میں اس کے کئی ترجمے موجود ہیں میں نے دوسرے ترجمے نہیں دیکھے اس لئے مقابلے یا موازنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن زیر نظر ترجمہ اس قدر سلیس۔ بامحاورہ اور رواں ہے کہ اسے شکنتلا کے دوسرے ترجموں میں ایک خوبصورت اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ میں نے بچپن کے زمانے میں ٹیگور کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا جو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ لیکن منیر کا ترجمہ پڑھکر مجھے اس عظیم ناٹک کے اصل حسن سے واقفیت ہوئی۔ اس ترجمے میں جذبات نگاری اور منظر کشی کے بڑے خوبصورت نمونے ملتے ہیں کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں پہلے کا یہ ناٹک ہمارے سامنے کھیلا جا رہا ہے محاکاتی حسن کی اس سے خوبصورت مثال بہت کم ملیگی

اس ترجمے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ بحروں کی تبدیلی سے ڈرامے کے TEMPO کو جاندار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامے کے مزاج کے اعتبار سے بحروں کا انتخاب کیا گیا ہے جسکی وجہ سے ناٹک میں حرکت بلا کی اور زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے زبان کی روانی میں فرق نہیں آتا ہاں بعض جگہ سنسکرت اور خالص ہندی کے الفاظ تھوڑی دیر کے لئے قاری کو ان کا مفہوم سمجھنے کے لئے ٹھہر جانے پر مجبور کرتے ہیں لیکن یہ وقفہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ایک خوشگوار سفر میں مسافر دم لینے کے لئے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں ٹھہر جائے۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

ایک عورت نمونیا سے بیمار پڑی۔ اسنے اپنے شوہر کو بلایا اور کہا "دیکھئے اگر میں مر جاؤں اور آپ دوسری شادی کریں تو میں آپ سے ایک ہی وعدہ لینا چاہونگی۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ کی دوسری بیوی میرے کپڑے نہیں پہنیگی۔"

"یہ وعدہ میں بڑی خوشی سے کر سکتا ہوں تمہارے کپڑے اسے بڑے ہونگے۔"

●

"ہلو دوست تمہاری نئی ملازمت کیسی چل رہی ہے۔"

"فرسٹ کلاس۔ میرے نیچے ۲۰ آدمی کام کرتے ہیں۔"

"واقعی پھر تم بڑے آدمی ہو گئے"

"نہیں میں پہلی منزل پر کام کرتا ہوں۔"

چندر پرکاش شاد

غزل

ماند پڑنے لگے سلسلے
اب تو کوئی گلے آ ملے

تیرے دل میں مری یاد سے
سینۂ سنگ پہ گل کھلے

تو بچھڑ جائے دنیا ہنسے
تو جو مل جائے دنیا جلے

کوئی منزل نہیں شوق کی
بے کراں ہیں یہ سب سلسلے

پھر بھٹکنے لگیں منزلیں
پھر بکھرنے لگے قافلے

تم مرے سامنے ہو مگر
درمیاں ہیں کئی فاصلے

دن تو کانٹا تھا احساس کا
رات کا پھول شاید کھلے

یوں وہ چھوتی مری بات پر
جیسے پھولوں کی ڈالی ہلے

ایک گم گشتہ آواز پر
بڑھتے جاتے تھے سب قافلے

ایٹمی دور اور ہم

برٹرینڈ رسل
ترجمہ
رشید الدین

آج کے اس ترقی یافتہ زمانے میں ہم بہت سے ایسے ہیں جو قطعی مطمئن اور آسودہ قلب نہیں۔ میں اسے ان کی نادانی کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا یہ صحیح ہے کہ فی زمانہ بہت سی پیچیدگیاں انسانی راستے میں حائل ہوگئی ہیں اور انسانی زندگی خطرناک ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے غیر یقینی سی ہو کر رہ گئی ہے مگر پھر بھی ہم ان چیزوں پر قابو پا سکتے ہیں اور ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ خطرات ضرور دور ہو جائیں گے لیکن اس کے لئے جد وجہد کرنی ہوگی۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں سمجھتا بنی نوع انسان کی تاریخ میں کبھی ایسا ممکن اور عمدہ کوئی اور دور آیا ہوگا ہمیں اس سے پوری طرح مستفید ہونا چاہیئے۔

موجودہ نسلِ انسانی انفرادی اور اجتماعی ہر دو طریقوں سے بس یہی سوچتی ہے کہ کیا تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے گی؟ لیکن جو دن گزرتا ہے یہ امید بندھ جاتی ہے کہ نہیں شاید ایسا نہیں ہوگا! مغربی ممالک کے مقابلے میں مشرق میں جو نیا اشتراکی بلاک بن گیا ہے اس کی وجہ سے اس قسم کی جنگ کا خطرہ بھر ضرور پیدا ہو گیا ہے لیکن پھر بھی ہماری نظر مثبت اور تعمیری پہلوؤں پر ہونی چاہیئے اور ہمیں موجودہ ایٹمی دور کی حاصل شدہ تمام سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

موجودہ دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے، ہمیں سائنس اور مشینیا کے اس دور میں ان چیزوں سے اچھے اور مفید کام لینے کے طریقے سوچنا چاہیئے موجودہ دور میں سیاسیات اور معاشیات ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں اور سائنس اور مشین کے ذریعہ ہم ان علوم کو زیادہ سے زیادہ موثر اور مفید بنا سکتے ہیں۔ اب دنیا میں غریبی اور افلاس زیادہ دن نہیں پنپ سکیں گے انسان اور انسان کے درمیان اونچ نیچ اور دشمنی کا جذبہ (جو کسی زمانہ میں نسلی امتیاز کی بنا پر پیدا ہو گیا تھا) اب بڑی حد تک باقی نہیں رہا ہے اور تمام لوگ مل جل کر بغیر کسی احساس کے تعمیری کاموں میں معروف ہیں اور مشینیا کو انسانی زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

آجکا انسان اتنا کما سکتا ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کا پیٹ پال سکے۔ اب غیر سنجیدہ مقابلہ بازی بھی نہیں رہی اور باہم مل جل کر کام کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں دنیا میں معاشی مشکلات بڑی حد تک اسی غیر سنجیدہ مقابلہ بازی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں جس کا سدباب اب خود بخود ہو رہا ہے۔ اب تک انسانوں کا ایک طبقہ جو معاشی مشکلات کا شکار رہا ہے وہ مختلف انسانوں ہی کی خود غرضی اور مفاد پرستی کا نتیجہ تھا۔ یہ ساری مشکلات انسانوں ہی کی لائی ہوئی تھیں۔ اگر پہلے ہی سب لوگ مل کر ہنسی خوشی کام کرتے تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ آدھے انسان بھوکے اور ننگے پھرتے اور دنیا میں خوف وہراس اور مایوسی و یاسیت کا دور دورہ رہتا۔ ہمیں ایک دوسرے کی تکلیفات کا احساس رکھنا چاہیئے جس دن یہ احساس عام ہو جائے گا اس دن کوئی انسان کسی کا دشمن نہیں ہوگا۔ دنیا سے قتل، چوری اور غارت گری ناپید ہو جائے گی اور انسان آپس میں سچے دوستوں اور سگے بھائیوں کی طرح رہیں گے۔

آج بہت سے انسان اپنے اندر ایک قسم کا خوف محسوس کرتے ہیں۔ وہی خوف جو انسان کو اس وقت لاحق تھا جب وہ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہوا تھا اور قدرت پر اسے کچھ بھی تصرف حاصل نہ تھا۔ اس قسم کا خوف بجا بھی ہو سکتا تھا لیکن آج کے اس ترقی یافتہ زمانے میں جبکہ انسان اپنی معراج پر پہنچ چکا ہے ایک انسان کو کسی قسم کا خوف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً ہمیں اس قسم کے خوف سے بچنا چاہیئے۔ جو ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے ہے لیکن وہم حد تک پہنچ چکا ہے اس قسم کا خوف نسلِ انسانی کے لئے تخریبی رول ادا کر رہا ہے اور آج کے انفرادی اور اجتماعی المیہ اور گھبراہٹ کی اصل وجہ یہی ہے۔

آج نسلِ انسانی میں جو خوف وہراس پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رہا۔ انسانی معاشرہ طبقوں اور قوموں میں بٹ گیا اور خود غرضی جو انسانی کردار کا ایک منفی پہلو ہے اس سے ایسے تنگ نظری اور تباہی کے کام کروا رہی ہے آج انسان اور انسان کے درمیان جو عدم اعتمادی پائی جاتی ہے اس کی وجہ محض یہی ہے۔ میری رائے میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہو سکتا ہے جہاں لوگوں کو ایک دوسرے پر کامل اعتماد ہو۔ ان کے دل

خوف سے یکسر خالی ہوں اور وہ خوش و خرم اور مطمئن زندگی گذاریں۔ ایسی صورت میں وہ تمام متذکرہ بالا رکاوٹوں اور مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔

مگر یہ ساری چیزیں تو اپنی جگہ رہیں انسان کو ایک نئی جنگ کا خوف لاحق ہو گیا ہے جو اس کی رگ رگ میں رچ بس گیا ہے اور وہ جب بھی اخبار دیکھتا ہے اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی نظر "جنگ چھڑ گئی" والی سرخی پر نہ پڑ جائے۔ آج کا دور اتنا ترقی یافتہ ہے کہ انسان نے آسمان کو چھونا باقی رکھا۔ آمد و رفت کی نئی نئی ایجادوں نے دنیا کو سکیڑ کر بالکل چھوٹی بنا دیا ہے انسان کے تصرف میں ہر قسم کی مشینیں ہیں جن سے وہ بھلے برے وقت میں بہت کام لے سکتا ہے۔ ایٹم سے صرف بم ہی نہیں بنائے جا سکتے بلکہ بہت سے دوسرے مفید کام بھی انجام دیئے جاتے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ انسان کا دماغ اس کی طرف مائل ہو اور اس کے دل سے ان ایٹمی ہتھیاروں کا خوف نکلے جو اس کے بنائے ہوئے ہیں مگر ان ہی کی وجہ سے ان کے دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی ہے۔

موجودہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں یقیناً پر امن اور پرسکون نہیں ہے۔ خوف اور امید دونوں میں کشمکش جاری ہے۔ کبھی خوف کا پلہ بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی امید کا۔ اور اگر خوف کا غلبہ ہو گیا تو کوئی عجب نہیں کہ دنیا تباہ ہو جائے۔ لیکن اگر انسان ہمت و جرأت سے کام لے اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو ہم دنیا کے مستقبل کی طرف سے ایک حد تک مطمئن ہو سکتے ہیں۔ انسانی ہنر، انسانی ایجادات، انسانی عقل و فراست اس نقطہ پر پہنچ چکی ہے کہ جہاں سے اپنے لئے امید کا انتخاب کر کے انسان اپنے آرام کیلئے بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اگر ہم مصیبتوں اور خوف میں گھرے ہوئے ہیں تو یہ اپنی ہی نادانی کی وجہ سے ہے اگر ہم اپنے دل و دماغ کے دروازے امید کے لئے کھول دیں تو یہ دنیا فوراً کبھی نہ خشک ہونے والے چشمے میں تبدیل ہو جائے گی اور یہاں خوشی، اطمینان، آسودگی آرام اور سکون سب ہی میسر آ جائیں گے۔

شامِ تنہائی

مدہوش بلگرامی

کچھ خبر ہے تجھے اے جانِ تمنا کہ حیات
ہجر میں کتنی پریشان ہوئی جاتی ہے
میری جاں سوز سلگتی ہوئی تنہائی سے
ایک دنیا ہے کہ انجان ہوئی جاتی ہے

تو جو تھی پاس تو محسوس کیا کرتا تھا
ایک بے نام سی منزل کا نشاں دل کے قریب
تیرے جانے سے ہوئی موجِ تلاطم کی اسیر
تھی جو ارمانوں کی کشتی میری ساحل کے قریب

عہد و پیمان وہ محبت کے تجھے یاد نہیں
آج تک مجھ سے کوئی بات بھلائی نہ گئی
اب بھی نظروں میں ہے میری وہ جدائی کا سماں
تیری تصویر محبت سے مٹائی نہ گئی

تھی جدائی جو محبت میں بچھڑنا ہی پڑا
سوچتا ہوں کہ یہ افتادِ محبت کیا ہے
آج سمجھا دیا قسمت نے چھڑا کر تجھ سے
درد کیا چیز ہے تنہائی فرقت کیا ہے

میں تو اک شاعرِ رسوا ہوں مگر یاد رہے
عشق بیتابیٔ فرقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اس حقیقت کو سمجھتے ہیں سمجھنے والے
زندگی دردِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

زندگی میری بہر حال گزر جائے گی
میں جیوں گا تیری یادوں کا سہارا لے کر
اپنی بے تاب امنگوں کو سکوں دے لونگا
تیری خاموش نگاہوں سے نظارا لے کر

بم اور ہم

ایس، ملگاؤکر

مجھے اُمید ہے کہ ہندوستان میں نیوکلیر یائی اہمیت کے حق میں جو جذباتی ابھار رونما ہوا ہے اس پر ہم سے بہتوں کو ایک ناگوار حیرت محسوس ہوئی ہوگی۔

یقین کا شعور کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔

بعض سیاسی پارٹیوں سے تو مجھے توقع تھی کہ وہ اس کی مہم چلائیں گی کہ ہندوستان کو بھی اب اپنا ایٹم بم بنانا چاہیے۔ مثلاً جن سنگھ اور سنیکت سوشلسٹ پارٹی کے لوہیا گروپ کی بابت میرا خیال تھا کہ ایسا ہوگا۔ بعض کانگریسیوں کی طرف سے بھی، جو پبلک طرز عمل کے اصولوں سے شیفتگی کے مقابلے میں موقع پرستی کے لئے زیادہ مشہور ہیں، اس مہم کی حمایت کے لئے میں تیار تھا۔ لیکن برسر اقتدار طبقہ کے کسی ذمہ دار آدمی کا پورے زور و شور کے ساتھ اس ٹولی میں شامل ہو جانا ایک بالکل مختلف چیز ہے اور جب وزیر دفاع مسٹر چوہان "صورت حال" کی ضروریات کو پیدا کرنے کے لئے "فعال اور حربی" دفاعی پالیسی کی بات کرنے لگیں، تو آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آپ کے لئے کرنے کو کچھ نہیں رہا ہے اور آپ بازی پہلے ہی سے ہار چکے ہیں۔

تردید

وزیر دفاع نے بیشک اپنے بیان کی دوسرے ہی روز تردید کر دی جس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو ان کے بیان کی رپورٹنگ غلط کی گئی تھی یہ کہ جتنا کہنے کی اُن کو اجازت تھی وہ اس سے زیادہ کہہ گئے تھے۔

[illegible] یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ چین کے دھماکہ پر انتہائی تشویش [illegible] کیا جانا صحیح ہے اور نہ ہم اس زبردست نفسیاتی نفع کو نظر انداز کر سکتے ہیں جو ایشیا اور افریقہ میں چین کو سفید فام اقوام کی نیوکلر اسلحہ کی اجارہ داری کو توڑنے والے پہلے غیر سفید فام ملک کی حیثیت سے پہنچے گا۔ چین کی نسلی جارحیت کے خلاف ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش میں ان براعظموں میں ہندوستان کو ناکامی ہوتی آ رہی ہے۔ یہ سب سے زیادہ ہم ہی جان سکتے ہیں کہ طاقت سے پیچھے ڈرا جاتا ہے اور کسی ملک کی مقبولیت کا تعلق حق و ناحق سے کہیں زیادہ اس کی قوت سے کیونکر ہوتا ہے۔

سکوت

خود بم کے معاملے کو لیجئے۔ مذمت کرنا تو بڑی بات ہے چین کی اس حرکت پر افسوس کا اظہار بھی صدر نکرومہ کے علاوہ پورے افریقہ میں کسی دوسری با اثر شخصیت کی جانب سے نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے عرب دوست بھی جو اس سے پیشتر نیوکلیرائی تجربات کی مخالفت میں ہم سب کے لئے مثال اور نمونہ بنے ہوئے تھے آج انکی خاموشی ہمارے لئے ایک معمہ ہے۔

سیاسی طور پر بم بنانے سے پہلے چین جتنا بڑا خطرہ تھا، بم بنا لینے کے بعد اس سے کہیں بڑا خطرہ ہو جائے گا، اسے تو طے شدہ ہی سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی طے شدہ ہے کہ اسے جو بھی سیاسی فائدے حاصل ہونگے ان کا خمیازہ ہندوستان کو بھگتنا پڑے گا۔

اس چیلنج کا مقابلہ ہندوستان کو ضرور کرنا چاہیے لیکن کیا اس کا مقابلہ چین ہی کے اکھاڑہ میں اور چین ہی کی شرطوں پر کیا جا سکتا ہے، جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ چین کے اکھاڑہ میں اور اس کی شرطوں پر ہم چیلنج کا پوری طرح مقابلہ کبھی نہیں کر سکتے۔

یہ مشورہ تو خوف اور سراسیمگی کا نمونہ ہوگا۔ ذرا آئیے تو جیسے حقائق کا تجزیہ کیجئے۔

آسان نسخہ

چینی بم کے پیدا کردہ ریڈیائی ذرات کے جو نمونے امریکی ہوائی جہاز لائے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ چین نے بم بنانے میں پلیوٹونیم کے بجائے یورنیم ۲۳۵ استعمال کیا تھا۔ یہ بات ایک خاص اہمیت رکھتی ہے ہائیڈروجن بم جو ایٹم بم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تباہ کن ہے اس کو داغنے کے لئے کسی وجہ سے پلیوٹونیم موزوں نہیں ثابت ہوا ہے۔

برطانیہ اور فرانس دونوں کے پاس پلیوٹونیم کافی مقدار میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بموں کے لئے بے انتہا مصارف برداشت کر کے ایسے کارخانے تیار کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں جن میں یورنیم ۲۳۵ بنایا جا سکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین نے ہائیڈروجن بم بنانے کا ایک آسان نسخہ ایجاد کر لیا ہے۔

اندازہ ہے کہ یورنیم ۲۳۵ کو علحدہ کرنے کے لئے اگر کارخانہ تعمیر کیا جائے تو اس کی لاگت پانچ سو کروڑ روپیہ کے لگ بھگ آئے گی کارخانہ بن جانے کے بعد اس کو چلانے کے لئے بھی بہت بھاری رقم درکار ہوتی ہے اور یہ سب ہندوستان کی اقتصادیات کے لئے جو یوں ہی بیمار ہے، ایک ایسا بوجھ ہوگا۔ جو اسے مفلوج کر کے رکھ دیگا اور اس طرح چین کا مقصد اگر وہ ہمارے خلاف بم استعمال بھی کرے تو اس سے زیادہ یقینی طور پر حاصل ہو جائے گا۔ ڈاکٹر بھابھا کے تخمینے کے مطابق ہم پلیوٹونیم بم ۱۰ لاکھ روپیہ فی بم کے حساب سے بنا سکتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ انہوں نے اس تخمینہ میں مناسب مقدار میں پلیوٹونیم بنانے کے لئے جو نئی بھٹیاں تعمیر کرنا پڑیں گی ان کی لاگت کو بھی شامل کیا ہے یا نہیں۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ ان کا تخمینہ صحیح ہے اور یہ خرچ ایسا ہے جسے ہم یقیناً برداشت کر سکتے ہیں لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا؟ ہمارے ہاتھ ایک ایسا بم آجائے گا جو پلیوٹونیم سے بنایا گیا ہوگا یعنی ہمارا بم چین کے بم کے مقابلہ میں بہت حقیر ہوگا اور اس طرح چین کی بابت

رکھتے کی اسکی صلاحیت بھی بہت محدود ہوگی ، تو ایسے ہتھیار بنانے کی طاقت حاصل کرنے سے فائدہ ؟ جس کے بارے میں ہم پہلے سے جانتے ہوں کہ وہ اس مقصد کے لئے ناکافی ہوگی جو ہمارے پیش نظر ہے ۔

ہم نے ابھی تک صرف بم تیار کر لینے کی بات کی ہے لیکن بم تیار کر لینے کے بعد ہم کیا کریں گے ؟ ہم اسے دشمن کے علاقے تک لیجا کر کس طرح گرائیں گے ؟ کیا کسی نے اس مرحلے کے اخراجات کا کچھ حساب لگایا ہے ، اور کیا کسی نے اس پر غور کیا ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے چین کے کسی ایسے علاقے پر جہاں اسکی ضرب واقعی محسوس کی جائے ، بم گرانے کے لئے ہماری پوزیشن کتنی دشوار ہے ؟ پیکنگ اور شنگھائی کی طرح کے چین کے مرکزی مقامات ہم سے تقریباً سوا ہزار میل کی دوری پر واقع ہیں اور منچوریا کے صنعتی مرکز اس سے بھی زیادہ دور ہیں اس کے برعکس ہندوستان کے بہت سے اہم مقامات تبت میں چین کے اڈوں سے پانچ سو میل کے اندر ہی ہیں اس طرح اگر ہم اپنی معقولیت میں نیوکلائی ہتھیار بنا بھی لیں تو ان کی جوابی اہمیت بہت محدود ہوگی ۔

چنانچہ موجودہ حالات میں ہمارے لئے اصل اہمیت کی بات چین کے جواب میں ایسا ہتھیار بنا لینا نہیں ہے جو اسے بہرحال ہمارے خلاف جارحانہ اقدام سے روک نہ سکے بلکہ یہ ہے کہ آیا ازراہ مذاکرات کوئی دوسری معقول صورت بھی موجود ہے ؟

جنگ کا امکان

میں نیوکلائی جنگ کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ چین کے نیوکلائی جنگ کرنے کا امکان عملاً بہت ہی کم ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس کا جواب وہ طاقتیں جو نیوکلائی اسلحہ کے بارے میں اس سے بہت آگے ہیں ضرور دیں گی ہم کو اس صورت پر ضرور اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ ایک ہم ہی ایسی چھوٹی طاقت نہیں ہیں جسے چین کے نئے اسلحہ خانے سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے ۔ ان دوسرے ممالک کا کیا ہوگا جو ہندوستان کے نیوکلائی طاقت بن جانے کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں ؟ کیا یہی وہ پاگل دنیا ہے جس کی تشکیل میں ہمیں حصہ لینا چاہئے ۔؟

مسئلہ کے اخلاقی پہلو کو ہم نے جس دن بھلایا اسی دن ہم برباد ہو جائیں گے ۔ ہم تو نیوکلائی اور تمام دوسرے اسلحہ کے خاتمے ایک منصفانہ اور شائستہ عالمی نظام کو وجود میں لانے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھنا چاہئے کیونکہ ہمارا اور کل بھلے ملک کا مفاد اسی میں ہے اور اس لئے کہ یہی وہ اقدار ہیں جو ہماری روایت میں داخل ہیں اور جو ہمیں گاندھی اور نہرو جی سے ملی ہیں ۔

بھرپور جواب

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کنیڈا نے اس ہندوستان کو ٹرامبے کی بھٹی بنائی ہے اور ایک اور بھٹی راناپرتاپ ساگر کے مقام پر بنانے کا وعدہ کیا ہے کہ ہم انھیں پرامن مقاصد کے لئے استعمال کریں گے ۔ کینیڈا اس کا پابند ہے کہ وہ اپنی نیوکلائی قوت اور صلاحیت کو جنگی مقاصد کے لئے نہیں استعمال کرے گا ۔ بلکہ ہم جس طرح کنیڈا کی امداد کو جس مقصد کے لئے وہ دی گئی ہے اس کے برعکس مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں ۔

چین کے چیلنج کا جواب دینے کا طریقہ دوسرا ہے سب سے پہلے ہمیں تعمیری کاموں پر بھرپور توجہ کرنا چاہئے دوسرے باہمی کفالت کے اصول کا ہمیں کھلے دل سے اقرار کرنا چاہئے دنیا اب اسقدر سکڑ گئی ہے کہ ہم اپنے مسائل کو تنگ قومی زاویہ نگاہ سے حل نہیں کر سکتے ہیں اور اس میں دفاع کا مسئلہ بھی شامل ہے ۔

اس کے جواب میں حسب عادت کہا جائے گا کہ یہ ناوابستگی نہیں ہے ۔ ناوابستگی کی تعریف ان چند برسوں میں اس قدر توڑی موڑی گئی ہے کہ ہم نے قاہرہ کانفرنس میں ناوابستگی کو ایک تیسری طاقت کی طرح ابھرتے ہوئے دیکھا ۔

ناوابستگی کو ایک مذاق بنا لیا گیا ہے ہم جیسے جیسے جیتے جاتے ہیں نئے نئے سبق سیکھتے جاتے ہیں ۔

آخر میں یہ دیکھ کر مجھے ہنسی آتی ہے کہ ناوابستگی سے زیادہ اہم نیوکلائی اسلحہ پر مسٹر نہرو کی پالیسی کے بنیادی اصول کو جو لوگ آج ترک کر دینے پر آمادہ ہیں وہی نہرو کے ترکہ کے خود ساختہ امین اور متولی بنے ہوئے ہیں ۔

اے۔ کے۔ بی۔ شیخ

ٹیلی سٹار

ایک زمانہ ایسا تھا جبکہ انسان کا ایکدوسرے کے قریب ئے بغیر بات چیت کرنا ناممکن تھا۔ اور ایک جگہ سے دوسری جگہ برسانی اور پیغام رسانی کا ذریعہ بھی صرف انسان ہی تھا۔ یہ بررساں اور پیغام رسانی گھوڑے یا اونٹ پر سوار ہو کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پیغامات بھیجا کرتے تھے۔ لیکن آج ہم کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہوں بڑی آسانی سے مطلوبہ انسان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔

۱۸۳۷ء میں سیموئل مورس نامی امریکی سائنسداں نے Telegraph ایجاد کیا جو آج بھی مروج ہے یعنی تار کے ذریعے خبریں اور پیغامات بھیجنا۔ اس ایجاد کے بعد ۱۸۷۶ء میں سر الگزنڈر گراہم بیل نامی سائنسداں نے ٹیلیفون ایجاد کر کے دور دراز مقامات کے لوگوں سے بات چیت کو آسان بنا دیا۔ ٹیلیفون کی بات چیت تاروں کے ذریعے دور دور تک سنی جا سکتی ہے۔ ہر ملک نے اس ایجاد کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ کھمبوں کے ذریعے ٹیلیفون کے تار ملک کے اندر باہر پھیلائے گئے ہیں اور کسی بھی شہر سے دوسرے کسی بھی شہر کو ٹیلیفون سے پیغام بھیجنا آسان ہو گیا ہے۔ ٹیلیفون کے تار صرف کھمبوں پر ہی نہیں لے جائے گئے ہیں بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو جو سمندر کے اس پار ہے سمندر میں CABLE ڈال کر ایک دوسرے کے قریب لایا گیا ہے۔ سمندری کیبل ۱۸۵۰ء میں پہلی بار استعمال کئے گئے تھے اور ملکہ وکٹوریہ اور صدر بکینن نے آپس میں پیغام بھیجا تھا اور ۱۸۶۶ء پہلی بار سمندری کیبل کے ذریعے انگلینڈ اور امریکہ میں بات چیت ہوئی۔

آج امریکہ برطانیہ جیسے بڑے ملکوں نے ملکر الاسکا سے ہوائی آئی لینڈ، جاپان، ویسٹ انڈیز اور یورپ میں کیبل کے سہارے ٹیلیفون کا جال بچھا دیا ہے۔ کامن ویلتھ کے ملکوں نے مل کر ایک کیبل برطانیہ سے لیکر جنوبی افریقہ، ہندوستان، پاکستان، سنگاپور، انڈونیشیا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک ڈال کر کامن ویلتھ کا رشتہ اور بھی گہرا کر دیا ہے۔

اور آگے

لیکن سائنسدانوں کی دوڑ مورس اور بیل کے ایجاد کئے ہوئے ٹیلیگراف اور ٹیلیفون تک ہی نہ رہی ۱۸۹۵ء میں مارکونی نامی سائنسداں نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا جس سے آواز بغیر کسی تار کے دور دور تک سنائی دینے لگی۔ اس آلے کا ایک چھوٹا سا نقشہ یہ ہے۔ آواز بھیجنے والی ایک ٹرانسمیٹر نامی مشین ہوتی ہے جس میں آواز کی لہریں الکٹرک کی لہروں پر سوار ہوتی ہیں آواز سے پر یہ الکٹرک لہریں ایریل یا ANTENNA کے ذریعہ فضا میں چھوڑی جاتی ہیں۔ یہ لہریں فضا میں روشنی کی رفتار سے چاروں طرف بڑھتی جاتی ہیں۔

اب دوسری طرف ریسیور نامی مشین رکھی ہوتی ہے۔ جس میں ان الکٹرک کی لہروں کو ایریل کے ذریعے چن لیا جاتا ہے اس کے بعد الکٹرک لہروں کو آواز سے جدا کر کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے باآواز بلند سنایا جاتا ہے اس آلے کا نام ریڈیو ہے۔

اس ایجاد کے بعد اس آلے کی RANGE بڑھتی گئی اور ۱۹۰۱ء میں ریڈیو کے اشارے انگلینڈ سے امریکہ کامیابی کے ساتھ بھیجے گئے اور ہم گھر بیٹھے دنیا کی خبریں بڑی آسانی سے ریڈیو کے ذریعے سن لیتے ہیں۔ ریڈیو لہروں کے استعمال سے ٹیلی پرنٹر جیسی مشینیں بھی ایجاد کی گئیں اور خبر رسانی کا کام ان مشینوں کے ذریعے آپ ہی آپ ہونے لگا۔

ٹیلی گراف، ٹیلیفون اور ریڈیو کی ایجاد اور ان کے استعمال کے بعد بھی سائنس دانوں کی دوڑ ختم نہ ہوئی۔ انھوں نے دنیا کا ہر گوشہ اپنی ایجاد کے اجالے سے روشن کرنے کی ٹھانی آج ہم دور کے ریڈیو کے پروگرام آسانی سے سن نہیں پاتے کیونکہ ریڈیو کی لہریں سفر میں کمزور ہو جاتی ہیں اور طاقتور ریڈیو کے بغیر ان کا سننا ناممکن ہے۔

لہروں کا سفر

ریڈیو کی لہروں کا سفر TRANSMITTING AERIAL سے چاروں طرف شروع ہوتا ہے کچھ لہریں سیدھی ریڈیو کے ایریل سے ٹکراتی ہیں اور کچھ لہریں فضا میں سیدھی چلی جاتی ہیں اور INOSPHERE نامی ہوا کے چھتے سے ٹکرا کر پھر واپس لوٹ آتی ہیں INOSPHERE ایک ایسا چھتا ہے جو کانچ کے مانند ہوتا ہے۔ جیسے اگر ہم کانچ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا عکس دیکھیں اسی طرح ریڈیو کی لہروں کا ہلکا سا عکس دنیا پر لوٹ آتا ہے۔

(A) اس طریقے سے سفر کرنے والی لہریں ریڈیو سے آسانی سے سنی جاتی ہیں لیکن (B) پر رکھے ہوئے ریڈیو کو یہ لہریں چھو نہیں پاتیں لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ

B پر رکھا ہوا ریڈیو بھی ہم کو سنائی دیتا ہے
سائنسدانوں نے اسکا سبب یہ بتایا ہے کہ ٹرانسمیٹر
سے نکلی ہوئی لہریں INOSPHERE
نامی فضا کے حصے سے ٹکرا کر دنیا پر واپس آتی ہیں
اور دور دور کے ریڈیو بھی خبریں یا پروگرام سن پاتے
ہیں۔

لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ B ۔ تک پہنچی ہوئی لہریں
کافی کمزور رہتی ہیں ان کمزور لہروں کو سننے کے لئے
طاقتور ریڈیو کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہر کوئی طاقتور
ریڈیو اپنے گھر رکھ نہیں سکتا کیونکہ ایسے ریڈیو کی
قیمت معمولی ریڈیو سے سات یا آٹھ گنا زیادہ ہوتی
ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے میں سائنسدانوں نے عجیب
عقل لگائی ہے RELAY STATION
نامی طاقتور ریلے سیٹنگ اسٹیشن سے پروگرام دوسرے
ٹرانسمیٹر کے ذریعہ فضا میں چھوڑا جاتا ہے اس طریقے
سے ریڈیو اسٹیشن کی EFFECTIVE AREA
اور بھی بڑھ جاتا ہے جیسے آج کل ہم ریڈیو سیلون سے
B.B.C. , VOICE OF AMERICA
یا آسٹریلیا کے کرکٹ کی کمنٹری ریلے کے ذریعہ آسانی
سے سن پاتے ہیں۔

ٹیلی وژن

آجکل امریکہ یورپ جاپان وغیرہ میں ٹیلیویژن کا
بہت استعمال ہو رہا ہے۔ ریڈیو کی عجیب وغریب ایجاد
کے بعد سائنسدانوں نے ریڈیو لہروں کے ذریعے فوٹو
بھیجنا بھی شروع کیا اب ریڈیو کے پروگرام کی طرح پروگرام بھی
دیکھنے لگے ہیں یہ نئے ریڈیو جن پر آواز کے ساتھ ساتھ
تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں ٹیلیویژن کہلاتے ہیں ریڈیو
لہروں کے ذریعہ فوٹو بھیجنا آواز بھیجنے سے کئی گنا مشکل ہے
اسلئے ایک ٹیلیویژن کے اسٹوڈیو سے نکلی ہوئی لہریں
اپنے اطراف کے چھوٹے سے ملک تک ہی جا سکتی ہیں۔
اسلئے امریکہ کا پروگرام صرف امریکی ہی دیکھ پاتے ہیں۔

اسیطرح یورپ اور جاپان اپنا اپنا پروگرام دیکھ سکتے ہیں
یورپ کا پروگرام امریکی نہیں دیکھ پاتے اور امریکہ یا کینیڈا
کے پروگرام یورپ والے نہیں دیکھ پاتے۔ کیونکہ ٹیلیویژن
کی لہریں ——— INOSPHERE
سے لوٹ کر بہت ہی کمزور رہ جاتی ہیں اور RELAY
STATION. سے ان کا پھر فضا میں چھوڑنا
کافی تکلیف دہ اور خرچیلا ہے۔
سائنسدانوں نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے
SATELLITE کا استعمال کیا اس
وقت امریکہ اور روس کے سائنسداں
SATELLITE بھیجنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اور ان
کے لئے ریڈیو اور ٹیلیویژن کی لہروں کو ———
SATELLITE سے ٹکرا کر اسی قوت سے واپس
لانا آسان ثابت ہوا اس ایجاد سے ایک ———

SATELLITE جو فضا میں چھوڑا جاتا ہے وہ
ریڈیو لہروں کا ——— آئینے کی طرح ———
REFLECT کرتا ہے اس ———
STELLITE میں ایک چھوٹا سا RELAY
STATION ہوتا ہے جو ریڈیو اور ٹیلیویژن کی
لہروں کو لیکر پھر دوبارہ فضا میں چھوڑتا ہے یہ دوبارہ
چھوڑی گئی لہریں کافی طاقتور ہوتی ہیں اور دور دور کے
ٹیلیویژن اور ریڈیو تک بڑی آسانی سے پہنچ سکتی ہیں۔
SETELLITE صرف آئینے کی طرح آواز
REFLECT کرتے ہیں انہیں ECHO
SATELLITE یا PASSIVE SATE
LLITE۔ کہتے ہیں اور جو SATELLITE
ریڈیو اور ٹیلیویژن کی لہروں کو اپنے چھوٹے
ٹرانسمیٹر سے پھر فضا میں چھوڑتے ہیں انہیں ACTIVE

ACTIVE SATELLITE
...بتے ہیں امریکی سائنسدانوں نے

آسمانی ریڈیو اسٹیشن

امریکی سائنسدانوں نے ACTIVE اور
PASSIVE پر ۱۹۵۰ء سے بڑے زوروں سے
...وع کیا اور ۱۲ اگست ۱۹۶۰ء کو ۱۰۰ فٹ کا پلاسٹک
...ا بنا ہوا غبارہ ۱۰۰۰ میل اونچائی پر دنیا کے اطراف
...نے لگا اس غبارے سے ریڈیو اور ٹیلیویژن کی لہریں
...واپس آنے لگیں اور ۱۹۶۲ء تک یہ غبارہ
PASSIVE یا ACTIVE SAT...
SATELLITE — کا کام
دیتا رہا۔ چونکہ ECHO SATELLITE
سے ٹوٹی ہوئی لہریں آتے آتے کمزور ہو جاتی ہیں اسلئے
ACTIVE SATELLI... کا استعمال سائنسدانوں
...نے آیا۔ اس ACTIVE SATELLITE کو جو
RELAY STATION ...ریڈیو کے
TELESTAR کا کام دیتا ہے
ہیں۔ TELESTAR میں مزید ترقیاں
...کے دسمبر سے متواتر ہو رہی ہیں اور ۱۰ جولائی
۱۹...ء کو ایک ۱۷۰ پاؤنڈ کا TELESTAR
— امریکہ کے کیپ کناورا سے اڑایا گیا جس
ذریعہ ٹیلیویژن امریکہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں
...ی دینے لگا۔

TELEST... کی کامیابی اس میں استعمال کی گئی
BATTERIE... ہے۔ پہلے بیٹریاں —
استعمال کی گئیں وہ آہستہ آہستہ اپنی طاقت کھو ... RE...
...ے اور کچھ دن بعد ACTIVE SATELLITE
RELAY کا کام بھول چکا تھا اب سورج
روشنی سے چارج ہونے والی بیٹریاں استعمال کی جا رہی ہیں
...وجہ سے RELAY کی مشین
...کا کام دے رہی ہے امریکی سائنسداں یہ بھی سوچ رہے ہیں

کر ٹیلیویژن کو POWERFUL بنانے کیلئے
ایک چھوٹا سا ATOMIC REACTOR
بھی TELESTAR کے ساتھ جوڑ دینے کا فی
بھی TELESTAR کو RELAY کرنے کر دیگا
اور TELESTAR اپنا کام اچھی طرح کریگا۔

اولمپک

اس سال ۱۹ اگست کو SYNCOM III
نامی TELESTR امریکہ نے فضا میں چھوڑا۔
اس TELESTAR کی یہ خاصیت ہے کہ یہ ایک ہی جگہ
پر یعنی — INTERNATIONAL
EQUATER اور DATE LINE
جہاں ایک دوسرے کو چھوڑتے ہیں اپنی جگہ فضا میں —
22300 میل کی اونچائی پر قائم رہیگا کیونکہ اسکی گھومنے
کی SPEED اور دنیا کے گھومنے کی
SPEED ایک ہی ہے۔ اس TELASTRR
کا مقصد یہ تھا کہ ۱۹۶۴ء کے اولمپک گیمس کو ہر ملک
اپنے ٹیلیویژن پر آسانی سے دیکھ سکتے اور یہ مقصد اس
SYNCOM III نامی TELESTAR نے
پورا کیا
Tokyo MEIJI OLYMPIC PARK
سے ٹیلیویژن کی لہریں KASHIMA
GROUND STATION کے AERIAL
یا ANTENNA — تک
لائی جاتی تھیں اور وہاں سے ۴۲ فٹ کے ایریل سے
SYNCOM III کے رخ میں چھوڑی
جاتی تھیں ان لہروں کو SYNCOM III
TELESTR دنیا کے ہر ملک میں بھیجتا تھا اسطرح ۹۴ دیس
اولمپک کے ہر ملک کے باشندوں نے اپنے ٹیلیویژن کے
پردے پر آسانی سے دیکھا۔ روس، برطانیہ اور امریکہ
کے سائنسداں اس طرح دوری کی دیوار توڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں
اور کچھ دن بعد ہم دور کے ملک کے باشندوں سے بات کرتے
وقت ایک دوسرے کو دیکھ بھی پائیں گے۔

بھر پلیٹ اور گاتے ہوئے آزادی کا جشن بھی منایا۔ مجاز کی آواز جس نے پوری نسل کو متاثر کیا ہے، اُن کا فن اور اُن کے خواب ہم سب کو بیحد عزیز ہیں۔

کیفی اپنی تقریر ختم کر چکے ہیں اور اب مشاعرے کا آغاز کر رہے ہیں۔ تقریباً تمام شعرا خوبصورت اور معیاری کلام پیش کر رہے ہیں اور ذہین و باذوق سامعین بھی جی کھول کر داد دے رہے ہیں،

رات کسقدر گذر چکی ہے، اس کا احساس کسی کو نہیں ہے۔ نیاز حیدر، ساحر لدھیانوی، باقر مہدی، جگن ناتھ آزاد مظفر شاہجہانپوری، آوارہ سلطانپوری، عزیز قیسی، عزیز جاوید ظفر گورکھپوری، حمید سوروی اور دوسرے کئی شاعر اپنا کلام سنا چکے ہیں۔ صدر جاں نثار اختر مشاعرہ برخاست کر رہے ہیں جو آخر تک قابلِ رشک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔

شامِ بہاراں

۱۱ دسمبر کی رات میں رنگ بھون میں ہندوستانی بک ٹرسٹ کی جانب سے ایک شعر و نغمہ کی تقریب منعقد ہوئی یہ تقریب دراصل "کبیر دن" کے سلسلے میں تھی اور اس کا مقصد دیوان کبیر کو منظرِ عام پر لانا تھا جسے سردار جعفری نے مرتب اور ہندوستانی بک ٹرسٹ نے شائع کیا ہے لیکن یہ دونوں مقاصد پتہ نہیں کہ کیوں اُجاگر نہ ہو سکے۔ ایک وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ مشاعرے کے ساتھ جو فلمی شخصیتوں کی نغمہ سرائی کا پروگرام تھا وہ اتنا چکا چوند تھا کہ ایک سنجیدہ مقصد ہاتھ سے نکل گیا۔

رنگ بھون کے مشاعرے "جو عموماً آل انڈیا قسم کے ہوتے ہیں مشاعرے کم اور کمال سر اور گلے کے مقابلے زیادہ ہوتے ہیں لیکن اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں چند شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا یعنی ایسے شاعر جو عرفِ عام میں مشاعرے کے شاعر نہیں کہے جا سکتے یوں کہنے کو تو سبھی شاعر تھے۔

اس مشاعرے میں پاکستان سے فیض بھی آنے والے تھے لیکن پچھلے دنوں پاکستان میں طلباء کے جو ہنگامے ہوئے ان وجہ سے فیض نے عین وقت پر آنے سے مجبوری ظاہر کی اور فیض کے ہزارہا شائقین کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا ہے جیسا ابھی یہ صورت آل انڈیا مشاعرے منعقد کئے جاتے ہیں ان کی کامیابی کے لئے اب گانے والے شاعروں کی صلاحیتوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس قسم کے مشاعروں میں شعر تو پہلے ہی نہیں اب گلا بھی ناکارہ ثابت ہو رہا ہے شاید اسی وجہ سے مشاعرہ کرنیوالوں کو دونوں قسم کے شاعروں سے قطع نظر فلمی شہرت رکھنے والی شخصیتوں کا بھی سہارا لینا پڑ رہا ہے، شاید اسی لئے اس مشاعرے میں دلیپ کمار، مینا کماری اور رفیع کی شرکت ضروری سمجھی گئی اور اس تقریب کو شاعری کا سیدھا سادا نام دینے کے بجائے "شامِ بہاراں" کہا گیا۔

اس تقریب کے منتظمین کو اس اقدام سے یقیناً مالی منفعت ہوئی ہوگی لیکن میری دانست میں یہ اقدام شاعری کے INSTITUTION کے لئے کافی خطرناک ہے۔ ،

تقریب کے منتظمین کا فلمی شخصیتوں کو مشاعرے میں بلوانا خود اس بات کا اعتراف ہے کہ اب صرف شاعروں سے مشاعرے کامیاب نہیں ہو سکتے اور اب مشاعروں کو "شامِ بہاراں" یا "شبِ غزل" کا نام دیدینا چاہئے۔ وہ دن واقعی بڑا افسوسناک ہوگا جب ہم اس خالص ادبی سنجیدہ اور شریفانہ اجتماع کو سستے قسم کے ذرائع سے کامیاب بنانے پر اتر آئیں گے۔ جب ہندوستانی بک ٹرسٹ جیسی اہم اور دور رس شخصیتیں بھی ایک شاعرہ کو بغیر ساز و آواز و انداز کے کامیاب نہیں بنا سکتیں تو نسبتاً کم اثر و رسوخ رکھنے والے بیچارے آل انڈیا مشاعرے کس بوتے پر کرینگے ہمارے مشاعرے جو بڑے قدیم اور حسین تہذیبی روایت ہیں دھیرے دھیرے تجارتی نقطۂ نظر اختیار کرتے جا رہے ہیں اس طرح سے ایک بڑے ہی خوبصورت ادبی اور تہذیبی ورثے کے خاتمے کی ابتدا ہو چکی ہے۔

اس مشاعرے میں سامعین کم اور تماشائی زیادہ تھے۔ فراق، مخدوم، سردار جعفری، وحید، جاں نثار اختر کیفی، ساحر۔ جیسے شاعروں کے سننے اور سمجھنے والے تو خاص مشاعروں میں بھی کم ہی ہوتے ہیں یہاں کیا خاک ہوتے جہاں دلیپ کمار، مینا کماری، اور رفیع کے پرستاروں سے ہال بھرا ہوا تھا۔ دلیپ کمار جیسے گیٹ تھے انھوں نے "کبیر دن" کا افتتاح میر کی غزل گا کر کیا۔ وہ بڑے فلمی آرٹسٹ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ریہرسل کے قائل نہیں لیکن اس ایداد میں یقیناً انھیں ریہرسل کرنے کی ضرورت تھی۔ ان کے بعد مینا کماری نے طبعزاد اور رفیع نے بھی غزلیں سنائیں جنہیں عوام نے بہت پسند کیا اور دل کھول کر داد دی لیکن یہ دادِ شعر کے لئے نہیں تھی۔ صلاصف اول کے شاعروں کے مقابلے میں ان فلمی شعروں کی کیا بیش جاتی۔ ہمارے ادبی شاعروں کے مقابلے میں ان کی قیمت حیثیت اور قدر فلمی شاعروں جیسی تھی جن کی شہرت اور مقبولیت اور زندگی صرف ایک فلم کی نمائش تک ہوتی ہے۔

اس تقریب کے کرتا دھرتا سردار جعفری تھے، ان کی انتظامی صلاحیتوں سے اُن کے کٹر سے کٹر مخالف کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کئی کمزوریوں کے باوجود یہ مشاعرہ بہت کامیاب رہا جسکا کھلا ہوا ثبوت ہزاروں سامعین کی موجودگی اور ۵۰ روپئوں کی ٹکٹوں کی نایابی تھی لیکن بعض اوقات جعفری صاحب صورت یا نہ جانے کس جیسے کو لیکر بحث کر بیٹھتے ہیں جیسا ان کا کمیٹ موضوع بحث بن جاتی ہے جعفری صاحب اس سال مشاعرہ میں کچھ ایسے شاعروں کو دور دراز مقامات سے بلوا کر پڑھوایا جن کی شاعرانہ شخصیت کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی مشتبہ سی ہے جبکہ بمبئی کے نوجوان اور اچھے شعر کہنے والوں کو مشاعرہ پڑھنے کی کہاں تک کی دعوت بھی نہیں دی گئی۔ جعفری صاحب ایک ایسا سنگم ہیں جہاں قدیم اور جدید دونوں نسلیں آکر ملتی ہیں۔ وہ نوجوان نسل کے حقوق کے لئے ہمیشہ کے لئے ہمیشہ لڑتے ہیں ان کی بھرپور نمائندگی کے قائل ہیں لیکن جب واقعی انہیں نمائندگی دینے کا وقت آتا ہے تو یہ سنگم چھوٹی گہری میٹھی پانی کی ندیوں سے اپنا منہ موڑ لیتا ہے۔ اور خس و خاشاک کے لئے اپنی آغوش وا کر دیتا ہے۔ نئی نسل پہلے ہی سے اپنے بزرگوں سے شاکی اور بدظن ہے اس قسم کی باتوں سے شکایت اور بدظنی اور جڑ پکڑتی ہے۔ کیا ہی بہتر ہو جعفری صاحب آئندہ اس نسل کو اپنے ہمراہ لے کر چلیں۔

تبصرے

تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے

●

خلش

خلش سیفی بریلی کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اسمیں
یں بھی شامل ہیں۔۔

سیفی بریلی نوجوان شاعر ہیں لیکن اُن کے کلام سے
تا ہے کہ وہ کسی بھی جدید مکتبۂ فکر سے متعلق نہیں ہے
ملنے میں ہماری شاعری میں دو اسکول ہوا کرتے تھے۔
سکول اور لکھنؤ اسکول اور حال حال تک اکثر شعرا ایک
اسکول سے اپنے کلام کے اعتبار سے وابستہ سمجھے جاتے
لیکن خالص غزل کے شاعر ہونے کے باوجود سیفی بریلی کا تعلق
ھنؤ سے نظر آتا ہے اور نہ دہلی سے کیونکہ خلش میں ہمیں
ھنؤ اسکول کی زبان کی نزاکتیں ملتی ہیں اور نہ دہلی اسکول
لہ رکھاؤ۔

دیباچے میں خلش صاحب نے اپنی شاعری کو داخلی
یات کے ساتھ ساتھ خارجی حقائق کا مظہر بھی بتایا ہے لیکن مجھے
ا محسوس نہیں ہوتا۔ خارجی عوامل سیفی صاحب کی شاعری
موضوع نہیں رہے یا کم از کم ان کی شاعری نے براہ راست
رجی حالات سے اثر قبول نہیں کیا ممکن ہے بالراست کہیں
ہیا وقت کے تقاضوں کی ترجمانی ملتی ہو لیکن یہ شعوری نہیں
شعوری جذبے کے تحت آئی ہے لیکن اس بارے میں ہمیں سیفی
حب سے شکایت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ داخلی یا خارجی اثبا
سے متاثر ہونے کا تعلق شاعر کی افتاد طبع سے ہوتا ہے۔

لیکن داخلی کیفیات کی ترجمانی میں
ا ہمیں خلش میں وہ حسن نہیں ملتا جس کی امید ہمیں غزل کے خالص
دایتی شاعر سے کرنی چاہئے۔

اکثر غزلیں پرانی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ یہ کوئی بری بات
نہیں ہے لیکن جب تک ایک دو شعر غیر معمولی نہ ہوں بات نہیں
بنتی۔ غزلیں ناک نقشے سے درست ہیں لیکن ان میں جذبے کی
گہرائی اور آنچ نہیں ملتی۔ اکثر جگہ اشعار کا مفہوم واضح نہیں ہو تا
مثلاً یہ شعر

آج ان کی گزرگاہ میں ہم اور بڑھاتی ہیں
تابش کو چھپا لیتی اب کا کہکشاں اپنی

●

یوں تو جنت ہیں وہ لب و رخسار
صبح فرقت بڑی بھیانک ہے آج

●

کھلی کھلی لب و عارض میں کیفیات بہار
شراب بن کے لہو بھی ترے بدن میں ہے

●

مسجدوں میں بھی وہی ہے جو صنم خانوں میں
نام اس شوخ کا رسوا ہوا انسانوں میں

●

ہر زبان پر آ گیا ان کی طرح داری کا نام
لوگ انھیں زیر نقاب پیرہن کہتے رہے

●

دن کی پامال فکر کو ہے شرط
تیری جانب سفر چراغ جلے

مرحوم جگر صاحب نے کہا تھا کہ اگر آج کی غزل میں دو چار شعر بھی
کام کے نکل آئیں تو بڑی بات ہے اگر اس معیار پہ رکھ کر سیفی صاحب
کے کلام کو جانچا جائے تو بلا شبہ ان کی غزلوں میں ہمیں اچھے شعر
بھی مل جاتے ہیں مثلاً

منظر عام پہ آنے کی جسارت بھی گئی
کتنے دل جرم کے اقرار تک آ پہنچے تھے

●

اس طرف دیر و حرم خوب سجے ہیں لیکن
تیری محفل کے مقابل نہیں ہونے پائے

●

غم فراق کو ہم خوش گوار کر لیتے
تمھارے نام سے ذکر بہار کر لیتے

●

پہنچ رہا ہے دلوں تک یقین نور سحر
گمان شب ہے کہو راستے سے ہٹ جائے

●

غم حیات کو یوں پی گئے جو دیوانے
تری نگاہ سے چھلکی ہوئی شراب نہ ہو

مجموعے کی طباعت و کتابت گوارا ہے قیمت دو روپئے
ہے۔ ملنے کا پتہ ہے۔ ظفر منزل جامع نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شعریہ شورشہ

شعریہ شورشہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی غالباً پہلی
کتاب ہے جس میں شعروں کے سہارے کارٹون شائع کئے گئے ہیں۔
شعروں کی تصویریں یا شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اُسے
ILLUSTRATE کرنے کا تجربہ بہت پرانا ہونے کے
ساتھ ساتھ ناکام بھی ہو چکا ہے۔

ذ اغالب کے شعروں کی تفسیر تصویروں کے ذریعہ پیش
کرنے کی ابتدا سب میں پہلے عبدالرحمن چغتائی نے کی تھی اور
یہ فن انہیں پر ختم بھی ہے۔ اگر چغتائی صاحب اپنے تجربے
میں کامیاب ہوتے تو یہ فن یقیناً ترقی کرتا اللہ آرٹ
موسیقی یا مصوری کی طرح بہت مقبول ہوتا لیکن خیال
کی تصویر پیش کرنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے اور کم
از کم ہم نے آج تک غالب کے کسی شعر کی ایسی کوئی تصویر
نہیں دیکھی جسے دیکھ کر خیال اسی شعر کی طرف جاتا ہو جس کی
وہ تصویر ہے۔

شعریہ شورش کے ذریعہ وہاب حیدر نے بھی ایک تجربہ کیا ہے اس تجربے کی ابتدا انھوں نے اخبار دوں کے ذریعہ کی۔ ان کے بنائے ہوئے کارٹون اردو کے روزناموں میں چھپتے رہے اور لوگوں کے لئے تفریح کے ساتھ کبھی کبھی غور وفکر کا ساماں بھی فراہم کرتے رہے۔ طنزیہ کارٹونوں میں غور وفکر کا عنصر زیادہ ہوتا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تجربے میں کامیاب ہونے کی کتنی قوت ہے۔

یہ کہنا نا اصل ہے کہ وہاب حیدر کے کارٹون امید سے زیادہ مقبول ہوئے ورنہ آج آپ انھیں کتاب کی صورت میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہاب حیدر نے شعریہ شورش میں غالب کے ۵۰ شعروں کا خاکہ اڑایا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ ہر کارٹون کا اہم کردار خود مرزا غالب ہیں۔ اس سلسلے میں وہاب حیدر ٹائمز آف انڈیا کے کارٹونسٹ لکشمن سے متاثر ہوئے ہیں جن کے کارٹون You Said it میں ایک بوڑھا کردار ہمیشہ موجود رہتا ہے جو بالکل معصوم ہے۔ سب کچھ دیکھتا ہے سنتا ہے مگر کچھ نہیں کہتا۔ تصویر حیرت بنا ہر برائی اور گناہ کا شاہد ہے لیکن وہاب حیدر نے اپنے اہم کردار غالب سے اکثر موقعوں پر بڑا خوبصورت کام لیا ہے۔

اکثر کارٹونوں میں غالب صرف خاموش تماشائی ہی نہیں بلکہ ڈرامے کے ایک ایڈونچرس ہیرو بھی ہیں۔

انھوں نے اپنے کارٹونوں میں غالب کو ہر رنگ میں دکھایا ہے۔ لیڈروں کے حلقے میں۔ فلم اسٹاروں کے ساتھ۔ ٹیڈی گرلز کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے۔ غم روزگار سے تنگ آکر خودکشی کرتے ہوئے۔ پولیس اسٹیشن اور عدالت میں غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں لے کر نہ گئے ہوں کر وہاب حیدر نے غالب کے شعروں کے تیر اپنے کارٹونوں کی صورت میں مارے ہوں اور اکثر تیر بہت کاری ہیں۔

گو کارٹونوں کا تعلق بالکلیہ مزاح سے ہوتا ہے لیکن پچھلے ۲۵ / ۲۰ سالوں کے کارٹونوں میں مزاح کا عنصر کم طنز کا زیادہ ہو گیا ہے۔ انگریزی کارٹونسٹ تو جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے کارٹونوں میں گہرے اور تیکھے طنز کا موجد اور ماہر سمجھا جاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لندن کے اکثر لوگ لندن ٹائمز صرف لو کے کارٹونوں کے لئے خریدتے تھے ہماری صحافت میں کارٹونوں کو ابھی وہ اہمیت تو حاصل نہیں جو ترقی یافتہ ملکوں اور وہاں کے گہرا سیاسی شعور رکھنے والے عوام میں ہے۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ اخبار خریدتے ہوئے لوگوں کی نظریں سب سے پہلے وہاب حیدر کے کارٹون شعریہ شورش کو ڈھونڈتی تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاب حیدر کے کارٹونوں نے عوام کے سیاسی اور سماجی شعور کی تہذیب میں نمایاں نہ سہی ایک خاموش حصہ ضرور لیا ہے۔

شعریہ شورش میں کچھ کارٹون تو غالب کے اشعار کے مصداق "از دل خیزد بر دل ریزد" قسم کے ہیں چند ایسے ہیں کہ متین اور سنجیدہ لوگ بھی قہقہہ نہ سہی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور چند کارٹون ابرو پر بل لے آئیں گے لیکن وہاب حیدر کے فن کی داد دئے بغیر شاید ہی کوئی رہ سکے۔

چند لوگوں کا خیال ہے کہ شعریہ شورش کا سلسلہ شروع کر کے وہاب حیدر نے غالب کی مٹی پلید کی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس میں غالب کی تضحیک کا پہلو قطعاً نہیں نکلتا نہ تو انھوں نے غالب کے اشعار کا مفہوم توڑ مروڑ کے پیش کیا اور نہ ہی انھیں کارٹونوں کی شکل دے کر ان کی عظمت کو کم کرنا چاہا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہاب حیدر نے اپنے فن کے اظہار کے لئے غالب ہی کا انتخاب کر کے اسے اور عظیم بنا دیا ہے ورنہ غالب سے پہلے ان کے بعد بھی کئی شاعر گزرے ہیں۔ حیدر ریحانی نے اس تعلق سے بڑی اچھی بحث کی ہے ان کا پیش لفظ بڑا ٹھوس۔ جامع اور متاثر کن ہے لیکن انھوں نے اخترالایمان پر جو نشتر لگایا ہے اس سے میں متفق نہیں ہوں شعر شورش کے باوجود شاعری اور کارٹونوں میں بڑا فرق ہے۔ دونوں کی اپیل کے حدود مختلف ہیں اور لطیف میں ہیں بہرحال امتیاز کرنا ہوگا دونوں کا مخاطب ایک ہی ہے لیکن اس درجہ کا فرق قائم ہے۔

وہاب حیدر نے غالب کے اشعار پر شورش مچانے میں یوسف ناظم نے مقدمہ لکھ کے ایک بہترین شوشہ لگا...

یہ کتاب اردو دان عوام کے ساتھ ساتھ ہندی والوں کے لئے بھی ہے۔ کارٹونوں کی تو کوئی زبان نہیں ہوتی۔ غالب کے اشعار ہندی میں بھی لکھ دئے ہیں تاکہ ہندی والے بھی اس کتاب سے لطف اندوز ہو سکیں۔

کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہے —— سرورق "مجھے خرید لو" کی کشش رکھتا ہے۔ کتاب کے لئے وہاب حیدر۔ کریمی ہوسٹل ۱۵۶ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی ۳ کو لکھئے۔

تبصرے کیلئے وصول شدہ کتابیں

کتاب	مصنف / ناشر
رخسار سحر	خورشید احمد جامی
بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات	شانتی رنجن
گریۂ شبنم	نیائے شرما
آنسو اور موتی	نیائے شرما
روح اسلام	ڈاکٹر غلام عرفان
صبح	انجمن ترقی اردو
مجلہ سیفیہ	سیفیہ کالج بھوپال
بند کواڑ	نریندر لوتھر
پیام تعلیم	مکتبہ جامعہ
جذبات و احساسات	حیدر دہلوی
لہر لہر ندیا گہری	زبیر رضوی
دیدۂ بینا	کوثر چاندپوری
قومی کتابیات	حکومت اترپردیش

ادبی اور تہذیبی خبریں

- ۲۶ر جنوری ۱۹۶۵ سے بمبئی سے ایک نیا ہفت روزہ "آئینہ" نکل رہا ہے جسے ظ۔ انصاری ترتیب دینگے۔ یہ ہفتہ وار فوٹو آفسٹ پر شائع ہوگا

- ساحر اور بھارت ویژن کا تنازعہ ہائیکورٹ تک پہنچ گیا۔ صد بت کا کہنا ہے کہ ساحر نے اُن کی فلم "دوج کا چاند" کے گانے ٹھیک طرح نہیں لکھے جس کی وجہ سے اُن کی فلم کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ ساحر نے معاہدہ کی رو سے ۳۰ ہزار کا مطالبہ کیا ہے۔ عدالت نے دونوں کو آپس میں تصفیہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

- سردار جعفری جلد ہی ایک نئی فلم بنانے کا اعلان کرنیوالے ہیں۔ اس فلم کی کہانی اور مکالمے خود ان کے لکھے ہوئے ہونگے اور وہ اسے پروڈیوس بھی کرینگے۔

- بمبئی کے شاعر و ادیب ایک "رائٹرس کو اپریٹو ہاؤزنگ سوسائٹی" کے قیام کے بارے میں سوچ رہے ہیں اس سلسلے میں کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ جاں نثار اختر۔ ساحر لدھیانوی۔ عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں مہاراشٹر کے چیف منسٹر نائک سے ملنے والے ہیں۔

- یوسف ناظم کے مزاحیہ مضامین کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔ پہلا ایڈیشن ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد نے پچھلے سال شائع کیا تھا۔ دوسرا ایڈیشن میر اینڈ کمپنی دہلی نے شائع کیا ہے۔

- کے۔ آصف نے اپنی نئی فلم کے لئے مخدوم محی الدین سے چار گانے لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ اطلاع ہے کہ مخدوم اس سلسلے میں بمبئی آئے ہوئے ہیں۔

- جاں نثار اختر کی فلم "بہو بیگم" اگست ۶۵ء میں نمائش کے لئے پیش کی جائیگی۔ جاں نثار عنقریب ایک اور فلم بنانے کا اعلان کرنیوالے ہیں۔

خطوط

میرزا عزیز جاوید — بمبئی

واحد پریمی کے نام سے چھپا ہوا خط — پڑھ کر ترس کھانے کی ایک چیز ہے! اس خط کی بہت سی کارآمد باتوں سے قطع نظر میں صرف دو باتوں کا جواب دینا مناسب سمجھتا ہوں پہلی بات تو یہ کہ لائق معترض نے میری نظم "ہجر کے سائے" میں لفظ سہم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ "سہم" خلافِ وزن نظم ہوا ہے، شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہونگے کہ لفظ "سہم" بالجزم ہے۔ ہاں عربی میں ضرور ہے اور اس کے معنی حصہ بخرے کے ہیں۔ اسی سہم سے مشتق لفظ سہیم ہے جسکے معنی حصہ دار اور شریک کے ہیں لیکن فارسی میں (سہم) بغیر علامت سکون کے ہے یعنی متحرک ہے اور اس کے معنی ڈر، خوف اور ہیبت کے ہیں لائق معترض تعلیمًا جدید نسیم اللغات صفحہ ۵۹۶ کسی سے ملاحظہ کروالیں اس خط کی دوسری بات جو نظم (ہجر کے سائے) پر مجموعی اعتراض کی صورت میں ہے اس کے لئے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ کل کے ماہنامہ اسلام پر رد وقدح کرنے والوں کا اعتراض تو آج کی شاعری پر اعتراضًا سنا بھی جاسکتا ہے لیکن ان کی باتوں پر کون کان دھرے جنکی لکھائی پڑھائی اپنی شاعری سے زیادہ محنت کر کے کسی جریدے کے ایڈیٹر کے نام خط تمام کرنے تک محدود ہو۔ اب رہی زادین کی بات تو عرض ہے کہ یہ حضرات ہر اضافتی اور عطفی تراکیب پر زادین لگا کر طنز کی دھار تیز کرنے پر مصر ہی ہیں تو اپنے ناموں اور تخلصوں پر بھی زادین لگا لیا کریں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

رفعت سروش — دہلی

ایک عرصے سے آپ کو خط نہیں لکھا۔ بمبئی میں دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔ چھٹی کم تھی، اور مشاعرہ میں جو کوفت ہوئی اس سے اور چڑ ہوگئی تھی۔ آپکے مشاعرہ کی رپورٹ بہت ہی عمدہ چھاپی تھی اس زورِ قلم پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، گذشتہ دنوں کے کچھ شماروں میں بھی اچھی اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں مگر بس خط نہیں لکھ سکا۔ یہ ۳۰ اکتوبر کا شمارہ ہے جسمیں ۲۰ تین روز تک نہیں، غالبًا شاید ۳۰ نومبر کا ہونا غلطی سے ۳۰ اکتوبر چھپا ہے۔ اس میں محمد علوی اور فدا کی دو نظمیں ہیں دونوں نئی نظم کے اچھے نمونے ہیں۔

ممتاز راشد — اجمیر

تقریبًا دو مہینے سے "زادین" کا چکر چل رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ اس بحث کو ختم کرو۔ جیسے ظفر صفی اگر وہ زادین "ء" کا استعمال کرتے ہیں تو ادب کو کوئی نقصان پہنچنے سے رہا یا اگر وہ استعمال نہ کریں تو کوئی فائدہ ہونے سے رہا۔ اس بحث کو یہیں ختم کر دیجئے اور بھی دوسرے بہت سے موضوعات بحث کے لئے ہیں۔ میرے پاس "دورِ حیات" پابندی سے نہیں آتا اسلئے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ پھر بھی اسی شمارے میں تمنا فاضلی نے تجریدی نظم کی جانب کچھ اشارے کئے ہیں۔ یہ میدان بہت وسیع ہے۔ "جدید نظم" کے نام پر کیسی کیسی الجھنیں ذہن میں سر اٹھاتی ہیں۔ اس موضوع کو بھی منتخب کیجئے

اب کی بات

دورِ حیات کا زیرِ نظر شمارہ تین شماروں کا مشترک نمبر ہے۔ اس سے تاخیر کا وہ داغ دھل جائیگا، جو ایک مدت سے دورِ حیات کے دامن سے چپکا ہوا تھا۔ اس مشترک نمبر سے نہ آپ نقصان میں نہ ہم فائدے میں کیونکہ یہ ۴۰ صفحے کا ایک ضخیم نمبر بن گیا۔

●

من آں ستارۂ صبحم کہ در طلوعِ سحر
ہمیشہ پیش روِ آفتاب می باشم

عرفی نے یہ شعر کسی اور موقع کے لئے کہا تھا۔ لیکن دورِ حیات کا یہ شمارہ آپ کی خدمت میں ستارۂ صبح بنکر ایک آفتاب کی آمد کی بشارت دے رہا ہے۔ یہ آفتاب سالگرہ نمبر کی صورت میں جلوہ گر ہوگا جو اس ماہ کے ختم تک آپکے ہاتھوں میں ہوگا۔

●

اس شمارے میں منظور حسین شور کی نظم اور جمیل مظہری کی غزل کے چار شعر بہت وزنی ہیں۔ ظ۔ انصاری اور یونس ادیب نے اردو کی دو بڑی شخصیتوں کا انتقادی جائزہ لیا ہے۔
ظ۔ صاحب کا یہ مضمون کئی سالوں پہلے کا ہے لیکن اس میں وہی آنچ ہے جو آج کے ظ صاحب سے عبارت ہے
ایم۔ ٹی۔ کے تعلق سے دو مضامین ہیں دونوں پڑھنے کے لائق ہیں گو ان کا موضوع الگ الگ ہے۔ اسی طرح سدھراج ڈھڈا کا مضمون جو ہماری اقتصادیات سے بحث کرتا ہے کافی اہم ہے۔

اداریہ

آج اردو کے کسی پرچے کو چار سال تک زندہ رکھنا اور وہ بھی "دورِ حیات" جیسے پرچے کو جس میں عورتوں کے جسم کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے سستے قسم کے جذباتی افسانوں، جنسی موضوعات پر ہابتی کاتی نظموں، سنسنی خیز خبروں اور سب سے بڑھکر اوٹ پٹانگ فلموں کیسلئے متعلق جگہ نہ ہو ایک معجزے سے کم نہیں۔ شاید ان "چکا چوند" چیزوں کی غیر موجودگی ہی کا نتیجہ ہے کہ "دورِ حیات"، اتنا نہیں چلا جتنا ایک پرچے کو چار سال میں چلنا چاہیئے تھا۔ اسکی اشاعت کبھی دو ہزار سے آگے نہیں بڑھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر "دورِ حیات" کے کئی ہمدردوں نے "دورِ حیات" چلانے والوں کو بار بار رائے دی کہ یا تو پرچے کو آجکل کے "معیار" کے مطابق ڈھالا جائے یا نہیں تو پھر اسے بند کر دیا جائے۔ لیکن نہ تو اسے موجودہ "معیار" کی سطح پر لایا گیا اور نہ ہی بند کیا گیا اور یہ دونوں حقیقتیں ان ثابت قدم لوگوں کے عزم کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو "دورِ حیات" کی زندگی کے ذمہ دار ہیں۔

جس طرح ہر کام کے پیچھے کسی نہ کسی مقصد کا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ہر رسالے کے پیچھے ایک نہ ایک مقصد ہوتا ہے (ادب کی خدمت آجکل کوئی مقصد نہیں رہا) "دورِ حیات" کے اجراء کے آگے بھی ایک مقصد تھا اور وہ مقصد تھا اردو داں عوام کو زندگی کے نئے تقاضوں سے روشناس کرانا۔ ان میں ادب کے تقاضوں کو کم اور اقتصادی، سماجی، معاشی اور صنعتی تقاضوں کو زیادہ اجاگر کرنا تھا۔ لیکن ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ "دورِ حیات" اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی زیادہ تر ذمہ داری اردو داں عوام پر ہی عائد ہوتی ہے جن کو لذیذ افسانوں، چٹ پٹی قسم کی نظموں، رنگا رنگ خبروں اور چار دن جیسے والی فلمی شخصیتوں کے بھید جاننے کی چاٹ سی پڑ گئی ہے انھیں کوئی چیز منھ کو نہیں لگتی۔ ذرا آپ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی طرف بڑھے اور انھوں نے بُرا سا منھ بنایا۔ "دورِ حیات" کو شاید اسی لئے خشک پرچہ کہا جاتا ہے۔

اردو کے پرچے نکل رہے ہیں اور نکلتے رہیں گے۔ لیکن جب تک ان کے پیچھے کوئی ٹھوس اور تعمیری مقصد نہ ہو ان کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ "دورِ حیات" کو کم از کم یہ سکون تو حاصل ہے کہ اس نے ایک اچھے مقصد کی طرف قدم بڑھایا تھا۔

"دورِ حیات" کا یہ سالگرہ نمبر اپنی "خشک" پالیسیوں سے وقتی طور پر ایک گریز ہے۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ منھ کا ذائقہ بدلنے کے لئے یہ گریز ضروری بھی ہے۔

اس نمبر میں بڑے نام بھی ہیں اور چھوٹے بھی۔ پرانے لکھنے والے بھی ہیں اور نئے بھی۔ لیکن ساری تخلیقات اعلیٰ درجے کی سند کی مستحق ہیں۔

یہ نمبر ہمارے ادیبوں کی دو نسلوں کا خوشگوار امتزاج بھی ہے اور اس کا ثبوت بھی کہ "دورِ حیات" کو ہر مکتبۂ فکر کے ادیبوں کی حمایتیں اور ہمدردیاں حاصل ہیں اور یہ سب "دورِ حیات" کی زندگی کے واسطے ہی خواہاں ہیں جتنے خود حیات کے چلانے والے۔

لیکن پتہ نہیں ہمارے قارئین کی کیا رائے ہے؟

قیصر

جاں نثار اختر

غزل

کیا یونہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں

لے دو ہر ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

ایسے میں زلفِ یار نہ ہم سے گریز کر
ہم آج تیرے پاس پریشاں سے آئے ہیں

وہ میر کی غزل ہو کہ غالب کی شاعری
نغمے تمام سازِ رگِ جاں سے آئے ہیں

سردار جعفری

برہنہ پا ہے بہار

تمھارے تن پہ سلامت تمھارا پیراہن
ہمارے پاس یہ دامانِ تار تار سہی
تمھارے زیرِ قدم فرشِ گل، بساطِ بہار
ہمارے پاؤں میں دشتِ جنوں کے خار سہی

کسی کی بھوک سے بھرتے نہیں ہیں پیٹ اپنا
کسی کی پیاس سے لب اپنے تر نہیں کرتے
برہنگی سے کسی کی لباس کیوں لیں گے
بہشت پر بھی ہوس کی نظر نہیں کرتے

ہمارے دل کی تپش سے چراغ جلتے ہیں
ہماری تشنہ لبی میکدے بناتی ہے
نگاہِ ساقیِ نامہرباں کا شکوہ کیا
ہمارے نام کی صہبا چھلک ہی جاتی ہے

تمھیں خبر بھی ہے آوارگانِ کوچۂ شوق
شکستہ دل ہیں شکستہ دلوں کے یار بھی ہیں
بلاکشانِ محبت کا احترام کرو
خراب حال سہی مخبرِ روزگار بھی ہیں

ہماری طرح گریبانِ صبح تو بھی ہے چاک
فروغِ چاکِ گریباں ہے اہلِ دل کا شعار
ہماری طرح سے گلزار و دشت و صحرا میں
برہنہ سر ہے صبا اور برہنہ پا ہے بہار

شاذ تمکنت

فسونِ نیاز

یہ دشتِ بے سروساماں، یہ سوزِ نیم شبی
جہاں بھی چشمۂ ریگِ رواں نظر آیا
چمک اُٹھی ہے مری داغ داغ تشنہ لبی

●

گریز پا ہے کہ ہے پابہ گِل یہ عمرِ وفا
حیات ہے کہ سن و سال کی رہائی ہے
میں وہ کہ جس کو بیاباں سے مُشتِ خاک ملی
مرا طریقِ طلب ہے کہ جگ ہنسائی ہے
گُلِ شگفتہ نہ مانگوں گُلِ چکیدہ سہی
رسائی ہے کہ یہ احساسِ نارسائی ہے

●

نیاز شکر مرے پاس کوئی برگ نہ ساز
پُکارتا ہے نسب نامۂ جبیں کیا کیا
حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز

خورشید احمد جامی

غزل

دل کے بجھتے ہوئے شعلوں کو ذرا بھڑکاؤ
یاد آؤ تو مجھے آج بہت یاد آؤ
شامِ ہجراں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں
صبحِ امید کے آنچل کی طرح لہراؤ
تم کو سوچوں تو خیالوں سے مہکتے گزرو
تم کو پالوں تو اُجالوں میں کہیں کھو جاؤ
آنچ دیتے ہوئے زخموں کی جہاں وادی ہے
اور کچھ روز بہاروں کو وہیں ٹھہراؤ
پھر پُکارو مرے خوابوں کے دریچے سے مجھے
پھر مرے پیار کا مفہوم مجھے سمجھاؤ
غم کے زینے پہ کوئی شمعِ تمنّا رکھدو
دل کی راہوں میں کوئی نقشِ وفا چمکاؤ
دورِ حالات کی پُرشور ندی سے آگے
ہاتھ بچھڑے ہوئے نغموں کی طرح پھیلاؤ
پھر کہیں مِل کے مری سوچ کی دیوار تلے
وقت کو سایۂ گیسو کی طرح مہکاؤ
اپنے گیتوں کی نئی بزم سجا کر جامی
رات بھر شمع کی مانند پگھلتے جاؤ

توہم پرستی کے خلاف عقلیت کو اہمیت دیتا تھا۔ پنڈت نہرو زندگی میں حرکت اور ترقی کے قائل تھے اس لئے اگر ان کے تصورِ حیات کو کوئی نام دینا ضروری ہو تو اسے "سائنٹفک ہیومنزم" سماجی جمہوریت یا سوشلسٹ ڈیموکریسی کہہ سکتے ہیں جو خیرات اور ہمدردی پر مبنی ہو۔

آزادی، انصاف، مساوات اور ارتقا کے انھیں عام تصورات کو عام کرنے کی خواہش نے انھیں ایک اعلیٰ پایہ کا ادیب بھی بنا دیا تھا۔ وہ اس رسمی مفہوم میں ادیب نہیں ہے جس سے ادب کا کاروبار ایک پیشہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور نہ وہ محض لکھنے کے لئے لکھتے تھے بلکہ ان کی زندگی کا جو مقصد اور مشن تھا وہ جن انسانی اقداروں کے تحفظ اور ارتقا کے لئے کوشاں تھے لکھنے کا جذبہ بھی اسی کا ایک جز تھا۔ زندگی کے وہ بہت سے پہلو جوان کے فکر و عمل کے دائرے میں آتے تھے۔ وہ تہذیبی اور ادبی اثرات جو انھوں نے مشرق اور مغرب کے عالموں، فلسفیوں، ادیبوں اور شاعروں کے یہاں سے جذب کئے تھے۔ علم و حکمت کے وہ عناصر جو انھوں نے قبول کئے تھے، ایشیا اور خاص کر ہندوستان کی آزادی کی وہ جد و جہد جو رگوں میں خون کی گردش کو تیز کرتی تھی۔ یہ سب چیزیں پنڈت نہرو کو ادیب بنانے میں معین ہوئیں ان کے جذبات اور تخلیقی تصورات نے اظہار چاہا اور انھوں نے ایک سچے فنکار کی طرح انھیں جاندار اور توانا لفظوں میں ظاہر کر دیا۔ اُن کی تحریروں میں جو سچائی اور قوت، جو تخلیقی جوش اور گرمی ہے۔ اس میں اگر ایک طرف ان کی شخصیت کا پرتو ہے تو دوسری طرف اس فلسفۂ حیات کی جھلک بھی ہے جو عصرِ حاضر کے زہریلے اور نشہ آور تصورات کے لئے تریاق کا کام دے سکے۔

تصنیفی نقطۂ نظر سے پنڈت نہرو کی ادبی زندگی کی ابتدا ۱۹۲۹ء سے ہوتی ہے۔ جب انھوں نے نئے روسی نظام کو دیکھ کر اپنے تاثرات ایک مختصر کتاب "سوویٹ روس" کی شکل میں پیش کئے۔ یہ پہلی کتاب ہمیں پنڈت نہرو کے ذہن اور دل کے اندر جھانکنے کا موقع دیتی ہے اور اس شخصیت سے روشناس کراتی ہے جس کے تصورات میں ہندوستان اور عالمی کشمکش کا ایک نقشہ بن رہا ہے۔ اس کی بڑی واضح تصویر "تاریخ عالم کی جھلکیوں" میں نظر آتی ہے جو ایک آزادی پسند روشن دماغ اور انسان دوست ادیب نے کھینچی ہے۔ یہ محض "واقعات کی کھتونی" اور تاریخ عالم کے نشیب و فراز کی کہانی نہیں ہے بلکہ ایک بیدار ذہن کی وہ تخلیق ہے جس میں تہذیبِ انسانی کا کارواں بعض قدروں کے لئے جد و جہد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد ان کی خود نوشت سوانح عمری آتی ہے جس میں انھوں نے اپنی ذات کا عکس [illegible] پیش کر دیا ہے۔ اس سچائی اور دلکشی سے اپنی تصویر کھینچنا ہر ادیب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس زندگی کا ایک مثبت نقطۂ نظر اور پُر اثر اندازِ بیان ہو۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس تصنیف نے انھیں عالمی ادیبوں کی محفل میں ایک اعلیٰ جگہ دے دی ہے۔

پنڈت نہرو کی آخری باقاعدہ تصنیف "تلاشِ ہند" ہے۔ جس میں انھوں نے ہندوستان کی وہ روح تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو دب دب کر اُبھرتی اور مر مر کر زندہ ہوتی رہی ہے۔ اس تلاش میں وہ بار بار خود اپنے کو ڈھونڈتے اور پاتے رہے ہیں۔ اور یہی ایک بڑے ادیب اور مفکر کی پہچان ہے۔ دنیا کے بہترین انسانوں کی طرح پنڈت نہرو کے دامِ خیال میں بھی زندگی کے بہت سے پہلو اسیر تھے اور وہ ایک مفکر کی طرح مذہب، فلسفہ، سیاست، تہذیب، فنونِ لطیفہ اور سائنس کے متعلق خیال انگیز رائے دینے کے اہل تھے۔ شخصیت میں فکر و عمل کا ایسا خوبصورت امتزاج جس کا مجسمہ پنڈت نہرو تھے۔ مشکل ہی سے دستیاب ہوتا ہے۔ یہ امتزاج انکی تحریروں میں رعنائی، رنگ، قوت، توانائی اور دلکشی پیدا کرتا ہے اور اچھے ترجموں میں بھی اس کا لطف باقی رہتا ہے۔ جو لوگ ادب اور صحافت کے فرق پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ وہ بھی "میری کہانی" اور "تلاشِ ہند" کے بعض حصوں کو تخلیقی ادب کا اچھا نمونہ قرار دینے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ ان میں پنڈت نہرو کی مثالیت اور جذباتیت نے رنگ بھرا ہے اور فکر نے عظمت پیدا کی ہے۔

اختر نظمی

غزل

اپنی راتوں کی اُداسی کا سبب یاد نہیں
خواب دیکھا تھا کوئی خواب تو اب یاد نہیں

اس کو اک بار سرِ راہگزر دیکھا ہے
پوچھئے کس سے پتہ نام ہی جب یاد نہیں

کر دیے وقت نے پامال تمنا کے نقوش
تیرے ابرو ترے ترشے ہوئے لب یاد نہیں

خود فراموشی میں وہ کیف کا عالم تھا کہ بس
وہ یہاں آئے تو تھے آئے تھے کب، یاد نہیں

انتہا یہ ہے کہ ساقی کا کرم بھول گئے
بزم کے یاد نہیں، جشنِ طرب یاد نہیں

ہم تو اُس بزم میں دیکھا کئے بس ایک ہی سمت
کون آیا تھا گیا کون، یہ سب یاد نہیں

میں نے نظمی اسے چاہا ہے پرستش کی ہے
اپنی چاہت کا، عقیدت کا سبب یاد نہیں

کرشن چندر

ٹیکسی ڈرائیور

عدالت نمبر ۴ کا کمرہ ملزموں، وکیلوں، مدعیوں، گواہوں اور تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے اور عدالت کی کرسی ابھی خالی تھی۔

اس عدالت کے سامنے بکرم ٹیکسی ڈرائیور کا آج گیارہویں بار پیشی تھی۔ پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ بار عدالت کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور ہر بار پیشی اگلی تاریخ پر ٹل جاتی تھی اور اس کے کیس کی باری نہیں آتی تھی۔ پچھلے چار مہینوں میں وہ گیارہ دن ٹیکسی نہیں چلا سکا تھا۔ جب ٹیکسی نہیں چلتی ہے تو گھر کا خرچ نہیں چل سکتا، اور بچے کا اسکول نہیں چلتا ہے اور پینے کا کھانا نہیں چلتا ہے صرف بیوی کی زبان چلتی ہے۔

کوئی بڑا مقدمہ بھی نہ تھا اس کا۔ اس نے شہر کے سب سے بڑے آدمی کی کار کو بڑی تیز رفتاری سے جا لیا تھا اور اپنی ٹیکسی آگے بڑھا لی تھی اور ہزار کوشش کرنے کے بعد بھی اس نے بڑے آدمی کی کار کو اپنے سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ حالانکہ بڑے آدمی کی گاڑی اس کے پیٹ کی طرح بڑی تھی اور اس کی حرص کی طرح چلتی تھی اور اس کا رنگ ایک چھنال عورت کے میک اپ کی طرح بھڑکیلا تھا۔ تو بھی بکرم کی ٹیکسی نے اسے مات دیدی۔ اس میں بکرم کی ٹیکسی سے بکرم کی چالاکی کو زیادہ دخل تھا کیونکہ مشین تو انسان کے ہاتھ سے چلتی ہے۔ بڑے بڑے آدمی کبھی کبھی یہ بھول جاتے ہیں۔ شہر کا سب سے بڑا آدمی بھی ایک معمولی ٹیکسی ڈرائیور کی جرأت پر بے حد خفا ہو گیا تھا اور اگلے چوک پر روک کر اپنے ٹریفک انسپکٹر سے ایک کم حیثیت ٹیکسی ڈرائیور کی ڈھٹائی کے خلاف شکایت کر دی تھی۔

بکرم کو اس عدالت سے زیادہ سے زیادہ دس روپے جرمانہ ہوتا۔ مگر وہ بڑا آدمی بڑا معروف آدمی تھا کسی طرح پیشی پر حاضر نہ ہوتا اور بکرم کو عدالت میں حاضر ہوتے ہوتے آج گیارہ دن ہو گئے تھے۔

اس نے گھبرا کر اپنے وکیل سے پوچھا: "کیا جج صاحب آج بھی نہیں آئیں گے؟"

"کیا معلوم!" اس کے وکیل نے بڑی بیزاری سے جواب دیا کیونکہ بکرم نے اپنے وکیل کو ہر پیشی پر تین روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اور اپنی سمجھ میں اس نے بڑا سستا سودا کیا تھا۔ بکرم کا خیال تھا پہلے ایک دو پیشی میں اس کا فیصلہ ہو جائیگا اسے کیا معلوم تھا کہ معاملہ اس قدر لمبا کھنچے گا کہ اسے تین کی بجائے ۳۳ روپے دینے پڑ جائیں گے اور وکیل اسلئے تنگ سے جواب دے رہا تھا کہ بھلا آخر تین روپے والے کیس کو اور کس طرح جواب دیا جا سکتا ہے؟ اب اگر سو پچاس کا معاملہ ہوتا تو وکیل بھی مسکراتا۔ ہر وکیل کی مسکراہٹ اس کے نرخ سے ہوتی ہیں کبھی رنگی ہوتی ہو اور اس کی مسکراہٹ کو کھولنے اور بند کرنے کے لئے الگ الگ میٹر ہیں۔ کسی وکیل کی مسکراہٹ پانچ روپے پر کھلتی ہے تو کسی کی پچاس روپے پر۔ کسی کی پچاس پر تو کسی کی ہزار پر۔ وکیل کے میٹر اور ٹیکسی کے میٹر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بکرم نے بیزاری سے سوچا اب میں اس ظالم کو ۳۳ دے چکا ہوں۔ یہ کبھی سیدھے منہ سے مجھ سے بات نہیں کرتا کیونکہ میں تین روپے دیتا آ رہا ہوں۔ اب میں اس سے کیا کہوں؟ جرمانہ تو مجھے دس روپے سے زیادہ نہ ہوگا لیکن وکیل کو ۳۳ دے چکا ہوں۔

"پتہ تو لگا سے معلوم کیجئے کہ عدالت آج آئیگی کہ نہیں آئیگی۔ میری ٹیکسی کا نقصان ہو رہا ہے۔" بکرم نے بڑے التماس بھرے لہجہ میں وکیل سے کہا۔

وکیل نے گھورا اور جھڑک کر کہا۔ "ارے بے غضب ہو گئے۔ میرا ایک مقدمہ عدالت نمبر ۲ میں ہے۔ مگر میں ابھی کورٹ کے اندر۔ اگر تمہارا بلاوا آئے تو مجھے فوراً کورٹ نمبر ۲ سے بلا لینا۔"

وکیل اپنا چغہ کا لبادہ جھلاتا ہوا اپنے بیٹے کی طرح لٹکتی ہوئی تیلو کو جھلاتا ہوا کورٹ نمبر ۲ کی طرف چلا گیا۔ دوسرے روز اس نے بڑے ایڈووکیٹ کی خوبصورت لڑکی سے یہ سوچ کر شادی کی تھی کہ اس کا سسرا اسے ایڈووکیٹ بنا دیگا۔ مگر شادی کے چھ مہینے بعد وہ بیٹا ایڈووکیٹ بن گیا پھر اگلے دس سال تک اس کے سات بچے ہو گئے پھر اس کے کورٹ کا کالا رنگ چھٹ گیا۔

تمہارا بیٹا میں تم کیا کر سکتے ہو۔ اگر زندگی میں تلخیاں تلخی رہ جاتا تو زبان پر مٹھاس کہاں سے آتے۔ وکیل نے کورٹ نمبر ۲ کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

بکرم نے کورٹ لیڈر سے عدالت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی۔ جب کورٹ ریڈر نے اسے جھڑک دیا تو سہم کر پرے ہو گیا۔ وہ اپنی چھدری لیکن خوبصورت داڑھی کو سہلاتا رہا۔ اس کی داڑھی بڑی خوبصورت اور چھوٹی سی تھی اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ اس کے خاندان کے سبھی مردوں کی آنکھیں خوبصورت تھیں اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت داڑھیاں تھیں اور وہ سب لوگ بڑے بڑے جاہ پائیں لکھتے تھے۔ ریشم کے کچھوے کی طرح ملائم جانمازیں۔ بالوں کے یہ گھنے گچھے ان کے دھرم اور ان کی تہذیب کے پرانے نشان تھے۔ بکرم کے خاندان میں بڑے بڑے عالم فاضل اور پنڈت ہو گزرے تھے۔ مگر زمانے کی گردش نے بکرم کو ٹیکسی چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔

بکرم نے چاروں طرف بے بسی سے دیکھا یکایک سے کورٹ روم کے بائیں کونے میں آخری سرے پر ایک دروازے کے قریب جج کا چپراسی نظر آیا۔ یہ اردلی خاص عدالت بہادر کا تھا۔ جب جج صاحب اپنے پرائیویٹ روم سے نکل کر باہر عدالت کی کرسی میں جاتے تھے تو یہ اردلی ہر قدم پہلے آگے بڑھ کر پکارتا تھا۔ گویا ایک طرح سے بھری ہوئی عدالت کو جج صاحب کی آمد کی خبر دیتا تھا۔ پھر جج صاحب کا چہرہ نمایاں ہوتا، وہ چندی سنہری داڑھی کو سہلاتے ہوئے اندر تشریف لاتے اور ساری عدالت ان کی تعظیم دینے کیلئے کھڑی ہو جاتی اور اس وقت تک کھڑی رہتی جب تک عدالت کی اونچی کرسی پر نہ بیٹھ جاتے۔

بکرم سب کی نظریں بچا کر پرائیویٹ کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے اردلی سے باتیں کرنے لگا۔

"عدالت بہادر کب آئیں گے؟"

اردلی بولا۔ "وہ تو ٹھیک گیارہ بجے آتے ہیں۔ جانے کیا بات ہو گئی آج۔ ممکن ہے طبیعت خراب ہو۔"

"طبیعت خراب ہو گی تو پھر عدالت نہیں لگے گی۔"

"ہاں۔"

"کوئی دوسرا جج نہیں آئے گا؟"

"کبھی کبھی آتا ہے جب پہلا جج لمبی چھٹی لے لیتا ہے۔ مگر آج کیا ہوگا کیسے معلوم۔ شاید تھوڑی دیر میں جج صاحب کا ٹیلیفون آئیگا۔"

اردلی کے منہ سے یہ بات نکلی ہی تھی کہ ٹیلیفون آ گیا اور اردلی ٹیلیفون سننے لگا۔ بکرم کمرے کے اندر سر ڈال کر ادھر گھور کر دیکھنے لگا

عصمت چغتائی

کایا پلٹ

"ارے تو ابھی سال تو بی اے میں گیا ہے۔ نوکری کی تلاش میں ہے۔"

"ایسے بی اے پی ٹی نہ جانے کتنے جھک مارتے پھر رہے ہیں بہت سے بہت ڈیڑھ دو سو کی نوکری مل جائے گی۔"

"کیوں جی فسٹ پاس ہوا ہے یا نہیں۔"

"اے تم تو گھاس کھا گئی ہو۔ فسٹ کلاس پاس ہونا کون سی بڑی بات ہے۔ تنّی کا نصیب پھوڑنا چاہتی ہو۔"

"اے تو کون سا ابھی بیاہ ہوا جاتا ہے۔ نوکر چاکر ہو جائے تب دیکھا جائے گا"

"اجی وہ تو سونے میں بھی منڈھ کر دے تو میں اپنی بیٹی اسے نہیں دوں گا۔ سروپ جی ادھر سوائی مادھوپور میں لڑکا ہے اس کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ دسہرے تک بات پکی ہو جائے گی۔"

"اور جو تنّی کو لڑکا پسند نہ آیا تو۔"

"مجال ہے تنّی کی چوں چرا بھی کر جائے۔ اس کنگال سے شادی کر کے ساری عمر کا رونا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں کہ تم نے اسے منع کیوں نہ کیا۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔"

"اے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لڑکے کی بابت کہیں اور کر رہے ہو سکون سے لڑکا کیا کر رہا ہے۔"

"راشن آفس میں کہیں نوکر ہے۔ چار سو کماتا ہے۔ آگے اور ترقی ہو گی۔"

"چار سو کی ایسی راشن آفس میں کیسی نوکری ہے۔"

"بھئی میں نے ساری اوپر کی آمدنی ملا کر بتایا ہے۔ بھاگوت جی کہتے ہیں۔ ابھی آمدنی ہو جاتی ہے۔ لیکن کم سے کم چار سو تو"

"ابھی تو وہ ایم اے کرنے کو کہے ہے۔"

"بس جی بس ایم اے ویم اے کچھ نہیں کرنا ہے۔ زیادہ پڑھانے سے لڑکیاں بالکل ہی ہاتھ سے نکل جاتی ہیں ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور آپ کی لاڈلی ابھی تک نہ جانے کہاں کل چھرے اڑا رہی ہیں۔"

"بس رہنے بھی دو خواہ مخواہ بکواس کئے جا رہے ہو۔ میری لڑکی ایسی چھچھوری نہیں۔"

"ارے آجکل کی ساری لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں گھر سے بہانہ کر کے چلی جاتی ہیں اور نہ جانے کیا کیا بدکاریاں کرتی پھرتی ہیں۔"

"شرم نہیں آتی اپنی بیٹی کو بدکار کہتے ہوئے۔" شریمتی جی کا گلا بھر آیا۔

"تم ہی سوچو ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور لڑکی غائب ہے۔" شرما جی چنگھاڑے۔ "کہے دیتا ہوں ساری عمر سر پکڑ کر روؤ گی۔ میں تو ایک گھڑی اپنے گھر میں نہیں ٹکنے دوں گا۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیا تو نام نہیں۔ آج ذرا آ جائے بے شرم کہیں کی۔"

شرما جی غصہ سے پھنکارتے ہوئے ٹہلنے لگے۔

"بڑے آئے نکالنے والے، بے شرم خود ہو جو معصوم بچی پر اُلٹے سیدھے عیب تھوپ رہے ہو۔" شریمتی جی دھاروں دھار رونے لگیں۔

"ارے ابھی تو دیکھتی جاؤ، کیسا سر پکڑ کر جان کو روؤ گی۔ کیا وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ میں اس کا دشمن ہوں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہوں گا۔ تم تو گھر میں بیٹھی رہتی ہو۔ دنیا کے طعنے تو مجھے سہنا پڑیں گے۔ اب اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ کچھ کھا کر سو رہوں۔ بس تم ماں بیٹی کے کلیجے میں تو جب ہی ٹھنڈک پڑے گی۔"

"بھگوان کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے۔ بس نہیں ملی ہو گی یا ٹرین چھوٹ گئی ہو گی۔ اسی مارے دیر ہو گئی ہو گی۔ بس آتی ہی ہو گی۔"

"خاک آتی ہو گی۔ جلسہ کبھی کا ختم ہو چکا ہو گا۔ آنا ہوتا تو آ جاتی۔"

"آخر کیوں نہیں، برے شگون منہ سے نہ نکالو۔"

"اب میں تم سے کیا کہوں۔ بیکار پریشان ہو جاؤ گی۔ خود ہی سوچو جوان لڑکی۔ راتوں کو غائب رہے۔ ان حرکتوں کا کیا انجام ہو گا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ ان لفنگے لڑکوں پر بھروسہ کرنا سخت حماقت ہے۔ انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر ہی یہ بدمعاشیاں۔"

"ہے بھگوان مجھے تو موت ہی آ جائے۔" شریمتی جی بے قابو ہو گئیں۔

"موت آ جائے تو بڑے بھاگ سمجھنا۔ موت سے بھی بری گت ہو گی۔ آئے دن ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، کہ لڑکی کو کوئی بدمعاش بھگا کر لے گیا۔ اور ——"

"میری بیٹی ایسی نادان نہیں۔"

"ایک تم بڑی [illegible] ہو اور دوسری تمہاری بیٹی صاحبہ ہیں۔ ذرا سوچو ڈوب مرنے کی بات ہے یا نہیں۔ کیا سمجھتی ہو تم آجکل کے نوجوانوں کو۔ لڑکا آخر کو جوان ہے بچی تو نہیں۔ سچ بتاؤ کیا تم یہ قسم کھا کر کہہ سکتی ہو کہ تمہاری لڑکی تم سے کہے بغیر کچھ نہیں کرتی۔ یہ راتوں کو جو غائب رہتی ہے تو کس لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر گیتا کا پاٹھ کیا کرتی ہو گی۔ جو ماجائی تو ہوتی ہو گی اور کون جانے ——"

"بھگوان نہ کرے میری لڑکی ایسی نیچ نہیں۔"

"ارے آجکل کا یہی فیشن ہے۔ اندھیرے اُجالے کیا کچھ نہیں ہوتا ہو گا۔ جبھی تو تم سے کہتا ہوں۔ جب انسان پر شیطان سوار ہو جاتا ہے تو پھر بے چاری لڑکی۔ اب تم سے کیا کہوں۔ یہ بمبئی شہر ہے۔"

"ہو ہو۔" شریمتی جی رونے لگیں۔

"اور ایسے موقع پر نوجوانوں کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔ اگر لڑکی شریف ہو اور انکار کرے تو پھر بالکل راکشس بن جاتے ہیں۔ آئے دن ایسے کیس ہوتے رہتے ہیں کہ لڑکی نے جیسے چیخ کی اور ادھر گلا دبا دیا ٹیٹوا۔ نہ سالی زندہ رہیگی نہ پوچھ گچھ ہوگی۔ ریپ اور مرڈر کے کتنے واقعات ہوتے ہیں۔ ابھی اسی دن اخبار میں نکلا تھا۔ کس بری طرح گلا کاٹا تھا لڑکی کا کر سب۔"

"ہائے بھگوان موت آئے ستیش کے بچے کو۔ انگ انگ سے کوڑھ پھوٹے اسکے۔ ہتھنے کیڑے پڑیں۔ ارے میری نابیٹا کو ہاتھ لگا کر دیکھے۔ چھاتی پر چڑھ کے لہو نہ پی جاؤنگی۔ ارے آپ نے تو ڈرا دیا ہمکو۔ مجھے کیا معلوم تھا یوں آستین کا سانپ بنکر ڈسے گا۔ ہائے میری پھول سی بچی۔ اجی تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔"

"میری سنتی کب ہو جو تم سے کہتا۔ جیسے آزاد خیال کرم کی ہی بچی ہو۔ تمہارے ہاں تو سبھی کچھ چلتا ہے۔ تمہاری سگی بہن کھلے بازار ناچتی پھرتی ہے سارے یورپ میں ٹانگیں اچھالتی پھرتی ہے۔ بھیا تمہارے طبلچی۔"

"طبلچی کاہے کو ہوتا۔ ستار۔"

"ارے وہ ستار ہو یا سارنگی طبلہ ہوا ایک ہی بات ہے۔ تم لوگ تو انہیں کلاکار ہی کہتے ہو۔ ہاں جی تم لوگوں کا کیا کہنا۔ اونچے لوگ ٹھہرے اور ہم بیچارے پرانے زمانے کے لوگ۔ مگر اتنا یاد رکھو تم نے اور تمہارے بھانجے نے اگر میری بچی سے بیاہ کرایا تو سات پیڑھی تک کو جیتا نہ چھوڑوں گا۔"

"اے خدا کرے منہ میں خاک۔ بیاہ کریں تمہاری اماں بہنا۔ خبردار جو تم نے میری بچی کو کچھ کہا۔"

"تمہاری ہی بچی ہے میری کوئی نہیں لگتی۔ بس تم اپنی سی کرتی رہو، میں منہ تمہارا نہ لگونگا۔ ارے بھئی تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں برہمن سور ہوں۔ آ رہا ہوں۔ بھگوان کی سوگند آج اس بدذات لونڈیا کا گلا نہ دبا دوں اسے اور اسکے یار کو کھود کے نہ گاڑ دیا تو۔"

شرمیتا جی نے دھڑا دھڑ منہ پیٹ لیا۔ ہائے انکی پھول سی بچی۔

"ارے بھگوان کے لئے پولیس کو فون کیجئے۔"

"ہوں اب کورٹ کچہری میں بھی منہ کالا کرواؤ گی۔ نہیں بس آج فیصلہ ہوکر رہیگا۔" دھڑ دھڑ کرتے شرما جی بیڈروم میں گئے اور پستول نکالکر دھڑا دھڑ گولیاں بھرنے لگے۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو۔" شرمیتا جی پیلی پڑ گئیں۔

"وہی جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہئے۔" شرمیلا جی لپٹیں تو انھوں نے میز پر رکھ دیا۔

"ہے بھگوان، ہے گوپال، ہے پرمیشور۔"

"کیا چاہتی ہو۔" شرما جی جھنجھلا کر بولے "کیا وہ آئے تو اسے شاباشی دوں۔ واہ واہ بیٹی تو نے کُل کی لاج مٹی میں ملا دی۔ یہ میرے اوپر بڑا احسان کیا۔"

"ہائے تسی کیا اسی دن کیلئے پالا تھا تجھے۔ ارے تجھے موت کیوں نہ آگئی۔" شرمیتا جی ہچکیوں سے بین کر کر کے رونے لگیں۔

شرما جی کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ پیروں پر قابو نہ تھا۔ دھڑام کر صوفے پر گر رہے۔ کبھی کھڑکی کی طرف دیکھتے کبھی دروازے کی طرف پھر غصے سے لال آنکھیں سیلنگ پر جم جاتیں۔ پونے نو بج چکے تھے۔ ہال پر سناٹا چھایا تھا۔ اکا دکا بس گزر جاتی اور پھر خاموشی۔ انکے کان سنسنا رہے تھے۔ کنپٹیاں بھنچی جا رہی تھیں۔ شرمیتا تو خوش نصیب۔ رو کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں مگر وہ تو بھوں بھوں رو بھی نہیں سکتے تھے۔ دل کی وحشت دور کرنے کیلئے اخبار اٹھا لیا۔

"سمندر سے ایک گمنام لاش۔" اوہ یہ تو کل کی بات ہے۔ یقیناً تسی کی لاش نہیں ہوسکتی۔ "ساس سے جھگڑا۔ بہو نے کپڑے میں آگ لگا کر۔"

مگر تسی کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اگر شادی ہوچکی ہوتی تو اس وقت وہ کس قدر چین سے بیٹھے کراس ورڈ کا معمہ حل کرکے لاکھوں کمانے کے پلان بنا رہے ہوتے اور شرمیتا جی موزوں کی بجائے نواسے کیلئے سوئٹر بن رہی ہوتیں۔ نواسہ۔ اف۔

تسی کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ ماتھے سے خون جاری ہے۔ "پتاجی میں لٹ گئی۔" دھڑ سے زمین پر گر پڑتی ہے

چونک کر شرما جی نے سینے کو تھپک دیا۔ تسی۔ تسی۔ میلے کچیلے کپڑے دنیں یہ ننھی سی جان۔ پتاجی پتاجی۔ یہ پھول۔ یہ میری گود کا پھول سا کلیجہ۔ نسا کیجئے۔

انھوں نے لپک کر پستول پر ہاتھ ڈالا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔ بازار جاؤ گرم ہے۔ چہرہ سرخ ہے۔ اثر رہا ہے۔

ایکدم انکے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اسکالرشپ۔ پانچ برس کیلئے۔ لندن۔ اُف انکے ہاتھوں سے اخبار گر گئے

گر گئے ہی۔ "ستیش کو پانچ سال کے لئے اسکالرشپ۔"

"ارے یہ اخبار آج ہی کا تو ہے۔ نہیں کل کا ہے۔ اور آج ۱۵ ہے نا۔ ارے بولتی کیوں نہیں ہو۔"

"کیا ہے جی۔" شرمیتا جی کراہ کر بولیں "ہیڈ لائنز آپ ہی تو لائے ہیں ابھی۔"

"اوہ، ہاں، پڑھنے کا موقع ہی نہ ملا۔"

"ہاں وہ اس ابھاگن تسی کے جھگڑے میں بھول گئے۔ اچھا اچھا بعد میں پڑھئے گا۔ آپکو میری جان کی سوگند۔ جاکر پولیس میں رپورٹ لکھوا دیجئے۔"

"رپورٹ۔ وہ کیوں۔"

"اسے نو بج رہے ہیں۔ لڑکی کا ابتک پتہ نہیں۔"

"تو اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے، اکیلی تو نہیں گئی۔"

"اسی شیطان کے بچے ستیش کے ساتھ گئی ہے۔"

"گالیاں دیکر کیوں زبان گندی کرتی ہو۔"

"گالیاں نہ دوں تو کیا موئے کی بلائیں لوں۔ وہ گھڑی گھڑی آئے مونڈی کاٹے کو میری بچی کو نہ جانے مائی ملا کہاں لیگیا۔ ارے سنتے ہو جی"

"ہاں ہاں سن رہا ہوں۔ تم عورتوں کو تو ہر بات کا ہول سوار ہو جاتا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو جی۔ وہ شیطان میری بچی کا جیون نشٹ کر دے اور۔"

"تسی نا سمجھ۔ ایسی اوٹ پٹانگ بکواس سے کیا فائدہ۔" بڑے دھیرج سے بولے

"اگر ابھی تو خود ہی کہہ رہے تھے۔"

"ہاں ہاں۔ اگر میں نے تسی کی بھلائی کیلئے کچھ کہا تو اسکا یہ معنی تو نہیں کہ بس۔ کہ بس بالکل بیکار ہوا۔ سکاٹ ہے میرے خیال میں تو ستیش ایسا زیادہ برا بھی نہیں جتنا ہم سمجھ رہے ہیں اور ماں کے نالکے کوئی دیکھا۔ تمہارے دل میں ہو تو اسے نکالنے کی کوشش کرو۔"

"کیوں کالا منہ ستیش کے بچے کا۔ آئے تو سہی۔ نہ جوتی لیکر مونڈی کاٹے کا منہ توڑ کر رکھ دوں تو کہنا۔ نو بج رہے ہیں۔ اور۔"

"بڑا رش ہوتا ہے بوری بندر پر۔ بس نہیں ملی ہوگی۔"

"تو ٹرین سے آجاتے۔" شرمیتا جی چڑ گئیں۔

"جلسہ دیر سے ختم ہوا ہوگا۔"

"میں پوچھتی ہوں بات کیا ہے۔ ابھی تو کہہ رہے تھے یہ

شرمیتی جی بگڑ کر بولیں

"پر او جی تم تو بات کی کھال اتارنے لگتی ہو۔ لگتا ہے شاید وہ لڑکے
تینوں کا اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ دیکھو وہ بیٹا بھی موٹے کے پیچھے ہی لونی ندی ہی۔
کیا یا انھوں نے باتیں کی تھیں ... وقت انھیں
لینا انھوں نے ضبط ... میں رکھ دیا۔
وہ لیوں ... نہ لوں۔" شرمیتی جی ...

"میں جو کہتا ہوں۔"

"خدا کبھی تو تم کہہ ... سمجھے۔"

"اوہو۔ وہ تو کبھی ... انسان ..."

"یہ بات کیا ہے۔ ایکدم یہ لیٹا کیسا؟"

"معلوم ہو جائیگی بات۔" شرمیاں جی نے اٹھ کر دروازہ کھولا
"مطلوبہ بیڈی" تشی بیساکھی کا پائی چھلاتی ہوئی داخل ہوئی۔ "آن
بس اسٹینڈ پر لوٹے ... کیا لمبا لیا تھا جلدی سے
کھانا دے نا۔"

شرمیتی جی کچھ بوکھلائی ہوئی تھیں کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ
شرمیاں جی بولے

"ہاں ہاں تم بھی کھالو۔"

"جی۔ مگر۔ تشی اگر آپ اجازت دیں تو۔"

میں نے کہا ستیش ڈیڈی ... اجازت نہیں
دیں گے۔ تم چلے جاؤ ڈیئر۔ میں نہیں جا سکونگی۔"

"تو پھر میں بھی نہیں جاؤں گا۔"

"نہ ہو مت۔" تشی تنک کر بولی۔

"کیا بات ہے۔ کیسا ڈر ..." شرمیاں جی بڑی نرمی سے بولے

"میرے ایک دوست کی شادی ہے ڈنر پر ہم دونوں کو بلایا ہے۔"

"یہ بھی بتاؤ کہ قوالی بھی ہے۔ بائیں کا سجا ہے گے" تشی بولی

"نہیں ساڑھے دس تک کھانا ہو جائیگا۔"

"آنے جانے میں بارہ بج جائیں گے اور اب دیر بھی ہو رہی ہے
تمھیں چلے جاؤ۔"

"چلی جاؤ تشی۔"

"اگر نیند ... دیر ہو جائے گی۔"

"ستیش تمھارے ساتھ ہوگا یا نہیں۔"

"جی ہاں۔"

"تو بس پھر چلی جاؤ۔"

"ہائے تھارلنگ ڈیڈی۔ چلو ستیش۔" تشی نے لپک کر
پرس اٹھا لی۔

"یہ تو کار بھی لے جاؤ۔ ہے میں جا بجاؤں رسالہ سے
نکال کا کارڈی نہیں ... کرنے لگے۔ میں پیار سے بولے

"مگر میں ... کھانے کے بعد چلی آؤں گی۔ قوالی تو
جانے کب تک ہو گی۔"

"تو کیا ہوا۔ سنو ہی نا۔ یہی تو لوگوں میں خرابی ہے
اپنے دیش کی کلا کی قدر نہیں کرتے۔"

"نہیں جی۔ پر رات گئے تک غیر گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔"
شرمیتی جی نے تیوریاں چڑھائیں

"ارے بھئی۔ جانے بھی دو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

شرمیاں جی نے بیوی کا ہاتھ دبایا

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"جاؤ جی تم لوگ۔"

"مگر ممی۔" تشی نے سہم کر ماں کو دیکھا۔

"نہیں جی۔ تمھاری ممی تو یونہی کہہ رہی ہیں۔ آخر تمھاری
ماں کی آنتی بڑی کلاکار ہیں۔ سارے یورپ میں ان کا نام ہے
ایک تم ہو کہ کلا کا نام لیتے بھی نہیں آتا۔ جاؤ قوالی سن آنا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔" ان دونوں کے جانے کے بعد
شرمیتی جی بگڑ کر بولیں

"تمھاری سمجھ میں آتا ہی کیا ہے۔ بس سوائے چولھے
چکی کی باتوں کے اور کسی طرف عقل ہی نہیں چلتی۔"

"ہاں جی۔ ایک تم ہی ہو عقل کے ٹھیکیدار۔ مگر کہتا ہوں
یہ کایا پلٹ کیوں ہو گئی۔ ابھی تو توپ بندوق تانے بیٹھے تھے
کہ گھڑی بھر میں شیر و شکر ہو گئے۔ کیوں جانے دیا اس وقت
لڑکی کو۔"

"تم نہ سمجھو گی۔" شرمیاں جی مسکرائے۔ "آج کا اخبار
بھی دیکھا۔"

"کیا دیکھوں۔ آگ لگے اخبار کو۔"

"دیکھو ذرا سر یہ دیکھو ستیش میر جیندانی کو پانچ سال کیلئے
سرکاری وظیفہ دیکر ولایت بھیجا جا رہا ہے۔ جانتی ہو ولایت
پلٹ کو آجکل کیا گریڈ ملتا ہے۔"

"میری جانے بلا۔ نہ جانے کیا کہہ رہے ہو۔"

"جبھی تو کہتا ہوں تم نہیں سمجھو گی۔ لڑکی کے بھاگ جاگ اٹھیں گے
شادی کر کے سنگ ہی بھیج دوں گا۔ میں تو۔ تم عورتوں کے پاس
عقل جیسی کوئی چیز تو ہوتی ہی نہیں۔"

"اور جو سوائی مادھو پور میں بات چل رہی ہے۔"

"ارے مارو گولی سالے سوائی مادھو پور کو۔ تشی اور ستیش کا
جوڑ بھی اچھا رہے گا۔"

"ارے جی تو تم نے ستیش کے سامنے ہی ذکر کیوں نہ کیا۔"

"بھئی بڑھی ہوئی موٹی بدھی پائی ہے۔ اری عقل کی
دشمن۔ اگر اس کے سامنے ذکر کر دیتا تو وہ سمجھتا ہم اسلئے
تشی کو سات کے وقت اس کے ساتھ بھیج رہے ہیں کہ
اسے اسکالرشپ ملا ہے۔"

"اوہ سمجھی۔"

"شکر ہے بھگوان کا۔ کچھ تو سمجھیں۔ بھئی اپنی تشی کو
اتنا اچھا لڑکا کہاں ملتا اور پھر دونوں کا پیار ہے۔ جہیز پر
بھی جھگڑا نہیں ہوگا۔"

"کچھ بھی ہو رات کے وقت جوان لڑکی کو بھیجنا ٹھیک
نہیں۔ کون جانے۔"

"تم بس اسے اپنے کولہے سے لگائے بیٹھی رہو۔ تشی
کوئی نادان ہے۔"

"مگر میرا جی تو ڈر رہا ہے۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گیا تو۔"

"نہیں جی۔ ایسی ویسی بات کچھ نہیں ہو سکتی۔ ستیش
بہت شریف بچہ ہے۔"

"جو شیطان ہی سوار ہو جائے تو۔"

"تم عورتوں کے دل میں تو فضول کے وہم بھرے
ہوتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتیں کہ ستیش جان بوجھ کر اپنے
پیروں پر کیوں کلہاڑی مارے گا۔"

"کیا مطلب۔"

"مطلب یہ کہ اتنا بڑا اسکالرشپ ملا ہے۔ بھگوان
نہ کرے کوئی اسکینڈل ہو جائے تو سارا کیریر ختم ہو جائیگا

ان باتوں کی بڑی چھان بین ہوتی ہے۔ دوسرے اس میں ہمارا کیا نقصان ہوگا۔ پھر تو اسے شادی کرنا ہی پڑے گی تم خاطر جمع رکھو، وہ کوئی چھچھوری بات نہیں کرے گا۔ اور پھر اپنی تشی کو پسند بھی کرتا ہے۔ نہ جانے کس جنم کا دیا لیا کام آگیا۔ بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا لڑکا مل گیا۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ کہاں ہے سٹیشن کا نام۔"

شرمیتی جی اخبار پلٹنے لگیں۔

"او وہ یہ سامنے ہی تو ہے۔ تیسرے پیج پر سٹیشن میر چنڈانی۔"

"ہائے رام۔ یہ تو سٹیشن میر چنڈانی ہے۔"

"اور میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں بھی تو سٹیشن میر چنڈانی ہی کہہ رہا ہوں۔"

"پر اپنا سٹیشن تو رام چنڈانی ہے۔"

"رام چنڈانی — یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تم نے پہلے سے کیوں نہ کہا۔"

"ارے مجھے کیا معلوم تھا۔"

"تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں۔ نہیں ہوتا۔ کتنی دفعہ کہا تم سے۔ لڑکی کو ان سندھیوں سے نہ ملنے دیا کرو۔ ہمارا ان کا کیا جوڑ۔ کمبختوں کے کیا اوٹ پٹانگ نام ہوتے ہیں۔ آنے دو حرامزادے کو۔ کیا کچھ رکھا ہے۔"

" —— شرمیتی جی اداس ہو گئیں۔

" —— شرمیان جی غرّائے۔

" —— شرمیتی بسورین

" —— شرمیان کھنکارے

" —— شرمیتی جی پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔

" —— شرمیان نے دروازہ کھولکر پستول نکال لیا۔

تمام الجعفری

پھول اور انجن

[...] جو ۳۰ نومبر کو کوٹلی کے حادثے کی نذر ہو کر ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا

وہ زمستاں کی ہواؤں سے شرابور سماں
ہائے وہ موڑ، وہ ٹیلے، وہ گھروندے، وہ کنواں
ہائے وہ ریل، وہ انجن، وہ فضائے پُراں
ہائے وہ درد کا گوشہ، وہ مقامِ غمِ جاں
نوجوانی کہیں مرنے کے لئے ہوتی ہے
تو جہاں آکے گرا تھا وہ زمیں روتی ہے

شمعِ گزشتہ کا دھواں دیکھ رہا ہوں کب سے
تیرے زخموں کے نشاں دیکھ رہا ہوں کب سے
جی سنبھالے یہ سماں دیکھ رہا ہوں کب سے
تجھکو گم سم مری جاں دیکھ رہا ہوں کب سے
کچھ بتا مرگِ مفاجات میں کیا کیا بیتی؟
تجھپہ ان آخری لمحات میں کیا کیا بیتی؟

یوں کوئی پھول نہ خاکِ رہِ ویرانہ بنے
یوں کوئی دیپ نہ طوفان کا نذرانہ بنے
یوں نہ اک زندہ حقیقت کبھی افسانہ بنے
یوں کسی کے لئے دنیا نہ عزاخانہ بنے
یوں کوئی چاند نہ ڈوبے کہ ستارے مرجائیں
یوں کوئی رات نہ آئے کہ نظارے مرجائیں

گھر مقدر میں لکھا تھا نہ وطن ملنا تھا
دور پردیس میں پھولوں کا کفن ملنا تھا
زخمِ دل، زخمِ جبیں، زخمِ بدن ملنا تھا
دائمی نیند کو صحرا میں نہ کن ملنا تھا
تیرے مرنے کی ادا کا یہ اثر ہے دل پر
جیسے سوا ہنسی بہیوں کا گزر ہے دل پر

جسم پر زخم ہیں، زخموں سے چھلکتا ہے لہو
تیرے رخسار کے پھولوں پہ چھلکتا ہے لہو
تیرے ماتھے پہ کرن ہے کہ لپکتا ہے لہو
اشک بنکر مری آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
غم سے ہر تارِ نفس ٹوٹ رہا ہے جیسے
یہ قیامت ہے کہ جینے کی سزا ہے جیسے

اس ستم کو کرم جبر و قضا کہتے ہیں
سب تجھے شاملِ بزمِ شہدا کہتے ہیں
لوگ اس موت پہ رونے کو برا کہتے ہیں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مری، کیا کہتے ہیں
آسمانوں پہ ترے ساتھ کہیں ہوں میں بھی
لگ رہا ہے مجھے یوں جیسے نہیں ہوں میں بھی

سہیل عظیم آبادی

بدصورت لڑکی

"دیدی پرنام"

موہنا نے اچانک کمرے میں آکر سلام کیا۔ چندرا چونک پڑی۔ "ارے موہنا" کہتی ہوئی پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور "میرا بیو" کہہ کر ہاتھ پھیلائے۔ اس کے بچے کی طرف بڑھی۔ بیو ڈر کر چیخ اٹھا۔ اس کی ماں تیزی سے کمرے میں آئی۔ اندر بیو کو موہنا کی گود سے لے کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ جب بیو اور زیادہ چیخنے لگا تو موہنا بھی ماں کی پکار پر باہر چلی گئی۔ اور بچے کو چپ کرنے لگی۔ چندرا کا سر چکرا گیا اور آنکھوں کے سامنے موٹا پردہ سا چھا گیا۔ نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ ایک پل کے لئے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہوا۔ اور وہ کہاں ہے زمین پر یا ہوا میں۔ لیکن اس کی یہ حالت زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ وہ جلدی سنبھل گئی۔ اور ساری باتیں صاف صاف سمجھ میں آ گئی۔ وہ اپنی پلنگ پر لیٹی لیٹی ڈھائی تین گھنٹوں سے ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن اپنے بچے کو لئے اچانک آ گئی تھی اس نے بچے کو پیار کرنا چاہا تھا۔ مگر بچہ ڈر گیا تھا۔ اور اس کی ماں بچے کو باہر لے کر چلی گئی تھی۔ پھر موہنا بھی چلی گئی۔ اور بچے کو چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بچہ اب بھی روئے جا رہا تھا۔ کتاب تکئے کے پاس اسی طرح ادھ کھلی پڑی تھی جس طرح ذرا تھوڑی دیر پہلے اس نے رکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے وہ ناول میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور ایسی جگہ پہنچی تھی جہاں ناول میں الجھن اور دلچسپی دونوں ہی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ چندرا چپ چاپ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اور ناول کی کہانی اس کے دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔

کامنی جوان تھی۔ اور بیاہ کا کھیل ہو گئے سے پہلے بیوہ ہو گئی تھی۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ رواج کی پابندی اور پیار میں اس کا بیاہ اسی وقت کر دیا گیا تھا جب وہ دس سال کی تھی اور اسکول میں پڑھتی تھی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ جب جوان ہوئی تو بیوہ تھی۔ اور ماں باپ کی چھاتی کا بوجھ۔ کل کی ریت کے مطابق اسے ساری زندگی بیوہ رہنا تھا۔ اسے کامنی نے سمجھا اور زندگی کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتی رہی۔ اسکول کے بعد کالج میں پڑھتی رہی کہ زندگی میں کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ اور اس نے بی۔ اے کر لیا۔ سوچا تو اس نے یہ تھا کہ کسی سکول میں پڑھانے کا کام کریگی۔ لیکن اس کے باپ پنڈت نروتم لال کو فالج آ گیا۔ اور وہ پلنگ پر پڑ گیا۔ اور دو چار مہینے گزارنے کا بھی سہارا نہ رہا۔ پنڈت نروتم لال کے بچپن کے ساتھی اور اس کارخانے کے مالک جہاں وہ کام کرتا تھا۔ پنڈت امر چند کو خیال ہوا اور وہ نروتم لال کو سمجھا بجھا کر کامنی کو اپنے کارخانے میں لے آئے اور اپنا سکریٹری بنا لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نروتم لال کو کوئی تکلیف نہ ہو اور کامنی ان کی نگرانی میں رہے۔ نروتم لال کے بعد یوں بھی ان کو ایک بھروسے کے آدمی کی ضرورت تھی جو ہر چیز کی نگرانی رکھے۔ خاص کر کاغذات پر۔ نروتم لال کی بیماری سے وہ بالکل اکیلے پڑ گئے تھے۔ ان کا بیٹا چار سال سے امریکہ میں تھا۔ اور ابھی اس کے آنے میں دیر تھی۔

اتول جب کام سیکھ کر واپس آیا تو اپنے موٹر کے کارخانے کی دیکھ بھال کرنے لگا تو کامنی پنڈت امر چند کی سکریٹری بن چکی تھی۔ کارخانے کے ایک طرف دوسری منزل پر کئی کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پنڈت امر چند بیٹھے تھے۔ اور اس کے بغل والے کمرے میں کامنی۔ جس میں اس سے پہلے اس کا باپ بیٹھا کرتا تھا کمرہ بھی ایسا بنا ہوا تھا کہ بیچ کا دروازہ کھلنے سے ایک ہو جاتا تھا۔ اور وہ ہر وقت پنڈت جی کی نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اور جب اتول آیا تو پنڈت جی کے پاس ہی اس کے بیٹھنے کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح پنڈت امر چند، اتول اور کامنی پاس ہی بیٹھتے تھے۔ کامنی نے سارے کاموں کو سمجھ لیا تھا۔ اور سارے دفتر پر چھا گئی تھی۔ پنڈت امر چند اور اتول کے سوا کارخانے کے سارے لوگ اسے بہن جی کہتے تھے۔ اس لئے بھی کہ وہ پنڈت نروتم لال کی بیٹی تھی۔ اور وہ کارخانے کے ہر آدمی کو ان کی مہربانیاں یاد تھیں۔ ایک بوڑھا لال محمد مستری تھا جو اسے کموجی کہتا تھا۔ وہ بھی اس لئے کہ پنڈت نروتم لال نے اسے نوکر رکھا تھا۔ اور کامنی جب چھوٹی تھی تو اسے گود میں کھلایا تھا۔

کامنی کارخانے کے لئے اور اس سے بھی زیادہ پنڈت امر چند اور اتول کے لئے ضروری بن گئی تھی۔ جس طرح وہ ہر کاغذ کو جان گئی تھی اسی طرح پنڈت امر چند اور اتول کو بھی۔ اور اسی طرح دونوں کا خیال رکھتی تھی۔ پنڈت امر چند کو اس پر بڑا بھروسہ تھا۔ ان کے لئے سگار سے بسکٹ سے لے کر ناشتہ کے لئے مکھن اور جام تک وہی منگاتی تھی۔ اور انہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہوتی تھی تو کامنی سے کہتے تھے۔ اتول کو پہلے تو یہ بات بہت کھٹکی۔ لیکن کچھ دنوں

کے بعد وہ کامنی کی ضرورت کو سمجھنے لگا ۔ دفتر کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی ۔ دونوں چھ چھ گھنٹے ساتھ رہتے تھے ۔ اور سینکڑوں بار دفتر کی باتیں کرتے تھے ۔ لیکن اور کوئی بات نہ ہوتی تھی ۔ کبھی کبھی کامنی نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ کوئی کاغذ لے کر اتول کے پاس گئی تھی، تو اتول نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا ۔ جو عام نظروں سے الگ ہوتی تھی ۔ اور کبھی کبھی اتول کی زبان بولتے بولتے لڑکھڑا جاتی تھی ۔ اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ کبھی کبھی اتول اسے خالی نظروں سے تاک رہا ہے ۔ اور جب دونوں کی نظر مل گئی ہے تو گھبرا گیا ہے ۔ جلدی سے نظر جھکا لی ہے اور سٹ پٹا گیا ہے ۔ کبھی کبھی اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اتول اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہے ۔ اور اس نے بھی اپنے دل میں گرمی محسوس کی تھی لیکن دونوں کے بیچ میں پنڈت امرچند سمجھتے تھے جو پہاڑ کی طرح دونوں کو دو طرف رکھے ہوئے تھے ۔ دونوں کے دل ایک دوسرے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے ۔ لیکن دونوں دور تھے ۔

پنڈت امرچند دولت مند آدمی تھے اور ان کے پاس پہلے بھی کئی سکریٹری کام کر چکے تھے ۔ لیکن کامنی والی بات کسی میں نہ تھی ۔ وہ پنڈت امرچند اور اتول کو اس قدر جان گئی تھی کہ اسے کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ ہوتی تھی ۔ اگر وہ پنڈت جی اور اتول کو کاموں میں الجھا دیکھ لیتی اور اندازہ کر لیتی کہ کھانے کے لئے گھر جانے کا وقت نہیں ہے یا زیادہ دیر میں چھٹی ہوگی تو آدمی بھیج کر گھر سے کھانا منگوا لیتی ۔ اور وقت پر کھلا دیتی ۔ اگر شام کے وقت انھیں کہیں جانا ہوتا اور سمجھ لیتی کہ گھر جانے کا وقت نہیں ملے گا تو آدمی بھیج کر ان کے لئے کپڑے منگوا لیتی اور وہ صاف کپڑے بدل کر چلے جایا کرتے ۔ جب تک وہ دفتر میں رہتی دفتر کے کاغذات اور دونوں باپ بیٹے کے آرام کے خیال میں الجھی رہتی ۔ اور اتول کی بھی عادت سی تھی کہ ہر کام کامنی پر چھوڑ دیتا ۔ خواہ وہ ضروری خطوں کو ٹائپ کرا کے ایک نظر دیکھنے کے بعد پنڈت امرچند سے دستخط کرانے ہوں یا کسی کے لئے کپڑے خریدنے ہوں ۔ اور کامنی سارے کام خوشی سے کرتی ۔ ایسے کام بھی جو اس کی ذمہ داری نہیں تھی ۔ اور اس طرح وہ پنڈت امرچند اور اتول کی زندگی میں رچ بس گئی تھی ۔ دونوں ایک ہی بات محسوس کرتے تھے ۔ اور وہ یہ کہ کامنی کو الگ نہیں کر سکتے لیکن اتول اس سے بہت زیادہ محسوس کرنے لگا تھا

پنڈت امرچند دن بھر دفتر میں رہتے تھے ۔ اور دونوں پر کڑی نظر رکھتے تھے ۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی بات بھی نہ دیکھی تھی جو دونوں میں سے کسی پر کوئی شک ہوتا ۔ انھوں نے دونوں کو بے ضرورت باتیں کرتے بھی نہیں دیکھا تھا ۔ کامنی دن بھر اپنی میز کے سامنے بیٹھی کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھا کرتی تھی ۔ اور بے ضرورت کمرے سے باہر بھی نہ نکلتی تھی ۔ یا کاغذ پر سے نظر اسی وقت ہٹاتی جب کوئی اس سے کچھ پوچھتا ۔ پنڈت امرچند بہت خوش تھے ان کا سارا کام کامنی کی وجہ سے ہلکا ہو گیا تھا ۔ لیکن اتول تو سمجھنے لگا تھا کہ اگر کسی وجہ سے بھی کامنی نہ رہی تو پھر اس کے کوئی کام کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا ۔ اتول جو کچھ جانتا تھا وہ کارخانے کے بارے میں دفتر کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ یہ کہ اتول کبھی کبھی سوچنے لگتا تھا کہ کیا کامنی جیسی دوسری سمجھدار عورت اور بھی مل سکتی ہے جسے وہ اپنی جیون ساتھی بنائے ۔ نیک سادہ، سمجھدار اور خوبصورت ۔ کچھ نہ بولنے پر بھی کامنی نے اتول کے دل میں اپنے لئے جگہ بنا لی تھی ۔ اور کامنی بھی سوچا کرتی تھی کہ ان دونوں باپ بیٹوں کی طرح سیدھا سادہ اور شریف کوئی اور بھی ہوگا ۔ پنڈت امرچند تو خیر بوڑھے آدمی تھے لیکن اتول نوجوان تھا ۔ اور وہ جانتی تھی کہ آجکل کے جوان کیسے ہوتے ہیں ۔ ہر روز بہت سے جوانوں کو دیکھتی تھی اور ان کی نظر کو پہچانتی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں گرمی محسوس کرتے تھے ۔ لیکن کامنی منہ سے کچھ نہ بولتی تھی ۔ اور اتول باپ کے ڈر سے ۔

ایک دن کامنی ذرا دیر کر کے آئی ۔ ایک ضروری خط پر پنڈت امرچند دستخط کر چکے تھے اور اتول نے بھی اسے دیکھا تھا ۔ مگر وہ خط بھیجا نہیں گیا تھا ۔ کامنی آ گئی تو اس نے دیکھا اور فوراً پنڈت جی کے پاس پہنچی ۔ انھیں سمجھایا کہ اس خط کو بھیجنے سے ہزاروں کا گھاٹا ہو جائے گا ۔ اور خط کو روک کر دوسرا خط بھجوایا ۔ اس دن پنڈت امرچند نے خوش ہو کر کہا تھا ۔ کامنی تم نوکر نہیں ہو ۔ میرے بچپن کے ساتھی کی بیٹی ہو ۔ میری بھی بیٹی ہو ۔ میرے بعد بھی تم ساری زندگی کہیں اور کام کرنے کی بات نہ سوچنا اتول تمھارا بھائی ہے ۔ ساری زندگی اپنے بھائی کے ساتھ رہنا ۔ اور اس کی خبر گیری کرنا اتول بڑا سیدھا سادہ اور بے پرواہ ہے ۔

لیکن کامنی نے ان کی بات سنکر محسوس کیا تھا کہ پنڈت امرچند نے اس کے دل پر گھونسا مارا ہے اور اس کا سر چکرا گیا تھا ۔ اگر یہی بات وہ تین چار مہینے پہلے کہتے تو وہ خود کو سنبھال لیتی ۔ مگر اس وقت انھوں نے کہا تھا جب تیر کمان سے نکل چکا تھا ۔ دو ڈھائی مہینے پہلے جب پنڈت جی کو بخار آ گیا تھا اور پندرہ دنوں تک کارخانے نہیں آئے ۔ تو بات بہت آگے بڑھ چکی تھی ۔ اور دونوں کے دلوں کے بند ٹوٹ چکے تھے جس بات کو دونوں نے بہت دنوں تک دل کی گہرائی میں چھپا رکھا تھا ۔ وہ ایک دن ایک دم اوپر آ گئی تھی ۔ ایک دن بہت سے ضروری خط بھیجنے تھے ۔ کارخانے میں نیچے چند آدمی کام کر رہے تھے اور سارے لوگ جا چکے تھے ۔ بس اتول بھی خطوں پر دستخط کر کے جانے والا تھا ۔ جب کامنی سارے خط لے کر اس سے دستخط کرانے آئی تو اتول نے پاگلوں کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور اپنی محبت کا اظہار کر دیا تھا ۔ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے

جیات. جا . . .
. کی باتیں چھڑتی ہیں۔ لیکن وہ برابر انکار کرتا جا رہا ہے
۔ تو کامنی نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ بیوہ ہے اور کل کی
ریت کے مطابق اس کا دوسرا بیاہ نہیں ہو سکتا۔ اور
اگر وہ کل کی ریت کو ٹھکرا کر تیار بھی ہو جائے تو نہ تو اس
کا باپ تیار ہوگا اور نہ پنڈت جی۔ دونوں پرانے
خیال کے آدمی ہیں۔ اور وہ دوستی سے کسی کو بھی دکھ
پہنچانا نہیں چاہتی۔ کام کی وجہ سے مانا اور بات ہے،
لیکن پنڈت امر چند اسے کیسے پسند کر سکتے ہیں کہ اس
کا اکلوتا بیٹا ایسی لڑکی سے بیاہ کرے جس کا باپ
ان کے ہاں نوکر اور جواب خود نوکر ہے۔ اور بیوہ
بھی ہے۔ پنڈت جی کسی دولت مند کی کنواری لڑکی
کو اپنی بہو بنائیں گے جو اپنے ساتھ لاکھوں کا سامان
لائے۔ لیکن اتول پر اس کی کسی بات کا بھی اثر نہیں
ہوا۔ اور اس نے کامنی کا ہاتھ اس وقت تک نہیں
چھوڑا جب تک اس نے بھی محبت کا اقرار نہ کر لیا
اتول نے کہا تھا کہ موقع پا کر ماں باپ سے اپنے دل کی
بات کہے گا۔ اور انھیں رضامند کر لے گا۔ اور اگر
وہ نہ مانے تو وہ بیاہ کی بات کو ٹالتا ہی جائے گا۔
اور اس دن کا انتظار کرے گا جب وہ آزاد ہوگا۔
اور اس وقت اس سے بیاہ کر لے گا۔ اور اس
نے بھی سوچا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا اتول کے
ساتھ زندگی گزار دے گی۔ اتول نیک اور شریف
تھا۔ اور اس سے محبت کرتا تھا۔ اگر اتول جوانی کے
ترنگ میں کوئی غلط فائدہ اٹھانا چاہتا تو ضرور
ایسی ویسی باتیں کہتا۔ لیکن اس نے کوئی ایسی بات
نہیں کہی تھی۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن سینما دیکھنے
جاتا تھا۔ مگر کبھی سینما چلنے کو بھی نہ کہتا تھا۔ اسے یقین
تھا کہ اتول سچ مچ اس سے محبت کرتا ہے اور
اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ دل میں سوچا
کرتی کہ وہ بالکل بے سہارا نہیں ہے۔ لیکن جب
پنڈت امر چند نے اس سے کہا کہ اتول کو نہ چھوڑے
گی اور بھائی کے ساتھ ساری زندگی گزار دے گی

اس دن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ساری زندگی
اتول کے ساتھ رہے گی۔ لیکن اور ساری باتیں دل
سے نکال دے گی اور اپنی محبت کو قربان کر دیگی
اور اتول کی راہ سے ہٹ جائے گی بلکہ بہت جلد
ہی بیاہ کر لینے پر آمادہ کر لے گی۔ پھر سوچے گی کہ
زندگی کے باقی دن کس طرح کاٹے۔ ہوش سنبھالتے
ہی وہ ایک آگ میں جل رہی تھی۔ اب دوسری
آگ میں جلنے کیلئے بھی خوشی سے تیار تھی۔ اسے
صرف ایک فکر تھی اور وہ اتول کی۔ کوئی ایسا کام
کرنا نہیں چاہتی تھی جو اسے دکھ پہنچے۔ اس نے
بڑی عقلمندی کے ساتھ کام کرنا شروع کر
دیا تھا۔ اتول کے بیاہ کی باتیں کئی جگہ سے آئیں اور
وہ کسی نہ کسی بہانے سے انکار کرتا گیا۔ ماں باپ
تھک گئے تھے۔ جب شہر کے بڑے کاروباری
پنڈت اونکار ناتھ کی بیٹی سمترا سے اتول کے
بیاہ کی بات چلی تو پنڈت امر چند نے کامنی سے
بھی مشورہ کیا۔ اس نے پسند کیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا
کہ ابھی اتول سے بات نہ کی جائے۔ کہیں پھر وہ
پہلے کی طرح کوئی بہانہ نکال کر انکار نہ کر دے۔
اور پنڈت جی سے کہا تھا کہ یہ بات اس پر
چھوڑ دی جائے۔ وہ اتول کے مزاج کو سمجھتی
ہے اور اسے رضامند کر لے گی۔ پنڈت جی کو
کامنی کی عقل پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور انھوں نے
ہر کام کامنی پر چھوڑ دیا تھا۔ اور کامنی نے طے
کر لیا تھا کہ بیاہ کرا کے رہے گی۔ اور اپنے کل
کی مریادا کو بچا کر الگ ہو جائے گی۔

سمترا کا بھائی راجن اتول کا دوست تھا۔ ہر
روز شام کے وقت دونوں ساتھ سیر کرنے جایا
کرتے تھے۔ کامنی نے اس سے کہا کہ کلب کے بدلے
اتول کو اپنے گھر لے جایا کرے۔ اور وہیں تاش
کھیلا کرے۔ اس طرح اتول اور سمترا کو ایک
دوسرے کو جاننے کا موقع مل جائے گا۔ سمترا
خوبصورت بھی تھی اور پڑھی لکھی بھی۔ کامنی کو یقین تھا
کہ اتول سمترا کو جان لے گا تو اس سے بیاہ کی بات
مان لے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے دل کو
دھکا سا تو ضرور لگتا مگر وہ فوراً سنبھل جاتی۔ اور
سوچتی ایک چیز کو بنانے کے لئے دوسری چیز بگاڑنی
ہی ہوتی ہے۔ اور اتول کی زندگی کو بنانے کے لئے اسے
اسے اپنے دل پر ایک اور زخم کھانا ہی پڑے گا۔
اب اس کی زندگی ہی کیا تھی۔ جو تھی وہ بگڑ چکی تھی۔ اور
اگر وہ اسے دوبارہ بنانے کی کوشش کرے گی تو کل
کی مریادا بگڑ جائے گی۔ اور اگر کل کی ہی جاتی رہی تو
پھر زندگی بنی کیا، برباد کی برباد رہی۔

وہ ہر روز اتول کو راجن کے ساتھ زبردستی
بھیج دیتی اور راجن گھما پھرا کر اپنے گھر لے جاتا۔ پھر
وہاں اپنی بہن سمترا کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلتا۔
یا اور کوئی پروگرام بنتا۔ تو سب کے ساتھ اور ایک ڈیڑھ
مہینہ کے بعد جب اس نے اتول سے پوچھا کہ سمترا
کیسی لڑکی ہے۔ اور وہ مسکرا کر رہ گیا تو کامنی کو بڑا
اطمینان ہوا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب پنڈت
جی سے کہدے کہ بات پکی کر لیں۔ مگر پھر بھی وہ
کئی دنوں تک نہ کہہ سکی۔ ہر روز سوچتی اور ہر روز اس
کی زبان بند رہ جاتی۔ اپنے طور پر اس نے طے
کر لیا تھا کہ وہ پنڈت جی سے کہنے کے بعد ماں باپ
کو لے کر بنارس چلی جائے گی۔ جہاں اس کی دولتمند
پھوپھی اس لئے رہتی تھی کہ وہاں مرے اور گنگا کے
کنارے جلائی جائے۔ اس نے بھی کئی بار بھائی اور
بھاوج کو بلایا تھا۔ مگر کامنی راستے میں رکاوٹ
تھی۔ اب کامنی تیار تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اس
سے اچھی زندگی اور موت کیا ہوگی کہ جب تک زندہ
رہے صبح و شام بھگوان کے درشن ہوں اور جب
مرے تو گنگا کے کنارے جلائی جائے۔ اور اس
کی راکھ کو گنگا کی موجیں سمیٹ لیں۔ کوئی نیک
ہندو عورت اس سے اچھی زندگی اور موت اور سوچ

بھی سکتی ہے۔ پھر بھی یہ سوچ کر سہم جاتی کہ اس طرح چلے جانے کا اثر اتول پر کیا ہوگا۔ اور کیا سچ مچ ابھی اسے اتول کے دل سے نکال سکے گی؟ وہ اتول کے راستے سے الگ ہو جانا چاہتی تھی مگر خود اپنے نکلنے کا کوئی راستہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ اور یہ اس کے لئے ناممکن تھا کہ ایک بار اتول سے محبت کا اقرار کر لینے کے بعد پھر اس کے لئے بہن کا جذبہ دل میں پیدا کرے اور اس کے ساتھ بہے' نہ جانے کتنی راتوں کو اتول کے ہاتھوں کو اس نے اپنے گلے میں محسوس کیا تھا۔ اور اس کی گرم سانسیں اپنے گالوں پر۔ تھا تو یہ سب خیال لیکن وہ دل ہی دل میں اتول کو اپنے دل کا مالک مان چکی تھی۔ تھا تو یہ سب خیال ہی لیکن اس کا دل اور دماغ کیا سوچ رہا تھا۔ دل ایک طرف تھا اور دماغ دوسری طرف۔

چندرا ناول پڑھتی جا رہی تھی اور یہ جاننے کے لئے بے چین تھی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ کامنی اس الجھن سے کس طرح نکلتی ہے۔ اور اتول کیا کرتا ہے۔ کہانی کہاں اور کس طرح ختم ہوتی ہے۔ کامنی نے پہلے بھی دو بار ایسا فیصلہ کیا تھا۔ ایک بار تو اس نے رات کو فیصلہ کیا۔ لیکن دوسرے دن خود ہی اٹھ کر دفتر میں آگئی اور ایک بار اس نے استعفا لکھ کر بھیج دیا۔ تو خود پنڈت جی جا کر لے آئے۔ اور اس دن اتول اس سے دن بھر نہ بولا۔ اور وہ اتول سے الگ بھی نہ ہو سکی۔ بھاگنے کے سارے راستے بند تھے۔ ایک طرف اتول تھا دوسری طرف پنڈت جی اور اس کے ماں باپ اور کل کی مریادا۔

چندرا کو افسوس ہوا کہ موہنا ایسے وقت میں کیوں آگئی اور آئی تو بچے کو لیکر کیوں آئی۔ اس کا پڑھنا بھی حرج ہوا اور بچہ بھی ڈر گیا۔ اور اب تک رو رہا تھا۔ وہ گھر کے سارے لوگوں سے الگ کمرے میں لیٹی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ اور سب نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ جس طرح چاہے زندگی کے دن کاٹے اور ناول پڑھنے سے بڑا سہارا ملا تھا۔ اور ایک بات سمجھ میں آگئی تھی کہ دکھوں کا خیال کرنا بھی بیکار ہے۔ آدمی دکھوں کی گودی میں پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تک زندہ رہتا ہے طرح طرح کے دکھ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ زندگی نام ہی ہے دکھوں کو جھیلنے اور ان کا مقابلہ کرنے کا۔ اور خوشی ان پلوں اور گھڑیوں کا نام ہے۔ جب آدمی ان دکھوں پر قابو پا لیتا ہے اور دکھوں کے پنجے سے نکل بھاگتا ہے۔ بس دنیا میں وہ اکیلی دکھی نہیں ہے۔ ہر آدمی دکھی ہے۔ کسی کو کوئی دکھ ہے اور کسی کو کوئی دکھ۔ دکھوں سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے۔ اور ان دکھوں میں سے خوشی کا کچھ وقت نکال لینا ہی انسان کی بڑی کامیابی ہے۔

چندرا کی زندگی دکھوں کی ندی میں تنکے کی طرح بہتی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ کب اور کس کنارے لگے گی۔ یا اسی طرح بہتے بہتے کسی دن بیچ دھارے میں ڈوب جائے گی۔ لیکن جب سے اس نے ناول پڑھنا شروع کیا تھا تو اپنے کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اگر آدمی اپنے دکھوں کو بھول کر دوسرے کے دکھوں میں شریک ہو جائے تو اپنے دکھوں کو بھول کر خوشی حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو کھونا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنے دکھوں میں کمی پاتی تھی۔ اس کے دل کے اندر دوسرے آدمیوں کیلئے اتھاہ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے کوئی دکھ ہی نہیں ہے۔ وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کر سکتی ہے۔ جو سچ مچ دکھوں میں گھرے ہوئے ہیں دکھ بھی انسان کے لئے ہوا پانی اور اناج کی طرح ضروری ہے اس سے چھٹکارا ہی نہیں۔ دنیا کا سب سے دکھی آدمی وہی ہے جسے کوئی دکھ نہ رہ جائے۔

چندرا کی زندگی عجیب تھی۔ رستم کے نامی وکیل کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ تین اور چھوٹی بہنیں تھیں۔ بچپن ہی سے بدصورت تھی۔ جب تک چھوٹی تھی کوئی نہ کوئی بیماری دبوچے رہتی تھی۔ کالی تو تھی ہی۔ ایک بار چیچک نکل آئی تو رہی سہی کمی بھی پوری ہو گئی۔ ساری بدن پر بڑے بڑے داغ پڑ گئے۔ ناک کچھ بیٹھ گئی۔ آنکھیں کمزور ہو گئیں ماں باپ پر فکر کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس لڑکی کا کیا ہوگا تینوں بہنیں شکل کی اچھی تھیں۔ مگر یہ سب کی راہ کا پتھر بن گئی تھی۔ پڑھنے لکھنے میں تو بہت اچھی تھی۔ مگر پڑھنا لکھنا تو سب کچھ نہیں، اور وہ بھی لڑکی کے لئے۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی۔ ماں باپ کے دل کا بوجھ بھی بڑھتا گیا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ خود اس بوجھ کے نیچے دبی ہوئی محسوس کرنے لگی۔ ماں باپ اور رشتہ داروں نے کوشش کی کہ یہ بوجھ اٹھا کر کسی اور کندھے پر ڈال دیں۔ مگر ساری کوششیں بیکار گئیں۔ اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے کوئی بھی کندھا بڑھانے کو تیار نہ ہوا۔ بلکہ جس طرف لوگ بڑھتے وہ ہٹ جاتا۔ مجبور ہو کر ماں باپ نے دوسری بیٹی للتا کا بیاہ کر دیا۔ آخر ایک کے لئے دوسری کو کب تک بٹھائے رہتے۔ پھر دو سال بعد تیسری بیٹی آما کا بھی بیاہ ہو گیا۔ اور ایک سال کے بعد سب سے چھوٹی موہنا کا بھی۔ لیکن وہ سب سے بڑی تھی۔ جو بیٹھی رہ گئی۔ چندرا کو کوئی بر نہیں ملا۔ اور چندرا پر جوانی آئی تو ساون بھادوں کے بادل کی طرح۔ بس ٹوٹ کر برس جانے کو بے چین۔ نہ جانے بچپن کی ساری بیماریاں اب کہاں چلی گئی تھیں۔ اس کا سارا بدن تازہ منڈھے ہوئے ڈھول کی طرح تنا ہوا تھا۔ ذرا سی چوٹ لگے اور ٹن ٹن بول اٹھے۔ جب وہ بلاؤز پہنتی تو کہنیوں سے اوپر پھنس جاتا۔ اور آستین میں پھنس کر بانہہ کی مچھلیاں تڑپنے لگتیں۔ اور وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ جب ذرا سانس لیتی تو ایسا لگتا کہ بلاؤز کے سارے بٹن تڑ تڑ ٹوٹ جائیں گے۔ اس کی چھاتی پھٹ جائے گی۔ اور دل تڑپ کر باہر نکل آئے گا۔ اس وقت وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرتی۔ اور اس کا جی چاہتا کہ سارے کپڑے اتار پھینکے اور جوڑ جوڑ کو آزاد کر دے۔ وہ سانس روک لیتی اور اس کا جی چاہتا سچ مچ چھاتی پھٹ جائے اور ساری الجھن ختم ہو جائے۔ مگر نہ چھاتی پھٹتی تھی نہ الجھن ختم ہوتی تھی۔

ماں باپ نے کیا کوشش نہیں کی۔ مگر چندرا کے لئے کوئی بر ملا نہیں ملا۔ ماں باپ نے تو اسی وقت اس کے بیاہ کی بات شروع کر دی تھی۔ جب وہ ٹھیک سے جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ دولت ہونے پر بھی چندرا کے لئے بر ڈھونڈھ لینا پہاڑ کاٹ کر نہر نکالنے سے کم کٹھن کام نہیں۔ ایک تو یوں ہی کالی کلوٹی اور معمولی صورت کی پیدا ہی ہوئی تھی۔ بیماریوں نے اسے اور بھی بدصورت بنا رکھا تھا۔ مگر ماں باپ کو امید تھی کہ جوان ہو کر کچھ نہ کچھ صورت نکھر آئے گی۔ اور بدصورتی دب جائیگی۔

مگر چندرا جیسے جیسے جوان ہوتی گئی اس کی بدصورتی نکھرتی گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے بدصورتی کا نمونہ بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ کالا کلوٹا رنگ، چہرے پر چیچک کے بڑے بڑے چکیلے داغ، چھوٹی پیشانی، چپٹی ناک، چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں، موٹے موٹے اور کچھ الٹے ہوئے ہونٹ۔ ایسی لڑکی سے بیاہ کون کرتا۔ لڑکیوں کا کال تو نہیں۔ بات چلتی اور ختم ہو جاتی۔ تینوں چھوٹی بہنوں کا بیاہ بھی ہوا اور سب کے بچے بھی ہو گئے مگر وہ بیٹھی رہی۔ ماں باپ نے تھک کر کوشش کی کہ کوئی معمولی آدمی یا کوئی رنڈوا ہی مل جائے۔ تو اس کا بیاہ تو ہو جائے۔ انھوں نے روپے کا بھی لالچ دیا مگر کوئی بر ملا ہی نہیں۔ حد تو یہ تھی کہ چکردھر بابو اس کے باپ کے کلرک تھے اور دن بھر مقدموں کا بستہ اٹھائے پھرتے تھے۔ اور اس کے باپ کو حضور کہتے کہتے منہ سوکھتا تھا۔ عمر بھی پچاس سال سے کم نہ تھی چار چار بچے تھے۔ اس کی بیوی گئی تو اس کے باپ نے خود ہی ان سے کہا۔ مگر انھوں نے بھی بات بنا کر انکار کر ہی دیا۔

چندرا کو سب کچھ معلوم تھا۔ اس کے ماں باپ اس کے بیاہ کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھے۔ انھوں نے غریب اور معمولی گھر کے لڑکے کو ہزاروں کا تلک اور جہیز دینے کو کہا تھا۔ ہر طرح کا لالچ دیا تھا۔ مگر چندرا کی صورت کیسے بدل دیتے۔ یہ ان کے بس سے باہر بات تھی۔ چندرا خود بھی اسے سمجھتی تھی۔ اسکول سے کالج تک لگاتار کئی برسوں تک وہ ہر روز باہر جایا کرتی تھی اور دیکھتی تھی کہ جوان لڑکے دوسری جوان لڑکیوں کو کن انکھیوں سے دیکھتے تھے۔ اس کی ساتھی سومنگلا تھی۔ گوری چٹی اور خوبصورت۔ رکمنی بھی نکھرے نقشے کی سانولی سی لڑکی۔ سیر بھا بھی معمولی صورت کی لڑکی۔ ان میں سے کوئی بھی بھرپور جوان نہیں تھی۔ مگر گھر سے نکلنے کے بعد اسکول کے دروازے تک نوجوانوں کی نگاہیں ان کے قدم چومتی تھیں لیکن اسے کوئی پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا تھا البتہ کئی مرتبہ راستے میں اسکول اور کالج کے لڑکوں نے اس پر پھبتیاں ضرور کسی تھیں۔ ایک دن وہ سومنگلا کے ساتھ اسکول جا رہی تھی۔ تو راستے میں کئی لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا "ارے دیکھو چاند کے ساتھ ساتھ کالی بدلی بھی ہے۔" اور سارے لڑکے ہنس پڑے تھے۔ اس دن اس کے بدن میں دیر تک چنگاریاں سی چھوٹتی رہی تھیں۔ ایک دو بار نہیں سیکڑوں بار لڑکوں نے اس پر پھبتیاں کسی تھیں۔ اور اس کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔ ایک دن کالج جا رہی تھی تو ایک لڑکے نے سامنے آ کر ہاتھ جوڑے۔ پرنام کیا اور بولا کالی میا مری پرارتھنا مان لے۔ ایسے مت نکلا کر ہم لوگوں کو ڈر لگتا ہے۔ اس دن وہ خوب روئی تھی۔ اور رنج اور غصہ سے کھانا بھی نہیں کھا سکی تھی۔

لیکن جب موہنا کا بچہ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اس کا کلیجہ سچ مچ پھٹ جائے گا۔ وہ موہنا کے کمرے سے چلے جانے کے بعد دیر تک پلنگ پر پڑی روتی رہی یہ تو آخری حد تھی کہ وہ بچے کو پیار کرنے کو بڑھی اور وہ ڈر گیا۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا تو اس نے پھر ناول پڑھنا چاہا۔ مگر جی نہ لگا۔ نہ اسے کامنی یاد آ رہی تھی نہ اتول اور نہ سمترا۔ اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ موہنا کو پکارے اور اس سے باتیں کرے مگر موہنا خود ہی کمرے میں آ گئی اور بولی۔

"بڑا نٹ کھٹ ہے دیدی، میرے سوا کسی کے پاس نہیں رہتا۔ اور کوئی زبردستی لینا چاہے تو رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیتا ہے۔" چندرا موہنا کی بات سن کر مسکرا دی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ موہنا اس کا دل رکھنے کو باتیں بنا رہی ہے ورنہ بچہ ہنس مکھ تھا۔ اور اب کمرے سے باہر نانی کی گودی میں کلکاریاں بھر رہا تھا۔ چندرا نے بات ہی بدل دی اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ ایسے اچانک کیسے آ گئی۔ موہنا نے بتایا کہ اس کی جٹھانی کسم بہت بیمار ہے۔ اور اس کا پتی گھبرا کر یہ کہنے کو آیا ہے کہ وہ لوگ آ جائیں اور علاج ہو۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ کسم کی آنت میں زخم ہے اور آپریشن ضروری ہو گیا ہے۔ آپریشن پٹنہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے باپ نے پاس والا مکان دے دیا ہے اس کا پتی رات کی گاڑی سے گھر واپس جائے گا۔ اور دوسرے دن شام تک مراری بابو کسم کو لے کر آ جائیں گے۔ پھر علاج ہو گا اور آپریشن ہو گا۔

چندرا کسم کو جانتی تھی۔ دونوں اسکول میں ساتھی تھیں۔ کسم خوبصورت نیک اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ جو دن بھر ذرا ذرا سی بات پر ہنستی رہتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کی طرح نہ شور ہنگامہ کرتی تھی اور نہ کسی سے لڑتی تھی اور نہ ہر لڑکی سے زیادہ ملتی تھی۔ عمر میں اس سے چھوٹی تھی۔ مگر دونوں میں دوستی تھی لیکن کالج جانے سے پہلے ہی اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ بچے تو کئی ہوئے تھے لیکن صرف دو چھوٹے بچے رہ گئے تھے۔ چندرا کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ کسم کو بڑی خطرناک بیماری نے پکڑ لیا ہے۔ علاج آپریشن کے سوا اور کچھ نہیں اور اتنی کمزور ہے کہ فوراً آپریشن بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپریشن کسی وقت بھی ہو خطرناک ہو سکتا ہے۔ چندرا کو بہت سی پچھلی باتیں یاد آ گئیں۔ اور یہ سوچتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اگر کسم مر گئی تو اس کے بچوں کا کیا ہو گا۔ مراری بابو کو دوسری پتنی مل جائے گی لیکن بچوں کو ماں کہاں ملے گی زیادہ رنج یہ ہوا کہ بہت سے ناولوں میں اس نے سوتیلی ماؤں کے بارے میں پڑھا تھا اور سچے واقعات بھی سنے تھے کہ سوتیلی ماؤں کے آنے کے بعد بچوں کی زندگی کس طرح برباد ہو گئی۔ اس کے دل میں بچوں کے لئے ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگا جن کے سر پر دکھ کے بادل منڈلا رہے تھے۔

دوسرے ہی دن مراری بابو کسم اور بچوں کو لے کر آ گئے چندرا اس سے ملنے گئی اور اسے معلوم ہوا کہ مراری بابو بچوں کو لانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر کسم نہ مانی۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ بچے نہیں جائیں گے تو وہ علاج کرانے نہیں جائے گی۔ پہلے دو بچے مر چکے تھے۔ اور وہ موت اور زندگی کی کھینچ تان میں بچوں کو اپنی نظر سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر بچوں کو ساتھ لانے کے بعد دوسرا سوال بھی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ مراری بابو کی

ں پڑھی تھیں اور اوپر کا کام کرنے کے لئے ایک بڑھی
مت تھی۔ ایک عورت اور بھی تھی۔ مگر بالکل گنوار۔ چندرا
ب کسم سے ملتی تو اس نے اطمینان دلایا کہ بچوں کی طرف
ے مطمئن رہے۔ وہ خود دیکھ بھال کرے گی۔ اور بچوں
و تکلیف نہیں ہونے دے گی۔ اور کسم نے احسانمند
ا ہوں سے اسے دیکھا تھا۔ اور باتیں کرتے کرتے اس
ی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

نولو اور پوٹو بڑے پیارے بچے تھے۔ بھولے بھالے
ہ ہنس مکھ۔ کسم نے دونوں کو پاس بلایا اور کہا۔ "یہ ماسی
یں" پرنام کرو۔ اور دونوں بچوں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام
یا۔ نولو چار سال کا تھا اور پوٹو دو سال کا۔ چندرا نے ذرا
بلایا تو دونوں بچے اس کے پاس آ گئے۔ پوٹو نے اپنے ننھے
ننھے ہاتھوں سے چندرا کے چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا اور
ہ ڈر گئی کہ کہیں یہ لڑکا بھی ڈر کر چیخ نہ اٹھے۔ مگر پل بھر
بعد ہی وہ مسکرا دیا۔ اور توتلی زبان میں بولا۔

"ماسی تم بلی اچھی ہو"

اور چندرا کا دل پھول کی طرح کھل اٹھا۔ اس نے دونوں
چوں کو سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ اور نولو نے اس کی عینک
چھوتے ہوئے کہا۔

"ماسی اپنا چشمہ ہم کو دے دو۔"

کسم نے کمزور آواز میں کہا۔

"نہیں بیٹے بچے چشمہ نہیں لگاتے۔"

اور نولو نے عینک چھوڑ دی۔ کسم بولی۔

"ارے تم دونوں نے ماسی کو پیار تو کیا ہی نہیں۔"

اور دونوں بچوں نے دو طرف چندرا کے گالوں پر
پنے منہ رکھ دیئے۔ اور چندرا کو ایسا محسوس ہوا کہ اب
ک وہ جس چیز سے محروم تھی۔ وہ اسے مل گئی۔ دونوں
چوں کے لئے اس کے لئے محبت اور ہمدردی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

چندرا کو خود اپنے دکھ نے اس طرح گھیر لیا تھا کہ
اس سے نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی۔ اور دکھوں
کو بھول جانے کے لئے اس نے ناول پڑھنا شروع
کیا تھا۔ ناولوں کو پڑھنے کے بعد زندگی کو نئے پہلو
سے دیکھنے اور ان مسئلوں پر نئے ڈھنگ سے سوچنے
کا اسے موقع ملا تھا۔ اور اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ
غموں پر اختیار حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر آدمی اپنی
خواہشوں کو دل سے نکال دے اور دوسرے کے غم کو
اپنا لے۔ دوسروں کے دکھ کو دور کرنے کی کوشش
میں آدمی خود اپنے دکھوں کو بھول سکتا ہے۔ اور چندرا
نے دوسروں کے دکھوں کو کچھ اس طرح محسوس کرنا
شروع کیا تھا کہ خود اسے اپنے غم معلوم ہی نہیں ہوتے
تھے۔ اکثر وہ سوچتی رہتی تھی کہ آخر اسے غم ہی کیا ہے
صرف ایک یہ کہ اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ مگر اس ایک
غم نے اسے بہت سے غموں سے بچا لیا ہے۔ اُسے کسم اور
اس کے بچے یاد آئے جن کی ہر سانس اسے موت کی
طرف کھینچے لے جا رہی تھی۔ اور بچوں کے لئے کسم کی
پریشانی۔ اور وہ بے چین ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس
ہوا کہ ایک غم نے اسے ہزاروں غموں سے بچا لیا ہے۔ لو
اپنے ایک غم کسم کے غموں کو اپنا کر بھلا سکتی ہے۔
یوں بھی اپنے ایک غم کو بڑی حد تک بھول چکی تھی۔ اور
ناولوں کی دنیا میں کھو کر اپنے غم کو بھول گئی تھی۔

چندرا نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ اپنی زندگی دوسروں
کے غموں کو دور کرنے میں لگا دے اور اس طرح اپنے غم
کو بالکل ہی بھول جائے لیکن اس کا موقع بھی نہ تھا۔ کئی
بار اس نے سوچا تھا کہ بیماروں کی خدمت کو اپنی زندگی
کا مقصد بنا لے۔ صبح اٹھ کر ہسپتال جائے اور وہاں کام
کرتی رہے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ ماں باپ اس کی اجازت
نہیں دیں گے۔ باپ شہر کے بہت بڑے وکیل تھے۔
اور یہ کام بہت چھوٹا تھا۔ اگر وہ یہ کام شروع کرتی
تو ان کے نام کو بٹہ لگتا۔ اور وہ چپ چاپ کمرے میں
لیٹی لیٹی ناول پڑھتی رہتی۔ اور دوسروں کے دکھوں
کو محسوس کرتی رہتی۔ کسم کی بیماری نے موقع دیا تھا
کہ دوسرے کی سیوا کر کے اپنے غم کو بالکل بھول جائے۔

دوسرے ہی دن چندرا کی زندگی بدلنے لگی
صبح سویرے اٹھ کر کسم کے پاس چلی جاتی۔ دونوں
بچوں کو اٹھاتی۔ نہلاتی دھلاتی۔ کپڑے پہناتی۔ ناشتہ
کھلاتی۔ تھوڑی دیر کسم کے پاس بیٹھتی۔ اس سے باتیں
کرتی، دوا دیتی وقت پر دوا کھلاتی پھر اپنے گھر
آ جاتی۔ نہا دھو کر ناشتہ کرتی پھر کسم کے پاس چلی جاتی۔
بچوں کو اپنے پاس بٹھاتی ان سے باتیں کرتی۔ کہانی سناتی
پھر وقت پر کھانا کھلاتی اور ان کو کمرے میں کھیلنے کا سامان
دے کر اپنے گھر آ جاتی۔ بچے بھی اس کی بات مانتے تھے
اور گھوم پھر کر اس کے پاس رہتے تھے۔ کسم پلنگ پر پڑی
سب کچھ دیکھتی اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتی۔ وہ تو
شروع ہی سے جانتی تھی کہ چندرا کی شکل جتنی خراب تھی دل
اس کا اتنا ہی اچھا تھا۔ اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے
سوا اور کچھ نہ تھا۔

چندرا جب بچوں کی طرف سے مطمئن ہو جاتی تو کسم
کے پاس آ کر بیٹھتی اور گھنٹوں اس سے باتیں کرتی۔ بچپن کی
کہانیاں دہراتی اور اس سے ایسی باتیں کرتی جو کسم اپنی
تکلیف اور بیماری کو بھول جائے۔ اور کسم کا دل بھی لگ
جاتا تھا۔ مراری بابو خوش تھے کہ ایسے وقت میں کسم کی بچپن
کی ایک سہیلی مل گئی تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی اور بچوں کا بھی۔
اور ان کے دل میں چندرا کے لئے احسانمندی کا جذبہ پیدا
ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتے تھے کہ یہ عورت ہے یا دیوی
جو اس لگن سے کسم اور اس کے بچوں کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی
ہے۔ اور وہ جتنی بار چندرا کے بارے میں سوچتے ان کے دل
میں چندرا کے لئے زیادہ عزت پیدا ہوتی جاتی۔

شام کا وقت تھا چندرا نے بچوں کو ناشتہ کھلا کر
دائی کے ساتھ میدان میں بھیج دیا تھا۔ اور خود کسم کے
پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے
یقین دلا رہی تھی کہ وہ بہت جلد اچھی ہو جائے گی۔ لیکن
وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ مہینوں سے علاج ہو رہا
تھا مگر کمزوری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آپریشن کا اس وقت
تک سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا جب تک بدن میں طاقت
نہ آ جائے۔ کسم کو اپنی حالت کا اندازہ تھا۔ باتیں کرتے
کرتے اس نے چندرا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

[illegible] احسان [illegible]

[illegible] احسان سر پہ لئے چھوڑ جاؤں گی۔ اور اگر مر گئی تو سر پہ لئے جاؤں گی۔ تمہاری وجہ سے میرے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں۔"

اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ چندرا اسے دیر تک سمجھاتی اور یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ اچھی ہو جائے گی۔ اور اسے بچوں کی طرف سے بالکل بے فکر رہنا چاہئے لیکن کسم دیر تک ایک ہی بات کو دہراتی رہی تھی۔

ساتھ رہنے سے چندرا کو بچوں سے محبت ہو گئی تھی دونوں بچے بھی اس میں لپٹے رہتے تھے۔ اور کسم کی حالت سدھرنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ علاج جاری تھا لیکن اس کے بدن میں اتنی طاقت ہی پیدا نہ ہوتی تھی کہ آپریشن ہو۔ بلکہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ چندرا کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہونے لگتی تھی کہ اگر کسم مر گئی تو دونوں بچوں کا کیا ہوگا۔ مرادی بابو کی عمر چالیس سال بھی نہ تھی اور صحت اچھی تھی۔ گرہستی کو باقی رکھنے کے لئے بیاہ ضرور کریں گے۔ مگر سوتیلی کیسی ہوگی۔ اور بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے گی۔ ان بچوں کا کیا ہوگا [illegible] یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گئی۔

ایک دن چندرا اور کسم بہت دیر تک باتیں کرتی رہیں مرادی بابو ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔ دونوں بچے چندرا کے پاس بیٹھے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ دوسرے کمرے میں چل کر کوئی کہانی سنائے۔ کسم دیکھ کر مسکرا دی اور بولی۔

"چندرا مجھے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں ٹوٹو اور پٹو تمہارے ہی بچے تھے۔ جب ہی تو تم دونوں کے لئے اتنی تکلیف اٹھاتی ہو۔ ان سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہو اور یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ ویسے ہی گھل مل گئے ہیں کہ کبھی کسی گھر کے آدمی سے نہیں ملے۔"

چندرا نے دونوں بچوں کو اپنی گود میں سمیٹ لیا۔ اور پٹو سے بولی۔

"کہانی رات کو کہی جاتی ہے بد صورت بنو۔"

اور پٹو اینٹھ گیا تو چندرا بولی۔

"دن میں کہانی کہنے اور سننے سے راہی راہ بھول جاتے ہیں [illegible] ہوتا ہے۔"

ٹوٹو بولا۔

"تو پھر ہم ابھی کہانی نہیں سنیں گے جاتے ہیں اپنی موٹر چلانے۔"

اور پٹو بولا۔

"تو ہم بھی اپنی ریل چلانے جاتے ہیں۔"

اور دونوں بچے سائبان میں بھاگ گئے۔

چندرا مسکرا دی۔ واقعی دونوں بچے اتنے گھل مل گئے تھے۔ اسے خود بھی حیرت ہوتی تھی۔ اس کی اپنی بہنوں کے بچے تو اس سے بھاگتے تھے۔ اور یہ دونوں بچے اس سے اتنے گھل مل گئے تھے۔

کسم کا علاج ہو رہا تھا کہ بدن میں طاقت آجائے تو آپریشن ہو۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اور وہ روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں بچے چندرا میں الجھے جا رہے تھے۔ اور اتنے زیادہ گھل مل گئے تھے کہ اس کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب کوئی بات ہوتی تو ماسی ماسی پکارتے۔ اور وہ بڑی خوشی سے ان کے کام کرتی بچوں میں دلچسپی پیدا ہو جانے سے اس کی اداس زندگی میں نئی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ اور وہ دل کے اندر محسوس کرنے لگی تھی کہ اس کی زندگی بیکار نہیں ہے۔ اس کی اپنی زندگی چاہے جیسی بھی ہو۔ لیکن دوسروں کے کام آسکتی ہے اور کسی بھی بنا سکتی ہے۔ دوسروں کو خوشی پہنچا سکتی ہے اور اس احساس کے ساتھ ہی اس میں نئی زندگی ابھرنے لگی۔ اور خوشی کا نیا سوتا پھوٹ پڑا۔

گھر پر چندرا کو کوئی کام نہ تھا۔ دن بھر کمرے میں بند ناول پڑھا کرتی تھی۔ کسم کے بچوں میں الجھی تو ان کے پاس رہنے لگی۔ کسم سے باتیں اور بچوں کی دیکھ بھال جب مرادی بابو آجاتے تو ہٹ جاتی۔ اور جب بچے بھی کھیل میں کھوئے رہتے موقع نکال کر کچھ دیر پڑھ لیتی۔ اس کے ماں باپ یا گھر کے کسی آدمی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ سب سمجھتے تھے کہ اس کی زندگی میں کچھ تو دلچسپی پیدا ہو گئی ہے بلکہ ایک دن اس کے باپ نے [illegible] چندرا کی بڑی تعریف کی [illegible] یہی ہے کہ آدمی آدمی کے کام آئے اور سب ایک دوسرے [illegible]

چندرا نے محسوس کیا تھا کہ وہ سچ مچ کوئی بڑا کام کر رہی ہے مگر دوسرے ہی پل اس خیال سے کانپ اٹھتی تھی کہ اگر کسم اچھی نہ ہوئی مر گئی تو ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اور وہ کیسے رہیں گے۔ بچے اس سے اتنے گھل مل گئے تھے کہ انھیں ذرا تکلیف ہوتی تھی تو چندرا کو تکلیف ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچا کرتی کہ ابھی کسم بیمار ہے علاج ہو رہا ہے۔ بچے سامنے ہیں لیکن جب وہ اچھی ہو جائے گی۔ تو گھر چلی جائے گی۔ بچے بھی چلے جائیں گے۔ تو پھر کیا ہوگا دل بہلانے کو جو کھلونے مل گئے ہیں وہ چھن جائیں گے اس وقت کیا کرے گی۔ بچے تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی نظر سے دور ہو جاتے تھے تو وہ خود گھبرانے لگتی تھی۔ اور بچے چلے جائیں گے تو کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔

ایک دن چندرا کسم کے پاس بیٹھی تھی۔ بچے سائبان میں کھیل رہے تھے مرادی بابو آگئے اور باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں بولے۔

چندرا جی آپ تو بچوں سے ایسا پریم کرتی ہیں اور ان کی ایسی سیوا کرتی ہیں کہ کسم بھی نہ کر سکیں۔ آپ دیوی ہیں جو ایسے کٹھن وقت میں بچوں کو اس طرح پریم دے رہی ہیں۔

اور یہ کہتے کہتے مرادی بابو کی آواز بھرا گئی اور وہ اٹھ کر کمرے سے چلے گئے تھے۔

ایک دن چندرا بچوں کے ساتھ سائبان میں تھی۔ بچے کھیل رہے تھے اور وہ بیٹھی ناول دیکھ رہی تھی۔ مرادی بابو کسم کے پاس بیٹھے تھے اس نے سنا۔ مرادی بابو کہہ رہے تھے۔

"دنیا بھی کیسی عجیب جگہ ہے۔ صورت کو سب دیکھتے ہیں۔ دل کو کوئی نہیں دیکھتا۔ صرف صورت نہ اچھی ہونے کی وجہ سے چندرا جی کا بیاہ نہ ہوا۔ مگر سوچو جس کے ساتھ چندرا جی بیاہ ہوتا وہ مرد کتنا بھاگوان اور سکھی ہوتا۔ ایسی دیویاں تو ہر دم دھرتی پر نہیں اترتیں۔"

اور چندرا کے دل میں مرادی بابو کے لئے احترام [illegible]

مظہر حنفی
مولانا شہاب مالیرکوٹلوی

میرزا عزیز جاوید

یوسف ناظم

قیصرالجعفری

حرمت الاکرام

یا اس کو یاد تھا کہ جب وہ کبھی صحن میں دروازے کے ادھر ادھر شکر
دیکھ جاتی ہے۔ سکینہ نے دو تین بار اس کے سامنے چارہ لا کے
ڈالا۔ چارے سے منہ موڑا تو نرم نرم آٹا لا کر سامنے رکھا۔ اپنے
ہاتھوں سے نوالے تک بنا بنا کے دئے۔ لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔
سکینہ کا دل اس کی طرف سے میلا ہو گیا۔ لیکن ایک دن جب
وہ موتی کے پاس کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھی کہ اسے اپنی گردن
پر ٹھنڈک اور کچھ گرم سا کچھ ٹھنڈا سا احساس ہوا۔
اس نے منہ موڑ کر دیکھا تو موتی اس کی گردن کو اپنی زبان سے چاٹ
رہا تھا۔ کیا یہ دوستی کا پہلا قدم ہے ---؟ سکینہ نے خوش
ہو کر سوچا۔ پھر جب اس نے چارہ لا کر سامنے ڈالا تو موتی احسان مند
آنکھوں سے اسے دیکھتی جاتی اور کھاتی جاتی۔ دالان میں بیٹھی
اس کی ماں وہیں سے بولیں --- "بی بی اُس نے تیری محبت کا
جواب محبت سے دیا ہے۔ اب اس کا ساتھ نہ چھوڑیو---"
سکینہ نے محبت کی اس پکار کا سنجیدگی سے اور گہرائی سے دل
سے جواب دیا --- ؟ کیا میں اس ساتھ کو اس محبت کو نبھا
سکوں گی --- ؟ میکے میں لڑکی کتنے دن کی مہمان ہوتی ہے؟
لیکن اُس نے آنکھوں سے ٹپک پڑنے والے آنسوؤں کو فوراً ہی
پی لیا۔ آنے والے دکھوں کے خیال سے موجودہ خوشیوں کو کیوں
پامال کیا جائے --- ؟ اور اس نے تڑپ کر موتی کا سندر اور سجل
مکھڑا اپنے ہاتھوں میں، اپنے دل میں چھپا لیا۔

یہ پیار کے محل کی پہلی اینٹ تھی۔ پھر اینٹ پر اینٹ جمتی
گئی اور محل اونچے سے اونچا ہو گیا۔ محبت میں استواری کا شدید
دورہ تھا جب موتی پہلے پہل ماں بننے جا رہی تھی اور سکینہ نے اس
کے ہر دکھ سکھ بھرے لمحے کی آنچ اپنے دل پر محسوس کی تھی پھر جب
وہ ماں بن گئی اور ایک پیاری سی، ننھی سی، کلیلیں بھرتی بچھیا
نے آنگن کو اور زیادہ پُر رونق بنا دیا، اس وقت جبکہ وہ ممتا
کے خزانے دودھ کی شکل میں لٹا رہی تھی۔ یہ سکینہ ہی تھی جو
اس کی ممتا کا خیال کر کے گھر والوں کو موتی کا دودھ دوہنے
سے، کبھی بلونے سے منع کرتی تھی اور کہتی تھی۔ "نہیں پہلے
بچھیا کا پیٹ بھر لے تب دوسروں کا سوچا جائیگا---" موتی
بے زبان تھی۔ لیکن یہ ساری باتیں سنتی اور سمجھتی تھی---
اور اپنی بے زبان عقیدت کا اس کے پاس اس سے بڑھ کر اور
کوئی ذریعہ نہ تھا کہ اپنی چراغوں کی مانند چمکتی ہوئی آنکھوں
کے دیئے سکینہ کے چرنوں میں چڑھا دیتی۔ جب وہ اپنی
گیلی گیلی معصوم آنکھوں سے سکینہ کو دیکھتی تو سکینہ کو ایسا
لگتا کہ زندگی کا ہر بے نام جذبہ زبان پا گیا ہے اور محبت
امر ہو گئی ہے--- پاس پڑوس والیاں۔ آنے جانے
والیاں، سہیلیاں، اور خود گھر والے اور ماں اور سب ہی
سبھی اس دوستی کو دیکھ کر ہنستے--- کہتے "ارے
یہ سکینہ اس گائے کے پیچھے دیوانی ہو گئی ہے---" اور
خود موتی کا بھی یہی حال تھا۔ گوالے کو ہاتھ تک نہ لگانے
دیتی۔ حد یہ کہ دودھ تک سکینہ ہی کو دوہنا پڑتا۔

لیکن بہرحال سکینہ انسان تھی--- اور ایک عورت---
جس کا ایک تصور ہوتا ہے اور جس میں ایک شوہر،
ایک چھوٹے سے گھر، معصوم بچوں کی آرزو ہوتی ہے
اور جس تصور کے ساتھ ایک خاموش معاہدہ بھی میکے
سے ہوتا ہے۔ کہ تم لوگ مجھے لاکھ پیارے سہی۔ لیکن مجھے
پھر بھی یہ جدائی عزیز ہے کہ اس کے بدلے مجھے زندگی بھر
کی خوشیوں کی سوغات ملنے والی ہے--- اور ہر عورت
کی طرح سکینہ نے بھی یہ سودا قبول کر لیا--- جس میں ایک
طرف ساری محبتوں سے منہ موڑ کر، زندگی کے کئی رنگین
اور یادوں بھرے برس چھوڑ کر ایک اجنبی کو اپنانا تھا۔

لیکن اس انجانی ڈگر پر چلنے سے، قدم اٹھانے
سے پہلے اس کی پرانی محبتوں نے پھر ایک بار مل کر اپنا
وار کیا اور اب سکینہ ایک ایک سے گلے مل مل کر رو رہی
تھی۔ بی بی، بی بی کہہ کر پکارنے والا طوطا چپ چاپ تھا
کٹ کٹ کرتی مرغیاں دم سادھے کھڑی تھیں۔ بلیاں
اور ان کے بلونگڑے حیرت سے دم بخود تھے۔ چک
چک کرتی پالتو رنگین چڑیاں چہچہانا بھول چکی تھیں اور
ان سب سے بڑھ کر موتی--- جس کے چہرے پر انسانوں
کی طرح غم کا حجاب ابھر آئی تھی--- ناند میں پانی
یونہی پڑا تھا۔ چارے کی پولیاں سوکھی پڑی تھیں۔
--- اور وہ کھونٹے پر سر جھکائے ایک دلہن کی طرح
اداس بیٹھی ہوئی تھی--- سکینہ نے اپنے مہندی
بھرے ہاتھوں سے اس کا منہ اوپر کیا۔ دونوں کی آنکھیں
ملیں۔ سکینہ غم سے سسک کر بولی۔

"موتی--- ہم عورتیں ہیں نا--- ہمارا مقدر یہی
ہے کہ ہمیں اپنوں کو چھوڑنا پڑتا ہے---" وہ یکدم
رو پڑی--- "تم بھی تو کبھی اپنا گھر چھوڑ کر آئی تھیں
--- مگر نئی محبتیں پرانی محبتوں کو بھلا دیتی ہیں--- جی
چھوٹا نہ کرو موتی--- میرے بعد چھبیلی تمہارا خیال رکھے گی
..... لیکن ایسا لگتا تھا کہ موتی پر ان جھوٹی تسلیوں کا
کوئی اثر نہیں۔ وہ یونہی بیٹھا رہا۔ اس کی سیاہ آنکھیں
جو گیلی گیلی تھیں ایک ٹک سکینہ کو دیکھے گئیں۔

"چلو بیٹی--- کب تک روتی رہو گی--- یہ محبت کا دریا
ہے بیٹی جو بڑی مشکل سے پار کیا جاتا ہے--- چلو ڈولی
لگ چکی ہے---"

"مگر خالہ بی--- سکینہ سسکی--- "موتی نے چار
دن سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ وہ کیسے جیئے گی---"

خالہ بی کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ وہ آنسو پی کر بولیں
--- "کب تک بھوکی رہے گی بیٹی۔ بہل ہی جائے گی---"

اس وار پر موتی نے تڑپ کر سر اٹھایا۔ یہ اس کی
محبت کی توہین تھی۔ کیا وہ یہ سب کچھ بھول سکتی تھی۔؟
کیا وہ سکینہ کے بغیر بہل سکتی تھی؟ اس کے بغیر کھا سکتی تھی؟
اس کے بغیر زندہ رہ سکتی تھی--- ؟؟

سکینہ نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کا منہ ہاتھوں میں
تھام کر کہا--- "موتی یوں دکھ نہ کر۔ میں وعدہ کرتی ہوں
میں جلد ہی آؤں گی۔ میں ضرور واپس آؤں گی۔ تیرے لئے
صرف تیرے لئے---"

اور سکینہ دل میں بے پناہ غم، ڈھیر ساری خوشیاں
بہت سے آنسو اور بہت سے پچھتاوے لے کر ڈولی میں سوار
ہو کر چلی گئی---

موتی نے جیسے زندگی ہی سے ناطہ توڑ لیا--- کھانا
پینا۔ چرنا۔ گھومنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ بس ہر گھڑی دروازے
پر اس کی آنکھیں لگی رہتیں۔ آٹھ ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا
کہ بس کھال اور ہڈیاں ہی باقی رہ گئیں--- بس ایک انتظار

کے دئے تھے جو دونوں آنکھوں میں ابتک چمک باقی رکھے ہوئے تھے، ورنہ یوں لگتا کہ تن میں جان ہی نہیں — سکینہ تو نئی زندگی، نئی خوشیوں میں کھو کر رہ گئی جلا گو ورنہ کیا پلٹ کر نہ پوچھتی —

لیکن ایک دن سب نے دیکھا کہ گلی کے موڑ پر تانگے سے گھنگھرو چھن چھناتے اور پھر دروازے پر تانگہ آکر رکا۔ اور اس میں سے سکینہ یوں اتری جیسے پنجرے سے چھوٹا پنچھی بے تابی سے اُڑے — سکینہ ماں باپ، بھائی بہنوں اپنوں پرایوں سب سے ہٹ کر سب سے پہلے دوڑ کر انگنائی میں گئی اور موتی سے لپٹ پڑی —

"موتی تیرا یہ کیا حال ہو گیا موتی — تو کچھ کھاتی پیتی نہیں موتی — تو کیسے زندہ رہے گی موتی — "بس ایک موتی کا وظیفہ تھا اور آنسو تھے۔ اُس نے جھپٹ کر ناند میں گوندھا ہوا آٹا اُٹھا کر موتی کے قریب کیا — "کھا لے میری جان۔ ورنہ تیرے بغیر تو میں بھی گھٹ کر رہ جاؤں گی — میری سکھی۔ کیا تجھے میری خوشیاں پیاری نہیں —؟؟ یوں کہ جیسے وہ کسی انسان سے مخاطب ہو کر کہے جا رہی ہو" موتی اگر تو یوں تباہ رہے گی تو میں کیسے خوش رہوں گی؟ کیا تو نہیں چاہتی کہ میں نے اتنے ارمانوں سے جو جنت پائی ہے، اس کا مزہ لوں —؟ کھا لے موتی — کھا لے —

موتی نے آنکھیں اٹھائیں تو سبھی نے دیکھا کہ اس کی کالی کالی بڑی بڑی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی ہیں — روتی ہوئی آنکھوں سے موتی نے سکینہ کے سہاگ بھرے چہرے کو دیکھا۔ جو نئی زندگی کی خوشیوں سے دمک اٹھا تھا۔ لیکن موتی کے غم سے جس پہ دکھ کی چھاپ اُبھر آئی تھی۔

شاید موتی نے سوچا ہو "یہ میری سکھی جس نے اپنے کتنے ہی پیار بھرے لمحے میرے ساتھ بتائے۔ اب اپنی رنگین زندگی میں قدم دھر کر مسکرائی ہے تو کیا واقعی یہ میرا سلوک بجا ہے کہ اس طرح رو کے، یاد کر کے اس کی خوشیوں کے پھولوں میں کانٹے بو دوں —!؟

دوسرے ہی لمحے موتی جبڑے ہلا ہلا کر چارہ چبانے لگی

ظفر گورکھپوری

لمحوں کی مشین

یاد ہوگا تمھیں
تم جب آئی تھیں پہلے پہل
زندگی کتنی فرصت کی تھی
اور میں زندگی کے تصور بھرے خواب آگیں چمن زار میں
آرزوؤں کی لچکی ہوئی شاخ پر
تم سے اک پھول کی شکل میں، اک شگوفے کی صورت ملا تھا
تم نے جوڑے میں ٹانکا مجھے
میں نے اپنی محبت کے لعل و گہر، چاندنی شب میں تم پر نچھاور کئے
وہ تھی پہلی ملاقات اپنی
اب اگر میں تمھیں یاد آ جاؤں
اب کبھی مجھ سے ملنے جو آنا
زندگی وہ جو فرصت کی تھی زندگی
میں اسی زندگی کے گرجتے ہوئے کارخانوں میں دن رات چلتی ہوئی گرم لمحات کی گڑگڑاتی مشینوں کے اندر
ایک لوہے کے پرزے کی صورت تمھیں فٹ ملوں گا
اور اب کے تمھیں دیکھ کر
دو منٹ رُک کے
تم سے دو بات کرنا تو کیا
تم کو شاید میں پہچان بھی نہ سکوں۔

— کون کہتا ہے جانور جذبات سے عاری ہوتے ہیں — " دالان میں کھڑی اماں نے دکھے دل

سے کہا اور پلّو سے آنسو پونچھنے لگیں —

تصویر کھینچتا ہوں...

مظفر حنفی

(شاہ صاحب "آپ کی تعریف" کے سلسلے میں ایک نیا کردار کی عکاسی کرنا چاہتے ہیں۔ افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ کوشش کر رہا ہوں کہ یہ سلسلہ جاری رہے).

۱۔ آپ سے ملئے ہمارے باس ہیں

حال ہی میں جرمنی سے آئے ہیں — شکل سے "سبک، انگلش" ہیں
سیرتاً کوئی بھی کل سیدھی نہیں — آدمیت چھو کے بھی نکلی نہیں
کہہ رہے ہیں اُن کی بیٹی نے کل — دیکھئے فکر میں ہیں آج کل

"اختیار خاص" ان کے پاس ہیں

آپ سے ملئے ہمارے باس ہیں

۲۔ میر منشی سے بھی ملتے جائیے

دیکھئے رنگین عینک آپ کی — کیسے یک چشمی کا پردہ بن گئی
منہ بناتے ہیں گلابی سوٹ میں — نوٹ رکھتے ہیں چھپا کر کوٹ میں
لیتے ہیں حصہ ہر کلرک بابو سے آپ — چھیلتے ہیں کاغذی چاقو سے آپ

خیریت اس میں ہے چھیلے جائیے

میر منشی سے بھی ملتے جائیے

۳۔ افسرِ اعلیٰ کے یہ ہیں پیشکار

شب جو سیم و زر کی آمد آپ پر — ختم ہے "رسم خوشامد" آپ پر
بل جما لو سے کبھی کچھ بڑھ کر ہیں یہ — سچ تو یہ ہے "مخبر دفتر" ہیں یہ
ایک بلائے بد ہیں یہ سب کے لئے — سبزیاں لاتے ہیں صاحب کے لئے

یہ جو بیٹھے ہیں بہ ابروئے وقار

افسرِ اعلیٰ کے یہ ہیں پیشکار

۴۔ آپ ہیں جنگل کے دفتر میں کلرک

آپ کی تحریر استادانہ ہے — افسروں سے آپ کا یارانہ ہے
باسمتہ رکھنے میں کچھ ہوتے ہیں یہ — یوں بہادر شاہ کے پوتے ہیں یہ
فائلیں جاری کریں گے دیر میں — چونکہ ہیں تنخواہ دے کے پھیر میں

کر چکے انسانیت مدت سے ترک

آپ ہیں جنگل کے دفتر میں کلرک

۵۔ یہ بڑے صاحب کے شوفر ہی تو ہیں

کسٹرڈ وردی پہ اتراتے ہیں آپ — جیسے بیٹا لگا جاتے ہیں آپ
کار کی رفتار کم کھوائیں گے — بیچ کر پٹرول وہسکی لائیں گے
روز کچھ پرزے بدل دیں گے وہاں — اور پھر مونچھوں پہ بل دیں گے یہاں

تاش کی گڈی کے جوکر ہی تو ہیں

یہ بڑے صاحب کے شوفر ہی تو ہیں

۶۔ آپ صورت سے تو چپراسی نہیں

چونکہ سالے آپکے آفس میں ہیں — اس لئے کچھ دن سے اس پرس میں ہیں
تاؤ دے کر مونچھ کے ہتھیار کو — سہہ دکھا دیتے ہیں ٹھیکیدار کو
ایک روپیہ "خوش کلامی" کے لیے — قیمتاً صاحب کی سلامی کے لئے

رنگ کہتا ہے کہ "گرامی بابو نہیں"

آپ صورت سے تو چپراسی نہیں

۷۔ یہ برائے نام جو ہیں اردلی

زیب دیتا ہے انہیں بن کر چلیں — خوب مکھن کھائیں چہرے پر ملیں
چونکہ افسر آپ کے کہنے میں ہے — خیریت ان کی بھی رشتے میں ہے
کل ذرا ہم کر چکے ہیں نکیاں — اس لئے گھی میں ہیں پانچوں انگلیاں

سیرتاً ابلیس صورت سے ولی

یہ برائے نام جو ہیں اردلی!

۸۔ دیکھئے انکو ضرورتمند ہیں

یہ کبھی جنگل کے ٹھیکیدار تھے — آجکل قسمت مگر گردش میں ہے
روز کر جاتے ہیں دفتر کا طواف — آپ ہی ان کو بتا دیں صاف صاف
اردلی سے افسرِ اعلیٰ تلک — پار کرنے ہیں انہیں سات آسمان "فلک"

ورنہ باہر کامیابی سے بند ہیں،

دیکھئے ان کو ضرورتمند ہیں

علی حمّاد عبّاسی

اُدھار لینے کا فن

اُدھار لینے کا فن وہ فن شریف ہے جو حاجتمندوں کو اپنی حاجت روا کرنا، عزت والوں کو اپنی عزت بچانا اور سفید پوشوں کو اپنا بھرم رکھنا سکھاتا ہے۔ اُدھار لینا پہلے کبھی معیوب ہوگا۔ لیکن اب جبکہ خود سرکار ہم سے اُدھار لیکر ہمارے لئے ترقی کے منصوبے بناتی ہے۔ اُدھار دینے کے لئے امداد باہمی تحریک چلاتی ہے۔ ایسی حالت میں اُدھار کی اہمیت سے انکار کرنا اپنی کم بینی کا اعلان کرنا ہے۔

اُدھار لینے کا فن ایک ایسا فن ہے جس کی افادیت سے صرف اُدھار لینے والوں ہی کو آگاہ ہونا چاہیئے۔ اگر خدانخواستہ اُدھار لینے والا بھی دانائے راز ہوگیا تو اس فن کی وہی درگت بنے گی جو غلیظ دور میں تمام فنون لطیفہ کی بن رہی ہے

تمام فنون کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ اُدھار لینے کے فن کے بھی تین بہت ہی اہم بنیادی اصول ہیں۔ ان اصولوں میں پہلا اصول ہے قیافہ شناسی۔ اُدھار لینے والے کے لئے قیافہ شناسی کا علم از بس ضروری ہے۔ ویسے تو چارلس لیمب نے صاف لکھدیا ہے کہ دنیا میں صرف دو قسم کے لوگ بستے ہیں۔ ایک تو وہ جو اُدھار دیتے ہیں اور دوسرے جو اُدھار لیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں طبقوں میں امتیاز کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ امتیاز صرف قیافہ شناسی میں مہارت حاصل کرکے ہی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اُدھار لینے والا اگر قیافہ شناس نہیں ہے تو پھر وہ غلطی سے کسی ایسے شخص سے اُدھار مانگ سکتا ہے جو خود اس کی طرح کسی اور کے سامنے دستِ طلب بڑھانے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے قیافہ شناسی میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ذراسی چوک تکلیف اور ندامت کا باعث بن سکتی ہے۔ اب دیکھئے نا، پچھلے دنوں کیا ہوا۔ میں ایک صاحب سے اُدھار مانگا۔ ان صاحب کی ظاہری شان و شوکت سے تو یہی معلوم پڑتا تھا کہ ان سے مجھے وقت ضرورت یقیناً اُدھار مل جائیگا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اُدھار کے سوال پر پہلے تو انھوں نے ایک لمبی تمہید باندھی، کچھ مشکلیں اور اندیشے بیان کئے اور مجھے دوسرے دن بلایا۔ حکم کے مطابق حاضر ہوا تو انھوں نے کچھ بہانہ کیا اور تیسرے دن بلایا۔ اُس دن انھوں نے بڑی نفیس چائے پلائی۔ بڑھیا سگریٹ پینے کو دئے اور اس سے بھی عمدہ باتیں کیں اور چوتھے روز آنے کو کہا۔ اس دن بھی میں ان کے پاس جارہا تھا کہ ایک صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ صاحب تو خود محتاج ہیں دستگیری کیا کریں گے۔ انھوں نے اپنی شان و شوکت کے غبارے کو اُدھار کی ہوا سے پھُلا رکھا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں ان کو مسیحا سمجھتا تھا لیکن وہ بھی میری طرح دستِ شفا کے محتاج نکلے۔ اصل میں مجھ سے قیافہ شناسی میں غلطی ہوگئی تھی اور میں غلط آدمی کے پاس اُدھار مانگنے چلا گیا تھا۔ غلط آدمی سے اُدھار مانگنا صرف اپنی زبان خالی کرنا ہے بلکہ اپنا قیمتی وقت بھی ضائع کرنا ہے۔

اس کا دوسرا اصول ہے اداکاری۔ اُدھار لینے کا فن اداکاری کی صلاحیت کے بغیر ادھورا رہ جاتا ہے۔ مانا کہ آپ زبردست قیافہ شناس ہیں۔ کسی کی اقتصادی حالت اور اُدھار دینے کی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگالیتے ہیں لیکن اگر آپ نے قیافہ شناسی کے ساتھ اداکاری نہیں سیکھی اور اس شخص کو متاثر نہ کرسکے تو پھر اطمینان رکھئے اُدھار آپ کو مل چکا! اپنے چہرے پر بے کسی طاری کرکے، اپنے لہجے میں تھرتھراہٹ پیدا کرکے کسی حد تک ڈبڈبائی آنکھوں سے اُدھار دینے والے کو آپ کو یقین دلانا ہوگا کہ آپ واقعی حاجت مند ہیں اور یہ کہ اگر آپ کو اُدھار نہ ملا تو سنا بنایا کام بگڑ جائیگا اور آپ کے گھر میں قیامت بپا ہو جائے گی اور آپ اس کے لئے ساری عمر خود کو مجرم سمجھتے رہیں گے۔ ظاہر بات ہے، آپ کی کہ اگر تو ہیں ہی نہیں مگر وہ صاحب چپ رہ جائیں تو آپ بھی اپنی شامت آنے سے ہرگز نہ ڈریئے اور بڑھ کر وہی کیجئے جو غالبؔ نے پاسبان کے لئے کیا تھا ـــــ ـــــ اور کیا یہ سب کچھ اچھی اداکاری سیکھے بغیر ممکن ہے؟۔

قیافہ شناسی اور اداکاری کے بعد ایک اور اہم اصول ہے جسکو ہم عام زبان میں مستقل مزاجی کہتے ہیں۔ زندگی کے تمام شعبوں میں اس اصول کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ لیکن اُدھار لینے والے کے لئے مستقل مزاجی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اُدھار لینے والا کتنا ہی قیافہ شناس ہو، اچھی اداکاری کرسکتا ہو، لیکن اگر اس کے اندر مستقل مزاجی نہیں ہے تو وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ اُدھار لینے کی کوشش میں مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنے والے کو ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ پچھلے دنوں مجھے روپے کی شدید ضرورت پڑی۔ قیافہ شناسی اور اداکاری کا سہارا لیکر میں نے اُدھار دینے والوں سے رجوع کیا۔ اس گرانی کے زمانے میں بھلا کون پسند کرتا ہے کہ اپنی جیب سے رقم نکل کر بلاوجہ دوسرے کی جیب میں پہنچ جائے لیکن میں نے پورے ہفتے تک مستقل مزاجی سے ایک صاحب کا پیچھا کیا۔ آخر میں انھوں نے تنگ ہوکر انگریزی کا وہ محاورہ پڑھکر شیطان کو اس کا حصہ دیدو، اور مجھے اُدھار مل گیا۔

ایک بار تو میں اس سے بھی بڑے چکر میں پڑ گیا تھا۔ ایک دن علی الصباح میرے سیٹھ جی تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ آج تو میں اپنا حساب چکتا کرکے جاؤں گا۔ میں نے بہت ٹال مٹول کیے لیکن وہ آج ٹلا کی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اصل میں وہ میرے اس طرح کے ٹال مٹول سے بخوبی واقف تھے۔ آخر میں اللہ کا نام لیکر گھر سے نکلا۔ ایک صاحب کے ہاں دستکاری وہ کچہری میں پیشکار تھے ان سے عرض حال کی۔ انھوں نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں بھی جم گیا۔ ان کے پیچھے لگا کچہری گیا۔ دن بھر عدالت میں بیٹھا التجا آمیز نظروں سے ان کو دیکھتا رہا۔ شام کو انھوں نے بہت منہ بنا کر مجھے کچھ روپے اُدھار دئے۔ میں سرخرو گھر لوٹا اور سیٹھ جی کے منہ پر شان سے روپیہ پھینک دئے۔ جانتے ہیں آپ یہ صرف میری مستقل مزاجی کی بدولت ہوا۔

ان تینوں اصولوں ـــــ قیافہ شناسی، اداکاری اور مستقل مزاجی ـــــ کی اہمیت مجھ ایسے سمجھ لو آپ بھی ذرا اُدھار

لینے کے فن کو عملی طور پر برتنا سیکھیں۔ کیونکہ فن وہی کامیاب سمجھا جاتا ہے جو زندگی کی تلخ جدوجہد میں مدد دے سکے۔

ادھار لینے سے پہلے ان تینوں اصولوں کی خوب مشق کیجئے اور اتنی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے کہ آپ کو اپنے آپ پر اعتماد ہو جائے۔ پھر کسی ایسے شخص کو تاکئے جس سے آپ کو ادھار لینا ہو۔ پہلے اس کے پاس جائیے اور اس سے ایک روپیہ اس وعدے پر ادھار مانگئے کہ شام تک واپس ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس افراط زر کے زمانے میں ایک روپیہ کی کیا حقیقت ہے۔ روپیہ آپکو فوراً مل جائیگا ورنہ اس روپے کو مقدس امانت جان کر جیب میں حفاظت سے رکھیے۔ شام کو حسب وعدہ واپس کر آئیے اور ساتھ ہی اظہار تشکر بھی کیجئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان کے پاس پھر جائیے۔ اب کی بار دو روپے کے وعدے پر پانچ روپے مانگئے۔ ان پر آپ کا اعتماد جم ہی چکا ہے یہ پانچ روپے بھی آپ کو مل جائیں گے۔ لیکن آپ کے لئے یہ بڑی آزمائش کا وقت ہوگا۔ یہ روپے آپ کی جیب سے نکلنے کے لئے بار بار مچلیں گے۔ آپ کے دل میں گدگدی پیدا کریں گے۔ آپ کو رجھائیں گے۔ لیکن آپکو انتہائی ضبط سے کام لینا ہوگا۔ دل اگر قابو سے باہر ہونے لگے اور اصرار کرے کہ اس حقیر رقم کو جو ہاتھ آ گئی ہے کسی ہوٹل میں دھوڑا لیم فیض کی حسین نظم "اے دل بے تاب ٹھہر" کا ورد کیجئے اور حسب وعدہ روپے واپس کر آئیے۔ کچھ دن کے وقفہ کے بعد پھر جائیے اور کسی ناگہانی ضرورت اور اپنی عزت کا واسطہ دلاتے ہوئے اس بار کی مرتبہ ۵۰ روپے ادھار مانگئے۔ ان کی دو دونوں بار کی ہمدردیاں کا حوالہ دیکر اپنے اوپر کچھ رقت بھی طاری کیجئے، قوی امید ہے کہ یہ رقم بھی آپکو مل جائے گی۔ چونکہ یہ رقم کافی لمبی ہے اس لئے واپس کرنے کی زحمت گوارا نہ کیجئے۔ وہ صاحب اگر ضرورت سمجھیں گے تو رقم واپس مانگنے خود آپ کے دروازے پر آیا کریں گے۔

ادھار لینے کے فن کو زیادہ موثر بنانے کے لئے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ بڑی رقم قرض لے کر چھوٹے چھوٹے ادھار چکا دیجئے۔ آپ کی ساکھ بھی بنی رہے گی اور آپ ادھار کا چکر جس میں ایکبار پڑ کر نکلنا محال ہے۔ اطمینان سے چلا سکیں گے اور آپکے متعدد ادھار دینے والوں کو شکایت بھی نہیں ہونے پائے گی۔

اب کچھ باتیں تنبیہ کے طور پر بھی سن لیجئے۔ اگر آپ مرد ہیں تو کسی عورت سے اسکے شوہر کی موجودگی میں ہرگز ادھار مت مانگئے کیونکہ اس سے بلاوجہ میاں بیوی میں بدمزگی پیدا ہو جانے کا امکان ہے۔ اور اگر آپ عورت ہیں تو کسی مرد سے اسکی بیوی کے سامنے ادھار مانگنے سے احتراز کیجئے اس میں آپ ہی کی بھلائی ہے۔ ورنہ آپ خواہ مخواہ شماتت ہمسایہ کا شکار ہوں گے۔

آوارہ سلطانپوری

جنت کشمیر

ٹھٹھک رہا ہے سر شام صبح کا ماتھا
بھٹک رہی ہے فضا میں خیال کی قندیل
تڑپ تڑپ کے چھٹی جا رہی ہے نبضِ وفا
سسک سسک کے چلے جا رہے ہیں اسرافیل

فراز عرش سیاست سے آ رہی ہے صدا
فلک سے کوئی ستارا نہ جھانکنے پائے
زمیں کے گرد تنوروں میں ڈال دو پانی
کوئی دماغ شرارہ نہ پھانکنے پائے

ہیں کھوئے کھوئے سے صورت گرانِ صبحِ امید
تصورات کی دنیا اُجڑ نہ جائے کہیں
نہ پھیر دیں کہیں دانستہ لغزشوں کے قلم
تبسمات کی صورت بگڑ نہ جائے کہیں

نہ جانے عظمتِ آدم کا بول بالا ہے
کہ اور بھی کوئی شیطان بننے والا ہے

نئے سال کی پیشین گوئیاں

— یوسف ناظم

پیشین گوئیاں کرنے کا رواج انسانی زندگی کے آغاز سے چلا آرہا ہے اور آج بھی مقبول ہے۔ پہلے زمانے میں اس کام کو ایک علیحدہ اور معزز پیشہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس پیشے کو اپنانے والے "کاہن" کہلاتے تھے۔ کاہن نہایت بیش قیمت ہوا کرتے تھے۔ اور سوائے بادشاہوں کے کوئی انہیں نہیں پال سکتا تھا۔ یہ سفید ہاتھیوں سے بھی زیادہ مہنگے ہوتے تھے لیکن پیشین گوئی بھی ایسی کرتے تھے کہ اس میں بال برابر بھی فرق نہ آتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ فرعون مصر کے زمانے میں ایک کاہن نے ایک ایسے شخص کے پیدا ہونے کی پیشین گوئی کردی تھی جو فرعون مصر کا تختہ الٹ دینے والا تھا۔ فرعون مصر نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو کر رہی۔ اب کاہن پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں لیکن پیشین گوئیاں اب بھی کی جاتی ہیں ہم اپنی حد تک پیشین گوئیوں کو معیوب نہیں سمجھتے۔ بالخصوص دنیا کے عام حالات کے بارے میں پیش قیاسی کرنا نقصان دہ بات نہیں۔ اور یوں بھی اب دنیا میں ایسی کون سی بات ہوتی ہے جس سے آدمی خوفزدہ ہو جائے۔ ہو گی قیامت تو اس کی پیشین گوئی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

ہم نے بھی پیشین گوئی کے فن کو بطور فن حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور ہمارا خیال ہے اس فن میں ہم کافی حد تک کامیاب رہے۔ اگرچہ ہمیں اس فن پر عبور حاصل نہیں ہوا لیکن عبور کے آس پاس تو ہم پہنچ ہی گئے۔ ہم نے پچھلے سال کے بارے میں بیس سال کچھ پیشین گوئیاں کی تھیں اور انہیں اپنی نوٹ بک میں محفوظ کر لیا تھا۔ پچھلے سال کے آخری ہفتہ میں ہم نے اپنی نوٹ بک کا مطالعہ کیا تو ہمیں مسرت ہوئی کہ ہماری ۸۷ فیصد پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں۔ باقی ۱۳ فیصد پیشین گوئیاں جو غلط ثابت ہوئیں ان میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ یہ پیشین گوئیاں زیادہ تر لوگوں کی وفات سے متعلق تھیں یہ لوگ اب بھی بقید حیات ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کون کب تک جیلیٹ اور وفات سے متعلق پیشین گوئیوں کے غلط ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا سابنی ۸۸ فیصد پیشین گوئیوں کی صداقت پر ہمیں یہ خیال ہوا کہ کیوں نہ اس سال کے بارے میں بھی قیاس آرائی کی جائے۔ ستاروں پر ہم نے نظر ڈالی تو یہ کچھ اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے نظر آئے۔ یقیناً ہر سال ایسا ہی ہوتا رہا ہوگا لیکن اس مرتبہ ان کی نقل و حرکت ایک خاص پروگرام کے تابع نظر آئی۔ غالباً یہ خلا کے مسافروں کا استقبال کی تیاری ہوگی۔ بہرحال ستاروں کی موجودہ روش کے پیش نظر ہم نے جو پیش قیاسیاں کی ہیں وہ پیش ہیں کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ انہیں صرف نوٹ بک کی زینت بنائے رکھنا خود غرضی ہے۔

جنوری:-

آثار یہ بتلا رہے ہیں کہ نئے سال کے پہلے دن چھٹی ہوگی اور کیا تعجب بینک اور سٹہ خانے بھی بند رہیں۔ بینک اور سٹہ خانوں کے بند رہنے کی وجہ سے جیب کاٹنے والوں کو نقصان پہنچے گا۔ پہلی جنوری کو لوگ عام طور پر دیر تک سوتے رہیں گے کیونکہ اس دن نہ تو کوئی ریڈیو ہوگی نہ جلسہ۔ جنوری کے مہینہ میں سردی خوب ہوگی۔ برف کے کارخانے بند ہو جائیں گے۔ سگریٹ بیڑی اور گرم ادویات (جن میں گرم مسالے بھی شامل ہیں) کی تجارت کو فروغ ہوگا لسی دہی اور لیموں کو شربت کی تجارت بیٹھ جائے گی۔ لوگوں کی صحت اچھی رہے گی اور ان کا دل کام کرنے کو چاہے گا لیکن کام کاج کے مواقع نہیں ہوں گے۔ ماہتاب، چاند کی چودھویں تاریخ کو مکمل ہو جائے گا۔ اس مہینے میں لوگوں کو ریڈیو کا لائسنس بھی لینا ہوگا۔

فروری:-

فروری میں نظام شمسی متاثر ہوگا۔ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات میں تبدیلی ہوگی۔ اس مہینہ میں اندیشہ ہے کہ ریل گاڑیاں وقت پر چلیں گی۔ فروری کے ختم ہوتے ہی مارچ کا مہینہ شروع ہو جائے گا۔

مارچ:-

مارچ کے مہینہ میں گرمیاں شروع ہو جائیں گی اور دھوبیوں کی بن آئے گی۔ بیجوں اور خربوزوں کی فصل اچھی رہے گی لیکن دین میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا۔ اس مہینے میں حکومتیں اپنے اپنے موازنے تیار کر لیں گی۔ لہٰذا اظہار خیالی کریں گی اور کہیں کہیں حسب معمول واک آؤٹ بھی ہوں گے۔ عوام حیرت سے سب کی طرف دیکھیں گے۔ ان کی کچھ بوجھ میں کوئی ترقی نہ ہوگی۔ اسکول اور کالج کے طلباء امتحانی پرچے معلوم کرنے کے لئے سراغرسانوں کی خدمات حاصل کریں گے۔

اپریل:-

جھوٹ کو ترقی ہوگی۔ سفید پوشی بڑھ جائے گی مچھروں کی نسل میں اضافہ ہوگا (مچھروں میں فیملی پلاننگ کی سمجھ کہاں ہے) بار بردار جانوروں کی صحت اچھی رہے گی۔ دال مونگ پھلی بیجے وغیرہ کثرت فروخت ہوں گے امتحانی پرچوں کی پوشیدہ تجارت فروغ پائے گی شہروں میں فٹ پاتھ پر سونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا اپریل کی چاندنی راتیں پر لطف ہوں گی اور ہر طرف آؤ پیار کریں کی باتیں ہوں گی۔

مئی:-

اس مہینہ میں ہر شخص پسینہ بہا کر اپنی روزی کمائے

جو لوگ کے ساتھ ساتھ سایہ کی طرح رہنا ہوگا اور اچھی تتلی کی طرح اُن کی نگرانی کرنی ہوگی۔ باہر سیر کرنے لے جانا ہوگا۔ فالتو وقت میں ان کے کپڑے بھی دھونے ہوں گے۔ لڑکی تم کپڑے دھونا بھی جانتی ہو؟"

"ہم طرح لوگ آپ ہی اپنے کپڑے دھویا کرتے ہیں"۔ لڑکی نے من ہی من میں شرمیتی کے سوال کو بیوقوفی کا سوال خیال کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں پھر کبھی پورے طور سے اور ٹھیک ٹھیک کام تمہیں سمجھا دوں گی، اور اب جب کہ تم کو یہاں آئے دس دن ہو گئے تو تاکہ میں دیکھوں کہ تم کچھ بھی تیز ہو کہ تم سے یہاں کیسا کام لیا جائے گا۔

طرح کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور جیسے ایسا لگا جیسے معصوم سی وہ کہہ رہا ہے کہ بھلا اس میں سمجھنے کی کون سی بات ہے۔ "جی ماں جی، میں سمجھ گیا"۔ اُس نے جواب دیا۔ کہ پیچھے مجھے دل ہی دل میں شرمیتی کتنی گھبرا سے چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھلا بھلا کر کے یہی میں اپنے آپ کو ہلکان کر رہی ہیں۔

"کیا تمہیں بچوں سے محبت ہے؟"

"یقیناً! ماں جی، بچوں سے تو ہر کوئی محبت کرتا ہے"۔

"خیر اب باورچی خانے میں جاکر میرے خاوند کے آنے کا انتظار کرو۔ اس وقت میں تمہیں ٹھیک ٹھیک بتا سکوں گی کہ تمہیں رکھوں گی یا نہیں"۔

یہ سنتے ہی ایک طرح کی طرح جیسے اپنا فرض اور بڑوں کا درجہ معلوم ہوتا ہے فوراً جھٹ سے مڑا اور کمانے کے کمرے سے نکل کر آنگن میں جاکر سگریٹ کا دھواں اُڑانے لگا۔

ویسے تو شورا! میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں یہ کہہ دینا فرض ہو گیا ہے۔

"جی ممی، سب تو یوں ہی۔ بس اسے رکھ لیجئے"۔

"پہلے ہمیں تمہارے ڈیڈی سے پتہ لگانا ہوگا کہ یہ نشہ باز تو نہیں ہے"۔

"لیکن بلبل نے کہہ تو دیا کہ وہ ایسا نہیں"۔

"اس کے کہنے کو کون مان سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟"

"یہ ملاح ہیں۔ یہ کسان ہیں۔ یہ لوگ اس کی پرواہ کہاں کرتے ہیں کہ وہ کتنا جھوٹ بولتے ہیں"۔

"کیا اسے ستار بجانا بھی آتی ہیں! کیا وہ مجھ سے کھیلے گا بھی؟"

"میں مانتی ہوں کہ وہ ضرور کہانیاں سنا سکتا ہے۔ رہا کھیل تو وہ تو اسے تمہارے ساتھ کھیلنا ہی پڑے گا"۔

"لیکن امول تو کہانیاں جانتا نہ تھا۔ اور نہ کبھی میرے ساتھ کھیلا ہی نہیں کرتا تھا"۔

"امول ایک سست۔ نشہ باز اور نکما آدمی تھا"۔

"تو ممی کیا اسی لئے آپ اسے فوجی کوارٹر میں بھیج دیا کرتی تھیں؟"

"ہاں"۔

"اور کیا وہاں اسے کوڑے بھی مارے جاتے تھے؟"

"ہاں میری جان وہاں اسے کوڑے سے بھی پیٹا جاتا تھا۔ یہ مردود، اسی کو سدھارنے کیلئے ہوتا تھا۔ جب بھی وہ وہاں سے آتا تھا بڑا چڑچڑا ہو جاتا تھا۔ اتنا کہ مجھ سے بات بھی نہ کرتا تھا۔ اس لئے کہ امول برا آدمی تھا۔ جو اسے سدھار نہ سکی"۔

"امول اب کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم"۔

لڑکا چپ ہو کر خیالات کی دنیا میں سما گیا۔ پھر بڑی کچھ بچارگی بھری گم آواز میں بولا "ممی، پیاری ممی، اب بھول کر کوڑوں سے پٹوانے کیلئے کبھی نہ بھیجنا۔ جیسا کہ آپ امول کو بھیجا کرتی تھیں۔ اگر آپ اسے پٹوائیں گی تو وہ مجھے کبھی کہانی نہ سنائیگا۔ اور امول کی طرح مجھے برا بھلا بھی کہے گا"۔

"کیا اس نے تمہیں برا بھلا کہنے کی ہمت کی تھی؟"

"وہ تو مجھے کہا کرتا تھا کہ میں شیطان کا نتھو گرا ہوں۔ کیا یہ کوئی بڑی بات ہے؟"

"ہائیں بدذات! ارے تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا"۔

"اگر میں نے کہا ہوتا تو آپ اسے کوڑوں سے پٹنے کیلئے چھاؤنی میں بھیج دیتیں۔ اور اس کیلئے میرا دل کڑھتا"۔

"ایسے لوگ اس لائق نہیں ہوتے کہ ان پر افسوس کیا جائے۔ اور ہاں شورا، تمہیں اپنی ماں سے کوئی بات چھپانی نہ چاہئے"۔

"امول کا نام سنتے ہی داسی یکتا نے دل سے اٹھی ہوئی ہوک کو دبا لیا۔ وہ نوجوان بے پرواہ، گھنگرالے بالوں والا ملاح نشے پر جان دیتا تھا۔ اور جب وہ نشے میں دھت ہوتا تھا تو ڈھیٹ سا ہو جاتا اور ہوائی قلعے بناتا۔ اور بڑیں مارنے لگتا۔ وہ دو مہینے یہاں رہا پر اپنی میٹھی یادیں چھوڑ گیا۔

داسی کو امول سے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ جب کپتان صاحب نے اپنی شرمیتی جی کے زور دینے پر اسے پٹائی کیلئے ہیڈ کوارٹر بھیجا تھا۔ تو یکتا کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ اور یہ بات کوئی ایک بار کی تو نہ تھی۔ یہاں تو ایسا آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ بھلا کیسے بھول جاتی کہ وہ کتنا اچھا رباب بجاتا اور مستانہ گیت گاتا تھا۔ اس کے دیکھنے میں کتنی بے باکی تھی۔ وہ کتنا نڈر تھا۔ اور تو اور وہ شرمیتی سے بھی نہ ڈرتا تھا۔ خاص کر جب وہ پینے پلانے میں لگا ہوتا تھا۔ بچاری یکتا اپنے من میں اس کی محبت چھپائے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب بیکار ہے، کیونکہ امول نے کبھی چنچل نظر سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ کیونکہ وہ اپنی فرصت کا وقت پڑوس کی ایک نوکرانی چھوکری کے پیچھے دوڑ دھوپ میں ہی بتایا کرتا تھا۔

، :

●●

بجی ھاں، بابائے اُردو!

شریکِ حیات

وہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ بڑی ہستیاں شاید کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ عبدالحق بھی شاید اُردو ہی کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ عورت کی نزاکت اور غزالی آنکھوں کی کشش انہیں متاثر نہ کرسکی۔ جھلکتے ہوئے سکّے چمکیلے روپے اور دولت کی ہوس انہیں بہت نہ سکی۔ انہیں عشق تھا تو اُردو سے! محبوب کی جلوہ طرازیاں، ایک ساتھی کا لطف انہیں اُردو ہی میں ملتا تھا۔ انہوں نے اُردو ہی کو شریکِ حیات بنالیا تھا۔ کہتے تھے "بھائی میں تو شادی کیا کرتا، میں تو اُردو سے شادی کرچکا ہوں"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ساری محنت اور ریاضتیوں کا نقطۂ نظر اُردو ہی تھی۔ گرداب میں پھنسی ہوئی کشتی کو اگر محفوظ ہونا ہو تو اسے ویسا ہی ناخدا مل جاتا ہے۔ عبدالحق کی ذات اُردو ادب کی ڈگمگاتی ہوئی اور ڈوبتی کشتی کے لئے لائق اور جوہا ناخدا کی سی تھی۔ "انجمن ترقی اردو" پہلے بھی تھی مگر مردہ شکل میں۔ شبلی باوجود اپنی عالمگیر شہرت کے اُسے کچھ زیادہ فروغ نہ دے سکے۔ ان کے لئے معمولی محنت کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالحق کی دنیا ہی اُردو تھی۔ یہ تن من دھن سے اُردو کی خدمت میں لگ گئے۔

صحیح خدمت وہ ہے جو بے لوث ہو جس میں اپنے ذاتی مفاد کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو۔ یوں تو ہر ادیب، شاعر اپنی زبان کا خادم ہوتا ہے لیکن وہ صرف زبان کا خادم نہیں ہوتا۔ اس کا نقطۂ نظر زبان کی خدمت سے زیادہ اپنی خدمت اور اپنی شہرت سے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی اپنی خدمت میں زبان کی بھی ترقی ہوتی ہے۔ یہ شاعروں کے دواوین، یہ لوگوں کے مضامین، تنقیدی مجموعے، ناول، افسانے، انشائیات اور رسالے کیا صرف زبان کی ترقی کے لئے شائع کئے جاتے ہیں؟ کیا یہ ذریعۂ تجارت نہیں؟ کیا یہ ذریعۂ کفالت نہیں؟ اور اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو عبدالحق سے بڑھکر زبان کا خادم دنیا کی کسی بھی زبان میں ملنا مشکل ہے۔ یہ الفاظ جذباتی انداز میں نہیں کہے گئے بلکہ غور کیجئے تو اس کے اندر سے ٹھوس حقیقت جھانکتی ہوئی نظر آئے گی۔

ہاتھوں کی لاج

اُن کا وطن وہی تھا جو اُردو کا تھا۔ ان کا مذہب وہی تھا جو اُردو کا تھا۔ انہیں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے ہی اُن کے دشمن بن گئے مگر وہ ہمت نہ ہارے۔ چلچلاتی دھوپ میں، موسلادھار بارش میں، طوفان اور آندھیوں میں وہ اُردو کے لئے برابر دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ وہ بڑے خوددار تھے۔ مگر جب اُردو کے لئے رقم کی کمی پڑی اور چندہ مانگنا پڑا تو بلا جھجک دامن پھیلا کر نکل پڑے۔

"مجھے اعتراف ہے کہ مجھے مانگنا نہیں آتا مگر میں آپ سے صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ اُردو کے لئے اس بوڑھے ہاتھوں کی لاج رکھ لیجئے"۔

یہ ایک سچے خادم کی آواز ہے۔ کتنا درد ہے اس میں، کتنا سوز ہے اس میں اور اس میں کتنی تاثیر ہے!

وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انہوں نے کافی روپیہ کمایا مگر انہوں نے کوئی ذاتی ملکیت نہیں بنائی اور بناتے کس لئے؟ وہ تو اُردو کو ہی اپنا وارث بناچکے تھے۔ جو کچھ عمر بھر کمایا اُردو ہی کے دامن میں ڈال دیا۔

ایک صدی کا افسانہ

ان میں ادبی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ مولانا ایک اچھے رہنما اور کارکن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے نقاد، محقق اور سخن فہم بھی تھے۔ انہیں شہرت کی لالچ نہ تھی۔ نیولین کی بہت اعزائی شاندار ان سے زیادہ کسی نے نہ کی ہو۔ وہ خود پس پردہ رہا کرتے تھے۔ یہ بات ان کی کمزوری پر دلالت نہیں کرتی۔ وہ انتھک محنت کرنے والے انسان تھے۔ ایسے مشکل کام جو اُن کی نگاہ میں دوسروں کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی وہ خود کیا کرتے تھے۔ انہوں نے جنوبی ہند کی پرانی اور نایاب کتابوں کو زندہ کیا اور اس طرح اُردو کی عمر میں ایک صدی کا اضافہ کردیا۔ ان کی "انگلش اور اُردو ڈکشنری" اپنی نوعیت کی پہلی اور بےمثال چیز ہے، جسے انہوں نے بڑی ریاضت سے مرتب کیا ہے۔ اسے دیکھ کر اُن کی زبان دانی اور بے پناہ علمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہیں لسانیات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ ایک ایسی لغت بھی تیار کر رہے تھے جس کے ہر ایک لفظ سے ہماری قدیم تاریخی روایات اور تہذیب و تمدن کی جھلک نمایاں ہو۔ اُردو میں پہلے بھی قواعد کی کتابیں متعدد لکھی گئی تھیں مگر زمانے کے تقاضا کے مطابق کوئی قواعد اُردو میں نہ تھی۔ انگریزی کے اثرات نے اُردو کو کافی وسیع کردیا اور اس قدر وسیع ادب کے سامنے اب پرانی طرز کی قواعد اپنا اثر قائم نہیں رکھ سکتی تھی۔ مولانا نے بڑی تحقیق سے قواعد صرف و نحو مرتب کیا اور اس میں بھی قاعدے کے ارتقاء پر مفصل روشنی ڈالی۔

وہ اُردو کے بہت بڑے حامی تھے مگر ہندی یا کسی بھی دوسری زبان کے مخالف نہ تھے۔ انہوں نے ہندی، مراٹھی، سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کو بھی سیکھا۔ وہ اُردو کو ہندی سے قریب لانا چاہتے تھے۔ اور عربی و فارسی کے بےجا استعمال کے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک زندہ جاوید زبان میں الفاظ کا اضافہ ہوتے رہنا چاہئے۔ خود انہوں نے سیکڑوں بول چال کے الفاظ کو ادبی شان بخشی۔ گھریلو زبان اور محاورے وہ بڑی بےتکلفی سے استعمال کرتے تھے۔ وہ اسلوب میں حالی کے مقلد تھے۔ انہوں نے اپنا کوئی اسلوب تعمیر نہیں کیا مگر اُردو کو ہندی سے قریب لانا، اُردو کو عوامی زبان بنانا اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے!

انور مظہر

لو پھر دل کے افق سے اٹھی اک بیچارے پرند کی لہر
لو وہ نین گگن پر چھایا اک فسردہ اندھیارا
پھر دل کی بستی اک زہرِ کرب کی دھند میں ڈوب چلی
پھر خوابوں کا گھونگھٹ اٹھا پھر وحشت کا نقاب ہٹا
وہ دیکھو پھر جھوم کے اٹھی یادوں کی گھنگھور گھٹا

وہ دیکھو پھر جھوم کے اٹھی یادوں کی گھنگھور گھٹا
بدلی بدلی ابھرا عکس کئی ہنستی تصویروں کا
پھیلا پھیلا جال کسی کی کالی کالی زلفوں کا
بکھرا بکھرا اُجیارا در سورج ڈالی آنکھوں کا
چمکا چمکا چاند کسی کے نور سے روشن راتوں کا
دھڑکن دھڑکن ایک کسک سے گھبرائی گھبرائی ہے
ہر سو آنکھوں، زلفوں والی چاندنی سی صورت چھائی ہے
یہ کیسی برسات ہے دیکھو کیسی آگ لگائی ہے

کیا من موہن روپ بھی ایسا پیتا روپ بدلتا ہے
بوٹا بوٹا شعلۂ لرزاں، پتہ پتہ جلتا ہے
غنچہ غنچہ جیسے اپنے دل کا خون اگلتا ہے
اپنے تبسم کی گرمی سے کھلتا پھول پگھلتا ہے
کون ہے ایسا جادوگر، یہ کس کا جادو چلتا ہے
دل گھبرائے، کیا ہونا ہے، شام کا سورج ڈھلتا ہے
جانے ایسی بربستی شب میں کیسا چاند نکلتا ہے

کون کہے یہ چاند اور دل کے بیچ نہ بادل آئے گا
کیسے ماتوں دھیان کے انگاروں پر جل برسائے گا

اپنے ہاتھوں آگ لگائی، چاہوں کوئی بجھائے نا
مجھ کو شعلہ جان، ہوا بھی دامن کو پھیلائے نا
چاند اور سورج، پھول اور کلیاں، کوئی اپنا نہ بلائے نا
خواب، خیال، امید، دلاسے کوئی آنکھ ملائے نا

اک اک کر کے تسکیں کے سب تاروں نے لیں آنکھیں موند
من پیاسا ہے، اب جو برسے، امرت جل یا لبس کی بوند!

درونِ خانہ

مرزا عزیز جاوید

خدائے ذہن شاعر
یہ مرے احساس کی دنیا
کہ جس میں کتنی دنیائیں ہیں سنگمِ نور و ظلمت کی
جہاں ہر رات پچھلے پہر سجتی ہے عدالت وہ زرفتہ
کے حقائق پر
جہاں حرص و ہوائے کن فکاں کی ہر حقیقت
آبلہ تن، سر برہنہ، پا بجولاں
دلیلوں کا لباسِ آتشیں پہنے
کبھی کچھ تلخ لہجے
اور کبھی فریاد کی لے میں
دلیلوں کا لباسِ آتشیں پہننے والوں کی
حکایت
مرے احساس کے مسند نشینِ عدل سے
کہتی ہے سرتا پا
حکایت زہر آگیں، شعلہ بردست....
جسے سن کر
مرے احساس کا مسند نشینِ عدل
جھلکتا ہے سراپا
خدائے ذہن شاعر
یہ مرے احساس کی دنیا۔

معائب سخن

مصنفہ حسرت موہانی پر ایک نظر

— عصمت جاوید

استادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اردو شعرگوئی کے فن میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب ہمارے نظامِ شعرگوئی سے استاد کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ استادی اور شاگردی کے سلسلے کا ختم ہو جانا یا اس رواج کا بڑی حد تک کم ہو جانا دراصل زمانے کی ضرورت تھی۔ جمہوریت کے تقاضوں، شعرگوئی کی عام مقبولیت کی باعث شعرا کی کثرت قدیم طریقۂ تعلیم کے خاتمے، طباعت و اشاعت کی سہولتوں اور کتابوں اور رسالوں کے ذریعے ملک کے مختلف خطوں میں اردو زبان کی ترویج و ترقی نے استاد کے وجود کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناممکن قرار دے دیا۔ جب ہمارے ادارۂ سخن گوئی سے استاد کا وجود آہستہ آہستہ مٹنے لگا۔ تو اردو زبان سے والہانہ محبت اور صحیح ذوقِ سخن رکھنے والے حلقوں میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی کہ نو مشق شعرا کی ہدایت و رہنمائی کیلئے فن شعرگوئی پر ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں عروض اور محاسن و معائب شعری سے متعلق ایسے کارآمد گر ہوں جو نہ صرف صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہوں بلکہ جن کی پشت پر ارتقائے زبان و بیان کی مکمل تاریخ بھی ہو۔ اس ضرورت کو بیسویں صدی کے ربع اول ہی میں محسوس کیا جانے لگا تھا۔ اس سلسلے میں خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی شاعری کی پہلی دوسری اور تیسری کتابیں اور مولانا حسرت موہانی کی کتاب نکاتِ سخن، یہ سب کتابیں ۱۹۲۵ء یا اس سے کچھ قبل شائع ہو چکی تھیں۔

شاعری کی پہلی کتاب کے سرورق پر یہ عبارت قابل ذکر ہے۔ "ہر مبتدی بغیر استاد کی مدد کے چند دنوں میں کامل شاعر بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نکاتِ سخن کے دیباچے میں حسرت موہانی فرماتے ہیں "شعر کے موجودہ دور میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ قریب قریب ناپید ہو چکا ہے۔ استادی و شاگردی کی وہ رسم قدیم جس کا سلسلہ قریب قریب منقطع ہو چکا ہے اب دوبارہ اپنی گذشتہ روایتوں کے ساتھ ازسرِ نو قائم نہیں ہو سکتی۔ اور جب ایسا نہیں ہو سکتا تو لازم آیا کہ نئے شاعروں کے فائدے کیلئے اس قدیم اور متروک طریقے کی بجائے کوئی اور جدید اور آسان طریقہ ایجاد کیا جائے۔ اور راقم کو اس کا کوئی اور طریق اس سے بہتر نظر نہیں آیا کہ اپنے گذشتہ تیس سال کے شاعرانہ تجربوں کو نکاتِ سخن کے نام سے کتابی شکل میں پیش کر دے۔ (اس کتاب کو مصنف نے تین رسالوں موسومہ ۱۔ متروکاتِ سخن، ۲۔ معائبِ سخن، ۳۔ محاسنِ سخن کی صورت میں شائع کیا ہے۔)"

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں حضرات نے زمانے کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ اور نظامِ شعرگوئی میں استاد کی عدم موجودگی سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا اسے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کتابوں کو لکھے ہوئے تین دہائیوں سے کچھ اوپر یعنی ایک نسل سے زیادہ کا زمانہ گذر گیا ہے اور جب سے اب تک اسالیب بیان کے نہ جانے کتنے گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آ چکے ہیں۔ جہاں تک فن عروض پر کتابوں کا تعلق ہے ان کتابوں پر نظرِ ثانی کی اس لئے چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس فن میں علامت الشعار پنگل کے اتباع سے قطع نظر اب تک کوئی قابلِ ذکر انقلابات نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ معائب و محاسن سخن اور خود نظریۂ سخن سے متعلق ہمارے خیالات میں اس حد تک تبدیلی آ چکی ہے کہ ضرورت ہے کہ فن شاعری کے موضوع پر تیس سال سے قبل لکھی ہوئی کتابوں کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے۔ خصوصاً اس لئے کہ موجودہ دور میں اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں ان پرانی کتابوں کی خوشہ چینی کرتی ہیں۔ اور ان کے اقوال و آرا کو بطورِ سند پیش کیا جاتا ہے۔

مقالۂ ہذا میں اسی نوع کی ایک کتاب معائبِ سخن مصنفہ حسرت موہانی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے کا موضوع معائبِ سخن کے صرف معائب دکھانا نہیں ہے اس مختصر رسالے میں کام کی کئی باتیں بھی ملتی ہیں۔ علامتِ مفعول "کو" اور حرفِ اضافت "کا" سے متعلق اس رسالے میں بہت سی معلومات درج ہیں۔ اسی طرح تعقیدِ روانی، شکست ناروا، غلط العوام "بجز" بمعنی "صرف" کا غلط استعمال ان عنوانات کے تحت مفید باتیں بتائی گئی ہیں۔ ہر مبتدی کیلئے اس رسالے کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حسرت کے اقوال و آرا سند کے طور پر پیش کر کے غلطیوں اور غیر ضروری پابندیوں کو ضروری سمجھ کر اپنا لیا

شاعری کی پہلی کتاب بارِ سوم ماہ اپریل ۱۹۲۶ء

شاعری کی دوسری کتاب بارِ اول ۱۹۲۵ء، تیسری کتاب کے سرورق پر تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ اس کا دیباچہ ۸ جون ۱۹۲۷ء کا لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح نکاتِ سخن دیباچے کی تاریخ ارقام ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء ہے۔

جو کسی شاعر کو جاہل قرار دیا جائے ۔ معائبِ سخن کے طرف معائب نہ تحقیق دلائی گئی ہے ۔

معائبِ سخن کا سب سے بڑا عیب حسرت موہانی کے تنقیدی رویے کا ہے جسے آج کا ذہن قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ۔ حسرت نے قیاسی (deductive) تنقید پر عمل کیا ہے ۔ جو پہلے سے طے شدہ اصول و ضوابط کے معیار پر حالات و واقعات کو پرکھ کر ان پر حسن و قبح کا حکم لگاتی ہے ۔ تنقید کا دوسرا طریقہ استقرائی ہے ۔ جو حالات و واقعات کا بغائر مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد اس کی روشنی میں اصول و ضوابط وضع کرتا ہے ۔ حسرت نے مبینہ معائب کے ذیل میں اساتذہ فن کے کلام سے بھی مثالیں دی ہیں ۔ اس طرح انھوں نے اپنے دور کا قیاسی خصوصیت یعنی افلاس پرستی کے خلاف عمل کیا ہے بلکہ اپنے اس رد عمل کے جواز میں انھوں نے خود اپنے اشعار تک پیش کئے ہیں لیکن خود اس بات سے کہ اساتذہ فن نے مبینہ غلطیاں کی ہیں ۔ یہ ثابت ہے کہ یہ غلطیاں نہیں بلکہ زبان کے مزاج کا اقتضا ہیں تھا ۔ بہر حال حسرت کے بیان کردہ معائبِ سخن مندرجہ ذیل ہیں ۔

(۱) معائبِ سخن میں پہلا عیب "عیبِ تنافر" بتایا گیا ہے حسرت نے اس کی تعریف یوں کی ہے ۔ "جب کسی شعر میں دو ایسے لفظ متصل ہو جاتے ہیں ۔ جن میں سے پہلے لفظ کا حرفِ آخر وہی ہوتا ہے جو دوسرے لفظ کا حرفِ اوّل ہوتا ہے ۔ تو ان دونوں حرفوں کے ایک ساتھ تلفظ میں ایک قسم کا ثقل اور ناگواری پیدا ہو جاتی ہے ۔ اسی کا نام عیبِ تنافر ہے ۔ اس سے ہر شاعر کو حتی الامکان احتراز لازم ہے ۔ حسرت کا بیان کردہ یہ عیب محلِ نظر ہے ۔ جبکہ اکثر اشعار میں پہلے لفظ کے حرفِ آخر اور دوسرے لفظ کے حرفِ اوّل میں اشتراک و اتصال ہونے کے باوجود کوئی صوتی تنافر پیدا نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس اتصال سے پیدا ہونے والی آواز کسی مشدد حرف کی آواز کے مماثل ہوتی ہے ۔ جس میں کوئی تنافر نہیں ۔ اگر کسی لفظ میں دو حرف ایک صورت ہوں ۔ جس میں پہلا حرف متحرک اور دوسرا حرف ساکن ہو تو ایسے لفظ میں کوئی تنافر نہیں ہوتا ۔ مثلاً ممدوح ، مماثل ، سرا سر ، ہلہلو ، نخ وغیرہ ۔ اگر یہ دو الفاظ کا قیاس کرنا چاہئے ۔ جن میں سے پہلے لفظ کا حرفِ آخر وہی ہے جو کہ دوسرے لفظ کا حرف اول ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے میں متوخر الذکر بھی متحرک ہوتا ہے ۔ حسرت کا یہ بیان کردہ تنافر صرف اصطلاحی ہے حقیقی نہیں ۔ اور شاعر پر اس قسم کی اصطلاحی قید کرنا مناسب نہیں ۔ حسرت نے اس ضمن میں کئی شاعروں اور کچھ اساتذہ کے اشعار پیش کئے ہیں جن کے مطالعے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان اساتذہ نے بھی اس اصطلاحی عیب کی پرواہ نہیں کی ہے ۔ حسرت نے اس ضمن میں جو اشعار پیش کئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں ۔

قائم : نام سنتے ہی اسکا کیوں قائم
بھڑکی تم نے اضطراب شروع

فراسو (کتا)
وہیں ہے تمام بزم میں سے سرخ جام سرخ
یاں میں سرشک سرخ سے آنکھیں مدام سرخ
(اس شعر میں دو میم کی بجائے تین میم ایک جگہ جمع ہیں اسکو عیب تنافر (جلی) کی مثال سمجھنا چاہئے ۔۔۔۔ حسرت)

مسرور کاکوری :
ضبط سے ارتباط ہو کیا خوب ہے
پھر کچھ سے اختلاط نہیں کیا خوب ہے
(اختلاط کی "ط" اور نہیں کی "ت" کا اجتماع ثقل سے خالی نہیں ۔۔۔۔ حسرت)

ذوق :
اے ذوق دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

غالب :
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سروپا [illegible]
کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا کو

مذکورہ بالا اشعار کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہم "ک" ، "ک" اور "ت" ، "ت" کا اتصال قطعی بار نہیں گزرتا ۔ اس لئے کہ یہ الفاظ غیر مسموع (unvoiced) ہیں ۔ ان کے اتصال میں ثقل نہیں ہے ۔ البتہ "ع" کے اتصال میں جیسا کہ غالب کے مذکورہ شعر میں ہے ناگواری کا احساس ہوتا ہے ۔ اس لئے کہ "ع" مسموع ہے ۔ اور دونوں "ع" متحرک ہیں ۔ پھر بھی یہ آواز اتنی بد نما نہیں ہے ۔ کہ اسے عیب میں شمار کیا جائے ۔ حسرت کو غالباً اس بات کا احساس ضرور تھا کہ عیب تنافر جب تک کہ واضح نہ ہو عیب نہیں ہوتا ۔ اسی لئے انھوں نے اس عیب کی دو قسمیں بتائی ہیں ۔۔۔ عیب جلی اور عیبِ خفی ۔ لیکن یہ تقسیم غیر ضروری ہے ۔ بقول پنڈت کیفی "فن کے رسالوں میں جو کلام تنافر کی مثالوں کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس میں اگر واقعی تنافر ہے تو شعر کہنا ہی ناممکن ہو جائے گا"۔

ہائے مختفی کی بجائے الف کا استعمال ۔۔۔

اس سرخی کے ذیل میں حسرت ترکیب فارسی کے تحت ہائے مختفی کی جگہ الف کا استعمال ناجائز قرار دیتے ہیں ۔ حالانکہ ہماری زبان کی صوتیات کا یہ تقاضہ ہے کہ ہم ہائے مختفی کو صرف متحرک کی طرح ادا کریں ۔ بلکہ اس کا اشباع الف کی صورت میں کریں ۔ حسرت نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ اردو شاعروں میں کم ایسے ہیں جو اس رعایت کا لحاظ ترکیب فارسی میں ہائے مختفی کے بجائے الف استعمال نہ کر کے لحاظ رکھتے ہوں اور ان سے اس غلطی کا ارتکاب نہ ہوا ہو ۔ جب بول چال میں ہم ترکیب فارسی کے اس ہائے مختفی کو مضاف الیہ میں ہو الف میں تبدیل کر دیتے ہیں تو شعر میں اس صورت تغیر کے حوالے سے انکار کرنا بڑی زیادتی ہے ۔ حسرت نے اس ذیل میں جو مثالیں دی ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں ۔

سلہ پنڈت دتاتریا کیفی نے "منشورات" کے ... [illegible] ... حسرت ... [illegible] ... سے جا بجا اختلاف کیا گیا ہے ۔ چونکہ پنڈت جی کے خیالات اس سلسلے میں قدامت شکن ہیں ۔ اور اردو زبان کے جدید رجحانات کا ساتھ دیتے ہیں اس لئے مضمون نویس ان کے حوالے جا بجا دیئے گئے ہیں ۔ راقم کو اس وقت استفادہ کرنے کا موقعہ ملا جب یہ مضمون مکمل ہو چکا تھا ۔ اس لئے نظر ثانی میں ان حوالوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔

سلہ صوتیات کی اصطلاح میں آواز ادا کرتے ہوئے اگر صوتی تاروں میں کھنچاؤ پیدا ہو تو ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسے انگریزی میں voice کہتے ہیں ۔ دونوں انگلیاں کانوں میں ڈال کر اگر کسی آواز کو ادا کریں تو گونج ہو تو اسے voiced کہتے ہیں ۔ ورنہ غیر مسموع (unvoiced) ۔ اردو تعلیم کے لسانیاتی پہلو ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہندوستانی لسانیات میں ڈاکٹر زور نے مسموع کیلئے "منعیت" کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

ہفت روزہ

پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد ۴ | ۱۰ر فروری ۱۹۶۵ء | شمارہ ۵

اس شمارے میں

قیمت

ایک سال دس روپے۔
فی پرچہ تیس پیسے

★

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

ان دس دنوں میں

- اڑیسہ کے وزیر اعلیٰ مسٹر بیرن مترا نے استعفیٰ دے دیا۔ بدعنوانیوں کے الزامات کی وجہ سے مرکزی حکومت نے انھیں مستعفی ہونے کے لئے کہا تھا۔
- پرجا سوشلسٹ اور سمیکت سوشلسٹ پارٹیاں علیحدہ ہوگئیں۔
- مرکزی حکومت نے کہا ہے کہ ہندی کے نفاذ کے بعد سرکاری ملازمتوں کے سلسلے میں ملک کی مختلف ریاستوں کا کوٹا مقرر کیا جائے گا۔
- بمبئی اور دہلی میں کروڑہا ناجائز روپیہ برآمد کیا گیا۔
- وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے کہا ہے کہ یونین پبلک سروس کمیشن میں ہندی زبان کے ذریعۂ امتحان بننے میں ابھی کافی مدت ہے۔
- وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ولسن نے کہا ہے کہ ہندوستان پر کسی بھی بیرونی حملے کی صورت میں برطانیہ ہندوستان کی مدد کرے گا۔
- برما کے صدر مملکت جنرل نی۔ون ہندوستان کے دورے پر دہلی پہنچے۔
- پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ مسٹر کیرون اور اُن کے تین ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا۔
- امریکہ اور جنوبی ویٹ نام کے ہوائی جہازوں نے شمالی ویٹ نام کے ہوائی مرکزوں پہ بمباری کرکے انھیں تباہ کر دیا۔

نشور واحدی

غزل

بیک نظر یہ حقیقت سمجھ میں آئی ہے
حیا کچھ بھی نہیں اپنی دلربائی ہے

جھکی ہوئی ہے وہ زلفِ سیاہ آنکھوں پر
گھٹا یہاں بھی کسی میکدہ پہ چھائی ہے

فریبِ عمر نہ کھانا کہ یہ ضیائے حیات
ازل سے تا بہ ابد ایک پل میں آئی ہے

فلک کے چاند ستاروں پہ ایک سانس نہیں
یہ زندگی بھی بہت دور سے منگائی ہے

وہی فریب ہے گندم کا اور وہی آدم
سمجھ رہا تھا کہ جنّت نئی بنائی ہے

خرد کے دونوں کناروں پہ روشنی کیسی
اِدھر جو شمع جلائی اُدھر بجھائی ہے

نگاہِ ساقیِ نامہرباں کا طور نہ پوچھ
جہاں گئی کوئی پیمانہ توڑ آئی ہے

نشور مست نگاہوں کا راز کیا کہیے
اِن انکھڑیوں نے کسی کی غزل چرائی ہے

مولانا ماہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

"نرس یا کھلایا"

(۵)

دوسرے دن صبح سویرے لگ بھگ آٹھ بجے "بلبل فیدو" اپنا سامان ایک چھوٹی سی پیٹی گدیلا اور ایک تکیہ جس پر سوتی کپڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ جو اس کو اس کے سرہنگ دوست کی بیوی نے بھینٹ کیا تھا۔ اور ایک روسی تین تا ڈسبے کر شگنیوں کے یہاں آن پہنچا۔ یہ چیزیں اس نے باورچی خانہ کے ایک کونے میں رکھدیں۔ اور اپنے جسم پر کسی ہوئی تنگ وردی اتار کر جہازیوں کا تہبند اور کنوس کا جوتا پہن کر شریمتی شگن کے سامنے جا حاضر ہوا۔ کہ اپنی نئی سیوا چالو کردے۔

بلبل فیدو اپنی شلوار جیسے کھلے پاجامے اور کھلے کھلے تہبند میں جس کا بڑا اور کھلا کالر اس کی مضبوط تنی ہوئی گردن پر کھلتا تھا۔ اب وہ کوئی دوسرا ہی آدمی نظر آتا تھا جو آزاد ہو۔ اور ہر آندھی اور کٹھن وقت کا سامنا کرنے کے لئے بالکل تیار۔ بس وہ اس لباس میں پکا جہازی آدمی تھا۔ اس کی ہر چیز ٹھیک تھی۔ ایک دھونکو اسے میل کھاتی تھی۔ یہ تو سب ٹھیک تھا۔ وہ ضرور صاف ستھرا تھا مگر تارکول کی گندھ تو اس میں رکھی جاتی تھی۔ ہاں یہی وہ گندھ شورا کو دنیا جہان کی سگندھوں سے اچھی لگ رہی تھی۔

شریمتی شگن نے اسے سر سے پیر تک کڑی نظر سے دیکھا اور خیال کیا کہ نیا نوکر اتنا برا اور جنگلی تو نہیں جتنا وہ پہلے پہل دکھائی دیا تھا۔ نہ وہ اتنا ہٹیلا ہی جان پڑتا ہے۔

بس مگر اس میں کوئی بری چیز تھی جو کھٹکتی تھی تو بس یہی اس کے گندے ہاتھ تھے۔ وہ اپنی ہاتھوں کو (نا) گھن دیکھتی ہوئی بولی۔

میں نے تمہیں جیسا کہا تھا۔ کیا تم حمام میں گئے تھے؟

جی بائی جی۔ میں گیا تھا۔ بلبل نے گویا اپنی بات ثابت کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "بائی جی تارکول ایک ایسی جھٹ پٹ چھوٹ جانے والی چیز نہیں چاہے کوئی ہاتھوں کو کتنا ہی رگڑے۔

خیر اپنے ہاتھوں کو اور رگڑو اور صاف رکھو۔

جی اچھا بائی جی۔

شریمتی شگن نے اس کے کنوس کے جوتوں کو دیکھتے ہوئے تیکھے پن سے کہا۔

خبردار ننگے پیر کبھی میرے پاس مت آنا۔

اب تم جہاز پر نہیں ہو۔

جی نہیں بائی جی

اچھا اب جا کر چائے پیو۔ اور یہ مصری کی ڈلی لیتے جاؤ۔

"بڑی مہربانی بائی جی" یہ کہتے ہوئے اس نے مصری کی ڈلی یوں اٹھائی کر بجال ہے۔ اس کی انگلیاں بائی کی گوری گوری انگلیوں سے چھونے پائی ہوں۔

جانے پاکر باورچی خانہ میں زیادہ مت ٹھہرو۔ بس چائے پیتے ہی میرے لال کے پاس پہنچ جاؤ۔

"بلبل جلدی کرو اور جھٹ پٹ واپس آجاؤ" شورا نے کہا۔

سکندر بلی صاحب۔ تو میں آیا۔ بلبل فیدو نے کہا۔ فیدو اور شورا دونوں پہلے ہی سے ایسے سرگرمی سے دوڑ دھوپ میں لگ گئے جیسے انہیں دنیا میں بس ہے تو یہی ایک کام۔

پہلے تو شورا فیدو کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور ادھر جا جب تک اپنے کھلونے دکھا نہ سکا جو اس کے پاس تھے۔ پھر تو سچ مچ ایسے لگا کہ انہیں دیکھ کر بلبل کچھ بھونچکا سا ہوا۔ اور اس نے انہیں بڑے دھیان سے دیکھا۔ ان کھلونوں میں سے ایک پن چکی اور دوسرا ۔۔۔ دو ٹوٹے ہوئے کھلونے بھی تھے۔ فیدو نے کہا کہ میں ان کو ٹھیک کر کے چلتے پھرتے اور کام کے بنا دوں گا۔

"سچ مچ تم مرمت کر سکو گے" شورا نے کچھ شک سا کرتے ہوئے۔

میں کوشش تو ضرور کروں گا۔

بلبل تم کہانیاں بھی کہنا جانتے ہو۔

ضرور جانتا ہوں۔

کیا تم مجھے کہانیاں سناؤ گے۔

کیوں نہیں اب بھی اور پھر بھی۔

بلبل اگر تم کہانیاں سناؤ گے تب تو تم اور بھی اچھے ۔۔۔ ملاح نے اپنے کرخت ہاتھ سے بچے کے سر کو تھپتھپایا۔ اس کی کھردری اور جھکی ہوئی بھنوؤں میں چھپی ہوئی آنکھوں میں نرمی اور پیار کی مسکراہٹ آگئی۔

بلبل کی یہ ریت نہ یہ کر شورا کو بری نہیں لگی جسے اس کی ماں نے پڑھا رکھا تھا کہ نوکر چاکروں سے زیادہ گھلنا ملنا نہیں چاہیے۔ لیکن وہ تو اپنے اس نئے دوست سے خوب گھل مل گیا۔

"بلبل بھلا تم کچھ جانتے بھی ہو۔"

ماسٹر سکندر کیا؟

میں تم سے تمہاری شکایت کبھی نہ کروں گا۔

لیکن کرو بھی تو کہوں اور کیا۔ میں بھلا تمہارا کچھ بگاڑوں گا تھوڑا ہی۔ کیونکہ بچوں کو ستانا تو بڑا پاپ ہے۔ اور تو اور جنگلی جانور بھی بچوں کو دکھ نہیں دیتے۔ خیر اگر کبھی ہم دونوں میں بگاڑ ہو جائے تو ہم دونوں آپس میں آپ ہی آپ نپٹ لیا کریں گے" فیدو نے نیک دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم تمہاری ماں کو بیچ میں لائیں ہی کیوں ماسٹر سکندر بلی

بہت ٹھیک۔ یہ گناہ کی معافی بڑی بات ہے۔ ماسٹر سکندر۔
بہت ہی بڑی بات ہے۔ فیدو نے جہازیوں کی پرانی
ریت کے مطابق دبی دبی آواز میں کہا۔

شورا نے یہ مان لیا کہ گناہ کی معافی بڑا کام ہے۔
اُسے اماں اور بیگم نے بھی تو یہی بات کئی بار کہی تھی۔ اور پھر
اپنی بات سمجھانے کے لئے بولا کہ کس طرح اس نے انہوں کو
کوڑوں کی پٹائی سے بچایا تھا۔ جب اس نے لے سنبھالا
یا ستو تگڑا ایک تھا۔ اس پر بھی اس کی کوڑوں سے پٹائی
ہوتی رہتی تھی بسبب یہ کہ وہ ممی سے اکڑ اکڑ کے بات
کیا کرتا تھا۔ اور نشے میں دھت بھی ہو جایا کرتا تھا۔
لڑکے نے بھروسہ بھری دھیمی آواز میں کہا۔

بچے تم نے ٹھیک کہا ـــ بہت ہی ٹھیک کہا۔ فیدو
نے نرم آواز میں کہا اور بچے کے کام کو سراہتے ہوئے اس
کے کندھے کو تھپتھپایا۔ تمہارے ننھے سے دل میں اتنی سمجھ
بوجھ بھی ہے کہ تمہیں اس پر ترس آ گیا۔ لیکن انہوں کی یہ بڑی
بھول تھی کہ اس نے بڑوں کا غصہ برداشت اور معصوم
بچے پر اتارا۔ وہ نرا مورکھ اور نادان ہی ہوگا۔ لیکن
تم بھی دیکھو خدا سے ننھے منے ہو تم نے اس سے بدلہ
نہیں لیا۔ بیٹا تم نے یہ بہت ہی اچھا کیا۔

فیدو ایک ٹرنک پر بیٹھ کر روتا گیا۔

مگر تم اپنی ممی کو جا کر بتا دیتے جو انہوں نے کیا تھا تو اس
کو جیل میں سے نکال لیا جاتا۔

بلبل اس کا کیا مطلب ہے۔

بلبل نے ہنستے ہوئے کہا کہ اس کی خوب ٹھکائی ہوتی۔

کبھی تمہاری بھی پٹائی ہوئی ہے۔

ہاں ـــ ہاں ـــ جب میں جوان تھا۔ یہ تو مجھ پر
بھی بہت بیت چکی ہے۔

کیا اس سے بہت دکھ ہوتا ہے۔

کھری بات تو یہ ہے کہ پٹائی کچھ مزیدار چیز تو ہوتی نہیں۔
تمہیں کوڑوں سے کیوں پیٹا گیا تھا۔

سمندری بیڑے میں اس بات کا

شورا تھوڑی دیر تو چپ رہا۔ پھر بلبل کو مخاطب کرتے
ہوئے کہنے لگا کہ بلبل پٹائی تو میری بھی ہو چکی ہے

تمہاری! ارے میرے بچارے ـــ

ممی نے آپ مجھے کوڑے لگائے تھے..... دکھ
بھی بہت ہوا تھا۔

بھلا کیوں تمہاری ممی نے یہ کوڑا ماری کی تھی۔

ایک بار تو میں نے ممی کا پیالہ توڑ دیا تھا۔ دوسری
بار میں نے ان کا کہنا نہیں مانا تھا۔ مگر بلبل یہ بات کسی سے
کہنا مت۔

مت ڈرو بچے! میں کسی سے نہ کہوں گا۔

لیکن ڈیڈی نے تو مجھے کوڑے تک کبھی مارے نہیں۔

یہ ان کی اچھی بات ہے۔ بھلا مارتے بھی تو کیوں۔

تم لیڈمرلی گھونڈ کو جانتے ہو نا۔ ان کا بیٹا پریتم
کہتا تھا کہ اس کی تو خوب پٹائی ہوتی ہے۔ اور خود اس کے
ڈیڈی اس کی اپنے ہاتھ سے پٹائی کرتے ہیں۔

فیدو نے گھمبیرتا سے سر ہلایا۔ یہی بات تھی کہ
گوھنڈ جی ملاحوں میں پسند نہ کئے جاتے تھے۔ جہاں تک
ماتحتوں سے سختی کا معاملہ وہ ایک ہیولا بنے ہوئے تھے۔

کیا ڈیڈی بھی جل پری کے ملاحوں کو پیٹا کرتے ہیں۔

ماسٹر سکندر کبھی کبھی تو سزا دینی بھی پڑتی ہے۔

کیا وہ بھی کوڑے لگواتے ہیں۔

کبھی کبھی! لیکن تمہارے ڈیڈی بھلے آدمی
ہیں۔ یہی کارن ہے کہ ان کے آدمی انہیں جی جان سے
چاہتے ہیں۔

ضرور ڈیڈی بہت اچھے ہیں۔ لیکن بلبل ہم باہر
کیوں نہ چلیں۔ لڑکے نے بات چیت کا رخ بدلتے
ہوئے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا جس میں سے
ہو کر سورج کی کرنیں کمرے میں پھیلتی چلی جاتی تھیں۔

کیوں نہیں۔ چلو باہر چلیں۔ سورج خوب چمک
رہا ہے۔ اسے دیکھ کر تمہارا دل خوش ہوگا۔

ضرور ضرور۔ ہمیں پہلے ممی سے پوچھنا چاہئے۔
تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ ہمیں باہر جانے دیں گی۔

مجھے یقین تو ہے کہ وہ ضرور باہر جانے دیں گی۔

شورا دوڑا دوڑا باہر گیا۔ اور منٹ بھر میں واپس
آتے ہوئے خوشی سے پکار کر کہنے لگا۔

ممی کہتی ہیں کہ ہم باہر جا سکتے ہیں۔ لیکن پہلے مجھے
گرم کپڑے پہن کر ان کو دکھا لینا چاہئے۔ بلبل تو مجھے
کپڑے پہناؤ۔

ہرا کوٹ وہ ٹنگا ہے۔ ٹوپی اور گلوبند بھی وہیں ہے۔

فیدو نے لڑکے کو کپڑے پہناتے ہوئے ہنستے ہنستے
کہا۔ ماسٹر سکندر تم نے کتنے گرم کپڑے پہنے ہیں۔ معمولی ہوا
تو کیا یہ تو برف کے طوفان میں بھی کام آ سکتے ہیں۔

لیکن ممی مجھے دوہرا ہلکا کوٹ پہننے ہی نہیں دیتیں۔

میں نے پوچھا تھا۔ لو آؤ ممی کے پاس چلیں۔

مسز بیتی شگن نے شورا کے لباس کو جانچا۔ پھر فیدو
کی طرف دیکھ کر کہا۔

اپنے ننھے ماسٹر کا دھیان رکھیو۔ دیکھنا کہیں
گر کر چوٹ پھیٹ نہ کھا لے۔

میں کیسے دیکھوں گا۔ اگر بچہ گر بھی پڑے تو اس سے کیا
بڑا نقصان ہوتا ہے۔ فیدو نے دل میں سوچا۔ اور مسز بیتی
شگن کے یوں زبان چلائے جانے کو دل سے ناپسند تو کیا
مگر بڑے ادب سے کہا یوں کہ۔

جی ہاں جی۔ نہیں ہاں جی۔

تو باہر جاؤ۔

دونوں کے دونوں خوش خوش خوابگاہ سے نکلے۔ نیکتا
چھوٹے بچے کو گود میں لئے کھڑی رشک بھری نگاہ سے ان
کو دیکھتی رہی۔

ماسٹر سکندر برآمدے میں ذرا رکنا میں پلک مارتے دوہرا
جوتا پہن کر یہ آیا۔

بلبل باورچی خانے کے ساتھ کی اپنی کوٹھری میں گیا۔ بوٹ
بوٹ چڑھائے جہازیوں کی صدری پہنی اور ٹوپی سر پر جمائی۔ اور
کوٹھی کے بڑے صحن میں آن کی آن میں لڑکے کے پاس آن پہنچا۔
بنگلے کے پچھواڑے حصہ میں باغ تھا جس میں ننگے بچے خوشنما کلیوں
میں پھوٹ پڑنے کیلئے بہار کے شگوفے مچل رہے تھے۔ (باقی آئندہ)

مایا شنکر

شیشے فریب کا

وہ غسل خانے سے نکلی، بلکہ نہیں، نکلنے کے لئے اس نے ذرا دروازہ کھولا کہ اس کی نظر مختصر سے آنگن سے ہوتی ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑے ہوئے مرد کی پشت پر پڑی۔ جو کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ باتھ روم سے نکل کر آنگن میں آ کھڑی ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والے کی جھلک، اس کی چال کا انداز، اسے کچھ پہچانا سا محسوس ہوا۔ مگر کسی کے آنے کی اسے اطلاع نہیں تھی۔ کسی کو اس نے آنے کی دعوت بھی نہیں دی تھی آج۔ اس نے اپنے دماغ پر زور دے کر سوچا۔ یوں آنے والا یہ کون ہو سکتا ہے؟ وہ ابھی ابھی دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ اس کی پیٹھ پر پھیلے ہوئے سر کے بال، یوں لگتے تھے کہ گھنے کالے بادل اس کی کمر کے نیچے تک جھک آئے ہیں۔ جن سے جیسے موتی ٹپک رہے ہوں۔ ان گنت بے شمار آبدار موتی۔

دروازے پر پڑے ہوئے بھاری ریشمی پردے کو ذرا سرکا کر، اس نے ایک پیر اندر رکھا اور ٹھٹھک کر جہاں کی تہاں ہی رہ گئی۔ جیسے اس کے جسم کے سارے پرزے ایک دم ٹھپ ہو کر رہ گئے ہوں۔ پھر بھی اس کا دل دھڑک رہا ہے۔ ٹھک ٹھک۔ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھال کر، اس نے آنے والے کو "خوش آمدید" کہنا چاہا۔ لیکن اس کے ہاتھ اٹھے ہی نہیں، کہ کم سے کم انھیں جوڑ کر نمسکار ہی کر دے۔

"اس طرح آ دھمکنے کے لئے، کہو تو معافی مانگ لوں" لاپروائی کے انداز میں اندر گھس آنے والے نے کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کے بولنے کا کھرا جھٹکا وہ پہچان پاتی۔

"اب آ ہی گیا ہوں، لوٹوں گا کل یا پرسوں۔"

کوئی تبدیلی نہیں، کچھ بھی نہیں بدلا۔ بالکل وہی چہرہ، جس کی تہ کے اندر ایک کھردرا پن چھپا ہے کھردرا، جس کا کوئی توڑ نہیں۔ اداسی کی جھلک جس میں کچھ بھی کر گزرنے کا رنگ۔ لیکن ہونٹوں پر ایک موہ لینے والی جادوئی مسکان۔ ایک نظر دیتا نے اس پر ڈالی اور کھنچتی ہوئی چل کر، اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ اپنا سر شنوناتھ کے گھٹنوں پر ٹیک دیا اس نے۔

"ادھر نہیں" شنو نے اسے باہوں سے پکڑ کر، اپنے پہلو میں صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں بڑی ناراض لگتی ہو؟"

اس کے کندھے سے سر لگا کر سویتا نے آنکھیں بند کر لیں۔ مندی آنکھوں کے سامنے بھی اس کی ایک ایک کرن دمک کر جیسے ناچنے لگی۔

مائیوں بیٹھی سویتا۔ فروری مہینے کی لمبی چوڑی رات۔ اس رات کا آخری پہر۔ سب تھکے ہارے۔ بستروں میں لیٹے پڑے، جیسے موت کی گہری نیند سے مقابلہ کر رہے ہوں۔ مگر ایک پل کے لئے سویتا کی آنکھ نہیں لگ رہی ہے۔ آنے والی زندگی کی، زنجیر کی ایک ایک کڑی اس کے کانوں میں بج رہی ہے، رفتار سے پڑتی ہوئی چوٹ کی طرح۔ ہر چوٹ میں مستقبل کا کوئی نہ کوئی اشارہ لپٹا ہوا ہے۔ "لگن کا وقت گزرا جا رہا ہے۔" بشنوناتھ نے دوسرے کمرے سے آ کر اس کی اماں کو جھنجھوڑ کر کہا تھا۔ "اٹھو پنڈت کو بلا لاؤ۔"

"آپ نہیں جائیں گے۔" ماں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "اس گھر میں تو پنڈت جی کا گھر ہے۔"

"نہیں۔" شنو نے اپنا کمبل ماں کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "آپ کو ہی جانا ہوگا۔"

ماں بولی نہیں کچھ۔ تھوڑے تھکے قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

رنگ برنگی پھریروں سے منقش گھر کے صحن پر لٹکے جل رہے چوکھے منڈپ کی چاروں لوئیں تھرتھرا اٹھیں۔ سویتا کے دل کی طرح۔ اس کی آنکھوں پر غنودگی چھا گئی۔

ٹوٹے ٹوٹے قدموں سے شنوناتھ اس کے پیچھے پہنچ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ سویتا کے سر پر رکھ کر اس کا چہرہ گھمایا۔ بھرے بھرے نین۔ سویتا نے اس کی آنکھوں میں ڈال دئے۔

"اس شریک بولی بولی سے بھی کھیل کر، ابھی آپ کا من نہ بھرا۔" سویتا نے یہ کہنا چاہا مگر اس نے ہونٹوں سے پکھو ڈالا۔

"حکم کیجئے۔"

"روتی ہو؟" شنو نے کوئی حکم نہ دے کر کہا۔ "رونا ہی چاہئے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں۔" اور اسے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

چھنک۔ چھنک۔ چھن۔ سویتا کی باہوں سے لپٹے کیلے بج اٹھے۔

گہری گہری سانسوں کی بھاپ سے قطرے ٹپکے۔ جلتی ہوئی بوندیں سویتا کی پیشانی پر کھیلنے لگیں۔ اس نے پلکیں اٹھائیں۔ سچ، شنوناتھ رو رہا ہے۔ سویتا اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال کر بولی "چلئے۔" شنوناتھ نے جواب نہیں دیا۔ اٹھا بھی نہیں۔ بس آنسو بہہ رہے ہیں اس کی آنکھوں سے جھر جھر۔ "اٹھئے، چلئے بھی" سویتا ٹھنکی۔ جیسے کچھ کہا ہو۔ شنوناتھ پھر کبھی نہیں اٹھا۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ بس۔

سویتا کا روم روم کانپا۔ جیسے برف کی دو سلیں اس کے ہونٹوں پہ چپکی ہوں۔ کوئی تپش نہیں۔ کوئی جلن نہیں۔ رشو کے ہونٹوں میں سے "ہے بھگوان میرے رشو کی رکشا کرنا۔" سویتا نے دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کی۔

دوسرے ہی لمحے رشو نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"بس سویٹ! جیسے کسی گہرے کنویں سے وہ بولا۔ بہت ہو چکا۔ اب تم پرائی ہو گئی ہو۔"

سویتا نے اس کے پیر چھو کر کہا۔ "پھر آشیرواد دیں۔ جس کی ہونے جا رہی ہوں۔ اس زندگی میں اس سے بے وفائی نہ کروں۔"

رشو ناتھ کا بے جان ہاتھ کچھ دیر اس کے سر پر ٹھہرا رہا۔ اپنے کمرے میں لوٹتے ہوئے اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

رشو ناتھ نے اپنی دو انگلیوں کا سہارا دے کر سویتا کا ماتھا اوپر اٹھایا۔ ایک سپنا ٹوٹا۔ اس نے اپنے بڑے بڑے نین رشو کی آنکھوں میں گڑا دیے۔

"بہت ناراض ہو رہی ہو، ہے نا؟" رشو نے اس کی آنکھوں میں جیسے کھوجتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا، ان چودہ پندرہ سال کے لمبے سفر میں تمہاری ناراضگی کہیں کھو چکی ہو گی۔"

"بہت تھکے تھکے لگتے ہیں۔" سویتا نے سنی ان سنی کر کے کہا۔ "نہا دھو لیں، پھر باتیں ہوں گی۔ اٹھئے، اٹھئے بھی۔"

اپنے جسم کا سارا بوجھ وہ سویتا کے کندھوں پر ڈال کر اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ سویتا نے اس کا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے ایک جوڑا کپڑوں کا نکالا۔ چپل نکال کر رکھی۔ پھر سب باتھ روم میں پہنچا کر وہ صوفے پر ادھ لیٹی سی پڑ گئی۔

یہ رشو ناتھ آج چالیس کے آس پاس ہے۔ تنگڑے بدن پر پتلا پتلا چہرہ، جیسے ماس ہے ہی نہیں اس پر۔ کچھ چھوٹی پر تیز آنکھیں۔ ناک پتلی اور لمبی کہ پہلی نظر میں کچھ ناگوار گزرتی ہے۔ پر تھوڑی ہی دیر میں یہی ناک اس کے چہرے کا سنگار نظر آنے لگتی ہے۔ بول چال کچھ اکھڑا اور برتاؤ بھی ایسا ہی ہے۔ اسی لئے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ پر بدلنے والے جیووں میں سے نہیں یہ رشو ناتھ۔

ایک شادی شدہ عورت سے رشو ناتھ کا یہ رویہ دیکھ کر، کون ہے جو اس پر تھو تھو نہیں کریگا!

مائیوں بیٹھی سویتا سے....

ٹھکری ہے ایسے آدمی پر۔

ڈیوڑھی کے دروازے پر تیسری بار تھاپ پڑی۔ تب سویتا کی ماں نے کنڈی کھول کر باہر جھانکا۔ ایک نوجوان کھڑا ہے۔ بغل میں چھوٹا سا گٹھڑ۔ اس کے چہرے پر گہری نظر ڈال کر سویتا کی ماں نے اپنے دماغ پر زور دیا۔ مگر وہ جان نہ پائی کہ یہ کون ہو سکتا ہے۔ پس و پیش میں پڑ گئی۔ کیا کہے، کیا نہ کہے؟ لیکن اس نوجوان نے جیسے مشکل آسان کر دی۔

"کچھ کپڑے سلوانے ہیں؟" اس نے گٹھڑی بغل سے نکال کر اس طرح ہاتھوں میں تھام لی کہ چاہیں تو یہیں لے لیں دروازے پر۔ سویتا کی ماں نے "لا دیجئے" کہہ کر ہاتھ تو بڑھایا پر اسی لمحے پیچھے کھینچ کر کہا۔ "چلئے اندر چلئے۔"

گلی نما سکڑے سکڑے آنگن کو پار کر کے وہ دروازے پر جا کر ٹھٹک گیا۔ کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھی سویتا نے کتاب پر سے آنکھ اٹھائی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کوئی خفیف سی ریکھا ابھری کہ نہیں؟ پر رشو ناتھ نے ایسا ہی محسوس کیا۔ سویتا پر سے اٹھ کر اس کی نگاہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک کونے میں اجلے چمکتے ہوئے چند برتن گنتی کے اور اسٹوو۔ تو یہ رہا ان کا کچن۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی میز۔ اس پر چند کتابیں، کاپیاں اور قلم دوات۔ ایک کھاٹ دیوار سے لگی ہوئی، جس پر تہہ کیا ہوا بستر۔ ایک کونے میں دو ٹین کے بکس اوپر تلے۔ جن پر سے رنگ روغن اکھڑا ہوا۔ کچھ پچکے پچکے۔ باقی بچی ہوئی جگہ پہ دری بچھی ہوئی۔ سلائی کی مشین اور کچھ کپڑے، ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں اس پر۔

"بیٹھئے،" سویتا کی ماں نے بکھرے ہوئے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔ "کپڑے دیکھ لوں، کیا بنانا ہوگا؟"

رشو ناتھ نے گٹھڑ کھول کر، چار میں الگ الگ کر کے کہا۔ "ایک جوڑا ماں کے لئے اور دو جوڑے میرے چھوٹے بھائیوں کے بنانے ہیں۔"

الگ الگ کر کے سویتا کی ماں نے کپڑا اٹھایا اور رشو ناتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سویتا کی ماں بولی۔ "کچھ چائے وائے تو پی لیتے۔"

"پرسوں کپڑے لینے آؤں گا تو چائے بھی پیتا جاؤں گا۔" رشو نے چلتے چلتے کہا اور گھر سے باہر ہو گیا۔

سویتا پچھلے دو تین مہینوں سے روزانہ شاستری جی کے گھر پڑھنے جاتی ہے۔ راستے ہی میں "نیا کتاب گھر" پڑتا ہے۔ پہلی بار وہ اس نوجوان کو کاؤنٹر پر کھڑے دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ کہیں اسے پہلے کبھی دیکھا ہے سویتا نے۔ مگر کہاں؟ اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ جانے کیوں وہ پھر ادھر سے آنکھ بچا کر ہی گزرنے والی تھی۔ چار دن پہلے اسے کچھ کاپیوں اور ایک کتاب کی ضرورت تھی۔ نیا کتاب گھر کے سامنے کھڑی ہو کر وہ سوچنے لگی تھی۔ کسی دوسری دوکان سے کیوں نہ خرید لوں۔ وہ اسی پس و پیش میں تھی کہ اس نے شیریں لہجے میں کہا۔

"آئیے، آپ کی ہی تو دوکان ہے..."
جیسے چونک کر سویتا کے منہ سے نکل گیا "آپ کو شاید پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔"

دوکان میں اور کوئی گاہک نہیں تھا اس وقت۔ اتنی سی بات کو لے کر رشو ناتھ نے ایسا جادو کا جال بچھایا۔ وہ ایسی اس میں پھنسی کہ اپنے گھر کی سب کیفیت دے کر ہی چھوٹی۔ آج اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ رشو ناتھ اس کی بات کی انگلی

بچ کر اس طرح اس کے گھر تک بھی پہنچ جائے گا۔
شونا تھ نے تب اپنا حال بھی بتایا تھا۔ وہ بھی
چار پانچ مہینے پہلے ریلیف کیمپ میں کچھ دن ٹھہرا تھا۔
انھیں کے قریب ہی اس کا تنبو رہا ہو شاید۔ لیکن اسے
یاد نہیں پڑتا کہ اس نے سوچیتا کو وہاں دیکھا کہ نہیں۔
اس دن شونا تھ کپڑے لینے آیا۔
"بس یونہی یہ کام چلا رہا ہوں۔ پھر بھی امید
ہے سلائی بری نہیں پائیں گے۔"
سوچیتا کی ماں نے سلے ہوئے کپڑے پھیلا کر شونا تھ
کو دکھائے۔
"کیوں ہنستی ہو بہن!" شونے کپڑے الٹ پلٹ کر
کہا "سلائی بہت اچھی کی ہے آپ نے تو۔"
وہ انکار کرتا ہی رہا پر چائے پیے بغیر اس کا پنڈ
نہیں چھوٹا تھا اس دن۔ دوسرے چوتھے شونا تھ آنے جانے
لگا۔ کچھ نہ کچھ سلائی کا کام لے کر ہی آتا۔ کچھ دیر ٹھہرتا،
ہنستا بولتا اور چلا جاتا۔
ایسا کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ پر ہوا یہ کہ، کچھ دنوں میں ہی
سوچیتا کی ماں اور شونا آپس میں گھل مل گئے۔ یہ میل جول اتنا
بڑھا کہ جیسے دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھے بغیر بے چینی
سی ہونے لگتی تھی۔
اُس دن شونا صبح سویرے ہی ان کے یہاں آ گیا۔ تعطیل
کا دن تھا، اسی لئے دکان بند تھی۔ اپنی رام کہانی سنانے لگی
سوچیتا کی ماں شونا تھ کو۔
سوچیتا آئی تو اس کے پتا پٹواری سے گرداور ہوئے۔
منوج آیا تو وہ نائب تھے۔ پر رہنا ہوا کی تحصیلدار ہوئے
تو انھیں ایک لاعلاج بیماری نے جکڑ لیا۔ پانچ سال تک
بیماری سے لڑتے رہے، ساتھ ساتھ کام بھی کرتے
جاتے تھے۔ لیکن کب تک؟ چار سال تک پھر کھاٹ
پکڑے رہے۔ گھر ٹھٹک گیا، تو انھوں نے ہمیشہ کے لئے
ہم سے منہ موڑ لیا۔ تب سوچیتا انٹر میں تھی۔ جیسے
تیسے اس نے امتحان پاس کر لیا۔ کالج میں داخلہ
ہونے کا اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ میں بے بس تھی۔ گھر کا

کپڑا تھا سینے کے لئے جو سلائی کا کام سیکھا تھا۔ اسی
بل پر تو مشکل سے پیٹ ہی چلتا تھا۔ پڑھائی کا خرچ
کہاں سے آتا؟ گہنے پاتے تو ان کی بیماری کی ہی بھینٹ
چڑھ چکے تھے۔
انہی دنوں پاکستان بن گیا۔ رفیوجی کیمپ میں
ٹھکانا ملا ادھر۔ لیکن زیادہ نہ ٹھہر پائی وہاں۔
طرح طرح کے لوگ تنبو میں آ ٹپکتے۔ کوئی راشن کارڈ
کے بہانے تو کوئی گھر کی لنڑی گھنے کی آڑ لے کر۔
کتنے ہی ایسے چہرے جن پر شیطانیت ناچتی تھی۔
کب تک ٹکتی وہاں جوان بیٹی کے ساتھ؟ نصیب سے
یہ کوٹھری کرائے پر مل گئی۔ دیور کو خبر ملی تو وہ
لینے آیا۔ کسی پر بوجھ بننے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ پھر
بھی مجبور ہو کر منوج کو اس کے ساتھ کرنا ہی پڑا۔
وہ چھٹے درجے میں پڑھتا ہے۔ یہاں مجھے ایک پیسہ
محلے سے سلائی کا کام مل ہی جاتا ہے۔ کبھی کبھی پڑھائی
سے ہٹ کر سوچیتا بھی میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اب اسے
روکتی ہوں۔ امتحان بھی تو نزدیک آ گیا ہے بیچاری کا۔
کتاب پر جھکی جھکی سوچیتا سب سنتی رہی۔ سنتی رہی
اور کڑھتی رہی۔ یہ ماں بھی کیسی ہے؟ آخر یہ شونا تھ
کیا لگتا ہے ہمارا؟ کیوں اپنا رائی رتی کھول رہی ہے
اس کے سامنے۔ چاہ کر بھی اُس نے ماں کو ٹوکا نہیں۔
ٹوکنے کی ہمت نہیں پڑی۔
کھانا لگا کر سوچیتا کی ماں نے کہا "اٹھو کھانا کھا لے"
"ابھی بھوک نہیں ماں! آپ دونوں کھا لیں۔"
سوچیتا نے کتاب میں ڈوبے کا ناٹک کرتے ہوئے کہا۔
"تو ٹھیک ہے۔"
ماں نے جانے کس سے کہا اور چوکے سے اٹھ گئی۔
شونا تھ نے ایک بار منہ بولی بہن کی طرف دیکھا۔
پھر اٹھ کر سوچیتا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
سوچیتا نے آنکھ نہیں اٹھائی۔
شونے اپنے ہاتھ کتاب پر پھیلا دئے۔ سوچیتا نے
محسوس کیا۔ اس کے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

بڑھتا ہی جا رہا ہے کہ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے لچک کر
کتاب سمیت دھرتی میں دھنستی جا رہی ہیں۔ دھنستی جا
رہی ہیں۔
"پاگل!"
سوچیتا نے ٹوٹ کر آنکھ اٹھائی۔
شونا تھ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔
"بالکل پاگل"
چھی! چھی!! سوچیتا نے من ہی من اپنے کو کوسا۔
پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ ایک گز جو اس کے ہاتھ
کے گرد منڈلا رہا تھا، جانے کدھر چھٹک گیا تھا۔
سوچیتا نے ناگاہ محسوس کیا کہ اس کا کمرہ ڈول رہا ہے۔ وہ
تیز طوفان میں پھنسی کسی کاغذ کی چڑیا کی طرح چھٹ پٹا رہی ہے۔
جانے کہاں لے جائے گی یہ آندھی! اس کی آنکھوں کے
آگے ترمرے تیرنے لگے۔
شونا تھ کے قدموں کی جانی پہچانی آہٹ۔ ماں کو
رفیوجی کیمپ میں گئے کچھ ہی منٹ گزرے ہیں۔ گھنٹہ
ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے کہاں لوٹے گی۔ اس درمیان؟
سلائی کرتے کرتے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
جیسے بلی کو اپنے پر جھپٹتا پا کر چڑیا کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں
مگر وہ سیدھا کھاٹ پر جا بیٹھا ہے۔ آنکھ چرا کر
سوچیتا نے دیکھا۔ اب وہ پپیتا نے پڑے بستر کا ڈھاسنا
لے کر لیٹ گیا ہے۔
جانے کیا کرے وہ؟ جانے کیا نہ کر بیٹھے؟ سوچیتا
نے من میں سوچا۔ وہ کمرے سے نکل بھاگے، یا زور
زور سے چیخنے لگے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں سوچیتا نے۔ جیسے
اس میں کچھ بھی کرنے کی شکتی ہی نہیں رہی ہو۔ اس
طرح شو کو بڑھاوا دینے کا نتیجہ! اس نے اپنے
آپ پر جھلاتے ہوئے پھر کنکھیوں سے ادھر دیکھا۔
شونے انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر، اپنے ہاتھ
سر پر دھر لئے ہیں۔ اس کی آنکھیں ایکدم بند۔
سوچیتا نے ہاتھ کا کام پرے ڈھکیل کر، اب سیدھا
اس کی طرف دیکھا۔ ایک رنگ آتا، ایک رنگ جاتا۔ جیسے

وہ جیسے اپنی پوری طاقت لگا کر اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ شکنتلا کے چہرے پہ یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ایسے چل رہا تھا گویا وہ تلوار کی دھار پر چل رہا ہے۔

بیٹھے بیٹھے وہ ایک طرف جھکی۔ ڈیوڑھی کا دروازہ پھر بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ ڈیوڑھی کی کنڈی تو دو کنارے، ایک پٹ ابھی پوری طرح بند نہیں۔

"چلو باہر نکل چلو"

سویتا کے اندر کسی نے سرگوشی کی۔

اس نے ڈیوڑھی سے باہر جھانکا۔ گلی خالی۔ دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ ایک قدم باہر رکھ کر وہ مڑی اور کنڈی لگا کر کمرے میں لوٹ آئی۔

شکنتلا کے چہرے پہ وہی دھوپ چھاؤں کا کھیل

اس نے مشین ذرا پرے سرکائی۔ سٹوو جلانے لگی۔ کانپتے ہاتھوں اس میں ہوا بھری۔ کیتلی چڑھا کر اٹھی۔ کھاٹ کی پٹی پر بیٹھے بیٹھے وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی۔

"کیا سوچ رہے ہیں اس طرح؟"

اس نے شو کے جڑے ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کر اس سے پوچھا۔

"سوچتا ہوں" شو نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت لمبی بات ہے۔ اس جنم میں سب کہہ پاؤں، اس کا بھروسہ نہیں۔ جانے کتنے جنموں کی باتیں کہنی سننی ہیں۔"

ایک جھٹکے سے سویتا اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "مجھے نہیں اچھا لگتا۔ جو کہنا ہے، ماں جی سے کہیں۔"

"ان سے کیوں؟" شو نے قدرے رکھائی سے پوچھا۔

"میں ان کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا پاؤں گی اس لئے۔"

یہ کہہ کر سویتا کیتلی میں چائے کی پتی ڈالنے لگی

شو نے پھر کچھ نہیں کہا۔ بیٹھا بیٹھا اس کی پیٹھ سے الجھتا رہا جہاں اس کی چوٹیاں، اس کے ہلنے سے، ادھر ادھر الجھنے لگتی تھیں۔

ایک گھونٹ چائے کا لے کر شکنتلا نے بڑے معصوم انداز میں سویتا سے کہا "پھر کبھی کہہ دو نا سے، پلیز۔ آج بس۔"

سویتا کا سارا شریر ہل گیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا کر کہا "یوں تو مجھے ناٹک نہیں بھاتیں ماں جی آپ کو۔" پھر ذرا رک کر کہا "آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ ایسی باتیں لڑکیوں کی کہنے کی نہیں ہوا کرتیں۔"

"تو آدمی ہم سے سر مہا" شو کی آنکھوں میں شرارت بھر آئی: "آج یہاں سے کہہ ڈالوں گا"

اور وہ آج ایسا آیا کہ گئی رات تک وہ وہیں جما رہا۔ بچھونے سے بھی ایک بار اٹھنے کا نام نہیں لیا اس نے۔ چوک والے گھنٹے نے گیارہ بجائے کہ بارہ؟ شو نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ مڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا "بڑے زوروں کی بارش جھکی کھڑی ہے۔"

"ہونے دیجئے" سویتا کی ماں نے بڑی لاپرواہی کے انداز میں کہا "آپ کو گھر تو جانا نہیں آج کہ بھیگ جائیں گے۔"

سویتا جل اٹھی ماں کی اس فراخ دلی پر۔ ساتھ ہی شو کی اس ڈھٹائی پر بھی غصہ آیا۔ دیکھتا نہیں کہ یہاں اس کے سونے کے لئے کیا انتظام ہو سکتا ہے؟ لیکن کہے تو کیا کہے؟ من مار کر رہ گئی اور اٹھ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ دیکھوں تو ذرا شاں کیسے بندوبست کرتی ہے؟

سویتا کی ماں نے اٹھ کر بچھونا کھولا۔ توشک نیچے فرش پہ آڑی کر کے بچھا دی۔ کھیس تہہ کر کے پیروں کی طرف بچھایا۔ ایک چادر اوپر بچھائی۔ پھر دونوں کو دائیں بائیں بغل میں لیا اور کمر تک رضائی کھینچ کر کہا "آدمی دل کو تنگ نہ کرے تو جگہ اپنے آپ کھل جاتی ہے۔"

سویتا دیوار کی طرف پیٹھ کر کے لمبی ہو گئی۔

رام نام کا سمرن کرتے کرتے سویتا کی ماں نے باری باری دونوں کی پیشانیاں چوم لیں اور اٹھ کر لائٹ آف کی تو سارا کمرہ روشنی میں نہا رہا تھا۔ سورج کھلی کھڑکی سے گھس کر کمرے میں آ گیا تھا۔ سویتا ادھر پیٹھ کئے اکڑ بیٹھی۔

شو نے لیٹے لیٹے اس کی کمر گدگدا دی۔

وہ ذرا تنک کر بولی "رات بھر سونے نہیں دیا۔ دنیا جہان کے قصے کھنگال ڈالے۔ یہ بھی کوئی تک کی بات ہے؟"

"برا نہ مانو سویتا! آج ضرور..." وہ بولتے بولتے رک گیا۔

سویتا کی ماں اندر آ کر پانی کی بالٹی گاگر میں انڈیل رہی تھی۔

شام کو سویتا شاستری جی کے ہاں پڑھنے کو جاتے ہوئے دکان کے آگے سے گزر رہی تو شو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے رک جانے کو کہا۔ وہ دکان کے اندر چلی گئی۔ شو نے اس کے ہاتھ کی کتاب کاونٹر پر ڈال کر کہا "چلو۔"

رکشے پر بیٹھے ہوئے شیوناتھ سے اس نے پوچھا "کہاں جانا ہوگا؟"

"چڑھو آؤ" سنا ان سنا کر کے شیو نے کہا۔ "دیر نہ کرو۔"

"آخر جانا کہاں ہے اس طرح؟" سویتا چڑ سی گئی۔

"چرچ"

"چرچ ہو یا کورٹ" سویتا نے رکشا پہ بیٹھ کر کہا "اس وقت تو دونوں کے دروازے بند ہوں گے۔"

شیوناتھ چپ رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

رکشا سوہن اسٹوڈیو کے سامنے سڑک پر رکا۔ دونوں
اوپر کی منزل پر چلے گئے۔ سیڑھیاں اترتے اترتے، شبو
کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، سوبیتا نے ذرا مسکراتے
ہوئے کہا: "یہ کیا شرارت سوجھی"؟
شبو نے پیچھے پلٹ کر دیکھا سیڑھیوں کے نیچے
پرکشش میں سوبیتا کی مسکراہٹ اسے نظر نہیں آئی تھی۔
اس نے سوبیتا کو باہوں میں بھر لیا۔
"ابھی نہیں" شبو کی گرم گرم سانسیں اس کے
چہرے سے لپٹ رہی تھیں۔ وہ چھٹپٹائی: "یہاں
نہیں"۔
لیکن دو دہکتے انگارے اس کے ہونٹوں سے
چپک گئے۔ اُف! کتنی آگ —— پر اس آگ
میں بھی کیا نشہ؟ جانے سوبیتا کس دنیا میں پہنچ گئی۔
نیم جان سوبیتا کو اس نے سہارا دے کر،
سیڑھیوں پر سے اتارا۔ اب گری کہ تب گری کی حالت
ہوئی تھی تب سوبیتا۔
"رات کافی بیت گئی تو سوبیتا نے جمائی لے کر
کہا: "اب مشین سنبھالو ماں! بڑی نیند لگ
رہی ہے مجھے"۔
ماں اٹھ کر بچھونا لگانے ہی لگی تھی کہ شبو ناتھ
نے دستک دی۔
"دو دن کہاں غائب رہے"؟
ماں کے لہجے میں شکایت تھی۔
"ایک سپنا دیکھا ہے نہیں"! کہہ کر اس نے
ذرا سوبیتا کی طرف جھک کر کہا — "تمہیں بڑی نیند
لگ رہی ہے"؟
سوبیتا چپ رہی۔
ادھر مڑ کر شبو نے کہا: "سنو گی بہن! کہ
چلوں؟"
"جائیں تمہارے دشمن" — ماں نے ہلکی سی چپت
جڑتے ہوئے اور بچھونا ٹھیک کر کے کہا: "اب سنیں گے
تمہارا سپنا"۔

شبو جلدی سے ان بچھونے کے بیچوں بیچ پسر
گیا۔ سوبیتا کی ماں اس کے پہلو میں آ کر بولی "شبو
گھڑی کیا ٹک رہی ہے؟ دیکھتی نہیں، کتنی
ٹھنڈ ہے؟"
وہ ہچکچائی۔ کہیں کوئی راستہ نہیں۔ مرتے
سے قدموں سے چل کر شبو ناتھ کے دوسرے
پہلو میں بچھونے پر آنا پڑا اسے۔ شبو نے ذرا
منہ پھیر کر اس کی طرف دیکھا — "یعنی اب بتا
بچو!"
کرتنگ سے رضائی بڑھا کر سوبیتا کی ماں بولی
"اب کہو سپنا"۔
وہ سپنا سنانے لگا۔
ایک بڑا سمندری جہاز، اتنا بڑا، جتنا
ہمارا بھارت۔ میں اپنے آپ کو جہاز کے
ایک کیبن میں پاتا ہوں دوسروں کے ساتھ
لیکن میرا شریر جیسے دو حصوں میں بٹ گیا ہے
ایک حصہ جہاز میں تو دوسرا کھلی فضا میں اڑتا ہوا
یہ حصہ صاف صاف دیکھتا ہے کہ جہاز کے کیبن
ایسے ہیں جیسے ہندوستان کا ہر صوبہ۔ سارا ہندوستان
جیسے دنیا کے سمندر کی چھاتی پر تیر رہا ہے۔
"ہوشیار"
جہاز کا کپتان جو انگریز ہے سب سے
اوپر والی منزل پر سے چلایا۔
"ہوشیار! جہاز طوفان میں گھر گیا ہے"۔
سب مسافروں میں ہلچل مچ گئی۔
کپتان پھر چلایا — جہاز کسی سمندری چٹان
. . . . .
جہاز ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ چٹان
سے ٹکرا کر دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ مسافر ہیں کہ
کوئی ایک حصے سے نکل کر دوسرے حصے کی طرف لپک
رہے ہیں۔ دوسرے حصے والے پہلے والے کی طرف
سمندر کی لہریں گویا شریک بنی ہیں۔

ایک لکڑی کے ٹکڑے پر دو پرانی بہہ جا رہی
ہیں۔ ایک، ایک سرے پر تو دوسرا دوسرے سرے
پر آہستہ آہستہ دونوں کے بیچ کا فاصلہ کم پڑتا جاتا ہے
ایک دوسرے کی طرف سرک رہے ہیں جیسے، لیکن
ڈرتے ڈرتے۔ ایک دوسرے سے قطعی انجان دونوں
پر ایسا لگ رہا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نزدیک
اور نزدیک ہونا چاہ رہے ہیں۔ دونوں الجھن میں بھی
پڑے نظر آ رہے ہیں۔ پھر بھی ان کی آنکھوں میں،
مجھے ایک چمک نظر آ رہی تھی، ایک کسک نظر آ
رہی تھی۔ ایک عجیب کشش بھی تھی دونوں کی آنکھوں
میں جیسے صدیوں سے بچھڑے دو پرانیوں میں،
ایک دوسرے سے نزدیک آتے ہوئے پیدا ہو
جاتی ہے"۔
"یہ دھماکا —— جہاز کا ٹوٹنا ان کے لئے
قدرت کا ستم ہے"۔ کہ ایک دم رک کر شبو ناتھ
نے سوبیتا کی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا
— "احسان؟"
ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے جواب دیا
— "ان کے لئے تو یہ قدرت کا احسان ہی
ماننا پڑے گا"۔
"تو آشیرواد دیں انہیں"۔
شبو نے ڈرامائی انداز میں اپنی جیب سے
فوٹو نکال کر سامنے کر دیا۔ سوبیتا نے اچک کر دیکھا۔
حالانکہ اسے یہ فوٹو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
سوبیتا کی ماں کی نظریں کافی دیر تک فوٹو پر
جمی رہیں۔ ایک بار اس نے میٹھی نظر سے کروٹ لیتی ہوئی
سوبیتا کی طرف دیکھا اور فوٹو کو چوم کر شبو کو لوٹا دیا۔
پریکشا کا نتیجہ نکلا۔ دھڑکتے دل سے
شبو نے اخبار کے ورق الٹے، دکان کھلی ہی چھوڑ کر
وہ ان کے ہاں دوڑا دوڑا پہنچا۔
"لو" اب تمہیں مٹھائی کھلانا پڑے گی۔ سوبیتا کے
آگے اس نے اخبار کھول کر کہا — "آٹھ نمبروں کی کمی

رہ گئی فسٹ ڈویژن سے نئے، میری مٹھائی بچ گئی۔"

تینوں پانی ایسے خوش ہو رہے تھے کہ دنیا بھر کی مسرتیں گویا انھیں میسر آگئی تھیں۔

ہنستے ہوئے سونیتا کی ماں نے کہا — "تم تو آپس میں جھگڑتے ہی رہو گے بس۔" لو میں پورے کھائے دیتی ہوں!"

ڈاکیے نے چٹھی ڈیوڑھی پر گرا دی۔ سونیتا اٹھا لائی۔ ایک نظر میں پڑھ کر اس نے ماں کی طرف چٹھی بڑھا دی۔

پڑھ کر سونیتا کی ماں نے کہا — "اس کے چاچا کی چٹھی ہے۔ وہ اور سونیتا کے موسا شام کی گاڑی سے آ رہے ہیں۔ پرسوں، ماگھی کے دن شگن دینے کا فیصلہ کیا ہے انھوں نے۔"

شبو نے شرارت بھری نظر سونیتا پر ڈالی اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے اس نے سنا۔ سونیتا کی ماں کہہ رہی ہے کہ "ضرورت ہوئی تو وہ شبو کو بلا لیں گے یہاں، ویسے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی وہ پہلے ہی سب کچھ انھیں لکھ چکی ہے۔ بس دس بجے شوناتھ کے گھر شگن لے کر پہنچ ہی جائیں گے۔"

شوناتھ ماگھی کے دن دکان پر نہیں گیا، دکان بند ہی رکھی۔ اس کی ماں نے دکان بند رکھنے کا سبب پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ وہ سوچ رہا تھا، ماں کیسے اچنبھے میں آ جائے گی، جب وہ اچانک شگن لے کر آ جائیں گے۔ یہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ دل ہی دل میں وہ مزا لینے لگا۔

ساڑھے نو، پھر دس بھی بج گئے۔ شبو دروازے پر، پھر دور تک گلی میں جھانک آیا، کوئی آ رہا ہو تو نظر آئے؟ گیارہ بج گئے تو اس کے لئے گھر میں ٹکنا محال ہو گیا۔ جانے کیا آفت پڑ گئی وہاں! یہ جاننے کے لئے وہ گھر سے نکل پڑا۔

شبو نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا، دونوں ماں بیٹی، اس طرح فرش پر سر جھکائے بیٹھی ہیں، جیسے کوئی لاش ان کے درمیان لیٹی ہو اور وہ اس کا ماتم منا رہی ہوں۔ دونوں میں سے کسی نے آنکھ نہ اٹھائی۔ وہ کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا —

کئی منٹ بیت گئے، جیسے صدیاں گزر گئی ہوں، صبر کا دامن شبو کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور لرزتی آواز میں پوچھا — "یہ کیا ہو رہا ہے —؟ کچھ بتاؤ تو بہن!"

"پھر روتے بلکتے ہوئے، سونیتا کی ماں نے اسے بتایا —

بھیا! میں نے انھیں تمہاری بابت لکھا تھا۔ ان کی چٹھی سے میں یہی سمجھی تھی کہ انھوں نے منظور کر لیا ہے۔ لیکن میرا خط پہنچنے سے پہلے ہی وہ انھیں زبان دے چکے تھے۔ مجھے یہ منظور نہیں تھا۔ لیکن مری ایک نہیں چلی۔ دیور بھائی نے حالت دیکھ کر ہمارے دوسرے رشتہ داروں کو بھی تار دے کر یہاں جمع کر لیا میری چھاتی پر اتنے آدمی آ چڑھے، اتنا بوجھ آ پڑا کہ میرے منہ سے ہاں . . . ."

سونیتا کی ماں بیہوش ہو گئی تھی۔

شبوناتھ کے پکے کھیت پر ٹڈی دل اتر آیا تھا۔ کسی بھی قیمت پر کسی بھی جتن سے اسے اپنا کھیت بچانا ہے، اس نے یہی تہیہ کر لیا ہے۔

کتنی دیر تک سونیتا ماں کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتی رہی۔ آخر اس کی بے ہوشی ٹوٹی۔

"وکیل بھائی جو مل رہا ہے ایک معمولی کتاب فروش . . . . ." شوناتھ ابل پڑا۔ سونیتا کی ماں نے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا — "میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔" کان کھول کر سن لیں سبھی اٹھ کر جاتے ہوئے بولا — "شام تک سب سوچ لیں۔"

شوناتھ کے چہرے پر دہکتے انگارے اُگ آئے تھے۔ ماں بیٹی، آنے والے کسی خطرناک انقلاب کی چکن کر کے ہی ادھ مری ہوتی رہیں۔

دن ڈوبتے نہ ڈوبتے شوناتھ آیا اور آتے ہی بولا — "سوچ لیا آپ نے، کیا فیصلہ ہوا؟"

"بیٹھو تو سہی"۔ سونیتا کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا — "بتاتی ہوں!"

"نہیں" اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"میری ناک کاٹ کر" سونیتا کی ماں نے بجھے لہجے میں کہا۔ "جو بھی چاہو کر سکتے ہو۔"

شبو کچھ بولا نہیں۔ بوڑھے قدموں چل کر کھاٹ پر جا بیٹھا۔

سونیتا کی ماں نے ٹرنک کھول کر ایک ڈبیہ نکالی۔ شبو کے نزدیک ڈبیہ کھولتے ہوئے کہا۔ — "یہ سونیتا کے کڑے ہیں۔ اپنے گہنے تب بیچنے پڑے تھے، یہ بیچ کھانا تو حق نہیں تھا میرا۔ چھ سات تولے کے ہیں۔ سونیتا کے لئے ان سے ایک سیٹ بنوا دو۔"

"میں کیوں بنوانے لگا؟" شبو نے کڑے پرے ڈھکیل دیئے۔ جیسے یہ کالے ناگوں کی طرح ڈس لیں گے اسے!

لیکن سونیتا کی ماں پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا، گھبرائی نہیں۔ اس نے زبردستی دونوں کڑے اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا — "ہو نا آخر بھولے ناتھ!" کھلی رسی، جس میں کوئی بل نہیں گھماؤ نہیں، کوئی تناؤ نہیں؟ شوناتھ کیسے توڑ دے اسے؟ وہ لڑنے پر آمادہ تھا۔ بات چلتی، تو آج ہی کچھ نہ کچھ ہو جاتا اتنا کچھ کہہ . . . .

"اور کوئی کام؟" پوچھ کر شوناتھ اٹھ کر چلا گیا۔

شام چار بجنے یا پانچ بجنے [illegible]

آٹھ بج رہے تھے۔ بیٹھتے ہی سویتا سے بولا۔

"آج پکچر چلیں گے جلدی سے تیار ہو لو۔"

سویتا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ کل کی گفتار سے کہیں زیادہ کٹھور۔ ادھر سے آنکھ پھیر کر ماں کی طرف دیکھا۔ یعنی کیا کہوں؟ جاؤں یا نہیں۔

"کھانا تو کھا لیتے۔" سویتا کی ماں نے کہا۔ "ابھی تو کافی وقت ہے۔"

"نہیں" شِو نے اٹھ کر کہا۔ اور دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"چلو"۔ سویتا نے پرس بکس سے نکال کر کہا۔

گلی سڑک میں داخل ہوئی تو سویتا نے کہا "رکشا نہیں لیں گے؟"

شِو ناتھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگلے موڑ پر سڑک چھوڑ کر، دوسری گلی پکڑ لی۔ گلی جو سینما کی مخالف سمت کی طرف جا رہی تھی۔

کتنے ہی چکر چپ چاپ کٹتے رہے۔ پھر جیسے میلوں کا سفر کہیں جا کر ختم ہوا۔ شِو نے ڈیوڑھی پر پڑا تالا کھولا۔ سویتا اندر آ گئی تو اس نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔ اب وہ کمرے کا دروازہ کھولنے لگا۔ سویتا نے پوچھ لیا۔ "ماں نہیں ہیں کیا؟"

"نہیں" شِو نے جواب دیا۔ "سب ایک شادی میں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

پرس تپائی پر پٹک کر سویتا کرسی پر بیٹھ گئی۔

شِو کی مٹھیاں کسی ہوئی۔ چہرہ بھی کسا ہوا۔ وہ فضول ہی کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

"یہ سب کیا ہے؟" سویتا نے پریشان ہو کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کچھ بتاتے کیوں نہیں؟"

جیسے شِو ناتھ نے چونک کر کہا — "چلو — اس کمرے میں۔"

سویتا نے ساتھ والے کمرے میں بڑھ کر دیکھا۔ ایک پلنگ بستر لگا ہوا۔ اس پر کچھ پھول بکھرے ہوئے، ایک طرف عروسی جوڑا۔ تپائی پر سنگار بکس اور موگرے کی وینی، ساتھ میں گہنوں کا نیا سیٹ بھی۔

"جلدی تیار ہو جاؤ" کہہ کر شِو ناتھ پہلے والے کمرے میں چلا گیا۔ سویتا کچھ کہتی کہ اس نے پردے بھیڑ دیئے۔

سویتا کے اندازے غلط نکلے۔ بھیتر سے نکلتی چیخوں کو کسی طرح دبا کر، تھوڑی دیر کے بعد اس نے پکارا — "آ جائیے۔"

شِو ناتھ نے آ کر دیکھا۔ گہنے اور عروسی جوڑا جیوں کا تیوں پڑا ہے۔

"یہ کیوں؟" اس نے ذرا سخت لہجہ میں پوچھا۔

سویتا نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "ذرا ادھر تو دیکھو بھلا۔"

ہلکا میک اپ۔ ماتھے پر چم چم کرتی بندی۔ جتن سے سنواری زلفیں ان پر موگرے کی وینی کی خوشبو۔ آنکھوں میں کاجل کی حسین ریکھا ہونٹوں پر مسکان۔ ایک مدھ بھری مسکان جیسے پوچھ رہی ہے، بولو، دلہن بنی یا نہیں؟

کئی لمحے شِو ٹھگا سا کھڑا رہا پھر دیوانہ وار بڑھا۔ اور سویتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سویتا کھنچی چلی گئی کھنچتی چلی گئی۔

دوپہر ڈھلنے کو آئی تو سویتا کی ماں نے اسے جتن سے جگایا۔ سویتا نے گنگنے پانی کا لوٹا لوٹا اپنے جسم پر گراتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کا انگ انگ، ہڈی ہڈی پھر سے جڑ گئے تولیے سے جسم رگڑتے ہوئے اس نے پایا وہ اتنی جوان ہو گئی ہے اتنی جوان کہ —

کئی دن بعد ایک شام کو شِو کے ہاتھ میں ایک چٹھی دے کر سویتا کی ماں نے کہا — "اسے پڑھ لیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے؟"

"یہی کہ" شِو نے کھلے انداز میں کہا۔ "آپ تیاری کر لیں۔ میں خود بھی ساتھ چلوں گا۔ شادی کے بعد آپ کے وہاں ہی رہنے کا انتظام بھی کر آئیں۔ یہاں اب اکیلی رہ کر کریں گی بھی کیا؟"

ماں بیٹی نے اس کا جواب تو سن لیا۔ مگر اس کا یقین تب آیا، جب چلنے کے دن شِو ناتھ ان کے دروازے پر گاڑی لے آیا۔

باتھ روم سے نکل کر شِو ناتھ نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر پڑے ہوئے پردے کو ذرا سرکایا۔

"آئیے!" جیسے چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں، جو شِو نے کتنی بار پہلے بھی سویتا کی گفتار سے لپٹی ہوئی پائی تھیں۔ اور برسوں پہلے اس رات اسی سویتا نے اس سے کہا ہو "آئیے۔"

وہی ہلکا میک اپ۔ وہی آنکھوں میں کاجل کی ریشم سی لکیر کھنچی ہوئی۔ ہونٹوں پہ وہی مدھ بھری ہوئی مسکراہٹ۔ جیسے پاگل سا ہو کر شِو نے بڑھ کر سویتا کا ہاتھ چوم لیا۔

سویتا نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس کی حرکت پر۔ وہ کھانا کھا کر بیٹھے ہی تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی گھرگھرا کر بج اٹھی دوسرے کمرے میں۔ سویتا نے لوٹ کر کہا۔ "تمہاری ناری کلیان سبھا کی آج خاص میٹنگ ہے۔ مجھے اڑھائی بجے وہاں پہنچنا تھا۔ نہیں پہنچی سو ٹیلیفون کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں پریزیڈنٹ کے بغیر میٹنگ کیسے چل سکتی ہے؟" پھر بھی میں نے منع کر دیا ہے۔ "میں نہیں جاؤں گی۔"

شوناتھ کچھ کہتا کہ پھر ٹرنک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔

"کیا مصیبت ہے۔ اُف!" وہ اٹھی نہیں۔

رشو نے کہا: "چلی جاؤ۔ میں بھی تھوڑا آرام کر لوں گا۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ نیند بھی لگ رہی ہے۔"

"ایک بات۔" سونیتا چلنے کو ہوئی تو رشو نے روک کر کہا۔ "تمہارے گھر نہ ہوتے چودھری آ گیا تو میں نپٹ ہی لوں گا۔ اس سے مگر لیکن تمہارے لوٹ آنے پر بھی وہ آیا تو کیا تعارف دو گی میرا؟ ذرا میں بھی جان لوں!"

"خوب یاد دلایا۔" سونیتا اس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ رشو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولی۔ "چودھری بہت بھلا آدمی ہے۔ چراغ لے کر تلاش کریں تو بھی شاید دنیا بھر میں ایسا سادھو نہ ملے گا۔ میرے لئے زندگی کے تمام سکھ اور مسرتیں مہیا کرنا ہی اس نے اپنی زندگی کا مقصد فرض کر لیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے میری عفت کے گن گاتا رہتا ہے۔ میں اتنی سُن کر جب اندر جھانکتی ہوں تو مر مر جاتی ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھ پر ایسا جنون بھی سوار ہوا کہ میں اپنی زندگی کے اس باب کے پردے کو تار تار کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ مگر اس ڈر سے چپ ہو جاتی۔ اپنے ہونٹ سی لیتی کہ وہ اتنا سادھو اور بھولا آدمی ہے کہ میری ان باتوں کو ہنسی میں اڑا دے گا۔ وہ مر جائے گا پر یقین نہیں کرے گا۔ میں بھی ...... ایسے گناہ بے لذت کا فائدہ؟" تھوڑا رک کر پھر سونیتا کہنے لگی۔ "چھاتی پر منوں بوجھ لئے میں ہنستی مسکراتی رہی۔ پر نصیب! آج آپ نے وہ بوجھ اتار کر پھینکنے کا موقع دیا ہے۔ شکریہ۔۔ جیسا میرا تعلق رہا ہے آپ سے ویسا تعارف میں رکھوں گی اور بس۔"

ٹیلیفون سے واپس آ کر وہ سیدھی کچن میں چلی گئی۔ اسے رشوناتھ کی پسند کی چیزیں تیار کرانے کی ہدایت جو دینی ہے۔ کھانا بنانے والی مہری نے مالکن کو سامنے کھڑا پایا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ سونیتا کے پاس آ کر بولی۔ "بی بی جی، وہ بابو تو چلے گئے۔ یہ ......" ایک پیکٹ اس نے سونیتا کی طرف بڑھا دیا۔

سونیتا نے کانپتے ہاتھوں سے پیکٹ کھول ڈالا۔ سونیتا کے اس زمانے کی چند چٹھیاں اور وہ فوٹو جسے اس کی ماں نے کھنچوا دیا تھا۔ "فریبی نغمہ" وہ ہونٹوں میں بڑبڑائی۔ "وہ چلے گئے ہیں تو کیا ہوا، اب بھی لوٹ سکتا ہے۔"

بڑبڑاتے وہ چار قدم باہر کی طرف چل کر پھر کچن کی طرف لوٹ گئی۔ چند لمحے وہ جلتی ہوئی انگیٹھی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ پھر پیکٹ اس میں پھینک کر تیزی سے مڑ گئی۔

ممتاز راشد اجمیری

غزل

رکے تو محفلِ خوباں میں حشر برپا ہے
چلے تو انجمنِ دار سے پکارا ہے

مہک رہی ہے فضا زلفِ مشکبو کی طرح
یہیں کہیں تری یادوں کا ابر برسا ہے

اب اور تیرے تغافل کی بات کیا ہو گی
ہر ایک سمت مری بیکسی کا چرچا ہے

کوئی امنگ کوئی ولولہ نہیں باقی
تمہاری آرزو اب شہرِ دل میں تنہا ہے

کسی خیال کے سورج سے روشنی مانگیں
نگاہ و دل کے افق پر بہت اندھیرا ہے

کسی کی سوئی ہوئی یاد جاگ اٹھی راشد
کبھی جو کوئی حسین سامنے سے گزرا ہے

سُرسیش رام بھائی

نوبل پرائز پانے والا امریکی نیگرو

"آپ نے مجھے جو یہ انعام دیکر اعزاز بخشا ہے، اس کے لئے آپ کا بہت ہی ممنون ہوں۔ یہ انعام اس بات کا مظہر ہے کہ دنیا کے سامنے جو سیاسی اور اخلاقی بحران ہے۔ اس کا تدارک اہنسا کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے امریکا پر ایک زبردست عقیدت اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں نیک خواہشات کے ساتھ میں اس اعزاز کو قبول کرتا ہوں اور اپنے مشن کے لئے اپنے کو مزید پیش کرتا ہوں۔"

مندرجہ بالا تاثرات گزشتہ ۱۰ دسمبر ۱۹۶۴ء کو ناروے کے دارالحکومت اوسلو میں امن کا نوبل پرائز پانے پر اپنی تقریر میں ریورنڈ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نے ظاہر کئے۔ جیسا کہ نوبل کمیٹی نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے کہا تھا یہ انعام ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو ان کی پُرامن اور اہنسائی کارکردگی کے لئے ان کو دیا گیا ہے جو انھوں نے امریکہ میں نیگرو عوام کی آزادی کے لئے کی ہیں۔ ڈاکٹر کنگ کی رہنمائی میں نیگرو لوگوں نے اپنے شہری حقوق اور آزادی کے حصول کے لئے ایک شاندار تحریک چلا رکھی ہے۔ اپنی بےلوث خدمات، زبردست مجاہدات اور کامیاب قیادت کی وجہ سے ڈاکٹر کنگ کی گنتی آج کے عظیم افراد اور دنیا کے مخصوص امن دوستوں میں کی جاتی ہے۔

آج سے ۳۶ سال پہلے ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء امریکہ کے جنوبی حصّے کے ایٹلانٹا شہر میں ڈاکٹر کنگ کا جنم ہوا۔ ان کے باپ کا نام بھی یہی ہے۔ اس لئے باپ کے نام کے آگے سینیئر اور بیٹے کے آگے جونیئر لکھا جاتا ہے۔ باپ ایک گرجے میں پادری ہیں اور اپنی ایمانداری، بےخوفی اور حق پسندی کے لئے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر کنگ کی والدہ بھی بڑی مذہبی، خدمت گزار اور نیک دل ہیں۔ ماں باپ سے کنگ کو سماجی خدمت گزاری اور نیز مذہبیت کا ورثہ ملا ہے۔

امریکہ میں زیادہ تر لوگ سپید فام ہیں۔ لیکن ایک بڑی تعداد نیگروؤں کی ہے جو سیاہ فام ہیں۔ ان دونوں کے بیچ کافی تناؤ اور بھید بھاؤ چلتا ہے۔

بچپن ہی سے مارٹن لوتھر کنگ نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ لوگ نسلی امتیاز کا کس طرح شکار رہیں۔ انھوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ کبھی نہ کبھی اس غیر انسانی رویہ سے ٹکر لینی ہوگی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس کی شکل کیا ہوگی۔ اور امریکی سماج کس طرح یکسانیت کے معیار کو قبول کرے گا۔

کالج کی تعلیم کے دوران نوجوان مارٹن کو اس سوال کا کچھ جواب ملنے لگا۔ انھوں نے مشہور امریکی فلسفی تھوریو کا عدم تعاون پر مضمون پڑھا۔ اس نے ان پر بڑا اثر کیا۔

آگے چل کر یونیورسٹی میں مارٹن نے ارسطو جیسے پرانے اور روسو جیسے نئے فلسفیوں کی تصنیفیں دیکھیں۔ لیکن ان کے دل میں اب بھی یہ سوال قائم تھا کہ سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے پریم کی طاقت کا استعمال کیسے ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کا اثر:۔

۵۴ء کی بات ہے۔ ایک دن انھوں نے فلاڈلفیا کے گرجے میں ایک تقریر سنی۔ اس میں مقرر صاحب نے مہاتما گاندھی جی کی زندگی اور ان کے نظریات کے بارے میں تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی۔ اس تقریر سے مارٹن کو گویا نئی زندگی مل گئی۔ انھوں نے فوراً گاندھی جی کے بارے میں لٹریچر لیا اور بڑی دلچسپی سے اسے پڑھ ڈالا۔ اس مطالعہ کے تاثرات کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے،

"گاندھی کی ستیاگرہ کی تحریک پر میں فریفتہ ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ پریم کی طاقت سے سماجی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ حضرت مسیح کا نظریہ صرف انفرادی حیات کے لئے ہے۔ اس میں مجھے اپنی بھول اب معلوم ہوئی۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ گاندھی جی کی راہ پر چل کر پریم کو سماجی اور اجتماعی انقلاب کی خاطر ایک زبردست ہتھیار کی شکل میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

پھر آگے چل کر انھوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھیں اور اہنسا پر ان کا بھروسہ اور پختہ ہو گیا۔

۲۵ سال کی عمر میں مارٹن لوتھر کنگ نے تعلیم و تربیت حاصل کر لینے کے بعد مانٹگمری کے بیپٹسٹ چرچ میں پادری کا کام کرنا شروع کیا۔ یہاں ان کی بیوی کارٹا بھی ان کے ساتھ تھیں جن سے ان کی شادی جون ۱۹۵۳ء کو ہوئی تھی۔ مانٹگمری میں دونوں میاں بیوی کچھ عرصہ میں کافی مقبول ہو گئے اور احترام کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔

نیا موڑ:۔

وہاں رنگ کا امتیاز بڑی بھیانک شکل میں چل رہا تھا۔ بسوں میں نیگرو لوگوں کو پیچھے بیٹھنا پڑتا تھا۔ سب کے دل میں تھا کہ اس نسلی امتیاز کے خلاف تحریک چلائی جائے۔ آخر ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے اس تحریک کو جنم دے دیا۔ ایک روز ایک نوجوان نیگرو عورت دفتر سے بس کے ذریعہ گھر جا رہی تھی۔ کنڈکٹر نے اس سے سیٹ چھوڑنے کے لئے کہا۔ کیونکہ کچھ گورے لوگ بس پر سوار ہوئے تھے۔ اس عورت نے کچھ کہا نہیں، چپ چاپ بیٹھی رہی۔ تب اسے زبردستی اٹھا دیا گیا۔ وہ گرفتار کر لی گئی۔ اس پر مقدمہ چلا۔ پھر کیا تھا یہ خبر نیگرو لوگوں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ اور نیگرو لوگوں نے اس بنیاد پر تحریک چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی رہنمائی ایک کمیٹی کے سپرد کی گئی جس کے صدر مارٹن لوتھر کنگ بنائے گئے۔

۵ دسمبر ۵۵ء کو مانٹگمری شہر میں نیگروؤں نے بسوں کا بائیکاٹ کیا۔ شام کو ایک عوامی جلسہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ جب تک رنگ و نسل کا امتیاز باقی رہے گا ہم لوگ بسوں پر نہ بیٹھیں گے۔ اپنی تقریر میں ڈاکٹر کنگ

واضح طور پر پکار کر یاد دلائیے ہمارا مقصد جیتنا نہیں جیتانے کا ہے۔ بڑے مجمع نے دھمکانے کا ہے پریم کا ہے نہ کہ نفرت کا۔ اگر آپ ہمت، عزت نفس اور پریم کے ساتھ تحریک کریں گے، تو آئندہ کے تاریخ ساز آپ کی مدد کریں گے اور کہیں گے، عظیم لوگ تھے سیاہ فام لوگ — جن کے کاموں کی تہذیب کی رگوں میں نئے اقدار کا خون داخل ہوا۔ یہ ہمارے لئے چیلنج ہے اور ہم سب کی زبردست ذمہ داری ہے۔ تقریباً ایک سال تک یہ تحریک چلی اور آخر کار ۲۰ دسمبر ۵۶ کو بسوں سے رنگ و نسل کے امتیاز کا خاتمہ ہو گیا۔ اس انوکھی کامیابی سے نیگرو لوگوں میں جرأت و امید پیدا ہوئی اور تب سے وہ اپنے شہری حقوق کے لئے ڈاکٹر کنگ کی قیادت میں کوئی نہ کوئی تحریک کرتے رہے ہیں۔

پہلی گرفتاری:-

ڈاکٹر کنگ کی پہلی گرفتاری مارچ ۱۹۵۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے وہ ۱۵ مرتبہ جیل جا چکے ہیں۔ تین بار ان پر ہاتھ بھی اٹھایا گیا اور ایک مرتبہ تو ایک عورت نے قتل کرنے کے خیال سے ہی ان پر حملہ کیا۔ لیکن وہ بچ گئے اور اسپتال میں کئی ہفتے رہنے کے بعد ٹھیک ہوئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ۲۸ اگست ۶۳ کو نیگرو لوگوں نے ایک عجیب پروگرام واشنگٹن میں ترتیب دیا۔ تقریباً ۲ لاکھ افراد جس میں کچھ گورے لوگ بھی تھے، واشنگٹن میں تقریباً ۲ میل پیدل چلے اور ابراہیم لنکن کی یادگار پر پہنچ کر ایک زبردست جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ نے کہا۔

لنکن کی قبر پر:-

"میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب یہ ہے کہ ایک دن وہ آئے گا جب پرانے غلاموں کی اولاد اور پرانے غلام مالکوں کی اولاد آپس میں ملیں گی اور ایک ساتھ بھائی چارہ کی میز پر بیٹھ سکیں گی۔"

اس مظاہرے کا زبردست اثر گورے افراد کے ذہن پر پڑا اور ان کو یقین ہو گیا کہ نیگرو لوگ شانتی اور اہنسا کی راہ سے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پریزیڈنٹ کینیڈی نے ان مظاہرین کے ایک وفد کو اطمینان دلایا تھا کہ نیگرو لوگوں کے امتیاز کو مٹانے کے سلسلے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ صدر جانسن بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ گزشتہ جولائی میں انھوں نے یکساں حقوق کے بل کو منظور کیا ہے۔

ونوبا سے ملاقات:-

گاندھی جی کے عقیدت مند ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ کو ہندوستان سے بڑی محبت ہے۔ وہ گویا اسے اپنا ہی ملک سمجھتے ہیں۔

فروری - مارچ ۱۹۵۹ء میں وہ یہاں آئے تھے اور اجمیر کے پاس ونوبا جی سے بھی ملے تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے ونوبا جی سے دو سوال پوچھے۔ ایک تو یہ کہ ایٹمی جنگ میں ستیہ گرہ کی شکل کیا ہوگی؟ ونوبا جی نے جواب دیا کہ اس کا اشارہ بائیبل میں ملتا ہے۔ حضرت مسیح نے کہا ہے کہ اپنے مخالف سے فوراً ہی موافقت کرلو۔ دوسرا یہ کہ اگر سامنے والا بہت ہی ظالم و جابر ہو تو اس کے خلاف ستیہ گرہ ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ ونوبا جی نے کہا کہ ضرور ہو سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ سامنے جتنا زیادہ اندھیرا ہوگا اجالا اسی قدر جوش سے آگے بڑھے گا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ظالم چاہے جیسا بھی کیوں نہ ہو۔ اس کا بھی خاندان ہوتا ہے اور اس کے پاس بھی دل ہوتا ہے اور ہمیں اسی دل کو بدلنا ہے۔

سب میں کم عمر:-

۳۴ سال کی عمر میں نوبل پرائز حاصل کرنے کا شرف شاید مارٹن لوتھر کنگ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ملا۔ اہنسا میں اٹوٹ عقیدت، انسانوں کے ساتھ پریم اور ہمدردی، نیز کسی کام کو کامیابی کے ساتھ کرنے کی ان کی صلاحیت — اپنی ان سب خوبیوں کی وجہ سے ڈاکٹر لوتھر کنگ عالمی امن کے لئے نیگرو تحریک آزادی اور اہنسا کے حقیقی مظہر بن گئے ہیں۔ ان کی سالگرہ کے موقع پر ہم ان کو دلی مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی عمر دراز ہو اور ان کا نسلی اتحاد اور عالمی اخوت کا خواب حقیقت میں بدل جائے۔

انتظار نعیم

زود پشیماں

لُٹ گیا صحت کے ہاتھوں سے مرا نقدِ وجود
چھپ گیا خاک کے پردے میں ترا پھول سا جسم
جل گئے خواب، خیالوں میں دھواں پھیل گیا
اب تمنا کا فسوں ہے، نہ امیدوں کا طلسم

پھول میں خار کی مانند، چمن ہے صحرا
ساری دنیا مجھے بدلی سی نظر آتی ہے
شام آتی ہے کلیجے میں کھلاتی ہوئی زخم
اک نیا درد لئے صبح نکھر آتی ہے

اب یہ احساس شب و روز ستاتا ہے مجھے
جیتے جی میں نے کوئی قدر نہ جانی تیری
اشکِ غم پی گئے سونا ترے رخساروں کا
خاک میں رل گئی چاندی سی جوانی تیری

تیری آنکھوں سے لگی رہتی تھی ساون کی جھڑی
چہرا اترا سا نظر آتا تھا اکثر تیرا
سیج پر سونا نہ لکھا تھا تری قسمت میں
رات چوکھٹ پہ بتانا تھا مقدر تیرا

اب تری یاد مجھے کوس رہی ہے دن رات
اب ترے درد کا احساس ہوا ہے مجھ کو
بجھ گئی شمع تو کرنوں کا خیال آیا ہے
دور ہونے پہ ترا پاس ہوا ہے مجھ کو

اے۔ جی۔ شیخ

ایک عجیب کمان

ایفل ٹاور یا امپائر اسٹیٹ کا نام لیتے ہی نظروں کے سامنے اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں جو آسمان سے ٹکرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ آج انسان ان عمارتوں کو دیکھ کر صرف ان کی تعریف و توصیف ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ان سے بھی اونچی عمارتیں بنانے کی تگ و دو کرتا ہے۔ اور یہی انسان اور فن انجینئرنگ کی کامیابی کا ایک درخشاں ثبوت ہے۔

امریکہ کے سینٹ لوئی نامی شہر میں ایک ایسی عجیب و غریب کمان بنائی جا رہی ہے جو دنیا میں سب سے اونچی کمان ہوگی۔ اس کی تکمیل کا کام بڑے زور شور سے چل رہا ہے اور انجینئروں کا کہنا ہے کہ جون ۱۹۶۵ء تک یہ کمان پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔

کمان کے دو کھمبوں کے درمیان ۶۳۰ فٹ کا فاصلہ ہے اور ان کی بلندی ۶۳۰ فٹ ہے چونکہ یہ کمان امپائر اسٹیٹ بلڈنگ جو ۵۵۵ فیٹ اونچی ہے سے بھی اونچی بنائی جا رہی ہے۔ اس لئے ساری دنیا اسے تعجب کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔

سائنس اور انجینئرنگ کے ماہروں نے گزشتہ صدی سے اب تک کافی بلند عمارتوں کی تعمیر کی ہے۔ جن میں پیرس کا ایفل ٹاور، روم کا سینٹ پیٹرز چرچ، نیویارک شہر کے سمندر میں کھڑا ہوا آزادی کا بت جو ۳۰۲ فٹ اونچا ہے اور امپائر اسٹیٹ بلڈنگ جو ۵۵۵ فٹ اونچی ہے یہ سب عجیب کاریگری اور فن کے نمونے ہیں جن کو دنیا والے حیرت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

اس کمان کی بناوٹ فولادی فریم سے ہوگی جو اسٹین لیس اسٹیل Stainless Steel کی تہوں سے بند کی جائے گی۔ تاکہ ہوا کے اثر سے فولاد کو زنگ نہ لگ سکے۔ کمان کا کٹ سکشن تکونا ہوگا جس کا ہر ضلع ۵۴ فیٹ ہوگا۔ فولاد کی تکونی فریموں کو ایک کے بعد ایک رکھ کر اس کمان کی تعمیر ہو رہی ہے۔

یہ کمان صرف دیکھنے کے لئے ہی نہ رہے گی۔ بلکہ تکونے سکشن کے اندرونی حصّے میں اوپر چڑھنے کے لئے آٹھ ڈبوں والی ریل گاڑی ہوگی۔ ہر ڈبے میں پانچ آدمیوں کی نشست کا انتظام ہوگا تاکہ بیک وقت ۴۰ آدمی آرام سے کمان میں سفر کر سکیں۔ ریل ایک کھمبے سے چڑھ کر دوسرے سے اترے گی اور اس کی رفتار ۴ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ یعنی دو یا تین منٹ میں آپ کمان کی چوٹی پر پہنچ سکیں گے۔ اس کمان کا ۶۰ فٹ کا اوپری حصّہ شیشے سے بند رہے گا۔ تاکہ مسافر کمان کے اطراف ۳۰ میل تک نظر دوڑا سکیں۔ کمان کی تعمیر شمالاً جنوباً ہو رہی ہے۔ تاکہ کمان کے مشرق کی جانب دریائے مسی سی پی آفتاب کی کرنوں میں چمکتا ہوا دکھائی پڑے اور مغرب کی جانب سینٹ لوئی شہر کی اونچی اونچی عمارتیں اور رات کی روشنی کی رنگین جگمگاہٹ کا نظارہ بخوبی کیا جا سکے۔

کمان کے دونوں کھمبوں میں اوپر چڑھنے کے لئے ۱۰۷۶ فیٹ تک زینے لگائے جائیں گے تاکہ نوجوان اور طاقتور ۱۰۷۶ فٹ تک زینے کے ذریعہ اوپر جا سکیں۔

اس کمان کو کھڑا کرنے کے لئے ایک ۶۰ فیٹ گہرا پایہ کھودا گیا ہے۔ اس میں ۴۰ فیٹ گہرا ایک پتھر کاٹا گیا ہے۔ تاکہ شدید سے شدید قسم کا طوفان بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ بنیاد ۱۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی آندھی کا مقابلہ بھی بڑی آسانی سے کر سکے گی۔

دونوں کھمبوں سے ایک ہی وقت کام شروع کیا گیا ہے اور جون ۱۹۶۵ء تک سارا کام مکمل ہو جائیگا۔ اس کمان کے بنانے کے لئے تقریباً ۵۰۰۰ ٹن کنکریٹ لگ رہا ہے اور ۹۰۰ ٹن Stainless Steel استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ اس کمان کا وزن ۱۷۰۰۰ ٹن رہے گا۔

اس کمان کے نیچے ۱/۲ لاکھ مربع فٹ زمین پر ایک تہ خانہ بنایا جا رہا ہے جس میں ایک عالی شان نمائش قائم ہوگی۔ یہ نمائش سائنس اور انجینئرنگ سے متعلق ہوگی اور اس کمان کی تعمیر میں جو کوششیں کی گئی ہیں ان کی پوری تفصیل دکھائی جائے گی۔

اس تہ خانے کو خاص طور سے Air conditioned کیا جائے گا۔

اس کمان کی تعمیر پر ۲۹ کروڑ ڈالر (ساڑھے ۱۴ کروڑ روپے) صرف ہو رہے ہیں۔ جنوری ۱۹۶۳ء میں یہ کمان بننا شروع ہوئی۔

ماڈرن آرٹ کی ایک نمائش میں آڑی ٹیڑھی لکیروں، رنگ کے بے ہنگم چھینٹوں اور اوٹ پٹانگ قسم کے اشاروں سے جب میں بیزار ہو گئی اور میرا سر چکرانے لگا تو میں تازہ ہوا کے لئے لاؤنج میں آ گئی۔ میرے نزدیک ہی ایک جوڑا کھڑا ہوا تھا۔ شوہر کہہ رہا تھا۔

"ماڈرن آرٹ کی ایک چیز مجھے بہت پسند ہے۔ یہ آرٹ ہر شخص کو اس کی سمجھ کے مطابق موقع فراہم کرتا ہے۔"

خط ملا

ابکی بار

اس شمارے میں نشور واحدی کی غزل اور مایا شنکر کا افسانہ اول درجے کی چیزیں ہیں۔ نشور صاحب کا شمار ہندوستان اور پاکستان کے ان گنے چنے غزل گو شعراء میں ہوتا ہے جن کی ذات سے اردو غزل کی آبرو منسلک ہے۔ غزل پر پھبتی کسنے والوں پران کا احترام واجب آتا ہے اور غزل کو روایتی انداز میں گالیاں دینے والے بھی ان کا نام آنے پر چپ سادھ لیتے ہیں۔ آئندہ آپ "دور حیات" میں نشور صاحب کی اس سے بھی اچھی غزلیں پڑھیں گے۔

مایا شنکر ہندی کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کہانی "شفیشہ فریب" کا بڑا ہی خوبصورت چیز ہے۔ اسکے پلاٹ کی پیچیدگی آپ کو اسے دوبارہ پڑھنے پر مجبور کر دیگی۔ ہندی اور پنجابی الفاظ اور محاوروں کا اردو میں خوبصورت اور برجستہ استعمال اس کہانی کا خوشگوار پہلو ہے لیکن اس کہانی کے انجام کے بارے میں دورائیں ہو سکتی ہیں کچھ Lemonade نما سی چیز ہوگئی ہے۔

دو چیزیں اور آپکی توجہ کی طالب ہیں۔ ممتاز راشد کی غزل کی انفرادیت اور انتظار نسیم کی نظم کے پیچھے کی کسک۔

O

برسوں کے انتظار کے بعد اردو میں ایک سلیقے کا پرچہ نکلا ہے جس کی صورت اور سیرت دونوں دیدہ زیب ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ آئینہ "دور حیات" اسے بڑے ہی خلوص سے خوش آمدید کہتا ہے اور اس کے ہمیشہ زندہ رہنے کی دعا کرتا ہے۔

*

نشور واحدی ——— کانپور

بیحد ممنون ہوں کہ آپ مجھے یاد کرتے رہتے ہیں۔ اور نادم بھی ہوں کہ کوئی قلمی معاونت اور ادبی خدمت نہیں کر سکا ہوں۔ کچھ صحت خراب رہتی ہے۔ کچھ مشاعروں میں اپنی قسمت کے ساتھ گردش میں رہتا ہوں۔ دسمبر میں مدراس چلا گیا تھا۔ وہاں سے آکر برابر سفر میں رہا۔ کبھی کبھی کوئی خط آپ ضرور لکھ دیا کریں۔ تاکہ غیرت جاگ اٹھے۔ آپ کی عنایت اور محبت کا شکر گزار۔

فراز عابدی ——— بنارس

"سالگرہ نمبر" نے "دور حیات" کے ستون کو مضبوط کیا ہے۔ "سالگرہ نمبر" کو بہت لگن اور حسن خلوص سے مرتب کیا گیا ہے۔ آپ نے درست کہا کہ "دور حیات" کو خشک پرچہ کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسا وہی لوگ کہتے یا سمجھتے ہیں جن کے ذہن جائے کی پتّی کی طرح خشک ہوتے ہیں۔ یہ "خشک مخلوق" اپنے ذہن کو "تر پرچوں" کی چائے پلا پلا کر تسکین دیا کرتی ہے۔ اردو ادب کا مستقبل ان "چائے نوشیوں" سے وابستہ نہیں ہے اس لئے ان کے اقوال کا "دور حیات" جیسے پرچوں کو اثر ہی نہیں لینا چاہئے۔ خشک ادب کو قلب و جگر کے خون سے تر کیا جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ایسا ہی کر رہے ہیں۔

میرے خیال میں "دور حیات" کو آج کل کے "معیار" پر لانا اس کے اعلیٰ معیار اور مقاصد کو مجروح کرنا ہے۔ آپ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ فلمی پریوں کے دیش سے نکلنے والا یہ پرچہ "میکدے میں اذان" دیتا ہے۔ کاش میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا۔

انتظار نسیم ——— بمبئی

"دور حیات" کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ سالنامے کا شدید انتظار تھا۔ مگر دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ پرچہ کا سارا حسن طباعت کی خرابیوں کی نذر ہوگیا۔

"دور حیات" کا یہ پہلو آخر آپ کے کنٹرول سے باہر کیوں ہے؟ اردو کے نامور ترین ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کی جو گت آپ کے پریس والے بناتے ہیں شاید ہی کہیں ہوتا ہو۔ حصۂ نظم میں نے سرسری نظر سے دیکھا ہے۔

(رشیق عابد زاہدی)

غزل

ہمسرِ خورشید ہر ذرّہ جو دور افتادہ ہے
اصل کی جانب ابھی پرواز کو آمادہ ہے

کس لئے اتنا بہانہ، رندِ مے آشام سے؟
"کچھ" تو شیشے میں نہاں ساقی! برنگِ بادہ ہے

تم ہو رنگ و بو کا پیکر، تم ہو جلووں کا جال
ہم ہیں سادہ، اور فطرت بھی ہماری سادہ ہے

ہے فقط حفظِ مراتب، ورنہ دشمن، دوست کیا؟
اب جو بھی ہے اس بزم میں وہ آپ کا دلدادہ ہے

اس جہانِ آب و گل میں ہر موقف ہے سراب
کوئی رہبر ہے، نہ منزل ہے نہ کوئی جادہ ہے

میکدے میں حضرتِ عابد چلے آتے ہیں یوں
ہاتھ میں تسبیح ہے اور دوش پر سجادہ ہے

کوئیں یٹس

[illegible]ہم کی التجا

ہم تیرے معبد میں عبادت کو آئے ہیں
ہم جو دعرقہ کے بیٹے ہیں
ننگا گوالا ساری گایوں کو
صحیح سلامت گھر لا چکا ہے
وہ اپنی بانسری لئے چپ چاپ کھڑا
اپنی بھوؤں سے بارش کے قطرے پونچھ رہا ہے
پرندے اپنے گھونسلوں میں مراقبے میں ڈوبے
اُن کا نغمہ گیتوں سے صبح کی پہلی کرن کا انتظار
کر رہے ہیں
سنکھ ساحل پر ہجوم کرتے ہیں
اور ان کے لب سمندر کے جسم سے پیوست ہیں
کاشتکار اپنے کھیتوں سے واپس آ چکے ہیں۔
اور الاؤ کے ارد گرد بیٹھے
بہت دور ماضی کی کہانیاں سنا رہے ہیں
پھر ہم دعرقہ کے بیٹے آخر کیوں
تیری عبادتگاہ میں التجائیں کریں جو بے اثر ہیں۔
جب ہمارے دل نغموں سے معمور ہیں
اور ہمارے غم سے کپکپا رہے ہیں؟
ننھا سا جگنو ستاروں سے نبرد آزما ہے
جلتی ہوئی لکڑی سورج سے
اور تونبے میں بھرا ہوا پانی عظیم الشان کا مقابل ہے
لیکن ہم افلاس کا پھٹا ہوا چیتھڑا لپیٹے
مالک کے دروازے پر کھڑے دعائیں مانگتے ہیں۔

کولیسی بریو

تلاش

ماضی در اصل حال کا
ایندھن ہے جو بجھ چکا ہے
اور مستقبل
وہ دھواں
جو چھوٹ کر بادلوں سے گھرے آسمان کی طرف جا رہا ہے

جانِ من، بہت آہستگی سے، بہت پیار سے کہو۔
کیونکہ الفاظ یادیں بن جاتے ہیں۔
اور یادیں کسی مسخرے کا ہتھیار ہو جاتی ہیں۔
جب عالم خاموش ہو جاتے ہیں
تو اس لئے کہ انھوں نے یہودا کے چہرے پر
یسوع مسیح کی ہتھیلیاں دیکھی ہیں۔

اس لئے جانِ من! ان کے خطبوں میں
علم اور صراطِ مستقیم کی تلاش نہ کرو

یہ دعا کرو کہ وہی آگ
جس نے ان کی زبانوں کو جلا کر
خاموش کر دیا
ہمیں بھی کندن بنا دے

بارش ہوئی
جب کہ ہم تم
اپنے جذبات کی رات کے بوجھ سے دب کر
سو رہے تھے۔
ان کے نو دریافت علم نے
بجلی کی تیز چمک جیسا تھا
اس سچائی کو عریاں کر دیا
کہ وہ [illegible] کے غلام رہے ہیں

ترجمہ ابراہیم رنگلا

[illegible]

ترجمہ: [illegible]

نرس یا کھلایا

(۴)

باہر کا سماں بڑا پیارا تھا۔

بہار کے رُت کا سورج ہلکے نیلے آسمان پر روشنی پھیلا رہا تھا اور ہلکے ہلکے سفید بادلوں کی مہین چادر ادھر اُدھر بکھر دھیرے سرک رہی تھی۔ ایسے میں ہلکی گرمی من کو بھاتی تھی ہوا میں سردی کی حالت تھی کہ اس میں بہار کے دنوں کی تازہ کھاد اور اڑوس پڑوس میں روٹی اور کرم کلّے پکنے کی سوندھی باس ملی ہوئی تھی۔ گھروں کی چھتوں پر سے برف کا پانی ٹپک ٹپک کر کیچڑ میں مل کر دمکتا ہوا چھوٹی چھوٹی نالیوں کا روپ دھار کر بہہ رہا تھا۔ اور اور زمین میں سے تازہ گھاس ابھر رہی تھی۔ نرمن بنگلہ کا دور تک پھیلا ہوا سارا آنگن جیسے جگمگا رہا تھا۔ چمکدار کھنے کے چھپر میں مرغیاں کلکلاتی ہوئی ادھر اُدھر پھر رہی تھیں اور ایک بے تاب و بیقرار سفید کلغی والا مرغا اپنی مرغیوں کے لئے دانہ دُنکا ڈھونڈتا اتنا تا پھر رہا تھا۔ بطخیں کیچڑ میں لت پت گھوم رہی تھیں۔ اور کبھی کبھی ہوا میں اُڑتی اُڑتی چڑیاں چہچہا کر آتیں اور آنگن میں بھیگتا ماتی ہوئی اترتیں اور ایک چکر لگا کر چلی جاتیں۔ فاختائیں چھپر پر بیٹھ کر اپنے سفید لہلہاتے اور اُجلے پروں کو پھیلا کر سیدھا کرتیں اور دھوپ میں میٹھی میٹھی کلکلاتیں اور سب کچھ ایسا تھا گویا ہیرے موتیوں میں مگن ہو جائیں۔ آنگن کی تلیا کے کنارے سے

پھر لالی بالوں والا ماتھرل کھل لیتا تھا۔

اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے ہی اُڑتی مکھیوں کے پکڑنے کو جھڑپ سے گردن بڑھا کر منہ پھیلا دیتا تھا۔

"بلبل کیسا سماں پیارا نہیں؟" شورا نے خوشی میں آکر [illegible] کی طرح [illegible] ادھر اُدھر [illegible] کی چھپر تک اور پھر وہاں سے آنگن کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ اور بے چاری مرغیاں اور چڑیاں تو پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑ بھاگ ہو گئیں لیکن کلغی دار مرغا اچنبھے میں آ کر تن کر جہاں تھا وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے"۔ ملاح نے کہا۔

"اور آپ چھپر کے پاس پڑے ایک پیپے کو اوندھا کر کے اس پر بیٹھ کر جیب سے اپنا چھوٹا سا پائپ اور تمباکو بٹوا نکالا۔ پہلے پائپ کو صاف کیا اور پھر اپنے ٹھنڈ منڈ انگوٹھے کی مدد سے اسے بھرا اور مزے لے لے کر دم پر دم لگاتے ہوئے آنگن کے منظر کا جائزہ لینے لگا۔ جہاں بطخیں اپنے جوڑوں کے ساتھ کبھی بہتے پانی میں تیرتی تھیں اور کبھی پانی کے کنارے کی گھاس پر آجاتی تھیں اور پیرہ دار کتّے کے کام کو دیکھ رہا تھا۔ ایسی نگاہ جس میں پیار تھا۔ یہ نظر انہیں کو ملتی ہے جو قدرت اور جاندار کو پیار کرنا جانتے ہیں۔

ماسٹر سکندر۔ زرا سنبھل کر۔ دیکھنا بابا کہیں کیچڑ میں نہ گر پڑو۔ وہاں پانی بہت ہے جو بطخوں کے تیرنے کے لئے بہت ہے۔

شورا جلد ہی دوڑتے بھاگتے تھک گیا اور آ کر فیدور کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ جو اس کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اب وہ کھانے کے لئے تو گھر میں جاتے تھے ورنہ ان کا سارا دن گھر سے باہر ہی بیت جاتا۔ فیدور نے اسے بطخوں، مرغیوں اور دوسرے پنچھیوں کے بارے میں اتنی باتیں بتائیں اور مزے لے لے کر کہانیں کہ شورا تو اس کی استادی کو مان گیا۔ اسے اچنبھا تھا کہ فیدور کو اتنی باتیں کیسے اور کہاں سے معلوم ہو گئیں۔

اس کے سامنے تو نئی دنیا کے دروازے کھل گئے [illegible] موقع تھا کہ قبل نے آزر با دیکھی ہوئی چیزوں کو [illegible] سمجھنے کے لئے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ شورا [illegible] باتیں ایسے دھیان سے سنتا جیسے اس پر فیدور نے جادو کیا ہو۔ جنگل، جانوروں، گھاس کی پتیوں اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کے بارے میں یوں باتیں کرتا تھا جیسا کہ وہ آج بھی انہیں چیزوں میں سے ایک ہو۔ یہ بات چیت شورا کی کود پھاند اور دنگے کے کارن کٹ گئی۔ ہوا یہ کہ شورا نے ایک پتھر اٹھایا اور بطخ کے دے مارا۔ وہ بیچاری پتھر کھا کر پاگلوں کی طرح گھبائی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگی۔

"ارے سکندر علی! تم کو ایسا نہ کرنا تھا۔" فیدور نے تیوری چڑھا کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہاری بھول تھی۔" اس نے اپنی بات کو دہرایا اور اس کی آواز میں ہلکا سا الاہنا تھا۔

شورا لال ہو گیا۔ مگر سمجھ نہ سکا کہ اس بات کا برا منائے یا نہ منائے۔ پھر بھی وہ ایسا بن گیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور لگا جان بوجھ کر پاس کے بہتے پانی میں ٹھیکریاں مارنے۔ گویا اس کا اس بات سے کوئی سمبندھ ہی نہیں۔

"ایسے سر دردش اور غریب کا کیا مارنا۔ ہا۔ بے چاری دیکھو وہ لنگڑا رہی ہے اور من ہی من میں کہہ رہی ہے کہ اس چھوکرے نے مجھے پتھر کیوں مارا اور ادھر کو جا رہی ہے کہ مہنس راج اپنے پتی دیو کو اپنی چوٹ دکھائے۔"

اب تو شورا کے دل میں بھی کچھ بے چینی سی ہوئی اور وہ بھی سمجھنے لگا کہ اس سے بھول ہو گئی۔ یہی وقت تھا کہ اس کے دل میں یہ خیال جاگ اٹھا کہ بطخیں بھی سوچتی سمجھتی اور آپس میں بات چیت کرتی ہیں۔ لیکن بہت سے گھمنڈی لڑکوں کی طرح اپنی بھول کھلم کھلا ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی لئے ڈھٹائی سے بولا۔ "بلبل! یہ سب کچھ نہیں۔ بھلا کہیں بطخیں بھی آپس میں بات چیت کر سکتی ہیں؟"

"تو تمہارا کیا خیال ہے؟ میاں! خدا کی پیدا کی ہوئی سب چیزیں سوجھ بوجھ رکھتی ہیں اور اپنی اپنی ریت اور [illegible] ڈھنگ سے سوچتی، بچارتی اور آپس میں باتیں بھی کرتی ہیں۔ زرا اُس چہچہاتے چڑے کو دیکھو جو بلبل نے

اس کی کتنی قدر و قیمت سمجھتے ہیں۔

بلبل چپ چاپ سنتا رہا۔ مگر دل میں اسے بالکل ناکارہ آدمی سمجھتا تھا کیونکہ وہ اس کے بُرے برتاؤ کو بھولا نہ تھا جو اس نے بزرودش گتّے کے ساتھ کیا تھا۔ ایک دن اس نے کھلے لفظوں میں اسے جتا بھی دیا کہ غریب بے زبان جانوروں کو یوں ستانا بڑے ہی شرم کی بات ہے۔

تم طرح طرح کھاتے ہو یہ جانتے ہوئے کہ اگر تم کو یوں جلایا جاتا تو اسے کتنا پسند کروگے۔ کرلائی یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر دل ہی دل میں بلبل کے خلاف توڑ جوڑ کرنے لگا۔ اس لئے کہ بلبل نے گتّے کے سامنے اس کی بےعزتی کی تھی۔ لیکن دکھاوے کو اس کی بات مان گیا تھا۔

بلبل نے اپنا پائپ پی کر اونچی آواز سے کہا۔ "لو بھئی اب سونے کا وقت آگیا۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑی گمبھیرتا سے اس نے خدا سے دعا کی اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ اور سونے سے پہلے اپنی جہازی نوکری کے دنوں کے کاموں پر سوچتے سوچتے اپنی آج کی حالت کو بھی سوچنے لگا۔

"زندگی تو بڑی اچھی ہے۔ مگر مجھے اور دوسرے پنشنا ہوئے ایک تو اس "چینی کی گڑیا" سے۔ دوسرے اس "بے پیندے کے بدھنے" سے۔

آخر سوچتے سوچتے سب کچھ خدا پر چھوڑ کر سو گیا۔ کہ جو ہوگا۔ ٹھیک ہی ہوگا۔

——— (۷) ———

فیدو طبل اکثر روسی ملاحوں کی طرح جب کہ ملک میں بھکاری اور غلامی کا دور دورہ تھا۔ اپنے نصیب کے لکھے پر یقین رکھنے والا فلسفی تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ملک کے عام لوگوں کی طرح ملاحوں سے بھی ہر جگہ بُرا اور وحشیانہ سلوک ہوتا تھا۔

اس کی زندگی کی ساری خوشی اسی میں تھی کہ وہ اپنے بدن کو پیٹ اور کوڑوں سے بچائے رکھے اور جہاں تک بن پڑے چہرے پر گہرا زخم نہ آنے دے۔ سوائے معمولی چوٹیں اس کی نظر میں کچھ نہ تھیں۔ اس حالت میں اس نے اپنے لئے رہنی سہنی باہمی برتاؤ اور چلن کا ایک فلسفہ سا بنا لیا تھا۔ جس کی وہ ہر حال پابندی کیا کرتا تھا۔ وہ یہ کہ اپنا فرض نبھاؤ اور میل جول اور آپس کے برتاؤ میں اچھائی اور بھلمنساہت کو سامنے رکھو اور باقی جو کچھ ہونا ہے اسے قدرت پر چھوڑ دیا جائے۔

اس عقیدہ اور قسمت کے لکھے پر راضی رہنے سے جو روسی کسانوں کا حصّہ تھا۔ خدا کے رحم و کرم کے بارے میں طبل کی سب کٹھنائیوں کا حل ہوگیا تھا۔ آنے والی کل کی [illegible] اسے بے نیاز بنا دیتی تھی۔ اس کی شردھا ہی تھی جو مزدور کی روز روز کی دکھ بھری زندگی کی نراشا میں اس کی ہمت بندھائے رکھتی تھی۔ اس کی شردھا اور ایمان کا کیا کہنا۔ اسی کے بل پر وہ ایک اچھا پیراک اور دکھ درد سے بے نیاز ملاح تھا۔ جب کبھی ظلم اور ناانصافی کے نظارے دیکھ کر اس کا دل دکھتا تو بے اختیار ہو کر ظلم پر لعنت ملامت کرنے پر بھی دریغ نہ کرتا۔ ایسے وقت میں کہ جب شردھا اور روسی ملاحوں کی بپتا بڑھ جاتی تھی وہ اپنے دل کا جوش دھکار کے بول بول کر ٹھنڈا کر لیا کرتا تھا۔

یہ اس کی پرانی مالکن کا خبط ہی تھا کہ اس سے کھیتی کا ہل چھڑا کر زبردستی اسے فوج میں بھرتی کرا دیا گیا تھا اور وہاں ڈریل ڈرل میں ناکام ہونے کی وجہ سے دریائی بیڑے میں جوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ بیچارے نے کبھی بھی سمندر کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ اس وقت سے اب تک آئے دن کی ادلا بدلی سے اس کی زندگی روزانہ نئے نئے رنگ ڈھنگ بھی بدلتی رہتی ہے۔ کبھی خوش قسمتی کے وقت آتے تھے۔ کبھی بدقسمتی کے، کبھی بھوکا فاقہ ہوتی تھی۔ کبھی نہ سہے جانے والے دکھوں سے پالا پڑتا تھا۔ کبھی چلتے پھرتے تیرتے تیرتے دوزخ کی سیر ہوتی تھی۔ کبھی دن پھرتے تھے تو بہشتی ہوائیں بھی چلنے لگتی تھیں۔ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسے کپتان اور چیف افسر یا دوسرے اچھے آفیسروں کے ہاتھ کے نیچے آجاتا جو اپنے ماتحتوں سے اس ظلم و ستم سے کم وحشیانہ اور ظالمانہ برتاؤ کرتے جو اس وقت عام تھا۔ سخت تو افسر بھی ضرور کرتے مگر بات بات پر کوڑا کاری نہ کرتے۔ فیدو جہاز کی چوٹی پر کام کرنے میں استاد تھا۔ اس لئے وہ آپ تو ہر دم گھورتے سے لگے کھڑے نہیں بیٹھتے تھے۔ اس حالت میں اس کی سودیشی خوش طبعی اور مزاج کی ہنسوڑ پن نے اسے جہازرانوں میں نکما اور اچھا کپتان سمجھا جاتا۔ لیکن خدا کا کرنا کبھی ایسا افسر بھی آجاتا جسے ملاحوں کی بات چیت میں "ٹکّا گتّا" کہا کرتے تھے۔ تو جہاز کی حالت ہی اور ہو جاتا تھا۔ پال لہرانے میں پلک جھپکنے کی دیر پر بھی وہ افسر آپے سے باہر ہو جاتا اور چوٹی پر کام کرنے والے سب ملاحوں کے کوڑوں سے چمڑے اڑوا دیتا۔ اس وقت فیدو کی جان سوکھ سی جاتی اور وہ مرجھا جاتی اور دل بیٹھ جاتا۔ اکثر ایسے وقت میں کوئی سے کہا کرتا کہ وہ جہاز کے کنارے [illegible] ہی جہاز سے نکل بھاگتا۔ ایسی حالت میں بھی یہ نرم بولی مگر جوش سے دالے لہجہ میں سادہ بیانوں کے لفظوں سے ٹوٹے ہوئے دل والے جوان ملاحوں کے دلوں پر ہمدردی کا مرہم رکھتا۔ سیدھا سادا ایسے آدمی کی زبان سے عجیب سا معلوم ہوتا کہ جس کی پیٹھ آپ ہی کوڑوں کی بیدردی مار سے اُدھڑی ہوئی ہو۔

"خدا چاہے" تو ہما یہ "ٹکّا گتّا" کسی اور جہاز پر بھیج دیا جائے گا اور وہ ظالم سے چھٹکارا پالیں گے۔ ایسی باتیں کہتیں جنہیں ماننے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔ غرض جوں توں اپنے دکھ کو ان کا دکھ اور ان کے دکھ کو اپنا دکھ بنا کر ان کو اس لائق بنا دیا کرتا تھا کہ آئے دن کے دکھ درد کو سہار سکیں۔ جہاز پر ہو یا خشکی پر دونوں جگہ فیدو طبل اپنے ساتھی جہازیوں میں مانا ہوا آدمی تھا۔ اس لئے کہ اس نے جو کام سے رکھا تھا۔ وہ اس کے لائق تھا اور اس کا سر بھی ٹھکانے پر رہتا تھا۔ ٹاپ میں ([illegible] ٹاپ Top) ہونے کے ناتے وہ ہمیشہ ساہس سے کام لیتا۔ اور جہازرانی کے کام میں ماہر ہونے کا پورا پورا ثبوت دیتا تھا۔ لوگ اس کو مانتے اور اسے چاہتے تھے۔ اپنے کھرے چلن اور بھلے برتاؤ اور پاکبازی کے سبب جہازیوں خاص کر نئے ملاحوں میں بہت مقبول تھا۔ جن کو موسموں کی سردی گرمی اور اپنی دریائی نوکری کے اونچ نیچ اور بیڑے سے بھلے اس قابل بنا دیا تھا کہ سامنے آنے والی کٹھنائیوں اور کڑواہٹوں کو جھیلنے جا [illegible]

بلکہ کچھیوں کو ببل ہمیشہ سرہنگوں اور چھوٹے موٹے افسروں کی دھمکیوں اور جھڑکیوں سے بچا لیا کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نے ماتحتوں کو جھڑکیاں دینے والے سرہنگوں کو سدھارنے میں قسمت کے لکھے پر بیٹھے رہنے کی پالیسی سے ہٹ کر ایک دوسرا راستہ اپنا لیا تھا۔ یعنی ان کے سدھارنے کو خدا پر چھوڑ دینے کے بجائے انسانی کس بل سے بھی کام لے لیا کرتا تھا۔

جب اپنے ماتحتوں سے آدمیوں کا سلوک کرنے کی اپیلیں ان درندوں پر اثر نہ کر پاتیں تو پھر نیدر دھمکیوں پر اتر آتا۔ "سرہنگ راج کپڑے چڑھا کر ادھر کا فیڈ کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ خدا کا زمانہ ہے کہ بڑے بول کا سر نیچا۔ ذرا سنبھل کر رہیئے۔ نہیں تو کوئی خدا کا بندہ آپ کے تیلیے سے بل نکال ڈالے گا۔" اگر یہ دھمکی بھی ہوا میں اڑ جاتی تو ببل اندر ہی اندر بل کھاتے ہوئے سر کو ہلاتا۔ تیور چڑھاتا۔ بھوؤں کو سکیڑتا دکھائی دیتا اور صاف لگتا کہ اس نے دل میں کچھ اور ٹھان لیا ہے۔

ببل گو نرم مزاج اور نیک دل آدمی تھا۔ لیکن جب پچھلے درجے کے جہازیوں کے "بے تکے" چالو دستور سے کام لینے کا کوئی معاملہ سامنے آجاتا تو پھر وہ سختی سے کام لینے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چند ایسے ملاحوں کو ملا لیتا جن پر اسے بھروسہ ہوتا اور یہ لوگ مل کر ایک گپت سبھا جوڑتے اور ایک ٹھہراؤ ٹھہراتے کہ اس نا ہنجار سرہنگ سے کیا برتاؤ کیا جائے۔ عام طور پر ان غیر سرکاری چھپے مقدموں میں فیصلہ یہی کیا جاتا کہ جب جہاز کنارے پر جا لگے اور جہاز کے ملاح بھی خشکی پر پہنچ جائیں تو خشکی ہی پر ان سرہنگ راج کو اچھا سانہ بھولنے اور بھلایا جا سکنے والا پاٹھ پڑھا دیا جائے۔ بس! پھر ہوتا یہ کہ ان سرہنگ راج کو کسی اجاڑ اندھیری گلی میں کوٹ پیٹ کر ٹھیک ٹھاک کر دیا جاتا اور کٹائی رکتی تب جب ان میں سانس تو چلتی رہتی مگر اور شعور بدھ کسی چیز کی نہ ہوتی۔ اسی بے سدھی کی حالت میں یہ لوگ اسے اٹھا کر جہاز میں واپس لے آتے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سرہنگ لوگ اپنے افسروں سے ایسی ویسی باتوں کی شکایت نہیں کیا کرتے تھے۔ جب کبھی کوئی پوچھتا بھی کہ بھئی یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ یہ مار پیٹ کے لال پیلے نشان کیسے ہیں؟ تو وہ پٹنے والا آدمی کہہ دیتا۔ "اوہ خیر کچھ ملاحوں سے ذرا یونہی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔" اس کارروائی کے ہو چکنے کے بعد سرہنگ پھر اپنے گھونسوں اور ٹھوکروں کو بچا کر ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ ہاں ان کی بھبکیاں چالو رہتی تھیں۔ مگر خالی خولی پھٹکاروں کی پرواہ کون کرتا تھا۔ جب کبھی کوئی ایسی بات ہو چکتی تو نیدر اپنے سیدھے سادے دیسی لہجہ میں کہتا کہ دیکھو تو کتنا اچھا آدمی بن گیا ہے۔ اب یہ ٹھیک ٹھیک معنوں میں سرہنگ ہی لگتا ہے۔

یہ آپ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا عہدہ اونچا کیا جائے۔ کیونکہ اونچا درجہ اس طبیعت کے آدمی کے سبھاؤ سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ایک بار اس کے چیف افسر نے چاہا بھی کہ اسے اور نہیں تو ایک چھوٹا سا عہدہ دے دیا جائے۔ تو اس نے گڑگڑا گڑگڑا کر کہا۔ سرکار۔ مہربانی کرو۔ مجھے افسر نہ بناؤ، میں ہاتھ جوڑتا ہوں۔

چیف افسر نے اچنبھے میں آکر پوچھا، "آخر کیوں؟"

اس نے کہا تو اتنا ہی کہ سرکار میں افسری کے لئے بنایا ہی نہیں گیا۔ بس مجھے تو سادہ سا ملاح ہی رہنے دو۔ اور اس نے اپنے انکار کا کوئی سبب بھی نہیں بتایا۔

"اچھا تمہاری مرضی ..... میں تو تمہیں تمہارے اچھے کام کا انعام دینا چاہتا تھا۔"

شکریہ، سرکار۔ میں آپ کا بہت آبھاری ہوں۔ کرپا کرکے مجھے وہیں رہنے دو جہاں ہوں۔"

"بہت اچھا۔ تم سے بڑا نادان کون ہوگا۔" چیف افسر نے کہا۔

نیدر یہ سن کر چیف افسر کے کیبن سے اطمینان کی سانس لیتا ہوا نکلا کہ چلو اچھا ہوا کہ وہ اس عہدہ داری کی جھنجھٹ سے صاف بچ نکلا جس کے بل پر اسے اپنے ساتھی ملاحوں پر جھپٹنا پڑتا اور بڑے افسروں سے برابری کرنی پڑتی۔

اس کا رویہ یہ تھا کہ جہاں تک بن پڑے سان بڑے لوگوں سے دور ہی رہنا چاہئے۔

ببل اپنی نوکری کے لمبے زمانے میں آزمائش کی گھڑیوں سے خوب گزر چکا تھا اور کٹ پٹ کر نکلا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو اس کی تعریف بھی ہوتی تھی۔ سنگرا سے کوڑوں کی سزا بھی تو سے سزا بھی گیا تھا۔ نوکری کے آخری تین سال جو کپتان سنگھن کے ہاتھ کے نیچے گزرے تھے وہ بڑے مزے کے تھے۔ کیونکہ سنگھن اور "جل پری" کے چیف افسر ساتھ نے کی عام حالت کو دیکھتے ہوئے بہت اچھے افسر تھے اور نہ اس جہاز میں کام کرنے والے عام ملاح بھی بھلے لوگ تھے۔ یہی کارن تھا کہ نہ تو لوگوں کو ہر وقت بخار سا چڑھا رہتا تھا اور نہ وہاں روزانہ کوڑوں سے پٹائی ہوتی تھی۔ اور نہ بے مطلب اور بیکار سخت ڈرل کرائی جاتی تھی۔ جو دریا میں رہنے والی زندگی کا مزہ چکھا دیا کرتی ہے۔

کپتان سنگھن جانتے تھے کہ ببل بڑا اچھا ٹاپ مین (Top man) ہے اس لئے انہوں نے اسے اپنے جہاز کے ساتھ کی کشتی کا کھیوتا چن لیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ یہ بڑا محنتی، مضبوط اور کھرے چال چلن کا آدمی ہے۔ نیدر دل میں سوچا کرتا تھا کہ اگر دریائی نوکری کے یہ آخری تین سال خدا کے کرنے سے کپتان سنگھن ہی کی ماتحتی میں نکل گئے تو پھر اسے خشکی پر کوئی کام سونپ دیا جائے گا اور وہاں سے ۲۵ برس کی خدمت پوری ہو جانے پر یہ اپنے ملک کے مغربی حصے میں اپنے چھوٹے سے گاؤں میں لوٹ جائیگا۔

نوکری کے اس لمبے زمانے میں اس نے اپنے گاؤں والوں سے اپنا ناتا قائم رکھا تھا۔ اور نہیں تو کم سے کم سال میں ایک بار ضرور وہ اپنے خواندہ ملاح ساتھیوں میں سے کسی ایک سے اپنے پیارے ماں باپ کے نام لمبی چوڑی چٹھی لکھوایا کرتا تھا۔ جس میں دور سمندر پار کے چھوٹے بڑے بیگھے، سنبندھیوں اور دوستوں کے لئے شبھ کامنائیں ہوا کرتی تھیں۔

لیکن ایک دن کیا ہوا کہ ببل ابھی جبکہ مستولوں کی چوٹی پر ہی تھا، ساتھ کام کرنے والے ایک مانجھی نے پہلا مستول کے رسّے کو چھوڑ دیا۔ ببل کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اور ساتھ کی انگلی رسّے میں الجھ کر بری طرح کچلی گئی۔

(باقی آئندہ)

نا سن پڑھیے

نور پرکار

" وہ کتابیں جو مجھے پسند نہیں "

اُدھار روپے پیسے دیئے کبھی واپس نہیں ملتے۔ اگر کسی کو اُدھار دیتے ہوں تو واپسی کی اُمید نہ رکھتے ہوئے دیئے جائیں۔ ایسا کسی نے کہا ہے۔ لیکن جہاں تک میری سمجھ کا تعلق ہے کتابوں سے متعلق بھی ایسی رائے قائم کی جا سکتی ہے میرے یہاں آنے والے لوگوں میں سے جب کوئی میری کتابوں کی طرف بڑی گہری نظر سے دیکھتا ہے تو میں اس کا چہرہ پڑھ لیتا ہوں اور جان لیتا ہوں کہ وہ اب مجھ سے کیا طلب کریگا۔

کیا آپ یہ کتاب دے سکتے ہیں، صرف دو دن کے لئے؟

کیوں نہیں ۔! میں جواب دیتا ہوں۔ اور اسی وقت سوچ لیتا ہوں۔ میری لائبریری میں سے ایک اور کتاب گم ہوئی۔

کتاب لے جانے والا شخص اُٹھتے اُٹھتے دھیرے سے پھر ایکبار کہیگا۔

"مکمل ہوتے ہی واپس کر دونگا"

مگر اس جملے کی طرف میں کوئی دھیان نہیں دیتا۔ چونکہ اس معاملے میں کافی تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ اسی لئے پیسوں سے متعلق دی ہوئی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کتاب کے بارے میں بھی یہی نظریہ قائم کر لیا ہے "کہ وہ واپس نہیں آئے گی!!"

میں اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک پیدا کرتے ہوئے کرسی سے اُٹھتا ہوں تو وہ شخص کہتا ہے "آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔ بیٹھے رہیے۔ میں چلا جاؤں گا" مگر میں دروازے تک ضرور جاتا ہوں، اپنی کتاب کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے لئے۔ چونکہ پھر کبھی اس کے درشن نہیں ہونگے۔ اب میں اس چیز کا عادی ہو چکا ہوں۔ اس لئے من کے بہلاوے کے لئے ایک بہلاوا بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ اس سے کہتا ہوں "وہ شخص کتاب پڑھیگا اور تمھیں ثواب ملیگا" بس اسی پن کا لالچ دیکر اپنے من کو شانت کر دیتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سبھی لوگ ایسے نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ ضرور اپنے قول اور اصولوں کے پابند ہیں۔

نہیں تو اب تک میری لائبریری بالکل خالی ہو چکی ہوتی۔

کتابیں لیجانے والے لوگوں کی بہ نسبت میں ان لوگوں سے زیادہ خوف کھاتا رہتا ہوں، جو اپنے ساتھ میرے لئے کتابیں لاتے ہیں۔ وہ کچھ وقت اِدھر اُدھر کی باتوں میں صرف کرنے کے بعد ایک کتاب سامنے رکھ دیں گے اور پوچھ بیٹھیں گے۔

"کیا یہ کتاب آپ کی نظروں سے گذری ہے۔؟

میں اس کتاب کو اچھی طرح دیکھتا ہوں۔ پھر نفی میں سر ہلا دیتا ہوں۔

آپ ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے اس کتاب کا مطالعہ آپ کے لئے بیحد ضروری ہے۔

ان سے پیچھا چھڑانے کیلئے میرے لب وا ہوتے ہیں "لیکن آجکل فرصت نام کو نہیں ملا" فوراً جواب ملتا ہے۔ "آپ اپنے پاس رکھ لیجیے۔ جس وقت بھی فرصت کے لمحات میسر ہوں۔ پڑھکر لوٹا دیجئے۔"

میں خاموشی مناسب سمجھتا ہوں۔ مگر وہ خاموش نہیں رہتے کہہ اُٹھتے ہیں۔

"آٹھویں باب میں مصنف نے گدھوں کو عقلمند ثابت کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے ......" بس کتاب کھولی اور آٹھواں باب شروع۔ میں اپنی آنکھیں موندے کچھ سنتا ہوں کچھ سوچتا ہوں اور کبھی کبھار اپنے آپ کو کوستا بھی ہوں۔

" اچھا اب میں چلوں گا "

دل ہی دل میں کہتا ہوں۔ چلو جان چھوٹی۔

مگر جاتے جاتے فرما جائیں گے۔ کتاب پڑھنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار ضرور کیجیے۔

یعنی اب کتاب کا پڑھنا لازمی ہو گیا۔ زندگی کے چند گھنٹے پھر اس شخص کی نذر ہو گئے۔

بالکل اسی طرح وہ مہمان جو پچھلے دو دن سے میرے یہاں مقیم تھے۔ جو تقسیم پر بحث کرتے کرتے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ جاتے جاتے ایک انگریزی کتاب میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہنے لگے۔

" اس کا مطالعہ کیجیے "

" لیکن صاحب میرا و شواس نہیں ..." " اسی لئے تو کہہ رہا ہوں پڑھ لیجئے آپ بھی وشواس کرنے لگ جائیں گے "

اور وہ ایک انگریزی کی موٹی سی کتاب میرے یہاں چھوڑ گئے۔

اسی طرح اور بہت سارے مہمان آتے ہیں اور اپنی مہربانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ کوئی آکر کہتا ہے۔ "اس کتاب کا تھیم آپ کو پسند آئے گا" تو دوسرا کتوں کی پرورش پر کوئی بھاری بھرکم کتاب لا کر رکھ دیگا۔ چونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ کہ مجھے کتے زیادہ پسند ہیں۔ تو تیسرا بھارتی کلا کے چند نمونے ...... ہر ایک اپنی پسند کے مطابق کتابیں لے آئے گا اور اصرار بھی کرے گا "کتاب ضرور پڑھیے۔ اس کا مطالعہ بہت ہی مفید ثابت ہو گا۔"

دو روز پہلے ہی کی واردات ہے۔ ایک صاحب ٹیکسی سے اُتر کر میرے گھر میں داخل ہوئے اور ہر ایک ناول میرے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگے۔

" ایسا ناول آپ ضرور پڑھئے۔ ایسی کتابوں کی آجکل بہت مانگ ہے "

وہ ناول میں پڑھ چکا تھا۔ اور یقین جانیئے کہ اگر وہ نہ بھی پڑھتے تو کیا جاتے۔

ایسی تمام کتابوں کو میں نے اپنی لائبریری میں اس طرح سجایا ہے کہ دیکھنے والے شخص کی نظر پہلے انہیں کتابوں پہ آ کر رک جائیں۔ مگر ہائے رے قسمت اب تک ایک بھی کوئی میرے جال میں نہیں پھنسا۔ اور کتابیں دینے والے بھی واپس نہیں آتے۔ یہ ایک طریقہ سے ٹھیک ہے۔ اگر واپس آ جاتے تو بجائے مصیبتوں کے کتنے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔

مگر اُن نہ آنے والے لوگوں میں سے ایک شخص واپس آئے تھے۔ سلام و پیام کے بعد مخاطب ہوئے۔

" آپ وہ کتاب مکمل کر چکے ہیں!

میں ٹھٹکا رہ گیا کہ کیا جواب دوں۔ اگر نفی میں جواب دیتا تو نجانے ان پر کیا گزرے یہی سوچکر میں نے کہا "

معنف کی کئی باتوں سے میں متفق نہیں ہوں، البتہ زبان پر اسے کافی عبور حاصل ہے حالانکہ میں اس کتاب کا نام تک بھول چکی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا تیر ٹھیک نشانہ پر لگا ہے۔ مگر انہوں نے کہا۔

ہی تو جاننے کے لئے آپ کے پاس آ دھمکا ہوں کہ آپ معنف کی رائے سے اتفاق کیوں نہیں کرتے ؟ اس نے کون سی بات غلط کہی ہے ؟" اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ کاش یہ زمین پھٹ جائے اور اس میں یا تو میں یا تو وہ ۔۔۔!۔۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔ میں اپنے خیالات کا اظہار تو کر سکتا ہوں، البتہ آخری دو باب پڑھنے باقی ہیں۔

تو پھر بتا دیجئے۔ آپ نے کہاں تک پڑھا ہے۔ تاکہ کم از کم اس بات تک میں آپ کی رائے جان سکوں۔

اب کے بھی ایک کھنڈر میں پھنس گئی تھی میں نے کہا۔ جانے دیجئے اس تذکرے کو۔ آج میں آپ کو ایسی کتاب دے رہا ہوں جسے میں دو بار مکمل پڑھ چکا ہوں۔ زبان تو اتنی اچھی تو نہیں ہے۔ البتہ معنف کے خیالات بہت دلچسپ ہیں اور شاید "جس کتاب کو آپ نے دو بار پڑھ دیا ہے۔ تو یقیناً ..... عنایت کیجئے۔

میں خوشی سے پھولا نہ سمایا میں نے الماری میں سے ایک موٹی سی کتاب نکال لی جو میں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے بالکل سامنے ہی رکھی تھی۔ کتاب کو انہوں نے ہاتھوں میں لیا اور مسکرا کر کہنے لگے۔

"ارے یہی کتاب تو میں نے آپ کو دی تھی اور آپ وہی کتاب مجھے دے رہے ہیں ؟"

مجھے اسی وقت محسوس ہوا جیسے زمین اور آسمان ایک ساتھ گھوم رہے ہیں۔ مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو غلطی سے میں وہی کتاب اٹھا لایا۔

میں نے دوسری کتاب ان کے ہاتھوں میں تھما دی اور اپنی جان چھڑا دی۔

جو کتابیں مجھے میرے مہربانوں نے دی ہیں۔ اور جنہیں میں نے الماری میں اس طرح سجایا ہے کہ لگتے ہیں الماری میں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ کتابیں نہ میری خریدی ہوئی ہیں اور نہ مانگے کی۔ آج تک میں نے ان کتابوں کو نہیں پڑھا اور نہ ہی آئندہ کبھی پڑھوں گا۔ کبھی کبھی میں ان کتابوں سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہوں۔

تم کیوں آئی ہو میرے گھر؟

مجھے محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ مسکرا رہی ہوں اور کہہ رہی ہوں۔

اگر تم دنیا والوں سے یہ نہ کہتے کہ مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے تو ہم تمہارے گھر کیوں آتیں ؟

اگر تم اپنے شوق کا لوگوں پر اظہار نہ کرتے۔ تو یقیناً ہم کبھی تمہارے گھر نہ آتیں"!

اور مجھے محسوس ہوتا ہے ان کا دیا ہوا جواب سو فیصدی صحیح ہے۔

فراز عابدی

جُلاّب

ارشد پریشان حال گھر میں داخل ہوا۔ جلدی جلدی زینے طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ اور وحشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ دفعتہً وہ اور زور سے چیخنے لگا۔

"میں نے کہا، سنتی ہو! کہاں ہو تم؟ دوڑو جلدی... گیا گیا... لے چلا گیا...... ارے جلدی آؤ!......"

شاہدہ باورچی خانے سے بھاگی بھاگی آئی اس کے ہاتھوں میں سوکھا آٹا لگا ہوا تھا۔ اس نے ارشد کو دیکھتے ہی کہا۔

"کیا بات ہے؟ کیوں چیخ رہے ہو؟ آخر...... ہیں! یہ کیا ہوا تمہیں! اتنے پریشان کیوں نظر آرہے ہو۔؟"

بیگم! غضب ہو گیا۔ ہائے اب کیا ہوگا۔ مجھے سہارا دو! مجھے سہارا دو!!"

"ہائے اللہ کیا ہو گیا آپ کو! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"مجھے.... اوئے .... یہ دوڑا...... دوڑا... یہ بھاگا..... اب کیا ہوگا؟"

"کہاں دوڑا؟ کون بھاگا؟ آخر کچھ بتائیے بھی!"

"بیگم! مجھے چھپا دوڑا ہو گیا ہے۔ ہائے! یہ موذی مرض مجھے ہی ہونا تھا۔"

"چھپا دوڑا! یہ کیا چیز ہے؟"

"ارے مرض ہے مرض! اور کیا چیز ہے۔ نہایت بدتمیز مرض ہے یہ!"

"یہ کیسا مرض ہے؟ میں نے تو کبھی نہیں سنا۔"

"اب آپ نے نہیں سنا ہے تو کیا میں ایسی ہر بیماری کو لے کر دیکھوں یہ ہے۔ چھپا دوڑا ایسا کہ وہ مرض تو

جس نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔"

"خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو لیکن... لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ریاض بھائی......"

"آپ کا ذہن کچھ سمجھنے کے قابل ہو، جب نا سمجھ میں آئے گی کوئی بات۔ معلوم ہوتا ہے آپ کا دماغ فرشتوں نے اس مٹی سے بنایا ہے جہاں کوئی گدھا لوٹا تھا جبھی آپ کو ریاض بھائی کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہاں ریاض کے ذکر کا کون سا موقع تھا بھلا؟"

"اچھا جی، مجھ سے غلطی ہوئی۔ اب بتاؤ تو بھی یہ نگوڑی مارا چھپا دوڑا کیا بلا ہے؟"

"جو عجیب و غریب نہایت خوفناک مرض میں جکڑا ہوا آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔ اور آپ کو میری فکر سے زیادہ مرض کی نوعیت سمجھنے کی فکر لگی ہوئی ہے وہ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے......

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

لیکن آپ کو میرا انتقال ہی منظور ہے تو بسم اللہ! — یہ مرض..... دیکھو بیگم دیکھو!

یہ دوڑا.... سوئیں سوئیں کرتا ہے بیگم سوئیں سوئیں!"

"مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا کیسا دوڑا۔ کیا سوئیں سوئیں — چلئے کچھ دیر آرام کر لیجئے —"

شاہدہ نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔ اور اسے خوابگاہ کی طرف لے جانے لگی —

"ہاں میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اب آرام کہاں۔ اب تو نیند اور زندگی دونوں حرام ہو کر رہ جائیں گی۔"

"پریشان نہ ہوئیے۔ لیٹئے یہاں آرام کیجئے۔ میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔"

"نہ نہ نہ..... ڈاکٹر واکٹر بلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کوئی کم ڈاکٹر ہوں۔ دنیا میں کوئی ڈاکٹر ایسا نہ ہوگا جو خود ہی اپنا علاج کر سکے۔ مگر میں کر سکتا ہوں اپنا علاج"

"اے تم تو اچھے بھلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے........"

"دیکھئے اور سنئے! ہاں صاحب۔ اور سنئے کیوں ٹھیک ہی تو ہے۔ لوگو میری جان پر بن جائے جب تک میری ایک سانس بھی باقی ہے آپ کو شک شبہ ہی ہوگا میری صحت میں۔ حالانکہ داد دینی چاہئے تھی میری ہمت کو کہ اس حالت کے عالم میں بھی، ہوش و حواس کی باتیں کر رہا ہوں۔ آپ کی طرح نہیں کہ ذرا انگلی کٹ گئی تو چارپائی سے لگ کر بلبلانے لگیں۔ اور میں اچھے بھلوں کی سی باتیں کر رہا ہوں تو کیا چور، اچکوں، غنڈوں، بدمعاشوں کی باتیں کروں۔ آخر کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"تم نے تو اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ تم ہی کہہ رہے تھے کہ خدا نہ کرے تمہیں کچھ ہو گیا ہے اور بولے خوب جا رہے ہو۔ میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں۔ بولو کسے فون کروں — شرما کو کہ اقبال کو؟"

"نہ شرما کو نہ اقبال کو۔ شرما صاحب سے کہئے کہ وہ ابھی شرمائے رہیں۔ اور اقبال سے کہئے کہ وہ مشاعرہ اٹینڈ کرتے رہیں۔ میں خود اپنا علاج کر لوں گا۔"

"کوئی بھی اپنا علاج اپنے سے نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا ڈاکٹر کیوں نہ ہو۔"

"دیکھو مجھے تاؤ نہ دلاؤ! اچھا دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ لو۔ لاؤ برف کی تھیلی۔ اور وہ کیا کہتے ہیں کہ میرے دادا جان مرحوم کے دواؤں کا بکس اور........ اور........"

"میں کہتی ہوں کچھ دیر سو رہو۔ مذاق بہت کر لیا"

"استغفر اللہ! زندگی اور موت کے سوال کو مذاق سمجھتی ہو۔ خدا وہ دن جلدی لائے جب میرا انتقال ہو جائے ... دن۔ تاکہ تمہیں یقین ہو جائے۔ مگر للہ ... وقت دوائی

نہا بکس اور برف کی تھیلی لا دو۔ ورنہ کیا میں خود نہیں ...

"لاتی ہوں! خدا خیر کرے ...." شاہدہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دونوں چیزیں لئے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی۔

ارشد نے برف کی تھیلی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

"لاؤ اسے مجھے دو — ! — یہ لیجئے یہ تھیلی لائی ہیں برف کی! ارے صاحب اس میں برف کہاں ہے؟ کیا میں نے اس میں ہوا بھر کر فٹبال کی طرح اچھالنے کیلئے منگایا ہے —؟"

"توبہ ہے! خود ہی تو کہا تھا تھیلی لانے کے لئے۔ اب میں اس وقت برف کہاں سے لاؤں موئی —"

"نوکر سے منگاؤ۔ اور کہاں سے لاؤ گی برف! میں کب تمہیں ایرکنڈیشنڈ سمجھ کر اس تھیلی میں بند ہو جانے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ ایں ...... اور وہ کہاں ہے .... یعنی کہ وہ .... ایک سیسے کی نلی نہیں ہوتی ہے جس میں پارہ بھرا ہوتا ہے ....!"

"تھرمامیٹر کہتے ہیں اُسے! اتنا بھی تو نہیں معلوم اور ڈاکٹری پڑھنے کا دعویٰ خم ٹھونک کر کرتے ہیں۔"

"خم ٹھونک کر نہیں بلکہ کیل ٹھونک کر کرتے ہیں ہم ڈاکٹری کا دعویٰ۔ یعنی کہ کچھ غلط محاورہ بول گیا ہوں شاید۔ خیر ہوگا کچھ — تو برف نہیں آئی ابھی تک؟"

"منگواتی ہوں برف۔"

شاہدہ نے نوکر کو آواز دے کر برف لانے کے لئے کہا۔ نوکر کے جانے کے بعد ارشد نے کہا۔

"ذرا دیکھو تو تھرمامیٹر کدھر گیا۔ دیکھنا چاہئے کہ کتنا ٹمپریچر ہے مجھے معلوم نہیں کہ ایک سو چار ہے کہ ایک سو پانچ۔"

"ارے کہاں! اچھا بھلا تو بدن ہے تمہارا —"

"یہ بخار الٹا چلتا ہے بلکہ سرے سے چلتا ہی نہیں ہے، اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ اگر ڈاکٹری زبان میں کچھ کہوں گا تو بیوقوفوں کی طرح منہ تاکنے لگو گی ہمارا۔ بس جلدی سے تھرمامیٹر ڈھونڈو بیگم! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"دیکھو جی ایسی دل ہلا دینے والی باتیں نہ کرو۔ ہاں! میں ابھی ریاض بھائی کو فون کر کے بلاتی ہوں۔"

"پھر وہی ریاض! مجھ سے زیادہ تمہیں ریاض کی فکر کیوں ہونے لگی ہے آخر؟ ... کی موت کا شعر ہے یاد نہیں آ رہا ہے بس ذہن کو چھوتا ہوا گزر گیا ہے کیا خوب کہا ہے ...... لے لیجئے یاد آ گیا شعر! لیکن غضب تو یہ ہے کہ شاعر کا نام بھی یاد آ جائے۔ وہ ...... بھلا سا نام ہے ...... کچھ بیل بوٹے کی قسم کا یعنی کہ داغ دھبا ...... جی ہاں داغ ...... داغ کا شعر ہے اور بہت عمدہ شعر ہے کہ ...... کہ ...... لیجئے! بھول گیا شعر ... آہا ..... یاد آیا اور شاعر کا نام ہے ..... لاحول ولا قوۃ بھول گیا نام ..... ابھی ابھی ...."

"داغ کا شعر ہے وہ! اور کون سا شعر ہے یہ میں نہیں جانتی۔"

"جان بھی کیسے سکتی ہو۔ لال بجھکڑ تو ہو نہیں۔ بہر حال وہ شعر یہ ہے کہ ...... جی ہاں۔

ذکر مجنوں سے مرے آگ لگی جاتی ہے

گرچہ ظاہر ہے تمہارا وہ طلبگار نہ تھا"

"شرم نہیں آتی یہ شعر پڑھتے ہوئے!"

"لیجئے یہ شرمناک شعر ہو گیا۔ محترمہ! یہ اس شاعر کا شعر ہے جس کی قسم رند بلانوش تک کھاتے ہیں۔"

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ سراسر اتہام ہے۔ الزام ناروا ہے۔ آپ کو اپنے الفاظ واپس لینے ہوں گے۔"

"ہائیں ہائیں! تم تو میرے سامنے پارلیمنٹ کا نقشہ کھینچ رہی ہو۔ لیکن میں نے تو شعر کہا ہے۔ الفاظ کب کہے ہیں کہ واپس لے لوں۔"

"یہ زیادتی ہے خدا کی قسم! میں ... میں .... آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟"

"ا ..... ر ..... رے .... میرا یہ مطلب نہ تھا۔ اُف فوہ ..... بھئی بس بس! ..... واقعی وہ نہایت مہمل اور بے محل شعر ہے بلکہ بیہودہ سا شعر ہے۔ اب آنسو پونچھ ڈالو ... میں اس وقت نہایت خوفناک مرض میں مبتلا ہوں ورنہ ضرور تمہاری دیدہ جوئی کرتا .... نہیں .... اسے کیا کہتے ہیں ... اشک شوئی ... اشک شوئی کرتا تمہاری ......"

"بس تمہاری اسی معصومیت پر تو میں جان دیتی ہوں اور صبر کر لیتی ہوں کہ تمہارے پاس عقل ہے ہی نہیں تو سمجھداری کی باتیں کب کرو گے۔ سوچے سمجھے بغیر جو منہ میں آتا ہے بکے جاتے ہو —"

ارشد شاہدہ کو اتنی آسانی سے ہنستے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

"ہاں ہاں! بالکل یہی بات ہے۔"

"بلکہ ہنسی آتی ہے بعض وقت تمہاری حالت پر۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ ضرور آتی ہوگی ہنسی۔ تم میری خوش دامن جو ہو — ! کیا برف آ گئی؟"

"ہاں آ گئی — یہ کونے میں رکھی ہوئی ہے۔"

"اچھا تو بس جلدی سے تھیلی میں بھر دو!"

شاہدہ نے برف کے ٹکڑے تھیلی میں بھر کر تھیلی ارشد کی طرف بڑھا دی —

"ہاں ہاں ..... ٹھیک ہے۔ یہاں رکھو کنپٹی پر میری۔ اور ذرا دیکھو تو تھرمامیٹر کہاں ہے؟"

"لیکن ہوگا کیا؟ تمہارے کہنے کے مطابق بخار نہ اِدھر کھسکتا ہے نہ اُدھر۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا تو دواؤں کا بکس مجھے دے دو۔"

"نہ! اسے تو چھونے بھی نہ دوں گی۔ میں اس لئے لائی ہوں بکس کہ اسے دور ہی دور سے دیکھ کر خود کو تسلی دیتے رہو۔ اور جلدی سے اچھے ہو جاؤ۔ اب بتاؤ کہ یہ ماجرا کیا ہے؟"

"صاحب!" ارشد نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے چوبا روڈا ہو گیا —"

"یہ چوبا روڈا آخر ہے کیا بلا؟"

"بازوؤں میں چوبا روڈنے لگنا، اب سمجھیں! نہایت موذی مرض ہے۔"

"توبہ ہے! ارے بازو کی مچھلیاں بھر گئی ہوں گی —"

"پہلے تو میں بھی یہی سمجھتا تھا۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ دراصل چوبا دوڑتا رہتا ہے بازوؤں میں۔ بھلا ہو جمیل کا جس نے مجھے آگاہ کر دیا۔ میرے دادا مرحوم بھی اس شہر کے مانے ہوئے حکیم تھے۔

حباب

"جانچ"

میں نے ایک پٹرول پمپ پر پٹرول لینے کے لئے اپنی کار روکی۔ میری کار میں پٹرول ڈالا ہی جا رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی کار آ کر رکی۔ جسے ایک نہایت خوبصورت لڑکی چلا رہی تھی۔ کار رکتے ہی چار خادم کار کی طرف لپکے اور اس کی دیکھ بھال اور جانچ میں معروف ہو گئے۔ پانچواں خادم دور ہی کھڑا رہا اور اپنی جگہ سے بالکل نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ وہ اونچا، پورا اور خوبصورت نوجوان تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا آپ کسی چیز کی جانچ نہیں کریں گے؟"

"جی نہیں مجھے کسی بھی قسم کی جانچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کا شوہر ہوں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

آدم جی بانات والا ـــــــ بمبئی

○

"فرق"

میں بلڈنگ کنٹریکٹر ہوں اور تقریباً ۵۰ سال سے یہ میرا آبائی پیشہ ہے۔ پچھلے سال مجھے ایک پرانی بلڈنگ گرا کر اس کی جگہ ایک نئی بلڈنگ تعمیر کرنے کا کام ملا۔

میرے مزدور منتخب ہوتے ہیں۔ جو برسہا برس سے میرے پاس کام کرتے آئے ہیں۔ ایک دن کھانے کی چھٹی کے دوران ایک بوڑھا مزدور میرے پاس آیا اور بڑے غور سے ڈھائی ہوئی عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو چچا؟" میں نے پوچھا۔

"اس بلڈنگ کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ بلڈنگ آج سے تقریباً ۴۰ سال پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ اس وقت میری عمر ۲۰ سال تھی۔ اس کی تعمیر میں میں نے بھی مزدوری کی تھی۔ یہ جب بن رہی تھی تو مجھے ۲ روپے روز مزدوری ملتی تھی۔ اس وقت بنانے والا ٹھیکہ دار تھے۔ اب جب یہ ٹوٹ رہی ہے تو مجھے ۴ روپے روز مل رہے ہیں اور اس وقت تم ٹھیکہ دار ہو۔

محسن علی ـــــــ حیدرآباد

○

"بیج اور پھل"

جب میرا نوجوانی کا عالم تھا تو میں ہر اچھی اور بڑی چیز کا خواہاں تھا اور چاہتا تھا کہ میری ہر خواہش بہ عجلت ممکنہ پوری ہو جائے۔ میری یہ عادت دیکھ کر میرے خاندان کے ایک بزرگ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ ایک دن جب میں نے اپنے والد سے خواہش کی کہ مکان کے پچھواڑے میرے لئے ایک خوبصورت سا کمرہ فوراً بنا دیا جائے تو ان بزرگ نے میری عجلت پسندی پر بہت ساری نصیحتیں کیں۔ پھر بعد میں مجھے ایک قصہ سنایا۔ وہ قصہ کچھ یوں ہے۔

ایک رات انہوں نے خواب دیکھا کہ ان کے شہر میں ایک بڑی ہی خوبصورت دوکان نئی نئی کھلی ہے۔ وہ دوکان کے اندر گئے اور دیکھا کہ وہاں ایک فرشتہ انہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اس دوکان میں کیا چیز بکتی ہے؟"

"ہر وہ چیز جس کی آپ کو خواہش ہے۔" فرشتے نے جواب دیا۔

"ایسا ہے تو میری خواہش ہے کہ دنیا میں ہمیشہ امن رہے۔ اس زمین سے دکھ درد، آنسو، جھگڑا، بیماری سب دور ہو جائے۔" ان بزرگ نے کہا۔

"ذرا ایک منٹ۔" فرشتے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے۔ آپ ٹھیک طرح نہیں سمجھ سکے۔ ہم یہاں پھل نہیں صرف بیج بیچتے ہیں۔"

شہریار منصور ـــــــ سرینگر (کشمیر)

○

"خاندانی نام"

پتہ نہیں خاندانی نام کی بیماری انگریزوں کی لائی ہوئی ہے یا یہ ہمارے ہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ انگریزوں کے ہاں تو پورا خاندان مسٹر جیمز، مسز جیمز، ماسٹر جیمز اور مس جیمز ہوگا۔ ہندوؤں میں بھی پورا خاندان، پاٹیل، نائک، دیش مکھ وغیرہ جانا جاتا ہے۔ لیکن اب مسلمانوں میں بھی شیخ، پٹھان، صدیقی، انصاری وغیرہ ہونے لگے ہیں۔ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر آپ کوئی خاندانی نام نہ بتائیں تو آپ شاید شریف بھی نہیں مانے جا سکتے۔ تعجب کرنے کی منزل گزر چکی ہے۔ اس ضمن میں ایک بڑا پُر لطف واقعہ میرے ذہن میں ہے۔

جب میں زچگی کے لئے اسپتال میں داخل ہوئی تو میرے خسر میری خیریت دریافت کرنے کے لئے اکثر فون کرتے۔ دوسرے دن میری زچگی ہوئی اور کچھ ہی دیر بعد میرے خسر کا فون آیا۔ مجھ پر جو نرس مامور تھی اس نے فون رسیو کیا اور نام پوچھا۔ نام سنتے ہی اس نے کہا۔

"اوہ مسٹر شیخ! آپ کی بیوی کو ابھی ابھی بچہ ہوا ہے۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن میں اس کا شوہر نہیں ہوں، صرف خسر ہوں۔"

میرے خسر نے رکتے رکتے جواب دیا۔

کلثوم امین ـــــــ ناگپور

○

اسلامی سنسکرتی

پچھلے دنوں انجمن اسلام ہال میں ایک بڑی مبارک تقریب منعقد ہوئی۔ یہ تقریب ساٹھے گروجی کی مراٹھی کتاب اسلامی سنسکرتی (اسلامی تہذیب) کے حصۂ اول کی اشاعت کے موقع پر ہوئی۔

ساٹھے گروجی جنگ آزادی کے صف اول کے سپاہی تھے۔ آزادی کا عشق کئی بار انھیں جیل لے گیا اور جیل ہی میں انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ یہ آج سے کوئی ۳۰، ۳۲ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ مالی مشکلات کی وجہ سے یہ مفید کتاب اب تک شائع نہ ہو سکی تھی۔ لیکن حکومت مہاراشٹر کی امداد کے آئی اور یہ مفید کام انجام کو پہنچا۔

یہ تقریب پونا کے مراٹھی اخبار، سادھنا، سادھنا پرکاشن، راشٹر سیوا دل اور روزنامہ اجمل کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اول الذکر تینوں ادارے ساٹھے گروجی کی یادگار ہیں۔ ساتھ ہی ساٹھے گروجی نے راشٹریہ سیوا دل قائم کیا تھا۔ انھوں نے اس زمانے میں قومی وحدت کے لئے بڑا کام کیا۔ ملک اور قوم کے مختلف فرقوں میں ہم آہنگی قائم کرنے کی جو کوششیں کیں اُن کا زندہ ثبوت راشٹر سیوا دل اور راشٹریہ سیوا دل جیسے مضبوط اداروں کی صورت میں موجود ہے۔

راشٹریہ سیوا دل۔ ہفت روزہ سادھنا۔ سادھنا پرکاشن اور راشٹر سیوا دل آج بھی کام کر رہے ہیں اور انھیں بھی مشکلات پیش آتی ہیں جو ادارے رواداری کے لئے ہیں۔ لیکن یہ خدمت وہ نبھا رہے ہیں زندہ ...

تقریب کا آغاز قرآن کریم کی تلاوت سے ہوا۔

جناب معین الدین حارث ایڈیٹر اجمل نے اپنی افتتاحی تقریر میں کتاب کو بہت سراہا اور کتاب سے زیادہ ساٹھے گروجی کے اُس جذبے کو جس کی وجہ سے یہ کتاب وجود میں آئی۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب جو سیرت نبوی پر مشتمل ہے۔ اس قدر عقیدت و احترام سے لکھی گئی ہے کہ اس کے مصنف پر ایک زہد و تقوے سے بھرپور کامل مسلمان ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔

مراٹھی کے نامور مصنف پروفیسر این۔ آر پاٹھک نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی تہذیب کو سراہتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے متعلق ہندوؤں کو شبہ ہے کہ وہ صرف فاتح اور ظالم تھے جن کا کام ملک گیری کا ہوس اور خون ریزی تھا۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا اور یہاں ایسے ایسے کام کئے جن سے ہندوستان کی خوبصورت تاریخ عبارت ہے۔ مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب کا نقش ہندوستان کے چپے چپے پر اور دوام اور حسن لئے ہوئے ہے۔

سیتو مادھو راؤ پگڑی نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغلیہ دور حکومت میں اس قسم کے کام ہوئے۔ سنسکرت میں اسلامی موضوعات پر کتابیں ملتی ہیں۔ ... کے جذبات کو فروغ دینے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

جناب ڈی۔ اے۔ اے فیضی صدر جلسہ نے کتاب کی خوبیوں کو اجاگر کیا۔ مراٹھی نہ جاننے کے باوجود ... نے کتاب دوسروں سے پڑھوا کر سُنی۔ انھوں نے کہا کہ ایک ہندو نے اسلامی موضوع پر بڑی ہی خوبصورت کتاب لکھی ہے لیکن کسی مسلمان کی ہندو مذہب کے موضوع پر اتنی خوبصورت کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری۔

صہبا جائسی

غزل

ٹوٹنے کو تو غمِ دہر نے لوٹا اب تک
میں وہ شیشہ ہوں کہ پتھر سے نہ ٹوٹا اب تک

زہر دیتی رہی ہر گام پہ دنیا ہم کو
دامنِ زیست تو ہاتھوں سے نہ چھوٹا اب تک

ان سے مل آیا مگر سوچ رہا ہوں اب بھی
تم کیوں بچھڑا ہے کیوں ساز ہے ٹوٹا اب تک

کیا کیا تم نے جو اس طرح خجل ہوتے ہو؟
میرا احساس تھا جس نے مجھے لوٹا اب تک

دشتِ پُر خار سے کہتے ہیں یہ دنیا ہم کو
آبلہ دل کا مگر پھر بھی نہ پھوٹا اب تک

تو رواں ہے منزل بھی چھپی ہے پیچھے
گردشِ بخت ترا ساتھ نہ چھوٹا اب تک

موج و گرداب سے شکوہ تو نہیں کوئی صہبا!
مجھ کو بے مہریٔ ساحل نے ہی لوٹا اب تک

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ، ۱۸۹ سعادت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد | ۲۰ جنوری ۶۵ء | شمارہ ۸

اس شمارے میں

قیمت

فی کاپی [illegible] سالانہ [illegible]

ایڈیٹر

[illegible]

ان دس دنوں میں

- ماسکو میں بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں کا اجلاس شروع ہوا جس میں شروع ہی میں چین نے روس کے خلاف معاندانہ رویّہ اختیار کیا۔
- صدر ایوب نے چین کا سات روزہ دورہ شروع کیا۔
- پرجا سوشلسٹ پارٹی کے مسٹر ناتھ پائی نے پارلیمنٹ میں اُس خفیہ رپورٹ کی کاپی پیش کی جو پولیس اور مرکزی وزارت کی خفیہ ایجنسی نے اڑیسہ کے دو سابق وزرائے اعلیٰ مسٹر بیجو پٹنائک اور مسٹر بیرین مترا کے خلاف تیار کی تھی۔ رپورٹ میں دونوں کو بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دیا گیا تھا۔ حکومت اب تک ان رپورٹوں کو صیغۂ راز میں رکھے ہوئے تھی۔
- پارلیمنٹ میں سردار سورن سنگھ نے بیان کیا کہ پاکستان نے ہندوستانی علاقہ کچھ کے کچھ حصّے پر قبضہ کر لیا ہے۔
- بمبئی ہائی کورٹ کے ایک فیصلے میں کہا گیا ہے کہ ہر ہندوستانی شہری کو پاسپورٹ حاصل کرنے اور بیرونی ممالک کا سفر کرنے کا بنیادی حق حاصل ہے۔ حکومت پاسپورٹ دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔
- کیرالا کے وسط مدتی انتخابات میں بائیں بازو کے کمیونسٹوں نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں۔ کانگریس بری طرح ہار گئی۔ لیکن مکمل اکثریت کسی بھی پارٹی کو حاصل نہیں ہوئی۔
- کشمیر میں استصواب رائے محاذ کے چوٹی کے لیڈر گرفتار کئے گئے۔
- ماسکو کے امریکی سفارت خانے کو چینی طلباء کے ہنگاموں سے بچانے کے لئے روسی حکام نے جو قوت استعمال کی اس پر چینی حکومت نے سخت احتجاج کیا ہے۔ اور روس کو معافی مانگنے کے لئے کہا ہے۔
- امریکہ کی بحری فوج کا ایک بیڑا ویت نام پہنچ گیا۔
- کانگریس نے کیرالا میں اپوزیشن پارٹی کی حیثیت سے کام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔
- لوک سبھا میں حکومت کے خلاف دوسری مرتبہ تحریک عدم اعتماد پیش ہوئی۔

ممتاز راشد

غزل

پھر تصور ان کی جلوہ گاہ تک پہنچا تو ہے
ذہن و دل کی تیرگی میں چاند اک ابھرا تو ہے

سولیوں کے لب سے ہو، یا ہو گلوئے دار سے
ہم نے اس کے عشق کا نغمہ مگر گایا تو ہے

ساعتوں کی دھوپ، گھڑیوں کی تپش، لمحوں کی آنچ
تیری زلفوں سے بچھڑ کر ہم نے یہ پایا تو ہے

رنگ لائی کشتگانِ زندگی کی خامشی
شہر میں ہر سمت اُس کے ظلم کا چرچا تو ہے

کھو گئے یادوں کے آہو دشتِ ماہ و سال میں
اب بھی لیکن سنگِ ماضی سے لہو رِستا تو ہے

کیا ہوا گر اس کا پیراہن نہ رنگیں کر سکے
خونِ دل کو صرف کرنے کے لئے صحرا تو ہے

ہر نفس زہراب، ہر لحظہ بلائے جاں سہی
اے نگارِ زندگی پھر بھی تجھے چاہا تو ہے

صبیحہ علی

سادہ ورق

پڑا ہے میز پہ کب سے یہ ایک سادہ ورق
قلم اُداس نگاہوں سے تک رہا ہے مجھے
کتابیں شلف میں مُردوں کی طرح بے حس ہیں
ہر ایک چیز پہ جیسے جمود طاری ہے
نہ منظر اب کے دلا میں نہ سیتر اب سکا ہے
وہ ایک ننھی سی چڑیا کا گھونسلہ جس سے
خیال و فکر کا ہر سلسلہ ملا یا تھا
بساطِ ذہن پہ خاکہ ساکہ بنایا تھا
کسی درندے نے کل سلسلہ وہ توڑ دیا
مرے خیال، مری فکر کو جھنجھوڑ دیا
کہیں سے کاش وہ چڑیا پھر آج آ جائے
ہر ایک ٹوٹا ہوا سلسلہ مِلا جائے
حسین نظم کا عنوان ہی بنا جائے
پڑا ہے میز پہ کب سے یہ ایک سادہ ورق

شاہد سلیم

غزل

اب ذکرِ جفاؤں کا سرِ عام کریں گے
ہم شہر میں ظالم تجھے بدنام کریں گے

ٹھہری ہے جو ضد کی تو سر اٹھائے بلا سے
جس کام سے روکو گے وہی کام کریں گے

محرم ہیں تری آنکھ کی گردش کے جو اے شوخ!
وہ کیا گلۂ گردشِ ایام کریں گے

ہم بے سر و ساماں ہیں تو کیا؟ شرخیٔ خوں سے
آپ آئیں تو تزئینِ در و بام کریں گے

جینا ہے تو یہ شام و سحر آ کے جلا دیں
مر کے کہاں تک سحر و شام کریں گے

یہ درد نہ ٹھہرے گا، کہو دل ہی ٹھہر جائے
تڑپے ہیں بہت دیر اب آرام کریں گے

میخانہ بنا لیں حرم و دیر کو تا کہ بس
آرام سے پھر شغلِ مے و جام کریں گے

وہ کسی سرکاری دفتر میں کلرک تھا۔ ناٹا۔ کسی قدر موٹا اور چیچک رو۔ اس کے بال گہرے لال تھے۔ آنکھیں معمولی دھندلی اور بے چمک۔ چندیا بالکل گنجی، بالکل انڈے کی طرح اور بے رحم زمانہ اس کے گالوں پر جھریوں کی شکل میں اپنے اثرات چھوڑ گیا تھا۔ اس کا نام تھا۔ اکاکی اکاکیوچ۔

کہتے ہیں وہ بڑی بڑی گھڑی میں پیدا ہوا تھا۔ اپنے بپتسمے کے دن ہی اس نے بڑے عجیب ڈھنگ سے منہ بنا کر جماہی لی تھی۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اسے ساری عمر کسی سرکاری دفتر میں کلرکی کرنی پڑے گی۔

اکاکی کب اور کس طرح اس دفتر میں ملازم ہوا اور کس نے اسے کام دیا۔ یہ کسی کو بھی یاد نہیں۔ بڑے بڑے صوبہ دار اور کلکٹر آئے اور چلے گئے لیکن وہ وہیں کا وہیں رہا اور صرف ایک ہی کام کرتا رہا۔ نقل نویسی۔ اس کے ساتھی کلرک اور افسر کہا کرتے کہ اکاکی ہاتھ میں قلم لئے ہی پیدا ہوا تھا۔ وہ بھی گنجے سر اور سبز اوورکوٹ کے ساتھ۔

دفتر میں اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔ جب وہ دفتر میں داخل ہوتا تو اس کے ساتھی کلرک ایسا ظاہر کرتے گویا کوئی مکھی دروازے میں گھس رہی ہو۔ افسر تو اس کی طرف دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ہیڈ کلرک کا اسسٹنٹ بھی کاغذ قلم اس کے سامنے پھینک کر حکم دیتا کہ فوراً اس کی نقل کر دو اور اکاکی بغیر کچھ کہے وہ کام ہاتھ میں لے لیتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ اس کو کاغذات دینے کا حق ہے بھی یا نہیں۔

دفتر کے تمام چھوٹے بڑے کلرک اس کا مذاق بنانے میں اپنی اپنی خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا کرتے۔ ان لوگوں نے تو یہ افواہ بھی پھیلا رکھی تھی کہ اس کی بوڑھی مالکن اسے پیٹتی ہے۔ کچھ کلرک ردی کاغذ کی گولیاں بنا بنا کر اکاکی کے گنجے سر پر نشانہ بازی کی مشق کیا کرتے۔ لیکن ان کی یہ تمام حرکتیں اس کے کام میں خلل نہ ڈال پاتیں۔ وہ بت سا بنا بیٹھا رہتا۔ بڑی حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس مخالف ماحول کے باوجود اس کے کام میں کبھی کوئی غلطی نہیں پائی گئی۔

اکاکی جیسا محنتی اور کام کو ہی اپنا سب کچھ سمجھنے والا دوسرا آدمی ملنا مشکل تھا۔ نقل نویسی سے تو اسے ایک پیار سا ہو گیا تھا۔ وہی اس کی دنیا تھی۔ جب نقل کرنے کے لئے کاغذات اس کی میز پر ڈال دیے جاتے تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتیں۔ رسم الخط کے چند حرفوں سے تو ایک دلی لگاؤ تھا مانو وہی اس کے سگے سمبندھی ہوں۔ ہر حرف کو لکھتے وقت وہ ایسے نازو انداز سے منہ بناتا۔ پلک جھپکاتا اور ہونٹوں کو چباتا کہ اگر کوئی چاہتا تو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ہی ایک ایک حرف پڑھ لیتا۔

اس کی محنت سے خوش ہو کر ایک رحمدل کلرک نے اسے ایک نئے قسم کا کام دیا۔ اسے ایک دستاویز پڑھ کر شہنشاہ زار کے لئے ڈرافٹ تیار کرنے کیلئے کہا گیا۔ یہ آسان کام تھا لیکن اکاکی اپنی تمام تر کوششوں کے بعد بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا جسم پسینے سے لرزنے لگا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے خوشامدانہ لہجے میں افسر سے کہا۔

"سر! مہربانی کر کے مجھے تو نقل کرنے کا ہی کام دیجئے۔"

اکاکی نہ کبھی کپڑوں پر دھیان دیتا اور نہ ہی کھانے پینے پر۔ اس کے رشتہ داروں کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اور اس کے طور طریقے ایسا لگتا۔ جیسے وہ اس وسیع دنیا میں اکیلا آیا ہے اور اکیلا ہی جائے گا۔

دفتر سے گھر لوٹتے ہی وہ کھانے کی میز پر جا بیٹھتا اور بڑی جلد بازی سے کام لیکر سوپ اور کچی پیاز کے ساتھ ڈبل روٹی کے بڑے بڑے نوالے نگلتا۔ کھانے کے فوراً بعد ہی دفتر سے لائے ہوئے کاغذات کی نقل کرنے بیٹھ جاتا۔ جس رات دفتر کا کوئی کام نہ ہوتا وہ کوئی پرانا اخبار لیکر بیٹھ جاتا اور ردی کاغذ پر اس کی نقل کرنے لگتا۔

ہر شام جب سینٹ پیٹرس برگ کے دوسرے کلرک موج کر رہے ہوتے تب اکاکی ردی کاغذ پر حرفوں کی قواعد کرایا کرتا۔ ایسا آدمی ڈھونڈے سے نہیں ملتا تھا۔ جس نے اکاکی کو خدا کی دی ہوئی کھلی ہوا میں سیر کرتے ہوئے دیکھا ہو

سینٹ پیٹرس برگ میں چار سو روبل تنخواہ پانے والوں کا سب سے بڑا دشمن ہے شمال کی جانب سے آنے والا برفیلا کہرا۔ امیر لوگ بھلے ہی اسے صحت افزا مانتے ہوں۔ لیکن غریبوں کے لئے تو اس سے بڑا جان لیوا کوئی نہیں۔ سویرے آٹھ نو بجے کے بیچ گلیاں دفتر جانے والے ان ہزاروں کلرکوں سے بھری ہوتیں جو اس کہرے کا کوئی علاج نہیں پاتے

انتظار نعیم

غزل

دل میں ہزار زخمِ تمنا پڑے رہے
ہم تھے کہ مسکرانے کی ضد پہ اڑے رہے

ہم پر سزائے شوق کی تکمیل ہو گئی
زنداں میں اس کے بعد سے تالے پڑے رہے

بچھڑے تھے جس مقام پہ ہم اُن سے ایک دن
تا عمر دل جلائے وہیں پر کھڑے رہے

ہم بھی کسی غریب کے نخلِ امید تھے
فصلِ بہار میں بھی جھڑے کے جھڑے رہے

کیا جانے کس کے گھر میں چراغاں ہو انعیم
ہم کو تو ایک شمع کے لالے پڑے رہے

عبد ال[illegible]

غزل

ستارۂ گل ہو کہ برگِ سمن عزیز نہیں
غمِ فراق میں حسنِ چمن عزیز نہیں

سکوں کی آس میں یہ اضطراب پیہم کیوں؟
مجھے خرد کا یہ دیوانہ پن عزیز نہیں

کمالِ فکر ہے حسنِ عمل کی بیداری
زوالِ فکر ہو جس میں وہ فن عزیز نہیں

نئے چراغ جلاتے چلو فضاؤں میں
یہ تیرہ بختیٔ شامِ وطن عزیز نہیں

نظر میں جنتِ قدِ یار گر نہ ہو آزاد
نگاہِ شوق کو سروِ چمن عزیز نہیں

آس پاس پولیس کا پہرہ بٹھا دیا گیا۔ لیکن بھوت نے جب ان کا بھی گلا دبا دیا تو وہ بھی بھاگ نکلے۔

ادھر کمشنر بھی اسی دن سے بیمار اور پژمردہ رہنے لگا جس دن اس نے اکا کو دھتکارا تھا۔ میز پر رکھے سرکاری کاغذوں پر اسے اکا کا کالا اور ڈراونا چہرہ منڈلاتا ہوا نظر آتا۔

ایک رات کمشنر اپنے ایک دوست کے گھر سے دعوت سے لوٹ رہا تھا۔ اس نے خوب شراب پی رکھی تھی۔ اس کا بنگلہ سنسان سڑک پر [illegible] تھا۔ یکایک کمشنر کو محسوس ہوا کسی نے پیچھے سے اس کی گردن پکڑ لی ہو۔ اسے اپنا شکاری پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ یہ اکا کا بھوت تھا۔

جب بھوت نے بولنے کے لئے منہ کھولا تو کمشنر کے خوف کی حد نہ رہی۔ "معاف کر دو" کہتے ہوئے بے ہوش ہو گیا۔

"نہیں، میں تو بدلہ لوں گا .... تمہارا لہو پی لوں گا۔" اور بھوت کا قہقہہ رات کے سناٹے میں گونج اٹھا۔

کمشنر جب گھر پہنچا تو اس کا سارا جسم پسینہ سے تر تھا۔

اس رات کے واقعہ کے بعد سے ہی کمشنر کے برتاؤ میں بہت فرق آ گیا تھا۔ وہ اپنے [illegible] بھول گیا تھا۔ اب اسی رات سے کالی پہاڑ والا بھوت بھی غائب ہو گیا۔ اب کسی کو ستائے جانے کی شکایت نہیں آتی۔

بھوت کے جسم پر کمشنر کا [illegible] آ گیا تھا۔

○

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد | یکم مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۳

اس شمارے میں

★

قیمت
ایک سال دس روپے
فی پرچہ تیس پیسے

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

یہ سچ ہے کہ
"دورِ حیات" کے موجودہ ڈھانچے سے نہ تو قارئین ہی مطمئن ہیں نہ منتظمین۔
ایسی صورت میں بار بار ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ ــــــ اسے
جاری کیوں رکھا جائے ؟

واقعی اہم اور غور طلب بات ہے ــــــ اسے کیوں جاری رکھا جائے !
اس سوال کا سر دست جواب دینا دشوار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم نے
افادیت یا خدمت کے بڑے دعوے نہیں کئے ہیں۔ اپنے میدان میں امامت کا بھی اعلان
نہیں کیا۔ اس لئے کچھ حد تک ہمارا ضمیر ضرور مطمئن ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ اردو کے موجودہ رسائل و اخبارات کے معنوی معیار پر نظر پڑتی ہے
تو محسوس ہوتا ہے کہ "دورِ حیات" نے اب تک جو مواد پیش کیا ہے اس کا بڑا حصہ سنجیدہ، صاف
اور بے لاگ تھا۔ اس قابل تھا کہ اسے قابل فخر سمجھا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک المیہ سے کم نہیں
کہ انہی قابل فخر اسباب کی بنا پر "دورِ حیات" کی مقبولیت اس معیار پر نہ پہنچ سکی جہاں پہنچ کر
اس کی مالی دقتیں اور پریشانیاں ختم ہو کر منفعت بخش صورتیں ہو سکتیں۔ ان حوصلہ شکن
حالات کے تحت پھر وہی سوال اٹھتا ہے ــــــ اسے کیوں جاری رکھا جائے ؟
کیا واقعی "دورِ حیات" کوئی خدمت انجام دے سکتا ہے ؟ اگر دے سکتا ہے
تو کیا ؟ کیا "دورِ حیات" کے جاری نہ رہنے سے کوئی خاص نقصان پہنچے گا ؟ اگر
پہنچے گا تو کیا ؟

ہم چاہتے ہیں کہ اس سے قبل کہ ان سوالوں کے ہم جواب دیں۔ ہمارے قارئین
نہایت صفائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

○

رفیق عابد (دہلوی)

غزل

جمالِ آفتابِ صبحِ خنداں ہے جہاں میں ہوں
بہارِ نزہتِ شامِ گلستاں ہے جہاں میں ہوں
کمالِ جلوۂ ماہِ درخشاں ہے جہاں میں ہوں
عروجِ لذتِ وکیفِ شبستاں ہے جہاں میں ہوں
وہی ہے وادیٔ ایمن، وہی ہے طورِ سینا بھی
تمہاری شمعِ حسنِ جلوہ ساماں ہے جہاں میں ہوں
تری چشمِ عنایت ہے، محبت ہے، مروت ہے
مرے بازو پہ زلفِ عنبر افشاں ہے جہاں میں ہوں
امنگیں ہیں، عزائم ہیں، جوانی کے کرشمے ہیں
تری آنکھوں میں کوئی اذنِ پنہاں ہے جہاں میں ہوں
وہی وحشت وہی جوشِ جنون و آبلہ پائی
دریدہ دامن و چاکِ گریباں ہے جہاں میں ہوں
مرے باغِ تخیل میں بہارِ غنچہ و گل ہے
بہ[illegible]ت [illegible] طبعِ غزلخواں ہے جہاں میں ہوں
[illegible] مینا اُبلتی ہے، وہیں ساغر اچھلتے ہیں
[illegible] درِ شرابِ گل بداماں ہے جہاں میں ہوں
برہمن بتکدہ بردوش غم ہے میرے پاؤں پر
وہیں شیخِ حرم کی چشم حیراں ہے جہاں میں ہوں
مری گرد رہِ دیوانگی ہے سرمۂ دانش
خرد کی تابنا کی مجھ پہ قرباں ہے جہاں میں ہوں
وہیں تقدیر ڈھلتی ہے، وہیں تدبیر بنتی ہے
بحمداللہ علاجِ درد و حرماں ہے جہاں میں ہوں
نیاز و ناز و سوز و ساز کی ہے محفل آرائی
بہار آگیں جمالِ حسن ساماں ہے جہاں میں ہوں
جہاں سے اُٹھ چلی توقیرِ شیخ و برہمن عابد
نہ ہندو ہے نہ اب کوئی مسلماں ہے جہاں میں ہوں

○

نریش کمار شاد

"بیچارگی"

وہ تیرگی ہے کہ جس کی نہیں نظیر کوئی
نہ ہم صفیر کوئی ہے نہ دستگیر کوئی
ترے سوا یہاں اپنا نہیں مشیر کوئی
مگر تو آپ ہے بے آس کیا کیا جائے
تو ہی بتا دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

شراب کہتے ہیں جس کو وہ ایک تلخ سی شے
سُنا تھا شدتِ غم کا علاج ہوتی ہے
ہمیں تو آ نہ سکی راس کیا کیا جائے
تو ہی بتا دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

جہاں ہو ایک جہاں مبتلائے درد وہاں
خود اپنے درد کا احساس کیا کیا جائے
تو ہی بتا دلِ پُر یاس کیا کیا جائے

○

اردو کے حامیوں کیلئے لمحۂ فکریہ

احمد فاطمی

سرکاری زبان کے سوال پر دکھن میں ہندی کے خلاف ہنگامہ آرائی کے بعد اردو کی آواز بھی اردو حلقے سے بلند ہونا شروع ہوئی ہے۔ اردو اپنا جائز مقام دستور میں حاصل کر چکا ہے۔ لیکن کشمیر اور آندھرا پردیش کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصے، خصوصاً شمالی ہند کے راج کاج میں اس کی جگہ لے ہونا ابھی باقی ہے اس لئے اردو حلقوں کی طرف سے اس کے لئے جد و جہد جاری رہے، یہ مناسب بھی اور ضروری بھی ہے۔

راست اقدام

اس سلسلہ میں دستخطوں کے ذریعہ راشٹرپتی کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ مرکز اور صوبوں میں وزراء سے وفدوں نے ملاقاتیں کر کے اردو کے مقدمہ کو پیش کیا ہے اور بعض حلقوں نے ناکامی کی صورت میں "راست اقدام" کرنے تک کی دھمکی دی ہے۔ ہمارا قیاس ہے کہ سیدھی کارروائی کی تجویز کو اردو کے سنجیدہ طبقے کی حمایت حاصل نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اردو والوں نے اردو کے لئے سیدھی لڑائی چھیڑ دی، تو اس کا انجام ویسا نہیں ہوگا، جیسا جنوبی ہند میں انگریزی کی حمایت کرنے والوں کی تحریک کا ہوا۔ بلکہ اس بالکل وہی حشر ہوگا۔ جو پنجاب میں ماسٹر تارا سنگھ کی پنجابی تحریک کا ہو چکا ہے۔

جہاں تک اردو کے کیس کا تعلق ہے، اس مقدمہ میں تین فریق ہیں۔ (۱) اردو کے حامی (۲) اردو کے مخالف اور (۳) حکومتیں۔ ان تین فریقوں کے علاوہ ایک چوتھا غیر متعلق گروہ ایسے لوگوں کا ہے جن کو زبان کے جھگڑے سے کوئی خاص مطلب نہیں اور جو طبعاً نیک، شریف اور انصاف پسند ہیں۔ اردو کی تحریک اگر اردو کے مخالفوں کو رام کرنے میں کامیاب ہو گئی اور ملک کے منصف مزاج طبقے کو اپنا ہم نوا بنا سکی تو اردو کے مطالبہ کو کوئی حکومت ٹال نہ سکے گی۔

دو غلطیاں

اردو اس ملک کی زبان ہے اور اگر سرکاری رپوٹ کو قابل وثوق مان لیا جائے، تو آج بھی یہ اس ملک کی ڈھائی کروڑ سے زیادہ شہریوں کی زبان ہے۔ جس زبان کے بولنے والے اتنی بڑی تعداد میں موجود اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہوں جس زبان میں ادب کا، کلچر کا، مذہب کا، تصوف کا، تاریخ اور فلسفہ کا اتنا بڑا سرمایہ موجود ہو اسے اس کا جائز حق اب تک کیوں نہیں ملا؟ اس کا تجزیہ کرتے وقت صرف مخالفوں کے فرد جرم پر ہی نہیں، بلکہ اپنی کوتاہیوں پر بھی نظر رکھنی چاہئے ماضی کے آئینہ میں حال کا جائزہ لے کر ہی مستقبل کے لئے کوئی صحت مند راہ ہم سوچ سکیں گے۔

اردو کے ہم دردوں نے ماضی میں دو بڑی غلطیاں ایسی کی ہیں جن کا نتیجہ آج اردو کو ہندوستان میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔

پہلی غلطی تو یہ ہوئی کہ مسلم لیگ نے زبان کی سطح سے ہٹا کر اردو کا رشتہ اسلام اور پاکستان کے مطالبہ سے جوڑ دیا اور اردو والوں نے اس غلط روش کے خلاف کوئی قابل ذکر احتجاج نہیں کیا اور دوسری نادانشمندی ان سے یہ ہوئی کہ ہندوستانی کی مخالفت کر کے انھوں نے گاندھی جی کا ساتھ چھوڑ دیا۔ ہندوستانی کی حمایت میں گاندھی جی کی تحریک اور تقریروں کے حوالے اردو حلقے آج کثرت سے پیش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بھولنا نہیں چاہئے کہ قومی زبان کے بارے میں گاندھی جی کے خیالات کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ وہ اس زمانے میں بھی منظر عام پر آئے تھے۔ جس زمانہ میں ظاہر کئے گئے تھے اور اس وقت وہ لغو اور لایعنی سمجھے گئے تھے۔ اس ضمن میں بابائے اردو کی تلخ نوائی آج بھی بہتوں کو یاد ہوگی۔

دو دعویدار

ہندوستان کی قومی زبان کی دعویدار یہاں کی دو زبانیں — ہندی اور اردو۔ تھیں گاندھی جی نے ایک بیچ کا راستہ ہندوستانی۔ تجویز کیا اور انڈین نیشنل کانگریس نے۔ جو ان دنوں ہندوستان کے قومی جذبات کی آئینہ دار اور ہندوستانی رائے عامہ کی نمائندہ تھی، اس تجویز کو منظور کیا۔ اس کے بعد "ہندی، ہندو، ہندی" کا نعرہ بلند کرنے والے دال میں نمک کے برابر بھی نہیں رہ گئے تھے۔ لیکن جب مسلم لیگ نے اردو کو مسلمانوں کا مذہبی اور سیاسی مسئلہ قرار دیا اور پاکستان کا اس کا مطالبہ بھی منظور ہو گیا تو ملک کے ایک بڑے گروہ کا۔ جو پہلے ہندوستانی کے حق میں تھا، سوچنے کا انداز بدل گیا۔ اس نے اس منطق سے کام لیا کہ اب کہ ملک کا بٹوارہ ہو چکا اور ایک مسلم ریاست بن گئی، تو ہندوستان سے اردو کا کیس بھی ختم ہو چکا ہے۔ گاندھی جی اور جواہر لال جی ہندوستانی کا مقدمہ لڑتے رہے، لیکن اردو والے پہلے ہی انہیں چھوڑ چکے تھے۔ ہندی والوں کا بھی ایک بڑا گروہ زبان کے معاملہ میں ان کا ہم نوا نہیں رہ گیا تھا۔ نتیجے میں ہندوستانی کی جگہ ہندی کا اس ملک

نرس یا کھلایا

جناب ... کے ... (byline partly illegible)

لیکن اس سے پہلے کہ ببل کے تفریحی ملاقاتی گھڑیوں میں جاکر بیٹھ جاتے، شعور نے بہت اچھے طرز سے سنجیدہ لہجے میں بول اٹھا۔

ببل کیا تمہاری پٹائی سخت ہوئی اور تمہاری کھال ادھڑی اور تم رو بھی پڑے تھے۔

نہیں جی! مجھے تو ان لوگوں نے ذرا بھی زور سے نہیں مارا۔ کھال ادھڑنا تو ایک طرف رہا" ببل نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

ارے بچو! لیکن تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہاں کی خوب پٹائی ہوا کرتی ہے۔

یہ تو ہے ہی۔ لیکن اب کی بار تو ان لوگوں نے عملاً گویا (مجھے پیٹا ہی نہیں۔ بس جتلانے کے لئے مجھے چند کوڑے لگائے تو ہیں وہ بھی اس لئے کہ تمہاری ماتا جی نے ان کو حکم دیا تھا کہ مجھے کوڑے لگائے جائیں۔

لیکن انھوں نے جو کوڑے لگائے وہ اتنے ہلکے تھے کہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے مجھے کوڑے لگے ہی نہیں اس کے لئے مجھے پیٹنے والے افسر کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ اسے مجھ پر بڑا ترس آیا اور اس نے جلادوں کو اشارہ کر دیا تھا کہ مجھے ہلکے کوڑے لگا دئے جائیں۔ لیکن بھیا اتنا خیال رہے کہ کہیں اپنی ماتا جی کو یہ بات نہ بتلا دینا۔ بس انہیں اسی غلط فہمی میں رہنے دو کہ میری گت ٹھیک ٹھیک ہو گئی ہے۔

اے میرے شیر پیڈ شپ مین۔ شاباش۔ وہ کتنا سیانا ہے۔ لیکن ببل میری پٹائی تو ہر طرح ہوئی تھی۔

ببل نے پیارے لڑکے کے سر کو تھپ تھپایا اور کہا میں جانتا ہوں۔ میں نے تمہاری آواز سنی تھی۔ اس کا مجھے بہت دکھ ہے لیکن اب ان باتوں کا نتیجہ؟ بس جو ہو چکا وہ ہو چکا۔

کچھ دیر تک تو دونوں چپ رہے۔ فیدو چاہتا تھا کہ اب تاش کا وہ کھیل کھیلا جائے جسے روسی زبان میں (DURAK) دورک یا احمق کہتے ہیں لیکن شعور اجو کسی اور ہی الجھن میں تھا بولا۔

تو ببل تمہارا خیال ہے کہ ممی نہیں جانتیں کہ انھوں نے کوئی بھول کی تھی۔"

ہو سکتا ہے کہ وہ نہ جانتی ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جانتی تو ہوں لیکن وہ یہ پسند نہ کرتی ہوں کہ کسی معمولی آدمی کے سامنے اپنی بھول ظاہر کریں۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جانتے ہیں کہ ان سے فلاں بھول ہو گئی مگر پھر بھی مانتے نہیں۔

میں سمجھا تو گویا ممی جانتی نہیں کہ تم بھلے آدمی ہو اور اسی کارن سے وہ تمہیں پسند نہ کرتی ہوں یہاں کے لوگوں کے جانچنے اور پرکھنے کی ریت ہے لیکن اس کارن سے تمہیں اپنی ماتا جی سے ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ عورت ذات ہیں اور عورتوں کے ہم مردوں کے بارے میں کچھ اور ہی وچار ہوتے ہیں۔ وہ کسی شخص کو سیدھے سادے طور سے ناپ ہی نہیں سکتیں لیکن خیر خدا نے چاہا تو وہ وقت بھی آئے گا کہ وہ جان جائیں گی کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ اور وہ دیکھ لیں گی کہ میں ان کے بیٹے کی دیکھ بھال کتنی اچھی ریت سے کرتا ہوں۔ اسے کہانیاں سناتا ہوں۔ اور اسے کوئی ایسی بات نہیں سکھاتا جو نہیں سکھانی چاہئے۔ اور ہم دونوں کی خاصی اچھی نبھ رہی ہے۔ ان کا ماتا جی اول ان باتوں کو ضرور مانے گا۔ سکھنتر لی جی کیونکہ ان کو اپنے لڑکے سے محبت ہے اس لئے وہ اپنے لڑکے کے کھلائے سے بھی محبت کرنے لگیں گی لیکن "بڑے میاں" ہر بات اپنا وقت لیا ہی کرتی ہے اور خدا وقت آنے پر لوگوں کو دانا بنا ہی دیا کرتا ہے۔ اس لئے جانی اپنی ماتا کے خلاف دل میں برا خیال لانا چھوڑ دو۔"

اس نے اپنی بات کو پورا کیا۔

شکر ہے کہ ببل کے ان الفاظ نے شعورا کی آنکھوں میں ان ماں کو کسی حد تک بڑا کر دیا۔ ان باتوں سے وہ خوشی سے بھر گیا اور برے خیالوں کے منجدھار سے صاف بچ نکلا۔ بے اختیار ہو کر اس نے ببل کو چوم لیا اور بڑے بھروسہ کے ساتھ بولا کہ "ببل یقیناً ماتا جی تمہیں پسند کرنے اور پہچاننے لگیں گی۔ اس کا مجھے پکا یقین ہے۔"

فیدو اس بارے میں بچے کی طرح زیادہ پُر امید نہ تھا۔ پھر بھی اس نے بچے کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اور شعورا جوش و خروش سے بولتا چلا گیا۔

ببل تب تو یہ بڑا کارنامہ ہو گا۔ اور ممی پھر کبھی تم کو پٹائی کے لئے چھاؤنی نہ بھیجیں گی اس کی جگہ وہ اس بدذات کرن کو وہاں کر دیں گی۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہمیشہ تمہارے خلاف ماتا جی کے کان بھرا کرتا ہے۔ مجھے تو اس سے گھن آتی ہے۔ جب ماتا جی مجھے مار رہی تھیں تو یہی ظالم ہے جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ ڈیڈی کو آنے تو دو میں کرن کے سب کرتوت ایک ایک کر کے ان کو بتاؤں گا۔ اگر میں ایسا کروں تو یہ میری بھول تو نہیں ہوگی۔ ببل" اچھا تو یہی ہے کہ تم ایسا نہ کرو۔ بھیا سکھنتر لی ٹھیک تو یہی ہے کہ کسی کی شکایت نہ کی جائے۔ ایسی حرکتوں سے

شبنم حسین

پیپل دیوتا جاگ پڑا

اتوار کی چھٹی کے بعد اس روز جب پہلی پالی کے مل مزدور مل کے احاطے میں داخل ہوئے تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پیپل کا پیڑ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ سرے سے غائب تھا۔ سو برس پرانا پیڑ۔ جس کی شاخیں مل کے احاطے کے باہر فٹ پاتھ پر بھی سایہ کرتی تھیں۔ اور جس پر بستی کے آدھے پرندوں کا بسیرا تھا۔ وہ ایک روز پیشتر تو مل کے احاطے میں کسی نیم خوابیدہ انسان کی مانند دھیرے دھیرے اپنی شاخیں جھلاتا ہوا اونگھ رہا تھا۔ مگر آج یوں غائب تھا جیسے کبھی وہاں پر تھا ہی نہیں۔

زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

سب ہکا بکا اور پریشان کھڑے تھے۔

جذباتی طور پر مجروح اور نیم پاگل سے۔ وہ روز اپنی پالی شروع کرنے سے پیشتر اس پیپل کو نمسکار کرتے تھے۔ مل کی چنگھاڑتی ہوئی دیو ہیکل مشینوں کے چنگل سے بچنے کی دعائیں مانگتے تھے۔ اس کے تنے کے گرد نہ معلوم انکی کتنی مرادوں، تمناؤں اور آرزوؤں کے کچے سوت لپٹے ہوئے تھے۔ اس کی جڑوں میں نہ معلوم انکی عقیدت اور بھگتی کا کتنا سیندور مہک رہا تھا۔ وہ پیپل دراصل ان کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا تھا۔ اس کی چھاؤں میں [illegible] کام کے دوران کسی مشین سے چھوٹی موٹی رگڑ لگ جاتی تو اسکی چھال کو گھس کر پلستر باندھتے تھے۔ اور اگر کسی کے لڑکے کا جنیئو یا منڈن سنسکار ہوتا تو منتظمین کی اجازت حاصل کرکے وہاں ہون کراتے تھے۔ اور بینڈ باجے بھی بجاتے تھے۔

اور اب سب کے سب حیران ششدر کھڑے تھے کہ آخر ہوا کیا۔ پیپل دیوتا کہاں انتردھیان ہو گئے۔ مگر وہاں کی تازہ تازہ کھدی ہوئی نرم نرم زمین یہ بتا رہی تھی کہ یہ اچانک آج کل میں ہی ہوا ہے۔

اچانک مجمع میں سے کسی نے غراتی ہوئی آواز میں کہا! ہو نا ہو۔ یہ کسی میاں بھائی کا کام ہے۔ وہی اس پیپل کو دیکھ کر ناک بھوں سکیڑتے تھے!"

مگر اس سے مجمع کی تشفی نہ ہو سکی۔ حالانکہ وہاں جو دو چار مسلمان کھڑے تھے وہ اپنی چمڑی بچانے کے لئے وہاں سے فوراً نو دو گیارہ ہو گئے۔

جوں جوں یہ اسرار گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کا صبر و تحمل بھی چھلک کر آنکھوں سے باہر آ رہا تھا۔ اور مٹھیاں بھنچتی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اگر کچھ دیر تک اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس پیپل دیوتا کی ہتیا کرنے والا دشٹ آخر کون ہے تو یہ لوگ آپس ہی میں ایک دوسرے پر جھپٹ پڑیں گے۔

یکبارگی بھیڑ میں سے کوئی پھر چلایا۔ بھائیو ـــ یہ کام تو

"کون کرشنان ـ بونس ہضم؟"

"ہاں ہاں وہی۔ وہی جو پرسوں بار بار سیٹھ کے آفس کے اندر باہر گھوم رہا تھا۔" اس کے ساتھ ہی سب کی نگاہوں میں اس بونس ہضم کرشنان کنٹریکٹر کا چہرہ گھوم گیا۔ بڑی بڑی اور گھنی مونچھوں سے لدا ہوا سیاہ اور بدہیئت چہرہ۔ جو بہترین قسم کے جدید لباس کا سنگار پا کر بھی کوئی خوشگوار تاثر چھوڑنے سے معذور تھا۔ مل کا مالک ہمیشہ اس سے مل کے احاطے میں کچھ نہ کچھ کراتا ہی رہتا تھا۔ کبھی کچھ بنواتا تو کبھی کچھ تڑواتا۔ اور اٹھنی کا کام کراتا تو دس روپے کی رسید لیتا اور مل کے مزدوروں کو ہمیشہ یوں لگتا جیسے اس کنٹریکٹر کا وجود ایک تیز قینچی کے مترادف ہے۔ جس سے انکی بونس کی مستقل طور پر کتر بیونت ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے سب لوگوں نے اس کا نام ہی بونس ہضم کنٹریکٹر رکھ چھوڑا تھا۔

اب جو اس کا نام آیا تو اس کے تئیں لوگوں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور وہ ابل کر آنکھوں میں اتر آئی۔

"ٹھیک ہے ـ" کوئی دوسرا چلایا! "اس نے تو پیپل ہتیا بڑا پنیہ سمجھ کر کی ہوگی!"

"وہی بار بار کہتا تھا کہ یہ کیا مل کے دروازے پہ پیپل کا جھاڑ لگا لیا ہے۔ دنیا بھر کے پرندے بیٹ کرتے ہیں۔ اور ٹرافک الگ جام ہوتی ہے!" کسی اور کی آواز آئی۔

"ہاں ہاں ـــ اسی نے سیٹھ کو الو بنایا ہوگا" دو چار ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ "تو پھر

کچھ لوگوں نے اپنی دھوتیاں کستے ہوئے کہا؛ "اس نے پیپل چبایا ہے۔ تو اپ سب مل کر اسے بھی نرک میں پہنچا ئیں گے۔ سالا کرسٹان کا بچہ، اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟"

یقین تو لوگوں کو ہو ہی چکا تھا۔ مجمع کے تیور بدلتے دیکھ کر اس بیچارے دس پانچ کرسٹان مزدور تھے وہ بھی ادھر ادھر چھٹ گئے۔ پھر کسی کا ہاتھ جوتے پر پڑا تو کسی کا سڑک کے کنارے لگے ہوئے اینٹوں کے ڈھیر پر۔ اور مجمع کی اس وحشیانہ بھگدڑ سے خوفزدہ ہو کر دونوں طرف کی دوکانیں جلد ہوتی چلی گئیں۔

جب یہ مل قائم ہوئی تھی تو پیپل کا پیڑ مل کے احاطے کے باہر تھا۔ مل کا احاطہ چوکور تھا۔ صرف اس پیڑ کے پاس آکر ہی ذرا سا دبک کر اندر کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہیں پر مل کا گیٹ تھا۔ اور اس کے عین سامنے پیپل دیوتا براجمان تھے۔

اس زمانے میں یہاں پر ایک ناگا مہاراج کا ڈیرا تھا۔ دن بھر بھجن کیرتن ہوتا رہتا۔ اور بھنگ گھٹتی رہتی۔ چرس اور سلفے کے دم لگتے رہتے اور کبھی کبھی تو یہ جمگھٹا اتنا بڑھتا کہ مل کے اندر آنے جانیوالی لاریوں کا راستہ ہی بند ہو جاتا اور ڈرائیور بھی نیچے اتر کر بھنگ گھونٹنے میں مشغول ہو جاتے۔ اور مل کے مالک کو خود ہی گیٹ پر آکر بنتی کرنا پڑتی؛

"مہاراج ذرا سا لاری گذرنے کی راہ بنا دیجئے بڑی کرپا ہوگی!"

"سیٹھ جی۔ لاری کے راستے کے لئے اتنا گڑگڑاتے ہوئے کوئی چرسی لہر میں آکر جواب دیتا؛ "کبھی مکتی کی راہ بنانے کی بھی سوچی ہے!"

"وہ تو آپ کے چرنوں میں بیٹھنے سے ہی بن جائیگی مہاراج!"

"تو پھر کیوں ہمارے چرنوں کو دکھ دیتے ہو!"

کوئی بھنگیڑی کھلکھلاتا؛ "کھڑا رہنے دو لاریوں کو اب نہیں تو شام کو گذر جائیں گی!"

اور یہ سچ مچ ان بھنگیڑیوں اور چرسیوں کے رحم و کرم پر ہی تھا۔ ان کا موڈ ہوتا تو لاریاں گذر جاتیں۔ نہیں تو گھنٹوں مل کی ٹرانک جام پڑی رہتی۔ اور پولس کی مداخلت کروانے کی جرات سیٹھ میں بھی نہیں تھی۔ فضا بگڑ جاتی تو اسی وقت سورگ کی راہیں کھل جاتیں۔

انہی دنوں ناگا مہاراج کا دیہانت ہو گیا۔ ان کا ایک چیلا تھا؛ پچیس چھبیس سال کا کڑیل جوان۔ جو پیپل دیوتا کا ان کھا کھا کر مستان ہو رہا تھا۔ کچھ دنوں تک اس نے بھی یہ بھجن کیرتن اور بھنگ چرس کی محفل جمائے رکھی۔ مگر پھر ایک روز چپکے سے محلے کے ایک حجام کی بیوی کو بھگا کر نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا۔

اور اسکے فرار ہوتے ہی بستی میں جیسے ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ لوگوں نے اپنی بہو بیٹیوں کی پیپل پوجا بند کر دی۔ جو لوگ بھجن کیرتن کے بہانے بھنگ چرس کے سرور میں ڈوبے رہتے تھے۔ انھوں نے دوسرے ڈیرے بسا لئے اور کچھ ہی دنوں میں پیپل دیوتا کی دیکھ ریکھ بھگوان کے بھروسے ہو گئی۔

اسی کھلبلی کے دوران مل کے مالک نے بڑا دور رس کام کیا۔ بستی کے سبھی بڑوں بوڑھوں کی پنچایت بلائی اور کہا کہ پیپل دیوتا کی نگہبانی کا کوئی بندوبست کریں نہیں تو اس کا پاپ ساری بستی کو لگے گا۔

پنچایت بڑی دیر تک سر جوڑ کر اس کا کوئی سادھان تلاش کرنے میں مصروف رہی۔ مگر انکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر مل کے مالک نے خود ہی ایک سادھان انکے سامنے رکھا؛

"اگر آپ لوگ اس کا سمرتھن کریں تو میں میونسپلٹی سے مل کر یہ پیپل استھان مل کے احاطے میں ہی شامل کر لوں۔"

"ٹھیک ہے؛" کسی نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا؛ "اس طرح اس پیپل استھان کی دیکھ ریکھ بھی ہوتی رہیگی اور یہاں پر ایرے غیرے لوگوں کا جماؤ بھی نہیں رہے گا۔"

یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی۔ بلکہ یوں کہیئے کہ من ہی من میں سب کو اپنے اپنے حصے کے پاپ سے نجات مل گئی۔ اور مل کے مالک نے پیپل استھان کو مل کے احاطے میں شامل کر کے احاطے کی دیوار کو سیدھا کر لیا۔

اس طرح دیوار تو سیدھی ہو گئی۔ اور چرسیوں اور بھنگیڑیوں کا اڈہ بھی جاتا رہا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی۔ پیپل دیوتا کے مل کے احاطے کے اندر چلے آنے سے مل کے مزدوروں میں پیپل پوجا کا زور بڑھ گیا۔

لوگ ڈیوٹی پر تو وقت پر چلے آتے تھے۔ مگر اسکے بعد جو پیپل پوجا کرنے اور منتیں مرادیں مانگنے والوں کی قطار لگتی۔ وہ کبھی ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھی۔ جن لوگوں نے پہلے کبھی پیپل دیوتا کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا ہو گا وہ بھی اپنی آرزوؤں امنگوں کا کوئی نہ کوئی تاگا لئے ہوئے پیپل دیوتا کے شرن میں بڑے مزے سے شستاتے رہتے۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ستیہ نارائن کی پوجا ہو جاتی دو چار مرتبہ

بھی کیر کن ہو جاتا۔ اور مل کی پالی چالو ہونے
کے باوجود نیم تعطیل کا سا سماں بنا رہتا۔

اور مل کے مالک کی اس معاملے میں رنگ
ٹوک کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اگر لوگ مشتعل ہو جائیں
تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس پریشان کن صورت
حال نے اسے بڑے شش و پنج میں ڈال دیا۔

انہیں دنوں مل مالک کے کُل پروہت ہری
دوار کی تیرتھ یاترا سے واپس لوٹے تو ایک روز
مل مالک نے ڈرتے ڈرتے ان سے یہ ساری داستان
کہی۔ کُل پروہت کچھ دیر تک من ہی من میں کچھ
سوچتے رہے۔ پھر بولے: اگر ایسی ہی بات ہے
سیٹھ جی تو پھر چپیل دیوتا کا جل پرواہ کیوں نہیں
کرا دیتے؟

"مگر یہ پاپ تو نہیں ہوتا!" مل مالک نے
بات کو کریدنے کی غرض سے پوچھا۔ "نہیں —
بالکل نہیں — " کُل پروہت نے کہا۔

"میرا مطلب ہے —، سیٹھ جی نے ذرا
ہچکچاتے ہوئے پوچھا: کہیں لوگ بگڑ نہ جائیں"
کُل پروہت سمجھ گئے۔ مسکرا کر بولے: اس کا
بھی سادھان ہو جائے گا۔"

اور در اصل کُل پروہت صرف مل مالک
کے ہی گرو نہیں تھے پوری مل کے گرو تھے۔ مل
کے مزدوروں کو ان پر بھی چپیل دیوتا کے جتنا ہی
وشواس اور بھروسہ تھا۔ جب وہ آتے
تھے تو سبھی لوگ ان کا آشیرواد حاصل کرتے تھے
اس لئے ان کے دلاسے سے مل مالک کے اعتماد
اور حوصلے کو بڑی تقویت پہنچی۔

اور اسی سنیچر کی رات کو جب مل کی آخری
پالی ختم ہو گئی اور مزدور اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
تو چپیل دیوتا کو مل کے احاطے سے لے جا کر سمندر کی
اتھاہ لہروں میں سمو دیا گیا۔

مشتعل مزدوروں کا یہ ہجوم مل کے احاطے سے نکل
کر کچھ دیر تک تو جھلائے ہوئے سانڈوں کی مانند یوں
ہی ادھر ادھر لپکتا رہا۔ جو کچھ ان کے سامنے آیا یا تو خاک
میں مل گیا یا ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ وہ ہر شے کو یوں سمار
کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے جیسے ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر
اس میں سے اس پولس ہضم کرسٹان کنٹریکٹر کو تلاش
کر رہے ہوں۔

مگر جب ان کا یہ اشتعال آہستہ آہستہ تکان آلود
ہونے لگا اور وہ کرسٹان کنٹریکٹر انھیں کہیں نظر
نہ آیا تو انکے غصے اور قہر میں الجھن کی لکیریں ابھرنے
لگیں...

آخر ان میں سے ایک بولا؟ بھائیو۔ کیوں نہ ہم
سیٹھ کے بنگلے پر چلیں۔ وہاں سے ہمیں اس کرسٹان
کا پتہ ضرور مل جائے گا؟

"ٹھیک ہے —" کوئی دوسرا بولا: "اور اس
سیٹھ مردود سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں۔ یہ گل کھلانے
میں اس کا ہاتھ ضرور ہو گا:

"کچھ ملی جلی آوازیں آئیں: "چلو —!" اور
اس کے ساتھ ہی جیسے انکی الجھن اور تکان سے بھرپور
غصے اور اشتعال کو پھر سے ایک نیا بہاؤ مل گیا۔ اور سب
چیختے چلاتے نعرے لگاتے ہوئے مل مالک کے بنگلے کی
طرف چل دیئے۔

جب وہ بنگلے کے سامنے پہنچے۔ تو جیسے انکے غصے
پر اوس سی پڑ گئی وہاں راگ رنگ ہو رہا تھا۔ اور جشن
منایا جا رہا تھا۔ جیسے سیٹھ جی کو چپیل دیوتا کی کوئی فکر ہی
نہ ہو...!

سب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اور مٹھیاں بھینچتے
ہوئے انھوں نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا:

"چپیل دیوتا کی جے!"

یہ نعرہ گویا انکی طرف سے مل مالک کے بنگلے پر
حملے کا اعلان تھا۔

مگر دوسرے ہی لمحے کُل پروہت بھی بنگلے کے
دروازے پر نمودار ہوئے اور انھوں نے بھی اسی
شدت سے جواب دیا: "چپیل دیوتا کی جے!"

سب لوگ الجھن کے مارے سن سے ہو گئے۔
انکی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کُل پروہت کی آواز ہے۔
یا انکی اپنی آواز ہی بنگلے سے ٹکرا کر لوٹ آئی ہے۔

اس لئے انھوں نے دوسرا نعرہ لگایا:

"چپیل دیوتا امر رہیں!"

اسی دوران میں بنگلے کے دروازے پر بھی کچھ
اور لوگ بھی جمع ہو چکے تھے۔ ان سب نے مل
مل کر جواب دیا۔"

"چپیل دیوتا سدا امر رہیں!"

سارے ہجوم پر گویا استعجاب کی اوس پڑ گئی۔ سب
لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کہ آخر یہ
کیا ماجرا ہے۔

اسی دوران میں کُل پروہت نے اپنے دونوں
ہاتھ استقبالیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے کہنا شروع
کیا: "بھائیو شبھ آگمن۔ اندر چپیل دیوتا کے جل
پرواہ کا یگیہ ہو رہا ہے۔ آئیے اور اس میں شامل
ہو کر اپنا پرلوک سنوار لیجئے:

یہ سن کر سب کچھ دیر تک شش و پنج میں گھرے
رہے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ اندر جانا چاہئے
یا نہیں پھر کسی نے دبی دبی سی آواز میں پوچھا: "مگر چپیل دیوتا کا جل پرواہ کیوں کرایا گیا؟" "بھائیو مل کے دھوئیں اور شور سے آلودہ فضا میں چپیل دیوتا کا نواس دھارمک درشٹی سے ٹھیک نہیں رہا ہوگا [illegible]
سمجھاتے ہوئے کہا۔ اس لئے میں نے سیٹھ جی کو جل پرواہ کا مشورہ دیا تھا — اور اسکے بعد یہ سارا [illegible] جیسے [illegible] کو دیکھا [illegible] کوئی [illegible]
قائم [illegible] بڑے [illegible] رہا ہو۔

یگانگی کی ایک مثال

ریاست مدراس کے تنجور ضلع کے ایک اہم قصبہ کمبا کونم سے پانچ میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی آبادی تین ہزار افراد سے کچھ ہی زیادہ ہے۔ ان میں سے دو تہائی کے قریب ہندو اور تقریباً ایک ہزار مسلمان ہیں یہ لوگ مدتوں سے بڑی ہی باہمی محبت کے ساتھ رہتے چلے آ رہے ہیں اور ان کے درمیان اس قدر ہم آہنگی ہے کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ باشندے دو مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں جدید زندگی کے انتشار پسند رجحانات نے ان پر اثر نہیں لیا اور اب ان لوگوں نے پرامن مذہبی بقائے باہم کی ایک مثال قائم کی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ یہ لوگ جدید زندگی کی آسائشوں سے محروم ہوں یہ سہولتیں تو انھیں بھی ترقیات کی تیز رفتار اسکیموں کی بدولت حاصل ہو چکی ہیں۔

اس گاؤں میں اور اس کے آس پاس اچھی سڑکیں موجود ہیں گاؤں میں بجلی اور پانی کا انتظام ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی کے اس جذبے کے مقابلے میں ضمنی چیزیں ہیں جو سارے قصبہ کی فضا میں بسی ہوئی ہے۔ اتحاد کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے اس عظیم تجربہ کا مرکزی نقطہ اور علامت ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کا افتتاح آپ راشٹرپتی ڈاکٹر ذاکر حسین نے کیا۔ گرد و نواح کے گاؤں میں چند مسجدیں ہیں جن میں سے ہر ایک بذات خود فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ایک پیغام ہے ان میں گوونداکڈی کی مسجد خصوصی امتیاز کی حامل ہے۔ یہ ان سب میں تازہ ترین ہے لیکن جو چیز دلچسپی کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ ڈھائی لاکھ روپیہ جو اس مسجد کی تعمیر میں صرف ہوا ہے اس کا اچھا خاصہ حصہ غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں نے اور سیلون اور ملائشیا ایسے ملکوں میں مقیم ہمارے وطنی بھائیوں کو عطیات سے حاصل ہوا ہے۔ خود مسجد کی تعمیر کے کام میں گاؤں کے ہر شخص نے بلا لحاظ ذات عقیدے یا مذہب کے ہاتھ بٹایا ہے۔

تقریباً دو سال قبل یہاں ایک پرانی مسجد تھی۔ چونکہ بہت شکستہ تھی لہذا ۱۹۵۸ میں گاؤں کے باشندوں نے اس پرانی مسجد کی جگہ ایک نئی مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی سال سے انتظامات شروع کر دیئے گئے۔ اور تعمیر کا کام ۱۹۶۰ میں شروع کر دیا گیا مسجد کا مجموعی رقبہ تقریباً ۷۰۰۰ مربع فٹ ہے اور نماز کا خاص دالان تقریباً ڈیڑھ ہزار مربع فٹ رقبے میں ہے اس کے دو مینار ہیں جن میں ہر ایک کی لمبائی فرش سے لے کر ۵۵ فٹ ہے۔

گوونداکڈی ہندوؤں کے نزدیک ایک متبرک اور مقدس مقام ہے جس کا نام پرانی کتابوں میں کمبوزم آیا ہے۔ اس کے قریب شیواجی کا ایک مندر بھی ہے۔

تاریخی اعتبار سے گوونداکڈی کا نام ۱۷ویں صدی کے اوائل کے ایک مقامی انسان دوست بزرگ گوند کشت کے نام پر پڑا ہے۔ جن کو اپنے دور کا سب سے زیادہ ممتاز شخص سمجھا جاتا تھا۔

اپنی بات

اس شمارے میں افسانے مضامین غزلیں شامل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین دورحیات شامل اشاعت مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ہم نے اپنے قارئین سے وعدہ کیا ہے کہ اب بہت جلد ہم دورحیات کو وقت کا پابند بنائیں گے مگر افسوس ہے کہ ہم آج تک ایسا نہ کر سکے۔ کسی پرچے کا وقت پر نہ نکلنا دراصل پرچے کے ایڈیٹر اور نگراں ... کے نام پر ایک بدنما داغ ہے۔ ہم اپنی پریشانیوں کا رونا رو رو کر اپنے کرم فرماؤں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہماری پریشانیوں نے ہمیں ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے کہ اگر ہماری جگہ پر کوئی دوسرا ہوتا تو شاید مجبوراً اسے اشاعت بند کر دینی پڑتی اور ہم خود بھی بنیادی طور پر اسی فیصلہ کن نقطے پر پہونچ چکے ہیں مگر ... قارئین کے خطوط سے .... ہماری ٹوٹی ہوئی آس پھر سے بندھ جاتی ہے۔ ذہن میں پھر ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے ایک نئی امنگ ہمارے دلوں میں مچلنے لگتی ہے اور پھر ہم ...... پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ تقریباً سولہ سترہ سال پہلے زبان اردو پر جو ستم توڑا گیا ہے اور ہنوز جو سلسلہ جاری ہے اردو ادب کے پرستاروں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ادب و فن کی اس ناقدری کے زمانے میں جبکہ شستہ ذہن و دماغ رکھنے والوں کا دائرہ سکڑتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ سستے اور گھٹیا قسم کے ادب نوازوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہو کسی ہمت مند پرچے کو کن دشوار گذار مراحل سے گذرنا پڑتا ہے سنجیدہ دل و دماغ رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم ایکبار پھر قارئین سے وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ان کا تعاون اسی طرح ہمارے شامل حال رہا تو ان شاء اللہ ہم دو تین اشاعتوں میں دورحیات کو وقت کا پابند بنا لیں گے اور ہم فخر کے ساتھ یہ بھی کہہ سکیں گے کہ انشاء اللہ دورحیات اپنے معیار کو قائم رکھے گا۔

پندرہ روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ - ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۳

جلد ۴ | ۱۰ ، ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء | شمارہ ۱۴-۱۵

اس شمارے میں

سالانہ — دس روپے
فی پرچہ — تیس پیسے

★

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

مقدس یاد

۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا منحوس دن تاریخ ہند میں ایک ایسا المیہ ہے جس کو بیان کرنا یا احاطۂ تحریر میں لانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ آج ہی کے دن ہماری جنگ آزادی کے سورما پنڈت جواہر لال نہرو کو موت کے بیرحم ہاتھوں نے ہم سے چھین لیا اور ہمارے دلوں میں ناسور ڈال دئے۔

آج انھیں ہم سے بچھڑے ہوئے پورا ایک سال ہوگیا۔ اس دوران میں ہم نے ماضی کی کتنی ہی تلخ وارداتوں کو اپنے لوحِ دل سے چھیل کر پھینک دیا ہوگا۔ لیکن نہ بھلائی جاسکی تو پنڈت جی کی مقدس یاد جو اگرچہ سوہانِ روح ہے لیکن مشعلِ عمل بھی ہے۔ کتنے ہی گھاؤ مندمل ہوگئے ہوں گے مگر نہ بھرا تو وہ ناسور جو مجاہدِ آزادی کی موت نے بے وقت ہمارے دلوں کو تفویض کیا۔ وہ ناسور آج بھی ہرا ہے اور ہمیشہ ہرا رہے گا۔ لیکن مشعلِ عمل ہمیں جو مقاصدِ زندگی بتائے ہیں اگر ہم ان کے نقشِ قدم پر چل کر ان مقاصد کو پورا کرتے رہیں تو کارزارِ عالم میں ہم سرخرو رہیں گے اور ہمارے امن اور شانتی کے پھریرے کی خنک ہوائیں اکنافِ عالم میں عطر بیزیاں کریں گی۔

یہ سچ ہے کہ ہم ان کی مقدس یاد کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے اور نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان کی یاد ایک روشنی ہے جو مصیبت کی تاریک راتوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اُن کی مقدس روح آج ہم سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ بھارت کے ہونہار سپوتو! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ترقی کے انتہائی مدارج پر فائز ہوکر دنیا میں نام روشن کرو۔ تو تم میرے اس مشن کو پورا کرو جسکو میں نے تمہارے درمیان چھوڑا ہے۔ سیکولرزم اور جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط کرو جن کی آبیاری میں نے اپنے خونِ دل سے کی ہے۔ صوبائی اور نسلی امتیازات کی بنیادیں ڈھا دو جن کے انہدام میں میں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اہنسا اور عدم تشدد کی پالیسی کا دامن چھوٹنے نہ پائے۔ مادرِ ہند کی عزت و وقعت کے لئے آخری قطرۂ خون تک نچھاور کردو۔ سراسیمگی اور حیرانی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دو اور مشکل سے مشکل مہم کو سر کرنے کے لئے عزم و حوصلہ بلند رکھو۔ کام کرو۔ آرام حرام ہے۔ اپنے کو اونچا کرو۔ قوم کو اونچا کرو۔ ملک کو اونچا کرو اور ذہن و دماغ کو ہر طرح کی کثافتوں سے پاک رکھو۔ آج بھی پنڈت جی کی روح کا یہی پیغام ہے۔ اور یہی مطالبہ ہے۔

آل احمد سرور

برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے

غیر مذہبی ریاست کو حقیقت بنانے کیلئے ایک طنز

وہ خود ہی توڑتے ہیں رشتۂ محبت کو / یہ چاہتے ہیں مگر جذب باہمی بھی رہے

جبیں پہ گرد کدورت نظر میں نشتر ہوں / دلوں میں مہر و اخوت کی چاندنی بھی رہے

پرانے گیتوں کی آواز تا فلک پہنچے / نئے ترانوں کی لیکن ہماہمی بھی رہے

حقیقتیں جو بہت تلخ ہیں تو کیا غم ہے / نگاہ لطف کی ہلکی سی چاشنی بھی رہے

خود اپنے قتل پہ راضی نہ ہوں جو دیوانے / ستم کے ساتھ کچھ افسون دلبری بھی رہے

یہ جان و دل سے ہوں جمہوریت کی شیدائی / اقلیت میں کچھ احساس کمتری بھی رہے

شریک بزم ہوں سب جام چند تک پہنچے / برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے

کچھ اور سخت ہوں عہد عتیق کے بندھن / نئے زمانے سے یونہی سی دوستی بھی رہے

سیاہ رات کی زلفیں سنوارنے والے / یہ کہہ رہے ہیں کہ ہاں دن کی روشنی بھی رہے

ہیں بادلوں کی ستاروں سے سازشیں کیا کیا
کہ ساتھ نور کے ظلمت کی ساحری بھی رہے

کام۔ وقت کی آواز

پیسے کی آگ

پرکاش تعلیم یافتہ تھا۔ ذہین تھا، جوان ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھا۔ لیکن پھر بھی اسے نوکری کہیں سے نصیب نہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس نے بمبئی کے ہر دفتر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن اسکی اپنی قسمت کے تمام دروازے بند ہو چکے تھے۔ لیکن وہ چونکہ بہت نوجوان تھا۔ شکست تسلیم کرنا اسکی فطرت سے باہر تھا۔ لہٰذا اس نے امید کا دامن نہ چھوڑا اور نوکری کی تلاش میں وہ بدستور بھٹکتا رہا، بھاگتا رہا۔ لیکن اسے ہر مقام سے مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔

گردش حالات نے پرکاش کے ستاروں کو اپنی آغوش میں یہاں تک مبتلا کر رکھا تھا کہ اس کی مالی حالت بالکل جواب دے گئی اور اس کی زندگی کی طرح اس کی جیبیں بھی بالکل خالی ہو گئیں۔

پرکاش کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ خدا نے انسان کے دل میں امید کا چراغ روشن کر کے اسے کس قدر دھوکے میں رکھا ہے۔ حالانکہ اسکی اپنی حالت دن رات کے فاقوں سے بالکل خراب ہو چکی تھی۔ مسلسل فاقہ کشی نے اسے نحیف و لاغر بنا ڈالا۔ جسم کا تمام گوشت پوست جد و جہد و کشمکش کی نذر ہو گیا اور ہڈیاں باہر کی جانب نکل آئی تھیں لیکن پھر بھی پرکاش اپنے عزم کا پکا تھا۔ وہ ہر نئی مصیبت کو مسکراتے ہوئے گلے سے لگاتا اور حالات کی سرد مہری اور زمانے کے تھپیڑے ہنستے ہنستے برداشت کرتا۔ صرف اچھے آنیوالے وقت اور دنوں کی امید پر۔ درحقیقت اسی امید کے سہارے وہ زندہ تھا۔

لیکن آج وہ تین روز سے بھوکا تھا۔ ان تین دنوں کے دوران اناج کا ایک دانہ بھی اسکے پیٹ میں نہیں گیا تھا۔ وہ پانی کو چائے روٹی سمجھ کر گزارا کرتا رہا، پیتا رہا۔ اپنی طاقت بھوک سے شکست خوردہ کو حوصلہ دیتا رہا۔ اور آج صبح جب وہ بستر سے جو اٹھا تو نقاہت کے باعث اسکی ٹانگیں بری طرح لرز اٹھیں اور بمشکل اس نے خود کو گرنے سے سنبھالا۔ پرکاش نے اسی وقت ایک مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر اسے آج کہیں نوکری نہ ملی تو وہ گودی پر مزدوروں کی طرح محنت مشقت کر کے روٹی کمائے گا۔ کیونکہ اب اس سے مزید بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ وہ آج سے ایک ماہ پیشتر بھی مزدوری کرنے کو تیار تھا۔ لیکن اسکی تعلیم، اسکی ڈگری و سند، دنیا کی جھوٹی روایتیں، سماج کے اصول و پابندیاں اور زمانے کی شرم و حیا نے مل کر اسکے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ لیکن اسکے خیالات زمانہ میں رہ رہ کے یہی خیال بجلی بن کر کوند جاتا کہ کاش اس نے اتنی موٹی موٹی کتابیں نہ پڑھی ہوتیں۔ اتنے کاغذ کالے نہ کئے ہوتے۔ اچھا برا سمجھنے کی اس میں تمیز نہ ہوتی۔ اس پس و پیش میں آنسو اسکی آنکھوں سے رواں ہو جاتے۔ اور وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

آج جبکہ وہ ایک دفتر میں ملازمت کے لئے اپنی قسمت آزمانے جا رہا تھا تو سڑک پر پڑا ہوا دو پیسہ کا سکہ اسے ملا جس کا کوئی [illegible] اس نے [illegible] سگریٹ [illegible] کیونکہ سگریٹ ہی تو بھوک [illegible] کے وقت انسان کا سب سے بڑا دوست و ساتھی ہوتا ہے۔

مگر یہ چاہتے وقت جیسے ہی پرکاش کی نظر دکان کے ایک آئینے پر پڑی تو وہ اپنے عکس کو دیکھ کر شدید دھکا کھا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ اسکے ابھرے ہوئے گال بری طرح سے پچک گئے تھے۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ چہرے پر خون کا پتہ نہ تھا اور بری طرح سے پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ اپنی مریل شکل کو دیکھ کر پرکاش کا دل بری طرح رو اٹھا اور وہ مرغ بسمل کی طرح اندر ہی اندر تڑپنے لگا۔ اپنے غم و پریشانی کو دور کرنے کیلئے پرکاش نے ایک طویل کش لیا۔ لیکن فاقوں سے مارا ہوا ناتواں سینہ دھوئیں کی تلخی برداشت نہ کر سکا۔ اور دوسرے ہی لمحے اس نے کھانسنا شروع کر دیا۔

اس کمپنی کے چیف افسر نے پرکاش کو صحیح حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مسٹر۔ یہاں کوئی نوکری خالی نہیں ہے۔ اسکے علاوہ تین امیدوار پہلے ہی سے ہماری فہرست پر موجود ہیں۔ میں آپکی مدد کسی بھی طریقے سے نہیں کر سکتا۔"

پرکاش نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتی آواز میں کہا۔

"ایسا نہ کہئے جناب۔ آپ ہی تو میری امید کی آخری روشنی ہیں۔ اگر آپ نے بھی انکار کر دیا تو میں بھوکا مر جاؤں گا۔"

[illegible]

"لیکن میں مجبور ہوں۔ یہاں کوئی نوکری خالی نہیں ہے۔"

"جناب میں بی اے پاس ہوں۔ آپ مجھے چپڑاسی کی نوکری دے دیجئے۔ میں ہنستے ہوئے قبول کر لوں گا۔ لیکن آپ انکار کر کے اور میرے دل کو زخمی نہ کیجئے۔"

"لیکن تمہیں چپڑاسی کی نوکری دے کر میں تعلیم یافتہ انسان کی توہین نہیں چاہتا۔ میں تعلیم کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتا۔"

"پر جناب میں نے تین روز سے کچھ بھی کھایا پیا نہیں۔ آپ مجھے کوئی بھی نوکری دے دیجئے ورنہ ......" پرکاش زیادہ جذباتی ہونے کے باعث اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ پرکاش کے گالوں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو افسر کے دل پر گہرا اثر کرنے لگے اور اس نے پرکاش کے شانے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم بری طرح سے حالات کا شکار ہو چکے ہو۔ لیکن ہمت چھوڑ دینا انسان کی سب سے بڑی بیوقوفی ہوتی ہے۔ تم کل یہاں چلے آنا۔ تمہیں کل کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائیگی۔"

پرکاش کو یکلخت یوں محسوس ہوا جیسے [illegible] زندگی میں بہار آ گئی ہو۔ اس نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"جناب [illegible] تو آپ نے مجھے موت سے [illegible] منہ [illegible]"

[illegible] وہ گویا اٹھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کائنات پر فتح پا لی ہے [illegible] کو جیت لیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ کل سے اسے ایک نئی زندگی ملنے والی ہے۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل کھلانے لگا اور اسی جذبے کے تحت وہ بے اختیار ہنسنے لگا ـــــ لیکن چند لمحات کے بعد [illegible] کو اپنی ہنسی پر مجبوراً ضبط کرنا پڑا۔ کیونکہ خالی پیٹ میں مسلسل ہنسی کے باعث مروڑ سے پڑنے لگے۔ انتڑیاں درد کرنے لگیں جس کی وجہ سے اسے شدید بھوک کا احساس ہونے لگا۔

پرکاش کا ذہن سوچ کی گہری وادیوں میں کھو گیا کہ پیٹ کی بڑھتی ہوئی بھوک کو کیسے مٹایا جائے؟ اس اہم مسئلے نے اسے سرتاپا پسینے میں ڈبو دیا ـــــ اس نے دل کو تسلی و تشفی دینی چاہی اور اپنی ڈھارس بندھانے کے لئے یہ سوچنے لگا۔ صرف چند گھنٹوں کا تو معاملہ ہے۔ کل صبح سے تو اسکی زندگی ہموار ہو جائیگی۔ اسے آج کا دن کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی دینا چاہیئے۔ چاہے اس کے لئے اسے کتنی ہی اذیت کیوں نہ سہنی پڑے۔ کتنا ہی درد و کرب کے عالم میں کیوں نہ تڑپنا پڑے۔ مگر یہ چوبیس گھنٹے تو پیٹ پر پتھر رکھ کر کاٹنے ہی ہونگے ـــــ

ـــــ لیکن کمبخت پیٹ بالکل نہیں مان رہا تھا۔ وہ تو ہر وقت ہر آن احتجاج کرتا اور چلا چلا کر کہنے لگتا ـــــ روٹی ... روٹی ..... روٹی!

پیٹ کی آگ بڑھتی جا رہی تھی اور یہی سوچتے ہوئے اسکے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے کہ کس طرح سے اس آگ کو بجھایا جائے۔ دفعتاً اسکی نظر [illegible]

[illegible] ـــــ [illegible]

ٹھیک ہے۔ کم از کم روٹی سے پیٹ کی انتڑیوں کو تو تسکین ملے گی۔ جسم کو روحانی تسکین ملے گی۔ پیٹ کی آگ تو بجھ جائیگی۔"

دوسرے ہی لمحے پرکاش اپنی لرزتی ہوئی ٹانگوں سے چل کر بلڈ بینک کے ڈاکٹر کے سامنے کھڑا اپنا بازو بڑھا کر کہہ رہا تھا۔

"لیجئے۔ میں پیسوں کے لئے اپنا خون دینے کی غرض سے یہاں حاضر ہوا ہوں۔"

ڈاکٹر نے نہایت ہی ششدر بھری نظروں سے پرکاش کے دبلے پتلے جسم کو بڑے غور کے ساتھ سرتاپا دیکھا اور اس نے مسکراتے ہوئے [illegible] کہا۔

"لیکن آپ میں تو دیکھنے میں جان معلوم نہیں ہوتی ..... آپ کا تو خون دینا خطرے سے خالی نہیں ہے۔"

مگر پرکاش تو اپنی جگہ بضد تھا۔

"کچھ بھی ہو ڈاکٹر۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔ آپ میرا خون لیجئے۔"

ڈاکٹر حیرت و استعجاب کے ساتھ پرکاش کو دیکھنے لگا۔

"آپ میری طرف یوں مت دیکھئے۔ مجھے پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔ میں یہ لکھ دینے کو تیار ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میں خود ذمہ دار ہوں۔"

ڈاکٹر نے ایک پرچہ [illegible] اس کے آگے رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے پرکاش قلم بڑی تیزی کے ساتھ دستخط کرنے میں مصروف ہو گیا۔

غزل

سزائے حسن پرستی، بجا، بجا بھی نہیں
کہ جرمِ عشقِ بتاں ہے برا، برا بھی نہیں

کسی کو کیا نہ ملا زندگی میں وائے نصیب
ہمارے ہاتھ بس اک دل رہا، رہا بھی نہیں

لیے دیئے بھی ہیں ہم لوگ کھوئے کھوئے بھی
کہ ہوشِ غم زدگاں ہے بجا، بجا بھی نہیں

نظر فریبیِ تحریر لے اُڑی مجھ کو
سرے سے نامۂ جاناں پڑھا، پڑھا بھی نہیں

تمام محویِ رفتار یہ تری راہ گزار
قدم کا نقش کچھ ایسا اُٹھا، اٹھا بھی نہیں

وہ چھپتے بھی نہیں اس ادا سے سامنے ہے
اگر کہوں وہ ہے مجھ سے خفا، خفا بھی نہیں

ٹھہر گئے سرِ دنیا تو بے جگہ ٹھہرے
چلو چلو کہ ماتم سرا، سرا بھی نہیں

ہم اس کو دیکھ کے بھی آہ کس طرح دیکھیں
نظارۂ رخِ جاناں ہوا، ہوا بھی نہیں

ادا ادا ایسے ادا ہو تو ہم ادا سمجھیں
نہیں ادا در ادا جو ادا، ادا بھی نہیں

عجب یہ دور ہے یا رب کہ خورش جانوں کی
وفا وفا بھی نہیں ہے جفا، جفا بھی نہیں

بھلا ہے کون، برا کون اس زمانے میں
برا برا بھی نہیں ہے بھلا، بھلا بھی نہیں

بوقتِ صبح چمن آنسوؤں کی دنیا ہے
سرشکِ خندۂ گل میں چھپا، چھپا بھی نہیں

نگاہِ ناز سے کیا حسن کے دل اُداس ہوا
اگر کہیں کہ کچھ اس نے کہا، کہا بھی نہیں

چمک اسی کی تب و تابِ حسن و عشق میں ہے
زمیں کا درد کچھ اتنا دبا، دبا بھی نہیں

تری نگاہ سے دنیا کو اک شکایت ہے
بجا بجا یہ شکایت بجا، بجا بھی نہیں

بس اک نگاہ کی پرچھائیاں بقا و فنا
بقا بقا بھی نہیں ہے فنا، فنا بھی نہیں

جسے معاملۂ حسن و عشق کہتے ہیں
ہزار بار یہ جھگڑا چکا، چکا بھی نہیں

وہ آنکھ کہتی ہے ایسے کا کیا ٹھکانا ہے
فراق آدمی ہے تو بھلا، بھلا بھی نہیں

کا شعر اگرچہ [illegible] انگلیوں کا ہوں سے شکایت [illegible] ہے
حیرت کے عالم میں بجا چہرے پر انگلی ہو کہ قسمت انسان
کو دم بخود کر دیتی ہے۔

انگلیاں گھما بجا دیتی ہیں۔ شہادت کی انگلی
کا اٹھ جانا ہی مہر تصدیق ثبت ہو جاتا ہے۔ البتہ اعتراض
کی انگلی اٹھتی ہے تو دل و جگر کباب کر دیتی ہے کسی
نے جیسا کر کیا خوب کہا ہے کہ ۔

ہم وہ بجھ ہوئے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں
کیا ہو گا کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

انگلیوں کے کس کس فن کو گنایا جا سکے۔ اگر انسان
کے ہاتھ میں انگلیاں نہ ہوتیں تو ساری خدائی ایک
چٹیل میدان یا گھنا جنگل بن جاتی۔ انگلیوں کو
خدا نے تعمیر و تخریب دونوں ہنر عطا کر کے وہ آزادی
مطلق عطا فرمائی ہے کہ انسان کے لئے کسی شکایت
کا موقع ہی نہیں رہا جو شخص اس خدائی عطیہ سے تخریب کا
کام لیتا ہے وہ گھاٹے میں آ جاتا ہے اور حد یہ کہ اس
کا بدبخت انگلیوں کا کیا بگاڑ باقی ہی نہیں رہ سکتا
کیوں کہ سنوارنے والی انگلیاں جاگ اٹھتی ہیں اور
اس ظالم کا کیا دھرا رہ جاتا ہے اسی طرح جو احسان
مند شخص اپنی پیاری انگلیوں سے تعمیر کا کام کرتا
ہے وہ کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ اس کی انگلیوں
کا حسن رہتی دنیا تک جوت جگاتا ہے۔ ظالموں کی
انگلیاں حشر کے بعد دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ جلتی رہیں گی
اور محسنین کی انگلیاں جنت میں شجر طوبیٰ کی حیات
افروز شاخ کی طرح تر و تازہ اور دائم و قائم رہیں گی۔

ایک بوڑھی خاتون گھبرائی ہوئی جہاز کے کپتان کے پاس
گئی اور سوال کیا اگر ہمارا جہاز برف کے پہاڑ سے ٹکرا گیا تو
کیا ہوگا؟

کچھ بھی نہیں، برف کا پہاڑ اسی طرح خاموشی سے گزر جائیگا جیسے
پہلے جا رہا تھا۔

اور خاتون مطمئن ہو کر واپس چلی گئی

مٹی کی دیواریں

رضیہ سجاد ظہیر

حیدر کو امید تھی کہ یہ تصویر ضرور اچھے پیسے لائے
گی اچھے کتنے؟ ہزار دو ہزار؟ نہیں اس نے تو
سوچ سمجھ کر اس کی قیمت صرف تین سو رکھی تھی
اتنا اگر آ جاتا تو وہ کچھ نئے رنگ ضرور خرید سکتا
اور دو چار دن کو اس شہر سے کہیں باہر ہو آتا
بس یہ کافی تھا وہ ان مصوروں میں سے نہیں
تھا جو اپنی تصویروں کی قیمت شروع ہی سے
ہزاروں لگانے لگتے ہیں اور جب نہیں بکتی تو
خریدنے والوں کو برا بھلا کہتے ہیں ان۔ پبلک
کو طعنے دیتے ہیں اور لوگوں کے ذوق کا رونا
روتے ہیں۔ ویسے اسے کسی سے نہ کچھ لینا تھا
نہ شکایت تھی وہ نہ بکنے کے لئے تصویر بناتا تھا
اسے تو صرف ان چیزوں سے تعلق تھا جو اس
کو اتنا بے چین کر دیتی تھیں کہ وہ مجبوراً ایزل
کے پاس کھڑا ہو جاتا تھا۔ دل کی آگ عجیب
عجیب رنگ اختیار کر کے چھلکتی تھی اور تصویر
بن جاتی تھی۔ وہ پرانے آرٹ اور نئے آرٹ
کے چکر میں نہیں پڑتا تھا۔ اس نے پڑھا بہت
کچھ تھا کس زمانے میں کیسی تصویریں بنتی ہیں
پھر کیسی بننے لگیں اور اب کیسی بنتی ہیں۔ یہ
سب اسے معلوم تھا پر آج نمائش میں اس
کی جس تصویر کے آگے لوگ بار بار کھڑے
رہتے تھے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتے ہی چلے
جاتے تھے اور ان کی آنکھیں خوشی اور حیرانی
کی نمی سے بھیگ جاتی تھیں۔ یہ تصویر اس
نے صرف اس لئے بنائی تھی کہ وہ بھی ایک
بچہ، اسی طرح حیران رہ گیا تھا۔ اسی طرح ٹکٹکی
باندھے دیکھتا رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھی
یوں ہی نمی سے بھیگ گئی تھیں۔ وہ کسی چھٹی میں
گھر گیا تھا اس کا گاؤں ریلوے اسٹیشن سے
کافی دور تھا۔ راستہ طے کرنے کے لئے یکے
مل جاتے تھے۔ پر وہ ہمیشہ پیدل ہی طے کیا کرتا
تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس لئے وہ اسٹیشن
پر لگے تاروں کو پھلانگ کر آہستہ آہستہ وہ
پگڈنڈی پر چل پڑا تھا، اسی پگڈنڈی پر جس سے
وہ ہزاروں بار گزرا تھا مگر جس پر ہمیشہ اسے نئے
رنگ بکھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے دور
دور تک پھیلے ہوئے کھیت سرسوں کے پھولوں
سے پیلے دکھائی دے رہے تھے۔ بسنت کی ہوائیں
فضا میں ٹھنڈک گھول رہی تھیں اور ابھرتے ہوئے
سورج کی سرخی اور سفیدی کی ملا کر سرمئی افق میں
سنہری روشنی پھیلانے کی کوشش کر رہی تھی اور روشنی
جو اونچے اونچے درختوں کی کالی پھنگیوں سے
امربیل کی طرح لپٹ رہی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے کھیت ختم ہوئے اور
ایک چھوٹی سی چند گھروں کی بستی کی لکیریں سر اٹھانے
لگیں، ایسی کئی بستیاں اسے اپنے گھر پہنچنے سے پہلے
پڑتی تھیں کچی مٹی کی دیواریں اندھیرے کا گھونگھٹ
نکالے کھڑی تھیں۔ ان کے کچھ حصے ابھی تاریکی میں
تھے کچھ پر روشنی پڑ رہی تھی۔ سنہری اور روپہلی
روشنی جو ان پر پھیلے ہوئے اپلوں کی بھورے سے
اور خاکی اور مٹیالے رنگ کی مہریں اور ان پر تھے

پروفیسر محمد عبداللہ۔ مشرقی پاکستان

نذرالاسلام اقبال اور رابندرناتھ ٹیگور

آزادی کا حصول کوئی فوری حادثہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طویل عمل کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن درخت کی جڑ پکڑنے اور پھولنے سے پہلے کئی ہاتھوں کے ذریعے اسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ ہمارے حصولِ آزادی کی بھی یہی روداد ہے۔

پاک و ہند کی قومی بیداری اور حصولِ آزادی میں تنہا کسی ادیب یا شاعر کا حصہ نہیں۔ بلکہ حالی (۱۸۳۷ء ـ ۱۹۱۴ء)، اکبر (۱۸۴۶ء ـ ۱۹۲۱ء) اقبال، نذرالاسلام (۱۸۹۹ء) اور دوسرے ادباء و شعراء نے یکے بعد دیگرے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے ذہنی نشو و نما میں اہم رول انجام دیا ہے۔ یکایک قومی بیداری کا شعور نہیں ابھرا اور نہ یکایک روز پاک و ہند آزاد ہوا بلکہ مختلف ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ہماری قوم موجودہ درجے پر پہونچی ہے۔

سب سے پہلے حالی نے اپنی قومی نظموں سے ہماری قومی بیداری کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے بعد اکبر اور اقبال نے قومی شاعری کے میدان میں قدم رکھا۔ انہوں نے حالی کی بتائی ہوئی راہ میں گامزن ہو کر مسلمانوں میں مذہبی جوش و جذبے کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اکبر نے مسلمانوں کو اپنی ثقافت و روایات کو مغربی تہذیب و تمدن کے حربوں سے بچانے کی تلقین کی۔ اقبال نے "خضر راہ" بن کر اپنے من میں ڈوب کر پاجا سراغِ زندگی کی ہدایت دی۔

سرزمینِ بنگال، حالی اور اقبال کی شاعری سے خاطر خواہ متاثر نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ یہ دونوں اردو کے شاعر تھے، انہوں نے اردو زبان میں قوم کو پیغام دیا۔ تقسیم ملک سے پہلے مشرقی پاکستان میں اردو کی اشاعت نہ ہونے کی برابر تھی۔ یہاں کے لوگ پورے معنوں میں ان کے کلام سے استفادہ نہ کر سکے البتہ رابندرناتھ ٹیگور اور نذرالاسلام نے ان کے مقاصد کو یہاں بارآور بنایا۔ (مگر بنگال کے ہزاروں دینی علماء اردو جانتے ہیں)۔ ـ ام۔ق)

نذرالاسلام اور رابندرناتھ دونوں معاصر ہیں۔ دونوں ایک ہی علاقے اور ایک ہی زبان کے شاعر ہیں۔ نذرالاسلام نے شاعری کے میدان میں اس وقت قدم رکھا، جب رابندرناتھ کی شاعری بامِ عروج پر تھی۔ تمام شعراء و ادباء انہیں کے چشمۂ فیض سے استفادہ کر رہے تھے، شروع شروع میں نذرالاسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے، مگر وہ ایک غیر معمولی ذہانت و فطانت کے مالک تھے ان کی غیور طبیعت نے زیادہ دنوں تک کسی کی تقلید گوارا نہ کی۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اپنا راستہ الگ نکالا اور رابندرناتھ ٹیگور کے زمانے میں بھی اپنی جدت آفرینی کا ثبوت دیا ایک تو فطرت نے ان کی طبیعت کو جودت و جدت ودیعت کر رکھی تھی، مزید بر آں زمانے کے تقاضوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ مظلوم انسانیت کی پکار نے ان کی شاعری میں ایک طوفانی اور ہیجانی کیفیت پیدا کر دی۔ یہی جذباتیت مظلوم انسانیت کے حق میں ثابت ہوئی۔ مگر اس کی وجہ سے ان کی نظموں میں گہرائی نہ آنے پائی۔ یہی چیز ان کے اعلیٰ درجے کے خلاق ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنی۔ ان کی نگارشات میں جو تندی و تیزی ملتی ہے وہ نہ ٹیگور میں ملتی ہے نہ اقبال میں۔

رابندرناتھ کی شاعری ایک اتھاہ سمندر ہے جس میں گہرائی تو ہے مگر تلاطم نہیں۔ نذرالاسلام کی شاعری ایک جوئبار ہے جو گہرا تو نہیں مگر ہیجان ضرور ہے جو اچھلتے پھسلتے اور سرکتے ہوئے تیزی سے آگے نکل جاتا ہے۔ رابندرناتھ کی شاعری میں وہ جنگ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

نذرالاسلام، رابندرناتھ اور اقبال تینوں کو انسانیت سے والہانہ محبت تھی۔ تینوں نے انسانیت کے گیت گائے۔ فرق یہ ہے کہ رابندرناتھ اور اقبال نے عوام سے دور رہ کر انھیں محبت کا پیغام سنایا۔ مگر نذرالاسلام نے دلدل میں پھنسے ہوئے انسانوں کے قریب پہنچ کر انہیں نکالنے کی کوشش کی۔ ٹیگور کی شاعری کا جو منشا تھا۔ اقبال٭ و نذرالاسلام کا بھی وہی تھا۔ ٹیگور نے جو باتیں نیازمندانہ انداز میں سنائیں۔ وہی اقبال اور نذ

٭ مگر اقبال کہتے تھے کہ

اوروں کا پیام اور میرا پیام اور ہے

نذرالاسلام اور ٹیگور کے یہاں وہ اسلامی فکر مستقیم کہاں جس سے اقبال کا کلام معمور ہے۔

جتنے ٹیگور، اقبال اور نذرالاسلام سے اتنے قریب نہیں جتنے کہ نذرالاسلام ہیں۔ انھوں نے عوام کو اتنے پاس سے نہیں دیکھا جتنے کہ نذرالاسلام نے دیکھا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ٹیگور کی شاعری میں ایک عالم گیر اور گہری محبت کی تلقین ہے جو سرزمین بنگال کے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ روحانی تجزیے، زبان کی ملاحت و حلاوت خیالات کی بلندی، مضامین کے سوز و گداز اور فن کارانہ کمال میں کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں۔ نذرالاسلام اور ٹیگور بنگلہ شاعر ہیں مگر اقبال فارسی اور اردو دونوں میں اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں یہ تینوں قادرالکلام شاعر ہیں جن میں نذرالاسلام اتنے بڑے خلاق نہیں جتنے کہ ٹیگور یا اقبال ہیں۔ ٹیگور اور نذرالاسلام نے نظم و نثر دونوں کے اہم شعبوں میں قابل ذکر کارنامے چھوڑے ہیں۔ نذرالاسلام شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، افسانہ نگار، ناول نگار، ناٹک نگار، صحافی اور مترجم ہیں۔ ٹیگور بیک وقت شاعر، گیت نویس، موسیقی داں، افسانہ نگار مقالہ نگار، ناول نگار، ناٹک نگار، نقاش نقاد اور صحافی ہیں۔

نذرالاسلام، ٹیگور اور اقبال تینوں کو جمالیاتی قدروں کا احساس تھا۔ حسن و عشق سے دل چسپی تھی۔ غلامی، ناانصافی، افلاس جہالت اور ظلم و ستم کے خلاف تینوں کے یہاں احتجاج ملتا ہے مگر فرق نوعیت اور کیفیت کا ہے۔ اقبال مظلوم انسانیت کی غمخواری میں "کاخ امراء کے در و دیوار ہلادو" "ضرب کلیم" سے گمراہ قوم کو راہ راست پر لانا چاہتے ہیں۔ نذرالاسلام طبل اور دمامہ بجاکر لوگوں کو جور و استبداد کے خلاف لڑنے کے لئے میدان جنگ میں لاکھڑا کرتے ہیں۔ ٹیگور عالم گیر محبت اور برادرانہ ہمدردی کی دعوت دے کر مفاہمت میں مرض کا علاج ڈھونڈتے ہیں۔ منزل تینوں کی ایک ہی ہے۔ تینوں حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ "ترک آب و گل" سے کسی کا واسطہ نہیں۔ کسی کے یہاں فراری کیفیت نہیں بلکہ کام کرنے کا ولولہ اور آگے بڑھنے کے جوش و جذبے سے ان کی شاعری لبریز ہے ان میں مغرب کے عمل اور مشرق کی روحانیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

با ایں ہمہ اشتراک خیالات نذرالاسلام رابندر ناتھ اور اقبال میں تھوڑا بہت فرق بھی پایا جاتا ہے۔ نذرالاسلام فلسفی شاعر نہیں وہ صاف گو اور عوامی شاعر ہیں، وہ فلسفیانہ مسائل میں نہیں الجھتے۔ اقبال اور رابندر ناتھ فلسفی شاعر ہیں۔ مگر رابندر ناتھ اتنے فلسفی نہیں جتنے کہ وہ شاعر ہیں۔ برخلاف اس کے اقبال بیک وقت شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا کہ ان کا کون سا پہلو راجح ہے اور کون سا مرجوح۔

ٹیگور ظلم و ستم کی طرف قوم کی توجہ منعطف کرکے اس کی خامیوں کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں وہ قوت اور انقلاب کے شاعر نہیں وہ اپنی منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے قوت میں وہ محبت کے حربوں سے میدان جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔ نذرالاسلام، اقبال کی طرح "نقش کہن" کو مٹا کر ایک "جہان نو" کی تخلیق کرنے کے آرزومند تو ہیں مگر وہ اسے بروئے کار لانے کے لئے کوئی واضح اور منظم طریقہ کار پیش نہیں کر سکتے، یہ فضیلت حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال کو حاصل ہے۔ وہ قرآن کا آسمان مستعار کر مٹا کر "اپنی دنیا آپ پیدا کر" کا پیغام سناتے ہیں وہ تشخیص مرض کے بعد اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں قوم کو اپنی منزل مقصود تک پہنچانے کیلئے ایک منظم طریقہ کار پیش کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر نذرالاسلام کے یہاں "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" تو ہیں مگر "خضر راہ" نہیں۔ رابندر ناتھ کے یہاں "طاؤس و رباب" تو ملتا ہے مگر "شمشیر و سناں" نہیں ملتی۔ ہاں حکیم الامت ڈاکٹر اقبال کے یہاں "بانگ درا" بھی ہے "ضرب کلیم" بھی ہے اور "خضر راہ" بھی۔ "طاؤس و رباب" بھی ہے اور "شمشیر و سناں" بھی۔

ٹیگور کی شاعری، ان کی تشبیہات و استعارات، ان کے محاوروں اور کہاوتوں میں عام طور پر ہندو تہذیب و تمدن کی ترجمانی ملتی ہے۔ دوسری طرف اقبال نے اپنی شاعری کو اسلامی جذبات و خیالات، مذہبی واقعات و سانحات کیلئے وقف کردیا۔ مگر نذرالاسلام کی شاعری گنگا جمنا اور دجلہ فرات کا سنگم ہے یہاں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کی تہذیب و تمدن کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہر فرد بشر میں اپنے اپنے مذہب کا انقلابی روح پھونک کر اس میں سیاسی اور سماجی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال تینوں قومی رہبری کے علمبردار اور آفاقی شاعر ہیں قومی تعمیر میں کسی کا حصہ کم نہیں۔ تینوں قومی تعمیر کی صف اول میں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ہم تینوں کی [illegible]

فیروز نظر

غزل

اب یوں ستمگروں کا تمسخر اڑائیے
ہر غم کو مسکرا کے گلے سے لگائیے

کتنی ہی حسرتیں ہیں جو بے موت مر گئیں
کس کس کے سوگ میں یہاں آنسو بہائیے

یہ کشمکش حیات کی، یہ رقص سیم و زر
منظر بڑا عجب ہے جو نظریں اٹھائیے

اب کوئی بھی جہان میں اپنا نہیں رہا
اب کس کے انتظار میں آنکھیں بچھائیے

یہ نفرتوں کے دیپ تو بجھنے کو ہیں حضور
اب ہو سکے تو پیار کی شمعیں جلائیے

کس کس کی چشمِ عیظ کا بنئیے یہاں ہدف
کس کس کو اپنے دکھ کا فسانہ سنائیے

یوں تو نہ کٹ سکیں گے یہ شام و سحر نظر
دوشیزۂ بہار کو چل کر منائیے

رئیس حاکم امروہوی

دوستو!

زنداں میں بھی الم سے گریزاں ہیں دوستو!
ظلمت کدے میں شمع فروزاں ہیں دوستو!

دنیا نے جو بھی رنگ دیا ہم نے بھر لیا
ہم شاہکارِ گردشِ دوراں ہیں دوستو!

ہم سر فرازِ دار و رسن، شمعِ رہگزار
ہم انتظامِ فطرتِ یزداں ہیں دوستو!

زخموں سے چور چور ہیں اتنے ہم اہلِ دل
بازارِ غم میں لعلِ بدخشاں ہیں دوستو!

آواز دو، کہاں ہے، زلیخائے وقت کو
بکنے کو کتنے یوسفِ کنعاں ہیں دوستو!

اب زندگی ہے بہر وفا صورت مسیح
اور ہم صلیب و حلقۂ زنداں ہیں دوستو!

مانا کہ خامشی سے لبِ دار ہیں مگر
ہم آبروئے چشمِ نگاراں ہیں دوستو!

افریشیائی وحدت میں شگاف

از: — گوپال مِتّل

ہندوستان کے وزیر خوراک و زراعت شری سبرامنیم نے جکارتہ سے واپسی کے بعد بنڈونگ کانفرنس کے دسویں سالگرہ کے جشن کو انڈونیشی تماشا قرار دیا ہے۔ وزیر موصوف نے یہ بات اس سوال کی تردید میں کہی کہ یہ کانفرنس چینی تماشا تھی، ہرچند کہ چین اور انڈونیشیا کی ایشیائی معاملات مکمل ہم آہنگی کے پیش نظر چینی تماشے یا انڈونیشی تماشے میں کوئی واضح خط امتیاز کھینچنا ممکن نہیں اور اس بات کا مظاہرہ خود جشن سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں بھی ہوا لیکن ان کے بیان سے اتنا تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ جشن سالگرہ کا اجتماع کسی حد تک یک طرفہ ہی تھا۔ یہ بات افریشیائی وحدت کے لئے کچھ سازگار نہیں۔

جو بات شری سبرامنیم نے مرموز طور پر کہی وہ کچھ ملکوں کے نمائندوں نے نسبتاً برملا طور پر بھی کہی۔ سیلون کے وزیر اعظم شری نانا ڈ سے سینا نائک نے سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں پیغام دیتے ہوئے اس افسوسناک حقیقت کی یاد دہانی ضروری سمجھی کہ "جس چیز کو ہم فخر سے بنڈونگ اسپرٹ کہتے ہیں وہ ۱۹۵۵ء کے بعد سے کمزور پڑتی جا رہی ہے۔"

صرف یہی نہیں بلکہ تھائی لینڈ کے وزیر خارجہ تھانٹ کھومانٹ تقریبات کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر یہ کہہ کر کنارہ کش ہو گئے کہ "بنڈونگ کانفرنس کے دس اصولوں کی لفظاً و معناً "خلاف ورزی کی جا رہی ہے اور خود جکارتہ کی تقریب بھی کیمونسٹ پروپگنڈے کے فورم کے سوا کچھ نہیں"

یہ سب باتیں کسی قیاس آرائی پر مبنی نہیں بلکہ انڈونیشی اور چینی حکمرانوں نے اپنے طرز عمل سے ان کی صداقت کا ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ بنڈونگ کانفرنس نے بین الاقوامی امن کو قائم رکھنے کے لئے جن باتوں پر زور دیا تھا ان میں انسانی حقوق کا احترام، چھوٹی بڑی حکومتوں کی خود مختاری کا احترام اور کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی سے اجتناب شامل تھا۔ لیکن عین اس وقت جب یہ تقریبات منائی جا رہی تھیں میزبان ملک انڈونیشیا اور اسکے آقا چین کے سربراہوں کی طرف سے ایسی متعدد باتیں کہی گئیں جو ان اصولوں کے بدیہی طور پر متضاد تھیں۔

سالگرہ کی تقریب کے سلسلے میں جمع شدہ ایک لاکھ حاضرین کو خطاب کرتے میزبان ملک کے صدر سوئیکارنو نے اعلان کیا کہ وہ ملائشیا کو کچلنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اس خوش امیدی کا بھی اعلان کیا کہ دنیا بھر کی ترقی پسند طاقتیں ملائشیا کو کچلنے میں انڈونیشیا کی موافقت کریں گی۔

اور عین اسوقت جب تھائی لینڈ کو ایشیائی وحدت کے ایک رکن کی حیثیت سے بنڈونگ کانفرنس کے جشن سالگرہ میں شریک کیا جا رہا تھا، نیو چائنا نیوز ایجنسی کے مطابق افریشیائی وحدت کی چینی کمیٹی کا چیرمین لیاؤ چنگ چی "تھائی لینڈ کے [illegible] عوام [illegible] فیصلہ کن قوت کا مظہر بن رہا تھا اور اسے یہ یقین دلا رہا تھا کہ اسے اس کے ملک کی باضابطہ حکومت کا تختہ الٹنے میں مدد دینا "چینی عوام کی ناگزیر ذمہ داری ہے۔" تھائی لینڈ کی آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کی تائید و اعانت کو "کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی سے اجتناب" کا نام دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

ہندوستانی رہنما تلخ سے تلخ حقیقت کو بھی معتدل لہجے میں بیان کرتے ہیں چنانچہ شری سبرامنیم نے جکارتہ سے واپسی پر اس بات سے انکار کیا کہ جکارتہ میں ہندوستان کے خلاف معاندانہ ماحول موجود تھا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ مقررین کی فہرست میں ہندوستان کے نمائندے کا نام شامل نہیں تھا اور سوئیکارنو کے اسٹیڈیم میں جھنڈوں کی جو پریڈ ہوئی اس میں نیپال اور ہندوستان کے جھنڈے شامل نہیں تھے۔ نیپال نے تو اس معاملے میں جکارتہ سے وضاحت طلب کی ہے۔

تھائی لینڈ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی چین نے جو دھمکی دی ہے وہ کیمونسٹ طریق کار میں کوئی استثنائی حیثیت نہیں رکھتی۔ ہندوستان کے ہوم منسٹر شری نندا برملا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ چین اور ہندوستان کے کیمونسٹوں کے درمیان ساز باز موجود ہے۔ نئی دہلی کے ممتاز اخبار "اسٹیٹسمین" نے اپنے ۲۱ اپریل کے اداریے میں حکومت ہند کے اس متضاد طریق کار پر اعتراض بھی کیا ہے کہ جب اس ساز باز کی بنا پر چین نواز کیمونسٹوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا ہے تو چینی سفارت گھر کی سرگرمیوں پر حکومت پابندی کیوں نہیں لگاتی۔

ترکِ اسلحہ

جے۔ ڈی۔ برنال

دنیا میں آج جن وسائل اور انسانی طاقت کو اسلحہ سازی پر ضائع کیا جا رہا ہے اگر ان کو سائنس اور تجربہ کی اغراض کے لئے استعمال کی جانے والی چیزوں کی پیداوار میں اضافہ کرنے والی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو دنیا کے ہر براعظم میں معیار زندگی میں اضافہ ہو سکتا ہے اور افلاس کے خلاف جنگ میں فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ان وسائل اور انسانی طاقت کو اس وحشت انگیز اور ہولناک جنگ کی تیاریوں کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے جو اگر شروع ہو گئی تو کروڑوں افراد فوراً ہلاک ہو جائیں گے۔ انسانی فلاح و بہبود کے جس قدر زبردست امکانات اس وقت موجود ہیں اتنے کبھی نہیں تھے اور انسانیت اب تباہی کے جس قدر شدید امکان سے دوچار ہے اتنی کسی زمانے میں نہیں تھی۔

ایسے ہولناک تصادم کی ہماری موجودہ دنیا شکار ہے اس لئے ترکِ اسلحہ نسلِ انسانی کے لئے اہم ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ ترکِ اسلحہ ہی بنی نوع انسان کی مادی فلاح و بہبود کی کنجی ہے۔ ہمارے کرۂ ارض پر نیوکلر تباہی کا جو ہولناک سایہ منڈلا رہا ہے اس سے تحفظ کا واحد ذریعہ ترکِ اسلحہ ہے۔

اتفاق کے بعد اختلاف

عام اور مکمل ترکِ اسلحہ کے مقصد کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی متفقہ طور پر منظور کی ہوئی قرارداد میں قبول کر لیا گیا ہے۔ مقصد کا تعین ہو جانے کے باوجود اس کے حصول کے طریقے میں اس قدر اختلاف اور تضاد پایا جاتا ہے کہ کئی لوگ اب اس شبہ کا اظہار کرنے لگے ہیں کہ آیا یہ مقصد کبھی حاصل بھی ہو سکے گا؟۔

عالمی امن کونسل کو ہمیشہ اس بات کا یقین حاصل رہا ہے کہ ترکِ اسلحہ کا مقصد حاصل کیا جا سکتا

...اس

کو اس بات کا بھی پختہ یقین ہے کہ مختلف سماجی نظاموں اور سیاسی، سماجی و معاشی اصولوں پر کاربند ملکوں کے درمیان پُرامن بقائے باہمی ممکن ہے۔ پُرامن بقائے باہم کے اس اصول کو ترکِ اسلحہ کے کے لئے اور دنیا سے جنگ کا نام ونشان مٹانے کی مہم کا بنیاد بنانا چاہئے۔

مکمل تباہی

انسان ہمیشہ ایسی دنیا کا خواب دیکھتا رہا ہے جو جنگ کی لعنت سے پاک ہو! اس خواب کی تعبیر کے لئے انسان نے جدوجہد بھی کی ہے اور قربانیاں بھی دی ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسی قوتیں طاقتور ثابت ہوئیں جو جنگ پر بھروسہ کرتی ہیں۔ جنگ سے حاصل ہونے والے منافع سے مالدار بن رہی ہیں یا جو اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے جنگ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہیں۔ بہت لوگ ماضی کی ناکامیوں کا تذکرہ کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں ہے لیکن ایسے لوگوں کو ہمارا جواب یہی ہے کہ یہ کام موجودہ صدی میں انجام دینا ہوگا۔ کیونکہ ہتھیاروں نے صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ ماضی میں جن مقاصد کے لئے جنگ کی جاتی تھی۔ وہ مقاصد آج جنگ کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتے۔ جنگ میں کوئی فاتح رہے گا نہ مفتوح۔ ہر طرف ایٹمی تباہ کاری نظر آئے گی۔

خطرناک توازن

بعض لوگ اس حقیقت کو تسلیم

ایک کے منتخب کرنے کا ہے پھر یہ کیا مناسب اور حقیقت کے مطابق نہ ہوگا کہ وہ کسی اپنے ہی جیسے انسان یا انسانوں کی غلامی کرنے کے بجائے جن کی ذاتی و قومی اغراض بھی ہیں اور خواہشات بھی جن کا اندر وہ ظرف بھی نہیں ہے اور علم بھی نہیں ہے جو آقائی کے لئے ضروری ہے جن کی غلامی تحت بھی ہے غلط بھی اور تکلیف دہ بھی ہم اس خدا کی بندگی اختیار کریں جس کو ہم پوجتے ہیں۔ جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ جو ہمیں پال رہا ہے اور جس کی حکمت علم اور ظرف کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم کو مان لینا چاہئے کہ جب بھی انسان نے خدا کی بندگی سے منہ موڑا ہے اسے بے شمار بندگیوں نے اچک لیا چاہے وہ پوپ اور برہمن کے نام پر ہوں یا بادشاہ کے نام پر۔ قومی مفاد کے نام پر ہوں یا روٹی کے نام پر۔

حقیقت کے اعتبار سے بھی یہ بات صحیح ہے کہ جس کو ہم پوجتے ہیں اس کی بندگی کریں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کب تک الحاد کے اندھیروں میں حیات کے آئینہ خانے تلاش کرتا رہے گا۔ ا

شولوخوف کی ساٹھویں سالگرہ

مسٹر فیدن اور فیض احمد فیض کی تقریریں

ماسکو۔ میخائیل شولوخوف کی ساٹھویں سالگرہ کے
موقع پر ماسکو کے پریس ہاؤس میں ایک دلکش تقریب
منعقد ہوئی جس میں سوویت ادیبوں نیز باہر کے ملکوں سے
آنے والے ادیبوں نے انہیں پرجوش مبارکباد پیش کیں۔
جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے سوویت ادیبوں کی یونین
کے صدر کونستانتین فیدن نے کہا کہ شولوخوف ہمارے
عہد کے ایک ممتاز ترین ادیب ہیں۔

شولوخوف نے سر جھکا کر حاضرین کی تالیوں
کا جواب دیا اور لوگوں کے ساتھ ہی کر قہقہے لگاتے رہے۔

فیدن نے شولوخوف کی غیر معمولی تخلیقی قوت
کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "دان خاموش بہتا ہے" کی پہلی
جلد اس وقت لکھی گئی تھی جب مصنف کی عمر صرف ۲۳
سال کی تھی اور اس کتاب کو پڑھ کر لوگ مسرت و استعجاب
سے چیخ اٹھے تھے۔ اس کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ شولوخوف
زندگی اور عوام سے بڑی قریبی واقفیت رکھتے ہیں اور
ان کے پاس صلاحیتوں کا لازوال ذخیرہ ہے۔

زندگی کی شدید ترین کشمکش کی طرف شولوخوف
کے جرأت مندانہ رویہ کو اور روسی کلاسیکی روایات کی فائدہ
بخش پیروی کو فیدن نے شولوخوف کی اہم ترین خصوصیت
قرار دیا۔

"شولوخوف پوری بے باکی کا اظہار کرتا ہے وہ المیہ
کو ڈھیلا بنا کر پیش نہیں کرتا اور نہ ہی ڈرامے کو غیر ضروری
طور پر طربیہ عناصر سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس
کی تحریروں میں ہمیشہ وہ مسرت ناچتا رہتا ہے کہ زندگی
کا تحفہ ہے۔ چاہے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو دشوار زندگی

کا حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔ ایک "نئے دن" کے حصول کی
مسرت کا جذبہ ابھارتی ہیں۔ اگرچہ ہر شولوخوف
کے بیان کئے ہوئے واقعات کی ڈرامائیت قیامت خیز ہوتی
ہیں مگر کتاب روشنی کے ایک احساس کے ساتھ ختم ہوتی
ہے" فیدن نے اپنی تقریر میں کہا۔

شولوخوف کو مختلف سوویت جمہوریوں کے
ادیبوں نے، حکومت اور عوامی تنظیموں کے
نمائندوں نے اور مسلح فوجوں کے نمائندوں نے
مبارکباد دی۔ مسلح فوجوں کے نمائندوں نے
خاص حکمنامہ پڑھ کر سنایا جو وزیر دفاع نے جاری
کیا تھا اور جس کے ذریعہ پنشن یافتہ کرنل شولوخوف
کو مارشل کا ایک خنجر عطا کیا گیا تھا جس پر اس ادیب
کا نام کندہ تھا۔

متعدد ملکوں سے آئے ہوئے ادیبوں نے
بھی شولوخوف کو مبارکباد دی۔ ان ادیبوں
نے شولوخوف کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کی
وسیع ترین بین الاقوامی مقبولیت اور متعدد ملکوں
کے موجودہ ادب پر ان کے مستقبہ اثرات پر زور
دیا۔ مقررین میں فن لینڈ کے ادیب مارٹی لارنی اور زمبلا کا
کے ادیب ارکادیو بوزہ شامل تھے۔ وبوزہ نے کہا
کہ ان کے ہم عصر ساتھیوں کو شولوخوف کی کتابوں
سے بہت کچھ سیکھنا ہے اور خصوصیت کے ساتھ
یہ سیکھنا ہے کہ عوام اور انقلاب کے نصب العین
کی خدمت انجام دینا ادب کا خاص مقصد ہے۔

اردو شاعر فیض احمد فیض نے کہا کہ شولوخوف

[illegible]
ادیب کو مبارکباد دینے میں مسرت محسوس کرتے ہیں گے
شولوخوف نے تہہ دل سے اپنے ساتھیوں کا شکریہ
ادا کیا جنہوں نے انہیں مبارکباد دی تھی ساتھ ہی ساتھ
انہوں نے اپنے قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے
بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیشہ ان کی مدد
کی ہے اور جن کے جذبات نے انہیں ہمیشہ حوصلہ
عطا کیا ہے۔ انہوں نے تہہ دل سے سوویت
حکومت کا شکریہ ادا کیا جس نے انہیں اعلیٰ اعزاز
یعنی لینن انعام عطا کیا ہے۔

ایک ملازمت کے لئے ایک امیدوار کا امتحان
لیا جا رہا تھا جب وہ اس سوال پر پہنچا کہ
سورج اور زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے
تو اس نے حسب ذیل جواب دیا۔
"میں قطعی طور پر تو نہیں بتا سکتا۔ لیکن
اس کی مجھے پوری امید ہے کہ سورج اتنا
قریب بھی نہیں کہ وہ میری اس ملازمت
کے فرائض میں دخل انداز ہو۔ جس کے لئے
میں امتحان دے رہا ہوں۔
اس امیدوار کو ملازمت مل گئی

★

دادا۔ بیٹا! دعا کرو کہ تمہارے ابا جان
کو ملازمت مل جائے۔
پوتا۔ دادا جان! اگر ہماری دعائیں
قبول ہو جایا کرتیں تو آج اسکول
میں ماسٹر لوگ نہ ہوا کرتے۔

★

غزل

مرتے مرتے زندگی کا اک مقام آ ہی گیا
بے ارادہ اُن کے لب پر میرا نام آ ہی گیا

مرحبا، اللہ اکبر خود بخود سر جُھک گیا
میکدے میں ایک ایسا بھی مقام آ ہی گیا

کیوں نہ قرباں جاؤں ساقی تیری چشمِ مست کے
جب اشارہ کر دیا گردش میں جام آ ہی گیا

لکھ کے خونِ دل سے میں نے جب انھیں بھیجا سلام
گرچہ مبہم ہی سہی، لیکن پیام آ ہی گیا

صبح سے گم کردۂ ہستی تھا دیوانہ نورد
تیرے کوچے میں بھٹک کر وقتِ شام آ ہی گیا

حُسن کی محفل میں اک دیوانہ کی تھی جستجو
شکر ہے اے جذبِ دل! تو کچھ تو کام آ ہی گیا

داغِ دل کھلتے ہی بہرِ سیرِ گل بے اطلاع
خود بخود اک روز اک محشر خرام آ ہی گیا

کوچۂ میخانہ میں جس نے گزاری ساری عمر
آج وہ عابد سوئے بیت الحرام آ ہی گیا

جمیل کلیمی

غزل

مہ جبینوں کے شہر میں جا کر
لوٹ آئے ہیں ٹھوکریں کھا کر

جا رہی ہے بہار کس جانب
اُدھر کھلے اِن گُلوں کو تڑپا کر

نیند آئی نہ آئے وہ اب تک
آؤ سو جائیں زہر ہی کھا کر

چاند کے ساتھ گھومنے دے ذرا
میرے سائے نہ میرا پیچھا کر

شعلۂ گل کو اور بھڑکایا
باغ میں پھر بہار نے آ کر

دمِ رخصت وہ دیکھو دن سے رات
کیا گلے مل رہی ہے شرما کر

تیرے دیوانے سو گئے ہیں پھر
آ کوئی حشر اور برپا کر

داد محفل میں تو بھی پائے جمیل
گر سنائے غزل کوئی گا کر

وائی۔ زمیل

ابن سینا
اور ان کی تصنیف "قانون حکمت"

سوویت تاجکستان کے تاجک باشندے قدیم تہذیب و روایات کے مالک ہیں۔ اس سرزمین پر شاہنامہ کے مصنف فردوسی جیسے عظیم شاعروں اور حکیم مشرق ابن سینا جیسے فلسفیوں نے آنکھ کھولی تھی۔ ابن سینا نے آج سے ہزار سال پہلے "قانون" تحریر کی تھی جو حکمت کی تاریخ میں اہم کتاب ہے۔ مقالہ نگار نے جدید ادویات کی ترقی میں ابن سینا کی اہمیت کا جائزہ لیا ہے۔

اپنے دور کے ایک عقلمند ترین انسان کو جب موت کی آہٹیں محسوس ہونے لگیں تو اس نے سب سے لائق شاگرد کو اپنے پاس بلایا اور اسے چالیس شیشیاں دیں، جن میں خاص دوائیں بھری ہوئی تھیں اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اس کے دل کی دھڑکن بھی رک گئی تو اس کے شاگرد نے استاد کے حکم سے اس کے مردہ جسم پر دوائیں ملنا شروع کیں۔ اس وقت ایک معجزہ رونما ہوا۔ ضعیف العمر استاد کا مردہ جسم دوبارہ زندگی حاصل کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بڑھاپے کی جگہ جوانی لے رہی تھی اور موت کی جگہ زندگی۔ شاگرد یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور پھر استعجاب میں آخری چالیسویں شیشی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

تاجکستانی عوام میں مشرق قدیم کے عظیم حکیم "معلم الحکماء" کے بارے میں یہ روایت بے حد مقبول ہے۔ معلم الحکماء ابن سینا کی "قانون حکمت" یونان، روم، ہندوستان اور چین کی ہزار سالہ حکمت کی تاریخ میں ترقی کی ایک نئی منزل سمجھی جاتی ہے۔ اس کی کتاب "قانون" پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس کی دو جلدوں میں ۷۸۵ دواؤں کے خواص بتائے گئے ہیں۔ یہ دوائیں جڑی بوٹیوں، حیوانوں اور معدنی چیزوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں بہت سی چیزیں آج بھی فن طبابت میں دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن ابن سینا کے بتائے ہوئے بہت سے نسخے گزرے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ طاقِ نسیاں کی زینت بن چکے ہیں۔

ابن سینا کے نسخے

پرندوں کے علم کے مشہور تاجکستانی ماہر آئی اے عبدالسیلموف برسہا برس سے ہنگ پامیر کے علاقہ میں سائنسی

تحقیق و تلاش میں معروف رہے ہیں
تحقیق و تلاش کے دوران انہیں پتہ چلا
کہ مقامی باشندے وسط ایشیا کے مشہور
سنہرے پرندے بز گنجے عقاب کا پِتّہ
دواؤں کے طور پر استعمال کرتے ہیں
پامیر کے باشندوں کا یہ بھی خیال ہے کہ
کٹاکرتہ یعنی پہاڑی جنگلی نیل مرغ کا گوشت
اور "پِتّہ" زخم بھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے
آج سے ہزار سال پہلے حکیم ابن سینا
نے "پِتّہ" کے خواص بتاتے ہوئے لکھا
تھا کہ ہر قسم کے "پِتّے" بصارت کی کمی کے
علاج کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ گِدھ کا
"پِتّہ" موتیا بند اور پتلی بڑھ جانے
میں مفید ہے۔ باز کا "پِتّہ" زیتون کے
تیل میں پھینٹ کر ان لوگوں کے کانوں
میں ڈالا جاتا ہے جو اونچا سننے کی
میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر اسی "پِتّے"
لیک (ایک پودے کا نام ہے) کے
عرق میں ملا کر کان میں ڈالا جائے
بہرا پن دور ہو جاتا ہے۔ اس پِتّے
روغن بنفشہ میں ملا کر کان میں ڈالا
سے آدھے سر کا درد دور ہو جاتا ہے۔
تاجکستانی طبی انسٹی ٹیوٹ کے رہنما
کا خیال ہے کہ اس علاقے کے عوام میں
طور پر اس قسم کی جو دوائیں مقبول ہیں
سینا کے ذریعے ہی رائج ہوئی ہیں۔ اور
ہے کہ یہ دوائیں بعض بیماریوں کے علاج
مفید ثابت ہوں۔
تجربہ گاہ کے سائنس داں عوامی علاج
طریقوں میں استعمال ہونے والی دواؤں
تجربہ کر رہے ہیں اور امید ہے کہ آگے چل
کے عظیم قانون کے بہت سے معمے حل کر

ہفت روزہ

دورِ حیات

پرنسس بلڈنگ ابراہیم رحمت اللہ روڈ
بمبئی ۔ ۳

جلد ۱۲ ۱۰ جون و ۲۰ جون ۱۹۷۵ء شمارہ ۱۷-۱۸

اس شمارے میں

قیمت
ایک سال
دس روپے

فی پرچہ تیس پیسے

★

ایڈیٹر
قیصر مظہر حسین

عکسِ بدن

(جان نثار اختر)

جب بھی ہنگام دار و رسن آ گیا
ہم میں کچھ اور بھی بانکپن آ گیا

اعتمادِ محبت تو دیکھے کوئی
ان میں اک خاص بیگانہ پن آ گیا

جام کی سمت جب بھی بڑھا میرا ہاتھ
جام میں تیرا عکسِ بدن آ گیا

صرف اگر خونِ دل ہو گیا غم میں
شعر کہنے کا تھوڑا سا فن آ گیا

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

ظفر کی شاعری میں وطنیت

آخری تاجدارِ ہند ابوالمظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر کا کلام حسرت و یاس، درد و غم، کرب و اضطراب اور سوز و گداز کا مجموعہ ہے۔ جس میں ظفر نے اپنی آپ بیتی، مادرِ وطن کی غلامی، اہلِ وطن کی بے بسی، زمانہ کی بے مہری اور تہذیبِ کہن کی تباہی بیان کی ہے۔ انہوں نے یہ حکایاتِ خونچکاں گل و بلبل، قفس و دام، زنجیر و زنداں، محتسب و میخانہ، صیاد و باغباں، چمن و آشیاں اور بہار و خزاں جیسی معروف و متداول علامات، شاعری کے پردے میں لکھی ہے۔ شاعری کی یہ علامتیں ویسے ہر شاعر کے یہاں اتنی موثر، بانداز در حقیقت بداماں کہیں ہیں جتنی کہ ظفر کے یہاں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ ظفر کے یہاں یہ تمام علامتیں تخلیقی واردات اور حقیقی جاگتی ہیں۔ انہوں نے ان میں وسعت و ندرت پیدا کی ——— مادرِ وطن کے لئے وہ گلستاں، چمن، باغ، میخانہ وغیرہ استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدخواہوں نیز دشمنوں کو گلچیں، صیاد اور محتسب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اور ان کے بے پناہ مظالم پر آنسو بہاتے ہیں۔

در حقیقت ظفر کی شاعری اپنے عہد کے حالات و واقعات کی ترجمان ہے۔ ظفر نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ اپنی ہلاکت خیزیوں اور ستم رانیوں کے اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ تاریک اور خون آشام [illegible]

تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اندرونی سازشوں نے اس کے دامانِ عافیت کو تار تار کر دیا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پورے ملک میں طوائف الملوکی اور افراتفری کا دور دورہ تھا۔ انتشار، بے چینی اور بدامنی سے فرنگی تاجروں نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزند تجارت کرتے کرتے حکومت پر قابض ہوتے جا رہے تھے۔ وہ تاجرانہ لباس اتار کر حکومت کا تاج پہن چکے تھے۔ اکبر و جہانگیر، شاہجہاں و عالمگیر کے جانشینوں کی حیثیت "شاہِ شطرنج" سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کی عزت و حمیت طاؤس و درباں کی شہرت اور مئے ناب میں غرق ہو چکی تھی۔ خود غرض افراد اور ارکانِ سلطنت میں میر جعفر اور میر صادق سے بڑھ چڑھ کر غدار موجود تھے۔ جو سفید فام اور مہذب نما درندوں سے ساز باز کرتے رہتے تھے اور جن کی سازشوں کا انجام یہ ہوا کہ کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور افغانستان سے لے کر بنگال تک پھیلی ہوئی وسیع و عظیم سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور اس کا حدودِ اربعہ سمٹ سمٹا کر "از دلی تا پالم" رہ گیا۔ ظلِ سبحانی کو تاجرانِ افرنگ کا وظیفہ خوار ہونا پڑا۔ پھر بھی اس کو چین نصیب نہیں تھا۔ قلعہ معلی سازشوں کا گہوارہ اور فتنوں کا مسکن تھا۔ جھوٹے اقتدار کے لئے شہزادوں کی باہمی کشمکش [illegible]

کا سحر اثر کر چکا تھا اور آلِ تیمور اپنی تباہی کے سامان خود فراہم کرتے جا رہے تھے۔

اپنی منقاروں سے خود کھینچتے تھے پھندا جال کا
طائروں پر سحر تھا صیاد کے اقبال کا

بہادر شاہ ظفر ایسے انقلاب بداماں عہد اور پر آشوب زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا، اسی کشمکش و کشاکش میں گذرا۔ بچپن سے لے کر ولی عہدی کے زمانے تک انہیں محرومیوں اور ناکامیوں کے ساتھ ساتھ مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ تخت نشینی کے زمانے تک وہ اسی طوفان میں گھرے رہے۔ ۱۸۳۷ء میں جب وہ تختِ حکومت پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت بھی انہیں سکون و اطمینان نصیب نہیں تھا۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک مسلسل جاری رہا۔ یہ سازشوں اور غداریوں ہی کی برکت تھی کہ ہندوستان کو آزادی کی پہلی جنگ میں شکستِ فاش ہو گئی۔ مادرِ وطن کو غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ اس کے سپوتوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی۔ شہنشاہِ ہند کو الٰہی بخش اور حکیم احسن اللہ خاں کی غداری کی وجہ سے اسیرِ فرنگ ہونا پڑا۔ ہندوستان کا والی اس کا سب سے بڑا مجرم، غدار اور باغی قرار دیا گیا۔ اب اس کا دیس، اس کا دیس نہیں رہا، جس دیس کی آزادی کے لئے اس نے جد و جہد کی، غلامی سے نجات دلانے کے [illegible]

بنا جن کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قربان کر
دیا اور تیسرے فاقہ میں بھی اپنے بیٹوں کا سر خوان میں
پیش کئے جانے پر تیموری آن کو قائم رکھا۔ وہ
لال قلعہ جہاں اس کے آبا و اجداد نے تین سو برس
تک اپنی عظمت و جلال کا پرچم لہرایا جن کی بدولت
ہندوستان کا وقار دنیا میں سربلند ہوا وہ دلی
جو عروس البلاد اور جہاں آباد کے نام سے موسوم
کی جاتی تھی اور جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

اسی رشک فردوس سرزمین سے اس کو نکالا
جا رہا ہے، مادرِ وطن کی آزادی کی جد و جہد
کو بغاوت قرار دیا گیا۔ شہنشاہ ہند کو مجرم بنا کر
مقدمہ چلایا گیا۔ حب وطن کی پاداش میں جلا
وطنی کی سزا دی گئی۔ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کی منحوس
تاریخ تھی، جب ظفر کو دلی سے ہمیشہ کے
لئے رخصت کر دیا گیا ؎

لئے وائے انقلابِ زمانہ کے جور سے
دلی ظفر کے ہاتھ سے پل میں نکل گئی

اور وہ ایک ایک چیز کو حسرت آمیز نگاہوں
سے دیکھتے ہوئے رنگون چلے گئے ؎

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں

رنگون میں اسی عالم بے چارگی اور کسمپرسی
کے ساتھ چار برس تک جلا وطنی کی زندگی
گزارتے رہے آخر ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو فرشتہ
موت کو رحم آیا اور اس نے ظفر کو قید فرنگ
اور قید حیات دونوں سے نجات دے دی۔
وطن کے اس فدائی کی تاریخ بھی "بجھا ہے چراغ
دہلی" سے نکلی۔ پورا قطعہ یہ ہے۔

سراج الدین بو ظفر مسافر، ہو سوئے جنت ہو روا
کہ جس کے باعث سے دلکشی سے جھلک رہا تھا دیا جہاں
چلے جو دہلی جلوس کا ہے سو سب ہی دیکھو مطابق اس کے
سروش غیبی نے سال رحلت کہا "بجھا ہے چراغ دہلی"

ایسا دل گداز حادثات میں ظفر کی عمر گذرے
اور ان کا دل متاثر نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟
وطن کی محبت کا جذبہ تو فطری جذبہ ہوتا ہے
کون ایسا انسان ہے جس کا دل اس جذبے سے
خالی ہے؟ انسان تو انسان حیوان بھی اس جذبہ
سے خالی نہیں۔ کیا وطن کا ذرہ ذرہ سورج
سے زیادہ روشن اور چاند سے زیادہ حسین
معلوم نہیں ہوتا؟ کیا وطن کے کانٹے بھی پردیس
کے پھولوں سے اچھے اور پیارے نہیں معلوم
ہوتے؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ

خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر
خاک وطن از ملک سلیمان خوشتر

کیا ایک محب وطن کی دلی یہ نہیں ہوتی؟

ٹھوکریں کھاؤں پر چمن میں رہوں
کانٹے چنتا ہوا چمن میں رہوں

کیا وطن کی محبت ایمان کا جزو نہیں ہے، اور
کیا اس میں کوئی مبالغہ ہے؟

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

کیا اس حقیقت سے کسی کو انکار ہے؟

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی میکرد
می گفت گدا بودن کنعان خوشتر

پھر بہادر شاہ ظفر تو بہر حال اپنے ملک کے
بادشاہ تھے۔ ان سے تخت و تاج چھینا گیا
ان کو شہر بدر نہیں ملک بدر کیا گیا ان کے سامنے
ان کے جگر کے ٹکڑوں اور ان کی محبوب رعایا
کو قتل کیا گیا۔ مادر وطن کی اینٹ سے اینٹ
بجا دی گئی۔ یہ ظلم و درندگی ہو، یہ خون آشامی
و غارت گری ہو جو ہم وطن اور وطن والوں پر ظلم و ستم
کے پہاڑ توڑے گئے ہوں تو ظفر کا دل متاثر نہ ہو؟
یہ ناممکن ہے؟ یہ انسانی فطرت کے خلاف
ہے پھر یہ کیونکر تسلیم کر لیا جائے گا،
"واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے
کلام میں شکوۂ غم روزگار اور گردش آسمان ضرور
ملتا ہے مگر کسی سیاسی جذبے کی تلاش ان کے
یہاں نہ کرنی چاہیئے۔"

جن کی گھٹی میں سیاست پڑی ہو، جنہوں
نے سیاست کے گہوارہ میں پرورش پائی ہو،
جس کی پوری عمر سیاست اور سیاسی کشمکش
میں گذری ہو، کیا ان کے احساسات و جذبات،
خیالات و رجحانات پر سیاست کے گہرے
اثرات نہ ہوں، ان کے کلام میں، اشاروں و
کنایوں میں بھی ان کی ترجمانی نہ ہوگی؟ سیاست
کے ساتھ کیا وطنیت کا رجحان نہ پایا جائے گا
ذہن سلیم کو یہ یقین نہیں آتا۔

درحقیقت یہ غلط فہمی انداز بیان کی وجہ
سے پیدا ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے
کلام ظفر کے فن پر تو زیادہ توجہ کی گئی۔
لیکن ان کی شخصیت اور نفسیاتی کیفیت کا
تجزیہ بہت کم کیا گیا۔ کوئی شک نہیں کہ "کلام
الملوک ملوک الکلام" کی مثل ظفر کے کلام پر
صادق آتی ہے قلعۂ معلیٰ کی ساختہ و پرداختہ
حوض کوثر سے دھلی ہوئی دلی کی ٹکسالی زبان
ظفر کی زبان ہے ان کی زبان میں جو لطافت و
پاکیزگی، سلاست و روانی، دلکشی و
رعنائی ہے، ان کے لہجے میں جو حلاوت
و شیرینی اور جذبات میں جو صداقت اور
گہرائی ملتی ہے وہ دوسرے باکمال شعراء کے
یہاں کہاں؟ اسی لئے ان کا انداز بیان دلکش
اور موثر ہے زبان و بیان پر قدرت کاملہ
کی بدولت ظفر نے اپنے جذبات کا اظہار رمز و
کنایہ میں سیکڑوں طرح سے کیا ہے۔

پا سکے رمز و کنائے کو وہی اس کے ظفر
جس کو ایک بات میں سو طرح کا پہلو نکلے

ظفر کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تک ظفر کی شاعری کے صرف چند پہلو اجاگر کیے گئے ہیں۔ خصوصیت سے ان کی المیہ شاعری، اخلاقی مضامین، عاشقانہ شاعری، مذہبی اور صوفیانہ شاعری، نیز ان کے تغزل پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے، زبان و بیان کے محاسن ظاہر کیے گئے ہیں، لیکن کیا ظفر کی شاعری صرف انہیں خصوصیات اور محاسن پر مشتمل ہے؟ کیا شکوۂ غم روزگار اور گلۂ ستم آسمان میں اُن کی آپ بیتی اور جگ بیتی شامل نہیں ہے۔

ظفر نے غزل کو اپنے سخن کا پردہ بنایا اور اسی صنف میں اپنے دلی جذبات اور قلبی واردات بیان کیے، غزل کی زبان رمز و کنایہ کی زبان ہے اس میں صراحت کیساتھ صاف صاف نہیں بیان کیا جاتا غالب نے اسی لئے تو کہا تھا کہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور اقبال نے بھی یہ تسلیم کیا کہ

ہمہ ہنر حرفِ نگفتن کمال گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

ظفر نے بھی رمز و ایما، اور کنایہ و اشارہ میں بات کہنے کا دعویٰ کیا ہے اور ایک ایک اشارہ میں سو سو طرح کے پہلو بتائے ہیں۔ پھر کیا یہ اشارے صرف حسن و عشق کے ہی اشارے ہیں؟ کیا ان میں خود ان کی اور ان کے وطن کی محبت پوشیدہ نہیں ہے؟ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ظفر بہرحال بادشاہ تھے تیموری جاہ و جلال کا آخری یادگار تھے۔

عام انسانوں کے مقابلہ میں ان کی تہذیب و معاشرت بلند تھی، سنجیدگی و کم آمیزی اور لیے دیئے رہنے کے اصول کے پابند تھے اسی لئے وہ ایک حد تک مجبور تھے کہ اپنے خیالات اشاروں اور کنایوں میں بیان کریں ان میں سے ایک اشارہ "وطنیت" بھی ہے جس میں ہندوستان کی عظمت اور وطن سے بے پناہ محبت کے نغمے موجود ہیں۔ یہ نغمے بھی وطن کی بے کسی و مجبوری پر دکھ کی پکار بن جاتے اور کبھی وطن کی آزادی کے لئے سعی و عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ ظفر کے لئے وطن کے نغمے نئے بھی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے اسلاف سے بھی وطن کی عظمت و شان کے راگ سنے۔ ہندوستان کی غلامی و محکومی پر دردِ روز صدائیں سنیں۔ مادرِ وطن کی تباہی و بربادی پر خون کے آنسو بہتے ہوئے دیکھے اور وہ اس سے بھی واقف تھے کہ

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
وہ بھی فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی
(مصحفی)

اور ان کے کانوں میں یہ پُرسوز آواز بھی پہنچ چکی تھی،

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گذری
(راجہ رام موزوں)

میر اور سودا کی یہ دردناک آواز بھی سن چکے تھے،

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کس نے رکھا یاں قدم نہیں معلوم

ظفر کے معاصر شعراء میں بھی وطنیت پائی جاتی ہے۔ غالب نے عالم جنوں میں حکایاتِ خونچکاں لکھی اگرچہ ان کے ہاتھ قلم کیے گئے۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اسی طرح مومن نے بھی اپنے گھر کی ویرانی پر آنسو بہائے ہیں اور ۱۸۵۷ء کے بعد تو شہر آشوب بکثرت لکھے گئے، جن کو پڑھنے کے بعد کلیجہ منہ کو آتا ہے

جب ان تمام شعراء میں وطنیت کی جھلک پائی جاتی ہے تو ظفر کے کلام میں ان سب سے زیادہ ہونا چاہیے اگر کلام ظفر کا مطالعہ سرسری طور پر کیا جائے تو سینکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو حب وطن میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ کلام ظفر میں وطنیت، اپنی پوری توانائی اور رعنائی کے ساتھ موجود ہے یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں وطنیت کا مفہوم وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ آج کے نظریہ وطنیت کی روشنی میں اس زمانے کی وطنیت کو پرکھنا مناسب نہیں ہے تاہم اس وقت بھی یہ تو تھا ہی کہ اپنے وطن کی فلاح و اصلاح اور تعمیر و ترقی، بے لوث خدمت اور ایثار و قربانی سچی حب الوطنی سمجھی جاتی تھی، ظفر کے کلام میں یہ تمام اشارے واضح طور پر موجود ہیں۔

ظفر کے کلیات میں چار دیوان ہیں یہ چاروں ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہیں۔ زمانۂ اسیری کا کلام کلیات میں شامل نہیں ہے اور متعدد رسائل

و کتب میں منتشر طور پر پایا جاتا ہے کلیات میں غزلوں کے علاوہ مستزاد، مخمس، مسدس، قطعہ، تضمین، نعتیہ قصائد، شہر آشوب، مرثیہ، سلام، مجرا، سہرا، پنکھا، ہولی، ٹھمری، بھجن، گیت سبھی کچھ موجود ہے۔ فارسی کا بھی کافی اور پنجابی زبان میں بھی متعدد غزلیں اور گیت ہیں۔ ان سب میں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں وطنیت پورے طور پر نمایاں ہے وطن کی عام تباہی و بربادی اور اغیار کے ظلم و ستم کا نقشہ کس قدر موثر انداز میں بیان کر رہے ہیں۔

ہزار حیف کہ بلبل کا صحن گلشن میں
نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشاں پر
کیسی ہوا چلی چمن دل میں لے ظفر
سب برگ و بار نخلِ تمنا کے جھڑ پڑے

چمن ہے گریہ شبنم سے تختۂ دامن
وگرنہ کس کو ہے نظارۂ چمن کا ہوش

بُرا ہو جو آباد تھے اس شہر میں میخانے برسوں
ہزار افسوس ہے بلبل چمن میں
رہا میرا نہیں اب ایک پر تک

کہیں ٹوٹے ہوئے شیشے پڑے ہیں اور کہیں ساغر
خرابی میکدہ میں آج اے پیر مغاں کیا ہے
اک گل بھی دیکھتے تو نہیں اے صبا کہیں
ویراں کیا خزاں نے یہ گلشن کو لوٹ کے

توڑے ہے شیشے میکدہ میں محتسب مدام
ساقی پڑے خدا کا غضب اس پہ ٹوٹ کے
میکشوں کے حال پر روتے ہیں کیا کیا مے فروش
محتسب نے جو لگایا ہر دکاں پر قفل ہے۔

جہاں چمن میں نشیمن تھے بلبلوں کے ظفر
ہزار حیف کہ وہ آشیاں زاغ بنے

کسی ایک شاعر کے کلام میں وطن سے اس والہانہ محبت کا جواب اردو شاعری میں مشکل سے ملے گا۔

حسرت ہے اس اسیر قفس پر کہ جس کے پر
اڑتے پھرے ہیں بعد فنا بھی چمن کے گرد
خاک بھی ہو گی ترے کوچے میں اپنی برباد
ہم تو مر کر بھی یہاں سے نہیں جانے والے
گوشِ گل تک مری فریاد تو پہنچے صیاد
رکھ قفس کو مرے ظالم نہ گلستاں سے دور
کیا ہے خاک عاشق کی اگر برباد ہو جاتی
پر اس کوچے میں اے بادِ سحر پہنچا تو دی ہوتی
اڑ کے جا سکتے چمن تک نہیں مرغانِ قفس
اے صبا آن کا اڑا کر کوئی پر لوتے جا

احسان کرے اسیر قفس پر نسیم صبح!
اک برگ گل جو لادے چمن سے قفس تلک
ایک مدت سے مری خاک کا مٹی تھی خراب
بارے اس کوچے میں اے بادِ سحر پہنچ گئی

قفس کے چاک میں گل رکھ کے منت اٹھا دیا
کہ ہر بلبل شیدا ہے یہ چراغ قفس!
اے صبا یہ بھی غنیمت ہے قفس سے کچھ برگ
اڑ کے دو چار چمن میں مرے پر جا پہنچے
ظفر آتی ہے جان بلبل میں
جب قفس میں سے بوئے گل آتی

غربت اور اسیری میں وطن کی یاد بے طرح ستاتی ہے۔ ایک طرف صیاد جفا پیشہ ہے جس کی سختیوں نے اسیر قفس سے طاقت پرواز چھین لی۔ دوسری طرف دیدار وطن کی تمنا ہے جس کے لیے دل، دن رات تڑپ رہا ہے حسرت و یاس کا یہ کشمکش ظفر کے کلام میں انتہائی کرب پیدا کر دیتی ہے اور اس کو سوز و گداز، حسرت و تمنا کا مرقع بنا دیتی ہے۔

حسرت اے طاقت پرواز کہ ہم اڑ نہ سکے
گر کے پھڑ پھڑا کے دیوار گلستاں کے تلے
اسیران قفس کا دم ہوا ہوتا ہے حسرت سے
چمن سے کیا کوئی جھونکا نسیم صبح کا آیا

یا کبھی رہتے تھے گلشن ہی میں مدت سے
ہم قفس میں ہیں صبا، گل کی خبر کے محتاج
چمن سے دور رہا اس قدر قفس میرا
کہ پہونچی اڑ کے نہ مجھ تک کبھی چمن کی بو
تا باغ ہم نہ پہونچے، قفس ہی میں مر گئے
کہہ کہہ کے ہائے ہائے چمن ہائے ہائے باغ
مر گئے آخر پھڑک کر دام سے چھوٹے نہ ہم
دل کا دل ہی میں تمنائے رہائی رہ گئی

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر
اور بھی دو چار نالے ہم قفس میں کھینچ لیں۔

آزادی کے لیے جد و جہد کی ترغیب اور اہل وطن کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے سعی پیہم بھی ظفر کے کلام میں مفقود نہیں ہے۔

قفس کے ٹکڑے اڑا دوں پھڑک پھڑک کے آج
ارادہ میرا اسیرانِ ہم نفس یوں ہے
قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں!

شہر آشوب، بھجن، اور ہندی کے گیتوں میں بھی وطن کے اس فدائی کی پکار موجود ہے۔

بادِ صبا اڑا نے چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دست ہم کفِ افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک
شاداب جیسے خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہو لا خار نخل مغیلا نہال ہوں
جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہوئے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانہ زنداں یہ آسماں!
چھٹنا محال اس سے ہو جب تک ہے تن میں جاں
جو آگیا ہے اس محیط نیرہ رنگ میں
قیدِ حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

اور یوں تو پوری غزل ان کا درد انگیز داستان کا ترجمان ہے۔

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آبادیاں گھر تھے
شغال اب ہیں جہاں بستے کبھی بستے بشر یاں تھے

ظفرؔ احوالِ عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

کتنے ہی بن کے شہر کے اور گاؤں کے نشاں
یوں مٹ گئے زمیں پہ کہ جوں پاؤں کے نشاں
گر نخلِ خشک کوئی کہیں رہ گیا ظفرؔ
پائے نہ اس کے پاؤں تلے چھاؤں کے نشاں

مجنوں کی اس پرسوز نے سے پتھر کا دل بھی پگھل جاتا ہے۔

جن گلیوں میں پہلے دیکھیں لوگوں کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو ان لوگوں میں ہوئی پڑی وہ گلیاں تھیں
روز بہاراں لوٹتے تھے وہ جا جا کر جس باغوں میں
شوقؔ پھر رنگ بہ دیکھا وہاں نا پھول نہ کلیاں تھیں

اسیری کے زمانے کا کلام تمام تر دکھ ہی کا پکار ہے
اس میں جو شدید کرب اور بے چینی پائی جاتی ہے
عالمِ غربت میں بے کسی و بیچارگی اور کسمپرسی کا
جو غم انگیز احساس پایا جاتا ہے وطن کی بے پناہ محبت
کا جو جذبہ ملتا ہے سخت سے سخت دل بھی ان سے
متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
بدعا یا ہند تبہ ہوئی کہو کیا کہ ان پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ شہر دہلی تھا اک چمن کہو کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تُلے خارِ غم کو وہ کیا سہے
ملے طوقِ قید میں جب انہیں کہو گل کے بدلے یہ ہار ہے
نہ دبایا زیرِ زمیں انہیں نہ دیا کسی نے کفن انہیں
نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے
نہ غنچہ ہے نہ شگفتہ ہے پڑا ہے باغ ویرانہ
نہ گل ہے اور نہ بلبل ہے نہ ساقی ہے نہ پیمانہ

نکل جائے اگر دم بھی اسی گلشن کے تصور میں
پسِ دیوارِ گلشن لے ظفرؔ اب ہم کو دفنانا
لیکن افسوس ظفرؔ کی یہ تمنا پوری نہیں ہوئی کیونکہ
انہوں نے پہلے جو پیش گوئی کی تھی کہ
نہ ہوا نصیب وطن انہیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے
وہ حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔
پے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی شمع لا کے جلائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں
ظفرؔ کی حبِ وطن کی یہ داستان سادہ اور نامکمل
رہ جائے گی اگر ان کی ہولی سے اس کو رنگین نہ بنایا جائے

ہند میں کیسو بھاگ بچوری   جھولا جوری
پھولوں کا تختہ ہند بنا تھا
کیسر کی کیسی کیاری
کیسو پھوٹے بھاگ ہمارے
لٹ گئی باگ بہاری !
لٹ گئی سب پھلواری
گولن کے گلال بنائیو
توپن کی پچکاری
آئے رہی سگری مکھ پر
ایسی تک تک ماری !
شور دنیا میں مچوری
گنگارام بھی دیا نے تخت کا ناس کیوری
اور کو دُنے کا ہے ایسا پاپ کیوری
سر آپ سب کا لیوری
بہادر شاہ درگا جی مردنے
دین کا ساتھ دیوری
مرتے دم تک اس پرکیا نے
دین ہی دین کیوری !
نام اس رب کا لیوری
ہند میں کیسو بھاگ مچوری
جور جوری

مظفر حنفی

غزل

جس میکدے میں جام مرے روبرو نہ آئے
اس میکدے کا نام مرے روبرو نہ آئے

مجھ سے نہ ہو سکے گا روایت کا احترام
زلفِ سیاہ فام مرے روبرو نہ آئے

کھل جائے گا بہار کی تشنہ بندی ہوئی
پھر باغباں کا نام مرے روبرو نہ آئے

یا رب مرے قیام کا امکاں ہو جہاں
ایسا کوئی مقام مرے روبرو نہ آئے

میری کسی کے ساتھ کوئی دوستی نہیں
اب نامہ و پیام مرے روبرو نہ آئے

لوگو "چراغِ شام" مجھے ناپسند ہے
دیکھو چراغِ شام مرے روبرو نہ آئے

پردہ جو بیچ میں تھا مظفرؔ نہ اٹھ سکا
بڑھ کر وہ چند گام مرے روبرو نہ آئے

آمنہ ابوالحسن

انجان

ونیش کا موڈ آج بے حد خراب تھا باہر سے لوٹ کر اس نے دروازہ کھولا تو کمرے کی ساری تنہائی اور اداسی ایک دم اس کے دل میں سمٹ آئی اور ناگن کی طرح پھنکار پھنکار کر ڈسنے لگی ــــ

بہار چارپائی پر سکڑی ہوئی پڑی تھی۔ چونکہ اس نے اونگھنا برخواست کر دیا۔ سر اٹھا کے ونیش کو دیکھا پھر چارپائی سے کود کر اس کے پیروں میں لوٹنے لگی۔ ٹپ ٹپ ٹپ کئی آنسو ونیش کی آنکھوں سے ٹپک گئے۔

زندگی کے بے پناہ اندھیرے میں بہار کا وجود روشنی کی ایک ہلکی سی رمق، محبت اور اپنائیت کا ایک ذرا سا سرور۔ اگر بہار نہ ہوتی اگر وہ اسے اتنا نہ چاہتی تو ـــــ؟!

ونیش کو اپنا وجود اس پتھر کی طرح لگا جس پر زمانہ کے سمندر نے گہری کائی جما دی ہو۔ کائی جس پر پیر پڑتے ہی آدمی پھسل کر دور جا گرے۔

اس نے بہار کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کی ملائم پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے لمحہ بھر کے لیے قرار آ گیا۔

بہار کی آنکھیں محبت سے بھری ہوئی تھیں ایسی محبت سے جو اسے دنیا میں کسی انسان سے نہیں ملی۔ دیر تک وہ اسے سہلاتا چومتا رہا پھر یک لخت بے چین ہو کر باہر نکل گیا۔

اگر بہار کے ساتھ اس کمرے میں اس کے ماں باپ بھی ہوتے؟

اس کی ایک گھر والی بھی ہوتی ـ؟؟

اس کے بچے بھی ہوتے تو۔؟!؟

تو یہ زندگی کیسی خوبصورت کیسی حسین کتنی قیمتی ہوتی؟!..

اسے اپنے بچپن کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ عقل آنے پر اس نے خود کو بہت سے بچوں کے ساتھ کھیت میں پھول چنتے ہوئے پایا، دو وقت کا کھانا اور کپڑا اسے وقت پر مل جاتا۔ رہنے کے لئے ایک بڑا سا کھپریل کا کمرہ تھا۔ پھول چننے والے بچوں میں سے کچھ تو اپنے گھر چلے جاتے اور کچھ اس بڑے کمرے میں آ کر جمع ہو جاتے۔ شائد اس کی طرح کے بچے جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ لڑتے جھگڑتے گاتے ناچتے۔ بھی بھونڈی اور معصوم نقلیں اتارا کرتے پھر پڑ کر سو جاتے۔

ان کا مالک ایک توندیل آدمی تھا۔ فرصت کے اوقات میں بچوں کو داؤں سکھانا اور کمزور کو بہادر سے چت کروا دینا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بہت سے بچے محض اس کی ـــ۔ ذرا سی تعریف کے لئے گھنٹوں مٹی میں لڑتے رہتے۔ ہاتھا پائی کرتے پھر اپنی تعریف سن کر اس طرح مسکراتے جیسے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر آئے ہوں۔

ونیش کو پہلے تو مالک سے پھر ایسے تمام تعریف کے بھوکے بچوں سے شدید چڑ ہو گئی۔ [illegible] انکار کر دیا [illegible] کھت کر رہ [illegible] اور کم ہمتی [illegible] کھا کر رہ جاتا [illegible]

پھر جب وہ [illegible] نے اسے کھیت سے ہ[illegible] رکھ لیا ــــ

مالک کی نئی بٹیاں تھیں [illegible] سب ضدی اڑیل اور [illegible] طرح طرح کے کام لیتے پھر [illegible] اور دن بھر جتے رہنے کے ـــ۔ مالک سے شکایت کرتی [illegible]

کام چور ہے صرف گوندا بھر کھا [illegible] تو ونیش کی آنکھوں میں خون اتر [illegible] کے کان کی لویں جلنے لگتیں۔ اگر [illegible] کھائے تو کام کس طرح کرے۔ اسے [illegible] کی چیزوں پر گڑی رہنے والی نگاہیں تھیں اس لئے ایک روز چپ چاپ د[illegible] کا گھر لانگ گیا اور کسی فیکٹری میں ملازم [illegible]

پہلے پہل وہ صرف ونز ڈھوتا رہا پھر ساتھیوں کی کرپا سے مشین چلانا بھی سیکھ گیا او[illegible] یہیں سے اس کی ایک مستقل مربوط زندگی شروع ہوئی۔ لیکن یہ زندگی ایسی ہی تھی جیسے بند کمرے کی گھٹی ہوئی ہوا۔ ٹھنڈک اور سرور سے بے بہرہ ــــ

وہ ہر وقت اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتا ۔
ہنسی اس کے ہونٹوں کو چھو چھو کے گزر جاتی
قہقہہ نہ بن پاتی۔ فیکٹری والے اس کی محنت
اور ایمانداری سے خوش تھے لیکن ساتھی اس
کی علیحدگی پسندی اور خاموشی سے عاجز۔
وہ پوچھ پوچھ کر ہار چکے تھے۔ لیکن دنیش
کے پاس ان کے سوالات کا کوئی جواب نہ تھا
وہ انہیں کس طرح کہتا۔ اسے اپنے ماں باپ
کا حال معلوم نہیں۔ ماں باپ نے اسے بیچ
دیا۔ کسی ناگہانی میں پھنس گئے یا مر کھپ گئے۔

یا — یا —

ایک اور خیال جو اس کے کلیجے میں
کانٹا بن کر چبھ جاتا یہ تھا کہ کہیں وہ "ایسی
ویسی اولاد" تو نہیں۔ سڑک یا کسی کونے
کھدرے میں پھینکی ہوئی! لیکن ایک دن
ایک بوڑھے پنواڑی نے اسے پہچان کر
بتا دیا وہ بالکل اپنے باپ سے ملتا جلتا ہے
اس کی پیدائش ہی اس کی ماں کی موت کا
سبب بنی تھی اور باپ بھی کچھ دن بعد کسی وبا
کا شکار ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ تب محلے والوں
نے اسے پھول والے کے حوالے کیا تو آگے
سننے کی دنیش کو خواہش نہ رہی۔ اس بات
کے سکون کے باوجود کہ وہ ایک جائز ہستی
ہے۔ اپنی پیدائش کے ساتھ ہی ناخوشگوار
حادثات کی بات نے اس کے ذہن کو اس
حد تک جکڑ لیا کہ وہ کسی سے ملتے جلتے کسی
کی خوشیوں میں حصہ لیتے کسی کی ہنسی میں شریک
ہوتے ڈر محسوس کرنے لگا کوئی اسے منحوس
نہ کہہ دے اس خوف نے اسے دنیا سے
بہت دور پرے کھینچ لیا۔ فیکٹری کے ایک
ساتھی نے سفارش کر کے کمرہ دلا دیا اور وہ
نہایت خاموشی سے اس کمرے کی ویران فضا
میں بھرپور جوانی کی دبی دبی سانسیں لینے لگا۔

ایک روز جب وہ فیکٹری سے لوٹ
رہا تھا اس نے ایک عورت کو دیکھا جو
کندھے پر تھیلا لادے تیز تیز جا رہی تھی۔
تھیلے کی ہلچل نے دنیش کو پریشان کر دیا۔ وہ
خود کو عورت کے تعاقب سے باز نہ رکھ سکا
کافی آگے بڑھ کر عورت نے تھیلے کا منہ کھولا
اور اسے الٹ دیا ——

یہ بہار تھی، جو ادھ موئی ہو گئی تھی جسے چلنا
بھی دوبھر تھا دنیش نے اسے اٹھا لیا۔ نکڑ
کے حلوائی سے دو آنے کا دودھ خریدا۔
اسے یقین تھا وہ دودھ پی کر بھاگ جائے گی
لیکن بھاگنے کے بجائے وہ اس کے قدموں میں
بیٹھ گئی اور دنیش نے اس کا نام بہار رکھ دیا۔

اسے بہار اس لئے پسند تھی کہ بہار کے منہ
سے کوئی کڑوی بات سننے کا کبھی بھی گمان نہ ہو سکتا
تھا۔ وہ پابندی سے دنیش کے ساتھ کھانا
کھاتی چائے پیتی پھر اس کی چارپائی یا پیروں
میں لوٹتی رہتی۔ دنیش اس کی وفاداری کی
اتنی ہی قدر کرتا جتنی ہمسایہ اچھے ہمسائے
کی کرتا ہے تب سے وہ اس کی مستقل ساتھی
تھی جب کہ لوگ اس سے مل کر بچھڑ چکے تھے۔

یہ سب سوچتے سوچتے دنیش اس
بلندی تک پہنچ گیا جہاں اپنی سنسان شامیں
گزار کر اسے یک گونہ سکون حاصل ہوتا۔
چٹانوں کے سینے میں بسایا گیا باغ جہاں
پہونچ کر شہر بالکل کھلونا لگتا اور انسان
بونے ——

دنیش کام سے لوٹ کر اکثر یہاں آیا
کرتا۔ یہاں سے وہ زندگی مل پاتی جسے کھینچ
زندگی کہا جا سکتا۔

وہ اکیلا ہوتا لیکن آنے والوں کے ساتھ
لڑکیاں بچے اور گہما گہمی ہوتی۔ دنیش خود کو ان
میں شامل سمجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دیتا اور
خوش ہوتا رہتا۔

کوئی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرا دیتی یا کوئی
بچہ کھیلتے کھیلتے اس کی گود میں آ جاتا تو دنیش
کی شخصیت پھیل کر ایک نقطے سے کائنات بن جاتی
وہ اس ننھے بچے کی طرح شوخ اور چنچل
بن جاتا جسے ڈھیر ساری نعمتیں خلاف توقع
مل جاتیں۔

ایسی چھوٹی موٹی خوشیوں نے اسے مرنے
سے بچائے رکھا۔ اس کے پاش پاش ریزہ
ریزہ وجود کو اپنی مضبوط گرفت سے باندھ کر
لیکن زندگی کے کڑے چالیس برس اچانک ہی
اس گرفت سے نکل کر تنکوں کی طرح بکھر گئے۔

نینا جو دنیش کی پڑوسن تھی جسے دنیش
صبح و شام اپنے کمرے کی دراز سے جھانک
جھانک کر دیکھا اور خوش ہوا کرتا تھا۔ ہفتہ بھر
قبل اس کی مسرتوں کے منہ پر طمانچہ مار کر ہنستی
کھیلتی اپنے کنہیا کے گھر سدھار چکی تھی۔ اور دنیش
بہت بے قرار تھا۔ کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح
شانتی کی تلاش میں۔ مگر شانتی کہیں نہیں تھی۔ اتنے
بڑے آفاق کے کسی کونے کسی گوشے میں۔

بہار کی رفاقت نے اسے بہت سہارا لیکن
بہار انسان تو نہ تھی

وہ دفعتاً بے حد تھک گیا۔ آدمیوں کے
ہجوم سے کھسک کر سبزے کی چھتری کے نیچے
آ گیا ——

نیچے بہت نیچے گہرائی میں اس کے گھر
جانے والی سڑک کسی دوشیزہ کی صاف ستھری

مانگ کی طرح جگر جگر کر رہی تھی۔ اس ایک کمرے کا راستہ جس پر برسوں وہ چپ چاپ تھکا ماندہ چلتا رہا اور جس کی تنہائی میں گھٹ گھٹ کر زندگی گذارتا رہا۔

پھر دور اسے وہ ہوٹل نظر آیا جہاں ایک مرتبہ سنگھ اسے ساتھ لے گیا تھا۔ سنگھ کے ساتھ للیتا تھی —— للیتا گیہوں کے دانے کی طرح گندمی تھی۔ اس کے چہرے پر دھوپ جیسی تپش تھی۔ اس کا جسم چٹان کی طرح سخت تھا اس کی آواز اس ڈرم کی طرح تھی جسے بچے مسلسل پیٹ رہے ہوں اور آنکھیں املی کے بیجوں کی طرح مانند جن میں کسی جذبے کا عکس بے معنی تھا۔ لیکن بہرحال للیتا ایک لڑکی تھی —— ایک ساتھی ——

اور سنگھ کا کہنا تھا۔ بغیر ساتھی کے جیون اس سڑک سے مشابہ ہوتا ہے جسے دن بھر میں ہزاروں قدم چھو دیں لیکن آہٹ ختم ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا جائے۔ سڑک کا سینہ خالی ہو جائے۔

سنگھ نے اسے ساتھی حاصل کرنے کے گر بھی بتائے گئے تھے۔ لیکن وہ ازل کا ڈرپوک آگے رکھی ہوئی چیز چھوتے ہوئے بھی ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی ٹوک نہ دے۔ کہیں نینو ا برا نہ مان جائے نینو ا جس نے کبھی اسے مخاطب نہیں کیا۔ اس سے دو قدم والی کوٹھری میں چپ چاپ رہتی رہی۔ اور وہ خود ہی صبح و شام اسے دیکھ دیکھ خوش ہوتا رہا۔

پھر دور اسے بینڈ کی روشنیاں نظر آئیں بینڈ پر اسے لالو لے گیا تھا۔ لالو گرمی میں قلفی لگاتا اور ٹھنڈے دنوں میں کباب کلیجے بیچا کرتا۔ لالو نے زمانے کے سرد و گرم دیکھے تھے۔ لالو کی آنکھیں کچوں کی طرح سکار اور زہر بھری تھیں۔ ان میں اس ساری زندگی کا عکس موجود تھا جو جھوٹ اور دغا فریب کے سہارے گذار دی گئی ——

لالو محنت کرتا تھا لیکن اس کے اندر کا انسان زمانے سے ہار کر مدت ہو کر اپنا ضمیر بیچ چکا تھا۔ دن بڑے اطمینان سے قلفی اور کباب کلیجوں میں الم غلم چیزیں ملاتا اور اسی بڑی بلڈنگ کی نچلی منزل میں رہا کرتا جہاں دوسرے مالے پر دنیش رہتا تھا۔

اس بلڈنگ کے پچاسوں کمرے تھے اور ہر کمرے میں محنت کش لوگ بسے ہوئے لیکن لالو ان میں ایک تھا۔ اس کی ساری بلڈنگ والوں بلکہ دنیا جہان سے شناسائی تھی اس کے گھٹے ہوئے کمرے میں قریب قریب رات بھر چراغ جگمگاتے اور سویرے سویرے بجھ جاتے۔ لالو کا کہنا تھا۔ زندگی ایک جال ہے جس میں بکھرا ہوا دانہ چننے کے لئے بھی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔

صرف ایک شام وہ لالو کے ساتھ گیا تھا۔ بینڈ پر روشنیاں تھیں۔ تفریح کی دلدادہ لڑکیاں تھیں۔ سایہ دار درخت تھے اور موٹروں کی ریل پیل تھی مگر یہ سب کچھ دنیش کی ہستی سے کتنی دور کتنا پرے ——

دنیش کا کرچی کرچی وجود وہاں پہنچ کر بھی ایک سالم ٹکڑا نہ بن سکا تھا اور لالو کے روکتے روکتے وہ لوٹ آیا تھا۔

پھر اسے ریل کی وہ پٹری نظر آئی جو ناگن کی طرح لہراتی بل کھاتی دور تک زمین کی چھاتی پر رینگتی چلی گئی تھی ——

جس کی دوسری طرف گھروندوں جیسے مکانات تھے جن میں لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہتے آئے تھے۔

جہاں ایک بار اسے مانی لے گئی تھی۔ مانی نے اسے شربت پلایا تھا اور اس کے لئے مسکرائی بھی تھی لیکن جلد اکتا گئی اور وہ شربت دل چلا آیا۔

پھر مانی اس سے ہمیشہ نہیں ملی ہے۔ زندگی کے کولھو میں اپنی گردن جھکائے رکھنے والا۔ مانی بلڈنگ میں صفائی پر متعین رہتا تھا۔ مانی کی لالو سے دوستی تھی لیکن لالو کا کہنا تھا۔ مانی عورت نہیں ڈائن ہے وہ شربت میں افیون ملاتی ہے اور جو شخص نشہ کی مار میں آ جائے اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔

دنیش نے کئی مرتبہ سنجیدگی سے سوچا تھا کیا ہر عورت مانی ہوتی ہے؟ لیکن عورت کے متعلق اس کے نظریات اٹل تھے۔

عورت اس کے پاس وتا رتی، ماں تھی، سیتا تھی، ساوتری تھی ہماری جھانسی تھی، چاند بی بی سلطانہ تھی اور اس کے دور کی عورت تو ویلنٹینا ترشکووا تھی۔

مانی تو محض ایک ایسی شکل تھی جسے بیچاریوں نے بگاڑ دیا۔ اس لئے اس نے کبھی مانی کے کہنے کا برا نہ مانا تھا۔ نہ اس پر اپنا ویر ہونا ثابت کرنا چاہا۔ بلکہ اس نے کبھی کبھی مانی کو سمجھایا۔

عورت کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے اپنے رتبہ کو سمجھو۔ لیکن کوڑا کرکٹ اور غلاظت صاف کرنے والی مانی اپنے من میں موتی نہ پال سکی۔ اور بیچاریوں سے انتقام لے لے کر خوش ہونے لگی۔

پھر اسے بے شمار انسان، درخت، موٹریں جانور، گاڑیاں نظر آئیں۔ اس بڑے کینوس کی طرح جو کسی مصور کے ذہن میں پھیلا ہوا ہو اور تخلیق کے لمحے کا انتظار کرتا ہو۔

لیکن یہ لمحہ؟

دنیش کو یقین ہو گیا۔

مصور کے ذہن میں دور دور تک اس
ٹھکانہ نہیں اس وسیع و عریض کینوس میں اس
کے لئے کہیں کوئی موزوں مناسب جگہ نہیں تب
ایسی زندگی کا فائدہ ہی کیا جو کوڑے کچرے کی طرح
ایک گوشے سے دوسرے گوشے پر منتقل ہوتی رہے
امید کر سمیٹ میلاموں نے برسوں کی مسافت
آنسو پونچھتے طے کر ڈالی تھی لیکن اب —
نیتو کے بچھڑ جانے اور تنہائی کے مستقل ہو جانے
کے احساس نے زندگی کی آخری خواہش بھی اس سے
چھین لی۔

ہجوم بڑی حد تک چھٹ چکا تھا۔ بچوں کی
قلقاریاں اور دوشیزاؤں کی چھلی بھری مسکراہٹیں
خلا کے غار میں گم ہو چکی تھیں اکے دکے لوگ
البتہ ستا رہے تھے۔ یہ بھی چلے جائیں تب —

تب —!

ذرا سا آگے سرک کر دنیش نے پھر پیچھے
جھانکا —

گھر لائی اسے بڑی پرکشش محسوس ہوئی۔ اپنی گود
پھیلائے ہوئے ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے
اس کے پاس ناامیدی نہ تھی، انکار نہ تھا۔ بس
انتظار تھا۔ دنیش کی زندگی کی طرح مسلسل انتظار۔
خوشی کی لہر چاندنی کی طرح اس کے وجود میں
اندر ہی اندر پھیل گئی پھر اسے سنگھ۔ للیتا۔ لالو مانی
اور وہ سارے ملنے والے یاد آئے جو کبھی نہ کبھی
کسی نہ کسی اچھی بری طرح تھوڑی بہت دیر کے لئے
اس کی زندگی میں آئے اور وہ دانستہ ان سے
بچھڑ کر آگے بڑھ گیا۔ تصوری تصور میں بڑے
خلوص سے وہ ان سب کے آگے جھکا۔

دوستو — میں نے تمہیں چھوڑ دیا لیکن تم مجھ
سے بھلائے نہ گئے — اور زندگی — تو ہار یہ

آگے آ کر اوجھل ہو جاتی تھی لیکن کبھی، کہیں، کسی
موڑ پر مجھ سے بغل گیر نہ ہو سکی ہے اب اپنا ڈرامہ
ختم کر۔ دنیش جا رہا ہے تجھے چھوڑ کر تجھے کچھ کر۔
زندگی کو دھکا کر اسے پہلے جو سکون حاصل
ہوا۔ وہ مسکرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
ایک قلابازی۔ ہمت کا ایک شاندار فاتح
لمحہ —

اس نے ایک بھرپور نظر دنیا پر ڈالی۔ اپنے
اطراف و جوانب پر نظر ڈالی پھر جھکا۔
پھر اچانک اسے خیال آیا۔
بہار بھوکی ہے —!
بہار اس کی منتظر ہے —!
بہار مقفل بھی تو ہے —!!!

جیسے کسی زبردست ہاتھ نے دنیش کو
یکایک پیچھے کھینچ لیا۔ وہ دوڑتا ہوا بلندی سے اترا
اور دیوانہ وار کمرے پر پہنچا۔ ٹمٹماتی ہوئی روشنی
میں انجن کی طرح چلتے ہوئے دل سے اس نے تالے
میں چابی ڈالی۔

کواڑ چرچرائے پھر اسے ایک لمبی جھرجھری
آگئی —

باہر نکلنے کی جد و جہد میں بہار نے اپنا سر
کواڑوں کی دراز میں پھنسا لیا تھا اور اب زندگی
سے عاری بے جان اس کے پیروں پر آ پڑی تھی۔
وہ کانپتا رہا۔ کانپتے کانپتے چارپائی میں
گر گیا —

کیسی ہولناک۔ دہلا دینے والی شریانات
زندگی کے خاتمے کا احساس —؟

آنسو اس کی آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔ پھٹی
ہوئی آنکھوں سے وہ خلاؤں میں اس طرح گھورتا
رہ گیا جیسے کوئی نئی نہ سمجھ میں آنے والی بات
آہستہ آہستہ سمجھ رہا ہے۔

نشور واحدی

غزل

ہستی بھی شرار ہو گئی ہے
مستی بھی خمار ہو گئی ہے

ساحل پہ ہے رہزنوں کا خطرہ
کشتی ہے کہ پار ہو گئی ہے

سب نقد خریدتے ہیں دوزخ
جنت جو ادھار ہو گئی ہے

بدلی ہوئی اس نظر کو دیکھا
بے قول و قرار ہو گئی ہے

کیا لکھوں کہ چشم تر ہی میری
افسانہ نگار ہو گئی ہے

خوشیوں کے برات چلتے چلتے
اشکوں کی قطار ہو گئی ہے

اس دور کی زندگی نہ پوچھو
تلوار کی دھار ہو گئی ہے

تھی پھول کی ایک کلی محبت
کانٹوں میں شمار ہو گئی ہے

شیشے کی پری نشور توبہ
دل لے کے فرار ہو گئی ہے

اردو ناول

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن

ہر عہد کا اپنا مزاج ہوتا ہے، ناول میں عہد کا مزاج شامل رہتا ہے اور بڑے رجحانات کام کرتے ہیں۔ جب ناول میں گہرے تجربے پیش ہوتے ہیں تو زندگی کی وسعت، گہرائی اور گیرائی کا بھی شدید احساس ہوتا ہے۔ بڑے معیاری ناول کے لئے خلاق ذہن چاہیئے کوئی دیو پیکر شخصیت یا [illegible] ہی ... تجربے کر سکتا ہے اور بلیغ تجربوں کے مطابق فارم اور تکنیک کی تشکیل کر سکتا ہے۔ اردو ناولوں کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بڑے اور اہم رجحانات کی کمی ہے۔ اب تک کوئی خلاق ذہن اس طرف نہیں مل سکا ہے۔ اردو میں اچھے ناول ہیں، معیاری ناول ہیں، لیکن بڑے معیاری ناول نہیں ہیں۔ بڑے ناول کے تیور تو ملتے ہیں، بڑے ناول نہیں ملتے۔

یہ کہہ کر کہ اردو میں معیاری ناول موجود ہیں الجھنا بھی نہیں ہوتا، یوں معیاری کا لفظ بھی "خلاق" کے لفظ سے گمراہ کن نہیں ہے۔ جس طرح ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقہ اور ہر فرد کا اپنا اخلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک، ہر قوم، ہر طبقہ اور ہر فرد کا اپنا معیار بھی ہوتا ہے۔ خصوصاً ادبی معیار کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ ناول میں مختلف پلاٹ اور مختلف رجحانات سے ... کے کئی زاویے بنتے ہیں، ہم ابدی اور دائمی، خوب اور بندھے ٹکے قاعدے اور کلیے نہیں بنا سکتے۔ مختلف نقطۂ نظر سے مختلف معیار پیدا ہوتا ہے۔ تکنیکی اور موضوعی معیار کا مسئلہ زندگی کی طرح پیچیدہ، پراسرار اور تہہ در تہہ مسئلہ ہے ہر عہد میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن سے بہت سے افراد مجموعی طور پر متفق ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہر عہد کے مزاج کے مطابق معیار قائم ہوتا ہے۔ ہر دور کا ناول اپنے عہد کے معیار پر کسی نہ کسی طرح پورا اترتا ہے۔ ناول اور تکنیکی معیار اور موضوعی معیار کا تجزیہ کیجئے تو اس کی وضاحت ہوگی کہ معیار میں تبدیلی ہوتی ہے۔ تجربوں کے مطابق معیار بنتا ہے تشکیل پاتا ہے، بڑے رجحان معیار کی پختگی کا ضامن ہوتا ہے۔

ہم کیوں یہ بھول جائیں کہ بڑے معیاری ناول رجحانات اور تجربات سے داخلی طور پر پراسرار طریقہ سے معیار بدل دیتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ خارجی اقدار سے خام مواد لے کر اسے داخلیت کی آگ میں تپا کر ناول نگار نے سوچنے کا ڈھنگ ہی بدل دیا ہے۔

مشکل ہے یہ کہنا کہ معیاری اور غیر معیاری ناول میں فرق کس طرح ہو، کونسا ناول زیادہ معیاری ہے اور کونسا کم معیاری ہے۔ اس سلسلے میں دو افراد کی رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اردو تنقید کے معیار کو نہ بھولئے اس لئے کہ ناول کے معیار کو سمجھانے کے لئے اردو تنقید نے اکادمی فکر کی گرہیں سنبھال ہیں۔ ناول کو اکادمی تنقید سے بچانے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تنقیدی معیار کا تعلق ہے نئے ڈھنگ سے نئے انداز سے سوچنا چاہیئے، اکادمی تنقید کا تقاضہ یہ ہے کہ پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ کرداروں کا اتحاد، کرداروں کا ارتقاء، جانے پہچانے کرداروں کی مقبولیت، مکالمہ نگاری، نظریۂ حیات، زمان و مکان کا تصور اور معلوم نہیں کتنی اور باتیں، ہم فارسٹر، پرسی لبک اور ڈیوڈ ڈیسس کی باتیں دہرا رہے ہیں۔ حالانکہ انگریزی، فرانسیسی، اور امریکی ناول تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے قطعی مختلف ہو گئے ہیں۔ نئے علوم کی روشنی میں تجربوں کا اظہار مختلف طریقوں سے ہو رہا ہے۔ تکنیک واقعی گیلی مٹی ہو گئی ہے۔ اس عہد میں جیمس جوائس کے ULYSSES ناول میں چوبیس گھنٹے کی زندگی پیش ہوئی ہے۔ مرکزی کردار صرف سوچتا ہے۔ چشمۂ شعور کی تکنیک نے غیر متعلق باتوں سے ذہنی زندگی کو مربوط بنا دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس ناول کی تکنیک اور اس کا ڈھانچہ تنقید کے لئے ایک الجھا ہوا مسئلہ بن گیا ہے۔ جوائس نے ہومر کی تخلیق اوڈیسی کو ماڈل بنایا ہے اس کے صرف تین حصے ہیں، اور اٹھارہ واقعات ہیں، جوائس نے غیر متعلق واقعات میں شخصیت کے گہرے اسرار و رموز کو نمایاں کر کے ایک آفاقی ڈھانچے کی تخلیق کی ہے۔ غیر متعلق باتوں میں اندرونی اور داخلی تسلسل ہے اور اسی سے اس ناول کا توازن برقرار ہے۔ اردو میں ابھی تک کوئی ناول اس معیار تک نہیں آیا۔ تکنیکی اعتبار سے ترقی ہو سکتی تھی، تکنیکی معیار تو بدل سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ تجربوں میں پیچیدگی نہیں ہے، ہم سپاٹ تجربوں کو دیکھنے اور اس کے دکھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ایک معمولی اور غیر اہم تجربہ ہمیں آدمی کی پیچیدہ اور پراسرار شخصیت اور اس کے پیچ در پیچ تجربوں تک نہیں لے جاتا۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ "آگ کا دریا" ایک اچھا ناول ہے۔ لیکن اس کے دوسرے حصے میں جو تجربہ ہے، ربط اور گہرے رشتے اور داخلی تسلسل کی جو کمی ہے، اسے آپ نے

بھی محسوس کیا ہوگا۔ اس ناول کے تیور غضب کے ہیں۔ لیکن اس ناول کو عظیم معیاری ناول نہیں کہا جا سکتا۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے، صرف ایک مثال ہے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے ناول کا مستقبل کیا ہے۔ اردو کے دوسرے ناول نگار اس تکنیک کو کس حد تک اپنانے کی کوشش کریں گے، بڑے اور اہم رجحانات کو پیش کرنے کی کس قدر کوشش ہوگی۔

اردو میں اس فن میں تکنیکی تجربے زیادہ نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تک اس طرح کوئی بڑا فن کار نہیں ملا ہے ظاہر ہے کہ تجربے ناکام ہوں گے، لیکن ابھی وہ منزل بھی نہیں ہے جہاں کچھ ناول نگاروں نے ناکام تجربے کئے ہوں۔ اردو کے ناول نگاروں پر سوچتے ہوئے بار بار ایک بات ذہن میں آتی ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد سے پریم چند تک جو ناول نگار ہیں وہ بنیادی طور پر "داستانیت" سے متاثر ہیں۔ پریم چند تو ایک کامیاب اور بڑے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اردو ناولوں کو بھی ایک خاص معیار تک پہنچایا ہے، لیکن موضوع اور فارم کے اعتبار سے تجربہ اور رجحان کے پیش نظر ان کے ناولوں میں جو کمزوریاں اور خامیاں ہیں [illegible] ان سے واقف ہیں، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اردو افسانے میں پریم چند نے اپنی فکر و نظر سے جو انقلاب پیدا کیا وہ ناول میں نہیں کر سکے۔ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں پھر کچھ اور۔ پریم چند کے بعد کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، شوکت صدیقی، اختر اورینوی، ممتاز مفتی، جمیلہ ہاشمی۔ اور کئی دوسرے نام سامنے آتے ہیں۔ شکست، ٹیڑھی لکیر، گریز، خون، ضدی، طوفان کی کلیاں، حسرت تعمیر، شام اودھ، معصومہ، خدا کی بستی، تلاش بہاراں، میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم دل، اور کچھ دوسرے ناول اچھے معیاری ہیں لیکن ان کی تعداد اتنی ہے

کہ ہم انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ ہر ناول میں تیور مختلف ہے۔ رجحان مختلف ہے۔ لیکن صرف تیور سے بات نہیں بنتی۔ موضوعات اور تکنیک کے غیر معمولی تجربے نہیں ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح ہم بڑے اور غیر معمولی معیاری ناول کی تلاش میں ابھی تک ہیں۔ ایک حقیقت اور پیش نظر رکھیے۔ ان تمام ناولوں کے مصنفین پہلے افسانہ نگار ہیں پھر ناول نگار اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں افسانوں کے لئے وقف ہیں۔ ان تمام فن کاروں نے اردو کو لازوال افسانے دیئے ہیں، ہم یہ نہیں سوچتے کہ ایک افسانہ نگار ناول نگار نہیں بن سکتا۔ لیکن یہ ضرور سوچتے ہیں کہ جب تمام تخلیقی صلاحیتیں افسانے کے لئے صرف ہوتی ہیں تو دوسری صنف میں ضرور کوئی کمی محسوس ہوتی ہے اس کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے پوری شخصیت سے ہوتا ہے۔ پیچیدہ جذباتی زندگی سے ہوتا ہے۔ تخلیقی عمل ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اظہار کے لئے فارم کی تشکیل بہت پہلے ہو جاتی ہے... پوری شخصیت لاشعوری طور پر ڈھانچے کی طرف لپکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام افسانہ نگاروں کے ناول بھرپور اور مکمل اشارے نہیں بنتے۔ دور دور تک [illegible] امکان نہیں ملتا۔ ناول میں ان کے رجحانات [illegible] اور متاثر کرتے ہیں۔ لیکن یہ سرمایہ [illegible] جھٹک کر دیکھنے لگیں ہم پھیلے ہوئے وسیع [illegible] سے تجربے بھی تو چاہتے ہیں۔ آدمی کی شخصیت کی ٹیڑھی لکیریں جب تک آدمی کو نہ سمجھا دیں ہمیں اطمینان کب ہوتا ہے! جب تک "ٹائم آرٹ" کی قدریں بلیغ رجحانات کے ساتھ نمایاں نہ ہوں ہم مطمئن کب ہوتے ہیں۔

اردو تنقید کے اکادمی انداز نے اردو ناول نگاروں کو گمراہ کیا ہو یا نہ کیا ہو حقیقت یہ ہے کہ داستانیت سے ابھی رشتہ نہیں ٹوٹا ہے۔ واقعات کی پیشکش میں انداز بنیادی طور پر روایتی ہے۔ جدید انگریزی، فرانسیسی، اور امریکی ناولوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ محض پلاٹ اور کردار کی مخصوص اصطلاحوں سے ناولوں کے فرق کو سمجھنا، رجحانات کا تجزیہ کرنا، تجربوں اور قدروں کی روشنی اور ان کے سائے "[illegible]" کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ تعمیر ماجرا، کردار، بیانات، مکالمہ اور نظریۂ حیات اس کی وضاحت معلوم نہیں کیوں اردو ناول میں ضروری سمجھی جاتی ہے، کو جزئیات ضمنی سمجھنا چاہیئے اس لئے کہ ان تمام عناصر کے پیش نظر شاید ہی کوئی ناول مکمل نظر آئے۔ ضرورت سے زیادہ اس بنی بنائی تکنیک کو اہمیت دینا دانشمندی نہیں ہے، دنیا کے بعض اہم اور بڑے معیاری ناول ایسے ہیں جن میں کرداروں کا ہجوم نہیں ہے! دو تین کردار ہیں، صرف جذبات کی کشمکش، بنیادی جبلتوں کے اظہار شعور اور لاشعور کی تہہ در تہہ کیفیتوں کی وجہ سے یہ ناول معیاری ہیں۔ کچھ ناول محض جذبات کے ناول ہیں اور تعمیر ماجرا کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ظاہر ہے تکنیکی معیار ایک نہیں ہو سکتا۔ تجربوں کے مطابق تکنیکی معیار بنتا ہے اردو ناولوں میں ایک بنی بنائی تکنیک کو برتنے کی وجہ سے تجربے بھی سمٹ گئے ہیں۔ کچھ اہم رجحانات بھی چھپ گئے ہیں۔ کردار میکانکی بن گئے ہیں۔ تجربوں کو اس تکنیک کے پیش نظر سمیٹنے اور پھیلانے کا عمل جاری ہے، یہ طریقۂ کار ہی غلط ہے۔ واقعہ اور قصہ کی اہمیت یقیناً زیادہ ہے لیکن ہر قصہ داستان کی تکنیک میں پیش نہیں ہو سکتا۔ اردو کے کئی ایسے نئے ناول ہیں جن کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کھو جاتے ہیں، فنکار کی تخلیقی صلاحیتیں جادو کرتی ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ گہرائیوں میں اتر رہے ہیں۔ لیکن نصف کتاب کے بعد آپ اچانک سطح

پر آجاتے ہیں اور گہرائیوں کا تصور بکھر جاتا ہے، داستانیت شروع ہو جاتی ہے۔ تخلیقی صلاحیتیں گم ہو جاتی ہیں، جذبی اور داخلی قدریں منتشر ہونے لگتی ہیں۔ بلیغ رجحان پیدا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔ خارجی قدروں کی چوٹ پڑتی ہے اور آپ کسی صورت سے ناول ختم کر لیتے ہیں۔ اکثر نصف ناول صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ عجلت پسندی کی پہچان پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔ افسانہ نگار کی ناول نگاری کا المیہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ نئے اردو ناولوں میں بھرتی کے واقعات اور کردار بھی ہوتے ہیں۔ ان سے صفحات تو بڑھ جاتے ہیں لیکن منطقی اور داخلی تسلسل ختم ہو جاتا ہے۔ تقریر بازی اور لفاظی سے بھی مضمون کا دامن بھرا جاتا ہے۔ "خدا کی بستی" "آگ کا دریا" "ایک وائلن سمندر کے کنارے" اور چند دوسرے ناولوں کے مطالعہ سے یہ حقیقتیں واضح ہو جائیں گی۔

ناول میں زندگی کی ترجمانی اور مصوری کی بات جس طرح کی جاتی ہے اور خصوصاً اردو کے ناقد جس طرح یہ بات کرتے ہیں ہم اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ سپاٹ عکاسی اور ترجمانی سے جمالیاتی قدریں پیدا نہیں ہوتیں۔ جمالیاتی شعور کی پختگی ہر فن کے لئے ضروری ہے۔ اور ناول جو جدید عہد کا ایک بے جمالیاتی شعور کے رچاؤ کے بغیر اعلیٰ سطح تک نہیں جا سکتا۔ جمالیاتی اور روحانی قدریں ابتدا سے مفقود ہیں۔۔۔

ناول میں حقیقت اصل حقیقت کی صورت میں نہیں بلکہ حقیقت کے حسن کے پیکر میں نمایاں ہوتی ہے، کوئی المیہ حقیقت ہے۔ ناول میں اسے المیہ کا حسن بن جانا ہے۔ ترجمانی اور مصوری کے الفاظ اردو تنقید میں اپنی تمام گہرائیوں کے ساتھ نمایاں نہیں ہوتے۔ ترجمانی پر غور کیجیے تو اس پھیلی ہوئی تہہ در تہہ زندگی کا تصور پیدا ہوتا ہے، ماضی اور حال میں پھیلی ہوئی پیچیدہ اور پراسرار زندگی کا خیال آتا ہے۔ آدمی کے جذبات اور بنیادی جبلتوں اور معلوم نہیں کتنی روشن، پیچیدہ، آڑی ترچھی اور صلیبی قدروں کی طرف ذہن جاتا ہے۔ اسی طرح مصوری کے لفظ کے ساتھ کتنے رنگ، کتنے خطوط، کتنے پیکر، کتنی لکیریں، اور کتنے زاویئے ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی آمیزش، دھبے، پرچھائیاں، خلا میں، سائے ان دونوں الفاظ کی معنویت کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اردو ناولوں میں ایسی ترجمانی اور ایسی مصوری نہیں ہے۔ علامتوں کے استعمال کا سلیقہ نہیں ہے، زندگی سے مراد عموماً گاؤں کی زندگی ہے۔ شہر کی زندگی ہے۔ طبقاتی زندگی ہے، تاریخی زندگی ہے۔ لیکن ان میں پیچیدگی اور تہہ داری نہیں ہے، وہ زندگی ہے جو سامنے ہے، حالانکہ ہر زندگی دوہری ہوتی ہے۔ طبقاتی زندگی کو دیکھنے کی نظر واقعی دیر سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔

مراۃ العروس، توبۃ النصوح۔ ابن الوقت، ایامیٰ، فسانۂ آزاد۔ منصور موہنا، فتح اندلس۔ زوال بغداد، ملک العزیز، امراؤ جان ادا۔۔۔ گئودان۔ میدان عمل، یہ سب اردو کے معیاری ناول ہیں۔ معیاری اس لئے کہ اس میں عہد کا مزاج ہے۔ فوٹوگرافی ہے زندگی کی، سچائی کسی حد تک اور کہیں بہت حد تک پیش ہوئی ہے، سماجی بیداری بھی ہے۔ تکنیک کا ایک شعور بھی ہے، انگریزی اثرات ہیں، جانے پہچانے کردار مبالغے کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ مبالغہ کی انتہا بھی ہے، تاریخی واقعات ہیں۔ (تخیل کے کرتب کے ساتھ) اور بہت کچھ ہے، لیکن یہ ناول داستانی روایات کے ساتھ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض ناولوں کی محض تاریخی اہمیت ہے۔ طالسطائی اور دوستو وسکی کی طرح ڈپٹی نذیر احمد اور سرشار متاثر نہیں کرتے اور متاثر کر بھی نہیں سکتے۔ کسی ناول کو معیاری کہتے ہوئے ہم عموماً بنیادی حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تجربہ سو سال کا بھی ہو سکتا ہے اور آدھے گھنٹے کا بھی۔ اس تجربے کے لئے بنی بنائی تکنیک کہاں تک مناسب ہے۔ کرشن چندر کا ایک نیا ناول "ایک وائلن سمندر کے کنارے" پڑھیے نصف ناول آپ کو گہرائیوں میں لے جائے گا، پھر گدھے کی سرگزشت کی یاد آئے گی اور اس طرح آپ اوپر اٹھتے جائیں گے۔ سطح پر آجائیں گے اور خارجیت سے ذہن بار بار ٹکرائے گا۔ تمام جمالیاتی قدریں ٹوٹ جائیں گی، مرکزی کردار کو اسی الماری میں رکھنا مناسب سمجھیں گے۔ جہاں آپ نے توبۃ النصوح، فسانۂ آزاد، فتح اندلس، ایک گدھے کی سرگزشت اور دوسرے ناولوں کو بڑی حفاظت سے رکھا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ اردو ادب میں صدیوں اخلاق کا جو مخصوص تصور رہا ہے کیا ہم اسی کے پیش نظر کسی ناول کو معیاری اور غیر معیاری کہہ سکتے ہیں! تیسری بات یہ کہ کسی ناول کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا راز محض سماجی بندھنوں سیاسی کشمکش اور طبقاتی رشتوں ہی میں پوشیدہ ہے۔۔ اور اس کشمکش اور رشتوں کو سطح پر اجاگر کرنا ضروری ہے؟ چوتھی بات یہ کہ کیا ناول لکھنے کا عمل جان جوکھوں کا کام نہیں ہے؟ کیا یہ پوری زندگی کا سودا نہیں ہے؟ اگر ہے تو اردو کے کتنے ناول نگاروں نے اپنے تخلیقی عمل کے دھارے کو اس طرف موڑ دیا ہے؟ جب تک مطالعہ گہرا نہ ہو، رجحانات پختہ نہ ہوں، سکون اور یکسوئی حاصل نہ ہو، پھیلی ہوئی بیکراں زندگی کے اسرار و رموز تک

(بقیہ صفحہ ۲۶)

الیاس احمد گدی

"ہارے ہوئے لوگ"

اپنے موتی سؤروں اور کتوں کے آگے مت ڈالو ایسا نہ ہو کہ وہ ان کو پاؤں تلے روندیں اور پلٹ کر تم کو پھاڑ دیں۔

ایک چھوٹے خوبصورت پلاسٹک کے پرس کو بائیں ہاتھ میں جھلا کر چلتا ہوا وہ نوجوان یوں چونک گیا، جیسے کسی نے اس کا دامن پکڑ لیا ہو۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا سڑک کے کنارے چار چھ آدمی جمع کیے، ایک سیاہ فام پادری واعظ کہہ رہا ہے۔

"یسوع مسیح نے فرمایا اے عورتو!..."

وہ جلدی سے فٹ پاتھ سے نیچے اتر گئی ——

نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے! اس نے سوچا، ہم نے کب اپنے موتی سؤروں اور کتوں کے آگے ڈالے ہیں، وہ تو کوئی انجانی طاقت ہے جو ہمیں ان خونخوار وحشی کتوں کے پنجرے میں ڈھکیل دیتی ہے اور باہر سے تماشہ دیکھتی ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم پر کیا گذری ہے.......

اس نے اپنی رفتار بڑھا دی لیکن جیسے سیاہ فام پادری کے الفاظ برابر اس کا تعاقب کر رہے تھے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خود یسوع مسیح اس کے پیچھے پیچھے پکار رہا ہے۔ اے لڑکی! اے لڑکی! —— اپنے موتی سؤروں اور کتوں کے آگے مت ڈالو اے لڑکی!... سنتی ہو... اے بدبخت گمراہ لڑکی سنتی ہو....؟

آواز مدھم، رحم دل، مشفق آواز اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ ایسی آواز جو دھیرے سے، نرمی سے ایکدم دل میں اتر جاتی ہے، مگر دل ——!

تم نے وہ کہانی نہیں سنی کہ جب ایک قبیلے کے افراد اندھیرے گھنے جنگل میں راستہ بھول کر دلدل میں پھنسنے لگے تو لوگوں نے اس کو طعنے دیے، برا بھلا کہا کہ وہی شخص تمام بربادی کا ذمہ دار ہے۔ تب اس آدمی نے کہ جو ان کا سردار تھا اور ان سے محبت کرتا تھا، اپنی چھاتی چیری اور اپنے دل کو اپنے ہاتھوں میں نکال لیا، جو آفتاب کی طرح دمک رہا تھا اس دل کی سرخی خوبصورت روشنی میں لوگوں نے اپنا راستہ تلاش کیا اور جب جنگل سے باہر نکل آئے تو......

اس کا باپ کہتا ہے جو تو نہ ہو تو یہ سب لوگ مر جائیں گے، یہ تمہارا اپاہج بھائی، یہ فرشتوں جیسا معصوم بھائی اور یہ بوڑھا اندھا باپ جو بھیک مانگنے نکلتا ہے تو بھیک تک نہیں ملتی...... کیا تمہیں ان سب پر ترس نہیں آتا؟ پھر وہ سسکتا ہے اور اپنے کندھے اور ہونٹوں کے پاس ہاتھ گھما کر صلیب کا نشان بناتا ہے اور ایسے کہتا ہے جیسے اپنے گناہوں کے احساس سے کانپ گیا ہو۔

خدا مجھے معاف کرے....!

خدا، جو غریبوں کے لئے بڑا عظیم ہے کہ جب ہم ہار جاتے ہیں اور کتے اور سؤر ہمارے جسم کو نوچ نوچ کر لہولہان کر دیتے ہیں اور ہم گر پڑتے ہیں تو کہتے ہیں یا خدا ہمیں معاف کر دو۔ اور خدا جو بڑا عظیم اور رحیم ہے ہمیں معاف کر دیتا ہے اور ہمارے سارے زخم مندمل کر دیتا ہے اور ہمیں نئی توانائی اور تازگی بخشتا ہے کہ ہم پھر اپنا جسم کتوں سے بچا سکیں۔

وہ جسم جیسے مٹی کا تودہ اور گناہوں کا مسکن کہا گیا ہے وہی جسم جو آج ہے تو کل نہیں رہتا وہی جسم جس پر زمانہ اتنی خراشیں ڈالتا ہے کہ بعد میں پہچانا نہیں جاتا مگر موٹا سیٹھ للچائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

"تمہارا جسم تو ریشم کا پوٹ ہے گنگا اور سندھ کی کیول مٹی سے بنا ہوا یہ جسم اس قدر گداز اور مخملیں کہ اس کو چھوتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین لذت سے آشنا ہو رہے ہیں!"

اس کے موٹے بھدے سیاہ چہرے پر چھپکلیوں ایسی مسرت چمکنے لگی ہے پلنگ کے اوپر گھومتا ہوا پنکھا خاموش گواہ کی طرح تکتا رہتا ہے اور امریکن سینٹ کی خوشبو اور نرم ڈنلپ کا گدا اور بڑا سا ابنوس کا پلنگ حجلۂ عروسی کی یاد دلاتا ہے۔ وہ حجلۂ عروسی جس کے متعلق اب وہ سوچتی تک نہیں۔ کیونکہ جب بھی اس کی شادی کی بات آتی ہے تو اس کا بوڑھا باپ کسی نامعلوم خوف سے کانپنے لگتا ہے۔

"نہیں، تم ابھی میری بچی ہو، بالکل بچی ہو، ایک دم معصوم، کمسن بچی ——!"

وہ آہستہ سے ہاتھ گھما کر صلیب کا نشان بناتا ہے اور اپنی اپاہج بیٹی ماریہ کو حسرت سے دیکھنے لگتا ہے جس کو بون ٹی بی ہے اور جسے ڈاکٹروں نے پلاسٹر کر کے بستر پر ڈال دیا ہے اور جس کے دونوں پاؤں سوج گئے ہیں اور جو بات کرتی ہے تو گالوں

ہوتا ہے جیسے رو رہا ہو۔ اور جو، جوزیہ کو ایسے دیکھ رہی ہے کہ جوزیہ لرز لرز جاتا ہے اسے ایسا لگتا ہے، جیسے ماریہ سب کچھ جانتی ہے وہ سب کچھ بھی جسے وہ اپنے آپ تک سے چھپائے رکھتی ہے حالانکہ مائیکل کا دیا ہوا رومال وہ باہر ہی پھینک آتی ہے کبھی اُسے اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتی کبھی اس کے ساتھ بازار میں اس ڈر سے نہیں گھومتی کہ کہیں کوئی آدمی ماریہ سے کہہ نہ دے۔

اس دو کمروں کے چھوٹے سے بوسیدہ گھر میں ہر آدمی خوف زدہ ہے، جوزیہ ماریہ کی نگاہوں سے خوف کھاتی ہے، اس کا باپ جوزیہ کی شادی سے خائف رہتا ہے اور ماریہ اپنی موت سے ڈرتی ہے اور وقت سہما ہوا ڈرا ہوا ان کے قریب سے گزرتا ہے، جیسے وہ بھی خوف زدہ ہو کہ کہیں یہ نازک نرم رشتے ٹوٹ نہ جائیں۔ ایک مشکوک، غیر معتبر خاموشی سارے گھر پر چھائی رہتی ہے اور اس خاموشی میں جوزیہ کا چھوٹا بھائی مقدس انجیل سے کچھ پڑھنے لگتا ہے تو یوں گمان ہوتا ہے۔ جیسے ہم بہت پیچھے لوٹ گئے ہیں سینکڑوں، ہزاروں سال پیچھے۔

لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی پر نظر کی وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا ہے پس اگر تیری داہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر پھینک دے کیوں کہ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے!

مائیکل کی آواز بڑی درویشانہ ہے سیدھے دل میں اتر جاتی ہے اس کی آواز ایسا فسوں پھونکتی ہے کہ چند لمحوں تک آدمی وارفتہ ہو جاتا ہے لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہر آدمی الگ الگ سوچنے لگتا ہے۔ تب جوزیہ آہستہ سے ماریہ کے بستر پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگتی ہے۔

جوزی ڈارلنگ، جوزی ڈارلنگ! بولو کیا اس جہنم کے علاوہ بھی کوئی جہنم ہے؟

جوزیہ اس کو کوئی جواب نہیں دیتی، صرف ٹکٹکی سے اس کی طرف دیکھتی ہے، جو چھت کا میلا کچیلا اور شہتیر تکنے لگتی ہے اور سوچتی ہے کہ اس نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے کہ اُسے مفلوج کر کے بستر پر ڈال دیا گیا ہے کہ نہ وہ چل سکتی ہے نہ کروٹ لے سکتی ہے۔ صرف چت لیٹ کر چھت کو تکے جاتی ہے، یونہی بے مقصد، بیکار... اور اُسے ایسا گمان ہوتا ہے، جیسے کوئی بار بار اس سے پوچھ رہا ہو، بتاؤ کیا تم زندہ ہو؟ بتاؤ تو کیا تم زندہ ہو؟ اور وہ جواب میں ہاں کہتی ہے نہ ناں کہتی ہے کیونکہ بعض اوقات اسے خود محسوس ہوتا ہے کہ وہ مر چکی ہے اور کمرہ دراصل اس کا تابوت ہے — ابھی ذرا دیر میں لوگ آئیں گے اور اس تابوت کو اٹھا کر لے جائیں گے ایک جہنم سے دوسرے جہنم کی طرف — شاید ان بہت سارے اجنبی انجان جنازہ برداروں میں مائیکل بھی آ جائے، وہ تمنا کرتی ہے۔

لیکن جوزیہ جانتی ہے کہ مائیکل اب نہیں آئے گا۔ کیونکہ وہ خود اس کے پیچھے گھومتا ہے اور اس کو ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے اس پر فدا ہو جانا چاہتا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے بلاوے اور رقص گاہوں میں ڈھکے چھپے الفاظ میں اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا ہے مگر ہر بار وہ ٹال جاتی ہے کیونکہ ہر بار اس کو ایسا لگتا ہے، جیسے کہیں نہ کہیں سے ماریہ اس کو دیکھ رہی ہے ہاں یہ وہی ماریہ ہے جس سے مائیکل نے کہا تھا کہ وہ دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہے اور وہ اس سے شادی کرے گا۔ اور اسے شملہ لے جائے گا جہاں وہ پہلے بھی ایک آدھ بار اپنے والدین کے ساتھ جا چکا تھا پھر ایک کار خریدے گا اور پھر دونوں سارے شہر کی سیر کریں گے مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھائیں گے اور شاندار کلبوں میں ڈانس کریں گے اور سڑکوں پر ان کے آگے پیچھے گھومیں گے......!

مگر یہ تب کی بات ہے جب ماریہ ابھی بیمار نہیں پڑی تھی۔ اور اس کے خوبصورت اور معصوم چہرے پر ایک عجیب طرح کی مسرت جھلکتی رہتی تھی اور جو سارا دن اس قدر اودھم مچاتی کہ بعض لوگ کالونی والے شکایت کرنے آ جاتے، تب اس کا باپ جو ایک پرائیویٹ فرم کا ملازم تھا، اور اس کی بینائی ختم نہیں ہوئی تھی، صرف پیار سے مسکراتا اور جب کالونی والے چلے جاتے تو بڑے پیار بھرے مدھم لہجے میں کہتا۔

"ماریہ تو بالکل اپنی ماں پر گئی ہے!"

پھر اس کی کمر میں درد رہنے لگا اور آخر ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے بون ٹی بی ہے اور اس کو پلاسٹر کر کے بستر پر ڈال دیا گیا اور اس اچھل کود کی ماریہ کو بڑی مہنگی قیمت چکانی پڑ گئی۔ اور اب ماریہ بڑے سُریلے لہجے میں بالکل شہد کی طرح جوزیہ سے پوچھتی ہے

"ڈارلنگ، مائیکل تمہیں نہیں ملتا؟"

"مائیکل" وہ کانپ جاتی ہے مگر اسے نہیں بتاتی کہ مائیکل اسے اکثر ملتا ہے کیونکہ ایک نا معلوم خوف اس پر حاوی ہونے لگتا۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ماریہ سب کچھ جانتی ہے، سب کچھ...

ماریہ اس کی طرف دیکھے بغیر کہتی ہے

"جوزی، کیا ایک بار، صرف ایک بار تم اسے یہاں نہیں لا سکتیں؟ ڈارلنگ! اس سے کہنا کہ کم از کم ایک بار تو مجھ سے مل لے شاید اب میں زیادہ دن زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

جوزیہ کچھ جواب نہیں دیتی مگر ایک تیز سی سوئی اس کے دل میں دور تک اترتی چلی جاتی ہے۔

...کی گھٹنوں تک ایک بدنام کسک اس کو بے چین کیے رہتی ہے.....!

جوزیہ کے پیچھے چلنے والی آواز اب مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

لڑکی! اے لڑکی بدبخت گمراہ لڑکی سنتی ہو...

پھر اچانک ایسا لگا جیسے کوئی ایک دم اس کے پیچھے آگیا ہو، وہ کانپ گئی اور اس نے پلٹ کر دیکھا مگر وہ یسوع مسیح نہیں مائیکل تھا۔ وہی خوبصورت کھلنڈرا تیز و طرار مائیکل...

ہلو، بہت پریشان سی ہو، کیا بات ہے؟

"او کچھ نہیں! وہ ہینڈ بیگ سے رومال نکال کر گردن کا پسینہ پونچھنے لگی۔

تم آج ایسی گھبرائی سی لگ رہی ہو جیسے کوئی بھوت دیکھا ہو؟

"بھوت؟" وہ کھو کھلے پن سے ہنسی۔ "یہ بھوت وہ کا تو بستی کا کولڈ ڈرنک تمہیں پلائیں!"

وہ اس کا بازو تھام کر قریب کے ہوٹل میں گھس گیا۔ لیمن اسکواش ٹھنڈا تھا، فرحت بخش تھا۔ جب گلے سے اترتا تو سارے جسم میں ایک تازگی اور فراوٹ پہنچاتا جاتا، مگر بچوں کے سے ہے اس نے سوچا وہ کوئی اور مزہ چاہتی تھی۔ ذرا تیز تلخ اور ترش۔ جیسے جیسے.....

آج میفیئر میں ڈانس ہے چلو گے؟

ضرور تمہارے ساتھ ڈانس کرنا میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے دراصل تمہارے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ تم ان لڑکیوں سے بلند تر ہو جو ہم رقص ہونے کے باوجود، اکھڑی اکھڑی سی، الگ الگ سی رہتی ہیں۔ تمہارے یہاں جو مکمل مفاہمت ہے وہ.....

چلو اس مت کرو، ڈانس کے بعد سے گھر چھوڑ

مائیکل ایک دم سے چپ ہو گیا۔ جیسے کچھ مڑ کر سوچنے لگا۔

تمہیں وہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا.....مارگریٹ چلو ناں؟ اس نے جوزیہ کی آنکھوں میں جھانکا "مگر سارا وقت تمہیں میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ تم اکثر مجھے جُل دے جاتی ہو۔ حالانکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، بے پناہ محبت.....!"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی مائیکل کے چہرے کی طرف دیکھا جو مشتعل جذبات سے بھبک اٹھا تھا وہ ایسے ہی چپ چاپ گھونٹ گھونٹ لیمن اسکواش پیتی رہی۔

آرکسٹرا تیز اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والا تھا۔ دلکش اطالوی دھنوں پر بے آپ ہی آپ بہنے لگتے۔ مارچ کی ٹھنڈی رات، دن بھر کی تپش کے بعد بڑی خوبصورت اور نکھری نکھری معلوم ہوتی تھی اور سارے ہال میں خوشبو اور رنگ برنگے لباس اور وہسکی کا گہرا سرور چھایا ہوا تھا، اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرتا ہوا مائیکل اسے یوں لگ رہا تھا جیسے تیز دھارے والے دریا میں بے بس سے بہتے اچانک کسی نے اس کو تھام لیا ہو اور اب آہستہ آہستہ اسے کنارے کی طرف لیے جا رہا ہے ابھی یہ انجان، اجنبی شہزادہ اس کے بے شکنتہ پر لوگوں سے دلجوئی کرے گا۔ اور پھر اسے جیت کر اپنے شاندار محل میں لے جائے گا۔ جہاں بجلی کے قمقموں کی بجائے بڑی بڑی موم بتیاں جلتی ہیں۔

ڈارلنگ، جوزی ڈارلنگ! جی چاہتا ہے، یہ رات رک جائے ساری زندگی یونہی رقص ہوتا رہے.....مائیکل اس سے سرگوشی کی۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ گہری سیاہ آنکھیں، بالکل ہندوستانی شہزادوں کی سی، اس پر آویزاں تھیں.....اس کا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کے سانس کی گرم بھاپ وہ اپنے رخساروں پر محسوس کر رہی تھی۔

جوزی ڈارلنگ، کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟

جوزیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اپنا سر اس کی چھاتی سے لگا دیا جیسے اس کی محبت کا اقرار کر رہی ہو مائیکل کی گرفت اس کی کمر کے گرد سخت ہو گئی۔

تم دراصل جگنو کی روشنی میں جیتی ہو، ذرا بھر کو جگنو چمکتا ہے اور ایک جگمگاہٹ چھوڑ کر پھر اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے گھڑی بھر کی یہ روشنی آنکھوں کو اور ناقابل برداشت بنا دیتی ہے جیسے روشنی کے ایک جھماکے کے بعد اندھیرا اور گہرا ہو جاتا ہے۔

وہ نڈھال ہوئی جا رہی تھی ہاری جا رہی تھی۔ یہ مائیکل تھا یہ اس کا کا ٹک نہیں تھا، جسے پنیٹا کر وہ جلد سے فراغت حاصل کرنا چاہ رہی تھی یہ دراصل مائیکل تھا خوبصورت، کھلنڈرا، ہینڈسم!

چلو باغ میں چلیں یہاں بہت گھٹن ہے۔

موسیقی تیز ہو گئی تھی اور ساتھ ہی رقص کرنے والے جوڑوں کی رفتار بھی تیز ہو گئی ہال کا فرش کانپ رہا تھا۔ اور ملی جلی سرگوشیوں اور ہلکی ہلکی پراسرار ہنسی سے فضا کھنک رہی تھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی آنکھیں نیم وا کیے اُسے دیکھتی رہی۔

"چلو۔"

وہ گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے آیا پھر دونوں آہستہ سے دروازے کے باہر ہو گئے۔

باہر مارچ کی رات ریشمی خنکی میں ملفوف تھی آسمان، وسیع نیلا آسمان جگمگا رہا تھا۔ چاند جو رقص کے آغاز تک ایک بڑے سے سونے کی تھال کی طرح مشرق کے گوشے میں آویزاں تھا اب اوپر آ گیا تھا اور ہوا جیسے اطالوی آرکسٹرا کا نغمہ چھیڑے ہوئے بہہ رہی تھی دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے باغ میں دور تک نکل گئے ان کے پیچھے موسیقی کی لہریں اٹھ رہی تھیں جیسے وہ خواب کے جزیروں سے آ رہی ہوں۔ رات کی رانی کے سائے میں ہم نشیں ہو...

مرمر کی بنچ پر مائیکل نے اُسے بٹھایا۔

"ڈارلنگ! کبھی کبھی ہم اتنی مسرت پا لیتے ہیں کہ اس کے بعد اور کسی مزید خوشی کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

وہ چپ رہی۔ اُس نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تو ایک اور ہی منظر تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس شہزادے نے اسکو دریا کی ہولناک موجوں سے نکال لیا تھا اور اب وہ دونوں کنارے پر تھے

"مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میری زندگی کو جس ساحل کی تلاش تھی، وہ مجھے مل گیا ہے ....." اس کی طرف جھک گیا۔ جوزیہ نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پیچھے ہال سے موسیقی کے ساتھ ملا جلا ایک تیز سریلا قہقہہ ان پر رنگ اچھالتا گذر گیا۔

"سچ کہتا ہوں جوزی ڈارلنگ، تمہیں پاکر میں ساری دنیا کو چھوڑنے کے لئے تیار ہوں.... میں تم سے .... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں.....!" اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اس کو کھینچ لیا اور اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیئے۔ ایک لمحہ کے لئے روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ پیچھے سرسراتی ہوئی موسیقی ایک گونج بن گئی۔ دور جگمگاتی ہوئی روشنیاں ایک دم سے نزدیک آ گئیں — ایک دم آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ کتنے ہی رنگ اِدھر اُدھر کانپنے لرزنے لگے..... اور اس کا سارا وجود گویا تڑخ تڑخ کر ٹوٹنے لگا...

...... اُس نے کہا کم از کم ایک بار وہ مجھ سے مل لے۔ شاید اب میں زیادہ دن زندہ نہ رہوں۔

ایک دم سے جوزیہ چونکی جیسے اچانک دریا کے کنارے چلتے چلتے اس کا پاؤں پھسلا ہو۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنے کپڑے ٹھیک کرنے لگی۔

وہ دیکھتے ہی لیٹا رہا مسکراتا رہا۔

"تم مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں ڈارلنگ! بولو نا؟ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

جوزیہ نے محسوس کیا، جیسے شہزادہ اس سے کہہ رہا ہو۔ میں تمہیں اپنے محل میں لے چلوں گا۔!

"ماریہ تم سے ملنا چاہتی ہے!" جوزیہ نے اپنے جملہ کا ردِّ عمل دیکھنے کے لئے اس کی آنکھوں میں گہرائی تک دیکھا۔

"ماریہ"! مائیکل بڑے زور سے چونکا۔

وہ شاید اب زیادہ دن زندہ نہ رہے"! مائیکل ایک دم سے چپ ہو گیا۔ ایک پُراسرار اُداس خاموشی چھا گئی۔ آرکسٹرا کی مدھم، دلکش، مسرور کن آواز اس خاموشی کے پس منظر میں اور بھی خوبصورت ہو گئی۔

"ڈارلنگ کیا اور کسی وقت کے لئے ان باتوں کو نہیں اُٹھایا جا سکتا۔؟

نہیں ڈارلنگ! یہ اس بات کے لئے مناسب ترین وقت ہے"۔

جوزیہ ایک دم ہوش میں آ گئی تھی۔ موسیقی کا فسوں، وہسکی کا نشہ اور مائیکل کی قربت کا سرور اُتر چکا تھا۔

"بڑی مضحکہ خیز بات ہے ڈارلنگ، ہم ایک چھوٹی سی مسرت کی کشتی میں تیر رہے تھے کہ اچانک وہ کشتی اُلٹ گئی....."

جوزیہ بڑی دل فگاری سے، بڑے طنز سے ہنسی "کس کی مسرت کی کشتی اُلٹی، کون ڈوب رہا ہے۔ تمہیں کیا معلوم؟"

"ڈارلنگ، میری درخواست کو ٹالو نہیں...."

مائیکل نے اُسے یاد دلایا۔

"سنو وہی بات تو میں تم سے کھل کر کہنا چاہتی ہوں۔ ماریہ تم سے محبت کرتی ہے بے پناہ محبت۔ وہ تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپتی رہتی ہے، تمام آنے جانے والوں سے تمہارے متعلق پوچھتی رہتی ہے اس کا سارا وجود تم سے عبارت ہے۔ تم سے وہ صرف تم سے......!"

لیکن میں کیا کر سکتا ہوں جوزی ڈارلنگ.....

تم خود سوچ کر دیکھو اگر تم میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟

ایک بات کہوں؟"

وہ چپ رہا۔ استفہامیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم اس سے شادی کر لو"!

"تم پاگل تو نہیں ہو گئیں"

"سنو، تم اس سے صرف نام کے لئے شادی کر لو، تم جب بھی، جس وقت بھی دن کو یا رات کو مجھے چاہو گے، میں تمہارے پاس رہوں گی۔ میں اپنے وجود کا ذرّہ ذرّہ اپنے جسم کا انگ انگ اور اپنی مسرت کا ایک ایک لمحہ تم پر وار دوں گی۔۔"

"تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔" وہ تنک کر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو ڈارلنگ! خدا کے لئے خفا مت ہو۔ بس ذرا سی قربانی اگر ایک آدمی کو مسرتوں سے مالا مال کر سکتی ہے تو کیا تم اس قربانی سے گریز کرو گے؟"

"سنو۔ میں قربانی کا بکرا نہیں ہوں۔ میں مسرت چاہتا ہوں اور اسی مسرت کے لئے تو میں شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔ میں ایک مستقل عذاب نہیں پا سکتا ماریہ تمہارے لئے اہم ہوگی کہ وہ تمہاری بہن ہے۔ مگر میرے لئے.... مگر میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں سمجھیں؟ ہر جگہ سودا کرنا چاہتی ہو۔ اپنے اس جسم کو کہاں کہاں بیچو گی!"

وہ تلخی سے بولا۔

جوزیہ ایک دم تڑپ اُٹھی۔

"شٹ اپ یو سوائن!"

وہ حقارت سے ہنسا۔ "گالی مت دو، کہو تو آج کے اس عیش کی قیمت بھی چکا دوں؟"

"قیمت"! اُس نے تڑپ کر مائیکل کا گریبان پکڑ لیا۔ مگر مائیکل کے ہاتھوں کا ایک زوردار، بے رحم دھکا کھا کر فرش پر گر پڑی سنگ مرمر کے بنچ سے ٹکرا کر اس کا سر لہولہان ہو گیا۔

حسرت کی رومانیت

سعادت نظیر ایم۔ اے

انسان نفسیات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے، جس میں چھوٹی بڑی طرح طرح کی وقت بے وقت ذرا ذرا سے تغیر سے ان گنت کیفیات کی موجیں جو احساسات و جذبات کے امتزاج کا نتیجہ ہیں، پیدا ہوتی ہیں، جن کا مکمل نفسیاتی تجزیہ قریب قریب ناممکن ہے۔ ان ہی کیفیات میں رومانیت بھی ایک کیفیت ہے، جو مختلف اور متعدد عناصر سے مرکب ہے، جس کی فضا میں عقل و شعور کے اجزا بہت کم پائے جاتے ہیں۔ البتہ ماضی پرستی، تجسس حسن، مرکز گریزی، جذبات کا ہجوم، احساس و وجدان پر اعتماد، تخیل کی خودکفالتی، ولولہ، ہیجان اور انقلاب حیات کا جوش داخلی طور پر محسوس ہوتا ہے توضیحت و صفائی اور بیان کی وضاحت و تشریح سے زیادہ موسیقیت، اشاریت اور معنی و مفہوم کی نہیں اور ان کی وسعتیں بھی خارجی حیثیت سے ملتی ہیں، غرض رومانیت بھی ایک عجیب کیفیت کا نام ہے جو دل میں ایک عجیب و غریب اضطراب سا پیدا کر دیتی ہے جس کی تسکین کے لئے فطری طور پر خارجی ماحول میں دلبستگی و دلآویزی کی جستجو جاذب نگاہ مناظر کی تلاش، ہم خیال کا تجسس، یک دلی، یک جہتی اور ہم آہنگی کی تمنا ہوتی ہے اور یہ سب کچھ یقینی سامانی کے ساتھ سینوں کے ارتباط یا تذکرہ محسوس میں محسوس ہوتا ہے۔ یہی کیفیت ترقی کرتے کرتے عشق و محبت کا روپ لیتی ہے اور رفتہ رفتہ ہر شعبۂ حیات و نفسیات پر چھا جاتی ہے۔ رومانیت کا یہی بدلا ہوا روپ شعر و شاعری کی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہے، جیسے جیسے شاعر کو حسن کا گہرا احساس ہوتا ہے ویسے ویسے وہ نامعلوم طور پر عام سطح سے بلند ہو کر نہ صرف حسن کے جلوؤں کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور اس کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، بلکہ اپنے اس خصوصی احساس کو مترنم آہنگ کے ساتھ زبان و بیان کا خوش وضع لباس بھی عطا کرتا ہے۔ احساس کی اس پیش کش میں عموماً شاعر کی طبعی افتاد، ذہنی صلاحیت نہار گزشتہ کے واقعات، ماحول کے اثرات اور اشارتی انداز قابل لحاظ حد تک دخیل ہوتے ہیں اور یہ چیزیں اگر مناسب حیثیت سے ممد و معاون ہوں تو یہی رومانیت اس کو ایک معیاری مقام پر پہنچا دیتی ہے، اور اس کی شخصیت کو قابل قدر بھی بنا دیتی ہے اور شاعر اپنے جادو اثر نغموں سے اپنے گرد و پیش کی دنیا کو محظوظ کر کے مسحور کر لیتا ہے اردو شاعری کے افق پر کچھ ایسے آفتاب اثر شاعر بھی نمودار ہوئے ہیں جن کے احساسات کی خس نے غم حیات کے طوفان باد و باراں کے ساتھ ساتھ رومانیت کی ایک نظر فریب قوس قزح کی تزئین کی۔ ان ہی ممتاز رومانی شاعروں میں حسرت موہانی بھی ایک شخصیت ہیں، جنھوں نے چکی کی مشقت کے دوران بھی رومانی غزل نگاری کو نظر انداز نہیں کیا۔

حسرت کے کلام میں حسن کی جلوہ سامانی نشاط کی کیفیت، حواس کی آسودگی اور احساس جمال کی ندرت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں ایک صحت مند باذوق اور جمال پرست کی جگر تشنگی ہے، وہ حسن کے ہر جلوے کے پرستار تو ہیں مگر چونکہ بہار باغ کائنات "صنف نازک" کا حسن ہی شعور و احساس پر زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بھی اس بت ہزار شیوہ پر جان دیتے ہیں، ان کا مرکز دل اوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک مشرقی خاتون ہے، جو ہرجائی نہیں اور ڈھیٹ بھی نہیں، پاکباز ہے، سادگی کا پیکر اور شرم و حیا کا مجسمہ ہے ؂

خود عشق کی گستاخی سب تجھ کو سکھا لے گی
اے حسن حیا پرور! شوخی بھی شرارت بھی

محبوب کے خاطر نازک کا انھیں پورا پورا لحاظ ہے ؂

گراں گزرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

کبھی تو رعبِ عشق اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسرتِ اظہار دل ہی میں رہ جاتی ہے ؎

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی
رو برو ان کے مگر آنکھ ملائی نہ گئی

حسرت ایک صداقت پسند اور راست گو کی طرح دورِ ارتقا میں عہدِ ہوس کا ایک واقعہ جو غالباً ان کی رومانیت کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، بڑی سادگی ہی سے بے جھجک حرارتِ رندانہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ نہایت اضطراب و اشتیاق کے ساتھ محبوب سے دل بستگی کے باعث بار بار ان کی مشتاق نگاہیں بے اختیار اس کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ وہ عاشق نواز بھی اپنے غرفے سے تاک جھانک کرتی ہے۔ اس سے کبھی وہ مل کر دفورِ شوق سے کچھ بے باکی کا مظاہرہ کر جاتے ہیں تو وہ دوپٹے سے منہ چھپا لیتی ہے۔ سوتے میں پاؤں چومنا چاہتے ہیں تو وہ شوخی سے ٹھکرا کر مسکرا دیتی ہے۔ ابتدائی زمانہ یاد دلاتے ہیں اور رفتہ رفتہ واقعات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ وہ چوری چھپے رات غیروں کی نظریں بچا کر آ جایا کرتی تھی۔ اور دورانِ ملاقات میں کبھی ذکرِ فراق آ جاتا تھا تو روتی تھی اور رلاتی بھی تھی۔ دوپہر کی سی دھوپ میں ان کے بلانے کو ننگے پاؤں چلی آتی تھی۔ اس کی پھولوں میں بسی زلفیں مشامِ جان کو طبلۂ عطار بنا دیتی اور اس کے مہندی میں رچے ہوئے دست و پا رنگینی کا نظر میں بچنے والا معیار متعین کرتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہوتیں اور وہ دشمن کے ذکر کو باتوں میں اڑا دیا کرتی تھی مختصر یہ کہ صحبتِ راز و نیاز گرم رہتی تھی۔

انھیں برگشتگی پر سو سو ناز سے منایا جاتا اور جب وہ من جاتے تو وہ خود روٹھ جاتی وہ چھیڑتے گدگداتے، وہ بگڑ بگڑ کر بنتی اور من کر بگڑ جاتی ؎

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انہیں غصہ ہے، انکار بھی حیرت بھی

اس نازنیں سے لڑائی ہوتی ہے اور صفائی بھی تقاضائے محبت کے ہاتھوں وہ وفا پر مجبور بھی ہے، لیکن دنیا کا خیال مانع ہے اور بدنامی و رسوائی کا خوف عناں گیر، حسرت کی اس ابتدائی سادگی و سپردگی کی جگہ آخر میں ربودگی و سنجیدگی لے لیتی ہے، جس میں تجربات کی وسعت اور مشاہدات کی گہرائی سے ایک وزن پیدا ہو جاتا ہے اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ باتوں سے وصل کی تدبیر بنتی ہے نہ آرزو سے تقدیر پھرتی ہے، التفاتِ یار کو وہ آغازِ وفا کا ایسا خواب تصور کرتے ہیں جس کی تعبیر سچ نہیں ہوا کرتی، قیدی غم ہو کر انھیں عظمتِ عشق محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنی عالی جاہی اور گردوں رکابی پر ناز کرنے لگتے ہیں۔ عشق و محبت کے ابتدائی دور کی حسین یادیں ہی ان کی رومانی زندگی کے مایۂ ناز سرمائے سے کچھ کم نہیں گویا آغازِ الفت کے عیشِ بافراغت اور بیگانۂ رسمِ جفا محبوب کے لطفِ بے نہایت کے مزوں کی یاد ہی تا دمِ مرگ ان کی حیاتِ عشق کا آسرا بنی رہی ؎

حسن سے اپنے وہ غافل تھا، میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے؟
میری جانب سے نگاہِ شوق کی گستاخیاں
یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے

اک بار سنی تھی سو مرے دل میں ہے موجود
اے جانِ تمنا تری تقریر ابھی تک
بھولی نہیں دل کو تری دزدیدہ نگاہی
پہلو میں ہے کچھ کچھ خلشِ تیر ابھی تک

حالاں کہ جیسا ان کے کلام سے پتہ چلتا ہے محبوب کی اور ان کی ملاقاتوں کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہے، باہمی چھیڑ چھاڑ کا واسطہ باقی نہیں رہا، سلسلۂ راز و نیاز منقطع ہو چکا ہے نہ وہ ہم نشینی ہے، نہ وہ بادہ پیمائی با ایں ہمہ قنوطیت، جو نتیجہ، لوازماتِ فراق ہے۔ حسرت کے دل و دماغ پر اثرانداز نہ ہو سکی اور وہ کہیں ناامید و مایوس نظر نہیں آتے اور انہیں یادوں کے سہارے اپنے رنگین ماضی کی دنیا خیالوں میں بسانے اور شگفتہ ہو کر ایسے نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ رودادِ حال کا شبہ گزرتا ہے:

اے یادِ یار! کہ باوصفِ رنجِ ہجر
مسرور ہیں تری خلشِ ناتواں سے ہم

شب وہی سب ہے، دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائیں

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر
ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

مل گئی مجھ کو عشق کی داد
وہ جو شرمندۂ جفا نہ ہوا

دنیائے محبت میں حسرت پر جو کچھ بیتی اور جو کچھ گزری، اسی کی سرگزشت تو ان کی رومانی شاعری کی جان ہے جدائی کے عالم میں وہ کبھی روئے دل آرا کے تصور سے کھیلتے ہیں تو کبھی خیالِ یار سے باتیں کرتے ہیں کبھی یادِ جاناں کی رنگینیوں سے بہلتے ہیں تو کبھی غمِ ہجراں سے گھبرا کر بے اختیار وصالِ یار کی دعا کر بیٹھتے ہیں مگر پچھتاتے بھی

ہیں کہ کہیں ان کی التجا قبول ہو گئی تو انھیں کشمکش انتظار کی لذتوں سے محروم ہونا پڑے گا، لبوں پر شکوۂ بے اعتنائی ہوگا۔ اور نہ خلش فرقت ہی رہے گی کہ دل لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن حقیقت ہے کہ محبوب کی غفلت شعاری عشق کا کٹھن ترین مرحلہ ہے ؎

گھبرا کے تغافل سے تمنا ہے ستم کی
حالت کوئی دیکھے ترے مجبورِ الم کی

اس منزل پر بھی آرزو بر نہیں آتی تو ان کے جی میں آتی ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے اب پھر کبھی نہ ملیں گے اور بے وفا ہو جائیں عشق کے حسین زمانے کو ایک خواب فراموش سمجھیں اور تمنائے شوق سے ہاتھ اٹھا لیں۔ کاوشِ دردِ جگر کو بھول جائیں، مائل آرام ہوں اور مشتاق شفا بھی، انھیں کوئی ارمان رہ ہو نہ کوئی حسرت بلکہ بے نیازی مدعا ہو اعہد وفا سے وہ اس قدر بیگانہ ہو جائیں کہ دل میں اس عشق ستم پرور کی یاد بھولے سے بھی کبھی چٹکیاں لینے نہ لگے مگر کس کے بس کا روگ ہے؟

اس سراپا ناز سے کیوں کر خفا ہو جائیے
کوئی عشق نازی کا مستغنا نہیں کہیں اے دل مبتلا
مگر اب کیا ہے جو ہوسد تو خوشی سے ناز تیاں

اسی حسرت نے اپنے مشاہدات و تجربات کی روشنی میں حسن و عشق کے ہر پہلو کو موثر انداز میں اجاگر کرنے کی اکثر کامیاب کوشش کی ہے حتیٰ کہ کہیں انھوں نے ابتذال و فحاشی کی بھی پرواہ نہیں کی، ان کے یہاں مذاق سلیم اور سنجیدگی پر گراں گزرنے والے شعر بھی ہیں۔ لیکن ان جواہر پاروں کی بھی کمی نہیں جو ان کی نمایاں انفرادیت کے آئینہ دار ہیں۔ جن میں انھوں نے باتوں باتوں میں شاعری کا ڈھنگ جگایا ہے ؎

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

ان کے سحر آگیں شعروں میں ایک شاہپارہ یہ بھی ہے جس میں انھیں بیک وقت حسن کرشمہ ساز کے اعجاز کا اعتراف بھی ہے اور اس پر طنز بھی ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

قادرانہ رمز کاری شعر کو پرکشش بنا دیتی ہے تشبیہیں، استعارے اور کنائے معنی آفرینی اور جدت طرازی کے موثر ذرائع ہیں ان سے موزوں اور برمحل لفظوں کے مفہوم و مطالب کا خوش رنگ دامن وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ مگر ان شعری وسیلوں کا استعمال شاعر کے سلیقے پر موقوف ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں جس حسن سے برتے گا شعر اتنا ہی جاندار ہو جائے گا۔ اور یہ خوبی بھی حسرت کے یہاں مناسب صورت میں پائی جاتی ہے۔ ان تشبیہات استعارات اور کنایات میں فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ رومانی قدروں کی دل آویزیاں بھی سمٹ آئی ہیں ؎

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکس مئے سے شیشہ گلابی

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

چمن جاں میں نسیم ہوس انگیز چلی
کشت امید پر ابر طرف آثار آیا

اس سے چھپتے ہیں، ہوتی ہے جس پہ ان کی نظر
اگر یہی ہے تو امیدوار ہم بھی ہیں!

نفسیات کی یہ بالکل روزمرہ کی ہوئی تجربہ پا افتادہ بات ہے کہ بات بات یاد آتی ہے چنانچہ اسی بات سے حسرت نے ایک بات بنائی ہے۔

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ کسی ذہین و نابغہ کے حرف و حکایات کو کشف و کرامات سمجھ لیا جاتا ہے، اس سے حسرت کی طباعی نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی فنکارانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے ؎

نگہ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں
شہرت کشف و کرامات چلی جاتی ہے

سیدھے سادے انداز کے ساتھ موثر اسلوب اظہار سے حیرت آفرینی بھی شاعر کا ایک کمال ہے

دل بے تاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت
نگہ شوق نے کیا جانئے کیا دیکھا ہے

یوں تو ہر انسان حسن و محبت کے رنگ پہلوؤں میں کم و بیش آشنا ہوتا ہے اور نت نئے مشاہدات و معاملات اور تجربات سے نشاط اندوز بھی۔ نشاط و سرور کے علاوہ کچھ اس کے ناگوار پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ہر ـــــ دل فطری طور پر متاثر و مغموم ہو جاتا ہے مگر عوام کو یہ سارے جذبات گونگے کے گڑ کھانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے یہ شاعری کا حصہ ہے کہ یہ قدرے بذریعہ کلام اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات اور ان کے اثرات کو ایسے موثر پیرائے میں اپنے ماحول تک بھی پہنچاتا ہے ہر ایک سامع اس کی ہر کہی ہوئی بات کو اپنے دل کی آواز سمجھتا ہے۔ اور مزہ لیتا ہے۔ شاعر اپنے جذبات

ہی کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اوروں کے دل کی گرہیں بھی کھولتا ہے، اور اس خوبی کے ساتھ اپنی تقریر میں لذت پیدا کرتا ہے کہ ہر سننے والا چیخ اٹھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے اور یہی حسنِ اظہار و قدرتِ کلام ہے۔ ان با قول کا دارومدار داخلی نوعیت سے احساسات کی قوت اور رومانیت کی شدت پر ہے اور خارجی حیثیت سے ماحول معاملت و تجربات کی اثر اندازی پر۔ جس شاعر میں رومانیت جس شدت کی ہوگی اس کے اشعار اتنے ہی بلیغ موثر اور پسندیدہ ہوں گے۔ حسرت کے احساس اور جذبات میں بھی ایک معیاری رومانیت عمولیٰ سی محسوس ہوتی ہے جس سے ان کی شاعری میں ایک دلکشی اور پسندیدگی آگئی ہے جو حسنِ قبول کی ضامن ہے:

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

رنگ سوتے ہیں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

لایا ہے طاہر کشی خرابی۔

اے یار! تیرا حسن شرابی حسن جاناں
سے یہ کہتا ہے مرا شہرۂ عشق

دور پہنچا ہے مرے نام سے افسانہ ترا
جذبۂ شوق کدھر کو لئے جاتا ہے مجھے!
پردۂ راز سے کیا تم نے پکارا ہے مجھے

حسرت کے کلام میں احساس جمال محبت مندی، ذوق، حسن و عشق کی بصیرت اور اس کے اظہار و ابلاغ میں سادگی و شگفتگی اور لطافت و بے باکی مثالی ہے ان کا نقطۂ نظر عقلی کم اور جذباتی زیادہ ہے لیکن ان کے یہاں جذبات میں تندہی نہیں، اعتدال ہے، آگہی و نشاط انگیزی:

تجدید لطف یار کی لذت میں کیا کہوں؟
شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے

⁂

تجھ میں کچھ بات ہے ایسی، جو کسی میں نہ ملی
یوں تو اوروں سے بھی دل بہلنے لگا دیکھا ہے

مختصر یہ کہ حسرت موہانی فلسفیانہ اصطلاحوں سے نہیں الجھتے نام نہاد تہذیب و تمدن کے اصولی قید و بند سے آزاد ہو کر انبساط احساس کی دنیا میں جس کا دوسرا نام "رومانیت" ہے گامزن ہوتے ہیں جہاں ان کے خیال اور جذبے کے پرکشش نقوش کہیں، ہلکے، کہیں گہرے رنگ میں ابھر آتے ہیں لب و لہجہ خوشگوار ہوتا ہے اضطراب و حشر سامانی، بے کرانی و لامحدودیت کے ساتھ دل نشین اشاریت جھلکنے لگتی ہے۔ اور وہ اپنی اندرونی و بیرونی تجربات کو ایک دوسرے میں سمو کر لطیف پیرایہ بیان میں اپنی طرف آفریں رومانیت کی جلوہ گری کرتے ہیں۔

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں
چل لے حوصلۂ دید! مجھے مقام کہیں

⁂

دام گیسو میں ترے ایک دلِ ناشاد بھی ہے
اے مرے بھولنے والے تجھے کچھ یاد بھی ہے

★

قیصر قلندر

غزل

یادوں کے شفق زار کے انداز بھلے ہیں
آنکھوں کے دیئے شمع کی مانند جلے ہیں

یہ ہجر کا صحرا ہے، کہاں آپ وفا ہے!
اس راہ میں گلزار تمنا کے جلے ہیں

خاموش نگاہوں میں تبسم کی کرن ہے
ہم صورتِ پیمانہ، اشاروں پہ چھلکے ہیں

شعروں میں نکھرتی ہے ترے حسن کی نزہت
پھولوں کی طرح میرے خیالات ڈھلے ہیں

ہر لحظہ کھلے رات، تمنا کے شگوفے
دل تاروں کے ہمراہ بہر رنگ جلے ہیں

وہ عارض و لب مہکے ہوئے شعر جواں رنگ
اس کاکلِ شب رنگ کی چھاؤں میں پلے ہیں

سو بار روایت نے دکھائے ہیں غمزے
ہم اس کے اشاروں پہ کبھی نہ چلے ہیں

اس شہر کی مٹی میں ہے تاثیر انوکھی
کس کس طرح سانچوں میں یہاں لوگ ڈھلے ہیں

ہر بار امیدوں کے چمن زار میں قیصر
احساس کے دل صورتِ پروانہ جلے ہیں

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمدنے اس زمیں پر صدقہ کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا انکی ہڈیاں ہیں

غزل کے میدان سے الگ، ہٹ کر ہم چکبست کی ان نظموں پر نظر ڈالتے ہیں جو سیاسی نہیں ہیں تو کہیں صاف صاف اور کہیں مبہم طور پر ان کا یہ ذہنی شعور ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ ان کا دل حب وطن سے لبریز ہے ان کی وطن پرستی ان کے ضمیر کا جز وغالب ہے۔ چنانچہ مختلف قومی رہنماؤں کی وفات پر جو انھوں نے مرثیے کہے ہیں۔ اس سے بھی ہمارے اس احساس کی تائید ہوتی ہے۔ "بال گنگا" دھر تلک"

وطن کی خاک تری بارگاہ اعلیٰ ہے
ہمیں یہی نئی مسجد نیا شوالا ہے

ان اشعار میں جس شدت کے ساتھ شاعر نے جذبۂ وطن پرستی محسوس کیا ہے وہ محتاج بیان نہیں، تلک کے لئے پیمانِ وفا کے بعد ہی نذر وطن کر دیا اور رگھو کھلے کے ہاتھ میں ناقوس برائے اذان کی اہمیت سمجھنے والا بھی وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے لئے وطن کی خاک بارگاہِ اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی نئی مسجد یا نیا شوالا بن جائے۔ چکبست کے لئے وہی رہنما رفیع تھا جس نے وطن کے لئے کچھ کیا ہو۔

اس قدر وہ عظیم و اہم۔ اس کا احساس وہی شخص کر سکتا ہے جو خود بھی صاحب دل اور وطن پرست ہو۔

مرثیہ ہو یا کوئی اور صنفِ شاعری چکبست اسے اپنے لئے غیر مستحسن سمجھتے ہیں کہ اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی پہلو سے جذبۂ حب وطن کا اظہار نہ ہو۔ ان کا ساغر دل اس سے اتنا لبریز تھا کہ بغیر کسی کاوش کے پیالہ چھلک جاتا تھا۔

دوسری اصناف شاعری کے بعد جب ہم انکی ایسی نظموں پر نظر ڈالتے ہیں جو خالص سیاسی محسوسات کا نتیجہ ہیں تو چکبست کی فنکاری کی اہمیت ہمیشہ سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں جب سیاسی تصور نے واضح شکل اختیار کی اور سلف گورنمنٹ کے مطالبے سے بڑھ کر ہوم رول حاصل کرنے کی جد و جہد کی، تب چکبست کی بھی آواز میں نسبتاً زیادہ زور پیدا ہوا پہلے کے مقابلے میں زیادہ کھل کر باتیں کرنے لگے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی ہمیشہ سے زیادہ اس دور میں ولولہ انگیز ہو گئی تھی۔ شاعر اپنے ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ چکبست بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ انکی شاعری اسوقت سے زیادہ زوردار و ہمہ گیر ہو گئی ہوم رول کی تحریک کو جتنا سہارا چکبست نے دیا ان کو نظر میں رکھکر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے کسی شاعر نے اتنی کاوش نہیں کی۔ اس سلسلے میں ان کا کوئی مدمقابل نظر نہیں آتا۔ سچ پوچھئے تو کسی ایک سیاسی رہنما نے شاید ہی اس تحریک کو اتنا عوام میں ہردلعزیز بنایا ہو جتنا چکبست نے اپنی شاعری سے اسے کامیاب بنایا ہوم رول کو چکبست نے اور ہوم رول نے چکبست کو آسمان پر پہنچا دیا۔ انکے اشعار بچے بچے کی زبان سے سنائی دینے لگے۔ در و دیوار سے آواز آئی تھی سے

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

انکی ایسی نظموں میں ہمیشہ سے زیادہ گرمی تھی۔ جاذبیت تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سر فروشی کا پیام تھا۔ انکے اشارے میں وقت کی پکار تھی، انکی شاعری قومی رہنماؤں کی زبان تھی۔ عوام کے جذبات کی ترجمانی تھی۔ ہوم رول ان کا عقیدہ بن گیا اور انکے اشعار میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک جگہ کہتے ہیں

یہ جوشِ پاک زمانہ دبا نہیں سکتا
رگوں میں خون کی حرارت مٹا نہیں سکتا
یہ آگ وہ ہے جو پانی بجھا نہیں سکتا
دلوں میں آکے یہ ارمان جا نہیں سکتا
طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

یہ مطالبہ بھی بدیسی حکومت کے لئے کرب کا باعث تھا۔ اس تحریک کو روکنے کے لئے اس نے کیا کیا مظالم نہ ڈھائے۔ حالانکہ اس مطالبہ کی آنچ انگریزوں کی چمن بندی کو جھلسا نہیں رہی تھی۔

ہندوستان سے باہر چلے جانے کا ان سے کوئی تقاضہ نہ تھا ان کو بحیثیت بادشاہ قیام کرنا جائز نہیں سمجھا گیا مگر پھر بھی وہ اس آگ کا اثر دور تک دیکھ رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ یہ سیلاب ہوم رول ہی تک محدود نہیں رہے گا اس لئے اسکو روکنے کے لئے طرح طرح کی سختیاں آئینِ حکومت بن گیا تھا۔

اس قید و بند کے بعد اگرچہ چکبست کی ایسی شاعری میں اس بنیاد کی کمی محسوس ہوتی ہے جو بعد کے شعراء کے یہاں پائی جاتی ہے تو کچھ تعجب نہیں، اس لئے کہ چکبست کے دور میں ملک میں وہ حرارت نہ تھی جو بعد میں پیدا ہوئی یہ وہ دور تھا جب ہندوستان اتنا منظم و متحد اپنے مطالبہ میں نہ ہوا تھا۔ کہ شمشیر برہنہ ہو کر حاکم وقت کے سامنے آجائے اپنے دور کے نشیب و فراز کے پیش نظر شاعر اسی لب و لہجہ میں باتیں کرتا تھا جو مصلحت وقت کا تقاضہ تھا لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ چکبست نے [illegible]

Regd. No. D 3

THE DAUR-E-HAYAT WEEKLY

Princess Building, Ibrahim Rehmatulla Road, Bombay-3

Vol. 4 JUNE 10, 20 & JULY 1 1965 No. 17, 18,
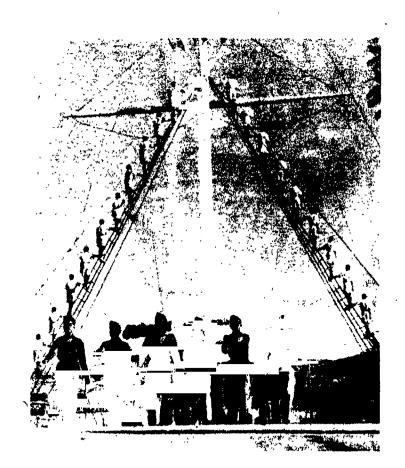
انتہائی سکون کے ساتھ داستانِ غم سنتے رہے۔ دل میں امید کے لاکھوں دیئے جگمگا اٹھے کہ اب تک کی کوئی بھڑکتی تدبیر بتائیں گے اور میرا آٹوگراف بھیڑ چال کا شکار ہونے سے بچ جائے گا۔ بہت دیر تک کچھ نہ بولے اور جب گویا ہوئے تو اس طرح کہ امید کے لاکھوں دیئے یکلخت بجھ گئے۔ کہنے لگے۔

"ٹیچر کی آنکھ بچا کر گھنٹی بجا دو اور لڑکیوں کو جمع کر کے کہہ دو کہ غلطی سے میرا نام نسیم رکھا گیا ہے، میں تو 'بادِ سموم' ہوں یقین نہ ہو تو گھر آکر تصدیق کر لیجیے۔"

بات کڑوی تھی۔ پی جانا حماقت معلوم ہوئی۔ دیر تک لڑتی رہی۔ جانے لڑائی کا اثر تھا یا بی۔ اے کی پڑھائی کا۔ اُس شام بھائی جان کے سر میں سخت درد رہا۔ مزاج پُرسی کی تو جواب ملا۔

"جو بھی آٹوگراف کا دُکھڑا رو کر پہلے تو بیزار کر دے۔ پھر زبان کے جوہر دکھا کر بیقرار کرے اور آخر میں کوسنے دے دے کر بیمار بنا دے اُسے 'بادِ سموم' نہ سمجھوں تو کیا سمجھوں؟"

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میری ہم جماعت لڑکیاں کسی کے ذریعے آٹوگراف گھر بھجوا دیتی تھیں بھائی جان آٹوگراف شناسی میں بہت تیز تھے۔ آتا دیکھ کر چلا اٹھتے۔ "اے بی نسیم کہاں ہو لو ڈاکیہ آ گیا خط لے کر۔"

ایک دن کا واقعہ ہے، اتی گھر میں موجود تھیں۔ اُنہیں زکام ہو گیا تھا اس لئے خدمت کرنے کی بجائے مجھ سے خدمت لے رہی تھیں۔ بھائی جان نے آٹوگراف کی آمد پر حسبِ معمول گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ظاہر ہے خوش ہونے کا کوئی مقام نہ تھا لہٰذا میں لبسورنے لگی۔ مجھے لبسورتا دیکھ کر اتی نے بھائی جان کو ڈانٹا۔ بج کے بیٹھے تھے۔ ایسی صفائی پیش کی کہ طبیعت صاف ہو گئی۔ اُن کا جواز تھا [illegible] حاضر، پیغام بھی

ہے لو نقطہ بھی۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے اک نامہ شے

بیٹے میں باپ کی ذہانت کا پرتو پا کر اتی کی باچھیں کھل گئیں۔ بھائی جان شہ پا کر اور شیر ہو گئے۔ مزید فرمایا

"اور آپ نے ملاحظہ کیا اتی چونچ کی سہیلیاں مسنون خط لکھتی ہیں۔"

یہ طنز تھا میری اُن ساتھیوں پر جو مشقِ سخن کے ساتھ مشقِ ستم بھی کرتی تھیں۔

ہوتے ہوتے آٹوگراف کے اوراق ڈھیلے پڑتے گئے۔ دن پر دن جو گزر رہے تھے۔ میں آٹھویں سے نکل کر گیارھویں درجے میں آ گئی تھی۔ جماعت یازدہم کا اعجاز سمجھئے کہ ایک روز بھائی جان نے آٹوگراف کے موضوع پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی۔ ماہیت بتائی۔ طریقۂ استعمال سکھایا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد ہمارے یہاں بڑا عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ ایک عظیم الجثہ شاعر صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اُنکے تن و توش کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے "ہنومانِ شاعری" کی پھبتی یاد آ رہی تھی۔ معاف کیجئے ذرا "سخن گسترانہ بات" زبانِ قلم سے نکل گئی۔ بھائی جان کی زبانی اُن کی عظمت کے متعلق سن چکی تھی۔ لیکچر ہنوز دماغ میں تازہ تھا۔ پو پھٹ رہی تھی کہ مشاعرہ ختم ہوا صاحبِ صدر ڈائس سے اُترنے بھی نہ پائے تھے کہ میں کاسۂ دریوزہ گری لے کر دوڑ پڑی۔ بعد عجز و نیاز دستخط کی درخواست کی۔ دبی زبان میں شعر لکھنے کی خواہش بھی کر بیٹھی۔ قسمت یاوری کر رہی تھی۔ شعر بھی لکھا اور دستخط بھی کر دیئے۔ آپ کے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے نیچے لکھ رہی ہوں ؎

سچ کہتا ہے جانی واکر
گھر کی مرغی دال برابر

ایسا بے تکا سا شعر دیکھ کر میں تو دم بخود رہ گئی اللہ میرے بھائی جان کو نظرِ بد سے بچائے اس خوبی سے شعر کا تجزیہ کیا ہے کہ چودہ طبق روشن ہو گئے۔

شاعرِ محترم منتظمینِ مشاعرہ سے سخت برہم تھے کہ مرغ مسلّم کو شریکِ طعام نہ کیا۔ مشاعرہ امدادی نوعیت کا تھا۔ اس لئے منتظمین اوقات کی مد پر کفایت کے ساتھ خرچ کر رہے تھے۔ شاعر صاحب کو مقصد سے کیا سروکار تھا۔ وہ تو بس حلوے مانڈے کی زبان جانتے تھے۔ رات بھر مرغی جنابِ صدر کے لاشعور میں اُچھل کود مچاتی رہی۔ صبح ہوئی تو جھپٹ کر میرے آٹوگراف پر آ بیٹھی۔ ممکن ہے آپ کی نظر میں اہلِ مشاعرہ کا اقدام درست ہو۔ میں تو یہی کہوں گی کہ شاعر صاحب کو مرغی نہ کھلا کر اُن کی حق تلفی کی گئی۔ آخر انہیں کے واسطے ہوتی ہیں مرغیاں پیدا۔"

ایس، ایس، سی کا امتحان سر پر منڈلا رہا ہے۔ سنا ہے ہفتہ بھر بعد ہمیں اسکول سے چھٹی مل جائیگی ساتھی طالبات "رخصتی" کے اہتمام میں مصروف ہیں۔ جرمانہ چکایا جا رہا ہے۔ لائبریری کی کتابیں لوٹائی جا رہی ہیں اور ہاتھوں میں ننھی منی آٹوگراف بکس لئے اسٹاف روم کا طواف بھی ہو رہا ہے۔ سب سرگرمِ عمل ہیں۔ ایک میں ہوں کہ سوگواری صورت لئے ڈیسک پر چپکی بیٹھی ہوں 'تمنا' کا خانہ صاف ہے اور آٹوگراف پاس نہیں ہے پچھلے پیر کا واقعہ ہے۔ بھائی جان کنوئیں کی جگت پر بیٹھ کر میرا آٹوگراف اپنے ایک دوست کو دکھا رہے تھے۔ رائے زنی ہو رہی تھی اور قہقہے لگ رہے تھے کہ آٹوگراف ہاتھ سے چھوٹ گیا اور گیا بھی تو کہاں۔ کنوئیں کی تہہ میں۔ نہ پوچھئے دن بھر کیا عالم رہا۔ نہ کھایا نہ پیا منہ لپیٹے پڑی رہی اور بھائی جان کا کاکر تسلی دیتے رہے۔ اب کہاں سے لاؤں وہ چسل گیا، نہ اتا بابا کو اطلاع ہوئی۔ بھائی جان کے نام سمن نکلو جانے دونوں کے جی کیا تھے ہوئیں، شام ہوئی تو آپ اطرافی اتی نے بھائی صاحب کی آٹوگراف لینے سوچی تو اکٹھا کیے۔ مجھ تو چاہئے آٹوگراف چاہئے جس کے سر ورق پر کوئٹہ کی دوستی نے ڈاٹ آرٹ کا نمونہ پیش کیا ہے اور اندر کل کی سہیلیاں نقط لکھے ہیں اور شاعر صاحب نے مرغی بٹھا دی ہے۔

[illegible]

اور انڈونیشیا کی جسم جیسم دخل اندازی کے باوجود افریشیائی وحدت کا خواب کب تک قائم رہ سکے گا؟

کیا سخت حقائق بالآخر اس خواب کو پاش پاش نہ کر دے گا؟ ہندوستان کا لہجہ ہمیشہ معتدل رہا ہے لیکن چین، انڈونیشیا اور ہندوستان کے انداز فکر کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔ شری سبرامنیم نے جکارتا سے واپسی کے بعد انڈونیشیا اور ملائشیا کے اختلافات کے پرامن حل پر زور دیتے ہوئے ہندوستان کے اس فیصلے کا اعادہ کیا ہے کہ وہ الجیریائی کانفرنس میں ملائشیا کی شرکت کی حمایت بدستور کرتا رہے گا۔ اس فیصلے اور انڈونیشیا کے ملائشیا کو شرکت سے محروم رکھنے اور اسے کچل دینے کے فیصلے میں مطابقت کس طرح پیدا کی جا سکے گی۔

شری سبرامنیم نے اس پہلی خبر کی تردید کی ہے کہ صدر سوئیکارنو نے ہندوستان کو ان ملکوں کی فہرست میں رکھا تھا جو ایشیا میں ہونے کے باوجود ایشیائی نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ صدر سوئیکارنو نے اس سلسلے میں ہندوستان کا نام نہ لیا ہو لیکن انکی متعدد تقریریں اس معاملے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں چھوڑتیں کہ انکے نزدیک بعض ملک ایشیائی ہونے کے باوجود ایشیائی نہیں اور کچھ ملک اور کچھ ملکوں کے باشندے بہر اعتبار غیر ایشیائی ہونے کے باوجود ایشیائی ہیں۔ صدر سوئیکارنو اور چینی حکمرانوں کے نزدیک ملائشیا، تھائی لینڈ اور فارموسا ایشیائی نہیں لیکن لاطینی امریکہ افریقی یا ایشیائی ضرور ہے۔ اپنی اسٹیڈیم والی تقریر میں تو انڈونیشی ڈکٹیٹر نے امریکہ اور برطانیہ تک کے کچھ لوگوں کو افریشیائی

[illegible] کا کامیابی کی توقعات ظاہر کرتے انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ عنقریب جکارتا میں ابھرتے ہوئے ملکوں کی ایک اور کانفرنس ہوگی جس میں برطانیہ اور امریکہ کے ترقی پسند عناصر بھی شریک ہونگے۔

اس اعلان کے بعد افریشیائی وحدت کا انڈونیشی اور چینی نقشہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے وہ تمام لوگ جو کمیونسٹ ہیں خواہ وہ امریکہ یا برطانیہ کے باشندے ہی کیوں نہ ہوں افریشیائی ہیں اور غیر کمیونسٹ ملک جغرافیائی طور پر ایشیا یا افریقہ میں ہونے کے باوجود غیر افریشیائی ہیں۔ ملائشیا اور تھائی لینڈ میں چونکہ غیر کمیونسٹ حکومتیں قائم ہیں اس لئے ان کا تختہ الٹ دیا جائے گا اور یہ کام انڈونیشیا اور چین انجام دینگے۔ ہندوستان کا نام خواہ اس فہرست میں شامل نہ ہو لیکن چین کا طرز عمل اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں چھوڑتا کہ اس ملک کی تخریب بھی ان ملکوں کے عزائم سے خارج نہیں۔

غیر جانبداری اس خطے میں میسر نہیں رہ سکتی۔ کمیونسٹ ملک مکمل اطاعت چاہتے ہیں اور اس حقیقت کو سامنے لانے کا شرف چین یا انڈونیشیا کو نہیں بلکہ چین کے مد مقابل سوویت روس کو حاصل ہے، روس کے سرکاری اخبار "پراودا" نے اپنی ۱۹ر اپریل کی اشاعت میں غیر جانبدار ملکوں کو خبردار کیا ہے کہ بڑی طاقتوں کے جھگڑوں سے الگ رہنا "اب غیر جانبداری کا کافی ثبوت نہیں" بلکہ اسکے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ "غیر جانبدار ملک سوویت روس کی جاری کردہ" ان کی مہموں میں سرگرم شرکت کریں۔

کمیونسٹ ملکوں کے اس مطالبہ جنوائی

ناشتہ

ایک نسیف الوجہ ماہر سے جب میری ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے دور کی تحقیق و مشاہدات جن سے اس کو دوچار ہونا پڑا تھا بیان کرنا شروع کر دیئے۔ اس نے کہا کیا آپ جانتے ہیں کہ پرانے زمانے کے لوگ ایک خاص قسم کی چڑیوں کے جنین نیز ایک خاص قسم کے جانور کے پیٹ کی قاشیں بڑے شوق سے کھاتے تھے پہلے گھاس کے بیج کو خوب اچھی طرح پیس ڈالتے تھے پھر اسے گوندھ کر آگ پر گرم کرتے تھے۔ پھر اسے ایک چربی دار شے میں لپیٹ دیتے تھے جو ایک جنگلی جانور کی رطوبت سے حاصل کی جاتی تھی۔ جب میں اس بربریت کو سن کر اکتا گیا تو وہ کہنے لگا۔ بھئی! میں نے جو کچھ کہا دراصل وہ خنزیر کے گوشت، مکھن، توسٹ پر مشتمل ایک ناشتہ تھا۔

ایک شکی مزاج شوہر نے ایک دن دفتر سے یہ دیکھنے کیلئے کہ بیوی گھر میں ہے کہ نہیں، فون کیا۔ بیوی جب فون پر آئی تو شوہر نے کہا۔

"ڈارلنگ کیا تم دوپہر میں گھر ہی رہو گی"

"ہاں ڈارلنگ میں کہیں نہیں جاؤنگی"

لیکن یہ تو بتاؤ تم ہو کون؟

کا مطلب ایک کند ذہن سے کند ذہن شخص بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ کیا ایشیا اور افریقہ کے ملک اسکے لئے واقعی آمادہ ہیں؟